

# معراج القرآن

مدرسۃ اسلامیہ کراچی  
مفتی اعظم پاکستان





# مَعَارِفُ الْقُرْآنِ

جلد

۷

لقمان الم سجدہ، احزاب سبا، فاطر یس، صافات، ص، زمر  
مومن، حم سجدہ، شوری، زخرف، دخان، جن، احقاف  
پارہ ۲۱ رکوع ۱۰ تا پارہ ۲۶ رکوع ۴

حضرت لانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ  
مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی





نعم و سبھا منفر لہ و د جہزین و میر

## حکومت پاکستان کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر ۲۷۳۲

عرض نامہ: اگرچہ معارف القرآن کی تصحیح کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن  
کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد بندی میں سہو غلطی  
ہو جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم  
مطلع فرمائیں۔  
ادارۃ المعارف کراچی ۱۳  
احاطہ دارالعلوم کراچی پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰  
فون: ۵۰۳۲۰۲۰۵۰۴۹۷۳۳

باہتمام : محمد مشتاق نسیمی

طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ - اپریل ۲۰۰۸ء

مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر : ادارۃ المعارف کراچی

فون : 5049733 - 5032020

ای میل : i\_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

✽ ادارۃ المعارف کراچی

فون: 5049733 - 5032020

✽ مکتبہ معارف القرآن کراچی

فون: 5031565 - 5031566



## فہرست مضامین "معارف القرآن" جلد ہفتم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۷	اسلام کا بے نظیر قانون عدل		
۲۸	لقمان کی دوسری وصیت متعلقہ عقائد	۱۷	سُورَةُ لُقْمَانَ پ
۶	تیسری وصیت متعلقہ اصلاح عمل	۱۷	آیات ۱ تا ۹
۶	چوتھی وصیت متعلقہ اصلاح خلق	۱۹	وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ
۶	پانچویں وصیت متعلقہ آداب معاشرت	۲۱	لہو و لعب اور اس کے سامان کے شرعی احکام
۳۰	آیات ۲۰ تا ۲۲	۲۳	فحش ناول اور اشعار اور اہل باطل کی کتابیں دیکھنا
۳۹	آیات ۲۳ و ۲۴		جائز نہیں
۵۲	إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ		کھیلوں کے سامان کی خرید و فروخت
۶	پانچ چیزوں کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں		مباح اور جائز کھیل
۶	مسئلہ علم غیب		ممنوع و ناجائز کھیل
۵۳	ایک شبہ اور جواب	۲۵	غنا و مزامیر کے احکام
۵۳	مسئلہ علم غیب کے متعلق اہم فائدہ	۲۶	ضروری تنبیہ
۵۵	فوائد متعلقہ الفاظ آیت	۲۷	بغیر مزامیر کے خوش آوازی سے مفید اشعار
۵۷	سُورَةُ الْحَمِّ سَجْدَةِ پ	۲۷	پڑھنا ممنوع نہیں
۵۷	آیات ۱ تا ۳	۲۷	آیات ۱۰ و ۱۱
۵۹	آیات ۲ تا ۹	۳۳	وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ
۶۱	روز قیامت ایک ہزار سال کا		حضرت لقمان نبی نہیں دلی تھے
۶	دنیا کی ہر چیز اپنی ذات میں اچھی ہے، برائی اس کے		وہ حکمت جو حضرت لقمان کو دی گئی
۶	غلط استعمال سے آتی ہے۔	۳۵	دالین کی اطافرض ہی مگر علائق شرع الموتیں کسی کی اطافرض نہیں
۶۲	تخلیق انسانی تمام مخلوقات میں حسین تر ہے۔	۳۶	
۶۷	آیات ۱۰ تا ۲۲		
۶۷	قبض روح اور ملک الموت کے متعلق کچھ تفصیلات		
۶۷	کیا جانوروں کی روح بھی ملک الموت قبض کرتے ہیں		



صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۰۳	خندق کی کھدائی کی تقسیم پوری فوج پر	۶۹	نماز تہجد
۱۰۴	صلاحیت کار میں مقامی اور غیر مقامی کا امتیاز		دنیا کے معائب بھی اللہ کی طرف رجوع ہونے والوں
"	ایک عظیم معجزہ	۷۰	کے لئے رحمت ہیں۔
"	قدرت کی تنبیہات		بعض جرائم کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت
۱۰۵	منافقین کی طعنہ زنی اور ایمانوں کا یقین ایمانی	۷۱	کی سزا اس کے علاوہ ہے۔
	بڑوں کو چھوٹوں کی تکلیف و مصیبت میں شامل	"	آیات ۲۳ تا ۳۰
۱۰۶	رہنے کی ہدایت	۷۴	کسی قوم کا مقتدار بننے کے لئے دو شرطیں
"	مشکلات سے رہائی کا نسخہ	۷۵	زمین کی آبپاشی کا قدرتی نظام عجیب
"	صحابہ کرام کا ایثار		سُورَةُ الْحَزَابِ پ
۱۰۷	ساتھ تین میل لمبی خندق کی کھدائی چھ روز میں	۷۷	آیات ۱ تا ۳
"	حضرت جابرؓ کی دعوت اور ایک کھلا ہوا معجزہ	"	شان نزول
۱۰۸	یہود بنی قریظہ کی عہد شکنی	۷۸	آنحضرتؐ کو کفار کے مشوروں پر عمل سے ممانعت
۱۰۹	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جنگی تدبیر	۷۹	آیات ۴ و ۵
"	حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی غیرت ایمانی	۸۲	زمانہ جاہلیت کی تین رسوم کی تردید
۱۱۰	ان کا زخمی ہونا اور دعا پر مقبول	۸۳	آیت ۶
"	غزوہ احزاب میں چار نمازوں کی قضا	۸۵	الَّذِينَ أُؤْتُوا الْبُيُوتَ فِي تَفْسِيرِ
۱۱۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا	۸۷	وَأُولَ الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي تَفْسِيرِ
"	فتح کے اسباب کا آغاز	۸۸	آیات ۷ و ۸
"	لحیم بن مسعودؓ کی جنگی تدبیر	۸۹	میشاقی انبیاء
۱۱۳	حضرت حذیفہؓ کا دشمن کے لشکر میں ایک عجیب واقعہ	۹۰	آیات ۹ تا ۲۷
۱۱۴	آئندہ کفار کے حوصلے پست ہو جائیں گے	"	غزوہ احزاب کا واقعہ
"	تنبیہ	۱۰۰	سیاست کے اکھاڑے میں جھوٹ
"	غزوہ بنو قریظہ	"	اللہ کے علم و کرم کا اعجاب
۱۱۷	اجتہادی اختلاف میں کوئی جانب گناہ نہیں ہوتی	۱۰۱	مدینہ منورہ پر سب سے بڑا حملہ
"	کعب بن ربیع بنو قریظہ کی ایک تقریر	"	مسلمانوں کی جنگی تیاری کے تین رکن : اللہ پر توکل،
۱۱۸	حضرت سعد بن کاظمؓ اور وفات	"	باہمی مشورہ، مادی وسائل بقدر وسعت
۱۱۹	احسان کے بدلے اور غیرت قومی کے دو عجیب نمونے	۱۰۲	خندق کی کھدائی
		۱۰۳	اسلامی لشکر کی تعداد
		"	پندرہ برس کی عمر میں لڑکا بالغ سمجھا جائے گا
		"	انتظامی امتیازات وحدت اسلامی کے منافی نہیں



صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۵۰	نکاح میں نسبی کفارت کا درجہ	۱۲۰	تنبیہ
۱۵۱	مسئلہ کفارت	۱۲۱	آیات ۲۸ تا ۳۲ پ
۱۵۲	نزول آیات کا ایک اور واقعہ، تَخْفُفٌ فِی نَفْسِکِ کی تفسیر	۱۲۶	ازواجِ مطہرات کو چند ہدایات
۱۵۵	لوگوں کی طعن تشنیع سے بچنے کا اہتمام اس حد تک کہ کسی حکم شرعی کے خلاف نہ ہو	۱۲۸	طلاق کے متعلق چند مسائل (فائدہ)
۱۵۶	مخالفین کے شبہات کا جواب	۱۲۹	ازواجِ مطہرات کی خصوصیت، ہر عمل کا دو ہر ثواب فائدہ
۱۵۷	انبیاء کے لئے تعدد ازواج کی ایک حکمت	۱۳۰	عالم کو جس طرح نیک عمل کا ثواب زیادہ ملتا ہے گناہ پر عذاب بھی زیادہ ہوتا ہے،
۱۵۸	ایک اشکال اور جواب	۱۳۱	ازواجِ مطہرات کو خاص ہدایات
۱۶۰	آیت ۲۰	۱۳۱	کیا ازواجِ مطہرات سائے عالم کی عورتوں سے افضل ہیں؟
۱۶۳	آیت خاتم النبیین کی تفسیر	۱۳۲	عورت کی آواز ستر میں داخل نہیں
۱۶۴	مسئلہ ختم نبوت	۱۳۳	عورتوں کو محمل پرودہ کرنے کی ہدایت
۱۶۵	ختم نبوت نزول عیسیٰ ؑ کے منافی نہیں	۱۳۴	پردہ سے استثنائی صورتیں
۱۶۸	نبوت میں ظلی بروزی کی ایجاد تحریف ہے	۱۳۵	حضرت عائشہؓ کا سفر بصرہ اور جنگ جمل پر
۱۷۰	آنحضرتؐ کے بعد دعویٰ نبوت کفر ہے	۱۳۸	رواقص کے ہفوات کا جواب
۱۷۳	آیات ۳۱ تا ۳۸	۱۳۹	ازواجِ مطہرات کو ہدایات کا سلسلہ - پانچوں ہدایات سب مسلمانوں کو عام ہیں۔
۱۷۶	ذکر اللہ ایسی عبادت ہے جس کے لئے کوئی شرط نہیں، اسی لئے بکثرت کرنے کا حکم ہے	۱۴۱	لَیْسَ بِہِیْ عَنکُمْ الرَّجْسُ اَہْلُ الْبَیْتِ
۱۷۹	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفات	۱۴۲	اہل بیت میں کون لوگ داخل ہیں؟
۱۸۰	شاہد داعی، مبشر نذیر اور ان کی تحقیق	۱۴۳	صحابہ پر احادیث رسولؐ کی تبلیغ واجب ہے
۱۸۱	آیت ۲۹	۱۴۴	حدیث رسولؐ کی حفاظت قرآن کی طرح
۱۸۲	طلاق کے بعض مسائل	۱۴۵	آیت ۳۵
۱۸۳	طلاق کے وقت متعین لباس کی تفصیل	۱۴۶	قرآن کے عام خطابات مردوں کو ہیں عورتیں
۱۸۴	حسن معاشرت کی بے نظیر تعلیم	۱۴۷	ان میں ضمناً شامل ہیں اس کی حکمت
۱۸۵	آیات ۵۰ تا ۵۲	۱۴۸	ذکر اللہ کی کثرت کا حکم اور اس کی حکمت
۱۸۶	آنحضرتؐ کی بعض خصوصیات متعلقہ	۱۴۹	آیات ۳۶ تا ۳۹
۱۸۷	نکاح و ازواج	۱۵۰	واقعہ نزول آیات
۱۸۸	آنحضرتؐ کا تعدد ازواج	۱۵۱	ایک لطیفہ
۱۸۹	آیات ۵۳ تا ۵۵		



صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۲۳	مذکورہ طریقہ صلوٰۃ و سلام کی حکمت	۱۹۸	بعض آداب معاشرت
"	صلوٰۃ و سلام کے احکام شرعیہ	"	دعوت طعام اور مہمانی کے بعض آداب
۲۲۶	آیات ۵۷ تا ۵۸	۱۹۹	مہمان کے لئے ادب
۲۲۹	ایذا پر رسول کفر ہے اس سے بچنے کی ہدایت	"	مہمان کا اکرام
"	کسی مسلمان کو بغیر وجہ شرعی دکھ پہنچانا حرام ہے	۲۰۰	عورتوں کو پردہ کا حکم
۲۲۹	آیات ۵۹ تا ۶۲	"	پردہ نسواں کی خاص اہمیت
۲۳۲	منافقین کی طرف سے ایذا پر رسول اور اس کے	"	آیات پردہ اور ان کا شان نزول
۲۳۲	انسداد کا حکم	۲۰۲	ازواجِ مطہرات آپ کے بعد کسی سے نکاح
۲۳۲	تنبیہ ضروری	"	نہیں کر سکتیں
"	مرتد کی سزا اسلام میں قتل ہے	۲۰۳	احکام حجاب اور انسدادِ فواحش کا
۲۳۵	آیات ۶۳ تا ۷۱	"	اسلامی نظام
۲۳۰	انبیاء الیہ جسمانی عیوب میں بھی مبتلا نہیں ہوتے	۲۰۵	انسدادِ جرائم کے لئے اسبابِ جرائم پر پابندی
"	جرباعث نفرت ہوں	۲۰۷	تنبیہ ضروری
"	زبان کی اصلاح دوسرے تمام اعضاء کی اصلاح	۲۰۹	نزولِ حجاب کی تاریخ
۲۳۱	کا موثر ذریعہ ہے۔	۲۱۱	حجاب اور ستر عورت میں فرق
"	قرآنی احکام میں سہولت کا خاص اہتمام	۲۱۳	پردہ شرعی کے درجات اور احکام
۲۳۲	آیت ۷۲ و ۷۳	۲۱۴	پہلا درجہ گھروں کے اندر مستور رہنا
۲۳۲	إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ	۲۱۵	ازواجِ مطہرات کے قلوب میں آپ کی عظمت
۲۳۳	امانت کی تعریف	"	اور عقیدت
۲۳۵	آسمان وزمین پر امانت پیش کرنے کا مطلب	۲۱۷	پردہ کا دوسرا درجہ (برقعہ)
۲۳۶	عرضِ امانت اختیار ہی تھا جبری نہیں	"	تیسرا درجہ چہرہ اور قد میں کا استثناء اور
۲۳۷	عرضِ امانت کا واقعہ کب ہوا	"	اس میں اختلاف فقہاء
۲۳۸	خلافت اہنی کیلئے بار امانت اٹھانے کی صلاحیت ضروری تھی	۲۲۰	آیت إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ کی
	سُورَةُ سَبَا ۲۲	"	تفسیر
۲۵۰	آیت ۲ و ۱	۲۲۱	صلوٰۃ و سلام کے معنی
۲۵۱	آیات ۳ تا ۹	۲۲۲	ایک شبہ کا جواب
۲۵۶	آیات ۱۰ تا ۱۳	۲۲۳	صلوٰۃ و سلام کا طریقہ
۲۶۰	حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں		
	کی تسبیح حقیقی تھی آواز کی بازگشت نہ تھی۔		



صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۹۲	اشتعال انگیزی سے پرہیز	۲۶۱	حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت
۲۹۳	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام دنیا کے لئے عام ہے	۲۶۲	کی تعلیم اور لوہے کو نرم کرنے کا معجزہ
۲۹۸	دنیا کی دولت و عزت کو عند اللہ فضیلت سمجھنا	۲۶۳	صنعت و حرفت کی فضیلت
۳۰۰	قدیم شیطان فریب ہے	۲۶۴	صنعت پیشہ لوگوں کو حقیر سمجھنا گناہ ہے
۳۰۱	مال و اولاد کی کثرت اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت نہیں بلکہ بعض اوقات یہی عذاب ہوتا ہے۔	۲۶۵	حضرت داؤد علیہ السلام کو صنعت زرہ سازی سکھانے کی حکمت
۳۰۲	انسان اپنا مال اور قوت و طاقت جو کچھ خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ غیب سے اس کا بدل دیدیتی ہیں	۲۶۶	خلیفہ وقت اور دینی خدمات کو نیا لے علماء اور مجاہدین کو بیت المال سے اپنا گزارہ لینا جائز ہے۔
۳۰۳	جو خرچ خلاف شرع ہو اس کے بدل کا وعدہ نہیں	۲۶۷	لوگوں سے اپنے عیوب کی تحقیق کرنا
۳۰۴	جس چیز کا دنیا میں خرچ کم ہو جاتا ہے اس کی پیداوار بھی کم ہو جاتی ہے	۲۶۸	حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہوائی سفر
۳۱۰	کفار مکہ کو دعوت حق کا ایک خاص انداز	۲۶۹	تسخیر جنات کا مسئلہ
۳۱۳	دَاخِدُوا مِیْنَ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ کا مطلب	۲۷۰	سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات کے اعمال عجیبہ
۳۱۴	ختم سورہ سبأ	۲۷۱	مساجد میں محراب کی جگہ کو مستقل کمرہ بنانے کا حکم
۳۱۵	سُورَةُ فَاطِرٍ ۲۲	۲۷۲	شرعیات اسلام میں جاندار کی تصویر بنانا حرام ہے
۳۱۶	اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اٰتٰیہُمْ مِّنْ رَّبِّہُمْ اٰیٰتٍ وَّزَیْدٌ	۲۷۳	حرمت تصویر پر ایک ماموشیہ اور اس کا جواب
۳۱۷	یٰۤاٰیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّہُمْ یَتَّقُوْنَ	۲۷۴	فوٹو کی تصویر بھی تصویر ہی ہے
۳۱۸	اللہ پر توکل سب مصائب سے نجات ہے	۲۷۵	شکر کی حقیقت اور اس کے احکام
۳۲۶	کلمات طیبہ کا اللہ کی طرف صعود اور اس کے اسباب و شرائط	۲۷۶	حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا عجیب واقعہ
۳۲۷	انسان کی عمر میں کمی یا زیادتی کا مطلب	۲۷۷	تعمیر بیت المقدس کا واقعہ
۳۲۸		۲۷۸	قوم سبا اور ان پر اللہ کے خاص انعامات
۳۲۹		۲۷۹	سبیل عزم اور سبب مآرب کا واقعہ
۳۳۰		۲۸۰	قوم سبا کا زمانہ
۳۳۱		۲۸۱	اصل عذاب آخرت کافروں ہی کے لئے ہے
۳۳۲		۲۸۲	قوم سبا کی بربادی
۳۳۳		۲۸۳	بحث و مناظرہ میں مخاطب کی رعایت
۳۳۴		۲۸۴	
۳۳۵		۲۸۵	
۳۳۶		۲۸۶	
۳۳۷		۲۸۷	
۳۳۸		۲۸۸	
۳۳۹		۲۸۹	
۳۴۰		۲۹۰	
۳۴۱		۲۹۱	
۳۴۲		۲۹۲	



صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۵۶	سورۃ یس ۲۲	۳۳۳	قیامت کے روز کوئی کسی کا بوجہ نہ اٹھائے گا
۳۶۲	سورۃ یس کے فضائل	۳۳۵	ربط آیات
۳۶۳	مسئلہ: کسی شخص کا نام یس رکھنا	۳۳۹	اختلاف الوان میں کمال قدرت
۳۶۵	جس طرح نیک و بد اعمال یکے جاتے ہیں اسی طرح اعمال کے اثرات و نتائج بھی۔	۳۳۹	انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء
۳۷۲	واضرِبْ لَهُمْ مَثَلًا آصْحَابَ الْقَرْيَةِ بستی کوئی ہے۔	۳۳۷	اصطلاح قرآن میں عالم کی تعریف اور یہ کہ حروف و کلمات کے معنی جاننے والا عالم نہیں کہلاتا
۳۷۳	اِذْ جَاءَ حَا الْمُؤْمِنُونَ میں اصطلاحی رسول مراد میں یا عام قاصد	۳۳۲	علماء کی چند علامات و صفات
۳۷۴	رَجُلٌ یَسْعٰی کی تحقیق اور اس کا قصہ	۳۳۳	اعمال صالحہ کی مثال تجارت سے
۳۷۵	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی بعثت کے پہلے ایمان لانیوالے تین حضرات کا ذکر	۳۳۳	قرآن کے وارث اللہ کے مقبول بندے
۳۷۷	مبلغین اسلام کے لئے اہم ہدایت	۳۳۵	اُمت محمدیہ خصوصاً اس کے علماء کی خاص فضیلت
۳۷۹	آیات ۳۳ تا ۴۴	۳۳۵	اُمت محمدیہ کی تین قسمیں
۳۸۳	نباتات کی پیداوار میں انسان کے عمل کو دخل نہیں	۳۳۶	ایک شبہ اور اس کا جواب
۳۸۳	انسانی غذا اور حیوانات کی غذا میں خاص فرق	۳۳۶	نیک صحبت کی تلاش و تمنا
۳۸۵	تَحْلِقُ الْاَزْوَاجِ کی تفسیر	۳۳۷	علماء اُمت محمدیہ کی عظیم فضیلت
۳۸۵	وَالشَّمْسُ شَرُیْ مُسْتَقَرَّةً اُنہا کی مفصل تحقیق	۳۳۹	مردوں کے لئے سونے کا زیور اور ریشمی کپڑا
۳۸۷	آفتاب کے زیر عرش سجدہ کرنے کی تحقیق	۳۳۹	جنت میں حلال دنیا میں حرام
۳۹۳	فائدہ: شمس و قمر متحرک ہیں	۳۵۰	دنیا غموں فکر وں کا گھر ہے اُن سے نجات جنت ہی میں ہوگی۔
۳۹۳	منازلِ قمر	۳۵۰	جنت کی چند خصوصیات
۳۹۳	قرآن میں ہوائی جہاز کا ذکر	۳۵۱	اَوَلَمْ نَعْمَرْکُمْ مَا یَبْتَذِرْہِ مِنْ یَبْرَکَ
۳۹۳	آیات ۳۵ تا ۴۷	۳۵۱	وہ کوئی عمر ہی جو انسان پر اللہ کی رحمت تمام کر دیتی ہے؟
۳۹۶	اللہ کا رزق بعض کو بالواسطہ ملنے کی حکمت	۳۵۳	ہُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خُلَیْفَہٗ فِی الْاَرْضِ
۳۹۷	آیات ۴۸ تا ۶۸	۳۵۴	عبرت و نصیحت
۴۰۲	قیامت میں اعضاء کے بولنے کی تحقیق	۳۵۷	لَا یَحِیُّ الْمَوْتِیْنَ اِلَّا بِاِیْمِہِ
		۳۵۷	برسی تدبیر اپنے ہی گلے کا بار بنتی ہے۔



صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۳۸	بری صحت سے بچنے کی تعلیم	۴۰۴	وَمَنْ يُعِزَّهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ کی تفسیر
۴۳۹	موت کے خاتمہ پر تعجب	۴۰۶	آیات ۶۹ تا ۷۵
"	آیات ۶۲ تا ۷۲	۴۰۷	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شعر و شاعری
۴۴۱	زقوم کی حقیقت		کی نفی کا مطلب
۴۴۲	كَانَ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ کا مطلب	۴۰۹	اشیاء پر ملکیت کی اصلی علت سرمایہ و محنت
"	آیات ۷۵ تا ۸۲		نہیں، بلکہ عطاۓ خداوندی ہے۔
۴۴۴	وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ	۴۱۰	آیات ۷۶ تا ۸۳
۴۴۵	آیات ۸۳ تا ۹۸	۴۱۲	جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا پر بحث
۴۴۸	ستاروں پر نگاہ ڈالنے کا مقصد	۴۱۳	ختم سورہ یس
۴۴۹	علم نجوم کی شرعی حیثیت		
۴۵۲	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیماری کا مطلب		سُورَةُ الصَّفَاتِ پ
۴۵۴	توریت کا شرعی حکم	۴۱۴	آیات ۱۰ تا ۱۰
"	آیات ۹۹ تا ۱۱۳	۴۱۵	مضامین سورت
۴۵۷	بیٹے کی فتر بانی کا واقعہ	۴۱۶	پہلا مضمون توحید
۴۵۹	دجی غیر متلو کا ثبوت	۴۱۷	نظم و ضبط دین میں مطلوب ہے
۴۶۲	ذبح حضرت اسماعیلؑ تھے یا حضرت اسحاقؑ	"	نماز میں صف بندی اور اس کی اہمیت
۴۶۷	آیات ۱۱۴ تا ۱۲۲	۴۱۸	فرشتوں کی قسم کھانے کی حکمت
۴۶۸	آیات ۱۲۳ تا ۱۳۲	"	حق تعالیٰ کا قسم کھانا اور اس کے احکام وغیرہ
۴۶۹	حضرت الیاسؑ کون تھے	۴۲۱	"شہاب ثاقب" پر اجمالی کلام
۴۷۰	بعثت کا زمانہ اور مقام	۴۲۲	مقصد اصلی
"	قوم کے ساتھ کشمکش	۴۲۳	آیات ۱۱ تا ۱۸
۴۷۲	حیات الیاس علیہ السلام کی تحقیق	۴۲۶	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا ثبوت
۴۷۴	غیر اللہ کی طرف تخلیق کی صفت منسوب کرنا	۴۲۷	آیات ۱۹ تا ۲۶
	جائز نہیں	۴۳۰	آیات ۲۷ تا ۴۰
۴۷۵	آیات ۱۳۳ تا ۱۳۸	۴۳۲	آیات ۴۱ تا ۶۱
۴۷۶	آیات ۱۳۹ تا ۱۴۸	۴۳۷	ایک جنتی اور اس کا کافر ملاقاتی



صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۰۴	بڑے لوگوں کو اپنی حاجت کی غلطیوں پر صبر کرنے کی تلقین	۴۷۸	قرعہ اندازی کا حکم
۵۰۴	کسی قسم کے دباؤ سے ہدیہ یا چندہ طلب کرنا	۴۷۹	تسبیح و استغفار سے مصائب دور ہوتے ہیں
	غضب کے حکم میں ہے	۴۸۰	مرزا قادیانی کی تلبیس کا جواب
۵۰۵	شرکت کے معاملات میں احتیاط کی ہدایت	۴۸۱	آیات ۱۴۹ تا ۱۶۶
۵۰۶	سجدۂ تلاوت نماز میں رکوع سے بھی ادا ہو جاتا ہے	۴۸۳	تفسیر آیات
"	سجدۂ تلاوت کے متعلق مسائل	۴۸۴	ہرٹ دھرمی کے وقت الزامی جواب
"	کسی کو غلطی پر متنبہ کرنے کے لئے طریقہ حکمت	۴۸۵	آیات ۱۶۷ تا ۱۷۹
۵۰۷	آیت ۲۶	۴۸۶	اللہ والوں کے غلبہ کا مطلب
"	حضرت داؤد علیہ السلام کو حکومت سیاست کے لئے چند بنیادی اصول کی ہدایت	۴۸۸	آیات ۱۸۰ تا ۱۸۲
۵۰۸	اسلامی ریاست کا بنیادی کام اقامتِ حق پر	۴۸۹	ختمِ سورت
"	عدلیہ اور انتظامیہ کا رشتہ		
۵۰۹	ذمہ داری کا پھردہ سپرد کرنے کے لئے سب سے پہلے قابلِ نظر انسان کا کردار ہے۔	۴۹۰	سورۃ ص ۲۳
"	آیات ۲۷ تا ۲۹	۴۹۱	آیات ۱ تا ۱۶
۵۱۰	آیات کی لطیف ترتیب	۴۹۳	واقعہ شانِ نزول
۵۱۱	آیات ۳۰ تا ۳۳	۴۹۵	آیات ۱۷ تا ۲۰
۵۱۲	حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ گھوڑوں کا معائنہ اور اس کی تشریح میں دو قول	۴۹۶	داؤد علیہ السلام کے لئے تسخیرِ جبال
۵۱۳	سورج کی واپسی کا قصہ ثابت نہیں	۴۹۷	نمازِ صبحی (اشراق، چاشت)
"	خدا کی یاد میں غفلت پر اپنے نفس کو سزا	"	زورِ بیان اور قوتِ خطابت بھی ایک نعمت ہے
"	ریاست کے کاموں کی نگرانی امیر کو خود کرنا چاہئے	۴۹۸	آیات ۲۱ تا ۲۵
۵۱۵	ایک عبادت کے معین وقت میں دوسری عبادت میں اشتغال غلطی ہے۔	۴۹۹	حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک امتحان
"	حضرت سلیمان ؑ کی ایک اور آزمائش	"	واقعہ امتحان میں مفسرین کے دو طریقے
		۵۰۰	واقعہ امتحان میں یہودیوں کی خرافات اور اس کی تردید
		۵۰۳	طبعی خوفِ نبوت یا ولایت کے منافی نہیں
		"	لوگوں کی بے قاعدگی پر حقیقتِ حال کے منکشف ہونے تک صبر کرنا چاہئے۔





صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۳۰	منکرین کے انکار کا پیغمبرانہ جواب	۵۷۸	سُورَةُ مُؤْمِنِينَ ۲۲
۶۳۱	کفار فرودِ اعمال کے مکلف ہیں یا نہیں ؟	۵۸۱	آیات ۱ تا ۹
۶۳۲	اس میں اختلاف فقہاء	=	سُورَةُ مُؤْمِنِينَ کی خصوصیات و فضائل
۶۳۳	آیات ۹ تا ۱۲	=	ہر بلا سے حفاظت
۶۳۴	آسمان و زمین کی تخلیق میں ترتیب اور ایامِ تخلیق کی تعیین	۵۸۲	دشمن سے حفاظت
۶۳۹	آیات ۱۳ تا ۲۵	=	ایک عجیب واقعہ
۶۴۵	انسان کے اعضاء و جوارح کی محشر میں گواہی	=	ان آیات کی تاثر اصلاحِ خلق میں
۶۴۶	آیات ۲۶ تا ۲۹	=	خاروق اعظم کی نصیحتِ مصلحین کے لئے
۶۴۷	تلاوتِ قرآن کے وقت خاموش ہو کر مستنا واجب ہے	۵۸۳	تنبیہ
۶۴۸	آیات ۳۰ تا ۳۶	۵۸۴	مسلمانوں کے سب سے زیادہ خیر خواہ فرشتے ہیں
۶۵۰	استقامت کے معنی	۵۸۵	آیات ۱۰ تا ۲۲
۶۵۲	جنت کی نعمتیں — احادیث	۵۹۱	آیات ۲۳ تا ۴۶
۶۵۳	آیات ۳۷ تا ۳۹	۵۹۹	مؤمن آلِ فرعون میں کون تھا
۶۵۴	اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں	۶۰۰	قیامت کو یوم التناد کہنے کی وجہ
۶۵۵	آیات ۴۰ تا ۴۶	۶۰۳	آیتِ قرآن سے عذابِ قبر کا ثبوت
۶۵۸	کفر کی ایک خاص قسم الحاد، تعریف اور احکام	۶۰۴	آیات ۴۷ تا ۶۰
۶۵۹	مُتَّوَلُّوْا لِّکُفْرِہِمْ کہنا چاہئے "اس کے بار" میں ایک مغالطہ کا ازالہ	۶۱۰	دعاء کی حقیقت اور شرطِ قبولیت
۶۶۰	اس زمانہ میں کفر و الحاد کی گرم بازاری	۶۱۱	فضائلِ دعا
۶۶۱	کتاب اللہ کی حفاظت اللہ کی طرف سے	۶۱۲	قبولیتِ دعا کا وعدہ
۶۶۳	آیات ۴۷ تا ۵۴	=	قبولیتِ دعا کی شرائط
		۶۱۳	آیات ۶۱ تا ۶۸
		۶۱۶	آیات ۶۹ تا ۷۸
		۶۲۰	آیات ۷۹ تا ۸۵
			سُورَةُ الْحَکَمِ سَجْدَہ ۲۳
	سُورَةُ الشُّوَرٰی ۲۵	۶۲۲	آیات ۱ تا ۸
۶۶۹	آیات ۱ تا ۱۲	۶۲۷	آنحضرتؐ کیسے کفار مکہ کی طرف پیشکش آپؐ کا جواب



صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۱۲	بشر سے اللہ تعالیٰ کے کلام کر نیکی تین صورتیں	۶۷۳	آیات ۱۵ تا ۱۳
	سُورَةُ الزَّخْرَفِ ۲۵	۶۷۷	حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے کفر و شرک نہیں تھا
۷۱۶	آیات ۱ تا ۲۵	۶۷۸	اقامت دین فرض اور اس میں تفرق حرام ہے
۷۲۳	سفر کی دعائیں	۶۷۹	ائمہ مجتہدین کے فردعی اختلافات تصدیق
۷۲۴	آیات ۲۶ تا ۳۰		ممنوع میں داخل نہیں
۷۲۵	ظن سورہ سے بچنے کے لئے اظہار برائت	۶۸۰	آیت کے دس احکام
۷۲۶	آیات ۳۱ تا ۳۲	۶۸۲	آیات ۱۶ تا ۲۰
۷۲۷	شان نزول	۶۸۵	شکر نعمت (حاشیہ) قلب پر مرض کا حملہ اور اس سے افاقہ
۷۲۸	تقسیم معیشت کا قدرتی نظام	۶۸۷	رزق کی تنگی سے حفاظت کے لئے ایک مجرب عمل
۷۲۹	معاشی مساوات کی حقیقت		آیات ۲۱ تا ۲۳
۷۳۲	اسلامی مساوات کا مطلب	۶۹۱	آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و محبت کا مسئلہ
۷۳۳	آیات ۳۳ تا ۳۵	۶۹۲	آیات ۲۴ تا ۲۶
۷۳۴	مال و دولت کی زیادتی فضیلت کا سبب نہیں ہے	۶۹۵	توبہ کی حقیقت
۷۳۵	آیات ۳۶ تا ۴۵		آیات ۲۷ تا ۳۵
۷۳۷	یاد خدا سے اعراض بُری صحبت کا اثر ہے	۶۹۸	شان نزول اور ربط
۷۳۸	نیک شہرت بھی دین میں پسندیدہ ہے		دنیا میں دولت کی فراوانی فساد کا سبب ہے
۷۳۹	انبیاء کے صحیفوں میں توحید کی تعلیم	۷۰۰	جنت اور دنیا کا فرق
	آیات ۴۶ تا ۶۵	۷۰۱	فائدہ
۷۴۵	وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْثَمٍ مَثَلًا کی شان نزول میں	۷۰۲	آیات ۳۶ تا ۴۳
	متعدد روایات	۷۰۳	نعم آخرت کے حصول کے لئے شرائط
۷۴۷	آیات ۶۶ تا ۷۷	۷۰۶	مشورہ کی اہمیت اور اس کا طریقہ
۷۴۹	دوستی درحقیقت وہی ہے جو اللہ کے لئے ہو	۷۰۷	عفو و انتقام میں معتدل فیصلہ
۷۵۰	آیات ۷۸ تا ۸۹	۷۰۸	آیات ۴۴ تا ۵۰
۷۵۲	وَقُلْ سَلَامٌ	۷۱۲	آیات ۵۱ تا ۵۳

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۸۵	آیات ۲۳ تا ۲۶		سُورَةُ الدُّخَانِ پ
۷۸۸	دہریہ زمانہ کو برا کہنے کی ممانعت	۷۵۵	آیات ۱ تا ۹
*	آیات ۲۷ تا ۳۷	۷۵۶	فصلیت سورۃ دخان
	سُورَةُ الْاِحْقَافِ پ	۷۵۸	آیات ۱۰ تا ۱۶
۷۹۱	آیات ۱۰ تا ۱۰	۷۶۰	دخان سے کیا مراد ہے
۷۹۶	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کے متعلق تقاضے ادب	۷۶۲	آیات ۱۷ تا ۲۲
۷۹۷	آیات ۱۱ تا ۲۰	۷۶۷	زمین و آسمان کا ردنا
۸۰۳	ماں کا حق باپ سے زیادہ ہے	۷۶۸	آیات ۲۳ تا ۳۲
۸۰۵	اکثر مذمتِ حمل اور اکثر مذمتِ رضاع میں فقہاء اُمت کا اختلاف۔	۷۷۰	قومِ شیخ کا واقعہ
۸۰۹	لذا یذ دنیا اور تنعم سے پرہیز کی ترغیب	۷۷۱	آیات ۳۳ تا ۵۹
*	آیات ۲۱ تا ۳۲		سُورَةُ الْجَاثِيَةِ پ
۸۱۲	وَ اِذْ صَرَفْنَا اَبْنٰكَ لِفِرَآئِمٍ اِلٰی جَنّٰتِ	۷۷۵	آیات ۱ تا ۱۵
	کے ایمان لانے کا واقعہ	۷۸۰	شانِ نزول
۸۱۵	آیات ۳۳ تا ۳۵	۷۸۱	آیات ۱۶ تا ۲۰
۸۱۶	اَوَّلُوْا الْعَزِيْمَ مِنَ الرُّسُلِ	۷۸۳	پچھلی اُمتوں کی شریعتوں کا حکم ہمارے لئے
	مَمْت	*	آیات ۲۱ تا ۲۲
		۷۸۴	عالمِ آخرت اور اس میں جہنم، سزا و عذاب
			سروری ہے



# سُورَةُ لُقْمَانَ





# سُورَةُ لُقْمٰنٍ

سُورَةُ لُقْمٰنٍ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اَرْبَعٌ وَتَلْسُوْنَ اَيُّهَا الَّذِيْنَ ارْبَعٌ رُّكُوْعًا

سورۃ لقمن مکہ میں نازل ہوئی اس کی چونتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الْمَدَّۃُ ۱ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ ۲ هُدًى وَرَحْمَةً

یہ آیتیں ہیں پکی کتاب کی ، ہدایت ہے اور مہربانی

لِلْمُحْسِنِیْنَ ۳ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

نیکی کرنے والوں کیلئے ، جو کہ قائم رکھتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوقِنُوْنَ ۴ اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًى مِّنْ

اور وہ ہیں جو آخرت پر ان کو یقین ہے ۔ انھوں نے پائی ہر راہ اپنے رب کی

رَبِّهِمْ ۵ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۶ وَمِنَ النَّاسِ مَن

طرف سے اور وہی مراد کو پہنچے ، اور ایک وہ لوگ ہیں کہ

یَسْتَرِیْ لَهٗوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۷

خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے تاکہ بچلائیں اللہ کی راہ سے بن سمجھے ،

وَلَا یَخِزُّنَ هَآهُنَا ۸ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۹ وَاِذَا

اور ٹھہرائیں اس کو مہنسی وہ جو ہیں ان کو ذلت کا عذاب ہے ، اور جب

تَتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتِنَا وَّلٰی مُسْتَكْبِرًا ۚ کَانَ لَّمْ یَسْمَعْهَا کَانَ فِیْ

سنائے اس کو ہماری آیتیں پڑھ دے جائے غور سے گویا ان کو سنایا ہی نہیں گویا اس کے دونوں

اُذُنَیْہِ وَقَرَّ اَجْرٌ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابِ اِلَیْمٍ ۙ اِنَّ الَّذِیْنَ

کان ہرے ہیں سو خوش خبری دے اس کو دردناک عذاب کی۔ جو لوگ یقین

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمْ جَنَّٰتُ النَّعِیْمِ ۙ خٰلِدِیْنَ

لائے اور کئے بھلے کام اُن کے واسطے ہیں نعمت کے باغ ہمیشہ رہا کریں

فِیْہَا وَعَدَ اللّٰہُ حَقًّا ۚ وَہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۙ

ان میں وعدہ ہو چکا اللہ کا سچا، اور وہ زبردست ہے حکمتوں والا

## مُحَلَّصَةُ تَفْسِیْرِ

الکَمَر (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (جو اس سورۃ یا قرآن میں مذکور ہیں)

آیتیں ہیں ایک پر حکمت کتاب (یعنی قرآن) کی جو کہ ہدایت اور رحمت (کا سبب) ہے،

نیک کاروں کے لئے جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ لوگ آخرت

کا پورا یقین رکھتے ہیں (سو) یہ لوگ (اس قرآن کے اعتقاد اور عمل کی بدولت) اپنے

رب کے سیدھے رستہ پر ہیں اور یہی لوگ (اس ہدایت کی بدولت) فلاح پانے والے

ہیں پس قرآن اس طرح اُن کے لئے ہدایت اور رحمت کا جس کا اثر فلاح ہی سبب

ہو گیا، پس بعض آدمی تو ایسے ہیں جیسا بیان کیا گیا، اور (برخلاف ان کے) بعض آدمی

(ایسا بھی) ہے جو (قرآن سے اعراض کر کے) ان باتوں کا خیریدار بنتا ہے (یعنی ایسی باتیں

اختیار کرتا ہے) جو (اللہ سے) غافل کرنے والی ہیں (سو اول تو یہو کا اختیار کرنا جب کہ اس

کے ساتھ آیات الہیہ سے اعراض بھی ہو خود ہی کفر اور ضلال ہے، پھر خاص کر جب کہ اس

کو اس غرض سے اختیار کیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ سے دوسروں کو بھی (اللہ کی

راہ (یعنی دین حق سے) بے سمجھے بوجھے گمراہ کرے اور اسی گمراہ کرنے کے ساتھ اس

(راہ حق) کی ہنسی اڑا دے (تاکہ دوسروں کے دل سے بالکل اس کی وقعت اور تاثیر

بکل جا دے، تب تو کفر بر کفر اور ضلال کے ساتھ اضلال بھی ہے اور) ایسے لوگوں کیلئے

(آخرت میں) ذلت کا عذاب (ہونے والا) ہے جیسا کہ ان کے اصرار کے لئے فلاح کا



ہونا معلوم ہوا، اور اس شخص مذکور کے اعراض کی یہ حالت ہے کہ جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ شخص تکبر کرتا ہوا ایسی بے التفاتی سے (منہ موڑ لیتا ہو جیسے اس نے سنا ہی نہیں، جیسے اس کے کانوں میں ثقل ہے (یعنی جیسے بہرا ہے) سو اس شخص کو ایک دردناک عذاب کی خبر سناد دیجئے (یہ تو اعراض کرنے والے کی سزا کا بیان ہوا، آگے اہل ہڈی کی جزا کا بیان ہو جو کہ فلاح موعود کی تفصیل ہے، یعنی) البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کے لئے عیش کی جنتیں ہیں جنہیں ہمیشہ رہیں گے یہ اللہ نے سچا وعدہ فرمایا ہے اور وہ زبردست حکمت والا ہے پس کمال قدرت سے وعدہ اور وعید کو واقع کر سکتا ہے اور حکمت سے اس کو حسب وعدہ واقع کرے گا) :

## معارف و مسائل

يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ، اس آیت میں زکوٰۃ کا حکم ہے، حالانکہ آیت مکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل زکوٰۃ کا حکم مکہ معظمہ ہی میں ہجرت سے پہلے آچکا تھا۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ زکوٰۃ کا حکم ہجرت کے دوسرے سال میں نافذ ہوا اس سے مراد نصابوں کا تقرر اور مقدار واجب کی تفصیلات اور حکومت اسلامیہ کی طرف سے اس کی وصول یابی اور مصرف پر خرچ کرنے کا انتظام ہے، یہ ہجرت کے دوسرے سال میں ہوا ہے۔

ابن کثیر نے سورۃ مزمل کی آیت اَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ کے تحت میں یہی تحقیق فرمائی ہے، کیونکہ سورۃ مزمل تو مکی سورتوں میں بالکل ابتداءً نزولِ قرآن کے زمانے میں نازل ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن کریم کی آیات میں اکثر صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے، اس کی فرضیت بھی ساتھ ساتھ ہی ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لَفْظِ اشْتَرَا کے لغوی معنی خریدنے کے ہیں، اور بعض اوقات ایک کام کے بدلے دوسرے کام کو اختیار کرنے کے لئے بھی لفظ اشترَا استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے الَّذِينَ اشْتَرَوْا الضَّلَالَةَ بِالْمُهْدَىٰ وَغَيْرِهِ آیات قرآن میں یہی معنی اشترَا کے مراد ہیں۔

اس آیت کا شانِ نزول ایک خاص واقعہ ہے کہ نصر بن حارث مشرکین مکہ میں ایک بڑا تاجر تھا، اور تجارت کے لئے مختلف ملکوں کا سفر کرتا تھا۔ وہ ملک فارس سے شاہانِ عجم کسریٰ وغیرہ کے تاریخی قصے خرید کر لایا اور مکہ کے مشرکین سے کہا کہ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو قوم عاد و ثمود وغیرہ کے واقعات سناتے ہیں، میں تمہیں ان کے بہتر رستم اور اسفند یار اور دوسرے شاہانِ فارس کے قصے سناتا ہوں۔ یہ لوگ اس کے قصہ کو شوق و رغبت سے سننے لگے۔ کیونکہ ان میں کوئی تعلیم تو تھی نہیں جس پر عمل کرنے کی محنت اٹھانی پڑے صرف لذیذ قسم کی کہانیاں تھیں۔ ان کی وجہ سے بہت سے مشرکین جو اس سے پہلے کلامِ الہی کے اعجاز اور یکسانی کی وجہ سے اس کو سننے کی رغبت رکھتے اور چوری چوری سنا بھی کرتے تھے، ان لوگوں کو قرآن سے اعراض کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ذکرہ فی الروح عن سبب النزول للواحدی ومقابل وذكر نحوه فی الدر المنثور برایۃ البیہقی اور درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مذکور الصدر تاجر باہر سے ایک گکانے والی کنیز (لونڈی) خرید کر لایا تھا اور اس کے ذریعہ اس نے لوگوں کو قرآن سننے سے روکنے کی یہ صورت نکالی کہ جو لوگ قرآن سننے کا ارادہ کریں اپنی اس کنیز سے ان کو گانا سنو آتا تھا اور کہتا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو قرآن سنا کر کہتے ہیں کہ نماز پڑھو روزہ رکھو اور اپنی جان و دھن میں تکلیف ہی تکلیف ہے، آؤ تم یہ گانا سنو اور جشنِ طرب مناؤ۔

قرآن کریم کی مذکورہ آیت اسی واقعہ پر نازل ہوئی، اور اس میں اشتراء لہو الحدیث سے۔ وہ قصے کہانیاں شاہانِ عجم کی یا یہ لونڈی گکانے والی مراد ہے۔ واقعہ نزول کے اعتبار سے لفظ اشتراء اپنے حقیقی معنی میں خریدنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور لہو الحدیث کے جو عام معنی آگے بیان ہو رہے ہیں ان کے اعتبار سے لفظ اشتراء بھی اس جگہ عام ہے۔ یعنی ایک کام کے بدلے میں دوسرے کو اختیار کرنا، اس میں سامان لہو کی خریداری بھی داخل ہے۔

اور لہو الحدیث میں لفظ حدیث تو باتوں اور قصے کہانیوں کے معنی میں ہے اور لہو کے لفظی معنی غفلت میں پڑنے کے ہیں۔ جو چیزیں انسان کو ضروری کاموں سے غفلت میں ڈالیں وہ لہو کہلاتی ہیں، اور بعض اوقات ایسے کاموں کو بھی لہو کہا جاتا ہے جن کا کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو، محض وقت گزاری کا مشغلہ یا دل بہلانے کا سامان ہو۔ آیت مذکورہ میں لہو الحدیث کے معنی اور تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ ابن عباسؓ و جابر رضی اللہ عنہم کی ایک روایت میں اس کی تفسیر گانے بجانے سے کی گئی ہے (رواہ الحاكم وصحیح البیہقی فی الشعب وغیرہ) اور جبہ و صحابہ و تابعین اور عامہ مفسرین کے نزدیک لہو الحدیث عام ہے تمام



ان چیزوں کے لئے جو انسان کو اللہ کی عبادت اور یاد سے غفلت میں ڈالے، اس میں غنا، مزامیر بھی داخل ہے اور یہودہ قصے کہانیاں بھی۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب الآداب المفرد میں اور بیہقی نے اپنی سنن میں لُہو الحدیث کی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ اس میں فرمایا ہے کہ لُہو الحدیث لُہو الغنا وَاَشْبَاهُہُ، یعنی لُہو الحدیث سے مراد گانا اور اس کے مشابہ دوسری چیزیں ہیں (یعنی جو اللہ کی عبادت سے غافل کر دیں) اور سنن بیہقی میں ہے کہ اشتراک لُہو الحدیث سے مراد گانے بجانے والے مرد یا عورت کو خریدنا یا اس کے امثال ایسی یہودہ چیزوں کو خریدنا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل کریں۔ ابن جریر نے بھی اسی عام معنی کو اختیار فرمایا ہے (روح ملخصاً) اور ترمذی کی ایک روایت سے بھی یہی عموم ثابت ہوتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ گانے والی لونڈیوں کی تجارت نہ کرو، اور پھر فرمایا فی مثل ہذا انزلت ہذہ الذیۃ و من الناس من یشترئ الخ لہو ولعب اور اس کے ان احکام کی پوری تفصیل قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ احقر کے سامان کے شرعی احکام مستقل رسالہ السعی الحثیث فی تفسیر لُہو الحدیث میں مذکور ہے۔

جس میں غنا و مزامیر پر بھی مفصل کلام قرآن و حدیث سے پھر فقہاء امت اور صوفیائے کرام کے اقوال سے مذکور ہے، یہ رسالہ بزبان عربی احکام القرآن حزب خامس میں شائع ہو چکا ہے۔ اہل علم اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں، عوام کے لئے اس کا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:-

پہلی بات قابلِ نظریہ ہے کہ قرآن کریم نے جتنے مواقع میں لُہو یا لعب کا ذکر کیا ہے وہ مذمت اور بُرائی ہی کے مواقع ہیں، جس کا ادنیٰ درجہ کراہت ہو (روح المعانی و کشاف) اور آیت مذکورہ لُہو کی مذمت میں بالکل واضح اور صریح ہے۔ اور مستدرک حاکم کتاب الجہاد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”یعنی دنیا کا ہر لُہو (کھیل) باطل ہو مگر تین چیزیں ایک یہ کہ تم بیرونِ گھر سے کھیلو دوسرے اپنے گھوٹے کو سدھانے کے لئے کھیلو، تیسرے اپنی بی بی کے ساتھ کھیل کرو“

كُلُّ شَيْءٍ مِّنْ لَّهٗوٍ اِلَّا ثَلَاثَةٌ اِنْتِصَالُكَ بِقَوْمِكَ وَتَاْدِيْبُكَ لِقَوْمِكَ وَ مَلَاْعِبُكَ لَا هِلَاكَ فَاَنْهَىٰ مِّنَ الْحَقِّ

حاکم نے اس حدیث کو صحیح علی شرط مسلم کہا ہے، مگر ذہبی وغیرہ نے اس کی سند کے متصل

السند ہونے کو تسلیم نہیں کیا بلکہ حدیث مرسل کہا ہے، مگر جہور محدثین کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے۔

اس حدیث میں ہر لہو کو باطل قرار دیا ہے اور جن تین چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے درحقیقت وہ لہو میں داخل ہی نہیں، کیونکہ لہو تو اُس کام کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی دینی و دنیوی فائدہ معتد بہا نہ ہو۔ اور یہ تینوں چیزیں مفید کام ہیں جن سے بہت دینی اور دنیوی فوائد وابستہ ہیں۔ تیرا انداز ہی اور گھوڑے کو سدھانا تو جہاد کی تیاری میں داخل ہیں، اور بیوی کے ساتھ ملاعت توالد و تناسل کے مقصد کی تکمیل ہے۔ ان کو صرف صورت اور ظاہر کے اعتبار سے لہو کہہ دیا گیا ہے وہ حقیقت کے اعتبار سے لہو میں داخل ہی نہیں۔ اسی طرح ان تین چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے کام ہیں جن سے دینی یا دنیوی فوائد متعلق ہیں اور صورت کے اعتبار سے وہ لہو (کھیل) سمجھے جاتے ہیں ان کو بھی دوسری روایات حدیث میں جائز بلکہ بعض کو مستحسن قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل آگے آجائی۔

**خلاصہ یہ ہے کہ جو کام حقیقتہً لہو ہوں، یعنی جن میں نہ کوئی دینی فائدہ ہو نہ دنیوی، وہ سب کے سب مذموم اور مکروہ تو ضرور ہی ہیں، پھر ان میں تفصیل ہے۔ بعض تو کفر کی حد تک پہنچ جاتے ہیں، بعض حرام صریح ہیں اور کم سے کم درجہ مکروہ تنزیہی، یعنی خلاف اولیٰ ہونے کا ہی، جس سے کوئی لہو جو درحقیقت لہو ہو مستثنیٰ نہیں۔ اور جن کھیلوں کو احادیث میں مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ حقیقتہً لہو میں داخل ہی نہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں خود اس کی تصریح موجود ہے۔ ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ میں حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت کتاب الجہاد میں ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں لَیْسَ مِنَ اللّٰہِ وَثَلَاثٌ تَاْدِیْبُ الرَّجُلِ قَرَسَهُ وَ مَلَا عِبْتَهُ اَہْلَهُ وَ رَمٰیَہُ بِقَوْسِیْہِ وَ نَبَلٰہُ الْحَدِیْثَ (نصب الراية ص ۳۷۲، ج ۲) اس حدیث نے خود یہ تصریح کر دی کہ یہ تین چیزیں جو مستثنیٰ کی گئی ہیں درحقیقت وہ لہو میں داخل ہی نہیں، اور جو حقیقتہً لہو ہے وہ باطل اور مذموم ہے، آگے اس کے مذموم ہونے کے مختلف درجات ہیں۔**

۱۔ جو کھیل دین سے گمراہ ہونے یا دوسروں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بنے وہ کفر ہے۔ جیسا کہ آیت مذکورہ صدر و مین الناس من یشترک لیہو و الحدیث میں اس کا کفر و ضلال ہونا بیان فرمایا گیا، اور اس کی سزا عذاب ہمیں قرار دی ہے جو کفار کی سزا ہے کیونکہ یہ آیت نصر بن حارث کے جس واقعہ پر نازل ہوئی ہے اس میں اس لہو کو اس نے اسلام کے خلاف لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ اس لئے یہ لہو حرام



ہونے کے ساتھ کفر تک پہنچ گیا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی لہو لوگوں کو اسلامی عقائد سے تو گمراہ نہیں کرتا مگر ان کو کسی حرام اور معصیت میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ کفر تو نہیں مگر حرام اور سخت گناہ ہو جیسو وہ تمام کھیل جن میں قمار اور جوا ہو یعنی ہار جیت پر مال کا لین دین ہو، یا جو انسان کو ادب و فرائض نماز روزہ وغیرہ سے مانع ہوں۔

فحش اور فضول ناول یا فحش اشعار اور اس زمانے میں بیشتر نوجوان فحش ناول یا جرائم پیشہ لوگوں کے اہل باطل کی کتابیں بھی دیکھنا نا جائز ہیں حالات پر مشتمل قصے یا فحش اشعار دیکھنے کے عادی ہیں۔ یہ سب چیزیں اسی قسم کے حرام میں داخل ہیں۔ اسی طرح گمراہ اہل باطل کے خیالات کا مطالعہ بھی عوام کے لئے گمراہی کا سبب ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، راسخ العلم علماء ان کے جواب کے لئے دیکھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

۳۔ اور جن کھیلوں میں نہ کفر ہے نہ کوئی کھلی ہوئی معصیت، وہ مکروہ ہیں کہ ایک بے فائدہ کام میں اپنی توانائی اور وقت کو ضائع کرنا ہے۔

کھیلوں کے سامان مذکورہ تفصیل سے کھیلوں کے سامان کی خرید و فروخت کا حکم بھی معلوم کی خرید و فروخت ہو گیا کہ جو سامان کفر و ضلال یا حرام و معصیت ہی کے کھیلوں میں استعمال ہوتا ہے اس کی تجارت اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ اور جو مکروہ میں استعمال ہوتا ہے اس کی تجارت بھی مکروہ ہے۔ اور جو سامان جائز اور مستثنیٰ کھیلوں میں استعمال ہوتا ہے اس کی تجارت بھی جائز ہے۔ اور جن سامان کو جائز اور ناجائز دونوں طرح کے کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے اس کی تجارت جائز ہے۔

مباح اور جائز کھیل | ادھر یہ بات تفصیل سے آچکی ہے کہ مذموم اور ممنوع وہ نہ ہو اور کھیل ہے جس میں کوئی دینی دنیوی فائدہ نہیں۔ جو کھیل بدن کی ورزش، صحت اور تندرستی باقی رکھنے کے لئے یا کسی دوسری دینی و دنیوی ضرورت کے لئے یا کم از کم طبیعت کا تنگن دور کرنے کے لئے ہوں اور ان میں غلو نہ کیا جائے کہ انہی کو مشغلہ بنا لیا جائے اور ضروری کاموں میں ان سے حرج پڑنے لگے تو ایسے کھیل شرعاً مباح اور دینی ضرورت کی نیست سے ہوں تو ثواب بھی ہیں۔

مذکورہ حدیث میں تین کھیلوں کو ممانعت سے مستثنیٰ کرنا اور پر گزر چکا ہے۔ تیر اندازی گھوڑے کی سواری، اپنے اہل کے ساتھ ملاعبت۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک مرفوع حدیث میں ہے: خیر لہوالمو من السباحۃ وخیر لہوالمراۃ

المغزل (جامع صغیر بر مزاج بن عدی باسناد ضعیف) یعنی مؤمن کا اچھا کھیل تیرا کی ہے اور عورت کا اچھا کھیل چرخہ ہے۔

صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انصارِ مدینہ میں ایک صاحبِ دوڑ میں بڑے ماہر تھے، کوئی ان سے سبقت نہ لے جاسکتا تھا، انھوں نے ایک روز اعلان کیا کہ کوئی ہے جو میرے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کرے؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ میں مقابلہ کروں، آپ نے اجازت دیدی تو میں مقابلہ میں آگے بڑھ گیا، اس سے معلوم ہوا کہ پیادہ دوڑ کی مشق کرنا بھی جائز ہے۔

ایک مشہور پہلوان رکابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی ٹھہرائی تو آپ نے اس کو کشتی میں پچھاڑ دیا (ابوداؤد فی المراسیل)

جلشہ کے کچھ نوجوان مدینہ طیبہ میں فن سپہ گری کی مشق کرنے کے لئے نیزوں وغیرہ سے کھیلتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کھیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنی لپٹ کے پیچھے کھڑا کر کے دکھلایا اور ان لوگوں کو فرمایا کہ اَلْهَوَاۗءُ وَالْعَبَوَاتُ ”یعنی کھیل کود کرتے رہو“ (رواہ ابیہقی فی الشعب کذا فی الکنز من باب الہو) اور بعض روایات میں اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی آئے ہیں قَاتِيۡ اَکُوۡہُ اَنْ یُّرۡیَ فِیۡ دِیۡنِکُمۡ غِلَظَۃٌ ”یعنی میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ تمھارے دین میں خشکی اور شدت دیکھی جائے“

اسی طرح بعض صحابہ کرام سے منقول ہے کہ جب وہ قرآن و حدیث کے مشاغل میں تھک جاتے تو بعض اوقات عرب کے اشعار یا تاریخی واقعات سے دل بہلاتے تھے (ذکرہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما فی کف الرعاع)

ایک حدیث میں ارشاد ہے: رَوَّحُوا الْقُلُوبَ سَاعَةً فَسَاعَةً اُخْرِجُوهُ اَبُو دَاوُدَ فی مساعیلہ عن ابن شہاب ہر سَلَا، ”یعنی تم اپنے قلوب کو کبھی کبھی آرام دیا کرو“ جس سے قلب و دماغ کی تفریح اور اس کے لئے کچھ وقت نکالنے کا جواز ثابت ہوا۔

شرط ان سب چیزوں میں یہ ہے کہ نیت ان مقاصدِ صحیحہ کی ہو جو ان کھیلوں میں پائے جاتے ہیں، کھیل برائے کھیل مقصد نہ ہو اور وہ بھی بقدر ضرورت ہو، اس میں توسع اور غلو نہ ہو۔ اور وجہ ان سب کھیلوں کے جواز کی وہی ہے کہ درحقیقت یہ جب اپنی حد کے اندر ہوں تو لہو کی تعریف میں داخل ہی نہیں۔

بعض کھیل جو صراحۃً اس کے ساتھ بعض کھیل ایسے بھی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر منع فرما دیا ہے، اگرچہ ان میں کچھ فوائد ممنوع نہ گئے



بھی بتلائے جاویں مثلاً، شطرنج، چوسر وغیرہ اگر ان کے ساتھ ہار جیت اور مال کا لین دین ہو تو یہ حرام ہیں اور یہ نہ ہو محض دل بہلانے کے لئے کھیلے جائیں تب بھی حدیث میں ان کو منع فرمایا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نرد شیر یعنی چوسر کھیلتا ہے وہ ایسا ہے جیسے اس نے اپنے ہاتھ خنزیر کے خون میں رنگے ہوں۔ اسی طرح ایک روایت میں شطرنج کھیلنے والے پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں (عقیلی فی الضعفاء عن ابی ہریرۃ کذا فی نصب الرایہ)

اسی طرح کبوتر بازی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناجائز قرار دیا (ابوداؤد فی المراسیل عن شرح کذا فی الکتر) ان کی ممانعت کی ظاہری وجہ یہ ہے کہ عموماً ان میں مشغولیت ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو ضروری کام یہاں تک کہ نماز اور دوسری عبادت سے بھی غافل کر دیتی ہے۔

غناء و مزامیر کے احکام | آیت مذکورہ میں چند صحابہ کرام نے توہو الخدیث کی تفسیر گانے بجانے سے کی ہے۔ اور دوسرے حضرات نے اگرچہ تفسیر عام قرار دی ہے، ہر ایسے کھیل کو جو اللہ سے غافل کرے کہو الخدیث فرمایا ہے، مگر ان کے نزدیک بھی گانا بجانا اس میں داخل ہے۔ اور قرآن کریم کی ایک دوسری آیت لَا يَشْهَدُونَ الشُّرُوكَ میں امام ابو حنیفہ اور مجاہد اور محمد بن الحنفیہ وغیرہ نے زور کی تفسیر غناء و گانے بجانے سے کی ہے۔

ادرا بوداؤد اور ابن ماجہ نے سنن میں اور ابن حبان نے اپنی کتاب صحیح میں حضرت ابومالک اشعریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”میری امت کے کچھ لوگ شراب کو اس کا نام بدل کر پییں گے ان کے سامنے معافیت و مزامیر کے ساتھ عورتوں کا گانا ہوگا اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں خسف کر دے گا، اور بعض کی صورتیں مسخ کر کے ہندراور سور بنا دے گا“

لَيْشَرِبْنَ نَاسٌ مِّنْ أُمَّتِي الْخَمْرَ  
يُسَمُّونَهَا بَغْيًا وَسَمِهَا  
يُعْزَفُ عَلَى رُءُوسِهِمْ  
بِالسَّعَارِيفِ وَالْمَقْنِيَّاتِ،  
يَخْشِفُ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ  
وَيَجْعَلُ اللَّهُ مِنْهُمُ الْغُرْدَةَ  
وَالْأَخْزَارَ

اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب اور خمرے اور طبلہ و سارنگی کو حرام کیا ہے، اور فرمایا کہ ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے۔ (رواہ الامام احمد و ابوداؤد و ابن حبان)

روى عن ابى هريرة قال قال  
رسول الله صلى الله عليه وسلم  
اذا اتخذ الفصح دولة والامانة  
مغضبا والزكاة مغرما وتعلم  
لغير الدين والطاع الرجل امراته  
وعق امته وادنى صديقه واقصى  
اباه وظهرت الاصوات فى المساجد  
وساد القبيلة فاسقمهم وكان زعيم  
القوم اسد لهم واكرم الرجل  
مخافة شره وظهرت القيان و  
المعازف وشربت الخمر ولعن  
اخرهن الامة اولها فليترقبوا  
عند ذلك ريجا حمراء وزلزلة  
وخسفا ومسحا وقرنا وايات  
تتابع كنظام بال قطع سلكه  
فتتابع بعضه بعضا رواه الترمذى  
وقال هذا حديث حسن غريب

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مال غنیمت کو  
شخصی دولت بنالیا جائے اور جب لوگوں کی امانت  
کو مال غنیمت سمجھ لیا جائے اور جب زکوٰۃ کو ایک  
تاوان سمجھا جانے لگے اور جب علم دین کو دنیا  
طلبی کے لئے سیکھا جانے لگے اور جب مرد اپنی بیوی  
کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، اور  
دوست کو اپنے قریب کرے اور باپ کو دور  
رکھے، اور مسجدوں میں شور و غل ہونے لگے اور  
قبیلہ کا سرداران کا فاسق بدکار بن جائے اور  
قوم کا سرداران میں ارڈل بدترین آدمی ہو جائے،  
اور جب شریر آدمیوں کی عزت ان کے شر کے خوف  
سے کی جانے لگے، اور جب گانے والی عورتوں  
اور باجوں گاجوں کا رواج عام ہو جائے، اور  
جب شرابی پی جانے لگیں اور اس امت  
کے آخری لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کرنے لگیں  
تو اس وقت تم انتظار کرو ایک سرخ آندھی کا

اور زلزلہ کا اور زمین خسف ہو جانے اور صورتیں مسخ ہو جانے کا اور قیامت کی ایسی نشانیوں کا جو  
یکے بعد دیگرے اس طرح آئیں گی جیسے کسی ہار کی لڑی ٹوٹ جائے اور اس کے دانے بیک وقت  
بکھر جاتے ہیں۔

اس حدیث کے الفاظ کو بار بار پڑھتے اور دیکھتے کہ اس وقت  
تنبیہ ضروری کی دنیا کا پورا پورا نقشہ ہے، اور وہ گناہ جو مسلمانوں میں عام  
ہو چکے ہیں اور بڑھتے جا رہے ہیں، ان کی خبر جو وہ سو برس پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
نے دے دی ہے۔ مسلمانوں کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ ایسے حالات سے باخبر رہیں،  
اور گناہوں سے بچنے بچانے کا پورا اہتمام کریں۔ ورنہ جب یہ گناہ عام ہو جائیں گے تو  
ایسے گناہ کرنے والوں پر آسمانی عذاب نازل ہوں گے، اور پھر قیامت کی آخری علامات  
سامنے آجائیں گی۔ ان گناہوں میں سے عورتوں کا گانا اور گانے بجانے کے آلات



طبلہ سازنگی وغیرہ بھی ہیں، اس جگہ اس روایت کو اسی مناسبت سے نقل کیا گیا ہے۔  
اس کے علاوہ اور بہت سی مستند احادیث ہیں جن میں گانے بجانے کو حرام و ناجائز  
فرمایا ہے اور اس پر وعید شدید ہے۔ ان تمام روایات کو احقر نے اپنے رسالہ کشف الغنّاء  
عن وصف الغنّاء میں لکھ دیا ہے۔ یہ رسالہ بھی بزبان عربی احکام القرآن حزب خامس میں  
شائع ہو چکا ہے، یہاں ان میں سے چند نقل کی گئی ہیں۔

خوش آوازی کے ساتھ بغیر مزامیر کے | اس کے مقابل بعض روایات سے غنا یعنی گانے کا جواز  
مفید اشعار کا پڑھنا ممنوع نہیں بھی معلوم ہوتا ہے، یہ روایات بھی رسالہ مذکورہ میں جمع  
کر دی گئی ہیں۔ تطبیق ان دونوں میں اس طرح ہے کہ جو گانا اجنبی عورت کا ہو یا اس کے ساتھ  
طبلہ سازنگی وغیرہ مزامیر ہوں وہ حرام ہے۔ جیسا کہ مذکورہ صدر آیات قرآن اور احادیث  
رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا۔ اور اگر محض خوش آوازی کے ساتھ کچھ اشعار پڑھو  
جائیں اور پڑھنے والی عورت یا مرد نہ ہوں، اور اشعار کے مضامین بھی فحش یا کسی دوسرے  
گناہ پر مشتمل نہ ہوں تو جائز ہے۔

بعض صوفیائے کرام سے جو سماع غنا منقول ہے وہ اسی قسم کے جائز غنا پر  
محمول ہے۔ کیونکہ ان کا اتباع شریعت اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب  
کی طرح یقینی ہے، ان سے ایسے گناہ کے ارتکاب کا گمان نہیں کیا جاسکتا۔ محققین  
صوفیائے کرام نے خود اس کی تصریح فرمائی ہے۔ اس معاملہ میں مذاہب اربعہ کے فقہاء  
اور صوفیائے کرام کے اقوال مذکورہ صدر رسالہ میں تفصیل سے جمع کر دیئے گئے ہیں، یہاں  
اسی اختصار پر اکتفا کیا گیا۔ واللہ المستعان

خَلَقَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَآلَافٍ فِي الْأَرْضِ حُرِّ

بنائے آسمان بغیر ستونوں کے تم اس کو دیکھتے ہو اور رکھ دیئے زمین پر

رَوَّاسِيٍّ أَنْ تَصِيدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَأَنْزَلْنَا

پہاڑ کہ تم کو لے کر جھک نہ پڑے اور پھیر دیئے اس میں سب طرح کے جانور اور اتارا ہم نے

مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ①

آسمان سے پانی پھر اُگائے زمین میں ہر قسم کے جوڑے خاصے،

هَذَا خَلَقَ اللَّهُ فَأَمْرُوْنِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُونِهِ

یہ سب کچھ بنایا ہوا ہے اللہ کا اب دکھاؤ مجھ کو کیا بنایا ہے اوروں نے جو اس کے سوا ہیں

بَلِ الظَّالِمُوْنَ فِي ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۱

کچھ نہیں پر بے انصاف صریح بھٹک رہے ہیں۔

## خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بلا ستون بنایا (چنانچہ) تم ان کو دیکھ رہے ہو اور زمین میں (بھاری بھاری) پہاڑ ڈال رکھے ہیں کہ وہ تم کو لے کر ڈالو اور ڈول نہ ہونے لگے اور اس (زمین) میں ہر قسم کے جانور پھیلا رکھے ہیں اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس زمین میں ہر طرح کے عمدہ اقسام (نباتات کے) اگائے (اور ان لوگوں سے جو کہ شرک کرتے ہیں کہتے کہ) یہ تو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں (سو اگر تم دوسروں کو شریک الوہیت قرار دیتے ہو تو) اب تم لوگ مجھ کو دکھاؤ کہ اس کے سوا جو (معبود تم نے بننا رکھے) ہیں انھوں نے کیا کیا چیزیں پیدا کی ہیں (تاکہ ان کا استحقاق الوہیت ثابت ہو، اور اس دلیل کا مقتضی یہ تھا کہ وہ لوگ ہدایت پر آجاتے، مگر انھوں نے ہدایت کو قبول نہیں کیا، بلکہ یہ ظالم لوگ ربدستور، صریح گمراہی میں مبتلا ہیں۔

## معارف و مسائل

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَّرَوْنَہَا، اسی مضمون کی ایک آیت سورۃ رعد کے شروع میں گزر چکی ہے، اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَّرَوْنَہَا، ترکیب نحوی کے اعتبار سے اس عبارت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:-

ایک یہ کہ تَرَوْنَہَا کو عَمَد کی صفت قرار دیا جائے اور اس کی ضمیر عَمَد کی طرف راجح کی جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جن کو تم دیکھتے ہو، یعنی اگر ستون ہوتے تم ان کو دیکھتے، جب ستون نظر نہیں آتے تو معلوم ہوا کہ یہ آسمان کی عظیم الشان چھت بغیر ستونوں کے بنائی گئی ہے، یہ تفسیر حضرت حسنؓ اور قتادہ سے منقول ہے۔ (ابن کثیر)

دوسری صورت یہ ہے کہ تَرَوْنَہَا کی ضمیر سموات کی طرف راجح ہو، اور یہ جملہ



مستقل قرار دیا جائے۔ معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بغیر ستون کے پیدا کیا، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ اور پہلی ترکیب کی صورت میں ایک معنی یہ بھی کہے جاسکتے ہیں کہ آسمان ستونوں پر قائم ہیں ان کو تم دیکھ نہیں سکتے وہ غیر مرئی ہیں۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ اور عکرمہؓ اور مجاہدؓ سے منقول ہے (ابن کثیر)

بہر صورت اس آیت نے حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی یہ نشانی بتلائی کہ آسمان کی اتنی وسیع و عریض اور اتنی بلند عظیم الشان چھت کو ایسا بنا یا ہے کہ اس میں کوئی عمود اور ستون نہیں دیکھا جاتا ہے۔

**ایک سوال و جواب** یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آسمان جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں اور عام طور پر مشہور ہے کہ ایک کرہ یعنی گول چیز ہے، اور ایسے گول کرہ میں وہ جہاں بھی ہو عادتاً عمود اور ستون نہیں ہوتے، تو آسمان کی کیا خصوصیت ہو؟ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح قرآن کریم نے اکثر مواقع میں زمین کو فراش فرمایا، جو گول اور کرہ ہونے کے بظاہر منافی ہے مگر اس کی وسعت کی وجہ سے وہ عام نظروں میں ایک سطح کی طرح دیکھی جاتی ہے، اسی عوامی تخیل کی بناء پر قرآن کریم نے اس کو فراش فرمایا، اسی طرح آسمان ایک چھت کی طرح نظر آتا ہے جس کے لئے عادتاً ستونوں اور عماد کی ضرورت ہوتی ہے، اس عام خیال کے مناسب اس کا بلا ستون ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ اور درحقیقت قدرت کاملہ کے ثبوت کے لئے اتنے بڑے عظیم الشان کرہ کی تخلیق ہی کافی ہے۔ اور بعض مفسرین ابن کثیر وغیرہ کی تحقیق یہ ہے کہ آسمان اور زمین کا مکمل کرہ ہونا قرآن و سنت کی رُو سے ثابت نہیں، بلکہ بعض آیات و روایات سے اس کا ایک قُبَّہ کی شکل میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک صحیح حدیث میں جو ہر روز آفتاب کا تخت العرش پہنچ کر سجدہ کرنا مذکور ہے وہ اسی صورت پر ہو سکتا ہے کہ آسمان مکمل کرہ نہ ہو، اسی صورت میں اس میں فوق و تحت یعنی اوپر نیچے کی جہت متعین ہو سکتی ہے، مکمل کرہ میں کسی جہت و سمت کو اوپر یا نیچے نہیں کہہ سکتے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنْ اشْكُرْ لِلَّهِ وَمَنْ يَشْكُرْ

اور ہم نے دی لقمان کو عقلندی کہ حق مان اللہ کا، اور جو کوئی حق مانے اللہ کا

فَانْمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝۱۲

تو مانے گا اپنے بھلے کو اور جو کوئی منکر ہوگا تو اللہ بے پرواہ ہو سب تعریفوں والا

وَإِذْ قَالَ لُقْمَنُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَبْنَىٰ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ ط

اور جب کہا لقمان نے اپنے بیٹے کو جب اس کو سمجھانے لگا اے بیٹے شریک ٹھہرائو اللہ کا،

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝۱۳ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ

بیشک شریک بنانا بھاری بے انصافی ہے، اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصْلُہٗ فِي عَامَيْنِ أَنِ

پیٹ میں رکھا اس کو اس کی ماں نے تھک تھک کر اور دودھ چھڑانا ہے اس کا دو برس میں کہ

اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ط إِلَىٰ الْمَصِيرِ ۝۱۴ وَإِنْ جَاهَدَاكَ

حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا آخر بھی تک آنا ہے، اور اگر وہ دونوں تجھ سے

عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ

اڑیں اس بات پر کہ شریک مان میرا اس چیز کو جو تجھ کو معلوم نہیں تو ان کا کہنا مت مان اور

صَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ

ساتھ دے ان کا دنیا میں دستور کے موافق اور راہ چل اس کی جو رجوع ہوا میری

إِلَىٰ ج ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝۱۵

طرف، پھر میری طرف ہے تم کو پھر آنا پھر میں بتلا دوں گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے،

يَبْنَىٰ إِنَّهَا أَنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ

اے بیٹے اگر کوئی چیز ہو برابر رانی کے دانہ کی پھر وہ جو کسی پتھر میں،

أَوْ فِي السَّمَاوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللَّهُ ط إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ

یا آسمانوں میں یا زمین میں لا حاضر کرے اس کو اللہ بیشک اللہ جانتا ہو چھپی ہوئی

خَبِيرٌ ۝۱۶ يَبْنَىٰ أَقِيمِ الصَّلَاةَ وَامْرًا بِالسَّعَادَةِ وَأَنَّ

چیزوں کو، خبردار ہو۔ اے بیٹے قائم رکھ نماز کو اور سکھلا بھلی بات اور منع کر



عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزَمِ الْأُمُورِ ۝۱۷

برائی سے اور تحمل کر جو تجھ پر پڑے بے شک یہ ہیں ہمت کے کام -

وَلَا تُصِعْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّ

اور اپنے گال مت بھلا لوگوں کی طرف اور مت چل زمین پر اتراتا بے شک

اللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝۱۸ وَأَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاعْصِضْ

اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اتراتا بڑائیاں کرنے والا - اور چل نیچ کی چال اور نیچی کر

مِنْ صَوْتِكَ ط إِنَّ أُنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَبِيرِ ۝۱۹

آواز اپنی ، بے شک بُری سے بُری آواز گدھے کی آواز ہے -

## خُلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لقمان کو دانشمندی (جس کی حقیقت علم مع العمل ہے) عطا فرمائی (اور ساتھ ہی یہ حکم دیا) کہ سب نعمتوں پر عموماً اور اس نعمتِ حکمت پر کہ افضل النعم ہے خصوصاً اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے رہو اور جو شخص شکر کرے گا وہ اپنے ذاتی نفع کے لئے شکر کرتا ہے (یعنی اسی کا نفع ہے کہ اس سے نعمت میں ترقی ہوتی ہے) کہ قال تَبَيَّنَ شُكْرُكُمْ لَا يَزِيدُكُمْ دِينِي نِعْمَتٍ فِي تَوْفِيقِي دُنْيَا فِي هَوْنِي وَآخِرَتٍ فِي ثَوَابِي عَظِيمٍ ملتا ہے، اور دنیوی میں آخرت کی ترقی یعنی ثواب میں اضافہ تو یقینی ہے اور کبھی دنیا میں شکر کرنے سے نعمت بڑھ جاتی ہے) اور جو ناشکری کرے گا تو (اپنا ہی نقصان کرے گا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (تو) بے نیاز (اور سب) خوبیوں والا ہے (یعنی چونکہ وہ اپنی ذات میں کامل ہے جو مدلول ہے حمید کا اس لئے وہ غنی ہے، اس کو کسی کے شکریہ و ثناء کی احتیاج نہیں، کہ اس میں استکمال بالغیر لازم آتا ہے اور چونکہ لقمان موصوف ہیں حکمت یعنی علم و عمل کے ساتھ، اس سے مفہوم ہوا کہ انھوں نے تعلیمِ شکر پر بھی شکر کیا ہوگا پس وہ شاکر بھی تھے اور شاکر ہونے سے ان کی حکمت میں ترقی بھی ہوئی ہوگی پس وہ اعلیٰ درجہ کے حکیم ہوئے) اور (ایسے حکیم کی تعلیم ضرور قابلِ عمل ہونا چاہئے) سو ان کی تعلیمات ان لوگوں کے سامنے ذکر کیجئے جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے

کہا کہ بیٹا خدا کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہرانا، بیشک شرک کرنا بڑا بھاری ظلم ہے (ظلم کی حقیقت علماء نے یہ بیان کی ہے کہ کسی چیز کو بے محل استعمال کیا جائے، اور یہ بات شرک میں سب سے زیادہ واضح ہے کہ پیدا کرنے والے کی جگہ بتوں کی پرستش کی جائے، اور درمیان قصہ کے امر توحید کی تاکید کے لئے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے کہ ان کی اطاعت اور خدمت کرے، کیونکہ بھولنے اس کے لئے بڑی مشقتیں بھیلی ہیں بالخصوص ماں نے چنانچہ اُس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا، (کیونکہ جوں جوں حمل بڑھتا جاتا ہے حاملہ کا ضعف بڑھتا جاتا ہے) اور (بچہ) دو برس میں اس کا دودھ چھوڑتا ہے (ان دنوں میں بھی وہ ہر طرح کی خدمت کرتی ہے، اسی طرح اپنی حالت کے موافق باپ بھی مشقت اٹھاتا ہے، اس لئے ہم نے اپنے حقوق کے ساتھ ماں باپ کے حقوق ادا کرنے کا حکم فرمایا، چنانچہ یہ ارشاد کیا کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر (حق تعالیٰ کی شکر گزاری تو عبادت و اطاعت حقیقیہ کے ساتھ اور ماں باپ کی خدمت و ادائے حقوق شرعیہ کے ساتھ کیونکہ) میری ہی طرف (سب کو) لوٹ کر آنا ہے (اس وقت میں اعمال کی جزاء و سزا دوں گا، اس لئے احکام کی بجا آوری ضروری ہے) اور باوجودیکہ ماں باپ کا اتنا بڑا حق ہے جیسا ابھی معلوم ہوا، لیکن امر توحید ایسا عظیم الشان ہے کہ اگر تجھ پر وہ دونوں (بھی) اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جس کے شریک الوہیت ہونے کی تیرے پاس کوئی دلیل (اور سند) نہ ہو (اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں کہ جس کے استحقاق شریکت پر کوئی دلیل قائم ہو بلکہ عدم استحقاق پر بہت سی دلیلیں قائم ہیں، پس مراد یہ ہوتی کہ اگر وہ کسی چیز کو بھی شریک الوہیت ٹھہرانے کا تجھ پر زور دیں) تو تو ان کا کہنا نہ ماننا اور رہاں یہ ضرور ہے کہ دنیا کے حوائج و معاملات میں جیسے ان کے ضروری اخراجات اور خدمت وغیرہ) ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا اور دین کے بارے میں صرف اس (ہی) شخص کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہو (یعنی میرے احکام کا معتقد اور عامل ہو) پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے پھر رآنے کے وقت میں تم کو جتلا دوں گا جو جو کچھ تم کرتے تھے (اس لئے کسی امر میں میرے حکم کے خلاف مت کرو...) آگے پھر تکمیل ہے نصائح لقمانیہ کی کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو اور نصیحتیں بھی کہیں چنانچہ توحید و عقائد کے بارے میں یہ بھی نصیحت کی کہ (بیٹا) حق تعالیٰ کا علم اور قدرت اس درجہ ہے کہ اگر کسی کا کوئی عمل (کیسا ہی مخفی ہو) مثلاً فرض کر دے کہ وہ رات کے دانے کے



برابر (مقدار میں) ہو (اور) پھر (فرض کر دو کہ) وہ کسی پتھر کے اندر (چھپا رکھا) ہو (جو کہ ایسا حجاب ہے کہ اس کا رفع ہونا دشوار ہے اور بدون رفع کسی کو اس کے اندر کا علم نہیں ہوتا) یا وہ آسمانوں کے اندر ہو (جو کہ عام خلّاق سے مکانات بہت بعید ہے) یا وہ زمین کے اندر ہو (جہاں خوب ظلمت رہتی ہے، اور یہی اسباب ہیں عام مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ رہنے کے، کیونکہ کبھی کوئی چیز چھوٹی اور باریک ہوتی ہے کہ نظر میں نہیں آتی اور کبھی کوئی شدید حجاب حائل ہونے سے کبھی مکان کے بعید ہونے سے کبھی ظلمت سے، لیکن حق تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ اگر یہ اسباب بھی پھینکے کے مجتمع ہوں) تب بھی رقیامت کے روز حساب کے وقت) اس کو اللہ تعالیٰ حاضر کر دے گا (جس سے علم اور قدرت دونوں ثابت ہوتے) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا باریک بین (اور) باخبر ہے (اور اعمال کے باب میں یہ نصیحت کی کہ) بیٹا نماز پڑھا کرو (کہ بعد تصحیح عقائد کے اعلیٰ درجہ کا عمل ہے) اور (جسبیا تصحیح عقائد و اعمال سے اپنی تکمیل کی ہے اسی طرح دوسروں کی تکمیل کی بھی کوشش کرنا چاہئے، پس لوگوں کو) اچھے کاموں کی نصیحت کیا کر اور بُرے کاموں سے منع کیا کر اور (اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بالخصوص اور ہر حالت میں بالعموم) تجھ پر جو مصیبت واقع ہو اس پر صبر کیا کر یہ (صبر کرنا) ہمت کے کاموں سے ہے اور (اخلاق و عادات کے باب میں یہ نصیحت کی کہ بیٹا) لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر اور زمین پر اترا کر مت چل، بیشک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے اور اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر رہنا بہت دوڑ کر چل کہ دقار کے خلاف ہے، نیز گر جاتے کا بھی احتمال ہے، اور نہ بہت گن گن کر قدم رکھ کہ وضع متکبرین کی ہے، بلکہ بے تکلف اور متوسط رفتار تواضع و سادگی کی چال اختیار کر، جس کو دوسری آیت میں اس عنوان سے ذکر کیا ہے **يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا** اور (بولنے میں) اپنی آواز کو لپٹ کر (یعنی بہت غل مت بچا، اور یہ مطلب نہیں کہ اتنی پستی کر کہ دوسرا سنے بھی نہیں آگے غل بچانے سے نفرت دلاتے ہیں کہ) بیشک آوازوں میں سے سب سے بُری آواز گدھوں کی آواز (ہوتی) ہے (تو آدمی ہو کر گدھوں کی طرح چیخنا اور چلنا کیا مناسب ہے، نیز چیخ چلاؤ سے بعض اوقات دوسروں کو وحشت و اذیت بھی ہوتی ہے) :

## معارف و مسائل

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ، حضرت لقمان علیہ السلام، وہب بن منبہؓ کی روایت کے مطابق حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے، اور مقاتلؓ نے ان کا خالہ زاد بھائی بتلایا ہے۔ اور تفسیر بیضاوی وغیرہ میں ہے کہ ان کی عمر دراز ہوئی، یہاں تک کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ پایا۔ یہ بات دوسری روایات سے بھی ثابت ہے کہ لقمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوئے ہیں۔ اور تفسیر درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ لقمان ایک حبشی غلام تھے، نجاری کا کام کرتے تھے (آخر جہ ابن ابی شیبہ و احمد فی الزہد و ابن جریر و ابن المنذر وغیرہ) اور حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے ان کے حالات دریافت کئے گئے تو فرمایا کہ پست قد پست ناک کے حبشی تھے، اور مجاہدؓ نے فرمایا کہ حبشی غلام موٹے ہونٹ والے پھٹے ہوئے قدموں والے تھے (ابن کثیر)

ایک سیاہ رنگ حبشی حضرت سعید بن مسیبؓ کے پاس کوئی مسئلہ دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوا تو حضرت سعیدؓ نے اس کی تسلی کے لئے فرمایا کہ تم اپنے کالے ہونے پر غم نہ کرو، کیونکہ کالے لوگوں میں تین بزرگ ایسے ہیں جو لوگوں میں سب سے بہتر تھے۔ حضرت بلال حبشیؓ، اور مجتبیٰؓ حضرت عمر بن خطابؓ کے آزاد کردہ غلام اور حضرت لقمان علیہ السلام۔

لقمان علیہ السلام جمہور سلف کے نزدیک ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ جمہور سلف کا اس پر اتفاق ہو ہی نہیں بلکہ ولی اور حکیم تھے کہ وہ نبی نہیں تھے، صرف حضرت عکرمہؓ سے ان کا نبی ہونا نقل کیا جاتا ہے، مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ اور امام بغویؒ نے فرمایا کہ اس پر اتفاق ہے کہ وہ فقیہ اور حکیم تھے نبی نہیں تھے۔ (منظہری)

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ حضرت قتادہؓ سے ان کے بارے میں ایک عجیب روایت یہ منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت لقمان کو اختیار دیا تھا کہ نبوت لے لو یا حکمت انھوں نے حکمت کو اختیار کر لیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ان کو نبوت کا اختیار دیا گیا تھا، انھوں نے عرض کیا کہ اگر اس کے قبول کرنے کا حکم ہے تو میرے سر آنکھوں پر ورنہ مجھے معاف فرمایا جائے۔

اور حضرت قتادہؓ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ لقمان علیہ السلام سے کسی نے



پوچھا کہ آپ نے حکمت کو نبوت پر کیوں ترجیح دی، جبکہ آپ کو دونوں کا اختیار دیا گیا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ نبوت بڑی ذمہ داری کا منصب ہے، اگر وہ مجھے بغیر میرے اختیار کے دے دیا جاتا تو حق تعالیٰ خود اس کی کفالت فرماتے کہ میں اس کے فرائض ادا کر سکوں اور اگر میں اپنے اختیار سے اس کو طلب کرتا تو ذمہ داری مجھ پر ہوتی (ابن کثیرؒ)

اور جبکہ لقمان علیہ السلام کا نبی نہ ہونا جمہور کے نزدیک مسلم ہے، تو پھر ان کو وہ حکم جو قرآن میں مذکور ہے اِنْ اَشْكُرْ لِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ہو سکتا ہے جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے شرعی مسائل میں لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے تھے، جب داؤد علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی تو فتویٰ دینا چھوڑ دیا کہ اب میری ضرورت نہیں رہی۔ بعض روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل کے قاضی تھے۔ حضرت لقمان علیہ السلام سے کلمات حکمت بہت منقول ہیں۔ وہاب بن منبہؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت لقمان علیہ السلام کی حکمت کے دس ہزار سے زیادہ ابواب پڑھے ہیں۔ (قرطبی)

حضرت لقمان ایک روز ایک بڑی مجلس میں لوگوں کو حکمت کی باتیں سنارہے تھے، ایک شخص آیا اور اس نے سوال کیا کہ کیا تم وہی نہیں جو میرے ساتھ فلاں جنگل میں بکریاں چرایا کرتے تھے؟ لقمان علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں میں وہی ہوں، اس شخص نے پوچھا کہ پھر آپ کو یہ مقام کیسے حاصل ہوا کہ خلق خدا آپ کی تعظیم کرتی ہے اور آپ کے کلمات سننے کے لئے دُور دور سے جمع ہوتی ہے۔ لقمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا سبب میرے دو کام ہیں ایک ہمیشہ سچ بولنا، دوسرے فضول باتوں سے اجتناب کرنا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت لقمان نے فرمایا کہ چند کام ایسے ہیں جنہوں نے مجھے اس درجہ پر پہنچایا، اگر تم اختیار کرو تو تمہیں بھی یہی درجہ اور مقام حاصل ہو جائے گا۔ وہ کام یہ ہیں: اپنی نگاہ کو پست رکھنا اور زبان کو بند رکھنا، حلال روزی پر قناعت کرنا، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنا، بات میں سچائی پر قائم رہنا، عہد کو پورا کرنا، مہمان کا اکرام کرنا، پڑوسی کی حفاظت کرنا، اور فضول کام اور کلام کو چھوڑ دینا۔ (ابن کثیرؒ)

حکمت جو لقمان علیہ السلام کو لفظ حکمت قرآن کریم میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا دی گئی اس سے کیا مراد ہے؟ ہر علم، عقل، حلم و بردباری، نبوت، اصابت رائے۔ ابو حیان نے فرمایا کہ حکمت سے مراد وہ کلام ہے جس سے لوگ نصیحت حاصل کریں

اور ان کے دلوں میں موثر ہو اور جس کو لوگ محفوظ کر کے دوسروں تک پہنچائیں۔ اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حکمت سے مراد عقل و فہم اور ذہانت ہے۔ اور بعض حضرات

نے فرمایا کہ علم کے مطابق عمل کرنا حکمت ہے، اور درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں، یہ بھی چرچا حکمت میں داخل ہیں۔ اوپر خلاصہ تفسیر میں حکمت کا ترجمہ دانشمندی سے اور اس کی تفسیر علم یا عمل سے کی گئی ہے یہ بہت جامع اور واضح ہے۔

آیت مذکورہ میں حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت عطا کرنے کا ذکر فرما کر آگے فرمایا ہے اِنْ اَشْكُرْ لِي، اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہاں قُلْنَا محذوف مانا جائے۔ مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے لقمان کو حکمت دی اور یہ حکم دیا کہ میرا شکر ادا کیا کرو، اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اِنْ اَشْكُرْ لِي خود حکمت کی تفسیر ہے، یعنی وہ حکمت جو لقمان کو دی گئی ہے سچی کہ ہم نے اس کو شکر کا حکم دیا انھوں نے تعمیل کی۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر گزار ہونا سب سے بڑی حکمت ہے۔ اس کے بعد یہ بتلادیا کہ یہ شکر گزاری کا حکم ہم نے کچھ اپنے فائدہ کے لئے نہیں دیا ہمیں کسی کے شکر کی حاجت نہیں، بلکہ یہ خود انہی کے فائدے کے لئے دیا ہے کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص ہماری نعمت کا شکر ادا کرتا ہے ہم اس کی نعمت میں اور زیادتی کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد لقمان علیہ السلام کے کچھ کلمات حکمت کا ذکر فرمایا ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے تھے، وہ کلمات حکمت قرآن کریم نے اس لئے نقل فرمائے کہ دوسرے لوگ بھی ان سے فائدہ اٹھائیں۔

ان کلمات حکمت میں سب سے اوّل تو عقائد کی درستی ہے، اور ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو سارے عالم کا خالق و مالک بلا شرکت غیرے یقین کرے، اس کے ساتھ کسی غیر اللہ کو شریک عبادت نہ کرے کہ اس دنیا میں اس سے بڑا بھاری ظلم کوئی نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ کی کسی مخلوق کو خالق کے برابر ٹھہرائے، اس لئے فرمایا يَبْنِي لَا تَشْرِكْ لِي بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ، آگے حضرت لقمان کی دوسری نصائح اور کلمات حکمت آئے ہیں جو اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے فرمائے تھے۔ درمیان میں حق تعالیٰ نے شرک کے ظلم عظیم ہونے اور کسی حال اس کے پاس نہ جانے کی ہدایات کے لئے ایک اور حکم ارشاد فرمایا:

والدین کی شکر گزاری اور اطاعت	کہ اگرچہ ہم نے اولاد کو اپنے ماں باپ کی اطاعت اور شکر گزاری
فرض ہے، مگر حکیم الہی کے خلاف	کی بڑی تاکید کی ہے، اور اپنی شکر گزاری و اطاعت کے ساتھ
کسی کی اطاعت جائز نہیں	ساتھ والدین کی شکر گزاری اور اطاعت کا حکم دیا ہے لیکن

شرک ایسا ظلم عظیم اور سنگین جرم ہے کہ وہ ماں باپ کے کہنے سے اور مجبور کرنے سے بھی کسی کے لئے جائز نہیں ہوتا، اگر کسی کو اس کے والدین اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو



شریک قرار دینے پر مجبور کرنے لگیں تو اس معاملہ میں والدین کا کہنا بھی ماننا جائز نہیں۔ اور یہاں جبکہ والدین کے حقوق اور ان کی شکر گزاری کا حکم دیا گیا تو اس کی حکمت یہ بتلا دی کہ اس کی ماں نے اس کے وجود و بقاء میں بڑی محنت برداشت کی ہے، کہ نو مہینے تو اس کو اپنے شکم میں رکھ کر اس کی حفاظت کی اور اس کی وجہ سے جو روز بروز اس کو ضعف پر ضعف اور تکلیف پر تکلیف بڑھتی گئی۔۔۔ اس کو برداشت کیا، پھر اس کے پیدا ہونے کے بعد بھی دو سال تک اس کو دودھ پلانے کی زحمت برداشت کی، جس میں ماں کو خاصی محنت بھی شب و روز اٹھانی پڑتی ہے، اور اس کا ضعف بھی اس سے بڑھتا ہے، اور چونکہ بچے کی پرورش میں محنت و مشقت زیادہ ماں اٹھاتی ہے، اس لئے شریعت میں ماں کا حق باپ سے بھی مقدم رکھا گیا ہے، وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۚ وَهَنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصْلُهُ فِي عَمَائِينَ کا یہی مطلب ہے اور اس کے بعد وَانْجَاهَكَ مِنْ يَبْتَلَايَا ہے کہ غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے کے معاملہ میں والدین کی اطاعت بھی حرام ہے۔ اسلام کا بے نظیر قانون عدل اور ایسی صورت میں کہ ماں باپ اس کو شرک و کفر پر مجبور کریں اور اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہو کہ ان کی بات نہ مانو، تو طبعی طور پر انسان حد پر قائم نہیں رہتا۔ اس پر عمل کرنے میں اس کا امکان تھا کہ بیٹا والدین کے ساتھ بدکلامی یا بدخونی سے پیش آئے ان کی توہین کرے۔ اسلام ایک قانون عدل ہے، ہر چیز کی ایک حد ہے، اس لئے شرک میں والدین کی اطاعت نہ کرنے کے حکم کے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیدیا کہ:

صَاحِبُهُمَا فِي الدِّينِ نَبِيًّا مَعْرُوفًا، یعنی دین میں تو تم ان کا کہنا نہ مانو، مگر دنیا کے کاموں میں مثلاً ان کی جسمانی خدمت یا مالی اخراجات وغیرہ اس میں کمی نہ ہونے دو، بلکہ دنیوی معاملات میں اس کے عام دستور کے مطابق معاملہ کرو ان کی بے ادبی نہ کرو، انکی بات کا جواب ایسا نہ دو جس سے بلا ضرورت دل آزاری ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے شرک و کفر کے معاملہ میں نہ ماننے سے جو ان کی دل آزاری ہوگی وہ تو مجبوری کے لئے برداشت کرو، مگر ضرورت کو ضرورت کی حد میں رکھو، دوسرے معاملات میں ان کی دل آزاری سے پرہیز کرتے رہو۔

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَبِالْآيَاتِ الْكُبْرَىٰ يُعَلِّمُهُ ۚ اس آیت میں جو بچے کے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بتلائی گئی ہے، یہ عام عادت کے مطابق ہے۔ اس میں اس کی کوئی تشریح و تصریح نہیں کہ اس سے زیادہ مدت تک دودھ پلایا جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ اس مسئلہ کی تشریح سورۃ احقاف کی آیت وَحَمْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا کے تحت میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گی۔

دوسری وصیت لقمانی یہ ہے کہ اس کا اعتقاد جازم رکھا جائے کہ آسمان و زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے اس کے ایک ایک ذرہ پر اللہ تعالیٰ کا علم بھی محیط اور وسیع متعلقہ عفت اند ہے اور سب پر اس کی قدرت بھی کامل ہے۔ کوئی چیز کتنی ہی چھوٹی سے چھوٹی ہو جو عام نظروں میں نہ آسکتی ہو اسی طرح کوئی چیز کتنی ہی دور دراز ہو اسی طرح کوئی چیز کتنی ہی اندہیروں اور پردوں میں ہو اللہ تعالیٰ کے علم و نظر سے نہیں چھپ سکتی، اور وہ جس کو جب چاہیں جہاں چاہیں حاضر کر سکتے ہیں۔ یٰلَیُّنَّی اِنَّہَا اِنْ تِلْكَ مُنْجَلَّاتٍ مِّنْ حُجُورِیْ الذِّقِّۃِ کَا یَہِیْ مَطْلَبِہِی۔ اور حق تعالیٰ کے علم و قدرت کا ہر چیز پر محیط ہونا خود بھی اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور عقیدہ توحید کی بہت بڑی دلیل ہے۔

تیسری وصیت لقمانی اعمال واجبہ تو بہت ہیں مگر ان سب میں سب سے بڑا اور اہم عمل نماز متعلقہ اصلاح عمل ہے، اور خود اہم ہونے کے ساتھ وہ دوسرے اعمال کی درستی کا ذریعہ بھی ہے۔ جیسا کہ نماز کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ، اس لئے اعمالِ صالحہ واجبہ میں سے نماز کے ذکر پر اکتفاء فرمایا یٰلَیُّنَّی اَقِمِ الصَّلٰوۃَ یعنی اے میرے بیٹے نماز کو قائم کرو۔ اور جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم صرف نماز پڑھ لینا نہیں بلکہ اس کے تمام ارکان و آداب کو پوری طرح بجالانا، اس کے اوقات کی پابندی کرنا اور اس پر مداومت کرنا سب اقامتِ صلوٰۃ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

چوتھی وصیت لقمانی اسلام ایک جماعی دین ہے، فرد کی اصلاح کے ساتھ جماعت کی اصلاح اس نظام کا اہم جزو ہے اس متعلقہ اصلاح خلق نماز جیسے اہم فریضہ کے ساتھ امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ ذکر فرمایا گیا کہ لوگوں کو نیک کاموں کی دعوت دو اور برے کاموں سے روکو وَ اَمَّا بِالنُّصْرَةِ وَ ذِیْ وَ اٰتِیَہُ عَنِ الْمُنْكَرِ یہ دو فریضے ہیں ایک اپنی اصلاح اور دوسرا عام مخلوق کی اصلاح۔ دونوں ایسے ہیں کہ دونوں کی پابندی میں خاصی مشقت و محنت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس پر ثابت قدم رہنا آسان نہیں، خصوصاً اصلاحِ خلق کے لئے امر بالمعروف کی خدمت کا صلہ دنیا میں ہمیشہ عداوتوں اور مخالفتوں سے ملا کرتا ہے۔ اس لئے اس وصیت کے ساتھ ہی یہ وصیت بھی فرمائی کہ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ، یعنی ان کاموں میں تمہیں جو کچھ تکلیف پیش آئے اس پر صبر و ثبات سے کام لو۔

پانچویں وصیت لقمانی وَ لَا تَصْغُرْ خَدَّیْ لِلنَّاسِ، لَا تُصَغِّرْ، صَغُرَ سے مشتق ہے جو متعلقہ آداب معاشرہ اونٹ کی ایک بیماری ہے جس سے اس کی گردن مڑ جاتی ہے، جیسے



انسانوں میں لقوہ معروف بیماری ہے جس سے چہرہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے، مراد اس سے رخ پھیر لینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی ملاقات اور گفتگو میں ان سے منہ پھیر کر گفتگو نہ کرو جو ان سے اعراض کرنے اور تکبر کرنے کی علامت ہو اور اخلاق شریفانہ کے خلاف ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا، مَرَحٌ اگر طر کر، اتر کر چلنا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے سارے عناصر سے بہت افتادہ بنایا ہے تم اسی سے پیدا ہوئے اسی پر چلتے پھرتے ہو اپنی حقیقت کو پہچاننا اتر کر نہ چلو جو متکبر بن کا طریقہ ہے۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ، یعنی اللہ نہیں پسند کرتا کسی متکبر فخر کرنے والے کو۔ وَاَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ، یعنی اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو، نہ بہت دوڑ بھاگ کر چلو، کہ وہ وقار کے خلاف ہے۔ حدیث میں ہے کہ چلنے میں بہت جلدی کرنا مومن کی رونق ضائع کر دیتا ہے۔ (جامع صغیر عن ابی ہریرۃ) اور اس طرح چلنے میں خود اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو تکلیف بھی پہنچنے کا خطرہ رہتا ہے۔ اور نہ بہت آہستہ چلو، جو یا تو ان تکبر اور تصنع کرنے والوں کی عادت ہو جو لوگوں پر اپنا امتیاز جتاننا چاہتے ہیں، یا عورتوں کی عادت ہے جو شرم و حیا کی وجہ سے تیز نہیں چلتیں، یا پھر بیماروں کی عادت ہو جو اس پر مجبور ہیں۔ پہلی صورت حرام اور دوسری بھی اگر عورتوں کی مشابہت پیدا کرنے کے قصد سے ہو تو ناجائز ہے اور یہ قصد نہ ہو تو پھر مردوں کے لئے ایک عیب ہے۔ اور تیسری صورت میں اللہ کی ناسمکری ہے، کہ تندرستی کے باوجود بیماروں کی ہیئت بنائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ صحابہ کرام کو یہود کی طرح دوڑنے سے بھی منع کیا جاتا تھا، اور نصاریٰ کی طرح بہت آہستہ چلنے سے بھی۔ اور حکم یہ تھا کہ ان دونوں چالوں کی درمیانی چال اختیار کرو۔

حضرت عائشہؓ نے کسی شخص کو بہت آہستہ چلتے دیکھا چلے ابھی مرجائے گا تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ ایسے کیوں چلتا ہے؟ لوگوں نے بتلایا کہ یہ فتراء میں سے ہے۔ فتراء قاری کی جمع ہے، اس زمانے میں قاری اس کو بھی کہا جاتا تھا جو تلاوت قرآن کی صحت و آداب کے ساتھ قرآن کا عالم بھی ہو۔ مطلب یہ تھا کہ یہ کوئی بڑا قاری عالم ہے، اس لئے ایسا چلتا ہے۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ عمر بن خطابؓ اس سے زیادہ قاری تھے، مگر ان کی عادت یہ تھی کہ جب چلتے تو تیز چلتے تھے (مراد وہ تیزی نہیں جس کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ اس کے بالمقابل تیزی ہے) اور جب وہ کلام کرتے تھے تو اس طرح کہ لوگ اچھی طرح سن لیں (ایسی پست آواز نہ ہوتی تھی کہ سننے والوں کو پوچھنا پڑے کہ کیا فرمایا)۔

وَ اَخْصَصْ مِنْ صَوْتِكَ ، یعنی آواز کو پست کرو ” مراد پست کرنے سے یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ بلند آواز نہ نکالو، اور شور نہ کرو۔ جیسا کہ ابھی حضرت فاروق اعظمؓ کے متعلق گذرا کہ کلام ایسا کرتے تھے کہ حاضرین سن لیں، انھیں سننے میں تکلیف نہ ہو۔ اس کے بعد فرمایا اِنَّ اَنْتُمْ اَلْاَصْوَاتُ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ، یعنی چوپاؤں میں سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی ہے جو بہت شور کرتا ہے۔“

یہاں آداب معاشرت میں چار چیزیں ذکر کی گئی ہیں: اول لوگوں سے گفتگو اور ملاقات میں متکبرانہ انداز سے رخ پھیر کر بات کرنے کی ممانعت، دوسرے زمین پر اتر کر چلنے کی ممانعت تیسرے درمیانی چال چلنے کی ہدایت، چوتھے بہت زور سے شور مچا کر بولنے کی ممانعت۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات و شمائل میں یہ سب چیزیں جمع تھیں۔ شمائل ترمذی میں حضرت حسینؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد علی مرتضیٰؓ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کے ساتھ بیٹھتے تھے تو آپس میں آپ کا کیا طرز ہوتا تھا؟ انھوں نے فرمایا:

كَانَ دَأْمُ الْبَشْرِ سَهْلًا يَخْلُقُ  
لَيْنًا الْجَانِبَ لَيْسَ بِغَضٍّ وَلَا غَلِيظٍ  
وَلَا صَخَابَ فِي الْأَسْوَاقِ وَلَا فَحَّاشٍ  
وَلَا عِيَابٍ وَلَا مُشَاحٍ يَتَغَافَلُ عَمَّا  
لَا يَشْتَهِي وَلَا يُؤَلِّسُ مِنْهُ وَلَا يَجِيبُ  
فِيهِ قَدْ تَرَكَ نَفْسَهُ مِنْ ثَلَاثِ الْمَرَّاتِ  
وَالْأَكْبَارِ وَمَا لَا يَعْنِيهِ ،

”کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ خوش و خرم معلوم ہوتے تھے آپ کے اخلاق میں نرمی اور برتاؤ میں سہولت مندی تھی، آپ کی طبیعت سخت نہ تھی، بات بھی درشت نہ تھی، آپ نہ شور مچانے والے تھے نہ فحاش گو تھے، نہ کسی کو عیب لگاتے تھے، نہ بخل کرتے تھے، جو چیز دل کو نہ بھاتی اس کی جانب سے غفلت

برتتے تھے (مگر) دوسرے کو اس کی طرف سے ناامید بھی نہ کرتے تھے، (اگر حلال ہو اور اس کی رغبت ہو) اور جو چیز اپنی مرغوب نہ ہو دوسرے کے حق میں اس کی کاٹ نہ کرتے تھے، (بلکہ خاموشی اختیار فرماتے تھے) تین چیزیں آپ نے بالکل چھوڑ رکھی تھیں، (۱) جھگڑنا (۲) تکبر کرنا (۳) جو چیز کام کی نہ ہو اس میں مشغول ہونا۔“

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مِمَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کام میں لگائے تمھارے جو کچھ ہو آسمان اور زمین میں



وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَن

اور پوری کر دیں تم پر اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی، اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں

يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ۝۲۰ وَإِذَا

جو جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں نہ سمجھ رکھیں نہ سوجھ اور نہ روشن کتاب - اور جب

قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

ان کو کہتے چلو اس حکم پر جو اتارا اللہ نے کہیں نہیں ہم تو چلیں گے اس پر جس پر پایا ہم نے

آيَاءَ نَاظِرِينَ أُولُو كَانِ الشَّيْطَانِ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَنِيبٍ لَّسْعِيرٍ ۝۲۱

اپنے باپ دادوں کو بھلا اور جو شیطان بلاتا ہو ان کو دوزخ کی طرف تو بھی ۹

وَمَن يَسْلَمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ

اور جو کوئی تابع کرے اپنا منہ اللہ کی طرف اور وہ ہونیکی پر سو اس نے پکڑ لیا

بِالْعَصَا وَهُوَ الْوَفِيُّ وَالْيَسِيرُ ۝۲۲ وَمَن كَفَرَ

مضبوط کڑا اور اللہ کی طرف ہے آخر ہر کام کا - اور جو کوئی منکر ہوا

فَلَا يَحْزَنُكَ كُفْرُهُمْ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا

تو تو غم نہ کھا اس کے انکار سے ہماری طرف پھر آنا، ہر ان کو پھر ہم جتلا دیں گے انکو جو انھوں نے کیا ہے

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝۲۳ نَسِيعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ

البتہ اللہ جانتا ہے جو بات ہے دلوں میں - کام چلا دیں گے ہم ان کا تھوڑے دنوں پھر

نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ ۝۲۴ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ

پکڑ بلایں گے ان کو گھاڑھے عذاب میں - اور اگر تو پوچھے ان سے کس نے بنائے

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ط قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ

آسمان اور زمین تو کہیں اللہ تعالیٰ نے، تو کہہ سب خوبی اللہ کو ہی پر وہ بہت

لَا يَعْلَمُونَ ۝۲۵ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ هُوَ

لوگ سمجھ نہیں رکھتے - اللہ کا ہی جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں بیشک اللہ وہی ہے

الْغَنَى الْحَسِيدُ ۝ وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ

بے پروا سب غویوں والا۔ اور اگر جتنے درخت ہیں زمین میں قلم ہوں

وَالْبَحْرِ يَسِيلُ ۝ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ

اور سمندر ہو اس کی سیاہی اس کے پیچھے سات سمندر نہ تمام ہوں باتیں اللہ کی

إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ مَا خَلَقَكُمْ وَلَا بَعَثَكُمْ إِلَّا كُنُفُسٍ

بے شک اللہ زبردست ہر حکمتوں والا۔ تم سب کا بنانا اور مرنے پیچھے جلانا ایسا ہی ہے جیسا

وَاحِدَةٍ ط إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ۝ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ

ایک جی کا، بیشک اللہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے۔ تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ داخل کرتا ہے

الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور کام میں لگا دیا ہے سورج اور چاند کو

كُلٌّ يَجْرِي إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى وَأَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

ہر ایک چلتا ہے ایک مقرر وقت تک اور یہ کہ اللہ خبر رکھتا ہے اس کی جو تم کرتے ہو۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الْبَاطِلُ

یہ اس لئے کہ اللہ وہی ہے ٹھیک اور جس کسی کو پکارتے ہیں سوا اس کے سو وہی جھوٹ ہے،

وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۝ أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي

اور اللہ وہی ہے سب اوپر بڑا۔ تو نے نہ دیکھا کہ جہاز چلتے ہیں سمندر

فِي الْبَحْرِ يَنْعَسَتِ الْوُجُوهَ لِيُرِيَكُمْ مِنْ آيَاتِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ

میں اللہ کی نعمت لے کر تاکہ دکھلاؤ تم کو کچھ اپنی قدرتیں البتہ اس میں نشانیاں

لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝ وَإِذَا غَشِيَهمْ مَوْجٌ كَأَنَّ الظُّلُمَ دَعَوًا

ہیں ہر ایک تحمل کرنے والے احسان مند والے کے واسطے، اور جب سر پر آئے ان کے موج جیسے بادل

اللَّهُ مُخْلِصِينَ لَهُمُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ

بیکار نے لگیں اللہ کو خالص کر کے اس کے لئے بندگی، پھر جب بچا دیا ان کو جنگل کی طرف تو کوئی ہوتا ہے انہیں



مُقْتَصِدٌ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ ﴿۳۲﴾

بیچ کی چال پر، اور منکر وہی ہوتے ہیں ہماری قدرتوں کے جو قول کے جھوٹے ہیں حق نہ ماننے والے۔

## خلاصہ تفسیر

کیا تم لوگوں کو (مشاہدہ و دلائل سے) یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو (بواسطہ یا بلا واسطہ) تمہارے کام میں لگا رکھا ہے جو کچھ آسمانوں میں (موجود) ہیں اور جو کچھ زمین میں (موجود) ہیں اور اس نے تم پر اپنی نعمتیں ظاہری اور باطنی پوری کر رکھی ہیں (ظاہری وہ کہ آنکھ کان وغیرہ سے معلوم ہوں اور باطنی وہ جو کہ عقل سے سمجھی جائیں، اور مراد نعمتوں سے وہ نعمتیں ہیں جو تسخیر سموات و ارض پر مرتب ہوتی ہیں پس اس کے سب مخاطبین کا مشرف باسلام ہونا لازم نہیں آتا اور باوجودیکہ (اس دلیل سے توحید ثابت ہوتی ہے مگر) بعض آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں) بدون واقفیت (یعنی علم ضروری) اور بدون دلیل (یعنی علم استدلال عقلی) اور بدون کسی روشن کتاب (یعنی علم استدلال نقلی) کے جھگڑا کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کا اتباع کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے (یعنی حق کو ثابت کرنے والے دلائل میں غور کر کے ان کا اتباع کرو) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ (ہم اس کا اتباع نہیں کرتے) ہم (تو) اسی کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا ہے، (آگے ان پر رد ہو کہ) کیا اگر شیطان ان کے بڑوں کو عذاب و دوزخ کی طرف (یعنی گمراہی کی طرف جو کہ سبب ہے عذاب و دوزخ کا) بلاتا رہا ہو تب بھی راہی کا اتباع کریں گے، مطلب یہ کہ ایسے معاند ہیں کہ باوجود اس کے کہ ان کو دلیل کی طرف بلایا جاتا ہے مگر بھڑکے بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل محض گمراہ باپ دادا کی راہ پر چلتے ہیں یہ حالت تو اہل ضلالت کی ہوتی، اور جو شخص (حق کا اتباع کر کے) اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے (یعنی فرمانبرداری اختیار کر کے) عقائد میں بھی اعمال میں بھی، مراد اسلام و توحید ہے) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (یعنی محض ظاہری اسلام نہ ہو) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا (یعنی وہ اس شخص کے مشابہ ہو گیا جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں تھام کر گرنے سے مامون رہتا ہے، اسی طرح یہ شخص ہلاکت و خسران سے محفوظ ہو گیا) اور آخر سب کاموں کا انجام اللہ ہی کی طرف پہنچے گا پس یہ اعمال یعنی اتباع باطل و اتباع حق بھی اسی کے حضور میں پیش

ہوں گے، پس وہ ہر ایک کو مناسب جزاء و سزا دے گا) اور جو شخص (حق کو ثابت کرنے والے  
دلائل کے باوجود) کفر کرے سو آپ کے لئے اس کا کفر باعثِ غم نہ ہونا چاہئے، (یعنی آپ غم نہ  
کریں) ان سب کو ہمارے ہی پاس لوٹنا ہے سو ہم ان سب کو جتلا دیں گے جو جو کچھ وہ (دنیا میں)  
کیا کرتے تھے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو (تو) دلوں کی باتیں (تک) خوب معلوم ہیں (تو ظاہری  
اعمال کا معاملہ ظاہر ہے) پس ہم سے کوئی امر مخفی نہیں سب جتلا دیں گے اور مناسب سزا  
دیں گے، اس لئے آپ کچھ غم نہ کریں اور یہ لوگ اگر محض چند روزہ عیش پر پھول رہے ہیں تو  
ان کی بڑی غلطی ہے، کیونکہ یہ دائمی نہیں بلکہ) ہم ان کو چند روزہ عیش دیئے ہوئے ہیں پھر  
ان کو کشاں کشاں ایک سخت عذاب کی طرف لے آ دیں گے (پس اس پر ناز کرنا جہالت ہے)  
اور رہم جس توحید کی طرف ان کو بلارہے ہیں اس کے مقدمات کو خود یہ لوگ بھی تسلیم  
کرتے ہیں، مگر اس سے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کا کام نہیں لیتے چنانچہ) اگر آپ ان سے پوچھیں  
کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے (اس پر)  
آپ کہتے کہ الحمد للہ جو مقدمہ ہتم بالشان تھا وہ تو تمھارے اعتراف سے ثابت ہوا اور  
دوسرا مقدمہ نہایت ہی ظاہر ہے کہ جو خود مخلوق و مصنوع ہو وہ مستحقِ عبادت نہیں پس مطلوب  
ثابت ہو گیا، مگر یہ لوگ مطلوب کو نہیں مانتے) بلکہ ان میں اکثر (تو مجموعہ مقدمات کو بھی)  
نہیں جانتے (چنانچہ دوسرے مقدمہ جلیہ کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے کہ معبود ہونا  
صرف خالق کا حق ہے اور اللہ کی وہ شان ہے کہ) جو کچھ آسمان و زمین میں موجود ہو سب  
اللہ ہی کا (مملوک) ہے (پس سلطنت تو ان کی ایسی) اور بیشک اللہ تعالیٰ (خود اپنی ذات  
میں بھی) بے نیاز (اور) سب خوبیوں والا ہے (پس سزا دار الوہیت وہی ہے) اور اس  
کی خوبیاں اس کثرت سے ہیں کہ) جتنے درخت زمین بھر میں ہیں اگر وہ سب قلم بن جائیں  
(یعنی متعارف قلم کے برابر ان کے اجزاء کے قلم بنائے جائیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح  
ایک ایک درخت میں ہزاروں قلم تیار ہوں) اور یہ جو سمندر ہے اس کے علاوہ سات  
سمندر (روشنائی کی جگہ) اس میں اور شامل ہو جائیں (اور پھر ان قلموں اور اس روشنائی  
سے حق تعالیٰ کے کمالات لکھنا شروع کریں) تو (سب تسلیم و شنائی ختم ہو جائیں اور) اللہ  
کی باتیں (یعنی وہ کلمات جن سے اللہ تعالیٰ کے کمالات کی حکایت ہوتی ہو) ختم نہ ہوں،  
بیشک خدا تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے کہ وہ قدرت میں بھی کامل ہے اور علم میں بھی  
اور یہ دونوں صفتیں چونکہ تمام صفات و افعال سے تعلق رکھتی ہیں، شاید اس لئے بعد  
عموم کے ان کو خصوصاً بیان فرمادیا، اور اس کمالی صفتِ قدرت کی ایک فرع عالم



آخرت بھی ہے، جس کو بد فہم دشوار سمجھ رہے ہیں، حالانکہ وہ ایسا قادر ہے کہ (تم سب کا) پہلی بار (پیدا کرنا اور دوسری بار زندہ کرنا) اس کے نزدیک (بیس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا پیدا کرنا اور زندہ کرنا۔ گویا ہاں مقصود قرینہ مقام سے بعث کا ذکر فرمانا ہے، لیکن ذکر خلق سے استدلال اور قوی ہو گیا ہے) بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا اور سب کچھ دیکھتا ہے، (پس جو لوگ باوجود ان دلائل کے قیامت کا انکار کر رہے ہیں اور اس جرأت پر فسق و فجور کرتے ہیں ان سب کو سُن رہا ہے دیکھ رہا ہے ان کو سزا دے گا، آگے پھر توحید کا بیان ہی، کہ) اے مخاطب کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ رات کے اجزاء (کو دن میں اور دن کے اجزاء کو رات میں داخل کر دیتا ہے، اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے کہ ہر ایک مقررہ وقت تک (یعنی قیامت تک) چلتا رہے گا اور (کیا تجھ کو) یہ (معلوم نہیں) کہ اللہ تعالیٰ تمھارے سب عملوں کی پوری خبر رکھتا ہے (پس اس کمال علمی و عقلی کا مقتضی یہ ہے کہ شرک چھوڑ دیا جائے، اور اوپر جو ان افعال مذکورہ کا اختصاص حق تعالیٰ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے) یہ (اختصاص) اس سبب سے ہے کہ اللہ ہی سب میں کامل (اور واجب الوجود) ہے اور جن چیزوں کی اللہ کے سوا یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں بالکل ہی لچر ہیں اور اللہ ہی عالی شان اور (سب سے) بڑا ہے (اس لئے یہ سب تصرفات اسی کے لئے مختص ہیں، البتہ اگر دوسرے موجودات باطل اور فانی اور ممکن نہ ہوتے، بلکہ نعوذ باللہ کوئی اور بھی واجب الوجود ہوتا تو پھر یہ تصرفات حق تعالیٰ کے ساتھ مختص نہ ہوتے، چنانچہ ظاہر ہے)۔

اے مخاطب کیا تجھ کو (توحید کی) یہ دلیل (معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے فضل سے کشتی دریا میں چلتی ہے، تاکہ تم کو اپنی قدرت کی) نشانیاں دکھلا دے (چنانچہ ہر ممکن کا وجود اپنے پیدا کرنے والے کے وجود کی دلیل ہے، اسی طور پر) اس میں (بھی قدرت کی) نشانیاں ہیں ہر ایسے شخص کے لئے جو صابر و شاکر ہو (مراد اس سے مؤمن ہے کہ صبر و شکر میں کامل ہونا اسی کی صفت ہے، نیز صبر و شکر محرک ہے تذکر و تدبیر عالم کو اور استدلال کے لئے تذکر و تفکر ضروری ہے، اسی لئے یہ دونوں وصف یہاں مناسب ہوئے بالخصوص کشتی کی حالت کے اعتبار سے کہ موجوں کا اٹھنا محل صبر ہے، اور بسلامت کنارہ پر جا لگنا محل شکر ہے، پس جو لوگ ان سب واقعات میں فکر کرتے رہتے ہیں استدلال کی توفیق انہی کو ہوتی ہے) اور (جیسا اوپر آیت وَلَیِّنِ سَاءَ لَنتِمُّمٌ میں مقدماتِ دلیل کا اعتراف ان کفار کی طرف سے ثابت ہے، بعض اوقات خود نتیجہ دلیل یعنی توحید کا بھی

اعتراف کرتے ہیں جس سے توحید خوب ہی واضح ہو گئی، چنانچہ جب ان لوگوں کو وہیں سائبانوں (یعنی بادلوں) کی طرح محیط ہو کر گھیر لیتی ہیں تو وہ خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں، پھر جب ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے، سو بعض تو ان میں اعتدال پر رہتے ہیں (یعنی کبھی مشرک کو چھوڑ کر توحید کو جو کہ اعدل الطرق ہے اختیار کر لیتے ہیں) اور (بعض پھر ہماری آیتوں کے منکر ہو جاتے ہیں اور ہماری آیتوں کے بس وہی لوگ منکر ہوتے ہیں جو بد عہد اور ناشکرے ہیں) کہ کشتی میں جو عہد توحید کا کیا تھا اس کو توڑ دیا اور خشکی میں آنے کا مقتضی تھا شکر کرنا اس کو چھوڑ دیا۔

## معارف و مسائل

شروع سورۃ میں کفار و مشرکین کو اس پر تنبیہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے علم محیط اور قدرت مطلقہ کے مظاہر دیکھنے کے باوجود یہ لوگ اپنے کفر و شرک پر مصر ہیں، اور ان کے بالمقابل اطاعت شعار مومنین کی مدح اور ان کے انجام خیر کا ذکر تھا۔ درمیان میں حضرت لقمان علیہ السلام کی وصایا کا ذکر بھی ایک حیثیت سے انہی مضامین کی تکمیل تھی۔ آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ کے علم و قدرت کے محیط ہونے اور مخلوق پر اس کے انعامات و احسانات کا ذکر کر کے پھر توحید کی طرف دعوت ہے۔

سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ، یعنی مسخر کر دیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ مسخر کرنے کے مشہور معنی کسی چیز کو کسی کے تابع فرمان بنادینے کے ہیں۔ یہاں اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اول تو زمین کی سب چیزیں بھی انسان کے تابع فرمان نہیں۔ بلکہ بہت سی چیزیں اس کے مزاج کے خلاف کام کرتی ہیں۔ خصوصاً جو چیزیں آسمانوں میں ہیں ان میں تو انسان کے تابع فرمان ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ دراصل تسخیر کے معنی کسی چیز کو زبردستی کسی خاص کام میں لگا دینا اور اس پر مجبور کر دینا ہے۔ آسمان و زمین کی سب مخلوقات کو انسان کے لئے مسخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام مخلوقات کو انسان کی خدمت اور نفع رسانی میں لگا دیا۔ ان میں بہت سی چیزوں کو تو اس طرح خدمت میں لگایا کہ ان کو انسان کا تابع فرمان بھی بنادیا وہ جس وقت جس طرح چاہے ان کو استعمال کرتا ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو انسان کے کام میں لگا دیا گیا ہے کہ وہ انسان کی خدمت میں لگی ہوتی ہیں، مگر



بتقاضائے حکمت ربانی ان کو انسان کے تالیج نہیں بنایا گیا، جیسا کہ آسمانی مخلوق اور سیارات اور برق و باران وغیرہ کہ ان کو انسان کے حکم کا تالیج بنا دیا جاتا تو انسانوں کی طبائع اور مزاج اور حالات کے اختلافات کا ان پر اثر پڑتا۔ ایک انسان چاہتا کہ آفتاب جلدی طلوع ہو جائے دوسرے کی ضرورت اس پر موقوف ہوتی کہ اس میں دیر لگے، ایک شخص بارش مانگتا دوسرا سفر میں ہے کھلے میدان میں ہے وہ چاہتا کہ بارش نہ ہو۔ تو یہ متضاد تقاضے آسمانی کائنات کے عمل میں تضاد اور خلل پیدا کرتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو انسان کی خدمت میں لگا دیا مگر اس کا تالیج حکم نہیں بنایا یہ بھی ایک قسم کی تسخیر ہی ہے واللہ اعلم  
وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ ذُنُوبَكُمْ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً، اسباق کے معنی مکمل کرنے کے ہیں معنی یہ ہیں کہ مکمل کر دیا اللہ تعالیٰ نے تم پر اپنی ظاہری نعمتوں کو اور باطنی نعمتوں کو۔ ظاہری نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو انسان اپنے حواس خمسہ سے محسوس اور معلوم کر لیتا ہے، مثلاً حسن صورت، اعضائے انسانی کا اعتدال اور ہر عضو کو ایسے تناسب سے بنانا جو انسان کے عمل میں زیادہ سے زیادہ معین بھی ہو اور اس کی شکل و صورت کو بھی نہ بگاڑے۔ اسی طرح رزق مال و دولت، اسباب معیشت، تندرستی اور عافیت یہ سب ظاہری نعمتیں اور محسوس نعمتیں ہیں۔ اسی طرح دین اسلام کو سہل کر دینا اور اللہ و رسول کی اطاعت کی توفیق ہونا اور اسلام کا دوسرے ادیان پر غالب آنا اور دشمنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد ہونا بھی انہی نعمائے ظاہرہ میں داخل ہیں۔ اور باطنی نعمتیں وہ ہیں جو انسان کے قلب سے متعلق ہوں، جیسے ایمان اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور علم و عقل، حسن اخلاق، گناہوں کی پردہ پوشی، اور جرائم پر فوری سزا نہ ملنا وغیرہ ہیں۔

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ، اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی معلومات اور اپنی قدرت کے تصرفات اور اپنی نعمتوں کی ایک مثال دی ہے کہ وہ غیر متناہی ہیں۔ نہ کسی زبان سے وہ سب ادا ہو سکتے ہیں نہ کسی قلم سے سب کو لکھا جاسکتا ہے۔ مثال یہ فرمائی کہ ساری زمین میں جتنے درخت ہیں اگر ان کی سب شاخوں کے قلم بنائے جائیں اور ان کے لکھنے کے لئے سمندر کو روشنائی بنا دیا جائے اور یہ سب قلم حق تعالیٰ کی معلومات اور تصرفات قدرت کو لکھنا شروع کریں تو سمندر ختم ہو جائے گا اور معلومات و تصرفات ختم نہ ہوں گے۔ اور ایک سمندر نہیں اس جیسے سات سمندر اور بھی شامل کر دیئے جائیں، جب بھی سب سمندر ختم ہو جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ کلمات اللہ سے مراد اس کے علم و حکمت کے کلمات ہیں (روح و منہری) اور شیون قدرت اور

نعمائے الہیہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اور سات سمندر سے مطلب یہ نہیں کہ کہیں سات سمندر موجود ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک سمندر کے ساتھ فرض کر لو اور سات سمندر مل جائیں جب بھی ان سب سب کلمات اللہ کو ضبط تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ اور سات کا عدد بھی بطور مثال ہے، حصر مقصود نہیں۔ اور دلیل اس کی دوسری آیت قرآن ہے جس میں فرمایا ہے:

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِذًا أَوْ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَذْدًا، یعنی اگر سمندر کو کلمات اللہ کو لکھنے کے لئے روشنائی بنا لیا جائے تو سمندر ختم ہو جاتے گا اور کلمات اللہ ختم نہ ہوں گے، اور صرف یہی سمندر نہیں اسی جیسے اور سمندر کو بھی شامل کر دیں تب بھی بات یہی رہے گی۔ اس آیت میں بمِثْلِهِ فرما کر اشارہ کر دیا کہ یہ سلسلہ دور تک چلایا جائے کہ اس سمندر کے مثل دوسرا سمندر مل گیا پھر اس کی مثل تیسرا چوتھا، غرض سمندروں کی کتنی ہی مقدار فرض کر لو... ان کی روشنائی کلمات اللہ کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ عقلی طور پر وجہ ظاہر ہے کہ سمندر سات نہیں سات ہزار بھی ہوں وہ بہر حال محدود اور متناہی ہیں اور کلمات اللہ یعنی معلومات اللہ غیر متناہی ہیں کوئی متناہی چیز غیر متناہی کا احاطہ کیسے کر سکتی ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت احبار یہود کے ایک سوال کے جواب میں نازل ہوئی وجہ یہ تھی کہ قرآن کی آیت ہے وَمَا أَوْتِيتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا، یعنی تمہیں نہیں دیا گیا مگر تھوڑا سا علم، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو چند احبار یہود حاضر ہوئے اور اس آیت کے بارے میں معارضہ کیا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ تمہیں تھوڑا سا علم دیا گیا، یہ آپ نے اپنی قوم کا حال ذکر کیا ہے، یا اس میں آپ نے ہمیں بھی داخل کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مراد سب ہیں، یعنی ہماری قوم بھی اور یہود و نصاریٰ بھی تو انھوں نے یہ معارضہ کیا کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے تو رات عطا فرمائی ہے، جس کی شان تَبْيَانٌ يَّجْلِي شَيْءٌ، یعنی ہر چیز کا بیان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ بھی علم الہی کے مقابلہ میں قلیل ہی ہے۔ پھر تو رات میں جتنا علم ہے اس کا بھی تمہیں پورا علم نہیں، بقدر کفایت ہی ہے۔ اس لئے علم الہی کے مقابلہ میں ساری آسمانی کتابوں اور سب انبیاء کے علوم کا مجموعہ بھی قلیل ہی ہے۔ اسی کلام کی تائید کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ، (الذیہ ابن کثیر)



يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ وَأَخْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ

اے لوگو! اپنے رب سے اور ڈرو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی باپ اپنے

وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَارٍ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ

بیٹے کے بدلے اور نہ کوئی بیٹا ہو جو کام آئے اپنے باپ کی جگہ کچھ بھی، بیشک اللہ کا وعدہ

حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَقَدْ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللَّهِ

سچا ہے، سو تم کو نہ بہکائے دنیا کی زندگی اور نہ دھوکا دے تم کو اللہ کے نام

الْغُرُورِ ۝۳۳ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ

سے وہ دغا باز۔ بیشک اللہ کے پاس ہے قیامت کی خبر اور اتارتا ہے مینہ

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا

اور جانتا ہے جو کچھ ہر ماں کے پیٹ میں، اور کسی جی کو معلوم نہیں کہ کل کو کیا کرے گا،

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝۳۴

اور کسی جی کو خبر نہیں کہ کس زمین میں مرے گا، تحقیق اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے۔

## خلاصہ تفسیر

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو (اور کفر و شرک چھوڑ دو) اور اس دن سے ڈرو

جس میں نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی ہو کہ

وہ اپنے باپ کی طرف سے ذرا بھی مطالبہ ادا کر دے (اور یہ دن آنے والا ضرور ہے، کیونکہ اس

کی نسبت اللہ کا وعدہ ہے اور) یقیناً اللہ کا وعدہ سچا رہتا ہے سو تم کو دنیاوی زندگی

دھوکہ میں نہ ڈالے (کہ اس میں مہمک ہو کر اس دن سے غافل رہو) اور نہ تم کو وہ دھوکہ با

ر (یعنی شیطان) اللہ سے دھوکہ میں نہ ڈالے کہ تم اس کے اس بہکانے میں آ جاؤ کہ اللہ تم کو

عذاب نہ دے گا جیسا کہہ کرتے تھے وَلَئِنْ رُجِعْتُمْ إِلَى رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَكَ لَدَّحَسَنَى

بیشک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی (اپنے علم کے موافق) میںہ برساتا ہے (پس اس کا

علم اور قدرت بھی اسی کے ساتھ خاص ہے) اور وہی جانتا ہے جو کچھ (لڑکا لڑکی حاملہ کے)

رحم میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کرے گا (اس کی بھی اسی کو خبر ہے)۔

اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا اس کی بھی اسی کو خبر ہے اور انہی چیزوں کی کیا تخصیص ہو جتنے غیوب ہیں (بیشک اللہ ہی ان سب باتوں کا جاننے والا اور ان سے) باخبر ہے (کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں)۔

## معارف و مسائل

مذکورہ صدر و آیاتوں میں سے پہلی آیت میں مؤمن و کافر عام لوگوں کو خطاب فرما کر اللہ تعالیٰ اور قیامت کے حساب کتاب سے ڈرا کر اس کے لئے تیاری کی .... ہدایت کی گئی ہے۔ **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ** یعنی اے لوگو! ڈرو اپنے پروردگار سے اس جگہ اللہ تعالیٰ کے نام یا کسی دوسری صفت کے بجائے صفت رب کے انتخاب کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف کا جو حکم ہے یہ وہ خوف نہیں جو کسی درندہ یا دشمن سے عادت ہو کر رہتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو تمہارا رب اور پالنے والا ہے، اس سے اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ خوف سے مراد اس جگہ وہ خوف ہے جو اپنے بڑوں اور بزرگوں کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے ہونا لازم ہے، جیسے بیٹا اپنے باپ سے، شاگرد استاد سے ڈرتا ہے۔ وہ کوئی اس کے دشمن یا ضرر پہنچانے والے نہیں، مگر ان کی عظمت و ہیبت دلوں میں ہوتی ہے، وہی ان کو باپ اور استاذ کی اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔ یہاں بھی یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہیبت تمہارے قلوب پر حاوی ہونا چاہئے تاکہ تم اس کی مکمل اطاعت آسانی سے کر سکو۔

**وَ اتَّقُوا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلِيهِ وَلَا مَوْلًى فِئْتَهُ هُوَ جَارٍ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا**، یعنی اس روز سے ڈرو جس میں نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو کوئی نفع پہنچا سکے گا، اور نہ بیٹا باپ کو نفع پہنچانے والا ہوگا۔

مراد اس سے وہ باپ اور بیٹے ہیں جن میں ایک مؤمن ہو دوسرا کافر۔ کیونکہ مؤمن باپ نہ اپنے کافر بیٹے کے عذاب میں کوئی کمی کر سکے گا نہ اس کو کوئی نفع پہنچا سکے گا اسی طرح مؤمن بیٹا اپنے کافر باپ کے کچھ کام نہ آ سکے گا۔

وجہ اس تخصیص کی قرآن کریم کی — دوسری آیات اور روایات حدیث ہیں جن میں اس کی تصریح ہے کہ قیامت کے روز ماں باپ اولاد کی اور اولاد ماں باپ کی شفاعت کریں گے، اور اس شفاعت کی وجہ سے ان کو کامیابی بھی ہوگی۔ قرآن کریم میں ہے **وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ**



”یعنی جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان میں ان کے تابع ہوئی، یعنی وہ بھی مومن ہو گئے تو ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ماں باپ صالحین کے درجہ میں پہنچا دیں گے، اگرچہ ان کے اپنے اعمال اس درجہ کے قابل نہ ہوں مگر صالح والدین کی برکت سے قیامت میں بھی ان کو یہ نفع پہنچے گا کہ والدین کے مقام پر پہنچا دیا جائے گا، مگر اس میں شرط یہی ہے کہ اولاد مومن ہو، اگرچہ عمل میں کچھ کوتاہی ہوئی ہو۔“

اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے جَنَّتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَسْرَارِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ، یعنی ہمیشہ رہنے کی جنتوں میں داخل ہوں گے اور ان کے ساتھ وہ لوگ بھی داخل ہوں گے جو ان کے ماں باپ بیویوں اور اولاد میں سے اس قابل ہوں گے، مراد قابل ہونے سے مومن ہونا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ ماں باپ اور اولاد، اسی طرح شوہر بیوی اگر مومن ہونے میں مشترک ہوں تو پھر ایک سے دوسرے کو محشر میں بھی فائدہ پہنچے گا۔ اس طرح متعدد روایات حدیث میں اولاد کا ماں باپ کی شفاعت کرنا منقول ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ کا یہ ضابطہ کہ کوئی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو محشر میں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا، یہ اسی صورت میں ہے کہ ان میں سے ایک مومن ہو دوسرا کافر (منظری)۔

فانکلا: یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اس آیت میں باپ، بیٹے کو نفع نہ پہنچا سکے گا یہاں تو جملہ فعلیہ کی صورت میں لَا يَجْزِيكَ وَالِدٌ عَنْ ذَكَرٍ ہ کے الفاظ سے ذکر فرمایا اور دوسری جانب میں ذُو تَغْيِرَ کتے گئے، ایک یہ کہ اس کو جملہ اسمیہ کی صورت میں بیان فرمایا، دوسرے اس میں وَلَدَ کے بجائے لفظ مَوْلُو د اختیار فرمایا۔ حکمت اس میں یہ ہو کہ جملہ اسمیہ بہ نسبت فعلیہ کے زیادہ مؤکد ہوتا ہے۔ اس تغیر جملہ میں اس فرق کی طرف اشارہ کر دیا جو باپ اور اولاد میں ہے کہ باپ کی محبت اولاد کے ساتھ اشد ہے، اس کے برعکس اولاد کی محبت کا یہ درجہ دنیا میں بھی نہیں ہوتا محشر میں نفع رسانی کی نفی تو دونوں سے کر دی گئی، مگر اولاد کی عدم نفع رسانی کو مؤکد کر کے بیان فرمایا۔ اور لفظ وَلَدَ کے بجائے مَوْلُو د اختیار کرنے میں یہ حکمت ہے کہ مَوْلُو د صرف اولاد کو کہا جاتا ہے اور لفظ وَلَدُ عام ہے اولاد کی اولاد کو بھی شامل ہے۔ اس میں دوسرے رُخ سے اسی مضمون کی تائید اس طرح ہو گئی کہ خود صلی بیٹا بھی باپ کے کام نہ آئے گا، تو پوتے پڑپوتے کا حال معلوم ہے۔

اور دوسری آیت میں پانچ چیزوں کے علم کا بالخصوص حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا، اس کے سوا کسی مخلوق کو ان کا علم نہ ہونا بیان فرمایا ہے، اور اسی پر سورہ لقمان ختم

کی گئی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَمَةٍ قَتُمُوتٌ، یعنی اللہ ہی کے پاس ہے علم قیامت کا کہ کس سال کس تاریخ میں آئے گی، اور وہی بارش کو اتارتا ہے اور وہی جانتا ہے جو شکم مادر میں ہے کہ لڑکی ہے یا لڑکا اور کس شکل و صورت کا ہے، اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کو کیا کمائے گا یعنی خیر و شر میں سے کیا حاصل کرے گا، اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔

پہلی تین چیزوں میں اگرچہ یہ تصریح نہیں کی گئی کہ ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، مگر کلام الیہ عنوان سے ذکر کیا گیا ہے جس سے ان چیزوں کے علم کا انحصار علم الہی میں معلوم ہوتا ہے، اور باقی دو چیزوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ انہی پانچ چیزوں کو سورۃ النعام کی آیت میں مفاتیح الغیب فرمایا گیا ہے وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ، یعنی صرف اللہ ہی کے پاس ہے علم مفاتیح غیب کا کوئی نہیں جانتا ان کو جسے اللہ تعالیٰ کے حدیث میں اس کو مفاتیح الغیب فرمایا گیا کہ مَفَاتِحُ اور مَفَاتِيحُ مَفَاتِحُ کی جمع ہے، کنجی یا چابی کو کہتے ہیں، جس سے قفل کھلتے ہیں.... مراد اس سے اصول الغیب ہیں، جن سے معلومات غیب کھلتے ہیں۔

**مسئلہ علم غیب** | اس مسئلہ کی تفصیل بقدر ضرورت سورۃ نمل کی آیت قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ، کے تحت میں گزر چکی ہے۔ اس آیت میں مطلقاً علم غیب کا حق تعالیٰ کے لئے مخصوص ہونا صراحتاً بیان فرمایا گیا ہے اور یہی پوری امت کا عقیدہ سلفاً و خلفاً رہا ہے۔ آیت زیر بحث میں جو صرف پانچ چیزوں کو خصوصیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان کا علم کسی مخلوق کو نہیں، صرف اللہ تعالیٰ ہی ان کو جانتا ہے، یہ کوئی تخصیص کے لئے نہیں، ورنہ سورۃ نمل کی آیت سے تضاد ہو جائیگا بلکہ ان پانچ چیزوں کا خاص اہتمام بتلانے کے لئے یہاں ان کا ذکر فرمایا ہے۔

اور وجہ تخصیص و اہتمام کی یہ ہے کہ عام طور پر جن غیب کی چیزوں کو انسان معلوم کرنے کا شائق ہوتا ہے وہ یہی پانچ چیزیں ہیں نیز علم غیب کا دعویٰ کرنے والے بخوشی وغیرہ جن چیزوں کی خبریں لوگوں کو بتا کر اپنا عالم الغیب ہونا ثابت کرتے ہیں وہ یہی پانچ چیزیں ہیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انہی پانچ چیزوں کے متعلق دریافت کیا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جن میں ان پانچوں کے علم کا اللہ تعالیٰ



کے ساتھ مخصوص ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ (روح)

اور حدیث میں جو بروایت ابن عمرؓ و ابن مسعودؓ یہ ارشاد آیا ہے کہ اُوْتِیْتُ مَفَاتِحَ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا الْخَيْبَ (امام احمد، ابن کثیر، اس میں لفظ اُوْتِیْتُ نے خود یہ بات واضح کر دی کہ ان پانچ چیزوں کے علاوہ جن غایبات کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور وحی دیا گیا تھا، اس لئے وہ علم غیب کی تعریف میں شامل نہیں۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی — اور اولیاء کو بذریعہ الہام جو غیب کی چیزوں کی خبریں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیدی جاتی ہیں وہ حقیقت کے اعتبار سے علم غیب نہیں، جس کی بنا پر ان کو عالم الغیب کہا جاسکے بلکہ وہ اَنْبَاءُ الْغَيْبِ یعنی غیب کی خبریں ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے اپنے فرشتوں اور رسولوں اور مقبول بندوں کو عطا فرمادیتا ہے۔ قرآن کریم میں ان کو اَنْبَاءُ الْغَيْبِ فرمایا گیا ہے مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهَا اِلَيْكَ۔

اس لئے مطلب حدیث کا یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ایسا مخصوص فرمایا ہے کہ بطور انباء غیب کے بھی فرشتے اور رسول کو اس کا علم نہیں دیا گیا۔ اس کے علاوہ دوسری مغیبات کا علم بہت کچھ انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی دیدیا جاتا ہے۔

اس تقریر سے بھی ایک اور وجہ ان پانچ چیزوں کے خصوصی ذکر کی معلوم ہوگئی۔

**ایک شبہ اور جواب** | مذکورہ آیت سے یہ ثابت ہوا کہ مطلق علم غیب جو حق تعالیٰ کی خصوصیت ہے اس میں بھی خاص طور سے پانچ مذکورہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا علم کسی پیغمبر کو بذریعہ وحی بھی نہیں دیا جاتا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ چیزیں کسی کو بھی معلوم نہ ہوں، حالانکہ امت کے بہت سے اولیاء اللہ سے ایسے بے شمار واقعات منقول ہیں کہ انھوں نے کہیں بارش کی خبر دی یا کسی حمل کے متعلق کوئی خبر دی، کسی کے متعلق آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی خبر دی، کسی کے مرنے کی جگہ متعین کر کے بتلا دی، اور پھر یہ پیشینگوئی مشاہدہ سے صحیح بھی ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض نجومی یا جفرور مل وغیرہ کا فن جادو الے ان چیزوں کے متعلق بعض خبریں دیدیتے ہیں، اور بعض اوقات وہ صحیح بھی ہو جاتی ہیں، تو پھر ان پانچ چیزوں کی خصوصیت علم الہی کے ساتھ کس طرح رہی۔

اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو سورۃ نمل میں تفصیل سے آچکا ہے، اور اختصاراً

کے ساتھ اوپر مذکور ہوا ہے کہ علم غیب درحقیقت اس علم کو کہا جاتا ہے جو سبب طبعی کے واسطے سے نہ ہو، بلا واسطہ خود بخود ہو۔ یہ چیزیں انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی اور اولیاء کو بذریعہ الہام اور نجومیوں وغیرہ کو اپنے حسابات و اسباب طبیعیہ کے ذریعہ حاصل ہو جاتیں تو وہ علم غیب نہیں بلکہ انباء الغیب ہیں، جو کسی جزئی و شخصی معاملہ میں کسی مخلوق کو حاصل ہو جانا آیت مذکورہ کے منافی نہیں۔ کیونکہ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کا کھلی علم جو تمام مخلوقات اور تمام حالات پر حاوی ہو وہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو بذریعہ وحی یا الہام نہیں دیا، کسی ایک آودھ واقعہ میں کوئی جزئی علم بذریعہ الہام حاصل ہو جانا اس کے منافی نہیں۔

اس کے علاوہ علم سے مراد علم قطعی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، الہام کے ذریعہ جو علم کسی ولی کو حاصل ہوتا ہے وہ قطعی نہیں ہوتا، اس میں مغالطوں کے بہت احتمال رہتے ہیں، اور نجومیوں وغیرہ کی خبروں میں تو روزمرہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ دس جھوٹ میں ایک صحیح کا بھی تناسب نہیں ہوتا، اس کو علم قطعی کیسے کہہ سکتے ہیں۔

مسئلہ علم غیب کے متعلق | استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے فوائد ایک فائدہ ہمتہ | تفسیر میں ایک مختصر جامع بات فرمائی ہے، جس سے مذکورہ قسم کے سبب اشکالات ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ غیب کی دو قسمیں ہیں، ایک احکام غیبیہ ہیں جیسے احکام شرائع جن میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا علم بھی داخل ہے جس کو علم عقائد کہا جاتا ہے، اور وہ تمام احکام شرعیہ بھی جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کون سے کام پسند ہیں کون سے ناپسند، یہ سب چیزیں غیب ہی کی ہیں۔

دوسری قسم اکوان غیبیہ یعنی دنیا میں پیش آنے والے واقعات کا علم۔ پہلی قسم کے غائبات کا علم حق تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل کو عطا فرمایا ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتے بجز اس رسول کے جس کو اللہ تعالیٰ اس کام کے لئے پسند فرمائیں۔

اور دوسری قسم یعنی اکوان غیبیہ، ان کا علم کلی تو حق تعالیٰ کسی کو عطا نہیں فرماتے وہ بالکل ذات حق کے ساتھ مخصوص ہے، مگر علم جزئی خاص خاص واقعات کا جب چاہتا ہے جس قدر چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے۔ اس طرح اصل علم غیب تو سب کا سب حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، پھر وہ اپنے علم غیب میں سے احکام غیب کا علم تو عطا انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی بتلاتے ہی ہیں، اور یہی علم ان کی بعثت کا مقصد ہے۔



اکوان غیب کا علم جزئی بھی انبیاء و اولیاء کو بذریعہ وحی یا الہام جس قدر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے عطا فرمادیتا ہے، جو متجانب اللہ عطا کیا ہوا علم ہے۔ اس کو حقیقی معنی کے اعتبار سے علم الغیب نہیں کہا جاسکتا، بلکہ غیب کی خبریں (انباء الغیب) کہا جاتا ہے۔

**فوائد متعلقہ الفاظ آیت** | اس آیت میں پانچ چیزوں کے علم کا حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا ایک خاص اہتمام کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے، جس کا ظاہری تقاضا یہ تھا کہ ایک ہی عنوان سے پانچ چیزوں کو شمار کرنا کرکھدیا جاتا کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہر کسی مخلوق کو ان کا علم نہیں دیا گیا۔ مگر آیت مذکورہ میں ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ ابتدائی تین چیزوں کے علم کو تو مثبت طور پر اللہ کے لئے خاص ہونے کا ذکر فرمایا اور دو چیزوں میں غیر اللہ سے علم کی نفی فرمائی۔ اور پہلی تین چیزوں میں بھی علم ساعت یعنی قیامت کا ذکر تو اس طرح فرمایا کہ **إِنَّ اللَّهَ عِنْدَكَ عِلْمُ السَّاعَةِ**، یعنی اللہ ہی کے پاس ہے علم قیامت کا۔ اور دوسری چیز کا ذکر عنوان بدل کر جملہ فعلیہ میں اس طرح ذکر فرمایا **يُنْزِلُ الْغَيْثَ**، یعنی اللہ تعالیٰ اتارتا ہے بارش، اس میں بارش کے علم کا ذکر ہی نہیں، بلکہ اس میں اتارنے کا ذکر کر دوسری چیز کا ذکر بھر عنوان بدل کر اس طرح فرمایا کہ **وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ**، اس تغیر عنوان کو بلاغت کلام کا ایک تفتن بھی کہا جاسکتا ہے اور غور کرنے سے اس میں کچھ اور حکمتیں بھی معلوم ہوتی ہیں، جو بیان القرآن میں حضرت نے بیان فرمائی ہیں۔

**خلاصہ** یہ ہے کہ آخری دو چیزیں یعنی آئندہ کل میں انسان کیا کماے گا، اور یہ کہ وہ کس زمین میں مرے گا خود انسان کی ذات کے متعلق حالات ہیں ان میں احتمال ہو سکتا تھا کہ انسان ان کا علم حاصل کر لے اس لئے ان دونوں میں خصوصیت سے غیر اللہ کے علم کو منفی کر کے بیان فرمایا گیا، جس سے پہلی تین چیزوں کا علم غیر اللہ کے لئے نہ ہونا بدرجہ ادنیٰ ثابت ہو گیا کہ جب انسان خود اپنے اعمال و مکاسب کو اور ان کی انتہا یعنی موت اور اس کی جگہ نہیں جانتا تو آسمان اور نزولِ مطر اور شکمِ مادر کی اندھیریوں میں مخفی چیز کو کیا جانے گا؟ اور آخری چیز میں صرف مکانِ موت کا علم انسان کو نہ ہونا بیان فرمایا ہے حالانکہ مکانِ موت کی طرح زمانِ موت بھی انسان کے علم میں نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ مکانِ موت اگرچہ متعین طور پر معلوم نہ ہو مگر ظاہری حالات کے اعتبار سے انسان کچھ سمجھ سکتا ہے، کہ جہاں رہتا ہوتا ہے وہیں مرے گا اور کم از کم وہ مکان جس میں اس کو مرنا ہے دنیا میں موجود تو ہے، بخلاف زمانِ موت کے جو زمانہ مستقبل ہے ابھی وجود میں بھی نہیں آیا، تو جو شخص مکانِ موت کو موجود بالفعل ہونے کے باوجود نہیں جان سکتا، اس کے متعلق

یہ تصور کیسے کیا جائے کہ زمان موت جس کا اس وقت وجود ہی نہیں اس کو جان لے۔  
خلاصہ یہ ہے کہ یہاں ایک چیز کی نفی سے خود بخود دوسری چیزوں کی نفی بدرجہ اولیٰ  
معلوم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کو منفی عنوان سے بیان فرمایا۔ اور پہلی تین چیزیں تو  
انسانی دسترس سے ظاہر حالات میں خود ہی خارج ہیں، ان میں انسان کے علم کا دخل نہ ہوتا  
واضح ہے۔ اس لئے ان میں مثبت عنوان اختیار کر کے ان کا اختصاص حق تعالیٰ کے ساتھ  
بیان کر دیا گیا۔

اور ان میں سے پہلے جملے کو جملہ اسمیہ سے اور بعد کے دونوں جملوں کو فعلیہ کے عنوان  
سے ذکر کرنے میں شاید یہ حکمت ہے کہ قیامت تو ایک امر متعین ہے اس میں تجدد نہیں  
بخلاف نزولِ مطر اور حمل کے کہ ان کے حالات میں تجدد ہوتا رہتا ہے، اور جملہ فعلیہ تجدد  
پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں میں وہ استعمال کیا گیا، اور ان دونوں میں بھی حمل  
کے حالات میں تو علم الہی کا ذکر فرمایا وَيَعْلَمُ مَا فِي الْآرْحَامِ، اور نزولِ بارش میں علم کا  
ذکر ہی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں بارش تادل کرنے کا ذکر کر کے ضمناً یہ بھی بتلادیا کہ بارش  
جس سے انسان کے ہزاروں منافع وابستہ ہیں وہ اللہ ہی کے کرنے سے آتی ہے، اور  
کسی کے تصرف میں نہیں، اور اس کا علمی اختصاص تو سیاقِ کلام ہی سے ثابت ہو جاتا  
ہے۔ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُورَةُ لُقْمٰنٍ بِحَمْدِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ  
فِي ۵ رَذِي الْحِجَّةِ ۱۳۹۱ هـ يَوْمَ الْاُمْنِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



# سُورَةُ السَّجْدَةِ

سُورَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلَاثُونَ آيَةً وَثَلَاثُ رُكُوعَاتٍ

سورۃ سجده مکہ میں نازل ہوئی اس کی تیس آیتیں ہیں اور تین رکوع -

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے -

الَمْ ۱ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَأُرِيَبَ فِيهِ مِنْ سَرِّ الْعَالَمِينَ ۲

اُتارنا کتاب کا اس میں کچھ دھوکا نہیں پر دروگاہِ عالم کی طرف سے ہے

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا

کیا کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ باندھ لایا ہو کوئی نہیں وہ ٹھیک ہر تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو ڈر سناؤ ان لوگوں

مَا آتَاهُمْ مِنْ نَبِيٍّ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۳

کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈرانے والا تجھ سے پہلے تاکہ وہ راہ پر آئیں -

## خُلاصۃ تفسیر

الَمْ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے، (اور) اس میں کچھ مشبہ نہیں (اور) یہ رب العالمین کی طرف سے ہے (جیسا کہ اس کتاب کا اعجاز خود اس کی دلیل ہے) کیا یہ (منکر) لوگ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ اپنے دل سے بنا

ہے (یعنی یہ کہنا محض لغو اور جھوٹ ہے یہ بنایا ہوا نہیں) بلکہ یہ سچی کتاب ہے آپ کے رب کی طرف سے (آئی ہے) تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) ایسے لوگوں کو (عذاب الہی سے) ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا تاکہ وہ لوگ راہ پر آجائیں

## معارف و مسائل

مَا آتَاهُمْ مِّنْ نَّذِيرٍ، نذیر سے مراد اس جگہ رسول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انبیاء کی دعوت بھی ان کو اب تک نہ پہنچی تھی۔ کیونکہ دوسری آیت قرآن میں واضح طور پر ارشاد ہے وَإِنَّ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ، یعنی کوئی امت اور جماعت دنیا میں ایسی نہیں جس میں کوئی اللہ سے ڈرانے والا اور اس کی طرف دعوت دینے والا نہ آیا ہو۔

اس آیت میں لفظ نذیر اپنے عام لغوی معنی میں ہے۔ یعنی اللہ کی طرف دعوت دینے والا وہ خواہ رسول اور پیغمبر ہو یا ان کا کوئی نائب خلیفہ یا عالم دین۔ تو اس آیت سے تمام امتوں اور جماعتوں تک توحید کی دعوت پہنچ جانا معلوم ہوتا ہے، وہ اپنی جگہ صحیح و درست اور حق تعالیٰ کی رحمتِ عامہ کا مقتضا ہے، جیسا کہ ابو حنیان نے فرمایا کہ توحید اور ایمان کی دعوت کسی زمانے اور کسی مکان اور کسی قوم میں کبھی منقطع نہیں ہوتی، اور جب کہیں نبوت پر زمانہ دراز تک گزر جانے کے بعد اس نبوت کا علم رکھنے والے علماء بہت کم رہ گئے تو کوئی دوسرا نبی و رسول مبعوث ہو گیا۔ اس کا مقتضی یہ ہے کہ اقوام عرب میں بھی بقدر ضرورت توحید کی دعوت پہلے سے ضرور پہنچی ہوگی، مگر اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ دعوت خود کوئی نبی و رسول لے کر آیا ہو، ہو سکتا ہے کہ ان کے نائبین علماء کے ذریعہ پہنچ گئی ہو۔

اس لئے اس سورۃ اور سورۃ یسین وغیرہ کی وہ آیتیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قریش عرب میں آپ سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا تھا، ضروری ہے کہ اس میں نذیر سے مراد اصطلاحی معنی کے اعتبار سے رسول و نبی ہو۔ اور مراد یہ ہو کہ اس قوم کے اندر آپ سے پہلے کوئی نبی و رسول نہیں آیا تھا، اگرچہ دعوتِ ایمان و توحید دوسرے ذرائع سے یہاں بھی پہنچ چکی ہو۔ زمانہ فترت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بہت سے حضرات کے متعلق یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ دینِ ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام پر قائم تھے، توحید پر ان کا ایمان تھا، بت پرستی اور بتوں کے لئے قربانی دینے سے متنفر تھے۔

روح المعانی میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نبوت سے پہلے آپ سے ملے بھی تھے، مگر نبوت سے پہلے ان کا انتقال اس سال میں ہو گیا جس میں قریش نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی اور یہ واقعہ آپ کی نبوت سے پانچ سال پہلے کا ہے، ان کا حال موسیٰ بن عقبہ نے یہ نقل کیا ہے



کہ قریش کو بت پرستی سے روکتے تھے، اور بتوں کے نام پر شرابی دینے کو بہت برا کہتے تھے، اور شرکین کے ذبايح کا گوشت نہ کھاتے تھے۔

اور ابو داؤد و طیالسی زید بن عمرو بن نفیل کے صاحبزادے حضرت سعید بن زید بن عمرو صحابہ میں عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں یہ روایت کیا ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے والد کا جو کچھ حال تھا وہ آپ کو معلوم ہے کہ توحید پر قائم بت پرستی کے منکر تھے، تو کیا میں ان کے لئے دعائے مغفرت کر سکتا ہوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں ان کے لئے دعا پر مغفرت جائز ہے، وہ قیامت کے روز ایک مستقل امت ہو کر اٹھیں گے (روح) اسی طرح ورقہ بن نوفل جو آپ کے زمانہ نبوت شروع ہوئے اور نزول قرآن کی ابتداء کے وقت موجود تھے توحید پر قائم تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنے کا اپنا عزم ظاہر کیا تھا، مگر فوراً بعد ہی ان کی وفات ہو گئی۔ یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ اقوام عرب بھی دعوتِ الہیہ اور دعوتِ ایمان و توحید سے محروم تو نہیں تھیں، مگر خود ان کے اندر کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ واللہ اعلم

ان تینوں آیتوں میں قرآن کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کا اثبات ہے۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ

اللہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن کے

آيَاتٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِّنْ دُونِهِ مَن ذِي

اندر پھر قائم ہوا عرش پر، کوئی نہیں سمجھتا اس کے سوائے حاکم

وَلَا شَفِيعٌ إِلَّا مَن أَذِنَ لَهُ ۖ وَن ۝۴ يَكْبِتُ السَّامِعِ إِلَىٰ

اور نہ سفارشی پھر کیا تم دھیان نہیں کرتے۔ تدبیر سے اتارتا ہو کام آسمان سے زمین

الْأَرْضِ ثُمَّ يُعِزُّهُ إِلَىٰ يَوْمٍ كَانَ مِثْلُ الْأَفْسَانِ

تک پھر چڑھتا ہے وہ کام اس کی طرف ایک دن میں جس کا پیمانہ ہزار برس کا ہے

مِمَّا تَعْدُونَ ۖ ذٰلِكَ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزِ

تمھاری گنتی میں۔ یہی جاننے والا چھپے اور کھلے کا زبردست

الرَّحِيمُ ۱) الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ

رحم والا - جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور شروع کی انسان کی پیدائش

مِنْ طِينٍ ۲) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ۳)

ایک گالی سے - پھر بنائی اس کی اولاد نچرے ہوئے بے قدر پانی سے -

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِ رَبِّهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ

پھر اس کو برابر کیا اور پھونکی اس میں اپنی ایک جان اور بنادینے تمہارے لئے کان اور

الْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ طَقِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۴)

آنکھیں اور دل تم بہت تھوڑا شکر کرتے ہو

## خلاصہ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو اور اس مخلوق کو جو ان دونوں کے درمیان

میں موجود ہے چھ روز کی مقدار میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے

اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے وہ ایسا عظیم ہو کہ) بدون

اس (کی رضا و اذن) کے نہ تمہارا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارش کرنے والا (البتہ اذن سے

شفاعت ہو جائے گی اور نصرت کے ساتھ اذن ہی متعلق نہ ہوگا) سو کیا تم سمجھتے نہیں ہو کہ

ایسی ذات کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا اور وہ (ایسا ہے کہ) آسمان سے بیکر زمین تک

(جتنے امور ہیں) ہر امر کی (وہی) تدبیر (اور انتظام) کرتا ہے، پھر ہر امر اسی کے حضور میں

پہنچ جائے گا ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہاری شمار کے موافق ایک ہزار برس

کی ہوگی (یعنی قیامت میں سب امور اور ان کے متعلقات اس کے حضور میں پیش ہوں گے

سَقُولُ تَعَالَىٰ ذَا الْعَرْشِ عِزُّهُ ۵) وہی ہے جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا زبردست

رحمت والا جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی (یعنی جس مصلحت کے لئے اس کو بنایا اس کے

مناسب بنایا) اور انسان (یعنی آدم علیہ السلام) کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس

(انسان یعنی آدم) کی نسل کو خلاصہ اخلاط یعنی ایک بے قدر پانی سے (یعنی نطفہ سے جو

فضلہ ہو مہضم راجع غذا کا جس میں چار خلط خون، بلغم، سودا، صفرا ملتے ہیں) بنایا پھر

(ماں کے رحم میں) اس کے اعضاء درست کئے اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونکی



اور روبرو تقرر تم کو کان اور آنکھیں اور دل (یعنی ادراکات ظاہرہ و باطنہ) دیئے (اور ان سب باتوں کا جو کہ دال علی القدرۃ والا نعام ہیں مقتضایہ تھا کہ خدا کا شکر کرتے جس کی فردا عظم توحید ہے مگر) تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو (یعنی نہیں کرتے) :

## معارف و مسائل

روز قیامت کا طول | فی یوم کان مقدماً اربعۃ الف سنۃ قیماً تعدون، یعنی اس دن کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار سال کی ہوگی اور سورۃ معارج کی آیت میں ہے فی یوم کان مقدماً اربعۃ خمسیین الف سنۃ، یعنی اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی اس کا ایک سیدھا سا جواب تو وہ ہے جو بیان ہتر آن میں اختیار کیا گیا ہے کہ اس دن کے ہولناک ہونے کے سبب یہ ان لوگوں کو بہت دراز محسوس ہوگا۔ اور یہ درازی بمقدار اپنے ایمان و اعمال کے ہوگی جو بڑے مجرم ہیں ان کو زیادہ جو کم ہیں ان کو کم محسوس ہوگی، یہاں تک کہ جو دن بعض کو ایک ہزار سال کا معلوم ہوگا وہ دوسروں کے نزدیک پچاس ہزار سال کا ہوگا۔

تفسیر روح المعانی میں اور بھی متعدد توجیہات علماء اور صوفیاء کرام سے نقل کی گئی ہیں، مگر وہ سب کے سب قیاسات ہی ہیں۔ ایسی چیز جس کو قرآن کا مدلول کہا جاسکے یا جس پر یقین کیا جاسکے کوئی نہیں۔ اس لئے اسلم وہی طریقہ ہے جو سلف صالحین صحابہ و تابعین نے اختیار کیا، کہ اس ایک پچاس کے فرق کو علم الہی کے حوالہ کیا اور خود اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ ہمیں معلوم نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کے متعلق فرمایا ہما یوم مان ذکرہما اللہ تعالیٰ فی کتابہ اللہ تعالیٰ اعلم بہہما واکثرہ ان اقوال فی کتاب اللہ مالا اعلم راخرجہ عبد الرزاق والحاکم وصححہ، یعنی یہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور اللہ ہی ان کی حقیقت کو جانتا ہے، اور میں اس کو برا سمجھتا ہوں کہ قرآن میں وہ بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔

دنیا کی ہر چیز اپنی ذات میں حسن اور اچھی ہے | اَللّٰہُ تَعَالٰی اَحْسَنُ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقَ، یعنی اللہ وہ ذات برائی اس کے غلط استعمال سے آتی ہے | جو جس نے ہر چیز کی خلقت کو حسین اور بہتر بنایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس علم میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا وہ حکمت اور مصالح عالم کے اقتضاء سے بنایا ہے۔ اس لئے ہر چیز اپنی ذات کے اعتبار سے ایک حسن رکھتی ہے۔

اور ان سب سے زیادہ حسین اور بہتر انسان کو بنایا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: - تَقَدَّرَ  
خَلَقُنَا إِلَّا لِنَسَانٍ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ یعنی ہم نے انسان کو سب سے زیادہ حسین تقویم اور  
بہتر شکل و صورت میں پیدا کیا ہے۔

اور دوسری مخلوقات خواہ وہ ظاہر میں کتنی ہی قبیح اور بُری سمجھی جاتی ہوں، گتھا،  
خنزیر، سانپ، بچھو، شیر اور بھیڑ یا یہ سب زہریلے اور درد مندے جانور عام نظر دل  
میں بُرے سمجھے جاتے ہیں، مگر مجموعہ عالم کے مصالح کے اعتبار سے ان میں سے کوئی بُرا نہیں۔  
کسی نے خوب کہا ہے ۵

نہیں ہر چیز نکمی کوئی زمانے میں ۶ کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

حضرت حکیم الامتہؒ نے فرمایا کہ کل شئی میں تمام جواہر اور اعراض داخل ہیں یعنی  
وہ چیزیں بھی جو وجود جوہری رکھتی ہیں جیسے حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ اور اعراض  
بھی جن میں اخلاق و اعمال بھی داخل ہیں۔ یہاں تک کہ جو اخلاق بُرے بتلائے جاتے  
ہیں جیسے غصہ، حرص، شہوت وغیرہ یہ بھی اپنی ذات میں بُرے نہیں، ان کی بُرائی غیر ضرر  
میں صرف کرنے اور بے محل استعمال کرنے سے ہوتی ہے۔ اپنے محل میں رہیں تو ان میں کوئی چیز  
بُری نہیں۔ لیکن مراد اس سے ان اشیاء کی جہت تخلیق و تکوین ہے، کہ وہ خیر ہی خیر اور حسن  
ہی حسن ہے۔ اور اعمال کی دوسری جہت انسان کا کسب و اكتساب ہے، یعنی اپنے اختیار کو  
کسی کام کے کرنے میں صرف کرنا۔ تو اس حیثیت سے سب حسن نہیں، بلکہ ان میں تفصیل  
ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کی اجازت نہیں دی وہ حسن نہیں، قبیح ہیں۔ واللہ اعلم

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِن طِينٍ، اس سے پہلے یہ بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے  
عالم کی ہر چیز کو حسن بنایا ہے، اس کے بعد انسان کا ذکر فرمایا جو ان سب میں زیادہ حسین  
ہے۔ اس کے ساتھ کمال قدرت کے اظہار کے لئے یہ بھی بتلادیا کہ جس انسان کو ہم نے  
سب مخلوق سے زیادہ بہتر بنایا ہے وہ یہ نہیں کہ اس کا مادہ تخلیق کچھ سب سے زیادہ  
اشرف و اعلیٰ اور بہتر لیا گیا، اس لئے سب سے بہتر ہو گیا۔ بلکہ مادہ تخلیق تو اس کا سب  
کمتر چیز یعنی مٹی کو بنایا گیا، پھر قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ نے اس کو کمترین چیز کو کہاں سے  
کہاں پہنچایا کہ اشرف المخلوقات قرار دیا گیا۔

وَقَالُوا أَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ بَلْ

اور کہتے ہیں کہ جب ہم رُل گئے زمین میں کیا ہم کو نیا بننا ہے؟ کچھ نہیں



هُمْ يَلْقَآئِ رَبِّهِمْ كَافِرُونَ ⑩ قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي

وہ اپنے رب کی ملاقات سے منکر ہیں۔ تو کہہ قبض کر لیتا ہے تم کو فرشتہ موت کا جو

وَكُلَّ يَكْمُرُ إِلَى رَبِّكُمْ تَرْجِعُونَ ⑪ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمَجْرُمُونَ

تم پر مستر رہے پھر اپنے رب کی طرف پھر جاؤ گے۔ اور کبھی تو دیکھے جس وقت کہ منکر

نَاكِسُو أَرْعُسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ

سر ڈالے ہوئے ہوں گے اپنے رب کے سامنے اور ہم اے ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو بھیج دو کہ ہم

صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ⑫ وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًى سَا

کریں بھلے کام ہم کو یقین آگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو بچھایتے ہر جی کو اس کی راہ

وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ

لیکن ٹھیک پڑ چکی میری بات کہ مجھ کو بھرنی ہے دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے

أَجْمَعِينَ ⑬ فَوَقَّوْا يَسِيئَتِكُمْ لِقَاءِ يُومِكُمْ هَذَا إِنَّا

اکٹھے۔ سو اب چکھو مزہ جیسے تم نے بھلا دیا تھا اس اپنے دن کے ملنے کو ہم نے بھی

نَسِينُكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ⑭

بھلا دیا تم کو اور چکھو عذاب سدا کا عوض اپنے کئے کا۔

إِنَّمَا يُوعِظُ مِنْ بَايِتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا

ہماری باتوں کو وہی مانتے ہیں کہ جب ان کو سمجھاتے ان سے گر پڑیں سجدہ کر کر

وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ⑮ تَتَجَافَىٰ

اور پاک ذات کو یاد کریں اپنی رب کی خوبیوں کے ساتھ اور وہ بڑائی نہیں کرتے۔ جدا رہتی ہیں

جَنُودُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَ

ان کی کروٹیں اپنے سونے کی جگہ سے پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈر سے اور لالچ سے اور ہمارا

مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ⑯ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ

دیا ہوا کچھ خرچ کرتے ہیں۔ سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا دھری ہو ان کے واسطے

مِنْ قُسْرَةٍ أَعْيُنَ جَزَاءَ يَسْأَلُونَ ۝۱۷ أَفَمَنْ كَانَ

آنکھوں کی ٹھنڈک، بدلہ اس کا جو کرتے تھے - بھلا ایک جو ہے

مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ ۝۱۸ أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

ایمان پر کیا برابر، اس کے جو نافرمان ہو؟ نہیں برابر ہوتے، سو وہ لوگ جو یقین لائے اور کئے

الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۹

کام بھلے تو ان کے لئے باغ ہیں رہنے کے، مہمانی ان کاموں کی وجہ سے جو کرتے تھے

وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ كُلَّمَا أَسْرَدُوا أَنَّ

اور وہ لوگ جو نافرمان ہوئے سو ان کا گھر ہی آگ، جب چاہیں کہ نکل پڑیں اس

يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُقُوا عَذَابَ النَّارِ

میں سے اُٹا دیئے جائیں پھر اسی میں اور کہیں اُن کو چکھو آگ کا عذاب

الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝۲۰ وَلَكِنْ يَقْنَهُمْ مِنَ الْعَذَابِ

جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے - اور البتہ چکھائیں گے ہم اُن کو تھوڑا

أَلَّا دُنِيَ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝۲۱

عذاب ورے اس بڑے عذاب کے تاکہ وہ پھر آئیں -

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا إِنَّا

اور کون بے انصاف زیادہ اس سے جو سمجھایا گیا اُس کے رب کی باتوں سے پھر اُن کو مٹا دیا ہوا

مِنَ الْمَجْرِمِينَ مُتَقِصُونَ ۝۲۲

ہم کو ان گنہگاروں سے بدلہ لینا ہے

## خُلاصۂ تفسیر

اور یہ (کافر) لوگ کہتے ہیں کہ ہم جب زمین میں (میل چل کر) نیست و نابود ہو گئے، تو کیا ہم پھر (قیامت میں) نئے جہنم میں آویں گے (اور یہ لوگ اس بحث و نشر پر صرف متعجب ہی نہیں ہیں جیسا کہ ظاہر ان کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے، بلکہ (درحقیقت) وہ لوگ اپنے

وَقَدْ غَفَرْنَا

۲۵



رب سے ملنے کے منکر ہی ہیں (اور یہ استفہام ان کا انکاری ہے) آپ (جواب میں) فرمادیں گے کہ تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے جو تم پر (اللہ کی طرف سے) متعین ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹا کر لائے جاؤ گے (جواب میں اصل مقصود تو یہی ترجمہ ہوتا ہے، اور یَتَوَفَّيْكُمْ یَبِیْحٌ میں بڑھا دینا تحویل کے لئے ہے کہ موت بھی فرشتہ کے ذریعہ سے آئے گی جو جان نکلنے کے وقت تم کو مائے دھاڑے گا بھی جیسا دوسری آیت میں ہے وَ لَوْ تَرَىٰ اِذْ یَتَوَفَّی الدِّیْنَ کَافِرًا وَّالْمَلَائِکَۃُ یَصْرِیْوْنَ وُجُوْہَہُمْ وَاِذْ یَاۡذَہُمْ اِلَیْہِمْ مَرۡجَیْنِہٖ کا انجام صرف خاک ہی میں مل جانا نہ ہوگا، جیسا تمہارا قول ؕ اِذَا ضَلَلْنَا اِلَیْہِ سَے معلوم ہوتا ہے) اور (اس رجوع کے وقت جس پر تَرَجَّوْنَ دال ہے) اگر آپ (ان لوگوں کا حال) دیکھیں تو عجب حال دیکھیں جبکہ یہ مجرم لوگ (غایت شرمندگی سے) اپنے رب کے سامنے سر جھکاتے (کھڑے) ہوں گے (اور کہتے ہوں گے) کہ اے ہمارے پروردگار بس (اب) ہماری آنکھیں اور کان کھل گئے (اور معلوم ہو گیا کہ پیغمبروں نے جو کچھ کہا سب حق تھا) سو ہم کو (دنیا میں) پھر بھیج دیجئے ہم (اب کے جا کر خوب) نیک کام کیا کریں گے (اب) ہم کو پورا یقین آ گیا اور (یہ کہنا ان کا بے کار محض ہو گا اس لئے کہ) اگر ہم کو (یہ) منظور ہوتا (کہ ضرور ہی یہ راہ پر آئیں) تو ہم ہر اس شخص کو اس (کی نجات) کا راستہ (مقصود تک پہنچا دینے کے درجہ میں ضرور) عطا فرماتے (جیسا کہ ہدایت بمعنی مطلوب کا راستہ دکھانا ان کو عطا فرماتی ہے) لیکن میری (تو) یہ (ازلی تقدیری) بات (بہت سی حکمتوں سے) محقق ہو چکی ہے کہ میں جہنم کو جنات و انسان دونوں (میں جو کافر ہوں گے ان) سے ضرور پھرونگا (اور بیان بعض حکمتوں کا سورۃ ہود کے اخیر میں ایسی ہی آیت کی تفسیر میں گذرا ہے) تو (ان سے کہا جائے گا کہ) اب اس کا مزہ چکھو کہ تم اپنے اس دن کے آنے کو بھولے رہے ہو، ہم نے تم کو بھلا دیا (یعنی رحمت سے محروم کر دیا جس کو بھلانا مجازاً کہہ دیا) اور (ہم جو کہتے ہیں کہ مزہ چکھو، تو ایک دور و زکا نہیں بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اپنے اعمال (بد) کی بدولت ابدی عذاب کا مزہ چکھو (یہ تو کفار کا حال اور ان کا مآل ہوا۔ آگے مومنین کا حال اور مآل مذکور ہے، یعنی) بس ہماری آیتوں پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو وہ آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں (جس کی تحقیق سورۃ مریم کے رکوع چہارم میں ہوئی ہے) اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے لگتے ہیں اور وہ لوگ (ایمان سے) تکبر نہیں کرتے (جیسا کافر کا حال آیا ہے ذٰلِی مُسْتَكْبِرًا، یہ تو ان کی تصدیق و اقرار و اخلاق کا حال تھا اور اعمال کا حال یہ ہے کہ شب کو) ان کے پہلو خواہگا ہوں سے

علحدہ ہوتے ہیں خواہ فرض عشاء کے لئے یا تہجد کے لئے بھی اور اس سے سب روایتیں صحیح ہو گئیں اور خالی علحدہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس طور پر (علحدہ ہوتے ہیں) کہ وہ لوگ اپنے رب کو (ثواب کی) امید سے اور عذاب کے خوف سے پکارتے ہیں اس میں نماز اور دعا و ذکر سب آگیا اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں (مطلب یہ کہ ایمان لانے والوں کی یہ صفات ہیں جن میں بعض تو نفسِ ایمان کا موقوف علیہ ہیں اور بعض کمالِ ایمان کا) سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانہ غیب میں موجود ہے، یہ ان کو ان کے اعمال (نیک) کا صلہ ملا ہے (اور جب فریقین کا حال اور مآل معلوم ہو گیا) تو (اب بتلاؤ) جو شخص مؤمن ہو کیا وہ اس شخص جیسا ہو جائے گا جو بے حکم (یعنی کافر) ہو (نہیں) وہ آپس میں نہ حالانہ مالا، برابر نہیں ہو سکتے (چنانچہ معلوم بھی ہوا ہے، اور خاص مآل میں برابر نہ ہونے کی تفصیل تاکید کے لئے پھر بھی سن لو کہ) جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے، سو ان کے لئے ہمیشہ کا ٹھکانہ جنتیں ہیں، جو ان کے اعمال (نیک) کے بدلہ میں بطور ان کی مہمانی کے ہیں (یعنی مثل مہمان کے ان کو یہ چیزیں اکرام کے ساتھ ملیں گی نہ کہ سائل محتاج کی طرح بے قدری اور بے وقعتی کے ساتھ) اور جو لوگ بے حکم تھے سو ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے وہ لوگ جب اس سے باہر نکلنا چاہیں گے (اور کنارہ کی طرف کو بڑھیں گے) گو بوجہ گہرائی کے اور دروازوں کے قفل ہونے کے نکل نہ سکیں گے، مگر ایسے وقت میں یہ حرکت طبعی ہوتی ہے) تو پھر اسی میں دھکیل دی جائیں گے اور ان کو کہا جائے گا کہ دوزخ کا وہ عذاب چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے، (اور یہ عذاب موعود تو آخرت میں ہو گا) اور ہم ان کو قریب کا (یعنی دنیا میں آنے والا) عذاب بھی اس بڑے عذاب (موعود فی الآخرة) سے پہلے چکھا دیں گے (جیسے امراض و اسقام و مصائب کذا فی الدرر فوعا و موقوفاً، کیونکہ امراض و آفات حسب تصریح قرآن اکثر اعمالِ بد کے سبب آتے ہیں) تاکہ یہ لوگ (متاثر ہو کر کفر سے) باز آئیں (کقولہ تعالیٰ ظہر الفساد رالی) یزدچوون، پھر جو باز نہ آئے اس کے لئے عذاب اکبر ہے ہی) اور (ایسے لوگوں پر عذاب ہونے سے کچھ تعجب نہ ہونا چاہئے کیونکہ) اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جس کو اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جائیں پھر وہ ان سے اعراض کرے (تو اس کے استحقاقِ عذاب میں کیا شبہ ہے، اس لئے ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے) :



## معارف و مسائل

قُلْ يَتَوَفَّاكُم مِّمَّنْ مَلَائِكَةُ الَّتِي فِيكُمْ ۚ وَمَنْ يُكَلِّمْهُم يُلْقِ فِي قُلُوبِهِمْ مِنْ شَأْنٍ ۚ فَتَكُونُ كَالْأَسْمَانِ الَّتِي كَانَتْ ۚ قُلْ يَتَوَفَّاكُم مِّمَّنْ مَلَائِكَةُ الَّتِي فِيكُمْ ۚ وَمَنْ يُكَلِّمْهُم يُلْقِ فِي قُلُوبِهِمْ مِنْ شَأْنٍ ۚ فَتَكُونُ كَالْأَسْمَانِ الَّتِي كَانَتْ ۚ قُلْ يَتَوَفَّاكُم مِّمَّنْ مَلَائِكَةُ الَّتِي فِيكُمْ ۚ وَمَنْ يُكَلِّمْهُم يُلْقِ فِي قُلُوبِهِمْ مِنْ شَأْنٍ ۚ فَتَكُونُ كَالْأَسْمَانِ الَّتِي كَانَتْ ۚ

قیامت کو تنبیہ اور ان کے اس استعجاب کا جواب تھا کہ مرنے اور مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے، اس آیت میں اس کا بیان ہے کہ اپنی موت پر دھیان دو اور غور کرو تو وہ خود حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ایک بڑا منظر ہے، تم اپنی غفلت و جہل سے سمجھتے ہو کہ انسان کی موت خود بخود آجاتی ہے، بات یہ نہیں بلکہ اللہ کے نزدیک تمہاری موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اور اس کے لئے فرشتوں کا ایک خاص نظام ہے جن میں بڑے عزرائیل علیہ السلام ہیں کہ ساری دنیا کی موت ان کے انتظام میں دی گئی ہے۔ جس شخص کی جس وقت، جس جگہ موت مقدر ہو ٹھیک اسی وقت وہ اس کی روح قبض کرتے ہیں۔ آیت مذکورہ میں اسی کا بیان ہے۔ اور اس میں ملک الموت بلفظ مفسر ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد عزرائیل علیہ السلام ہیں۔ اور ایک دوسری آیت میں فرمایا ہے اَلَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ اس میں ملائکہ بلفظ صحیح لایا گیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ عزرائیل علیہ السلام تنہا یہ کام انجام نہیں دیتے، ان کے ماتحت بہت سے فرشتے اس میں شریک ہوتے ہیں۔

قبض روح اور ملک الموت | امام تفسیر مجاہد نے فرمایا کہ ساری دنیا ملک الموت کے سامنے کے متعلق بعض تفصیلات ایسی ہے جیسے کسی انسان کے سامنے ایک کھلے طشت میں دانے پڑے ہوں، وہ جس کو چاہے اٹھالے۔ یہ مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے (ذکرہ القسطنطینی فی التذکرہ)

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک انصاری صحابی کے سرہانے ملک الموت کو دیکھا تو فرمایا کہ میرے صحابی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو۔ ملک الموت نے جواب دیا کہ آپ مطمئن رہیں، میں ہر مومن کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتا ہوں اور فرمایا کہ جتنے آدمی شہروں میں یا دیہات اور جنگلوں پہاڑوں میں یا دریا میں آباد ہیں، میں ان میں سے ہر ایک کو دن میں پانچ مرتبہ دیکھتا ہوں۔ اس لئے میں ان کے ہر چھوٹے بڑے سے بلا واسطہ واقف ہوں۔ پھر فرمایا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ جو کچھ ہے اللہ کے حکم سے ہے ورنہ میں اگر ایک پتھر کی روح بھی قبض کرنا چاہوں تو مجھے اس پر قدرت نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ ہی کا امر اس کے لئے نہ آجائے۔

کیا جانوروں کی روح بھی ملک الموت قبض کرتے ہیں؟ | مذکورہ روایت حدیث سے معلوم ہوتا ہے

کہ چھپر کی روح بھی باذن خداوندی ملک الموت ہی قبض کرتے ہیں۔ حضرت امام مالکؒ نے ایک سوال کے جواب میں یہی فرمایا ہے، مگر بعض دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے کے ذریعہ قبض روح انسان کے لئے مخصوص ہے، اس کی شرافت و کرامت کے لئے باقی جانور باذن خداوندی بغیر واسطہ فرشتے کے مرجائیں گے (ذکرہ ابن عطیہ از قرطبی) یہی مضمون ابوالشیخ، عقیلی، دیلمی وغیرہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہاں ہم اور حشرات الارض سب کے سب اللہ کی تسبیح میں مشغول رہتے ہیں (یہی ان کی زندگی ہے) جب ان کی تسبیح ختم ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی روح قبض فرمالتا ہے، جانوروں کی موت ملک الموت کے سپرد نہیں۔ اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت ابن عمرؓ سے بھی روایت کی گئی ہے۔ (منظری)

اور ایک روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عزرائیل علیہ السلام کے سپرد ساری دنیا کی موت کا معاملہ کیا تو انھوں نے عرض کیا اے میرے پروردگار! آپ نے مجھے ایسی خدمت سپرد کی کہ ساری دنیا اور سب بنی آدم مجھے برا کہیں گے، اور جب میرا ذکر آئے گا بُرائی سے کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اس کا تدارک اس طرح کر دیا ہے کہ دنیا میں موت کے کچھ ظاہری اسباب اور امراض رکھ دیئے ہیں جن کے سبب لوگ موت کو ان اسباب و امراض کی طرف منسوب کریں گے آپ ان کی بدگوئی سے محفوظ رہیں گے۔ (قرطبی فی التفسیر والتذکرہ)

اور امام بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جتنے امراض اور درد اور زخم وغیرہ ہیں وہ سب موت کے قاصد ہیں، انسان کو اس کی موت یاد دلاتے ہیں، پھر جب موت کا وقت آجاتا ہے تو ملک الموت مرنے والے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے بندہ خدا میں نے اپنے آنے سے پہلے کتنی خبریں کتنے قاصد کے بعد دی گئے تھے خبردار کرنے اور موت کی تیاری کرنے کے لئے بصورتِ امراض و حوادث بھیجے ہیں، اب میں آپہونچا۔ جس کے بعد کوئی اور خبر دینے والا یا کوئی قاصد نہیں آئے گا اب تم اپنے رب کے حکم کو لا محالہ مانو گے خواہ خوشی سے یا مجبوری سے۔ (منظری)

مسئلہ ۱۔ ملک الموت کسی کی موت کا وقت پہلے سے نہیں جانتا، جب تک کہ اس کو حکم نہ دیا جائے کہ فلاں کی روح قبض کر لو (اخرجہ احمد وابن ابی الدنیا عن معمر، منظری) تَتَجَافَىٰ جُنُوجُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا، سابعہ آیات میں کفار و مشرکین و منکرین قیامت کو تنہات تھیں۔ اس کے بعد (انما يؤمنون



بِأَيِّتِنَا، سے مومنین مخلصین کی خاص صفات اور ان کے لئے درجات عظیمہ کا ذکر ہے۔ ان مومنین کی ایک صفت آیت مذکورہ میں یہ بتلائی گئی ہے کہ ان کے پہلو اپنے بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں، اور بستروں سے اٹھ کر اللہ کے ذکر اور دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اللہ کی ناراضی اور عذاب سے ڈرتے ہیں، اور اس کی رحمت اور ثواب کے امید دار رہتے ہیں۔ یہی امید و بیم کی پہلی محلی حالت ان کو ذکر و دعا کیلئے مضطرب رکھتی ہے۔ نماز، تہجد بستروں سے اٹھ کر ذکر و دعا میں مشغول ہو جانے سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک نماز تہجد اور نوافل ہیں جو سو کر اٹھنے کے بعد پڑھی جاتی ہیں (ہو قول الحسن و مجاہد و مالک و الاوزاعی) اور روایات حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

مسند احمد، ترمذی، نسائی وغیرہ میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھا۔ ایک روز میں دوران سفر میں صبح کے وقت آپ کے قریب ہوا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے جو مجھے جنت میں داخل کرے، اور جہنم سے دور کر دے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے ایک بڑی چیز کا سوال کیا، مگر جس کے لئے اللہ تعالیٰ آسان کر دے اس کو وہ آسان ہو جاتی ہے۔ اور فرمایا کہ وہ عمل یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو، اور بیت اللہ کا حج کرو۔ اور پھر فرمایا کہ اب میں تمہیں خیر یعنی نیکی کے ابواب بتلا دیتا ہوں (وہ یہ ہیں کہ) روزہ ڈھال ہے (جو عذاب سے بچاتا ہے) اور صدقہ آدمی کے گناہوں کی آگ بجھا دیتا ہے، اسی طرح آدمی کی نماز درمیان شب میں۔ اور یہ فرما کر قرآن مجید کی آیت مذکورہ تلاوت فرمائی تَجَنَّبْ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْأَسْوَاطِ وَالْأَفْوَاحِ وَالْأَفْوَاحِ وَالْأَفْوَاحِ۔ حضرت ابوالدرداءؓ اور قتادہؓ اور ضحاکؓ نے فرمایا ہے کہ پہلوؤں کے بستروں سے الگ ہو جانے کی یہ صفت ان لوگوں پر بھی صادق ہے جو عشاء کی نماز جماعت سے ادا کریں پھر صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھیں۔ اور ترمذی میں بسند صحیح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ یہ تَجَنَّبْ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْأَسْوَاطِ وَالْأَفْوَاحِ وَالْأَفْوَاحِ کی نماز سے پہلے نہ سونے اور جماعت عشاء کا انتظار کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

اور بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت ان لوگوں سے متعلق ہے جو مغرب اور عشاء کے درمیان نوافل پڑھتے ہیں۔ (رواہ محمد بن نصر) اور حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کے متعلق فرمایا کہ جو لوگ جب آنکھ کھلے اللہ کا ذکر کریں لیٹے، بیٹھے اور کھڑے ہو رہے ہیں اس میں داخل ہیں۔

ابن کثیر اور دوسرے کرامۃ تفسیر نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی تضاد نہیں، صحیح بات یہ ہو کہ یہ آیت ان سب کو شامل ہے۔ اور آخر شب کی نماز ان سب میں اعلیٰ و افضل پر بیان ہے قرآن میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

اور حضرت اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو قیامت کے روز جمع فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی کھڑا ہوگا جس کی آواز تمام مخلوقات سنیں گی وہ ندا دے گا کہ اہل محشر آج جان لیں گے کہ اللہ کے نزدیک کون لوگ عزت و اکرام کے مستحق ہیں۔ پھر وہ فرشتہ ندا دے گا کہ اہل محشر میں سے وہ لوگ کھڑے ہوں جن کی صفت یہ تھی تَنَجَّافِي جَنُودِہُمْ عَنِ الْمَضْجِجِ یعنی ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں، اس آواز پر یہ لوگ کھڑے ہوں گے جن کی تعداد قلیل ہوگی (ابن کثیر) اور اسی روایت کے بعض الفاظ میں ہے کہ یہ لوگ بغیر حساب کے جنت میں بھیج دیے جائیں گے۔ اس کے بعد اور تمام لوگ کھڑے ہوں گے، ان سے حساب لیا جائے گا (مظہری)

وَلَكِنْ يُقَنِّعُهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُونَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ، لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ، ادنیٰ بمعنی اقرب ہے، اور عذاب ادنیٰ سے مراد دنیا کے مصائب و آفات، اور امراض وغیرہ ہیں، اور عذاب اکبر سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔

دنیا کے مصائب اُن لوگوں | مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو ان کے گناہوں پر |  
کے لئے رحمت ہیں جو اللہ کی | متنبہ کرنے کے لئے دنیا میں اُن پر امراض اور مصائب و  
طرف رجوع کریں ؟؟؟ آفات مسلط کر دیتے ہیں، تاکہ یہ متنبہ ہو کر اپنے گناہوں سے باز  
آجائیں، اور آخرت کے عذاب اکبر سے نجات پائیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ گنہگاروں کے لئے دنیا کے مصائب و آفات اور امراض و تکالیف بھی ایک قسم کی رحمت ہی ہیں کہ غفلت سے باز آکر عذاب آخرت سے بچ جائیں۔ البتہ جو لوگ آفات پر بھی اللہ کی طرف رجوع نہ ہوں ان کے لئے یہ دوا ہر عذاب ہو جاتا ہے، ایک اسی دنیا میں نفرت اور دوسرا آخرت کا عذاب اکبر اور انبیاء و اولیاء اللہ پر جو آفات و مصائب آتے ہیں ان کا معاملہ ان سب الگ ہے، وہ ان کے امتحان اور امتحان کے ذریعہ رفع درجات کے لئے ہوتے ہیں، اور پہچان اس کی یہ ہے کہ ان لوگوں کو امراض و آفات کے وقت بھی ایک قسم کا قلبی سکون و اطمینان اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم



بعض جرائم کی سزا آخرت کے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے۔

اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ، بظاہر لفظ مجرمین میں ہر قسم کے مجرم شامل ہیں ، اور انتقام بھی عام ہے خواہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں میں۔ مگر بعض روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے، ایک حق کے خلاف جھنڈوں اور نعروں کے ساتھ اعلاناً کو شیش کرنا، دوسرے والدین کی نافرمانی، تیسرے ظالم کی امداد۔ (رواہ ابن جریر

عن معاذ بن جبلؓ)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهِ وَ

اور ہم نے دی ہر موسیٰ کو کتاب سو تو مت رہ دھوکے میں اس کے ملنے سے اور

جَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ ۖ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ آيَةً

کیا ہم نے اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے - اور کئے ہم نے ان میں پیشوا جو

يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لِمَا صَبِرُوا عَلَيْهِ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ﴿٢٣﴾

راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے اور اے ہماری باتوں پر یقین کرتے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ

تیرا رب جو یہودی فیصلہ کرے گا ان میں دن قیامت کے جس بات میں کہ وہ اختلاف

يُخْتَلِفُونَ ﴿٢٥﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِمَّنْ

کرتے تھے۔ کیا ان کو راہ نہ سوجھی اس بات سے کہ کتنی غارت کر ڈالیں ہم نے ان سے

الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسْكِرِهِمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّأَفْلا

پہلے جماعتیں کہ پھرتے ہیں یہ اُن کے گھروں میں اس میں بہت نشانیاں ہیں، کیا ۵

يَسْمَعُونَ ﴿٢٦﴾ أَوْ لَمَّ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ خَجْرًا

سنتے نہیں ؟ کیا دیکھا نہیں انھوں نے کہ ہم ہانک دیتے ہیں پانی کو ایک زمین چٹیل کی طرف

فَنُخْرِجُ بِهِ زُرْعَاتَا كُلِّ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ أَفَلَا يُبْصِرُونَ ﴿٢٥﴾

پھر ہم نکالتے ہیں اس کھیتی کہ کھاتے ہیں اُن میں سے ان کے چوپائے اور خود وہ بھی، پھر کیا دیکھتے نہیں؟

وَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْفَتْحُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٨﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ فیصلہ اگر تم سچے ہو ۔ تو کہہ کہ فیصلہ کے دن

لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيهَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٢٩﴾ فَأَعْرِضْ

کام نہ آئے گا منکروں کا ایمان لانا اور نہ اُن کو ڈھیل ملے گی ۔ سو تو خیال چھوڑ

عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ إِنَّهُمْ مُنْتَظَرُونَ ﴿٣٠﴾

ان کا اور منتظر رہ وہ بھی منتظر ہیں ۔

## حُلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (آپ ہی کی طرح) کتاب دی تھی (جس کی اشاعت میں ان کو تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں، اسی طرح آپ کو بھی برداشت کرنا چاہئے، ایک تسلی تو یہ ہوئی، پھر اسی طرح آپ کو بھی کتاب دی) سو آپ (اپنی) اس کتاب کے ملنے میں کچھ شک نہ کیجئے (بقولہ تعالیٰ وَإِلَيْكَ نَسْلُكُ الْقُرْآنَ، مطلب یہ کہ آپ صاحب کتاب صاحب خطاب ہیں پس جب آپ اللہ کے نزدیک الے مقبول ہیں تو اگر مشے چندا حق آپ کو قبول نہ کریں تو کوئی غم کی بات نہیں، ایک تسلی کی بات یہ ہوئی) اور ہم نے اس (کتاب موسیٰ) کو بنی اسرائیل کے لئے موجب ہدایت بنایا تھا (اسی طرح آپ کی کتاب سے بہتوں کو ہدایت ہوگی، آپ خوش رہئے، ایک تسلی یہ ہوئی) اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں بہت سے (دین کے) پیشوا بنادیتے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے، جبکہ وہ لوگ (تکلیف پر) صبر کرتے رہے، اور ہماری آیتوں کا یقین رکھتے تھے (اس لئے ان کی اشاعت اور خلق کی ہدایت میں مشقت گوارا کرتے تھے، یہ تسلی ہے مومنین کو کہ تم لوگ صبر کرو، اور جب تم صاحب یقین ہو اور یقین کا مقتضا صبر کرنا ہے تو تم کو صبر ضروری ہے، اس وقت ہم تم کو بھی ائمہ دین بنادیں گے یہ تو تسلی دنیا کے اعتبار سے ہے، اور ایک تسلی آخرت کے اعتبار سے تم کو رکھنا چاہئے اور امر موجب تسلی یہ ہے کہ) آپ کا رب قیامت کے روز ان سب کے آپس میں (عملی) فیصلہ ان امور میں کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کرتے تھے (یعنی مومن کو جنت میں اور کفار کو دوزخ میں ڈال دیگا اور قیامت بھی کچھ دور نہیں، اس سے بھی تسلی حاصل کرنا چاہئے، اور اس مضمون کو سن کر کفار و شبہہ کر سکتے تھے، ایک یہ کہ ہم اسی کو نہیں مانتے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا



کفر ناپسند ہے جیسا فیصلہ سے مفہوم ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ ہم قیامت ہی کو ناممکن سمجھتے ہیں، آگے دونوں کے دفع کے لئے دو مضمون ہیں، اول یہ کہ ان کو جو کفر کے مبعوض ہونے میں شبہ ہے تو کیا ان کو یہ امر موجب رہنمائی نہیں ہوا کہ ہم ان سے پہلے (ان کے کفر و شرک) کی سبب، کتنی امتیں ہلاک کر چکے ہیں کہ ان کے طریق ہلاکت سے دینِ نبی کی پیشینگوئی کے بعد بطور خرقِ عادت کے واقع ہونے سے خدا کا غضب ٹپکتا تھا جس سے مبعوض ہونا کفر کا صاف واضح ہوتا ہے) جن کے رہنے کے مقامات میں یہ لوگ (اثناے سفر شام میں) آتے جاتے (گزرتے) ہیں اس (امر) میں (تو) صاف نشانیاں (مبعوضیت کفر کی موجود) ہیں کیا یہ لوگ (ان گزشتہ اہم کے قصص) سنتے نہیں ہیں کہ مشہور ہیں اور زبانوں پر مذکور ہیں دوسرا مضمون یہ کہ ان کو جو قیامت میں شبہ عدم امکان کا ہے تو کیا انھوں نے اس بات پر نظر نہیں کیا کہ ہم (بادلوں یا نہروں وغیرہ کے ذریعہ سے) خشک زمین کی طرف پانی پہنچاتے ہیں پھر اس کے ذریعہ سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جس سے ان کے مویشی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں تو کیا اس بات کو شب و روز دیکھتے نہیں ہیں (یہ صاف نمونہ ہے مرکز زندہ ہونے کا، جیسا کئی جگہ اس کی تقریر گزری ہے، پس دونوں شبہ دفع ہو گئے) اور یہ لوگ (قیامت اور فیصلہ کا ذکر سن کر بطور استعجال و استہزاء کے یوں) کہتے ہیں کہ اگر تم (اس بات میں) سچے ہو تو (بتلاؤ) یہ فیصلہ کب ہوگا، آپ فرمادیجئے کہ (تم عبث اس کا تقاضا کرتے ہو تمھارے لئے تو وہ پوری مصیبت کا دن ہے، کیونکہ) اس فیصلہ کے دن کا فردل کو ان کا ایمان لانا (بالکل) نفع نہ دے گا اور یہی ایک صورت ان کے بچاؤ کی تھی اور وہی مفقود ہے) اور (نفع نجات تو کیا ہوتا) ان کو مہلت بھی (تو) نہ ملے گی سو (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے (جن کے خیال سے غم ہوتا ہے) اور آپ (فیصلہ موعود کے) منتظر رہتے یہ بھی (اپنے زعم میں آپ کے ضرر کے) منتظر ہیں (کقولہم نثر تبصیر بہ ربیب المنون، مگر معلوم ہو جائے گا کس کا انتظار مطابق واقع کے ہے اور کس کا نہیں، کقولہ تعالیٰ فی جوابہم قل تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْأَمْرِ تَبَصِّرِينَ) ۛ

## معارف و مسائل

فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهِ، لقاء کے معنی ملاقات کے ہیں اس آیت میں کس کی ملاقات کس سے مراد ہے؟ اس میں اہل تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے جس کو خلاصہ تفسیر میں اختیار کیا گیا ہے کہ لِقَائِهِ کی ضمیر کتاب یعنی قرآن کی طرف راجع ہے

قرار دے کر مطلب یہ لیا گیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے کتاب دی آپ بھی اپنی کتاب کے آنے میں کوئی شک نہ کریں، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں قرآن کے متعلق ایسے الفاظ آئے ہیں وَ اِنَّكَ تَشْكِي الْقُرْآنَ

اور حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؓ سے اس کی تفسیر اس طرح منقول ہے کہ یقائنہ کی ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجح ہے، اور اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ آپ اس میں شک نہ کریں کہ آپ کی ملاقات موسیٰ علیہ السلام سے ہوگی۔ چنانچہ ایک ملاقات شب معراج میں ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، پھر قیامت میں ملاقات ہونا بھی ثابت ہے۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے اس کی یہ تفسیر فرمائی ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو ایک کتاب دی گئی اور لوگوں نے ان کی تکذیب کی اور ان کو ستایا۔ آپ بھی یقین رکھیں کہ یہ سب چیزیں آپ کو بھی پیش آئیں گی۔ اس لئے آپ کفار کی ایذاؤں سے دلگیر نہ ہوں، بلکہ اس کو سنتِ انبیاء سمجھ کر برداشت کریں۔

کسی قوم کا مقتدا، امام  
وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰیٰتًا يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنا لِنُصَبِّحَ رُفُوًا  
بننے کے لئے دو مشطیں  
گائو اِیٰتِنَا یُوقِنُوْنَ، یعنی ہم نے بنی اسرائیل میں سے کچھ  
لوگوں کو امام اور پیشوا و مقتدا بنا دیا جو اپنے پیغمبر کے نائب ہونے کی حیثیت سے باذن ربانی لوگوں کو ہدایت کیا کرتے تھے، جبکہ انھوں نے صبر کیا، اور جبکہ وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

اس آیت میں علماء بنی اسرائیل میں سے بعض کو امامت و پیشوائی کا درجہ عطا فرماتے کے سبب ذکر فرمائے ہیں، اول صبر کرنا، دوسرے آیات الہیہ پر یقین کرنا۔ صبر کرنے کا مفہوم عربی زبان کے اعتبار سے بہت وسیع اور عام ہے۔ اس کے لفظی معنی باندھنے اور ثابت رہنے کے ہیں۔ اس جگہ صبر سے مراد احکام الہیہ کی پابندی پر ثابت قدم رہنا اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام یا مکروہ قرار دیا ہے ان سے اپنے نفس کو روکنا ہے۔ جس میں تمام احکام شریعت کی پابندی آجاتی ہے، اور یہ بہت بڑا عملی کمال ہے۔ دوسرا سبب ان کا آیات الہیہ پر یقین رکھنا ہے۔ اس میں آیات کے مفہوم کو سمجھنا پھر سمجھ کر اس پر یقین کرنا دونوں داخل ہیں، یہ بہت بڑا کمال علمی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امامت و پیشوائی کے لائق اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہ لوگ ہیں جو عمل میں بھی کامل ہوں اور علم میں بھی، اور یہاں عملی کمال کو علمی کمال سے مقدم بیان فرمایا ہے۔



کہ ترتیب طبعی میں علم عمل سے مقدم ہوتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ کے نزدیک وہ علم قابل اعتبار ہی نہیں جس کے ساتھ عمل نہ ہو۔

ابن کثیر نے بعض علماء کا قول اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ **يَا صَبِّرُوا وَالْيَقِينِ** **مَنَالِ الْإِمَامَةِ فِي الدِّينِ**، ”یعنی صبر اور یقین ہی کے ذریعہ دین میں کسی کو امامت کا درجہ مل سکتا ہے“ **أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا**، ”یعنی کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم خشک زمین کی طرف پانی کو بعض مواقع میں (زمین پر چلا کر لے جاتے ہیں، جس سے اُن کی کھیتیاں اُگتی ہیں)“ **جُرُزُ** خشک زمین کو کہتے ہیں جس میں درخت نہیں اُگتے۔

زمین کی آبپاشی کا ایک خاص حکیمانہ نظام میں جا بجا اس طرح آیا ہے کہ اس زمین پر بارش برستی ہے، اس سے زمین تر و تازہ ہو کر اُگانے کے قابل ہو جاتی ہے۔ مگر اس آیت میں بارش کے بجائے پانی کو زمین پر چلا کر خشک زمین کی طرف لے جانے اور اس سے درخت اُگانے کا ذکر فرمایا ہے۔ یعنی بارش کسی دوسری زمین پر نازل کی جاتی ہے وہاں سے ندی نالوں کے ذریعہ زمین پر چلا کر پانی کو خشک زمین کی طرف لجا یا جاتا ہے جہاں بارش نہیں ہوتی۔

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ بعض زمینیں ایسی خام اور نرم ہوتی ہیں جو بارش کی متحمل نہیں ہوتیں، اگر وہاں پوری بارش برساتی جائے تو عمارتیں منہدم ہو جائیں، درخت اکھڑ جائیں۔ اس لئے قدرت نے ایسی زمینوں کے لئے یہ نظام بنایا ہے کہ بارش تو اس زمین پر نازل کی جاتی ہے جو اس کی متحمل ہے، پھر یہاں سے پانی بہا کر ایسی زمینوں کی طرف لے جایا جاتا ہے جو بارش کی متحمل نہیں، جیسے مصر کی زمین ہے۔ اور بعض مفسرین نے یمن اور شام کی بعض زمینوں کو اس کا مصداق قرار دیا ہے (کنز الدی عن ابن عباس الحسن) اور صحیح یہ ہے کہ یہ مضمون ایسی تمام زمینوں کو شامل ہے اور مصر کی زمین خصوصیت سے اس میں شامل ہے، جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ مگر بلاد حبشہ افریقہ کی بارشوں کا پانی دریائے نیل کے ذریعہ مصر میں آتا ہے، اور وہاں کی سرخ مٹی ساتھ لاتا ہے، جس میں انبات کا مادہ زیادہ ہے۔ اس لئے مصر کے لوگ اپنے ملک میں بارش نہ ہونے کے باوجود ہر سال نئے پانی اور نئی مٹی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ **فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ** **وَلَيَقُولَنَّ مَتَى هَذَا الْفَتْحُ** ”یعنی کفار یہ کہتے ہیں کہ وہ فتح کب ہوگی“ جس کا آپ ذکر کرتے ہیں کہ مؤمنین کو کفار پر غلبہ ہوگا، ہمیں تو کہیں اس کے آثار نظر نہیں آتے،

ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان خائف ہیں، چپتے پھرتے ہیں۔  
 اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا أَلَيْسَ لَهُمْ  
 كُفْرُؤُا اَيُّمَا نَحْنُ، ”یعنی آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ تم ہماری فتح کا دن ہم  
 سے کیا پوچھتے ہو وہ دن تو تمہاری مصیبت کا ہوگا کیونکہ جس وقت ہماری فتح ہوگی تو اس وقت  
 تم عذاب میں گرفتار ہو چکے ہو گے، خواہ دنیا میں جیسے غزوہ بدر میں ہوا یا آخرت میں۔  
 اور جب اللہ کا عذاب کسی کو پکڑ لیتا ہے پھر اس کا ایمان قبول نہیں ہوتا۔ کذا ذکرہ ابن کثیر  
 اور ابن جریر نے اس جگہ مَثٰی هٰذَا الْفَتْحِ کے معنی روز قیامت کے کئے  
 ہیں۔ اوپر خلاصہ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم ۛ

## سُورَةُ السَّجْدَةِ

سُورَةُ السَّجْدَةِ بِحَمْدِ اللَّهِ سُبْحَانَهُ  
 فِي لَيْلَةِ عَرَفَةَ مِنْ ذِي الْحِجَّةِ ۱۴۳۹ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



# سُورَةُ الْاَحْزَابِ

سُورَةُ الْاَحْزَابِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلَاثٌ وَسَبْعُونَ آيَةً وَتِسْعٌ رُكُوعًا ۝

سورۃ احزاب مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی تہتر آیتیں ہیں اور نو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ

اے نبی! اللہ سے اور کہانہ مان منکر دلوں کا اور دغا بازوں کا مقرر اللہ ہے

كَانَ عَلَيْهِمْ حَكِيمًا ① وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ إِنَّ

سب کچھ جاننے والا حکمتوں والا ۔ اور چل اسی پر جو حکم آئے تجھ کو تیرے رب کی طرف بیشک

اللَّهُ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ② وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ

اللہ تمھارے کام کی خبر رکھتا ہے ۔ اور بھروسہ رکھ اللہ پر اور اللہ

بِاللَّهِ وَكِيلًا ③

کافی ہے کام بنانے والا

## مُخْلِصَةٌ تَفْسِير

اے نبی! اللہ سے ڈرتے رہئے اور کسی سے نہ ڈرتے اور ان کی دھمکیوں کی ذرا پروا

نہ کیجئے، اور کافروں کا جو کھلم کھلا دین کے خلاف مشورے دیتے ہیں، اور منافقوں کا (جو درپردہ

ان کے ساتھ متفق ہیں، کہنا نہ مانتے) بلکہ اللہ ہی کا کہنا کیجئے، بیشک اللہ تعالیٰ بڑا علم والا

بڑی حکمت والا ہے (اس کا ہر حکم فائدہ اور مصالح پر مشتمل ہوتا ہے) اور اللہ کا کہنا مانتا یہ ہے کہ آپ کے پروردگار کی طرف سے جو حکم آپ پر وحی کیا جاتا ہے اس پر چلتے (اور اے لوگو) بیشک تم لوگوں کے سب اعمال کی اللہ تعالیٰ۔ پوری خبر رکھتا ہے (تم میں سے جو ہمارے پیغمبر کی مخالفت اور مزاحمت کر رہے ہیں ہم سب کو سمجھیں گے، اور اے نبی) آپ (ان لوگوں کی دھمکیوں کے معاملہ میں) اللہ پر بھروسہ رکھتے اور اللہ کافی کارساز ہے (اس کے مقابلہ میں ان لوگوں کی کوئی تدبیر نہیں چل سکتی، اس لئے کچھ فکر نہ کیجئے، البتہ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کسی تباہ کو مقتضی ہو اور اس کی وجہ سے کوئی عارضی تکلیف پہنچ جائے تو وہ ضرر نہیں بلکہ عین منفعت ہی) :

## معارف و مسائل

یہ مدنی سورۃ ہے اس کے بیشتر مضامین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت اور خصوصیت عند اللہ پر مشتمل ہیں، جس میں آپ کی تعظیم کا واجب ہونا اور آپ کی ایذا رسانی کا حرام ہونا مختلف عنوانات سے بیان ہوا ہے۔ اور باقی مضامین سورۃ بھی انہی کی تکمیل و اتمام سے مناسبت رکھتے ہیں۔

**شان نزول** اس سورۃ کے سبب نزول میں چند روایات منقول ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہوئے، تو مدینہ کے آس پاس یہود کے قبائل، بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقار وغیرہ آباد تھے۔ رحمتہ للعالمین کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح یہ لوگ مسلمان ہو جائیں۔ اتفاقاً ان یہودیوں میں سے چند آدمی آپ کی خدمت میں آنے لگے، اور منافقانہ طور پر اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگے، دلوں میں ایمان نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو غیبت سمجھا، کہ کچھ لوگ مسلمان ہو جائیں تو دوسروں کو دعوت دینا آسان ہو جائے گا۔ اس لئے آپ ان لوگوں کے ساتھ خاص مدارات کا معاملہ فرماتے، اور ان کے چھوٹے بڑے آنے والوں کا اکرام کرتے تھے، اور کوئی بڑی بات بھی ان سے صادر ہوتی تو دینی مصلحت سمجھ کر اس سے چشم پوشی فرماتے تھے۔ اس واقعہ پر سورۃ احزاب کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ (قرطبی)

ایک دوسرا واقعہ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی سے نقل کیا ہے کہ ہجرت کے بعد کفار مکہ میں سے ولید بن مغیرہ اور شیبہ ابن ربیعہ مدینہ طیبہ آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ پیشکش کی کہ ہم سب قریش مکہ کے آدمی ہیں آپ کو دیدیں گے اگر آپ اپنے دعوے کو چھوڑ دیں۔ اور مدینہ طیبہ کے منافقین اور یہود نے آپ کو یہ



دھکی دی کہ اگر آپ نے اپنا دعویٰ اور دعوت سے رجوع نہ کیا تو ہم آپ کو قتل کر دیں گے۔  
اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں (روح)

تیسرا ایک واقعہ ثعلبی اور واحدی نے بغیر سند یہ نقل کیا ہے کہ ابوسفیان اور عکرمہ ابن ابی جہل اور ابوالاعور سلمي اس زمانے میں جب واقعہ حدیبیہ میں کفار مکہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ترک جنگ پر معاہدہ ہو گیا تھا تو یہ لوگ مدینہ طیبہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ہمارے معبودوں کا بُرائی سے ذکر کرنا چھوڑ دیں، صرف اتنا کہہ دیں کہ یہ بھی شفاعت کریں گے اور نفع پہنچائیں گے۔ آپ اتنا کر لیں تو ہم آپ کو اور آپ کے رب کو چھوڑ دیں گے، جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

ان کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں کو سخت ناگوار ہوئی، مسلمانوں نے ان کے قتل کا ارادہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان سے معاہدہ صلح کر چکا ہوں اس لئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں (روح) یہ روایات اگرچہ مختلف ہیں مگر درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں، یہ واقعات بھی آیات مذکورہ کے نزول کا سبب ہو سکتے ہیں۔

ان آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو حکم دیئے گئے: پہلا اَتَّقِ اللہَ یعنی اللہ سے ڈرو، دوسرا لَا تَطِيعُوا الْكٰفِرِیْنَ یعنی کافروں کا کہنا نہ مانو۔ اللہ سے ڈرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ ان لوگوں کو قتل کرنا عہد شکنی ہے جو حرام ہے۔ اور کفار کی بات نہ ماننے کا حکم اس لئے کہ ان تمام واقعات میں کفار کی جو فرمائشیں ہیں وہ ماننے کے قابل نہیں۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللہَ، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اعزاز و اکرام ہے کہ پورے قرآن میں کہیں آپ کو نام لے کر خطاب نہیں کیا گیا، جیسا کہ دوسرے انبیاء کے خطابات میں یَا اٰدَمُ، یَا نُوحُ، یَا اِبْرٰهٖمَ، یَا مُوسٰی وغیرہ بار بار آیا ہے، بلکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے قرآن میں جہاں خطاب کیا گیا وہ کسی لقب نبی یا رسول وغیرہ سے خطاب کیا گیا۔ صرف چار مواقع جن میں یہی بتلانا منظور تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، ان میں آپ کا نام ذکر کیا گیا ہے جو ضروری تھا۔

اس خطاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو حکم دیئے گئے۔ ایک خدا تعالیٰ سے ڈرنے کا، کہ مشرکین مکہ سے جو معاہدہ ہو چکا ہے اس کی خلاف ورزی نہ ہونی چاہیے، دوسرے مشرکین اور منافقین و یہود کی بات نہ ماننے کا۔ یہاں جو یہ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہر گناہ سے معصوم ہیں، عہد شکنی بھی گناہ کبیرہ ہے، اور کفار و مشرکین کی وہ باتیں جو شانِ نزول میں اوپر بیان کی گئیں، ان کا ماننا بھی گناہ عظیم ہے تو آپ خود ہی اس سے محفوظ تھے۔ پھر اس حکم کی ضرورت کیا پیش آئی؟ روح المعانی میں ہے کہ مراد ان احکام سے آئندہ بھی ان پر قائم رہنے کی ہدایت ہے جیسا کہ اس واقعہ میں آپ ان پر قائم رہے اور اتق اللہ کے حکم کو اس لئے مقدم کیا کہ مسلمانوں نے ان مشرکین مکہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا جن سے معاہدہ صلح ہو چکا تھا۔ اس لئے عہد شکنی سے بچنے کی ہدایت لفظ اتق اللہ کے ذریعہ مقدم کی گئی۔ بخلاف اطاعت کفار و مشرکین کے کہ اس کا کسی نے ارادہ بھی نہ کیا تھا اس لئے اس کو متوخر کیا گیا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مراد امت کو سنانا ہے، آپ تو معصوم تھے، احکام الہیہ کی خلاف ورزی کا آپ سے کوئی احتمال نہ تھا۔ مگر قانون پوری امت کے لئے ہے، ان کو سنانے کا عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا جس سے حکم کی اہمیت بہت بڑھ گئی، کہ جب اللہ کے رسول بھی اس کے مخاطب ہیں تو امت کا کوئی فرد اس سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔

اور ابن کثیر نے فرمایا کہ اس آیت میں کفار و مشرکین کی اطاعت سے منع کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ ان سے مشورے نہ کریں، ان کو زیادہ مجالست کا موقع نہ دیں۔ کیونکہ ایسے مشورے اور باہمی روابط ایسا اوقات اس کا سبب بن جایا کرتے ہیں کہ ان کی بات مان لی جائے تو اگرچہ ان کی بات مان لینے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی احتمال نہ تھا، مگر ان کے تھا ایسے روابط رکھنے اور ان کو اپنے مشوروں میں شریک کرنے سے بھی آپ کو روک دیا گیا، اور اس کو اطاعت کے لفظ سے اس لئے تعبیر کر دیا کہ ایسے مشورے اور باہمی روابط عادیہ ماننے کا سبب بن جایا کرتے ہیں۔ تو یہاں درحقیقت آپ کو اسباب اطاعت سے منع کیا گیا ہے، نفس اطاعت کا تو آپ سے احتمال ہی تھا۔

رہا یہ سوال کہ آیت مذکورہ میں کافروں کی طرف سے خلافِ شرع اور خلافِ حق باتوں کا اظہار تو کوئی بعید نہیں، ان کی اطاعت سے منع کرنا بھی ظاہر ہے۔ مگر منافقین نے اگر اسلام کے خلاف کوئی بات آپ سے کہی تو پھر وہ منافقین نہ رہے، کھلے کافر ہو گئے ان کو الگ ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہوتی؟ جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ منافقین نے بالکل کھول کر تو کوئی بات خلاف اسلام نہ کہی ہو، مگر دوسرے کفار کی تائید اور حمایت میں کوئی کلمہ کہا ہو۔



اور منافقین کا جو واقعہ شان نزول میں اوپر بیان ہوا ہے، اگر اس کو سبب نزول قرار دیا جائے تو اس میں اشکال ہی نہیں کیونکہ اس واقعہ کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے روکا گیا ہے کہ ان اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے یہود سے آپ زیادہ مدارات کا معاملہ نہ کریں۔

اس آیت کے آخر میں **إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا**، فرما کر اس حکم کی حکمت بیان کر دی گئی۔ جو اوپر دیا گیا ہے کہ اللہ سے ڈریں، اور کفار و منافقین کا کہنا نہ مانیں۔ کیونکہ عواقب امور اور نتائج کا جاننے والا اللہ تعالیٰ بڑا حکیم ہے، وہی مصالح عباد کو جانتا ہے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ کفار یا منافقین کی بعض باتیں ایسی بھی تھیں جن سے شر و فساد کم ہونے اور باہمی رواداری کی فضا قائم ہونے وغیرہ کے فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ مگر حق تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا کہ ان لوگوں کے ساتھ یہ رواداری بھی مصلحت کے خلاف ہے، اس کا انجام اچھا نہیں۔

**وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ** **إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا**، یہ پہلے ہی حکم کا تکملہ ہے کہ آپ کفار و منافقین کی باتوں میں نہ آئیں، اُن کی بات نہ مانیں بلکہ جو کچھ اللہ کی طرف سے آپ کو بذریعہ وحی بتلایا گیا ہے بس آپ اور صحابہ اسی کا اتباع کریں۔ چونکہ اس خطاب میں صحابہ کرام اور عام مسلمان بھی شامل ہیں، اس لئے آخر میں بصیغہ جمع **بِمَا تَعْمَلُونَ** فرما کر تنبیہ کر دی گئی۔

**وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا**، یہ بھی اسی حکم کی تکمیل ہے۔ اس میں ارشاد ہے کہ آپ ان لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھریں، اور اپنے مقصد کی کامیابی میں صرف اللہ پر بھروسہ کریں کہ وہی کافی کارساز ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے آپ کسی کی رواداری کی ضرورت نہیں۔

**مَسْئَلَةٌ** : آیات مذکورہ سے ثابت ہوا کہ امور دین میں کفار سے مشورہ لینا بھی جائز نہیں۔ دوسرے امور جن کا تعلق تجربہ وغیرہ سے ہو ان میں مشورہ لینے میں مضائقہ نہیں۔ واللہ اعلم

**مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ وَ مَا جَعَلَ**

اللہ نے رکھے نہیں کسی مرد کے دودل اس کے اندر اور نہیں کیا تمھاری

**أَزْوَاجَكُمْ أَلِيًّا تَضَاهَرُونَ مِنْهُمْ أَمْ هُمْ كَذِبُونَ** **وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ**

جو روادوں کو جن کو ماں کہہ بیٹھے (ہو رچی) مائیں تمھاری اور نہیں کیا تمھارے پالکوں کو تمھارا

أَبْنَاءَكُمْ قُلْ لَكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ

بیٹے، یہ تمہاری بات ہی اپنے منہ کی، اور اللہ کہتا ہے ٹھیک بات اور

يَهْدِي السَّبِيلَ ۝ أَدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ

وہی سمجھاتا ہے راہ۔ پکارو لے باگوں کو ان کے باپ کی طرف نسبت کر کے ہی پورا انصاف اللہ کے یہاں

فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخوانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ

پھر اگر نہ جانتو ہو ان کے باپ کو تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق ہیں،

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيهَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ ۚ وَلَكِنْ مَّا تَعَسَّيْتُمْ

اور گناہ نہیں تم پر جس چیز میں چوک جاؤ، پر وہ جو دل سے ارادہ

قُلُوبُكُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

کرد، اور ہی اللہ بخشنے والا مہربان۔

## خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے اور (اسی طرح) تمہاری اُن بیٹیوں کو جن سے تم ظہار کر لیتے ہو تمہاری ماں نہیں بنایا اور اسی طرح سمجھو کہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا ریح مچ کا، بیٹا (بھی) نہیں بنا دیا یہ صرف تمہارے منہ سے کہنے کی بات ہے (جو غلط ہے) واقع کے مطابق نہیں) اور اللہ تعالیٰ حق بات فرماتا ہے اور وہی سیدھا راستہ بتلاتا ہے (اور جب منہ بولے بیٹے واقع میں تمہارے بیٹے نہیں تو) تم اُن کو (متبہی بنانے والوں کا بیٹا مت کہو، بلکہ) ان کے (حقیقی) باپوں کی طرف منسوب کیا کرو، یہ اللہ کے نزدیک راستی کی بات ہے، اور اگر تم ان کے باپوں کو نہ جانتے ہو تو اُن کو اپنا بھائی یا اپنا دوست کہہ کر پکارو کیونکہ آخر) وہ تمہارے دین کے بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں، اور تم کو اس میں جو بھول چوک ہو جائے تو اس سے تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا لیکن ہاں جو دل سے ارادہ کر کے کہو (تو اس سے گناہ ہوگا) اور اس سے بھی معافی مانگو تو معاف ہو جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۝



## معارف و مسائل

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار و منافقین کے مشوروں پر عمل نہ کرنے اور ان کی بات نہ ماننے کی ہدایت ہے۔ آیات مذکورہ میں کفار میں چلی ہوئی تین رسموں اور باطل خیالات کی تردید ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب لوگ اپنے شخص کو جو زیادہ ذہین ہو یہ کہا کرتے تھے کہ اس کے سینے میں دو دل ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں اپنی ازواج کے متعلق ایک رسم تھی کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو اپنی ماں کی بیٹھیا یا اور کسی عضو سے تشبیہ دی اور کہہ دیا کہ تو میرے لئے ایسی ہے جیسے میری ماں کی بیٹھیا اس کو ان کے محاورہ میں ظہار کہا جاتا تھا، جو ظہر سے مشتق ہے، ظہر کے معنی ہیں بیٹھ۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ جس شخص نے اپنی بیوی سے ظہار کر لیا وہ ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو گئی۔

تیسرے یہ کہ ان میں ایک رسم یہ تھی کہ ایک آدمی کسی دوسرے کے بیٹے کو اپنا متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنا لیتا تھا اور جو اس طرح بیٹا بناتا یہ لڑکا اسی کا بیٹا مشہور ہو جاتا، اور اسی کا بیٹا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اور ان کے نزدیک یہ منہ بولا بیٹا تمام احکام میں اصلی بیٹے کی طرح مانا جاتا تھا۔ مثلاً میراث میں بھی اس کی اولاد کے ساتھ مثل حقیقی اولاد کے شریک ہوتا تھا اور نسبی رشتہ سے جن عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہوتا ہے، یہ منہ بولے بیٹے کے رشتہ کو بھی ایسا ہی قرار دیتے۔ مثلاً جیسے اپنے حقیقی بیٹے کی بیوی سے اس کے طلاق دینے کے بعد بھی نکاح حرام رہتا ہے یہ منہ بولے بیٹے کی بیوی کو بھی بعد طلاق اس شخص کے لئے حرام سمجھتے تھے۔

زمانہ جاہلیت کے یہ تین باطل خیالات درسوم تھے جن میں سے پہلی بات اگرچہ مذہبی عقیدے یا عمل سے متعلق نہیں تھی۔ اس لئے شریعت اسلام کو اس کی تردید کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ محض فنی تشریح و طب کا معاملہ تھا کہ انسان کے سینے میں ایک ہی دل ہوتا ہے یا دو بھی ہوتے ہیں، اس کا ظاہر بطلان ہونا سہی کو معلوم تھا۔ اس لئے شاید اس کے بطلان کے ذکر کو بھی باقی دو مسئلوں کی تائید و تمہید کے طور پر بیان کر دیا گیا۔ کہ جس طرح اہل جاہلیت کا یہ کہنا باطل ہے کہ کسی ایک انسان کے سینہ میں دو دل ہو سکتے ہیں اور اس کے بطلان کو عام و خاص سبھی جانتے ہیں اسی طرح ظہار اور متبنیٰ کے مسائل میں بھی ان کے خیالات باطل ہیں۔

باقی دو مسئلے ایک ظہار دوسرے متبنیٰ بیٹے کے احکام یہ ان معاشرتی اور عائلی

مسائل میں سے ہیں جن کی اسلام میں خاص اہمیت ہے۔ یہاں تک کہ ان کی جزئیات اور تفصیلات بھی حق تعالیٰ نے قرآن میں خود ہی بیان فرمائی ہیں۔ دوسرے معاملات کی طرح صرف اصول بیان کر کے تفصیلی بیان کو پیغمبر کے حوالہ نہیں فرمایا۔ ان دونوں مسئلوں میں اہل جاہلیت نے اپنی بے بنیاد خواہشات سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے خود ساختہ قوانین بنارکھے تھے۔ دین حق کا فرض تھا کہ وہ ان باطل رسوم و خیالات کا ابطال کر کے حق بات واضح کرے۔ اس لئے بیان فرمایا وَمَا جَعَلَ آذُنًا جُحُورًا لِّی تَظْهَرُ رُءُوسُ مِنْهُمْ اَمْ كُنْتُمْ اَعْمٰی، یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ اگر کسی نے بیوی کو ماں کی برابر یا مثل کہہ دیا تو وہ حقیقی ماں کی طرح ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہوگئی، تمہارے کہنے سے بیوی حقیقتہً ماں نہیں ہو جاتی، تمہاری ماں تو وہی ہے جس سے تم پیدا ہوئے، مو۔ اس آیت نے اہل جاہلیت کے اس خیال کو تو باطل کر دیا کہ ظہار کرنے سے حرمت مؤبدہ نہیں ہوتی۔ آگے یہ بات کہ ایسا کہنے پر کوئی شرعی اثر مرتب ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کا حکم مستقلاً سورۃ مجادلہ میں بتلایا گیا ہے کہ ایسا کہنا گناہ ہے، اس سے پرہیز واجب ہے، اور ایسا کہنے والا اگر کفارہ ظہار ادا کر دے تو بیوی اس کے لئے حلال ہو جاتی ہے۔ کفارہ ظہار کی تفصیل سورۃ مجادلہ میں آئے گی۔

دوسرا مسئلہ متبنی بیٹے کا تھا۔ اس کے متعلق فرمایا وَمَا جَعَلَ اَدْعِیَاءَ کُفْرًا اَبْنَاءَ کُفْرٍ، اَدْعِیَاءَ، دعویٰ کی جمع ہے۔ دعویٰ وہ لڑکا ہے جس کو منہ بولا بیٹا کہا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان کے پہلو میں دو دل نہیں ہوتے، اور جس طرح بیوی کو ماں کے مثل کہنے سے بیوی ماں نہیں بن جاتی، اسی طرح منہ بولا بیٹا تمہارا بیٹا نہیں بن جاتا۔ یعنی دوسرے بیٹوں کے ساتھ وہ میراث میں شریک ہوگا اور نہ حرمت نکاح کے مسائل اس پر عائد ہوں گے کہ بیٹے کی مطلقہ بیوی باپ پر ہمیشہ کے لئے حرام ہے تو متبنی کی بیوی بھی حرام ہو۔

اور چونکہ اس آخری معاملے کا اثر بہت سے معاملات پر پڑتا ہے۔ اس لئے یہ حکم نافذ کر دیا گیا کہ متبنی بیٹے کو جب پکار دیا اس کا ذکر کرو تو اس کے اصلی باپ کی طرف منسوب کر کے ذکر کرو۔ جس نے بیٹا بنا لیا ہے اس کا بیٹا کہہ کر خطاب نہ کرو۔ کیونکہ اس سے بہت سے معاملات میں اشتباہ اور القباس پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہم زید بن حارثہ کو زید بن محمد کہا کرتے تھے (کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)



نے ان کو متبہی بنا لیا تھا، اس آیت کے نزول کے بعد ہم نے یہ عادت چھوڑ دی۔  
 مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ اکثر آدمی جو دوسروں کے بچوں کو بیٹا کہہ کر بکارتے ہیں  
 جب کہ محض شفقت کی وجہ سے ہو متبہی قرار دینے کی وجہ سے نہ ہو تو یہ اگرچہ جائز ہے مگر پھر  
 بھی بہتر نہیں کہ صورتہ ممانعت میں داخل ہے (کذا فی الروح عن التحفاجی علی البیضاوی)  
 اور یہی وہ معاملہ ہے جس نے قریش عرب کو مغالطہ میں ڈال کر ایک بہت بڑے  
 گناہ عظیم کا مرتکب بنا دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگانے لگے کہ آپ نے  
 اپنے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیا۔ حالانکہ وہ آپ کے بیٹے نہ تھے بلکہ متبہی تھے،  
 جس کا ذکر اسی سورہ میں آگے آنے والا ہے۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ

نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اس کی عورتیں اُن کی مائیں ہیں،

وَأُولَٰئِكَ حَٰلَ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِی كِتَابِ اللَّهِ مِنَ

اور قرابت والے ایک دوسرے سے لگاؤ رکھتے ہیں اللہ کے حکم میں

الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَٰكُمْ

زیادہ سب ایمان والوں اور ہجرت کرنے والوں سے مگر یہ کہ کرنا چاہو اپنے رفیقوں سے

مَعْرُوفًا كَانَ ذَٰلِكَ فِی الْكِتَابِ مَسْطُورًا ①

احسان، یہ ہے کتاب میں لکھا ہوا۔

## خُلاصۂ تفسیر

نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مؤمنین کے ساتھ تو ان کے نفس (اور ذات) سے بھی زیادہ  
 تعلق رکھتے ہیں کیونکہ انسان کا نفس تو کبھی اس کو نفع پہنچاتا ہے کبھی نقصان، کیونکہ اگر  
 نفس اچھا ہے اچھے کاموں کی طرف چلتا ہے تو نفع ہے اور بُرے کاموں کی طرف چلنے لگے  
 تو خود اپنا نفس ہی اپنے لئے مصیبت بن جاتا ہے، بخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے  
 کہ آپ کی تعلیم نفع ہی نفع اور خیر ہی خیر ہے۔ اور اپنا نفس اگر اچھا بھی ہو اور نیکی ہی کی

کی طرف چلتا ہو پھر بھی اس کا نفع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفع کی برابر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اپنے نفس کو تو خیر و شر اور مصلحت و مضرت میں مغالطہ بھی ہو سکتا ہے، اور اس کو مصالح و مضار کا پورا علم بھی نہیں، بخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کی تعلیمات میں کسی مغالطہ کا خطرہ نہیں۔ اور جب نفع رسانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری جان اور ہمارے نفس سے بھی زیادہ ہیں تو ان کا حق ہم پر ہماری جان سے زیادہ ہے، اور وہ حق یہی ہے کہ آپ کی ہر کام میں اطاعت کریں اور آپ کی تعظیم و تکریم تمام مخلوقات سے زیادہ کریں، اور آپ کی بیبیاں اُن (مؤمنین) کی مائیں ہیں یعنی مذکورہ تفسیر سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنین کے لئے روحانی باپ ہیں جو اُن کی اپنی ذات سے بھی زیادہ اُن پر شفیع و مہربان ہیں، اسی مناسبت سے آپ کی ازواج مطہرات امت کی مائیں ہو گئیں یعنی تعظیم و تکریم میں ان کا حق ماؤں کی طرح ہے۔

اس آیت نے ازواج مطہرات کو صراحۃً امت کی مائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اشارۃً امت کے روحانی باپ قرار دیدیا، تو اس سے بھی اسی طرح کا ایک التباس اور اشتباہ ہو سکتا تھا جس طرح کا اشتباہ متنبیؒ کو اس کے غیر حقیقی باپ کی طرف منسوب کرنے میں ہوتا تھا، جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ امت کے مسلمان سب آپس میں حقیقی بھائی بہن ہو جائیں تو ان کے آپس میں نکاح کا تعلق حرام ہو جائے، اور میراث کے احکام میں بھی ہر مسلمان دوسرے کا وارث قرار دیا جائے، اس التباس کو دور کرنے کے لئے آخر آیت میں فرمایا وَأُولَٰئِكَ هُم بِأَقْرَبُ یعنی بعضہم آؤ لی بعضہم فی کتب اللہ (یعنی رشتہ دار کتاب اللہ یعنی حکم شرعی) میں ایک دوسرے سے میراث کا زیادہ تعلق رکھتے ہیں، بہ نسبت دوسرے مؤمنین اور مہاجرین کے مگر یہ کہ تم اپنے (ان) دوستوں سے بطور وصیت کے کچھ سلوک کرنا چاہو تو وہ جائز ہے، یہ بات لوح محفوظ میں لکھی جا چکی ہے، (کہ ابتداءً ہجرت میں ایمانی اخوت کی بنا پر مہاجرین کو انصار کی میراث کا حق دار بنادیا گیا تھا مگر بالآخر تقسیم میراث رشتہ داری اور ارحام کی بنیاد پر رہے گی) ۛ

## معارف و مسائل

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے سورۃ احزاب میں بیشتر مضامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور آپ کی ایذاء رسانی کے حرام ہونے سے متعلق ہیں۔ شروع سورۃ میں مشرکین و منافقین کی ایذاؤں کا ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات دی گئی



تھیں۔ اس کے بعد جاہلیت کی تین رسموں کا ابطال کیا گیا، جن میں آخری رسم کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا سے تھا۔ کیونکہ کفار نے حضرت زیدؓ کی مطلقہ بی بی زینبؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے وقت اسی اپنی جاہلانہ رسم متبنی کی بناء پر آپؐ پر یہ الزام لگایا کہ آپؐ نے اپنے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیا۔ اس طرح شروع سورۃ سے یہاں تک ایذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مضمون تھا، اس آیت مذکورہ میں آپؐ کی تعظیم و اطاعت تمام مخلوق سے زیادہ واجب ہونا بیان کیا گیا ہے۔

الَّتِي أُولَىٰ بِالنَّبِيِّ هُنَّ أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ ۖ أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ كَأَبُو مَرْثَدَةَ تَفْسِير میں بیان کیا گیا ہر وہ ابن عطیہ وغیرہ کا قول ہے جس کو قرطبی اور اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپؐ کا حکم ہر مسلمان کے لئے اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ واجب التحیل ہے۔ اگر ماں باپ آپؐ کے کسی حکم کے خلاف کہیں ان کا کہنا ماننا جائز نہیں، اسی طرح خود اپنے نفس کی تمام خواہشات پر بھی آپؐ کے حکم کی تحیل مقدم ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا مِنْ مُّؤْمِنٍ إِلَّا وَآكَأُولَىٰ	یعنی کوئی مؤمن ایسا نہیں جس کیلئے
النَّاسِ يَهْدِي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ	میں دنیا و آخرت میں سالے انسانوں
إِقْرَعُوا إِنْ شِئْتُمْ أَلَّتِي	سے زیادہ اولیٰ اور اقرب نہ ہوں،
أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ	اگر تمھارا دل چاہے تو اس کی تصدیق

کے لئے قرآن کی یہ آیت پڑھ لو، أَلَّتِي أُولَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ ۖ

جس کا حاصل یہ ہے کہ میں ہر مؤمن مسلمان پر ساری دنیا سے زیادہ شفیق و مہربان ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا لازمی اثر یہ ہونا چاہئے کہ ہر مؤمن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سب سے زیادہ ہو۔ جیسا کہ حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ	یعنی تم میں سے کوئی اس وقت تک
أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ	مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کے
وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ	دل میں میری محبت اپنے باپ، بیٹے
(بخاری و مسلم، مظہری)	اور سب انسانوں سے زیادہ نہ ہو جائے،

وَأَزْوَاجَهُمْ أَهْلَهُمْ، ازواج مطہرات کو اہل کی مائیں فرمانے سے مراد تعظیم و تکریم کے اعتبار سے مائیں ہونا ہے۔ ماں اور اولاد کے دوسرے احکام حرمت

نکاح اور محرم ہونے کی وجہ سے باہم پردہ نہ ہونا اور میراث میں حصہ دار ہونا وغیرہ یہ احکام اس سے متعلق نہیں، جیسا کہ آخر آیت میں اس کو کھول دیا گیا ہے۔ اور ازواجِ مطہرات سے کسی امتی کا نکاح حرام ہونا وہ ایک مستقل آیت میں علیحدہ فرمایا گیا ہے۔ اس لئے فیہ ردی نہیں کہ یہ حرمت نکاح بھی مائیں ہونے کی وجہ سے ہو۔

مَسْئَلہ: آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ ازواجِ مطہرات میں سے کسی کی شان میں کوئی ادنیٰ بے ادبی اس لئے بھی حرام ہے کہ وہ امت کی مائیں ہیں، اور اس لئے بھی کہ ان کی ایذا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہونچے گی جو اشتدادِ وجہ کا حرام ہے۔  
وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ، أُولُو الْأَرْحَامِ کے لفظی معنی سب رشتہ داروں اور قرابت داروں کو شامل ہیں، خواہ وہ لوگ ہوں جن کو فقہاء عصباء کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، یا وہ جن کو خاص اصطلاح کے اعتبار سے عصباء کے بالمقابل اولوالارحام کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ فقہی اصطلاح جو بعد میں اختیار کی گئی ہے مراد نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ رسولؐ اور ان کی ازواج کا تعلق مؤمنین امت سے — اگرچہ اس درجہ ہے کہ ماں باپ سے بھی مقدم ہے، مگر میراث کے احکام میں اس کا کوئی دخل نہیں بلکہ میراثِ نبوی اور قرابتی رشتوں کی بنیاد پر ہی تقسیم کی جائے گی۔  
میراث کی حصہ داری شروع اسلام میں ایسا ہی اور روحانی رشتہ کی بنیاد پر تھی، بعد میں اس کو منسوخ کر کے قرابتی رشتوں کی بنیاد پر کر دی گئی جس کی تفصیل قرآن کریم نے خود بتلا دی ہے۔ یہ پوری تفصیل ناسخ اور منسوخ آیتوں کی سورۃ انفال میں گذر چکی ہے۔ اور مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ کے بعد الْمُهَاجِرِينَ کا ذکر اس صورت میں ان کا اختصاص امتیاز بتلانے کے لئے ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں مؤمنین سے مراد انصار اور مہاجرین سے مراد قریش ہیں۔ مہاجرین کے مقابل سے مؤمنین کا لفظ انصار کے لئے ہونا معلوم ہو گیا۔ اس صورت میں یہ آیت توارثِ بالہجرۃ کے لئے ناسخ ہوگی۔ کیونکہ ابتداء ہجرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کر کر ان کے باہم وراثت جاری ہونے کا بھی حکم دیا تھا، اس آیت نے اس توارثِ بالہجرۃ کو بھی منسوخ کر دیا (قرطبی)

إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أُولِيَ الْأَمْوَالِ مِمَّا مَعَكُمْ ذُوًّا، یعنی وراثت تو صرف رشتہ داری کے تعلق سے ملے گی، غیر رشتہ دار وراثت نہیں ہوگا۔ مگر ایمانی اخوت کی بنا پر جن لوگوں سے



تعلق ہو ان کو کچھ دینا چاہو تو اس کا بہر حال اختیار ہے۔ اپنی زندگی میں بھی بطور ہدیہ تحفہ ان کو دے سکتے ہو اور موت کے بعد ان کے لئے وصیت بھی کر سکتے ہیں۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَ مِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ

اور جب لیا ہم نے نبیوں سے ان کا اقرار اور تجھ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے

وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ۝ لِيَسْأَلَ

اور موسیٰ سے اور عیسیٰ سے جو بیٹا مریم کا اور لیا ہم نے ان سے گاڑھا قرار، تاکہ پوچھے

الصَّادِقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

اللہ پچوں سے ان کا پچ اور تیار کر رکھا ہے مستکروں کے لئے دردناک عذاب۔

## خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب کہ ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا اقرار لیا کہ احکام الہیہ کا اتباع کریں جن میں خلق اللہ کو تبلیغ و دعوت اور باہمی تعاون و تناصر بھی داخل ہے اور ان پیغمبروں میں آپ سے بھی (اقرار لیا) اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم (علیہم السلام) سے بھی اور یہ کوئی معمولی عہد و اقرار نہیں تھا بلکہ ہم نے ان سب سے خوب پختہ عہد لیا تاکہ رقیامت کے روز ان سچے لوگوں سے یعنی انبیاء علیہم السلام سے ان کے سچ کی تحقیقات کرے تاکہ ان کا شرف و اعزاز اور نہ ماننے والوں پر جنت مکمل ہو جائے، اس عہد اور اس کی تحقیقات سے دو باتوں کا وجوب ثابت ہو گیا کہ صاحب وحی پر اپنی وحی کا اتباع واجب ہے، اور جو عام لوگ صاحب وحی نہیں ان پر اپنے صاحب وحی پیغمبر کے اتباع کا وجوب اور کافروں کے لئے (جو صاحب وحی کے اتباع سے منحرف ہیں) اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

## معارف و مسائل

شروع سورۃ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وحی کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِيَّاكَ اور گزشتہ آیت اَلَّذِي يَأْمُرُكَ بِمَنْ يَنْتَهِیٰ عَنْ مَّا هُوَ حَرَامٌ پر صاحب وحی کے احکام کی تعمیل واجب کی گئی ہے۔ انہی دونوں باتوں کے مزید اثبات و اظہار کے لئے

مذکورہ دونوں آیتوں میں بھی دو مضمون بیان ہوئے ہیں، یعنی صاحبِ وحی کو اپنی وحی کا اتباع اور غیر صاحبِ وحی کو صاحبِ وحی کا اتباع کرنا واجب ہے۔

**میشاقِ انبیاء** | آیت مذکورہ میں جو انبیاء علیہم السلام سے عہد و اقرار لینے کا ذکر ہے وہ اس اقرار عام کے علاوہ ہے جو ساری مخلوق سے لیا گیا ہے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ میں بروایت امام احمد مرفوعاً آیا ہے کہ: **خُصُّوا بِمِثَاقِ السَّامَاءِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ قَوْلُهُ تَعَالَى وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ** الآية

یہ عہد انبیاء علیہم السلام سے نبوت و رسالت کے فرائض ادا کرنے اور باہم ایک دوسرے کی تصدیق اور مدد کرنے کا عہد تھا۔ جیسا کہ ابن جریر ابن ابی حاتم وغیرہ نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے۔ اور ایک روایت میں اس عہد انبیاء میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ سب اس کا بھی اعلان کریں کہ **مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ لَا نَبِيَّ بَعْدَكَ** یعنی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

اور یہ میثاقِ انبیاء بھی ازل میں اسی وقت لیا گیا جبکہ عام مخلوق سے **أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ** کا عہد لیا گیا تھا (روح و منظری)

**وَمِنْ ذُو نُوحٍ** الآية انبیاء علیہم السلام کا عام ذکر کرنے کے بعد ان میں سے پانچ انبیاء کا خصوصی ذکر ان کے اس خاص امتیاز و شرف کی بناء پر کیا گیا، جو ان کو زمرۃ انبیاء میں حاصل ہے۔ اور ان میں بھی لفظ **مِنْكَ** میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو اولیت سے مقدم کیا گیا، اگرچہ آپ کی بعثت سب کے بعد ہے، وجہ اس کی خود حدیث میں یہ بیان فرمائی ہے:

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تخلیق و تکوین میں سارے انسانوں سے پہلا ہوں اور بعثت و نبوت میں سب سے آخری۔

كُنْتُ أَوَّلَ النَّاسِ فِي الْخَلْقِ  
وَأَخْرَجَهُمْ فِي الْبَعْثِ، رَوَاهُ  
ابن سعد و أبو نعیم فی المحلیۃ عن میسرۃ  
الفجر والطبرانی فی المعجم عن ابن عباس،

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَ قَوْمُ**

اے ایمان والو یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب چڑھ آئیں تم پر **جُنُودًا فَآرَ سَلْنَا عَلَيْهِمُ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ** فوجیں پھر ہم نے بھیج دی اُن پر ہوا اور وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں، اور ہے



اللَّهُ يَمَّا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ⑨ اِذْ جَاءُوكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ

اللہ جو کچھ کرتے ہو دیکھنے والا ۔ جب چڑھ آئے تم پر ادھر کی طرف سے اور

أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ نَزَّاعَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ

نیچے سے اور جب بدنہ لگیں آنکھیں اور پہنچے دل گھلوں

الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ⑩ هَٰذَا لِكِ الْبَاقِي الْمُؤْمِنُونَ

تک اور اٹکل کرنے لگے تم اللہ پر طرح طرح کی انگلیں، وہاں جانچے گئے ایمان والے

وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ⑪ وَاِذْ يَقُولُ الْمُسَافِقُونَ وَالَّذِينَ

اور جھڑجھڑاتے گئے زور کا جھڑجھڑانا، اور جب کہنے لگے منافق اور جن کے

فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ⑫

دلوں میں روگ ہے جو وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ نے اور اس کے رسول نے سب فریب تھا۔

وَاِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ

اور جب کہنے لگی ایک جماعت ان میں اے یثرب والو! تمہارے لئے ٹھکانہ نہیں

فَارْجِعُوا وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ

سو پھر چلو، اور رخصت مانگنے لگا ایک فرقہ ان میں نبی سے کہنے لگے ہمارے گھر

بَيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ⑬

کھلے پڑے ہیں، اور وہ کھلے نہیں پڑے ان کی کوئی غرض نہیں مگر بھاگ جانا۔

وَلَوْ دَخَلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ أَقْطَارِهَا ثَمَّ سَأَلُوا الْفِتْنَةَ لَأَنزَلُوهَا

اور اگر شہر میں کوئی گھس آئے ان پر اس کے کناروں سے پھر ان سے چارہ دین سے بچنا تو مان لیں

وَمَا تَلَبَّسُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ⑭ وَلَقَدْ كَانُوا عَاهِدُوا اللَّهَ مِنْ

اور دیر نہ کریں اس میں مگر تھوڑی۔ اور اقرار کر چکے تھے اللہ سے

قَبْلُ لَا يُؤْلَوْنَ إِلَّا دَبَارًا وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا ⑮ قُلْ

پہلے کہ نہ پھیریں گے پیٹھ، اور اللہ کے قرار کی پوچھ ہوتی ہے۔ تو کہہ

لَنْ يَنْفَعَكُمْ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذَا لَا

کچھ کام نہ آئے گا تمھارے یہ بھاگنا اگر بھاگو گے مرنے سے یا مارے جانے سے اور پھر بھی

تُمْتَعُونَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۶ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِيكُمْ مِنَ اللّٰهِ

پھل نہ پاؤ گے مگر حقوڑے دنوں۔ تو کہہ کون ہے کہ تم کو بچائے اللہ سے

اِنْ اَسَا اَدَبُكُمْ سُوْءًا وَّ اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ

اگر چاہے تم پر بُرائی یا چاہے تم پر مہربانی، اور نہ پائیں گے اپنے واسطے

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَّلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝۱۷ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ

اللہ کے سوائے کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔ اللہ کو خوب معلوم ہیں جو اٹکانے والے ہیں

مِنْكُمْ وَاَلْقَائِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا وَّلَا يَأْتُوْنَ الْبَاسَ

تم میں اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو چلے آؤ ہمارے پاس، اور لڑائی میں نہیں آتے

اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۸ اَشِحَّةٌ عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَاءَ الْخَوْفُ رَاٰهُمْ

مگر کبھی۔ دریغ رکھتے ہیں تم سے پھر جب آئے ڈر کا وقت تو ٹوڑ دیکھے اُن کو

يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرًا عَيْنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِرَّةٌ

کہتے ہیں تیری طرف پھرتی ہیں آنکھیں اُن کی جیسے کسی پر آئے بے ہوشی

الْمَوْتِ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاللِّسَانِ حِدَادِ اَشِحَّةٍ

موت کی، پھر جب جاتا رہی ڈر کا وقت چڑھ چڑھ بولیں تم پر تیز تیز بانوں کے ڈھلے

عَلَى الْخَيْرِ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَجَبْتُ اللّٰهُ اَعْمَا لَهُمْ طَوَّكَانَ

پڑتے ہیں مال پر وہ لوگ یقین نہیں لائے پھر اکارت کر ڈالے اللہ نے ان کے کام، اور یہ ہی

ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۱۹ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا وَّ

اللہ پر آسان۔ سمجھتے ہیں کہ فوجیں کفار کی نہیں پھر گئیں، اور

اِنْ يَّاتِ الْاَحْزَابُ يَوْمَ ذَا لُوْا اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ

اگر آجائیں وہ فوجیں تو آزاد کریں کسی طرح، ہم باہر نکلے ہوتے ہوں گا دُور میں



يَسْأَلُونَ عَنْ أَنْبَاءِكُمْ وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قُتِلُوا إِلَّا قَلِيلًا ۝۲۰

پوچھ لیا کریں تمہاری خبریں، اور اگر ہوں تم میں لڑائی نہ کریں مگر بہت مختصری۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ

تمہارے لئے بھلی تھی سیکھنی رسول اللہ کی چال اس کے لئے جو کوئی امید

يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝۲۱ وَلَسَأَلَا

رکھتا ہو اللہ کی اور پچھلے دن کی اور یاد کرتا ہو اللہ کو بہت سا۔ اور جب دیکھی

الْمُؤْمِنُونَ الْآحْزَابُ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ

مسلمانوں نے فوجیں، بولے یہ وہی ہے جو وعدہ دیا تھا ہم کو اللہ نے اور اس کے رسول نے

وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ زَوْمَارِزْهُمْ إِلَّا إِيْمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝۲۲

اور سچ کہا اللہ نے اور اس کے رسول نے اور ان کو اور بڑھ گیا یقین اور اطاعت کرنا۔

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۝

ایمان والوں میں کتنے مرد ہیں کہ سچ کر دکھلایا جس بات کا عہد کیا تھا اللہ سے

فِيْنَهُمْ مَّنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا

پھر کوئی تو ان میں پورا کر چکا اپنا ذمہ اور کوئی ہرمان میں راہ دیکھ رہا، اور بدلا نہیں

تَبَدُّلًا ۝۲۳ لِّيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ

ایک ذرہ۔ تاکہ بدل دے اللہ سچوں کو ان کے سچ کا اور عذاب کرے

الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ

منافقوں پر اگر چاہے یا توبہ ڈالے ان کے دل پر بیشک اللہ ہے

غَفُورًا رَّحِيمًا ۝۲۴ وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ

بخٹے والا مہربان۔ اور پھیر دیا اللہ نے منکروں کو اپنے غصہ میں بھرے ہوئے

لَمَّا نَالُوا خَيْرًا ط وَكَفَىٰ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ ط وَكَانَ اللَّهُ

ہاتھ نہ لگی کچھ بھلائی، اور اپنے اوپر لے لی اللہ نے مسلمانوں کی لڑائی، اور ہے اللہ

قَوِّيًا عَزِيزًا ۲۵) وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوا مِنْهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ

زور آور زبردست ، اور اتار دیا ان کو جو ان کے پشت پناہ ہوتے تھے اہل کتاب سے

مِنْ صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ

ان کے قلعوں سے اور ڈال دی ان کے دلوں میں دھاک کتنوں کو تم جان مارنے لگے ،

وَكَايَسِرُونَ فَرِيقًا ۲۶) وَأَوْسَرْنَا أَرْضَهُمْ وَدَيَّرْنَا رُءُوسَهُمْ وَ

اور کتنوں کو قید کر لیا ۔ اور تم کو دلائی ان کی زمین اور ان کے گھر اور

أَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَمْ تَطْوُهَا ط وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۲۷)

ان کے مال اور ایک زمین کہ جس پر نہیں پھیرو تم نے اپنی قدم اور ہر اللہ سب کچھ کر سکتا ۔

۳  
ع  
۱۹

## خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو، جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے (یعنی عینہ کا لشکر اور ابوسفیان کا لشکر اور یہودی قرظہ) پھر ہم نے اُن پر ایک آندھی بھیجی (جس نے ان کو پریشان کر دیا اور ان کے خیمے اکھاڑ پھینکے) اور (فرشتوں کی ایسی فوج بھیجی جو تم کو (عام طور پر) دکھائی نہ دیتی تھی) رگوں بعض صحابہؓ مثلاً حضرت حذیفہؓ نے بعض ملائکہ کو بشکل انسان دیکھا بھی اور کفار کے لشکر میں یہ جاسوسی کے لئے گئے تھے وہاں یہ آواز بھی سنی کہ بھاگو بھاگو۔ اور اس واقعہ میں ملائکہ نے قتال نہیں کیا، صرف کفار کے دلوں میں رعب ڈالنے کے لئے بھیجے گئے تھے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے (اس وقت کے) اعمال کو دیکھتے تھے، کہ تم نے ایک طویل وعین اور گہری خندق کھودنے میں بڑی محنت اٹھائی، پھر کفار کے مقابلہ کے لئے بڑے استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہے اور اس پر خوش ہو کر تمہاری امداد فرما رہے تھے۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جبکہ وہ (دشمن) لوگ تم پر (ہر طرف سے) ٹرے کر کے (آچڑھے تھے اور ہر طرف سے اور نیچے کی طرف سے بھی) یعنی کوئی قبیلہ مدینہ کے نشیب کی طرف سے اور کوئی قبیلہ اس کی بلندی کی طرف سے، اور جب کہ آنکھیں (مارے دہشت کے) کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں، اور کلبجے منہ کو آنے لگے تھے اور تم لوگ اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے (جیسا مواقع شدت میں طبعی طور پر مختلف وسوسے آیا کرتے ہیں، اور یہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں، اور نہ اس قول کے منافی ہر



جو آگے اہل ایمان کا آئے گا ہنّ اَمَّا وَعَدَ نَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ، کیونکہ اس میں لفظ ہنّ کا اشارہ احزاب کے چڑھ آنے کی طرف ہے، چونکہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیدی گئی تھی، اس لئے یہ تو متیقن تھا لیکن انجام اس واقعہ کا نہیں بتلایا گیا تھا اس لئے اس میں احتمالات مختلفہ غالب آنے اور مغلوب ہونے کے پیدا ہوتے تھے اس موقع پر مسلمانوں کا (پورا، پورا امتحان کیا گیا جس میں وہ پورے اترے) اور (سخت) زلزلہ میں ڈالے گئے اور یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جب کہ منافقین اور وہ (وہ) لوگ جن کے دلوں میں (نفاق اور شک کا) مرض ہے یوں کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ نے اور اس کے رسول نے محض دھوکہ ہی کا وعدہ کر رکھا ہے جیسا معتب بن قشیر اور اس کے ہمراہیوں نے یہ قول اس وقت کہا تھا کہ خندق کھودنے وقت کدال لگنے سے کئی بار آگ کا شرارہ نکلا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بار ارشاد فرمایا کہ مجھ کو فارس اور روم اور شام کے محل اس کی رشتی میں نظر آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی فتح کا وعدہ فرمایا ہے۔ جب احزاب کے اجتماع کے وقت پریشانی ہوتی تو یہ لوگ کہنے لگے کہ یہ تو حالت ہے اور اس پر فتح روم و فارس کی بشارتیں سنا رہے ہیں، یہ محض دھوکہ ہے اور گو وہ اس کو اللہ کا وعدہ نہ سمجھتے تھے نہ آپ کو رسول جانتے تھے، پھر یہ کہنا مَآ وَعَدَ نَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ یا تو صرف حکایت کے درجہ میں ہے اور یا بطور فرض و استہزاء ہے) اور یہ واقعہ اس وقت کا تھا جبکہ ان (منافقین میں سے بعض لوگوں نے) دوسرے حاضرین (مصر کے) کہا کہ یثرب (یعنی مدینہ) کے لوگو! (یہاں) ٹھہرنے کا موقع نہیں کیونکہ یہاں رہنا موت کے منہ میں جانا ہے (سو اپنے گھروں کو) لوٹ چلو یہ قول اوس بن قیطی نے کہا تھا اور بھی کچھ لوگ اس میں شریک تھے) اور بعض لوگ ان (منافقوں میں) نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے (اپنے گھر واپس جانے کی) اجازت مانگتے تھے کہتے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں (یعنی صرف عورتیں بچے رہ گئے ہیں) دیواریں قابل اطمینان نہیں کبھی چور نہ آگھسیں، یہ قول ابو عرابہ اور دوسرے بعض بنی حاتم کا تھا) حالانکہ وہ (ان کے خیال میں) غیر محفوظ نہیں ہیں (یعنی ان کو اندیشہ چوری وغیرہ کا ہرگز نہیں اور نہ واپس جانے سے یہ نیت ہے کہ ان کا انتظام قابل اطمینان کر کے چلے آویں گے) یہ محض بھاگنا ہی چاہتے ہیں، اور ان کی یہ حالت ہے کہ، اگر مدینہ میں اس کے (سب) اطراف سے ان پر (جب یہ اپنے گھروں میں ہوں) کوئی (شکر کفار کا) آگھسے پھر ان سے فساد (یعنی مسلمانوں سے لڑنے) کی درخواست کی جائے تو یہ (فورا) اس (فساد) کو منظور کر لیں اور ان گھروں میں بہت ہی کم ٹھہریں (یعنی اتنا توقف ہو

کہ کوئی ان سے درخواست کرے اور یہ منظور کریں اور اس کے بعد وہ فوراً ہی تیار ہو جائیں اور مسلمانوں کے مقابلہ میں جا پہنچیں، اور کچھ بھی گھروں کا خیال نہ کریں کہ ہم تو دوسروں کو لوٹ مار کرنے جاتے ہیں، کبھی کوئی ہمارے گھر کو لوٹ لے تو اگر ان کا قصد واقعی حفاظت کا ہے تو اب گھروں میں کیوں نہیں رہے، اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصل میں ان کو مسلمانوں سے عداوت اور کفار سے محبت ہے، اس لئے تکثیر سوار سے بھی مسلمانوں کی نصرت پسند نہیں کرتے۔

باقی گھروں کا تو یہاں نہ ہے (حالانکہ یہ لوگ (اس سے) پہلے خدا سے عہد کر چکے تھے کہ دشمن کے مقابلہ میں) پیٹھ نہ پھیریں گے (یہ عہد اس وقت کیا تھا جبکہ بدر میں بعض شرکت سے رہ گئے تھے تو بعض منافقین بھی مفت کرم داشتین کے طور پر کہنے لگے کہ افسوس! ہم شریک نہ ہوئے، ایسا کرتے ویسا کرتے، جب وقت آیا ساری قلعی کھل گئی) اور اللہ سے جو (اس قسم کا) عہد کیا جاتا ہے اس کی باز پرس ہوگی، آپ (ان سے) فرمادیجئے کہ تم جو بھاگے بھاگے پھرتے ہو کما قال تعالیٰ اِنْ يُّرِيدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا تو تم کو بھاگنا کچھ نافع نہیں ہو سکتا اگر تم موت سے یا قتل سے بھاگتے ہو اور اس (بھاگنے کی) حالت میں بجز تھوڑے دنوں کے (کہ وہ بقیہ عمر مقدر ہے) اور زیادہ (حیات سے) متمتع نہیں ہو سکتے (یعنی بھاگ کر عمر نہیں بڑھ سکتی، کیونکہ اس کا وقت مقدر ہے، اور جب مقدر ہے تو اگر نہ بھاگتے تو بھی وقت سے پہلے مر نہیں سکتے۔ پس نہ قرار بالقات سے کوئی ضرر اور نہ قرار بالفاء سے کوئی نفع، پھر بھاگنا محض بے عقلی اور اس مسئلہ قدر کی تحقیق کے لئے ان سے) یہ بھی فرمادیجئے کہ وہ کون ہے جو تم کو خدا سے بچائے اگر وہ تمھارے ساتھ بُرائی کرنا چاہے (مثلاً تم کو ہلاک کرنا چاہے تو کیا تم کو کوئی بچا سکتا ہے جیسا تم فرار کو نافع خیال کرتے ہو) یا وہ کون ہے جو خدا کے فضل کو تم سے روک سکے اگر وہ تم پر فضل کرنا چاہے (مثلاً وہ زندہ رکھنا چاہے جو کہ رحمت دنیویہ ہے تو کوئی اس کا مانع ہو سکتا ہے؟ جیسا تمھارا خیال ہے کہ ثبات فی المعرکہ کو قاطع حیات سمجھتے ہو) اور (وہ لوگ سن رکھیں کہ) خدا کے سوا نہ کوئی اپنا حمایتی پائیں گے (جو نفع پہنچائے) اور نہ کوئی مددگار (جو ضرر سے بچائے) اب مسئلہ تقدیر کے بعد پھر تشبیح منافقین کا سلسلہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کو (خوب) جانتا ہے جو (دوسروں کو لڑائی میں جانے سے) مانع ہوتے ہیں اور جو اپنی رنسی یا وطنی، بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس آجاؤ (وہاں اپنی جان کیوں دیتے ہو، یہ بات ایک شخص نے اپنے حقیقی بھائی سے کہی تھی اور اس وقت یہ کہنے والا گوشت بریاں اور روٹی کھا رہا تھا۔ مسلمان بھائی نے کہا افسوس! تو اس چین میں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم



ایسی تکلیف میں، وہ بولا میاں تم بھی یہاں ہی چلے آؤ، اور دان کی بزدلی اور حرص و بخل کی یہ کیفیت ہے کہ، لڑائی میں بہت ہی کم آتے ہیں (جس میں ذرا نام ہو جائے یہ تو ان کی بزدلی ہے اور آتے بھی ہیں تو) تمھارے حق میں بخیلی لئے ہوئے (یعنی آنے میں بڑی نیت یہ ہوتی ہے کہ سب غنیمت مسلمانوں کو نہ مل جائے برائے نام شریک ہونے سے استحقاق غنیمت کا دعویٰ تو کسی درجہ میں کر سکیں گے) سو جب اُن کا جُبن اور بخل دونوں امر ثابت ہو گئے ہیں تو اس مجموعہ کا اثر یہ ہے کہ (جب کوئی خوف (کا موقع) پیش آتا ہے تو اُن کو دیکھتے ہو کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرائی جاتی ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو (یہ تو بزدلی کا اثر ہوا) پھر جب وہ خوف دُور ہو جاتا ہے تو تم کو تیز تیز زبانوں سے طعنے دیتے ہیں مال (غنیمت) پر حرص لئے ہوئے، (یعنی مال غنیمت لینے کے لئے دل خراش باتیں کرتے ہیں کہ کیوں ہم شریک نہ تھے ہماری ہی مدد سے تم کو یہ فتح میسر نہیں ہوئی، یہ اثر بخل اور حرص کا ہے۔ یہ معاملہ ان کا تم سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ یہ ہے کہ) یہ لوگ (پہلے ہی سے) ایمان نہیں لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام اعمال (نیک پہلے ہی سے) بے کار کر رکھے ہیں (آخرت میں کچھ ثواب نہ ملے گا) اور یہ بات اللہ کے نزدیک بالکل آسان ہے (کوئی اس سے مزاحمت نہیں کر سکتا کہ ہم ان اعمال کا صلہ دیں گے اور یہ حالت تو ان کی اجتماع احزاب کے وقت تھی مگر ان کا جُبن یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ احزاب کے چلے جانے کے بعد بھی) ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ (ابھی تک) یہ لشکر گئے نہیں اور غایت بزدلی سے ان کی یہ حالت ہے کہ) اگر (بالضرر) یہ (گئے ہوئے) لشکر (بھڑوٹ کر) آجائیں تو (پھر تو) یہ لوگ (اپنے لئے) بھی پسند کریں کہ کاش ہم (کہیں) دیہاتوں میں باہر جا رہیں کہ (وہاں ہی بیٹھے بیٹھے آنے جانے والوں سے) تمھاری خبریں پوچھتے رہیں (اور وہ جگر دوز معرکہ اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں) اور اگر (اتفاق سے) کل یا بعض دیہات میں نہ جاسکیں) بلکہ تم ہی میں رہیں تب بھی (اس وقت کی لے دے سن کر بھی کبھی غیرت نہ آوے اور محض نام کرنے کو) کچھ یوں ہی سالطیں (آگے) ثبات فی الحرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقتدار و اتباع کا مقتضائے ایمان ہونا بیان فرماتے ہیں تاکہ منافقین کو عار دلائی جاتے کہ باوجود دعویٰ ایمان اس کے مقتضائے سے تخلف کیا، اور مخلصین کو بشارت ملے کہ یہ لوگ ابستہ مصداق کان یزجو اللہ الخ کے ہیں پس ارشاد فرماتے ہیں کہ) تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الہی کرتا ہو (یعنی مومن کامل ہو اس کے لئے)





سچے مسلمانوں کو ان کے سچ کا صلہ دے اور منافقوں کو چاہے سزا دے یا چاہے اُن کو رنفاق سے، توبہ کی توفیق دے کیونکہ ایسے مصائب اور حوادث میں مخلص اور متصنع متمیز ہو جاتا ہے اور احیائاً ملامت سے بعض متصنعین بھی متاثر ہو کر مخلص ہو جاتے ہیں اور بعض بجا بہ بھی رہتے ہیں، بیشک اللہ غفور رحیم ہے اس لئے توبہ کا قبول ہو جانا مستبعد نہیں، اس میں ترغیب ہو توبہ کی، اور یہاں تک اس مجمع اسلام کے اقسام مختلفہ کے حالات تھے، آگے کفار مخالفین کی حالت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو (یعنی مشرکین کو) ان کے غصہ میں بھرا ہوا (مدینہ سے) ہٹا دیا کہ ان کی کچھ بھی مراد پوری نہ ہوئی (اور ان کا غصہ بھرا ہوا تھا) اور جنگ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے آپ ہی کافی ہو گیا (یعنی کفار کو قتال متعارف کی ذبت بھی نہ آئی کہ پہلے ہی دفع ہو گئے اور حقیقت سی لڑائی متفرق طور پر منفی نہیں ہی) اور اس طرح کافروں کا ہٹا دینا کچھ عجیب نہ سمجھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا زبردست ہے (اُس کو کچھ دشوار نہیں۔ یہ تو مشرکین کا حال ہوا) اور دوسرا گروہ مخالفین میں یہود بنی قریظہ کا تھا آگے ان کا ذکر ہے، جن اہل کتاب نے ان (مشرکین) کی مدد کی تھی ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کے قلعوں سے رجن میں وہ محصور تھے، نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھلا دیا (جس سے وہ اتر آئے اور پھر) بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کر لیا اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنا دیا، اور ایسی زمین کا بھی (تم کو اپنے علم ازیلی میں مالک بنا رکھا ہے) جس پر تم نے (ابھی) قدم نہ رکھا، نہیں رکھا (اس میں بشارت ہے فتوحات مستقبلہ کی عموماً یا فتح خیبر کی خصوصاً جو اس سے کچھ بعید ہوا) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے اس لئے یہ امور کچھ بعید نہیں ہیں) ۛ

## معارف و مسائل

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اور مسلمانوں کو آپ کے مکمل اتباع و اطاعت کی ہدایت تھی۔ اسی کی مناسبت سے یہ پورے دور کو قرآن کے غزوہ احزاب کے واقعہ سے متعلق نازل ہوتے ہیں، جس میں کفار و مشرکین کی بہت سی جماعتوں کا مسلمانوں پر یکبارگی حملہ اور سخت ترغہ کے بعد مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد معجزات کا ذکر ہے۔ اور اس کے ضمن میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق بہت سی ہدایات اور احکام ہیں۔ انہی بے بہا ہدایات کی وجہ سے اکابر مفسرین نے اس جگہ واقعہ احزاب کو خاص تفصیل سے لکھا ہے خصوصاً

قرطبی اور مظہری وغیرہ نے اس لئے واقعۃ احزاب کی کچھ تفصیل مع ان ہدایات کے لکھی جاتی ہے جس کا اکثر حصہ قرطبی اور مظہری سے لیا گیا ہے جو کسی دوسری کتاب سے لیا ہے، اس کا حوالہ لکھ دیا گیا ہے۔

## واقعہ غزوۃ احزاب

احزاب، حزب کی جمع ہے، جس کے معنی پارٹی یا جماعت کے آتے ہیں۔ اس غزوہ میں کفار کی مختلف جماعتیں متحد ہو کر مسلمانوں کو ختم کر دینے کا معاہدہ کر کے مدینہ پر چڑھ آئی تھیں، اسی لئے اس غزوہ کا نام غزوۃ احزاب رکھا گیا ہے۔ اور چونکہ اس غزوہ میں دشمن کے آنے کے راستہ پر بامر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خندق کھودی گئی تھی، اس لئے اس کو غزوۃ خندق بھی کہتے ہیں۔ غزوۃ بنو قریظہ بھی جو غزوۃ احزاب کے فوراً بعد ہوا اور مذکورہ آیات میں اس کا بھی ذکر ہے وہ بھی درحقیقت غزوۃ احزاب ہی کا ایک جز تھا، جیسا کہ واقعہ کی تفصیل سے معلوم ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس سال مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہوئے، اس کے دو سکر ہی سال میں غزوۃ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ تیسرے سال میں غزوۃ احد پیش آیا۔ چوتھے سال میں یہ غزوۃ احزاب واقع ہوا۔ اور بعض روایات میں اس کو پانچویں سال کا واقعہ قرار دیا ہے۔ بہر حال ابتداء ہجرت سے اس وقت تک کفار کے حملے مسلمانوں پر مسلسل جاری تھے غزوۃ احزاب کا حملہ بڑی بھرپور طاقت و قوت اور بختہ عزم اور عہد و میثاق کے ساتھ کیا گیا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام پر یہ غزوہ سب دو سکر غزوات سے زیادہ اشد تھا۔ کیونکہ اس میں حملہ آور احزاب کفار کی تعداد بارہ ہزار سے پندرہ ہزار تک بتلائی گئی ہے، اور اس طرف سے مسلمان کل تین ہزار وہ بھی بے سر و سامان، اور زمانہ سخت سردی کا۔ قرآن کریم تو اس واقعہ کی شدت بڑی ہولناک صورت میں یہ بیان فرمائی ہے، رَاغِبَتِ الْاِلَآ بُصَاۡرُہَا رَاۡیَ کَھٰلِیۡ کِی کَھٰلِیۡ رَہَ گَیۡسُہَا، بَلَغَتِ الْقُلُوۡبُ الْحَنَآجِرَ رَکِبَہَا مَنۡہَا کُفَرٌ وَّ زُلُۡمًاۤ اِذۡ لَیۡسَ اِلَآ شِدَّۃٌۭ اِذَا رَکِبَتِ زُلُۡلَہٗمِیۡنَ ڈالے گئے۔

مگر جیسا کہ یہ وقت مسلمانوں پر سب سے زیادہ سخت تھا، ویسے ہی اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد سے اس کا انجام مسلمانوں کے حق میں ایسی عظیم فتح و کامیابی کی صورت میں سامنے آیا کہ اس نے تمام مخالف گروہوں، مشرکین، یہود اور منافقین کی کمریں توڑ دیں۔



اور آگے ان کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ مسلمانوں پر کسی حملے کا ارادہ کر سکیں۔ اس لحاظ سے یہ غزوہ کفر و اسلام کا آخری معرکہ تھا، جو مدینہ منورہ کی زمین پر ہجرت کے چوتھے یا پانچویں سال میں لڑا گیا۔

اس واقعہ کی ابتداء یہاں سے ہوئی کہ یہود کے قبیلہ بنی نضیر اور قبیلہ بنی دائل کے تقریباً بیس آدمی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے سخت عداوت رکھتے تھے مکہ مکرمہ پہنچے، اور قریشی سرداروں سے ملاقات کر کے ان کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ قریشی سردار سمجھتے تھے کہ جس طرح مسلمان ہماری بت پرستی کو کفر کہتے ہیں اور اس لئے ہمارے مذہب کو برا سمجھتے ہیں یہود کا بھی یہی خیال ہے، تو ان سے موافقت و اتحاد کی کیا توقع رکھی جائے۔ اس لئے ان لوگوں نے یہود سے سوال کیا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان دین و مذہب کا اختلاف ہے اور آپ لوگ اہل کتاب اور اہل علم ہیں، پہلے ہمیں یہ بات بتلائیے کہ آپ کے نزدیک ہمارا دین بہتر ہے یا ان کا۔

سیاست کے اکھاڑے میں | ان یہودیوں نے اپنے علم و ضمیر کے بالکل خلاف ان کو یہ جواب دیا کہ جھوٹ کوئی نئی چیز نہیں | تمہارا دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین سے بہتر ہے۔ اس پر یہ لوگ کچھ مطمئن ہوئے، مگر اس پر بھی معاملہ یہ ٹھہرا کہ بیس آدمی یہ آنے والے اور پچاس آدمی قریشی سرداروں کے مسجد حرام میں جا کر بیت اللہ کی دیواروں سے سینے لگا کر اللہ کے سامنے یہ عہد کریں کہ ہم میں سے جب تک ایک آدمی بھی زندہ رہے گا ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے حلم و کرم | اللہ کے گھر میں اللہ کے بیت سے چمٹ کر اللہ کے دشمن اس کے رسول کا ایک اعجوبہ !!! | کے خلاف جنگ لڑنے کا معاہدہ کر رہے ہیں، اور مطمئن ہو کر جنگ کا نیا جذبہ لے کر ٹوٹتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حلم و کرم کا عجیب منظر ہے۔ پھر ان کے اس معاہدہ کا اثر بھی آخر قصہ میں معلوم ہو گا کہ سب کے سب اس جنگ سے منہ موڑ کر بھاگے۔

یہ یہودی قریش مکہ کے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد عرب کے ایک بڑے اور جنگجو قبیلہ غطفان کے پاس پہنچے اور ان کو بتلایا کہ ہم اور قریش مکہ اس پر متفق ہو چکے ہیں کہ اس نئے دین (اسلام) کے پھیلانے والوں کا ایک مرتبہ سب مل کر استیصال کر دیں۔ آپ بھی اس پر ہم سے معاہدہ کریں۔ اور ان کو یہ رشوت بھی پیش کی کہ خیبر میں جس قدر کھجور ایک سال میں پیدا ہوگی وہ اور بعض روایات میں اس کا نصف قبیلہ غطفان کو دیا جانے کا وعدہ کیا۔ قبیلہ غطفان کے سردار عیینہ بن حصن نے اس شرط کے ساتھ ان سے

شرکت کو منظور کر لیا اور یہ لوگ بھی جنگ میں شامل ہو گئے۔

اور باہمی قرارداد کے مطابق مکہ سے قریشیوں کا لشکر چار ہزار جوانوں اور تین سو گھوڑوں اور ایک ہزار اونٹوں کے سامان کے ساتھ ابوسفیان کی قیادت میں مکہ مکرمہ سے نکلا اور مدینہ میں قیام کیا یہاں قبیلہ اسلم اور قبیلہ اشجج اور بنو مکرہ، بنو کنانہ اور فزآرہ اور غطفان کے سب قبائل شامل ہو گئے۔ جن کی مجموعی تعداد بعض روایات میں دس بعض میں بارہ ہزار اور بعض میں پندرہ ہزار بیان کی گئی ہے۔

مدینہ منورہ پر غزوہ بدر میں مسلمانوں کے مقابل آنے والا لشکر ایک ہزار کا تھا، پھر غزوہ احد میں حملہ کرنے والا لشکر تین ہزار کا تھا۔ اس مرتبہ لشکر کی تعداد بھی ہر پہلی مرتبہ سے زائد تھی، اور سامان بھی اور تمام قبائل عرب و یہود کی اتحادی طاقت بھی۔

مسلمانوں کی جنگی تیاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس متحدہ محاذ کے حرکت میں آنے کی اطلاع ملی تو سب سے پہلا کلمہ جو زبان مبارک پر آیا یہ تھا حُبُّنَا اللہُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ”یعنی ہمیں اللہ کافی اور وہی ہمارا بہتر کارساز ہے“ اس کے بعد مہاجرین و انصار کے اہل حل و عقد کو جمع کر کے ان

۱) اللہ پر توکل (۲) باہمی مشورہ (۳) بقدر وسعت مادی وسائل کی فراہمی

مشورہ لیا۔ اگرچہ صاحب وحی کو درحقیقت مشورہ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ براہ راست حق تعالیٰ کے اذن و اجازت سے کام کرتے ہیں مگر مشورے میں دو فائدے تھے۔ ایک امت کے لئے مشورہ کی سنت جاری کرنا، دوسرے قلوب متومنین میں باہمی ربط و اتحاد کی تجدید اور تعاون و تناصر کا جذبہ بیدار کرنا۔ اس کے بعد دفاع اور جنگ کے مادی وسائل پر غور ہوا۔ مجلس مشورہ میں حضرت سلمان فارسیؓ بھی شامل تھے جو ابھی حال میں ایک یہودی کی مصنوعی غلامی سے نجات حاصل کر کے اسلامی خدمات کے لئے تیار ہوئے تھے انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمارے بلاد فارس کے بادشاہ ایسے حالات میں دشمن کا حملہ روکنے کے لئے خندق کھود کر ان کا راستہ روک دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشورہ قبول فرما کر خندق کھودنے کا حکم دیدیا۔ اور بنفس نفیس خود بھی اس کام میں شریک ہوئے۔

خندق کی کھدائی یہ خندق جبل سلح کے پیچھے اس پورے راستہ کی لمبائی پر کھودنا طے ہوا جسے مدینہ کے شمال کی طرف سے آنے والے دشمن آسکتے تھے، اس خندق کے طول و عرض کا خط خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھینچا۔ یہ خندق قلعہ شیخین سے شروع ہو کر جبل سلح کے مغربی گوشہ تک آئی اور بعد میں اسے بڑھا کر وادی لبطان اور وادی راتونا کے مقام اتصال تک پہنچا دیا گیا۔ اس خندق کی کل لمبائی تقریباً ساڑھے تین میل تھی، چوڑائی اور گہرائی



کی صحیح مقدار کسی روایت سے معلوم نہیں ہوئی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ چوڑائی اور گہرائی بھی خاصی ہوگی جسکو عبور کرنا دشمن کے لئے آسان نہ ہو۔

حضرت سلمانؓ کے خندق کھودنے کے واقعہ میں یہ آیا ہے کہ وہ روزانہ پانچ گز لمبی اور پانچ گز گہری خندق کھودتے تھے (منظری) اس سے خندق کی گہرائی پانچ گز کہی جاسکتی ہو۔ اسلامی لشکر کی تعداد اس وقت مسلمانوں کی جمعیت مکمل تین ہزار تھی، اور مکمل چھتیس گھوڑے تھے۔

بلوغ کی عمر پندرہ سال قرار دی گئی | اسلامی لشکر میں کچھ نابالغ بچے بھی اپنے جوش ایمانی سے مکمل کھڑے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بچوں کو واپس کر دیا جو پندرہ

سال سے کم عمر والے تھے، پندرہ سالہ نو عمر لے لئے گئے جن میں حضرت عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، ابوسعید خدری، براہ ابن عازب رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ جس وقت یہ اسلامی لشکر مقابلہ کے لئے روانہ ہونے لگا تو جو منافقین مسلمانوں میں رلے ملے رہتے تھے انھوں نے سرکنا شروع کیا۔ کچھ چھپ کر بھل گئے، کچھ لوگوں نے جھوٹے اعدا پیش کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واپسی کی اجازت لینی چاہی۔ یہ اپنے اندر سے ایک نئی آفت پھوٹی۔ مذکورہ آیات میں انہی منافقین کے متعلق چند آیات نازل ہوئی ہیں (قرطبی)

قتال اور نبی قومیتوں کا | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہاد کے لئے مہاجرین کا جھنڈا انتظامی معاشرتی امتیاز حضرت زید بن حارثہ کے سپرد فرمایا اور حضرات انصار کا جھنڈا اسلامی وحدت اور اسلامی قومیت کے منافی نہیں انصار کے درمیان مواخات (بھائی چالے) کے تعلقات بڑی مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم تھے، اور سب بھائی بھائی تھے۔ مگر انتظامی سہولت کے لئے مہاجرین کی قیادت الگ اور انصار کی الگ کر دی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قومیت اور اسلامی وحدت انتظامی اور معاشرتی تقسیم کے منافی نہیں بلکہ ہر جماعت پر ذمہ داری کا بوجھ ڈال دینے سے باہمی اعتماد اور تعاون و تناصر کے جذبہ کی تقویت ہوتی تھی۔ اور اس جنگ کے سب سے پہلے کام یعنی خندق کھودنے میں اس تعاون و تناصر کا اس طرح مشاہدہ ہوا کہ :-

خندق کی کھدائی کی تقسیم | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے لشکر کے مہاجرین و انصار کو پورے لشکر پر کی گئی، ؛ دس دس آدمیوں کی جماعت میں تقسیم کر کے ہر دس آدمیوں کو چالیس گز خندق کھودنے کا ذمہ دار بنایا۔ حضرت سلمان فارسیؓ چونکہ خندق کھودنے کا

مشورہ دینے والے اور کام سے واقف اور مضبوط آدمی تھے، اور نہ انصار میں شامل تھے نہ مہاجرین میں اُن کے متعلق انصار و مہاجرین میں ایک مسابقت کی فضا پیدا ہو گئی۔ انصار ان کو اپنے میں شامل کرنا چاہتے تھے، مہاجرین اپنے میں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رفع نزاع کے لئے مداخلت کرنے کی نوبت آئی اور آپ نے یہ فیصلہ دیا کہ سَلَمَانَ وَمَنَا أَهْلَ الْبَيْتِ، یعنی سلمان ہمارے اہل بیت میں شامل ہیں۔

صلاحیت کار میں ملکی | آج تو دنیا میں غیر ملکی باشندے اور غیر مقامی کو اپنی برابر کا درجہ دینا غیر ملکی، مقامی اور بیرونی لوگ پسند نہیں کرتے وہاں ہر فرقہ اہل صلاحیت کو اپنے ساتھ شامل کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز

نے ان کو اہل بیت میں خود داخل فرما کر نزاع کو ختم کیا اور عملی طور پر چند انصار اور چند مہاجرین شامل کر کے ان کے دس کی جماعت بنائی، جس میں حضرت عمرو بن عوف اور حذیفہؓ وغیرہ مہاجرین میں سے تھے۔

ایک عظیم معجزہ | اتفاق سے جو حصہ خندق کا حضرت سلمانؓ وغیرہ کے سپرد تھا اس میں ایک سخت اور چکنے پتھر کی بڑی چٹان نکل آئی۔ حضرت سلمانؓ کے ساتھی عمرو بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ اس چٹان نے ہمارے اوزار توڑ دیئے اور ہم اس کے کاٹنے سے عاجز ہو گئے۔ تو میں نے سلمانؓ سے کہا کہ اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس جگہ سے کچھ ہٹ کر خندق

کھودیں اور ذرا سی بجی کے ساتھ اس کو اصل خندق سے ملا دیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھینچے ہوئے خط سے انحراف ہمیں اپنی رائے سے نہیں کرنا چاہیے، آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کر کے حکم حاصل کریں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

قدرت کی تنبیہات | اس ساڑھے تین میل کے میدان میں خندق کھودنے والوں میں کسی کو رکاوٹ پیش نہ آئی جو عاجز کر دے۔ پیش آئی تو حضرت سلمانؓ کو پیش آئی، جنہوں نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا اور اسی کو قبول کر کے یہ سلسلہ جاری ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دکھلا دیا کہ خندق کھودنے اور بنانے میں بھی اللہ کی طرف رجوع کے سوا چارہ نہیں، آلات اوزار سب جواب دے چکے۔ جس میں ان حضرات کو تعلیم تھی کہ مادی اسباب کو بقدر وسعت طاقت جمع کرنا فرض ہے، مگر ان پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔ مومن کا بھروسہ تمام اسباب مادیہ کو جمع کر لینے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ہی پر ہونا چاہیے۔

حضرت سلمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بتلایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اپنے حصہ کی خندق میں کام کر رہے تھے، خندق



کی مٹی کو اس جگہ سے منتقل کرنے میں مصروف تھے۔ حضرات برابر بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپؐ کو دیکھا کہ آپؐ کے جسم مبارک کو غبار نے ایسا ڈھانپ لیا تھا کہ پیٹ اور پیچھ کی کھال نظر نہ آتی تھی۔ ان کو کوئی مشورہ یا حکم دینے کے بجائے خود ان کے ساتھ موقع پر تشریف لائے اور دس حضرات صحابہؓ مع سلمانؓ کے جو اس کے کھودنے میں مصروف تھے خندق کے اندر اتر کر آپؐ بھی ان میں شامل ہو گئے۔ اور گدال اپنے دست مبارک میں لے کر اس چٹان پر ایک ضرب لگائی۔ اور یہ آیت پڑھی تَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا یعنی پوری ہو گئی نعمت آپؐ کے رب کی سچائی کے ساتھ، اس ایک ہی ضرب سے چٹان کا ایک تہائی حصہ کٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک روشنی پتھر کی چٹان سے برآمد ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ نے دوسری ضرب لگائی اور آیت مذکورہ کو آخر تک پڑھا، یعنی تَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا، اس دوسری ضرب کا ایک تہائی چٹان اور کٹ گئی، اور اسی طرح پتھر سے ایک روشنی نکلی۔ تیسری مرتبہ پھر وہی آیت پوری پڑھ کر تیسری ضرب لگائی، تو باقی چٹان بھی کٹ کر ختم ہو گئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق سے باہر تشریف لائے۔ اور اپنی چادر جو خندق کے کنارہ پر رکھ دی تھی اٹھالی اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس وقت سلمان فارسیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ آپؐ نے جتنی مرتبہ اس پتھر پر ضرب لگائی میں نے ہر مرتبہ پتھر سے ایک روشنی نکلتی دیکھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمانؓ سے فرمایا کہ کیا واقعی تم نے یہ روشنی دیکھی ہے؟ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ میری آنکھوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی ضرب میں جو روشنی نکلی میں نے اس روشنی میں یمن اور کسریٰ کے شہروں کے محلات دیکھے اور جبریل امینؑ نے مجھے بتلایا کہ آپؐ کی امت ان شہروں کو فتح کرے گی۔ اور جب میں نے دوسری ضرب لگائی تو مجھے رومیوں کے سرخ محلات دکھائے گئے، اور جبریل امینؑ نے یہ خوش خبری دیدی کہ آپؐ کی امت ان شہروں کو بھی فتح کرے گی۔ یہ ارشاد من کر سب مسلمان مطمئن ہوئے، اور آئندہ عظیم الشان فتوحات پر یقین ہو گیا۔

منافقین کی طعنہ زنی اور اس وقت جو منافقین خندق کی کھدائی میں شامل تھے، وہ مسلمانوں کا بے نظیر یقین یابی کہنے لگے کہ تمہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر حیرت و تعجب نہیں ہوتا۔ وہ تمہیں کیسے باطل اور بے بنیاد وعدے سنار ہے ہیں کہ یثرب میں خندق کی گہرائی کے اندر انھیں حیرہ اور مدائن کسریٰ کے محلات نظر آرہے ہیں، اور

یہ کہ تم لوگ ان کو فتح کرو گے۔ ذرا اپنے حال کو تو دیکھو کہ تمہیں اپنے تن بدن کا تو ہوش نہیں، پیشانی پاخانے کی ضرورت پوری کرنے کی ہمت نہیں، تم ہو جو کسری وغیرہ کے ملک کو فتح کرو گے اسی واقعہ پر آیات مذکورہ صدر میں یہ نازل ہوا اِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا، اس آیت میں الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ میں بھی انہی منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جن کے دلوں میں نفاق کا مرض چھپا ہوا تھا۔

غور کیجئے کہ اس وقت مسلمانوں کے ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پر پورے یقین کا کیسا سخت امتحان تھا کہ ہر طرف سے کفار کے نرغہ اور خطرے میں ہیں، خندق کھودنے کے لئے مزدور اور خادم نہیں، خود ہی یہ محنت ایسی حالت میں برداشت کر رہے ہیں کہ سخت سردی نے سب کو پریشان کر رکھا ہے، ہر طرف سے خوف ہی خوف ہے۔ بظاہر اسباب اپنے بچاؤ اور بقا کے یقین کرنا بھی آسان نہیں، دنیا کی عظیم سلطنت روم و کسریٰ کی فتوحات کی خوش خبری پر یقین کس طرح ہو، مگر ایمان کی قیمت سب اعمال سے زیادہ اسی بنا پر ہے کہ اسباب و حالات کے سراسر خلاف ہونے کے وقت بھی ان کو رسول کے ارشاد میں کوئی شک و شبہ پیدا نہ ہوا۔

واقعہ مذکورہ میں امت کے لئے یہ کس کو معلوم نہیں کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص ہدایت کہ بڑوں کو چھوٹوں کی ہر تکلیف و مشقت میں شامل نہ ہونا چاہئے کے شریک ہوں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی دل جوئی اور امت کی تعلیم کے لئے اس محنت و مزدوری میں برابر کا حصہ لیا۔ صحابہ کرام کی جاں نثاری، آپ کے اوصاف کمال اور نبوت و رسالت کی بنیاد پر تو تھی ہی، مگر ظاہر اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ہر محنت و مشقت اور تنگی و تکلیف میں آپ سب عوام کی طرح ان میں شریک ہوتے تھے۔ حاکم و محکوم، بادشاہ و رعیت اور صاحب اقتدار و عوام کی تفریق کا کوئی تصور وہاں نہ پیدا ہوتا۔ اور جب سے ملک اسلام نے اس سنت کو ترک کیا اسی وقت سے یہ تفرقہ پھوٹے، اور طرح طرح کے فتنے اپنے دامن میں لائے۔

مشکلات پر عبور حاصل کرنے کا نسخہ | واقعہ مذکورہ میں اس ناقابل تسخیر چٹان پر ضرب لگانے کے ساتھ آیت قرآن تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ

تلاوت فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مشکل کو حل کرنے کے لئے اس آیت کی تلاوت ایک مجرب نسخہ ہے۔

صحابہ کرام کا ایثار اور تعاونِ تناصر | اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ خندق کی کھدائی کے لئے ہر چالیس



گز پر دس آدمی مامور تھے، مگر یہ ظاہر ہے کہ بعض لوگ قوی اور جلد کام کر لینے والے ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام میں سے جن حضرات کا اپنا حصہ کھدائی کا پورا ہو جاتا تو یہ سمجھ کر خالی نہ بیٹھتے تھے کہ ہماری ڈیوٹی پوری ہو گئی، بلکہ دوسرے صحابہ جن کا حصہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا ان کی مدد کرتے تھے (قرطبی، منہری)۔

ساڑھے تین میل لمبی خندق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جدوجہد اور کوشش کا نتیجہ چھ دن میں مکمل ہو گئی۔ چھ روز میں سلنے آگیا، کہ اتنی طویل اور چوڑی اور گہری خندق کی چھ روز میں تکمیل ہو گئی (منہری)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی دعوت میں اسی خندق کی کھدائی کے دوران وہ مشہور واقعہ پیش آیا کہ ایک روز ایک کھلا ہوا محبزہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر محسوس کیا کہ بھوک کے سبب آپ متاثر ہو رہے ہیں اپنی اہلیہ سے جا کر کہا کہ تمہارے پاس کچھ ہو تو بچاؤ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھوک کا اثر دیکھا نہیں جاتا۔ اہلیہ نے بتلایا کہ ہمارے گھر میں ایک صاع بھر جو رکھے ہیں میں ان کو پیس کر آسمان بناتی ہوں۔ ایک صاع ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے۔ اہلیہ پینے پکانے میں لگی، گھر میں ایک بکری کا بچہ تھا حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس کو ذبح کر کے گوشت تیار کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانے کے لئے چلے۔ تو اہلیہ نے پکار کر کہا کہ دیکھئے حضور کے ساتھ بہت بڑا مجمع صحابہ کا ہے، صرف حضور کو کسی طرح تنہا بلا لائیں، مجھے رسوا نہ کیجئے کہ صحابہ کرام کا بڑا مجمع چلا آئے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری حقیقت حال عرض کر دی کہ صرف اتنا کھانا ہے، مگر آپ نے پورے لشکر میں اعلان فرما دیا کہ چلو جابر کے گھر دعوت ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ان تھے گھر پہنچے تو اہلیہ نے سخت پریشانی کا اظہار کیا، اور پوچھا کہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل حقیقت اور کھانے کی مقدار بتلا دی تھی؟ جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں وہ میں بتلا چکا ہوں تو اہلیہ محترمہ مطمئن ہوئیں کہ پھر ہمیں کچھ فکر نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مالک ہیں جس طرح چاہیں کریں۔

واقعہ کی تفصیل اس جگہ غیر ضروری ہے، اتنا نتیجہ معلوم کر لینا کافی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے روٹی اور سالن سب کو دینے اور کھلانے کا اہتمام فرمایا، اور پورے مجمع نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب مجمع کے فارغ ہونے کے بعد بھی نہ ہماری ہنڈیا میں سے کچھ گوشت کم نظر آتا تھا اور نہ گوندھوئے آٹے میں کوئی کمی معلوم ہوتی تھی۔ ہم سب گھر والوں نے بھی شکم سیر

ہو کر کھایا باقی پڑوسیوں میں تقسیم کر دیا۔

اس طرح چھ روز میں جب خندق سے فراغت ہو گئی تو احزاب کا لشکر آپہنچا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے جبل سلح کو اپنی پشت کی طرف رکھ کر فوج کی صف بندی کر دی۔

یہودی بنی قریظہ کی عہد شکنی اور احزاب کے ساتھ شرکت

اس وقت دس بارہ ہزار کے با سامان لشکر کے ساتھ تین ہزار بے سر و سامان لوگوں کا مقابلہ بھی عقل و قیاس میں آنے کی چیز نہ تھی۔ اس پر ایک اور نیا اضافہ ہوا کہ احزاب میں قبیلہ بنو نضیر کے سردار حنی بن اخطب نے سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی دشمنی پر جمع کرنے میں بڑا کام کیا تھا، مدینہ پہنچ کر یہود کے قبیلہ بنو قریظہ کو بھی اپنے ساتھ ملانے کا منصوبہ بنایا۔ بنو قریظہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ایک صلح نامہ پر دستخط ہو چکے تھے اور معاہدہ مکمل ہو کر ایک دوسرے سے بے فکر تھے۔ بنو قریظہ کا سردار کعب بن اسد تھا۔ حنی بن اخطب اس کے پاس پہنچا۔ جب کعب کو اس کے آنے کی خبر ملی تو اپنے قلعہ کا دروازہ بند کر لیا، کہ حنی اس تک نہ پہنچ سکے۔ مگر حنی بن اخطب نے آوازیں دیں اور دروازہ کھولنے پر اصرار کیا۔ کعب نے اندر ہی سے جواب دیدیا کہ ہم تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ صلح کر چکے ہیں، اور ہم آج تک ان کی طرف سے معاہدہ کی پابندی اور صدق و سچائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا، اس لئے ہم اس معاہدہ کے پابند ہیں، آپ کے ساتھ نہیں آسکتے۔ دیر تک حنی بن اخطب دروازہ کھولنے اور کعب سے باتیں کرنے پر اصرار کرتا رہا اور یہ اندر سے ہی انکار کرتا رہا۔ مگر بالآخر جب کعب کو بہت عار دلایا تو اس نے دروازہ کھول کر حنی کو بلایا اس نے بنو قریظہ کو وہ سبز باغ دکھائے کہ بالآخر کعب اس کی باتوں میں آ گیا، اور احزاب میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔ اور کعب نے جب اپنے قبیلہ کے دوسرے سرداروں کو یہ بات بتلائی تو سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ تم نے غضب کیا کہ مسلمانوں سے بلا وجہ عہد شکنی کی اور ان کے ساتھ لگ کر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیا۔ کعب بھی ان کی بات سے متاثر ہوا اور اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کیا۔ مگر اب بات اس کے قبضہ سے نکل چکی تھی، اور بالآخر یہی عہد شکنی بنو قریظہ کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو اس کی اطلاع ملی تو اس وقت میں ان کی عہد شکنی سے سخت صدمہ پہنچا، اور بہت بڑی فکر اس کی لاحق ہو گئی کہ احزاب کے رہستہ پر تو خندق کھود دی گئی تھی، مگر یہ لوگ تو مدینہ کے اندر تھے، ان سے بچاؤ کیسے ہو۔ قرآن کریم



میں جو اس جملہ کے متعلق فرمایا ہے کہ لشکر احزاب کے کفار تم پر چڑھ آئے تھے مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ اس کی تفسیر میں بعض ائمہ تفسیر نے یہی فرمایا ہے کہ فوق کی جانب سے مراد بنو قریظہ ہیں اور اسفل سے آنے والے باقی احزاب ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہد شکنی کی حقیقت اور صحیح صورت حال معلوم کرنے کے لئے انصار کے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ اور قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ کو بصورت وفد کعب کے پاس بھیجا کہ اس سے گفتگو کریں اور یہ ہدایت دیدی کہ اگر عہد شکنی کا واقعہ غلط ثابت ہو تو سب صحابہ کے سامنے کھل کر بیان کر دینا اور صحیح ثابت ہو تو آکر گول مول بات کہنا جس سے ہم سمجھ لیں اور عام صحابہ کرام میں سرکشی پیدا نہ ہو۔

یہ دونوں بزرگ سعد نامی وہاں پہنچے تو عہد شکنی کے سامان کھلے دیکھے۔ ان کے اور کعب کے درمیان سخت کلامی بھی ہوئی، واپس آکر حسب ہدایت گول مول بات کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عہد شکنی کا واقعہ صحیح ہونے سے باخبر کر دیا۔

اس وقت جب کہ یہود کا قبیلہ بنو قریظہ جو مسلمانوں کا حلیف تھا وہ بھی ہر سر جنگ آگیا تو جو نفاق کے ساتھ مسلمانوں میں شامل تھے ان کا نفاق بھی کھلنے لگا۔ بعض نے تو کھل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف باتیں کہنا شروع کر دیں، جیسا کہ اوپر گذرا اِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ، اور بعض نے حیلے بہانے بنا کر میدان جنگ سے بھاگ جانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی، جس کا ذکر آیات مذکورہ (اِنَّ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ حُزْبًا) میں آیا ہے۔

اب محاذ جنگ کی یہ صورت تھی کہ خندق کی وجہ سے احزاب کا لشکر اندر نہ آسکتا تھا۔ اس کے دوسرے کنارہ پر مسلمانوں کا لشکر تھا۔ دونوں میں ہر وقت تیر اندازی کا سلسلہ رہتا تھا۔ اسی حال میں تقریباً ایک مہینہ ہو گیا کہ نہ کھل کر کوئی فیصلہ کن جنگ ہوتی تھی اور نہ کسی وقت بے فکری دن رات صحابہ کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کے کنارے اس کی حفاظت کرتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی بنفس نفیس اس محنت و مشقت میں شریک تھے، مگر آپ پر یہ بات بہت شاق تھی کہ صحابہ کرام سب کے سب سخت اضطراب اور بے چینی میں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ قبیلہ غطفان کے رئیس نے ان یہودیوں کے ساتھ شرکت خیبر کے پھل کی ایک جنگی تدبیر

اور کجور کی طرح میں کی ہے۔ آپ نے غطفان کے دوسرے دار عیینہ ابن حصن اور ابوالحارث بن عمرو کے پاس قاصد بھیجا کہ ہم تمہیں مدینہ طیبہ کا ایک تہائی پھل دیں گے، اگر تم اپنے ساتھیوں کو لے کر میدان سے واپس چلے جاؤ۔ یہ گفتگو درمیان میں تھی اور دونوں سردار راضی ہو چکے تھے قریب تھا کہ معاہدہ صلح پر دستخط ہو جائیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب عادت ارادہ کیا کہ صحابہ کرام سے اس معاملہ میں مشورہ لیں۔ قبیلہ اوس و خزرج کے دو بزرگ سعد بن سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ کو بلا کر ان سے مشورہ لیا۔

حضرت سعد کی غیرت ایمانی اور عزم شدید کی طرف سے حکم ہوا ہے تو ہمارے کچھ کہنے کی مجال نہیں ہم قبول کریں گے ورنہ بتائی کہ آپ کی طبعی رائے ہے یا آپ نے ہمیں مشقت و تکلیف سے بچانے کے لئے یہ تدبیر کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ امیر الہی اس کا ہے، اور نہ میری اپنی طبیعت کا تقاضا ہے بلکہ صرف تمہاری مصیبت و تکلیف کو دیکھ کر یہ صورت اختیار کی ہے، کیونکہ تم لوگ ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہو۔ میں نے چاہا کہ فریق بمقابل کی قوت کو اس طرح فوراً توڑ دیا جائے۔ حضرت سعد بن معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم جس وقت بتوں کو پوچھتے تھے اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانتے تھے نہ اس کی عبادت کرتے تھے، اُس وقت اُن لوگوں کو ہمارے شہر کے پھل میں سے ایک دانہ کی طرح رکھنے کی ہمت نہیں تھی، بجز اس کے کہ وہ ہمارے جہان ہوں، اور جہانی کے طور پر ہم ان کو کھلا دیں یا پھر ہم سے خرید کر لے جائیں۔ آج جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی معرفت عطا فرمائی اور اسلام کا اعزاز عطا فرمایا، کیا آج ہم ان لوگوں کو اپنا پھل اور اپنے اموال دیدیں گے۔ ہمیں ان کی مصالحت کی کوئی حاجت نہیں، ہم تو ان کو تلوار کے سوا کچھ نہیں دیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور اُن کے درمیان فیصلہ فرمادیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کی اولوالعزمی اور غیرت ایمانی کو دیکھ کر اپنا یہ ارادہ چھوڑ دیا اور فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔ سعد نے صلحنامہ کا کاغذ ان کے ہاتھوں سے لے کر تحریر مشادی، کیونکہ ابھی اس پر دستخط نہیں ہوئے تھے۔ غطفان کے سردار عیینہ اور حارث جو خود اس صلح کے لئے تیار ہو کر مجلس میں موجود تھے، صحابہ کرام کی یہ قوت و شدت دیکھ کر خود بھی اپنے دلوں میں متزلزل ہو گئے۔

حضرت سعد بن معاذ کا ادھر خندق کے دونوں طرفوں سے تیر اندازی اور پتھراؤ کا سلسلہ زخمی ہونا اور ان کی دُعا جاری رہا۔ حضرت سعد بن معاذ بنی حارثہ کے قلعہ میں جہاں



عورتوں کو محفوظ کر دیا گیا تھا، اپنی والدہ کے پاس گئے تھے۔ حضرت عائشہ رضی فرماتی ہیں کہ میں بھی اس وقت اسی قلعہ میں تھی، اور عورتوں کو پردے کے احکام اس وقت تک آئے نہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ سعد بن معاذؓ ایک چھوٹی زرہ پہنے ہوئی ہیں جس میں سے ان کے ہاتھ نکل رہے تھے، اور ان کی والدہ ان سے کہہ رہی ہیں کہ جاؤ جلدی کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لشکر میں شامل ہو جاؤ۔ میں نے ان کی والدہ سے کہا کہ ان کے لئے کوئی بڑی زرہ ہوتی تو بہتر تھا۔ مجھے ان کے ہاتھ پاؤں کا خطرہ ہے، جو زرہ سے نکلے ہوئے ہیں۔ والدہ نے کہا کچھ مضائقہ نہیں، اللہ کو جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

حضرت سعد بن معاذؓ لشکر میں پہنچے تو ان کو تیر لگا جس نے ان کی رگ اکھل کو کاٹ ڈالا۔ اس وقت حضرت سعدؓ نے یہ دعا کی کہ یا اللہ اگر آئندہ بھی قریش کا کوئی حملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر ہونا مقدر ہے تو مجھے اس کے لئے زندہ رکھے، کیونکہ اس سے زیادہ میری کوئی تمنا نہیں کہ میں اس قوم سے مقابلہ کروں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا میں پہنچائیں، وطن سے نکالا، اور آپؐ کی تکذیب کی۔ اور اگر آئندہ آپ کے علم میں یہ جنگ کا سلسلہ ختم ہو چکا ہو تو آپ مجھے موت شہادت عطا فرمائیں، مگر اس وقت تک مجھے موت نہ آئے جب تک کہ بنی قریظہ سے ان کی غداری کا انتقام لے کر میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔

حق تعالیٰ نے آپ کی یہ دونوں دعائیں قبول فرمائیں۔ اس واقعہ احزاب کفار کا آخری حملہ بنا دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کا دور شروع ہوا۔ پہلے خیبر پھر مکہ مکرمہ اور پھر وُسْطیٰ بلات فتح ہوئے۔ اور بنو قریظہ کا واقعہ آگے آتا ہے کہ وہ گرفتار کر کے لائے گئے اور ان کے معاملہ کا فیصلہ حضرت سعد بن معاذؓ ہی کے سپرد کیا گیا۔ ان کے فیصلہ کے مطابق ان کے جوان قتل کئے گئے، اور عورتیں بچے قید کر لئے گئے۔

اس واقعہ احزاب میں صحابہ کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات بھر خندق کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ اگر کسی وقت آرام کے لئے لیٹے بھی تو ذرا کسی طرف سے شور و شغب کی آواز آتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلحہ باندھ کر میدان میں جاتے تھے۔ حضرت ام سلمہ ام المؤمنینؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں کئی کئی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ ذرا آرام کرنے کے لئے تشریف لائے اور کوئی آواز سنی تو فوراً باہر تشریف لے گئے، پھر آرام کے لئے ذرا کمر لگائی اور پھر کوئی آواز سنی تو باہر تشریف لے گئے۔

اُمّ المؤمنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں بہت سے غزوات غزوہ مریح،

خیبر، حدیبیہ، فتح مکہ اور غزوہ حنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہی ہوں، آپ پر کسی غزوہ میں ایسی شدت اور مشقت نہیں ہوئی، جیسی غزوہ خندق میں پیش آئی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کو زخم بھی بہت لگے، سردی کی شدت سے بھی تکلیف اٹھائی، اس کے ساتھ کھانے پینے کی ضروریات میں بھی تنگی تھی (منظری)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چاہا ایک روز مقابل کفار نے یہ طے کیا کہ سب مل کر یکبارگی حملہ کر دو نمازیں اس جہاد میں قضا ہوتیں اور کسی طرح خندق کو عبور کر کے آگے پہنچو۔ یہ طے کر کے بڑی بے جگری سے مسلمانوں کے مقابلہ میں آگئے، اور سخت تیر اندازی کی۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو دن بھر ایسا مشغول رہنا پڑا کہ نماز کے لئے بھی ذرا سی ہمت نہ ملی، چار نمازیں عشاء کے وقت میں پڑھی گئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسلمانوں پر شدت کی انتہا ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب کفار کے لئے بددعا کی، اور تین روز پیر، منگل، بدھ

میں مجید فتح کے اندر مسلسل احزاب کی شکست و فرار اور مسلمانوں کی فتح کے لئے دعا کرتے رہے۔ تیسرے روز بدھ کے دن ظہر و عصر کے درمیان دعا قبول ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاداں و فرحان صحابہ کرام کے پاس تشریف لائے، فتح کی بشارت سنائی۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ اس وقت کے بعد سے کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پیش نہیں آئی (منظری)۔ کشود کار اور فتح کے دشمنوں کی صفوف میں قبیلہ غطفان ایک بڑی طاقت تھی، حق تعالیٰ اسباب کا آغاز کی قدرت بکاملہ نے انہی میں سے ایک شخص نعیم ابن مسعودؓ کے دل

میں ایمان ڈال دیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انھوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ اور بتلایا کہ ابھی تک میری قوم میں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں، اب مجھے فرمائیں کہ میں اسلام کی کیا خدمت کروں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اکیلے آدمی یہاں کوئی خاص کام نہ کر سکو گے، اپنی قوم میں واپس جا کر انہی میں مل کر اسلام سے مدافعت کا کوئی کام کر سکو تو کرو۔ نعیم ابن مسعودؓ ذہین سمجھدار آدمی تھے، ایک منصوبہ دل میں بنالیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی کہ میں ان لوگوں میں جا کر جو مصلحت دیکھوں کہوں، آپ نے اجازت دیدی۔

نعیم بن مسعودؓ یہاں سے بنو قریظہ کے پاس گئے جن کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں ان کے قدیم تعلقات تھے۔ ان سے کہا کہ اے بنو قریظہ تم جانتے ہو کہ میں تمہارا قدیم دوست ہوں انھوں نے اقرار کیا کہ ہمیں آپ کی دوستی میں کوئی شبہ نہیں، اس کے بعد



حضرت نعیم بن مسعودؓ نے بنو قریظہ کے سرداروں سے ناصحانہ اور خیر خواہانہ انداز میں سوال کیا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ قریش مکہ ہوں یا ہمارا قبیلہ غطفان یا دوسرے قبائل یہود وغیرہ، ان کا وطن یہاں نہیں، یہ اگر شکست کھا کر بھاگ جائیں تو ان کا کوئی نقصان نہیں، تمہارا معاملہ ان سب کے مختلف ہے۔ مدینہ تمہارا وطن ہے، تمہاری عورتیں اور اموال سب یہاں ہیں۔ اگر تم نے ان لوگوں کے ساتھ جنگ میں شرکت کی اور بعد میں یہ لوگ شکست کھا کر بھاگ گئے، تو تمہارا کیا بنے گا، کیا تم تنہا مسلمانوں کا مقابلہ کر سکو گے؟ اس لئے میں تمہاری خیر خواہی سے یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم لوگ ان کے ساتھ اس وقت تک شریک جنگ نہ ہو جب تک یہ لوگ اپنے خاص سرداروں کی ایک تعداد تمہارے پاس رہیں نہ رکھ دیں، کہ وہ تم کو مسلمانوں کے حوالہ کر کے نہ بھاگ جائیں۔ بنو قریظہ کو ان کا یہ مشورہ بہت اچھا معلوم ہوا، اس کی قدر کی اور کہا کہ آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا۔

اس کے بعد نعیم بن مسعودؓ قریشی سرداروں کے پاس پہنچے، اور ان سے کہا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں آپ کا دوست ہوں اور محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے برسی ہوں، مجھے ایک خبر ملی ہے تمہاری خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ میں وہ خبر تمہیں پہنچا دوں بشرطیکہ آپ لوگ میرے نام کا اظہار نہ کریں۔ وہ خبر یہ ہے کہ یہود بنی قریظہ تمہارے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد اپنے فیصلہ پر نادم ہوئے، اور اس کی اطلاع محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ کہہ کر بھیج دی ہے کہ کیا آپ ہم سے اس شرط پر راضی ہو سکتے ہیں کہ ہم قریش اور غطفان کے چند سرداروں کو آپ کے حوالے کر دیں کہ آپ ان کی گردن مار دیں، پھر ہم آپ کے ساتھ مل کر ان سب کے جنگ کریں۔ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کو قبول کر لیا، اب بنو قریظہ تم سے بطور رہن کے تمہارے کچھ سرداروں کا مطالبہ کریں گے، اب آپ لوگ اپنے معاملہ کو سوچ لیں۔

اس کے بعد نعیم بن مسعودؓ اپنے قبیلہ غطفان میں گئے، اور ان کو یہی خبر سنائی۔ اس کے ساتھ ہی ابوسفیان نے قریش کی طرف سے عکرمہ بن ابی جہل کو اور غطفان کی طرف سے ورقہ ابن غطفان کو اس کام کے لئے مقرر کیا کہ وہ بنو قریظہ سے جا کر کہیں کہ اب ہمارا سامان جنگ بھی ختم ہو رہا ہے، اور ہمارے آدھی بھی مسلسل جنگ سے تھک رہے ہیں، ہم آپ کے معاہدے کے مطابق آپ کی امداد اور شرکت کے منتظر ہیں۔ بنو قریظہ نے ان کو اپنی قرار دے کے مطابق یہ جواب دیا کہ ہم تمہارے ساتھ جنگ میں اس وقت تک شریک نہیں ہونگے

جب تک تم دونوں قبیلوں کے چند سردار ہمارے پاس بطور رہن (یرغمال) کے نہ پہنچ جائیں۔ عکرمہ اور ورقہ نے یہ خبر ابوسفیان کو پہنچادی تو قریش اور غطفان کے سرداروں نے یقین کر لیا کہ نعیم بن مسعود نے جو خبر دی تھی وہ صحیح ہے۔ اور بنو قریظہ سے کہلا بھیجا کہ ہم ایک آدمی بھی اپنا آپ کو نہیں دیں گے، پھر آپ کا دل چاہے تو ہمارے ساتھ جنگ میں شرکت کریں اور نہ چاہیں نہ کریں۔ بنو قریظہ کو یہ حال دیکھ کر اس بات پر جو نعیم بن مسعود نے کہی تھی اور زیادہ یقین ہو گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دشمن گروہ میں سے ایک شخص کے ذریعہ ان کے آپس میں پھوٹ ڈال دی، اور ان لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔

اس کے ساتھ دوسری آسمانی افتاد ان پر یہ آئی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سخت اور برفانی ہوا ان پر مسلط کر دی جس نے ان کے خیمے اکھاڑ پھینکے، ہنڈیاں چوٹھوں کے اڑا دیں۔ یہ تو ظاہری اسباب اللہ تعالیٰ نے ان کے پاؤں اکھاڑنے کے لئے پیدا فرما دیئے تھے اس پر مزید اپنے فرشتے بھیج دیئے جو باطنی طور پر ان کے دلوں پر رعب طاری کر دیں، ان دونوں باتوں کا ذکر آیات مذکورہ کے شروع میں بھی اس طرح فرمایا گیا، **وَفَارَسَلْنَا عَلَيْهِمُ رِيحًا وَجُنُودًا لِّمُدَّتِ رُوحَهَا** یعنی ہم نے بھیج دی ان کے اوپر ایک تند و سخت ہوا اور بھیج دیئے فرشتوں کے لشکر۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اب ان لوگوں کے لئے بھاگ کھڑے ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

حضرت حذیفہ کا دشمن کے  
لشکر میں جانے اور خبر لانے  
کی کارگزاری اور احزاب کے درمیان پھوٹ کے واقعات  
کی خبر ملی تو ارادہ فرمایا کہ اپنا کوئی آدمی جا کر دشمن کے لشکر کا واقعہ

اور ان کے ارادوں کا پتہ لائے۔ مگر وہ سخت برفانی ہوا جو دشمن پر بھیجی گئی تھی بہر حال پورے مدینہ پر حاوی ہوئی، اور مسلمان بھی اس سخت سردی سے متاثر ہوئے۔ رات کا وقت تھا، صحابہ کرام دن بھر کی محنت و مقابلہ سے جو رچو رخت سردی کے سبب سمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کون ہو جو کھڑا ہو اور دشمن کے لشکر میں جا کر ان کی خبر لائے، اور اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے جاں نثار صحابہ کا مجمع تھا مگر حالات نے ایسا مجبور کر رکھا تھا کہ کوئی کھڑا نہیں ہو سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہو گئے، اور کچھ دیر نماز میں مشغول رہنے کے بعد پھر مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہے کوئی شخص جو دشمن کے لشکر کی مجھے خبر لادے اور اس کے عوض میں جنت حاصل کرے۔ اس مرتبہ بھی پورے مجمع میں ساٹا رہا،



کوئی نہیں اٹھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پھر نماز میں مشغول ہو گئے اور کچھ دیر کے بعد پھر تیسری مرتبہ وہی خطاب فرمایا کہ جو ایسا کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ مگر پوری قوم دن بھر کے سخت ہنگام اور کسی وقت کے فاقہ سے اور بھوک سے اور ادھر سے سردی کی شدت سے ایسی بے بس ہو رہی تھی کہ پھر بھی کوئی نہ اٹھا۔

حضرت حذیفہ بن یمانؓ راوی حدیث فرماتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام لے کر فرمایا کہ حذیفہ تم جاؤ۔ حالت میری بھی سب جیسی تھی، مگر نام لے کر حکم دینے پر اطاعت کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں کھڑا ہو گیا، اور سردی سے میرا تمام بدن کانپ رہا تھا۔ آپؐ نے اپنا دست مبارک میرے سر اور چہرے پر پھیرا اور فرمایا کہ دشمن کے لشکر میں جاؤ اور مجھے صرف خبر لا کر دو اور میرے پاس واپس آنے سے پہلے کوئی کام نہ کرو۔ اور پھر آپؐ نے میری حفاظت کے لئے دعا فرمائی۔ میں نے اپنی تیر کمان اٹھائی اور اپنے کپڑے اپنے اوپر باندھ لئے اور ان کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب یہاں سے روانہ ہوا تو عجیب ماجرایہ دیکھا کہ خیمے کے اندر بیٹھے ہوئے جو سردی سے کپکپی طاری تھی وہ ختم ہو گئی، اور میں اس طرح چل رہا تھا جیسے کوئی گرم حمام کے اندر ہو، یہاں تک کہ میں ان کے لشکر میں پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہوا کے طوفان نے ان کے خیمے اکھاڑ دیئے تھے اور ہانڈیاں الٹ دی تھیں۔ ابوسفیان آگ کے پاس بیٹھ کر سینک رہے تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر اپنا تیر کمان مستحکم کیا، اور ابوسفیان پر تیر بھینکنے ہی والا تھا کہ مجھے حضورؐ کا یہ فرمان یاد آ گیا کہ کچھ کام وہاں سے واپس آنے تک نہ کرنا۔ ابوسفیان بالکل میری زد میں تھے، مگر اس فرمان کی بناء پر میں نے اپنا تیر الگ کر لیا۔ ابوسفیان حالات سے پریشان ہو کر واپسی کا اعلان کرنا چاہتے تھے، مگر اس کے لئے ضروری تھا کہ قوم کے ذمہ داروں سے بات کریں۔ رات کی تاریکی میں اور سناٹے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی جاسوس موجود ہو اور ان کی بات سُن لے۔ اس لئے ابوسفیان نے یہ ہوشیاری کی کہ بات کرنے سے پہلے سالے مجھ کو کہا کہ ہر شخص اپنی برابر والے آدمی کو پہچان لے، تاکہ کوئی غیر آدمی ہماری بات نہ سُن سکے۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ اب مجھے خطرہ ہوا کہ میری برابر کا آدمی جب مجھ سے پوچھے گا کہ تو کون ہے؟ تو میرا راز کھل جائے گا۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری اور دلیری سے خود مسابقت کر کے اپنے برابر والے آدمی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا تعجب ہو تم مجھے نہیں جانتے، میں فلاں ابن فلاں ہوں۔ وہ قبیلہ ہوازن کا آدمی

تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت حذیفہؓ کو گرفتاری سے بچا دیا۔

ابوسفیان نے جب یہ اطمینان کر لیا کہ صحیح اپنا ہی ہے، کوئی غیر نہیں تو اس نے پریشان کن حالات اور بنو قریظہ کی بدعہدی اور سامان جنگ ختم ہو جانے کے واقعات سنا کر کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ اب آپ سب واپس چلیں اور میں بھی واپس جا رہا ہوں اسی وقت لشکر میں بھگدڑ مچ گئی، اور سب واپس جانے لگے۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں یہاں سے واپس چلا تو ایسا محسوس ہوا کہ میرے گرد کوئی گرم حمام ہے جو مجھے سردی سے بچا رہا ہے۔ واپس پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں مشغول پایا۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو میں نے واقعہ کی خبر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس خبر مسرت سے خوش ہو کر ہنسنے لگے۔ یہاں تک کہ رات کی تاریکی میں آپ کے دندان مبارک چمکنے لگے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے قدموں میں جگہ دی، اور جو چادر آپ اوڑھے ہوئے تھے اس کا ایک حصہ مجھ پر ڈال دیا، یہاں تک کہ میں سو گیا۔ جب صبح ہو گئی تو آپ نے ہی یہ کہہ کر مجھے بیدار فرمایا کہ قُمْ يَا نَوْمَانُ، کھڑا ہو جا اے بہت سونے والے۔

آنندہ کفار کے حوصلے | صحیح بخاری میں حضرت سلیمان بن صہرہ کی روایت ہے کہ احزاب پست ہو جائیگی خوشخبری کے واپس جانے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

الآن نغزوهم ولا يغزونا نحن نسير | یعنی اب وہ ہم پر حملہ آور نہ ہوں گے بلکہ ہم ان پر حملہ کریں گے اور ان کے ملک پر چڑھائی کریں گے (منظری)

یہ ارشاد فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام شہر مدینہ میں واپس آ گئے، اور ایک مہینہ کے بعد مسلمانوں نے اپنے ہتھیار کھولے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ صحیح مسلم میں ہے اور یہ مستقلاً ایک | **تنبیہ** درس عبرت ہے جو بہت سی ہدایات اور محجزات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے۔ غور کرنے والے خود معلوم کر لیں گے، تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں۔

ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مدینہ میں واپس پہنچے ہی تھے کہ اچانک جبریل امین علیہ السلام حضرت وحیہ کلبی | **غزوہ بنو قریظہ**

صحابی کی صورت میں تشریف لائے اور فرمایا کہ اگرچہ آپ لوگوں نے اپنے ہتھیار کھول دیے ہیں مگر فرشتوں نے اپنے ہتھیار نہیں کھولے، اللہ تعالیٰ کا آپ کو یہ حکم ہے کہ آپ بنو قریظہ



پر حملہ کریں اور میں آپ سے آگے نہیں جا رہا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اعلان کرنے کے لئے ایک منادی بھیجا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم لوگوں کو سنایا اور پہونچایا لَا یُصَلِّیْنَ أَحَدٌ إِلَّا عَصْرًا إِلَّا فِی بَنِی قُرَیظَةَ، یعنی کوئی آدمی عصر کی نماز نہ پڑھے جب تک کہ بنو قریظہ میں نہ پہونچ جاتے۔

صحابہ کرام سب کے سب اس دوسرے جہاد کے لئے فوراً تیار ہو کر بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں عصر کا وقت آیا تو بعض حضرات نے حکم نبوی کے ظاہر کے موافق راستہ میں نماز عصر ادا نہیں کی، بلکہ منزل مقصد بنو قریظہ میں پہونچ کر ادا کی۔ اور بعض نے یہ سمجھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد عصر کے وقت میں بنو قریظہ پہونچ جانا ہے، ہم اگر نماز راستہ میں پڑھے عصر کے وقت میں وہاں پہونچ جائیں تو یہ حضور کے ارشاد کے منافی نہیں۔ انھوں نے نماز عصر اپنے وقت پر راستہ میں ادا کر لی۔

مجتہدین کے اختلاف میں کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام کے اس اختلاف عمل کی خبر دی گئی، تو آپ نے دونوں فریق میں سے کسی کو ملامت نہیں فرمائی، بلکہ دونوں کی تصویب فرمائی۔ اس سے علماء امت نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ علمائے مجتہدین جو حقیقت مجتہد ہوں اور اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں ان کے اقوال مختلفہ میں سے کسی کو گناہ اور منکر نہیں کہا جاسکتا، دونوں فریقوں کے لئے اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں ثواب لکھا جاتا ہے۔

بنو قریظہ سے جہاد کے لئے نکلنے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے آنے کی خبر سن کر بنو قریظہ قلعہ بند ہو گئے۔ اسلامی لشکر نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

بنو قریظہ کے رئیس بنو قریظہ کا سردار کعب بن ربیع نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد کعب کی تفسیر توڑ کر احزاب کے ساتھ معاہدہ کیا تھا، اس نے اپنی قوم کو جمع کر کے حالات کی نزاکت بیان کرتے ہوئے تین صورتیں عمل کی پیش کیں:

اول یہ کہ تم سب کے سب اسلام قبول کرو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہو جاؤ، کیونکہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم سب لوگ جانتے ہو کہ وہ حق پر ہیں، اور تمھاری کتاب تورات میں ان کی پیشینگوئی موجود ہے، جو تم پڑھتے ہو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو دنیا میں اپنی جان و مال اور اولاد کو محفوظ کر لو گے، اور آخرت بھی درست ہو جائے گی۔

دوسری صورت یہ ہو کہ تم اپنی اولاد اور عورتوں کو پہلے خود اپنے ہاتھ سے قتل کر دو اور پھر پوری طاقت سے مقابلہ کرو یہاں تک کہ تم بھی سب مقتول ہو جاؤ۔

تیسری صورت یہ ہو کہ یوم السبت (ہفتہ کے دن) تم مسلمانوں پر یکبارگی حملہ کر دو، کیونکہ مسلمان جانتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں یوم السبت میں قتال حرام ہے، اس لئے وہ ہماری طرف سے اس دن میں بے فکر ہوں گے، ہم ناگہانی طور پر حملہ کریں تو ممکن ہو کا مینا ہو جائیں۔

کعب رئیس قوم کی یہ تفسیر سن کر قوم کے لوگوں نے جواب دیا کہ پہلی بات یعنی مسلمان ہو جانا یہ تو ہم ہرگز قبول نہ کریں گے، کیونکہ ہم تو رات کو چھوڑ کر اور کسی کتاب کو نہ مانیں گے۔ یہی دوسری بات تو عورتوں بچوں نے کیا قصور کیا ہے کہ ہم ان کو قتل کر دیں۔ باقی تیسری بات خود حکم تورات اور ہمارے مذہب کے خلاف ہے، یہ بھی ہم نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد سب نے اس پر اتفاق کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیں اور آپ ان کے بارے میں جو فیصلہ فرمادیں اس پر راضی ہو جائیں۔ انصاری صحابہ کرام میں جو لوگ قبیلہ اوس سے متعلق تھے ان کے اور بنو قریظہ کے درمیان قدیم زمانے میں معاہدہ رہا تھا تو اُسی صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ میں ان کا معاملہ تمھارے ہی ایک سردار کے سپرد کر دوں۔ یہ لوگ اس پر راضی ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تمھارے سردار سعد بن معاذ ہیں، اس کا فیصلہ میں ان کے سپرد کرتا ہوں اس پر سب لوگ راضی ہو گئے۔

حضرت سعد بن معاذؓ کو واقعہ خندق میں تیر کا زخم شدید پہنچا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تیمارداری کے لئے مسجد کے احاطہ میں ایک خیمہ لگوا کر اس میں ٹھہرا دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مطابق بنو قریظہ کے قیدیوں کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیا گیا۔ انھوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان میں سے جو جنگ کرنے والے جوان ہیں وہ قتل کر دی جائیں اور عورتوں، بچوں، بوڑھوں کے ساتھ جنگی قیدیوں کا معاملہ کیا جائے جو اسلام میں معروف ہے۔ یہی فیصلہ نافذ کر دیا گیا، اور اس فیصلے کے فوراً بعد ہی حضرت سعد بن معاذؓ کے زخم سے خون بہہ پڑا، اسی میں ان کی وفات ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دونوں دعائیں قبول فرمائیں ایک یہ کہ آئندہ قریش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حملہ نہ ہوگا، دوسرے بنو قریظہ کی غدار کی سزا ان کو مل جائے وہ اللہ نے انہی کے ذریعہ دلوادی۔

جن کو قتل کرنا تجویز ہوا تھا ان میں سے بعض مسلمان ہو جانے کی وجہ سے آزاد کر دیے



عطیہ قرطی جو صحابہ کرام میں محدث ہیں انہی لوگوں میں سے ہیں۔ انہی لوگوں میں زبیر بن باطا بھی تھے۔ ان کو حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کر کے آزاد کرادیا جس کا سبب یہ تھا کہ زبیر بن باطانے ان پر زمانہ جاہلیت میں ایک احسان کیا تھا۔ وہ یہ کہ جاہلیت کے زمانے کی جنگ بعاث میں ثابت بن قیس قید ہو کر زبیر بن باطا کے قبضہ میں آگئے تھے، زبیر بن باطانے ان کے سر کے بال کاٹ کر ان کو آزاد کر دیا قتل نہیں کیا تھا احسان کے بدلے اور غیرت | حضرت ثابت بن قیس زبیر بن باطا کی رہائی کا حکم حاصل کر کے ان کے قومی کے دو عجیب نمونے پاس گئے اور کہا کہ میں نے یہ اس لئے کیا ہے کہ تمہارے اس احسان کا بدلہ کر دوں، جو تم نے جنگ بعاث میں مجھ پر کیا تھا۔ زبیر بن باطانے کہا کہ بے شک شریف آدمی دوسرے شریف کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا کرتا ہے۔ مگر یہ تو بتلاؤ کہ وہ آدمی زندہ رکھ کر کیا کرے گا۔ جس کے اہل و عیال نہ رہے ہوں۔ یہ سن کر ثابت بن قیس حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ان کے اہل و عیال کی بھی جان بخشی کر دی جائے، آپ نے قبول فرما لیا۔ زبیر بن باطا کو اس کی اطلاع دی، تو یہ ایک قدم اور آگے بڑھے کہ ثابت یہ تو بتلاؤ کہ کوئی انسان صاحب عیال کیسے زندہ رہے گا جب اس کے پاس کوئی مال نہ ہو۔ ثابت بن قیس پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان کا مال بھی ان کو دلوا دیا۔ یہاں تک تو ایک مؤمن کی شرافت اور احسان شناسی کا قصیدہ تھا جو حضرت ثابت بن قیس کی طرف سے ہوا۔

اب دوسرا رخ سنئے کہ زبیر بن باطا کو جب اپنے اور اپنے اہل و عیال کی آزادی اور اپنے مال و متاع سب واپس مل جانے کا اطمینان ہو چکا تو اس نے حضرت ثابت بن قیسؓ سے قبائل یہود کے سرداروں کے متعلق سوال کیا، اور پوچھا کہ ابن ابی الحقیق کا کیا ہوا جس کا چہرہ چینی آئینہ جیسا تھا۔ انھوں نے بتلایا کہ وہ قتل کر دیا گیا۔ پھر پوچھا کہ بنی قریظہ کے سردار کعب بن قریظہ اور عمرو بن قریظہ کا کیا انجام ہوا؟ انھوں نے بتلایا کہ یہ دونوں بھی قتل کر دیئے گئے، پھر دو جماعتوں کے متعلق سوال کیا اس کے جواب میں ان کو خبر دی گئی کہ وہ سب قتل کر دیئے گئے۔

یہ سن کر زبیر بن باطانے حضرت ثابت بن قیس سے کہا کہ آپ نے اپنے احسان کا بدلہ پورا کر دیا، اور اپنی ذمہ داری کا حق ادا کر دیا، مگر میں اب اپنی زمین جاہلداد کو ان لوگوں کے بعد آباد نہیں کروں گا، مجھے بھی انہی لوگوں کے ساتھ شامل کر دو، یعنی قتل کر ڈالو۔ ثابت بن قیسؓ نے اس کو قتل کرنے سے انکار کر دیا، پھر اس کے اصرار پر کسی دوسرے مسلمان نے اس کو

قتل کیا۔ (قرطبی)

یہ ایک کافر کی غیرت قومی تھی جس نے سب کچھ ملنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے بغیر زندہ رہنا پسند نہ کیا، ایک مؤمن ایک کافر کے یہ دونوں عمل ایک تاریخی یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بنو قریظہ کی یہ فتح ہجرت کے پانچویں سال میں ماہ ذی قعدہ کے آخر اور ذی الحجہ کے شروع میں ہوئی ہے۔ (قرطبی)

غزوۃ احزاب و بنو قریظہ کو اس جگہ کسی قدر تفصیل سے لانے کی ایک وجہ تو تنبیہ خود قرآن کریم کا ان کو تفصیل سے دو رکوع میں بیان فرمانا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان واقعات میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق بہت سی ہدایات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات و بیانات اور بہت سی عبرتیں ہیں، جن کو اس قصے میں عنوانات دے کر واضح کر دیا گیا ہے۔ اس پورے واقعہ کے معلوم کر لینے کے بعد آیات مذکورہ کی تفسیر کے لئے خلاصہ تفسیر مذکور کا دیکھ لینا کافی ہے، کسی مزید شرح کی ضرورت نہیں رہتی، صرف چند باتیں قابل نظر ہیں۔

اول یہ کہ اس غزوہ میں مسلمانوں پر شدت اور مختلف قسم کی تکلیفوں میں مبتلا ہونے کا ذکر فرما کر اس اضطراب کے عالم میں ایک حال تو مومنین کا بتلایا گیا ہے کہ تَطْمَئِنُّ قُلُوبُكُم بِاللهِ الْغَنِيُّ ذَا الْعَرْشِ الْعَظِيمِ یعنی تم لوگ اللہ کے ساتھ مختلف قسم کے گمان کرنے لگے تھے۔ ان گمانوں سے مراد غیر اختیاری و سادس ہیں جو اضطراب کے وقت انسان کے دل میں آیا کرتے ہیں کہ موت اب آ ہی گئی، اب نجات کی صورت نہیں رہی وغیرہ وغیرہ۔ ایسے غیر اختیاری خطرات و سادس نہ کمال ایمان کے منافی ہیں نہ کمال ولایت کے۔ البتہ ان سے مصیبت و اضطراب کی شدت کا ضرور پتہ لگتا ہے کہ صحابہ کرام جیسے جہاں سقا کے دلوں میں بھی دوسو سے آنے لگے۔

دوسرا حال منافقین کا ذکر فرمایا ہے کہ انھوں نے کھلے طور پر اللہ و رسول کے وعدوں کو دھوکہ فریب کہنا شروع کر دیا، وَ اِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللهُ وَرَسُولُهُ اِلَّا غُرُورًا، یہ ان کے باطنی کفر کا اظہار تھا آگے عملی طور پر وہ منافقین جو ظاہر میں مسلمانوں کے ساتھ شریک جہاد تھے ان کے دو طبقوں کا ذکر ہے۔ ایک طبقہ تو بے پوچھے بھاگنے لگا، جس نے کہا يَا اَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَاصْرِعُوا، اور دوسرے طبقے نے چلے بہانے تراش کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے واپس چلے جانے کی درخواست کی جن کا حال یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وَيَسْتَاذِنُ



فَرِحُوا مِنْهُمْ النَّبِيُّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ أَلَا يَتَذَكَّرُ الْآيَةُ، قرآن کریم نے ان کے حیلے بہانے کو کھول دیا کہ یہ سب جھوٹ ہی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ میدان سے بھاگنا چاہتے ہیں، اِنْ يُّزَيِّنْ وَيَنْزِلْ لَا يَفْرَارًا آگے کسی آیتوں میں ان کی شرارت اور مسلمانوں کے ساتھ عداوت پھر ان کے انجامِ بد کا ذکر فرمایا۔

اس کے بعد مؤمنینِ مخلصین کا ذکر فرما کر ان کے ثبات و استقلال کی مدح کی گئی ہے۔ اسی کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و اقتدار کی تاکید ایک ضابطہ کی صورت میں بیان فرمائی گئی ہے، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ، اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سب کی اقتدار کا حکم ثابت ہوا، مگر محققینِ ائمہ تفسیر کے نزدیک اس کی عملی صورت یہ ہے کہ جس کام کا کرنا یا چھوڑنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدرجہ وجوب ثابت ہو اس کا اتباع واجب و لازم ہے۔ اور جس کام کا کرنا یا چھوڑنا بدرجہ استحباب ثابت ہو اس کا کرنا یا چھوڑنا ہم پر بھی درجہ استحباب میں رہے گا کہ اس کی خلاف ورزی گناہ نہ قرار دی جائے گی (قلت اليه يرجع كلام الجصاص في احكام القرآن) آیات مذکورہ میں سے آخری تین آیتوں میں واقعہ بنو قریظہ کا ذکر ہے وَانْزَلِ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيهِمْ، یعنی جن اہل کتاب نے اہل احزاب کی مدد کی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا رعب ڈال کر ان کے مضبوط قلعوں سے ان کو نیچے اتار دیا، اور ان کے اموال اور دار و دیار کا مسلمانوں کو وارث بنایا۔

آخری آیت میں آئندہ ہونے والی فتوحات کی خوش خبری دی گئی ہے کہ اب کفار کے حملے ختم ہوئے، اب مسلمانوں کی فتوحات کا دور شروع ہو گا، اور ایسی ایسی زمینیں ان کے قبضہ میں آئیں گی جہاں ان کے قدم بھی اب تک نہیں پہنچے۔ جس کا ظہور صحابہ کرام کے دور میں سب کی آنکھوں نے دیکھ لیا کہ کسری و قیصر کی سب سے بڑی سلطنتیں ان کے زیرِ نگیں آگئیں۔ وَاللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَنْزِلَ وَأُجَلَكَ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْحَيَاةَ

اے نبی کہہ دے اپنی عورتوں کو اگر تم چاہتی ہو دنیا کی

الدُّنْيَا وَزِيَّاتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمِّيَّتُكُنَّ وَأَسْرَحُكُنَّ سَرَّاحًا

زندگانی اور یہاں کی رونق تو آؤ کچھ فائدہ پہنچا دوں تم کو اور رخصت کر دوں بھلی طرح

جَبِيلًا ۲۸) وَإِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالْأَخِرَةَ

سے رخصت کرنا۔ اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور پچھلے گھر کو

فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُمْ أَجْرًا عَظِيمًا ۲۹) يَنْسَاءُ النَّبِيُّ

تو اللہ نے رکھ چھوڑا ہے ان کے لئے جو تم میں نیکی پر ہیں بڑا ثواب۔ ایسی ہی کی عورتوں !

مَنْ يَأْتِ مِنْكُمْ بِفَاحِشَةٍ مُبَيَّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ

جو کوئی کر لائے تم میں کام بے حیائی کا صریح دُونا ہو اس کو عذاب

ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۳۰) وَمَنْ يَقْنُتْ

دوہرا اور ہے یہ اللہ پر آسان۔ اور جو کوئی تم میں اطاعت

مِنْكُمْ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعَمَلْ صَالِحًا نُورَتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ

کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور عمل کرے اچھے، دیویں ہم اس کو اس کا ثواب دوبار

وَأَعْتَدْنَا لَهَا زَوْجًا كَرِيمًا ۳۱) يَنْسَاءُ النَّبِيُّ كَأَحَدٍ

اور رکھی ہو ہم نے اس کے واسطے روزی عزت کی۔ ایسی ہی کی عورتوں تم نہیں ہو جیسے ہر کوئی

مِّنَ النِّسَاءِ إِنْ اتَّقَيْنَ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي

عورتیں اگر تم ڈر رکھو سو تم دب کر بات نہ کرو پھر لالچ کرے کوئی جس کے

فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۳۲) وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ

دل میں روگ ہے اور کہو بات معقول۔ اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَ

اور دکھلائی نہ پھر جیسا کہ دکھلانا دستور تھا پہلے جاہلیت کے وقت میں اور قائم رکھو نماز اور

آتَيْنَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ

دیتی رہو زکوٰۃ اور اطاعت میں رہو اللہ کی اور اس کے رسول کی، اللہ یہی چاہتا ہے کہ

لِيَذْهَبَ عَنْكُمُ الرِّجْسُ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ

دُور کرے تم سے گندی باتیں اے نبی کے گھر والو اور ستھرا کرے تم کو ایک



تَطْهِيراً ۳۲) وَادْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَ

تھرائی سے۔ اور یاد کرو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں اللہ کی باتیں اور

الْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ۳۳)

عقلندی کی، مقرر اللہ ہی بھید جانتے والا خبردار

## خلاصہ تفسیر

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنی بیبیوں سے فرمادیجئے (تم سے دو ٹوک بات کہی جاتی ہے تاکہ ہمیشہ کے لئے قصہ ایک طرف ہو وہ بات یہ ہے کہ) تم اگر دنیوی زندگی (کی عیش) اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ (یعنی لینے کے لئے متوجہ ہو) میں تم کو کچھ (مال و متاع دنیوی) دیدوں یا تو مراد اس سے وہ جوڑہ ہے جو مطلقہ مدخولہ کو بوقت طلاق دینا مستحب ہے یا مراد نان نفقہ عدت کا ہے، یا دونوں کو شامل ہے، اور (متاع دے کر) تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کروں (یعنی موافق سنت کے طلاق دیدوں تاکہ جہاں چاہو جا کر دنیا حاصل کرو) اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور (مطلب اللہ کو چاہنے کا اس جگہ یہ ہے کہ) اس کے رسول کو چاہتی ہو، یعنی فقر و افلاس کی موجودہ حالت کے ساتھ رسول کے نکاح میں رہنا چاہتی ہو) اور عالم آخرت کے درجات عالیہ کو (چاہتی ہو جو کہ زوجیت رسول پر مرتب ہونے والے ہیں) تو یہ تمہاری نیک کرداری ہے اور تم میں نیک کرداروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے (آخرت میں) اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے (یعنی وہ ثواب جو مخصوص ہر زوجاتِ نبی کے لئے کہ اور نیک بیبیوں کے اجر سے وہ عظیم ہے۔ اور جس سے زوجیت نبی کو اختیار نہ کرنے کی صورت میں محرومی ہوگی) اگر عموم دلائل سے مطلق ایمان و اعمال صالحہ کے ثمرات اس صورت میں بھی حاصل ہوں گے۔ یہاں تک تو مضمون تنخیر کا ہی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ازدواج کو اختیار دیا گیا کہ موجودہ حالت پر قناعت کر کے آپ کی زوجیت میں رہنا پسند کریں، یا پھر آپ سے طلاق حاصل کر لیں آگے حق تعالیٰ ان کو خود خطاب کر کے وہ احکام فرماتے ہیں جو بصورت اختیار زوجیت واجب الایہتمام ہوں گے۔ ارشاد ہے کہ) اے نبی کی بیبیو! جو تم میں کھلی ہوئی بیہودگی کرے گی (مراد اس سے وہ معاملہ ہو جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنگ و پریشان ہوں تو) اس کو اس پر آخرت میں (دوہری سزا دی جائے گی) (یعنی دوسرے

شخص کو اس عمل پر جتنی سزا ملتی اس سے دوہری سزا ہوگی، اور یہ بات اللہ کو (بالکل) آسان ہے یہ نہیں کہ دنیوی حکام کی طرح احیاناً سزا بڑھانے سے کسی کی عظمت اس کو مانع ہو جاوے، اور اس سزا کے بڑھنے کی وجہ ابھی تضعیفِ اجر کی تقریر میں آتی ہے، اور جو کوئی تم میں اللہ کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی (یعنی جن امور کو اللہ تعالیٰ نے واجب فرمایا ہے ان کو ادا کرے گی اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زوج ہونے کے جو حقوق اطاعت وغیرہ واجب ہیں وہ ادا کرے گی کیونکہ حیثیت رسالت کے حقوق اللہ کی اطاعت میں داخل ہو گئے) اور (امور غیر واجبہ میں سے جو) نیک کام (ہیں ان کو) کرے گی تو ہم اس کو اس کا ثواب (بھی) دوہرا دیں گے اور ہم نے اُس کے لئے (علاوہ دوہرے اجر و عود کے) ایک (خاص) عمدہ روزی (جو جنت میں ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اور جو صلہ عمل سے زائد ہے) تیار کر رکھی ہے (اطاعت کی صورت میں دوہرے اجر اور ترکِ اطاعت پر دوہرے عذاب کی وجہ شرفِ زوجیت نبی ہے جس پر *یُنِسَاءُ النَّبِیِّ* دال ہے۔ کیونکہ اہل خصوصیت کی کوتاہی بھی اور دل کی کوتاہی سے اشد ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی اطاعت بھی اور دل کی اطاعت سے زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ پس وعدہ و وعید دونوں میں وہ دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اور خصوصاً مقامِ کلام میں یہ کہنا ممکن ہو کہ حضراتِ اہبات المؤمنین سے خدمت اور اطاعت کا صدور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو راحت افزا زیادہ ہوگا پس آپ کی راحت رسانی موجب زیادتیِ اجر ہوگئی، علیٰ ہذا اس کی ضد میں سمجھنا چاہئے، یہاں تک ازواج سے آپ کے حقوق کے متعلق خطاب تھا آگے عام احکام کے متعلق زیادہ اہتمام کے لئے خطاب ہے کہ) اسے نبی کی بیبیرِ محض اس بات پر مت پھول جانا کہ ہم نبی کی بیبیاں ہیں اور اس لئے عام عورتوں سے ممتاز ہیں یہ نسبت اور شرف ہمارے لئے پس ہے، سو یہ وسوسہ مت کرنا یہ بات صحیح ہے کہ تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو رہی بیشک ان سے ممتاز ہو مگر مطلقاً نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ایک شرط بھی ہے وہ یہ کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو ورتب تو واقعی اس نسبت کے سبب تم کو اور دوسروں سے فضیلت حاصل ہے، حتیٰ کہ ثواب مضاعف ملے گا اور اگر یہ شرط متحقق نہیں تو یہی نسبت بالعکس دوہرے عذاب کا سبب بن جائے گی، جب یہ بات ہے کہ نسبت بلا تقویٰ صحیح ہے) تو تم کو احکامِ شرعیہ کی پوری پابندی کرنا چاہئے عموماً اور ان احکام مذکورہ آیت آئندہ کی خصوصاً، اور وہ احکام ہیں کہ تم (نامحرم مرد سے) بولنے میں (جب کہ بضرورت بولنا پڑے) نزاکت مت کرو



اس کا مطلب یہ نہیں کہ قصد انزاکت مت کرو کیونکہ اس کا براہین تو بدیہی ہے دوسری مخاطب یعنی ازواج مطہرات میں اس کا احتمال نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے عورتوں کے کلام کا فطری انداز ہوتا ہے کہ کلام میں نرمی اور نزاکت طبعی ہوتی ہے، اس انداز کو مت برو کہ (اس سے) ایسے شخص کو (طبعاً خیال فاسد پیدا) ہونے لگتا ہے جس کے قلب میں خرابی (اور بدی) ہے (بلکہ ایسے موقح پر تکلف اور اہتمام سے اُس فطری انداز کو بدل کر گفتگو کرو) اور قاعدہ (عفت) کے موافق بات کہو یعنی ایسے انداز سے جس میں خشکی اور روکھاپن ہو کہ یہ حافظ عفت ہے، اور یہ بد اخلاقی نہیں ہے۔ بد اخلاقی وہ ہے جس سے کسی کے قلب کو ایذا پہنچے اور طبع فاسد کے روکنے سے ایذا لازم نہیں آتی۔ اس میں تو بولنے کے متعلق حکم فرمایا) اور آگے پردہ کے متعلق ارشاد ہے اور امر مشترک دونوں میں فقط عفت ہی یعنی (تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو) مراد اس سے یہ ہے کہ محض کپڑا اوڑھ لپیٹ کر پردہ کر لینے پر کفایت مت کرو بلکہ پردہ اس طریقہ سے کرو کہ بدن مع لباس نظر نہ آئے، جیسا کہ آجکل شرفاء میں پردہ کا طریقہ متعارف ہے کہ عورتیں گھروں ہی سے نہیں نکلتیں، البتہ مواقع ضرورت دوسری دلیل سے مستثنیٰ ہیں) اور آگے اسی حکم کی تاکید کے لئے ارشاد ہے کہ (قدیم زمانہ جہالت کے دستور کے موافق مت پھر دو جس میں بے پردگی رائج تھی گو بلا فحش ہی کیوں نہ ہو۔ اور قدیم جاہلیت کے مراد وہ جاہلیت ہے جو اسلام سے پہلے تھی، اور اس کے مقابلہ میں ایک مابعد کی جاہلیت ہے کہ بعد تعلیم و تبلیغ احکام اسلام کے ان پر عمل نہ کیا جائے۔ پس جو تبرج بعد اسلام ہوگا وہ جاہلیت آخری ہے، اس لئے تشبیہ میں تخصیص جاہلیت اولیٰ کی ظاہر ہے، کیونکہ مشبہ مشبہ کا تغائر ضروری ہے۔ مطلب یہ کہ جاہلیت آخری جاری کر کے جاہلیت اولیٰ کا اقتدار نہ کرو جس کے مٹانے کو اسلام آیا ہے۔ یہاں تک احکام متعلقہ عفت کے تھے) اور آگے دوسرے شرائع کا ارشاد ہے کہ (تم نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ اگر نصاب کی مالک ہو) دیا کرو کہ دونوں اعظم شعائر سے ہیں، اس لئے ان کی تخصیص کی گئی، اور (بھی جتنے احکام ہیں اور تم کو معلوم ہیں سب میں) اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا مانو اور ہم نے جو تم کو ان احکام کے اس التزام اور اہتمام کا مکلف فرمایا ہے تو تمہارا ہی نفع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ان احکام کے بتانے سے تشریعاً یہ منظور ہو کہ اے پیغمبر کے گھر والو تم سے (معصیت و نافرمانی کی) آلودگی کو دور رکھو، اور تم کو (ظاہراً و باطناً عقیدۃ و عملاً و خلقاً بالکل) پاک صاف رکھے کیونکہ علم بالا احکام کے سبب معنی سے جو کہ موجب آلودگی اور مانع تطہیر ہے بچنا ممکن ہے، اور (چونکہ ان احکام پر عمل واجب

ہو، اور عمل موقوف ہو احکام کے جاننے اور ان کے یاد رکھنے پر اس لئے، تم ان آیات الہیہ یعنی قرآن، کو اور اس علم (احکام) کو یاد رکھو جس کا تمہارے گھروں میں چرچا رہتا ہے (اور یہ بھی پیش نظر رکھو کہ) بیشک اللہ تعالیٰ راز داں ہے کہ اعمالِ قلوب کو بھی جانتا ہے اور پورا خبردار ہے کہ پوشیدہ اعمال کو بھی جانتا ہے، اس لئے ظاہر و باطناً سراً و علانیۃ امتثالِ اوامر اور اجتنابِ نواہی کا اہتمام واجب ہے) :

## معارف و مسائل

اس سورۃ کے مقاصد میں سے اہم مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا سے اور ہر ایسی چیز سے بچنے کی تاکید ہے جس سے آپ کو تکلیف پہونچے، نیز آپ کی اطاعت اور رضا جوئی کے متوکلہ احکام ہیں۔ غزوۃ احزاب کا تفصیلی واقعہ جو اوپر گزرا، اس میں کفار و منافقین کی طرف سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا میں پہونچیں ان کا ذکر اور اس کے ساتھ انجام کار موزی کفار و منافقین کا ذلیل و خوار ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر موقع پر فتح مند اور کامیاب ہونا ذکر کیا گیا تھا، اور اس کے ساتھ ہی مومنین مخلصین جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم و اشارہ پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، ان کی مدح و ثناء اور درجاتِ آخرت کا بیان تھا۔

مذکورہ صدر آیات میں خاص ازواجِ مطہرات کو تعلیم ہے کہ وہ خصوصاً اس کا اہتمام کریں کہ آپ کو ان کے کسی قول و فعل سے ایذا نہ پہونچے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مکمل اطاعت میں لگ جائیں۔ اس سلسلے کے چند احکام ازواجِ مطہرات کو خطاب کر کے بتلائے گئے ہیں۔

شروع آیات میں جو ازواجِ مطہرات کو طلاق لینے کا اختیار دینا مذکور ہو، اس کا ایک یا چند واقعات ہیں جو ازواجِ مطہرات کی طرف سے پیش آئے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کے خلاف تھے، جن سے بلا قصد و اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہونچی۔

ان واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت سے مفصل آیا ہے، اس میں مذکور ہو کہ ازواجِ مطہرات نے جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مطالبہ کیا کہ ان کا نان نفقہ بڑھایا جائے۔ تفسیر بحر محیط میں ابو حیان نے اس کی تشریح یہ بیان کی ہے کہ غزوۃ احزاب کے بعد بنو نضیر پھر



بنو قریظہ کی فتوحات اور اموال غنیمت کی تقسیم نے عام مسلمانوں میں ایک گونہ خوش حالی پیدا کر دی تھی۔ ازواج مطہرات کو اس وقت یہ خیال ہوا کہ ان اموال غنیمت میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنا حصہ رکھا ہوگا، اس لئے انہوں نے جمع ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ کسری و قیصر کی بیبیاں طرح طرح کے زیورات اور قیمتی لباسوں میں ملبوس ہیں، اور ان کی خدمت کیلئے کنیزیں ہیں، اور ہمارا حال فقر و فاقہ کا آپ دیکھتے ہیں، اس لئے اب کچھ توسیع سے کام لیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے یہ مطالبہ سنا کہ ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو بادشاہوں اور دنیا داروں میں ہوتا ہے تو آپ کو اس سے بہت رنج ہوا کہ انہوں نے بیت نبوت کی قدر نہ پہچانی۔ ازواج مطہرات رضہ کو خیال نہ تھا کہ اس سے آپ کو ایذا پہونچے گی، عام مسلمانوں میں مالی وسعت دیکھ کر اپنی لئے بھی وسعت کا خیال دل میں آگیا تھا۔ ابو حیان نے فرمایا کہ اس واقعہ کو غزوہ احزاب کے واقعہ کے بعد بیان کرنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ازواج کا یہ مطالبہ ہی تخییر طلاق کا سبب بنا۔ بعض روایات حدیث میں حضرت زینبؓ کے گھر میں شہر پہننے کا واقعہ جو آگے سورۃ تحریم میں آگے مفصل آئے گا اس میں ازواج کی باہمی غیرت کے سبب جو صورت پیش آئی وہ اس تخییر طلاق کی سبب بنی۔ اگر یہ دونوں چیزیں تدریجی زمانے میں پیش آتی ہوں تو یہ بھی بعید نہیں کہ دونوں ہی سبب ہوں، لیکن آیت تخییر کے الفاظ سے زیادہ تائید اسی کی ہوتی ہے کہ ازواج مطہرات کی طرف سے کوئی مالی مطالبہ اس کا سبب بنا ہے۔ کیونکہ اس آیت میں فرمایا ہے **إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنَّتْهُمَا إِلَاةٌ**

اس آیت نے سب ازواج مطہرات کو اختیار دیدیا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودہ حالت یعنی معاشی عسرت و تنگی کے ساتھ آپ کی زوجیت میں رہنا قبول کریں یا پھر آپ سے طلاق کے ساتھ آزاد ہو جائیں۔ پہلی صورت میں ان کو عام عورتوں کی نسبت سے بہت زیادہ اجر عظیم اور آخرت کے خاص درجات عالیہ عطا ہوں گے، اور دوسری صورت یعنی طلاق لینے میں بھی ان کو دنیا کے لوگوں کی طرح کسی تلخی و تکلیف کی نوبت نہیں آئے گی، بلکہ سنت کے مطابق کپڑوں کا جوڑا وغیرہ دے کر عزت کے ساتھ رخصت کیا جائے گا۔

ترمذی نے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت تخییر

نازل ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اظہار و اعلان کی ابتداء مجھ سے فرمائی اور آیت سننے سے پہلے فرمایا کہ میں تم سے ایک بات کہنے والا ہوں، مگر تم اس کے جواب میں جلدی نہ کرنا، بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ یہ مجھ پر خاص عنایت تھی کہ مجھے والدین سے مشورہ کے بغیر اظہار رائے سے آپ نے منع فرمایا کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ میرے والدین مجھے کبھی یہ رائے نہ دیں گے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مفارقت اختیار کر لوں۔ میں نے جب یہ آیت سنی تو فوراً عرض کیا کہ کیا میں اس معاملے میں والدین سے مشورہ لینے جاؤں؟ میں تو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہوں۔ پھر میرے بعد سب ازواج مطہرات کو قرآن کا یہ حکم سنایا۔ سب نے وہی کہا جو میں نے اول کہا تھا کسی نے بھی دنیا کی فراخی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کے مقابلے میں قبول نہ کیا (قال الترمذی ہذا حدیث حسن صحیح)۔

### فائدہ

اختیار طلاق کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ طلاق کا اختیار عورت کے سپرد کر دیا جائے، اگر وہ چاہے تو خود اپنے نفس کو طلاق دے کر آزاد ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ طلاق شوہر ہی کے ہاتھ میں رہے کہ اگر عورت چاہے تو وہ طلاق دیدے۔ آیت مذکورہ میں بعض مفسرین نے پہلی صورت کو اور بعض نے دوسری کو اختیار کیا ہے۔ سیدی حکیم الامتہؒ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ آیت کے الفاظ میں دونوں احتمال ہیں، جب تک کسی صریح نص سے ایک کی تعیین نہ ہو جائے اپنی طرف سے کسی صورت کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب زوجین کی طبیعتوں میں منابہت نہ ہو تو مستحب یہ ہے کہ بیوی کو اختیار دیا جائے کہ شوہر کی موجودہ حالت پر قناعت کر کے ساتھ رہنا چاہے تو رہے ورنہ سنت کے مطابق طلاق دے کر کپڑے کے جوڑے دے کر عورت کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

آیت مذکورہ سے اس معاملہ کا استحباب ہی ثابت کیا جاسکتا ہے وجوب پر کوئی دلیل نہیں۔ بعض ائمہ فقہاء نے اس آیت سے وجوب پر استدلال کیا ہے، اور اسی بناء پر ایسے مفلس آدمی کی بیوی کو عدالت کی طرف سے طلاق دینے کا حق دیا کہ جو بیوی کو نفقہ دینے پر قادر نہیں۔ اس مسئلہ کی پوری تفصیل احکام القرآن حنبلہ خمس میں اسی آیت کے تحت میں بزبان عربی مذکور ہے۔

ازواج مطہرات کی ایک خصوصیت اور اس کی وجہ ان پر کڑی پابندی یُنْسَاؤُ الْمُنَیْمَاتِ



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا جَاءْنَا بِمَبَیِّنَةٍ لِّمَنْ يَضَعُ أَيْدِيَهُمْ أَوْفَىٰ عَلَىٰ سَبْعَةِ مِثَاقَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَمَنْ يَقْنُتْ مِنكُم بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَحْسَنَ صَالِحَاتِهِ نَبَاً أَجْرُهَا مَرَّتَيْنِ ۚ

ان دو آیتوں میں ازواجِ مطہرات کی یہ خصوصیت بیان فرمائی ہے کہ اگر وہ کوئی گناہ کا کام کریں گی تو ان کو دوسری عورتوں کی نسبت سے دو گنا عذاب دیا جائے گا یعنی ان کا ایک گناہ دو کے قائم مقام قرار دیا جائے گا، اسی طرح اگر وہ نیک عمل کریں گی تو دوسری عورتوں کی نسبت ان کو ثواب بھی دو ہر دیا جائے گا، ان کا ایک نیک عمل دو کے قائم مقام ہوگا۔ یہ آیت ایک حیثیت سے ازواجِ مطہرات کے لئے ان کے اس عمل کی جزا ہے جو انہوں نے آیتِ تحنیز نازل ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت پر دنیا کی فراخی کو قربان کر دیا۔ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ایک عمل کو دو کا درجہ دیدیا، اور گناہ کی صورت میں دو ہر عذاب بھی ان کی خصوصی فضیلت اور امتیازی شرافت کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ یہ بات عقلی بھی ہے اور نقلی بھی، کہ جتنا کسی کا اعزاز و احترام ہوتا ہے اتنا ہی اس کی طرف سے غفلت و سرکشی کی سزا بھی بڑھ جاتی ہے۔

ازواجِ مطہرات پر حق تعالیٰ کے انعامات بڑے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی زوجیت کے لئے انتخاب فرمایا۔ اُن کے گھروں میں وحی الہی نازل ہوتی رہی تو ان کی ادنیٰ غلطی کوتاہی بھی بڑی ہوگی۔ اگر دوسروں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچے تو اس سے کہیں زیادہ اشد ہوگا کہ ان سے کوئی بات ایذا و تکلیف کی سرزد ہو۔ قرآن کریم کے ان الفاظ میں خود اس سبب کی طرف اشارہ ہے وَادْكُرْنَ مَا يُكَلِّفُ فِي نَفْسِكُنَّ

ازواجِ مطہرات کی یہ خصوصیت کہ ان کے عمل کا دو ہر ثواب ملے عام اُمت کے اعتبار سے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُمت میں کسی فرد یا جماعت کو کسی خصوصیت

سے ایسا انعام نہ بخشا جائے کہ اس کو دو ہر ثواب ملے چنانچہ اہل کتاب میں سے جو لوگ مسلمان ہو گئے ان کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے اُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ۔

اور قیصر روم کے نام جو نامہ مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا اس میں اسی ارشاد قرآنی کی وجہ سے آپؐ نے قیصر روم کو یہ لکھا کہ يُؤْتِيكَ اللَّهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ۔ اہل کتاب جو اسلام لے آئیں اُن کے متعلق تو خود قرآن میں اجرِ مرتین کی تصریح ہے۔

اور ایک حدیث اور بھی ہے جس میں تین آدمیوں کے لئے اسی طرح دو ہر اجر مذکور ہے اس کی تفصیل سورۃ قصص میں آیت یُوْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ کے تحت میں لکھی گئی ہے۔

عالم کے عمل صالح کا ثواب امام ابو بکر حباص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ جس سبب سے حق تعالیٰ بھی دوسروں سے زیادہ ہو اور اس کے گناہ کی سزا بھی زیادہ ہو اس سبب علماء دین میں بھی موجود ہے۔ اس لئے جو عالم اپنے علم پر عامل بھی ہو اس کو بھی اس عمل کا ثواب دوسروں سے زیادہ ملے گا، اور اگر وہ کوئی گناہ کرے گا تو عذاب بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔

بِقَاحِشَةٍ مُّبَيَّنَةٍ، لفظ فاحشہ عربی زبان میں بدکاری اور زنا وغیرہ کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور مطلق معصیت اور گناہ کے لئے بھی یہ لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں فاحشہ کے لفظ سے بدکاری اور زنا مراد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب پیغمبروں کی ازواج کو اس سخت عیب سے فرمایا ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کی ازواج میں کسی سے بھی ایسا فعل صادر نہیں ہوا۔ حضرت لوط اور قوح علیہما السلام کی بیٹیاں ان کے دین سے منحرف ہوئیں اور سرکشی اختیار کی جس کی سزا ان کو ملی، لیکن بدکاری کا الزام ان میں بھی کسی پر نہیں تھا۔ ازواج مطہرات میں سے کسی عیبی و بدکاری کے صدور کا تو احتمال ہی نہ تھا۔ اس لئے اس آیت میں فاحشہ سے مراد عام گناہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا و تکلیف ہے۔ اور اس جگہ فاحشہ کے ساتھ جو لفظ مَبَيَّنَةٌ آیا ہے یہ اس پر شاہد ہے۔ کیونکہ بے حیائی اور بدکاری کہیں بھی مبیئنہ نہیں ہوتی، وہ تو پردوں میں اخفاء سے کی جاتی ہے۔ فاحشہ مبیئنہ سے مراد عام گناہ ہیں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا، ائمہ تفسیر میں سے مقاتل بن سلیمان نے اس آیت میں فاحشہ کا مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی یا آپ سے کوئی ایسا مطالبہ قرار دیا ہے جس کا پورا کرنا آپ کے لئے شاق ہو۔ (رواہ ابیہقی فی السنن)

اور قرآن کریم نے دوہرے عذاب کے سلسلہ میں تو صرف فاحشہ مبیئنہ پر یہ عذاب مرتب کیا ہے، مگر دوہرے اجر و ثواب کے لئے کئی شرطیں رکھی ہیں وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ مَشْكُورًا وَرَسُولُهُ وَتَعَمَلْ صَالِحًا، اس میں قنوت یعنی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی شرط ہے، پھر عمل صالح شرط ہے۔ سبب یہ ہے کہ اجر و ثواب تو اسی وقت ملتا ہے جب اطاعت مکمل ہو اور سزا کے لئے ایک گناہ بھی کافی ہے۔

ازواج مطہرات کو  
يُنْسَاءُ النَّبِيُّ لَسُنَّتْ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ، سابقہ آیات میں ازواج مطہرات کو



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیے مطالبات کرنے سے روکا گیا ہے جن کا پورا کرنا آپ کے لئے دشوار ہو یا جو آپ کی شان کے مناسب نہ ہوں۔ اور جب انھوں نے اس کو اختیار کر لیا تو ان کا درجہ عام عورتوں سے بڑھا دیا گیا کہ ان کے ایک عمل کو دو کے قائم مقام بنا دیا۔ آگے ان کو اصلاح عمل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و زوجیت کے مناسب بنانے کے لئے چند ہدایات دی گئی ہیں یہ سب ہدایات اگرچہ ازواجِ مطہرات کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام ہی مسلمان عورتیں ان کی مامور ہیں، مگر یہاں ازواجِ مطہرات کو خصوصی خطا کر کے اس پر متوجہ کیا ہے کہ یہ اعمال و احکام جو سب مسلمان عورتوں کے لئے لازم و واجب ہیں آپ کو ان کا اہتمام دوسروں سے زیادہ کرنا چاہئے اور تَسْتَنُّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ سے یہی خصوصیت مراد ہے۔

کیا ازواجِ مطہرات سائے عالم آیت کے ان الفاظ سے بظاہر معلوم ہوتے ہیں کہ ازواجِ مطہرات کی عورتوں سے افضل ہیں؟ تمام دنیا کی عورتوں سے افضل ہیں۔ مگر قرآن کریم کی آیت حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں یہ ہے إِنَّ اللَّهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ، اس سے حضرت مریم کا سائے جہاں کی عورتوں سے افضل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور ترمذی میں حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کافی ہیں تم کو ساری عورتوں میں سے مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد (ام المؤمنین) اور فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اور آسیہ زوجہ فرعون۔ اس حدیث میں حضرت مریم کی ساتھ اور تین عورتوں کو نساءِ عالمین سے افضل فرمایا ہے۔

اس لئے اس آیت میں جو ازواجِ مطہرات کی افضلیت اور فوقیت بیان کی گئی ہے وہ ایک خاص حیثیت یعنی ازواجِ النبیؐ اور نساءِ النبیؐ ہونے کی ہے، جس میں وہ تمام عالم کی عورتوں سے بلاشبہ افضل ہیں۔ اس عام فضیلت مطلقہ ثابت نہیں ہوتی جو دوسری نصوص کے خلاف ہو (منظہری)

تَسْتَنُّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ کے بعد اِنْ تَقِيَّتْنِ یہ شرط اس فضیلت کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو نساءِ نبیؐ ہونے کی وجہ سے بخشی ہے۔ مقصود اس سے اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ فقط اس نسبت و تعلق پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں کہ ہم ازواجِ رسولؐ ہیں، بلکہ تقویٰ اور اطاعتِ احکامِ الہیہ پر فضیلت کی شرط ہے (قرطبی و مظہری)

اس کے بعد چند ہدایات ازواجِ مطہراتؓ کو دی گئیں:

پہلی ہدایت عورتوں کے پردے سے متعلق آواز اور کلام پر پابندی ہے :-

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ، یعنی کسی غیر محرم سے پس پردہ بات کرنے کی ضرورت بھی پیش آئے تو کلام میں اس نزاکت اور لطافت کے لہجہ سے تکلف پر مہر کیا جائے جو نقطۂ عورتوں کی آواز میں ہوتی ہے۔ مطلب اس نرمی اور نزاکت سے وہ نرمی ہے جو مخاطب کے دل میں میلان پیدا کرے جیسا کہ اس کے بعد فرمایا ہر قِطْعَ الدِّثَانِ فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ، یعنی ایسی نرم گفتگو نہ کرو جس سے ایسے آدمی کو طبع اور میلان پیدا ہونے لگے جس کے دل میں مرض ہو۔ مرض سے مراد نفاق ہے یا اس کا کوئی شعبہ ہو۔ اصلی منافق سے تو ایسی طبع سرزد ہونا ظاہر ہی ہے، لیکن جو آدمی مؤمن مخلص ہونے کے باوجود کسی حرام کی طرف مائل ہوتا ہے وہ منافق نہ ہی مگر ضعیف الایمان ضرور ہے۔ اور یہ ضعیف ایمان جو حرام کی طرف مائل کرتا ہے درحقیقت ایک شعبہ نفاق ہی کا ہے۔ ایمان خالص جس میں شبہ نہ نفاق کا نہ ہو اس کے ہوتے ہوئے کوئی حرام کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔ (منظری)

خلاصہ اس پہلی ہدایت کا عورتوں کے لئے اجنبی مردوں سے اجتناب اور پردہ کا وہ اعلیٰ مقام حاصل کرنا ہے کہ جس سے کسی اجنبی ضعیف الایمان کے دل میں کوئی طبع یا میلان پیدا ہو سکے اس کے پاس بھی نہ جائیں۔ پردۂ نسواں کی مفصل بحث اسی سورۃ میں آگے آنے والی آیات کے تحت میں بیان ہوگی۔ یہاں ازواج مطہرات کے لئے خصوصی ہدایات کے ضمن میں جو کچھ آیا ہے صرف اس کی تشریح بھی جاتی ہے۔ کلام کے متعلق جو ہدایت دی گئی ہے اس کو سننے کے بعد بعض اقہات المؤمنین اس آیت کے نزول کے بعد اگر غیر مرد سے کلام کرتیں تو اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتیں تاکہ آواز بدل جائے۔ اسی لئے حضرت عمر بن عاصؓ کی ایک حدیث میں ہے اِنَّ الشَّيْءَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَهَيَّأَنْ يَكَلِّمَ النِّسَاءَ اِلَّا بِاِذْنِ اَزْوَاجِهِنَّ، (سوانح الطبرانی بسند حسن منظری)

مسئلہ : اس آیت اور حدیث مذکور سے اتنا تو ثابت ہوا کہ عورت کی آواز ستر میں داخل نہیں، لیکن اس پر بھی احتیاطی پابندی یہاں بھی لگادی اور تمام عبادات اور احکام میں اس کی رعایت کی گئی ہے کہ عورتوں کا کلام چہری نہ ہو جو مرد سنیں۔ امام کوئی غلطی کرے تو مقتدیوں کو لقمہ زبان سے دینے کا حکم ہے، مگر عورتوں کو زبان سے لقمہ دینے کے بجائے یہ تعلیم دی گئی کہ اپنے ہاتھ کی پشت پر دوسرا ہاتھ مار کر تالی بجا دیں جس سے اہم متنبہ ہو جائے زبان سے کچھ نہ کہیں۔

دوسری ہدایت : بِكُلِّ پَرْدَہ کرنے کی ہے وَقَدْ كَانَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى، یعنی بیٹھو اپنے گھروں میں اور زمانہ قدیم کی جاہلیتِ اولیٰ کی طرح نہ پھرو، یہاں جاہلیتِ اولیٰ سے مراد وہ جاہلیت ہے جو اسلام سے پہلے دنیا میں



پھیل ہوئی تھی۔ اس لفظ میں اشارہ ہے کہ اس کے بعد دوسری بھی کوئی جاہلیت آنے والی ہے جس میں اسی طرح کی بے حیائی بے پردگی پھیل جائے گی، وہ شاید اس زمانہ کی جاہلیت ہے، جس کا اب مشاہدہ ہر جگہ ہو رہا ہے۔

اس آیت میں پردہ کے متعلق اصلی حکم یہ ہے کہ عورتیں گھروں میں رہیں (یعنی بلا ضرورت شرعیہ باہر نہ نکلیں) اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ جس طرح اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت کی عورتیں علانیہ بے پردہ پھرتی تھیں ایسے نہ پھرو۔ لفظ تبرج کے اصلی معنی ظہور کے ہیں اور اس جگہ مراد اس سے اپنی زینت کا اظہار ہے غیر مردوں پر، جیسا کہ دوسری آیت میں غَيْرِ مُتَّبِعَاتٍ لِّزِينَتِكُنَّ آیا ہے۔

عورتوں کے پردہ کی پوری بحث اور مفصل احکام آگے اسی سورت میں آئیں گے یہاں صرف آیت مذکورہ کی تشریح لکھی جاتی ہے۔ اس آیت سے پردہ کے متعلق دو باتیں معلوم ہوتیں، اول یہ کہ اصل مطلوب عند اللہ عورتوں کے لئے یہ ہے کہ وہ گھروں سے باہر نہ نکلیں، ان کی تخلیق گھر لوکاموں کے لئے ہوئی ہے ان میں مشغول رہیں، اور اصل پردہ جو شرعاً مطلوب ہر وہ حجاب بالبیوت ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر بضرورت کبھی عورت کو گھر سے نکلنا ہی پڑے تو زینت کے اظہار کے ساتھ نہ نکلے، بلکہ برقع یا جلباب جس میں پورا بدن ڈھک جائے وہ پہن کر نکلے۔ جیسا کہ آگے اسی سورۃ احزاب کی آیت وَیَذْنِبْنَ عَلَیْہِنَّ مِنْ جَلَابِیْہِہُنَّ میں اس کی تفصیل آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

قراری بیوت سے مواقع | قَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ میں عورتوں پر قراری فی البیوت واجب کیا گیا۔  
ضرورت مستثنیٰ ہیں | جس کا مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کے لئے گھر سے باہر نکلنا مطلقاً ممنوع اور حرام ہو۔ مگر اڈل تو خود اسی آیت وَلَا تَبْرُجْنَ سے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ مطلقاً خروج بضرورت ممنوع نہیں بلکہ وہ خروج ممنوع ہے جس میں زینت کا اظہار ہو۔ دوسرے سورۃ احزاب کی آیت جو آگے آرہی ہے، اس میں خود یَذْنِبْنَ عَلَیْہِنَّ مِنْ جَلَابِیْہِہُنَّ کا حکم یہ بتلا رہا ہے کہ کسی درجہ میں عورتوں کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت بھی ہے بشرطیکہ برقع وغیرہ کے پردہ کے ساتھ نکلیں۔

اس کے علاوہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواضع ضرورت کا اس حکم سے مستثنیٰ ہونا ایک حدیث میں واضح فرمایا جس میں ازواج مبہرات کو خطاب کر کے فرمایا قَدْ اُذِنَ لَکُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ اِلْحَاجَتِکُنَّ رواہ مسلم، یعنی تمہارے لئے اس کی اجازت

ہو کہ اپنی ضرورت کے لئے گھر سے نکلے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل آیت حجاب نازل ہونے کے بعد اس پر شاہد ہے کہ ضرورت کے مواقع میں عورتوں کو گھر والے سے نکلنے کی اجازت ہو۔ جیسا کہ حج و عمرہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ازواج مطہرات کا جانا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ اسی طرح بہت سے غزوات میں ساتھ جانا ثابت ہے۔ اور بہت سی روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ ازواج مطہرات اپنے والدین وغیرہ ملاقات کے لئے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں اور عزیزوں کی بیمار پرسی اور تعزیت وغیرہ میں شرکت کرتی تھیں، اور عہد نبوی میں ان کو مساجد میں جانے کی بھی اجازت تھی۔

اور صرف یہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یا آپ کے زمانے ہی میں ایسا ہوا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی حضرت سودہ اور زینب بنت جحش وغیرہ کے علاوہ سب ازواج مطہرات کا حج و عمرہ کے لئے جانا ثابت ہے۔ جن پر صحابہ کرام میں سے کسی نے نکیر نہیں کیا۔ بلکہ فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں ازواج مطہرات کو خود اپنے اہتمام سے حج کے لئے بھیجا۔ اور حضرت عثمان غنیؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ کو ان کے ساتھ نگرانی و انتظام کے لئے بھیجا۔ اور ام المؤمنین حضرت سودہ اور حضرت زینب بنت جحشؓ کا بعد وفات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حج و عمرہ کے لئے نہ جانا اس آیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک حدیث کی بناء پر تھا۔ وہ یہ کہ حجۃ الوداع میں جب ازواج مطہرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ساتھ حج کرا دیا تو واپسی کے وقت فرمایا **هَذَا ثُمَّ لَكُمْ الْحَصْرُ**، ہذا کا اشارہ اس حج کی طرف ہے اور حصر حصیر کی جمع ہے، جس کے معنی پوریا کے ہیں۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ تمہارا نکلنا صرف اس کے لئے ہو چکا اس کے بعد اپنے گھروں کے پوریوں کو لازم پکڑو، ان سے نہ نکلو۔ حضرت سودہ بنت زمعہ اور زینب بنت جحشؓ نے اس حدیث کا یہ مفہوم قرار دیا کہ تمہارا خروج صرف اسی... حجۃ الوداع کے لئے جائز تھا، آگے جائز نہیں۔ باقی اور ازواج مطہرات جن میں صدیقہ عائشہؓ جیسی فقیہہ بھی داخل تھیں سب نے اس کا مفہوم یہ قرار دیا کہ جس طرح کا یہ سفر تھا کہ ایک شرعی عبارت کی ادائیگی کے لئے ہو بس اسی طرح کا خروج جائز ہے، ورنہ اپنے گھروں میں رہنا لازم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت **وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ** کے مفہوم سے باشاراتِ قرآن اور بعن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور باجماع صحابہ مواقع ضرورت مستثنیٰ ہیں، جن میں عبادا حج و عمرہ بھی داخل ہیں، اور ضروریاتِ طبعیہ والدین اور اپنے محارم کی زیارت، عیادت



وغیرہ بھی۔ اسی طرح اگر کسی کے نفقہ اور ضروریات زندگی کا کوئی اور سامان نہ ہو تو پر وہ کے ساتھ محنت مزدوری کے لئے نکلنا بھی، البتہ مواقع ضرورت میں خروج کے لئے شرط یہ ہو کہ اظہار زنیّت کے ساتھ نہ نکلیں، بلکہ برقع یا جلباب (بڑی چادر) کے ساتھ نکلیں۔

حضرت ام المؤمنین صدیقہ عائشہؓ کا سفر بصرہ اور جنگِ جمل کے واقعے پر روافض کے مفواست

اد پر یہ بات وضاحت کے ساتھ آچکی ہے کہ آیت مذکورہ میں وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوتِكُنَّ کا مفہوم خود قرآنی اشارات بلکہ تصریحات سے نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اور آپ کے بعد صحابہ کرام

کے اجماع سے یہ ثابت ہے کہ مواقع ضرورت اس سے مستثنیٰ ہیں جن میں حج و عمرہ وغیرہ دینی ضروریات شامل ہیں۔ صدیقہ عائشہؓ اور ان کے ساتھ حضرت ام سلمہ اور صفیہ رضی اللہ عنہما یہ سب حج کے لئے تشریف لے گئیں تھیں۔ وہاں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور بغاوت کے واقعات نے تو سخت غمگین ہوئیں، اور مسلمانوں کے باہمی افتراق سے نظامِ مسلمین میں خلل اور فتنہ کا اندیشہ پریشان کئے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ اور نعمان بن بشیرؓ اور کعب بن عجرہؓ اور چند دوسرے صحابہ کرام مدینہ سے بھاگ کر مکہ معظمہ پہنچے، کیونکہ قاتلانِ عثمانؓ ان کے بھی قتل کے درپے تھے۔ یہ حضرات اہل بغاوت کے ساتھ شریک نہیں تھے، بلکہ ان کو ایسے فعل سے روکتے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کے بعد وہ ان کے بھی درپے تھے، اس لئے یہ لوگ جان بچا کر مکہ معظمہ پہنچ گئے، اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور مشورہ طلب کیا۔ حضرت صدیقہؓ نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ آپ لوگ اس وقت تک مدینہ طیبہ نہ جائیں جب تک کہ باغی لوگ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کے گرد جمع ہیں، اور وہ ان قصاص لینے سے مزید فتنہ کے اندیشہ کی وجہ سے رستے کے ہوتے ہیں تو آپ لوگ کچھ روز ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں اپنے آپ کو مأمون سمجھیں، جب تک کہ امیر المؤمنینؓ انتظام پر قابو نہ پالیں اور تم لوگ جو کچھ کوشش کر سکتے ہو اس کی کر دو کہ یہ لوگ امیر المؤمنینؓ کے گرد سے متفرق ہو جائیں، اور امیر المؤمنینؓ ان سے قصاص یا انتقام لینے پر قابو پالیں۔

یہ حضرات اس پر راضی ہو گئے، اور ارادہ بصرہ چلے جانے کا کیا۔ کیونکہ اس وقت وہاں مسلمانوں کے لشکر جمع تھے۔ ان حضرات نے وہاں جانے کا قصد کر لیا تو ام المؤمنینؓ سے بھی درخواست کی کہ انتظامِ حکومت برقرار ہونے تک آپ بھی ہمارے ساتھ بصرہ میں قیام فرمائیں۔

اور اس وقت قاتلانِ عثمانؓ اور مفسدین کی قوت و شوکت اور حضرت علیؓ کا اُن کا شرعی جاری کرنے سے بے قابو ہونا خود ہیج البلاغہ کی روایت سے واضح ہے۔ یاد رہے کہ ہیج البلاغہ

کو شیعہ حضرات مستندانے ہیں۔ نبج البلاغہ میں ہے کہ حضرت امیر سے ان کے بعض اصحاب رفقاء نے خود کہا کہ اگر آپ ان لوگوں کو سزا دیدیں جنہوں نے عثمان غنیؓ پر حملہ کیا تو بہتر ہوگا۔ اس پر حضرت امیرؓ نے فرمایا کہ میرے بھائی! میں اس بات سے بے خبر نہیں جو تم کہتے ہو، مگر یہ کام کیسے ہو جبکہ مدینہ پر یہی لوگ چھائے ہوئے ہیں، اور تمھارے غلام اور آس پاس کے اعراب بھی ان کے ساتھ لگ گئے ہیں ایسی حالت میں ان کی سزا کے احکام جاری کر دوں تو نافذ کس طرح ہونگے؟

حضرت صدیقہؓ کو ایک طرف حضرت علیؓ کی مجبوری کا اندازہ تھا دوسری طرف یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت سے مسلمانوں کے قلوب زخمی ہیں، اور ان کے قاتلوں سے انتقام لینے میں تاخیر جو امیر المؤمنینؓ کی طرف سے مجبوری دیکھی جا رہی تھی اور مزید یہ کہ قاتلان عثمانؓ امیر المؤمنینؓ کی مجالس میں بھی شریک ہوتے تھے۔ جو لوگ حضرت امیر المؤمنینؓ کی مجبوری سے واقف نہ تھے، ان کو اس معاملہ میں ان سے بھی شکایت پیدا ہو رہی تھی۔ ممکن تھا کہ شکوہ و شکایت کسی دوسرے فتنے کا آغاز نہ بن جائے۔ اس لئے لوگوں کو فہمائش کر کے صبر کرنے اور امیر المؤمنینؓ کو قوت پہنچا کر نظم مملکت کو مستحکم کرنے اور باہمی شکوہ و شکایت کو رفع کر کے اصلاح بین الناس کے قصد سے بصرہ کا سفر اختیار کر لیا، جس میں ان کے محرم بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ ان کے ساتھ تھے۔ اپنے اس سفر کا مقصد خود امیر المؤمنینؓ نے حضرت قعقاعؓ کے سامنے بیان فرمایا تھا جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور ایسے شدید فتنہ کے وقت اصلاح بین المؤمنینؓ کا کام جس قدر اہم دینی خدمت تھی وہ بھی ظاہر ہے۔ اس کے لئے اگر امیر المؤمنینؓ نے بصرہ کا سفر محارم کے ساتھ اور پردہ کے آہنی ہو درج میں اختیار فرمایا تو اس کو جو شیعہ اور وفادار نے ایک طوفان بنا کر پیش کیا ہے کہ امیر المؤمنینؓ نے احکام قرآن کی خلاف ورزی کی اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

آگے منافقین اور مفسدین کی شرارت نے جو صورت جنگ باہمی کی پیدا کر دی اس کا خیال کبھی صدیقہؓ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس آیت کی تفسیر کے لئے اتنا ہی کافی ہے آگے واقعہ جنگ جمل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مگر اختصار کے ساتھ حقیقت واضح کرنے کے لئے چند سطور لکھی جاتی ہیں۔

باہمی فتنوں اور جھگڑوں کے وقت جو صورتیں دنیا میں پیش آیا کرتی ہیں ان سے کوئی اہل بصیرت و تجربہ غافل نہیں ہو سکتا۔ یہاں بھی صورت یہ پیش آئی کہ مدینہ سے آئے ہوئے صحابہ کرام کی معیت میں حضرت صدیقہؓ کے سفر بصرہ کو منافقین اور مفسدین نے



حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰؑ کے سامنے صورت بگھاڑ کر اس طرح پیش کیا کہ یہ سب اس لئے بصرہ جا رہے ہیں کہ وہاں سے لشکر ساتھ لے کر آپ کا مقابلہ کریں، اگر آپ امیر وقت ہیں تو آپ کا فرض ہو کہ اس فتنہ کو آگے بڑھنے سے پہلے وہاں جا کر روکیں۔ حضرت حسن و حسین و عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام نے اس رائے سے اختلاف بھی کیا اور مشورہ یہ دیا کہ آپ ان کے مقابلہ پر لشکر کشی اس وقت تک نہ کریں جب تک صحیح حال معلوم نہ ہو جائے، مگر کثرت دوسری طرف رائے دینے والوں کی تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی اسی طرف مائل ہو کر لشکر کے ساتھ نکل آئے، اور یہ شریراہل فتنہ و بغاوت بھی آپ کے ساتھ نکلے۔ جب یہ حضرات بصرہ کے قریب پہنچے تو حضرت قعقاع بن کواثم المؤمنینؓ کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجا۔ انھوں نے عرض کیا کہ اے ام المؤمنینؓ آپ کے یہاں تشریف لانے کا کیا سبب ہوا، تو صدیقہؓ نے فرمایا آئی بُتّیٰ اِلَیْ صَلَاحِ بَیِّنِ النَّاسِ، یعنی میرے پیارے بیٹے! میں اصلاح بین الناس کے ارادہ سے یہاں آئی ہوں۔ پھر حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کو بھی قعقاعؓ کی مجلس میں بلا لیا۔ قعقاعؓ نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ قاتلانِ عثمانؓ پر حد شرعی جاری کرنے کے سوا ہم کچھ نہیں چاہتے۔ حضرت قعقاعؓ نے سمجھایا کہ یہ کام تو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مسلمانوں کی جماعت منظم اور مستحکم نہ ہو جائے، اس لئے آپ حضرات پر لازم ہو کہ اس وقت آپ مصالحت کی صورت اختیار کر لیں۔

ان بزرگوں نے اس کو تسلیم کیا۔ حضرت قعقاعؓ نے جا کر امیر المؤمنینؓ کو اس کی اطلاع دیدی وہ بھی بہت مسرور ہوئے اور مطمئن ہو گئے، اور سب لوگوں نے واپسی کا قصد کر لیا، اور تین روز اس میدان میں قیام اس حال پر رہا کہ کسی کو اس میں شک نہیں تھا کہ اب دونوں فریقوں میں مصالحت کا اعلان ہو جائے گا، اور جو تھے دن صبح کو یہ اعلان ہونے والا تھا اور حضرت امیر المؤمنینؓ کی ملاقات حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے ساتھ ہونے والی تھی جس میں یہ قاتلانِ عثمانؓ غنی شریک نہیں تھے۔ یہ چیز ان لوگوں پر سخت گراں گذری، اور انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ تم اول حضرت عثمانؓ کی جماعت میں پہنچ کر قتل و غارتگری شروع کر دو، تاکہ وہ ادراکے ساتھ یہ سمجھیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے عہد شکنی ہوئی، اور یہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہو کر حضرت علیؑ کے لشکر پر ٹوٹ پڑیں۔ ان کی یہ شیطانی چال چل گئی، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر میں شامل ہونے والے مفسدین کی طرف سے جب حضرت صدیقہؓ کی جماعت پر حملہ ہو گیا تو

وہ سمجھنے میں معذور تھے کہ یہ حملہ امیر المؤمنینؑ کے لشکر کی طرف سے ہوا ہے، اس کی جوابی کارروائی شروع ہو گئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہ ماجرا دیکھا تو قتال کے سوا چارہ نہ رہا، اور جو حادثہ باہمی قتل و قتال کا پیش آنا تھا آگیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون! یہ واقعہ ٹھیک اسی طرح طبری اور دوسرے ثقافت مورخین نے حضرت حسن اور حضرت عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے نقل کیا ہے (روح المعانی)

غرض مفسدین و مجرمین کی شرارت اور فتنہ انگیزی کے نتیجے میں ان دونوں مقدس گروہوں میں غیر شعوری طور پر قتال کا واقعہ پیش آگیا، اور جب فتنہ فرو ہو تو دونوں ہی حضرات اس پر سخت غمگین ہوئے۔ حضرت صدیقہ عائشہؓ کو یہ واقعہ یاد آ جاتا تو اتنا روتی تھیں کہ ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰؓ کو بھی اس واقعہ پر سخت صدمہ پیش آیا۔ فتنہ فرو ہونے کے بعد مقتولین کی لاشوں کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے تو اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر یہ فرماتے تھے کہ کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر کر نیا دنیا ہو گیا ہوتا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت ام المؤمنینؓ جب قرآن میں یہ آیت پڑھیں

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ توروں نے لگتیں، یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔

(رواہ عبداللہ بن احمد فی زوائد الزہد وابن المنذر وابن شیبہ عن مسروق، روح)

آیت مذکورہ پڑھنے پر رونا اس لئے نہ تھا کہ شرار فی البیوت کی خلاف ورزی ان کے نزدیک گناہ تھی یا سفر ممنوع تھا بلکہ گھر سے نکلنے پر جو واقعہ ناگوار اور حادثہ شدیدہ پیش آگیا، اس پر طبعی رنج و غم اس کا سبب تھا۔ (یہ سب روایات اور پورا مضمون تفسیر روح المعانی سے لیا گیا ہے)۔

الادراج مطہرات کو قرآن کی  
تیسری، چوتھی اور پانچویں ہدایت

یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ دو ہدایتیں تفصیل کے ساتھ پہلے گزر چکی ہیں، یعنی غیر مردوں سے کلام میں نرمی و نزاکت سے اجتناب اور گھروں سے بلا ضرورت نہ نکلنا۔ تین ہدایتیں اس میں آگئیں۔ یہ مکمل پانچ ہدایات ہیں جو عورتوں کے لئے ہدایت دین میں سے ہیں۔

یہ پانچوں ہدایات سب  
مسلمانوں کیلئے عام ہیں

مذکورہ ہدایات میں آخری ہدایات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص ہوں، نماز، زکوٰۃ اور اللہ و رسولؐ کی اطاعت سے کوئی مسلمان مرد و عورت مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ باقی پہلی دو ہدایتیں جو عورتوں کے پردہ سے متعلق ہیں ذرا غور کرنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی



ازواجِ مطہرات کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان عورتوں کے لئے یہی حکم ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ ان ہدایات کے ذکر سے پہلے قرآن نے یہ فرمایا ہے لَسْتُمْ كَا حِدٍ مِّنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُمُوهُنَّ یعنی ازواجِ مطہرات عام عورتوں کی طرح نہیں اگر وہ تقویٰ اختیار کریں۔ اس سے بظاہر تخصیص معلوم ہوتی ہے۔ تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ تخصیص احکام کی نہیں، بلکہ ان پر عمل کے اہتمام کی ہے۔ یعنی ازواجِ مطہرات عام عورتوں کی طرح نہیں، بلکہ ان کی شانِ سب اعلیٰ و ارفع ہے، اس لئے جو احکام تمام مسلمان عورتوں پر فرض ہیں ان کا اہتمام ان کو سب زیادہ کرنا چاہئے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا، آیات سابقہ میں جو ہدایات ازواجِ مطہرات کو مخاطب کر کے دی گئی ہیں، وہ اگرچہ ان کی ذات کے ساتھ مخصوص نہ تھیں بلکہ پوری اُمت ان احکام کی مکلف ہے، مگر ازواجِ مطہرات کو خصوصی خطاب اس لئے کیا گیا کہ وہ اپنی شان اور بیتِ نبوت کے مناسبت ان اعمال کا زیادہ اہتمام کریں۔ اس آیت میں اس خصوصی خطاب کی حکمت مذکور ہے کہ اصلاحِ اعمال کی خاص ہدایت سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مطلوب یہ ہے کہ اہل بیتِ رسولؐ کو جس رگندگی سے پاک کر دے۔

لفظ رَجَسَ قرآن میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ رَجَسَ بتوں کے معنی میں آیا ہے، فَاِجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ اور کبھی لفظ رَجَسَ مطلق گناہ کے معنی میں، کبھی عذاب کے معنی میں کبھی نجاست اور رگندگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو شرعاً یا طبعاً قابلِ نفرت سمجھی جاتی ہو وہ رَجَسَ ہے۔ اس آیت میں یہی عام معنی مراد ہیں (بحر محیط)

آیت میں اہل بیت | اور پر کی آیات میں نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب تھا، اس لئے سے کیا مراد ہے؟ بصیغہ تانیث خطاب کیا گیا۔ یہاں اہل البیت میں ازواجِ مطہرات کے ساتھ ان کی اولاد و آباء بھی داخل ہیں، اس لئے بصیغہ مذکر فرمایا يَا عَشْرُكُمْ، وَلِيُطَهِّرَكُمْ اور بعض ائمہ تفسیر نے اہل بیت سے مراد صرف ازواجِ مطہرات کو قرار دیا ہے۔ حضرت عکرمہ و مقاتل نے یہی فرمایا ہے اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے آیت میں اہل بیت سے مراد ازواجِ مطہرات کو قرار دیا۔ اور استدلال میں اگلی آیت پیش فرمائی، وَإِذْ كُنَّا مَائِثًا فِي بَيْوتِكُمْ درواہ ابن ابی حاتم و ابن جریر۔ اور سابقہ آیات میں نِسَاءَ النَّبِيِّ کے الفاظ سے خطاب بھی

اس کا قرینہ ہے۔ حضرت عکرمہ تو بازار میں منادی کرتے تھے، کہ آیت میں اہل بیت سے مراد ازواج مطہرات ہیں، کیونکہ یہ آیت انہی کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اور فرماتے تھے کہ میں اس پر مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔

لیکن حدیث کی متعدد روایات جن کو ابن کثیر نے اس جگہ نقل کیا ہے اس پر شاہد ہیں کہ اہل بیت میں حضرت فاطمہؓ اور علیؓ اور حضرت حسنؓ و حسینؓ بھی شامل ہیں۔ جیسے صحیح مسلم کی حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لے گئے اور اس وقت آپ ایک سیاہ رومی چادر اوڑھے ہوئے تھے، حسن بن علیؓ آگے تو ان کو اس چادر میں لے لیا، پھر حسینؓ آگے، ان کو بھی اسی طرح چادر کے اندر داخل فرما لیا، اس کے بعد حضرت فاطمہؓ پھر علیؓ مرتضیٰؓ آگے، ان کو بھی چادر میں داخل فرما لیا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: إِنَّمَا يَرِيئُ اللَّهُ رِيئُ هِبَ عَنْكُمْ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرُكُمْ تَطْهِيرًا، اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آیت پڑھنے کے بعد فرمایا: اللَّهُمَّ هَبْ لَنَا أَهْلَ بَيْتِي (رواہ ابن جریر)

ابن کثیر نے اس مضمون کی متعدد روایات معتبرہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ درحقیقت ان دونوں اقوال میں جو ائمہ تفسیر سے منقول ہیں کوئی تضاد نہیں۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کی شان میں نازل ہوئی اور اہل بیت وہی ہیں یہ اس کے متنافی نہیں کہ دوسرے حضرات بھی اہل بیت میں شامل ہوں۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ لفظ اہل بیت میں ازواج مطہرات بھی داخل ہیں، کیونکہ شان نزول اس آیت کا وہی ہیں، اور شان نزول کا مصداق آیت میں داخل ہونا کسی شبہ کا محتمل نہیں۔ اور حضرت فاطمہؓ و علیؓ و حسنؓ و حسینؓ رضی اللہ عنہم بھی ارشاد نبوی علیہ السلام کے مطابق اہل بیت میں شامل ہیں۔ اور اس آیت سے پہلے اور بعد میں دونوں جگہ نساء النبی کے عنوان سے خطاب اور ان کے لئے صیغہ مؤنث کے استعمال فرمائے گئے ہیں۔ سابقہ آیات میں فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ سے آخر تک سب صیغہ مؤنث کے استعمال ہوتے ہیں، اور آگے پھر وَإِذْ كُنَّ نَائِيَاتٍ میں بصیغہ تانیث خطاب ہوا ہے۔ اس درمیانی آیت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر بصیغہ مذکر عَنْكُمْ اور يُطَهِّرُكُمْ فرمانا بھی اس پر شاہد قوی ہے کہ اس میں صرف ازواج ہی داخل نہیں کچھ رجال بھی ہیں۔

آیت مذکورہ میں جو یہ فرمایا ہے کہ لِيُنْزِلَ عَلَيْكُمْ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرُكُمْ تَطْهِيرًا، ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان ہدایات کے ذریعہ اغواء



شیطان اور معاصی اور قبائح سے حق تعالیٰ اہل بیت کو محفوظ رکھے گا، اور پاک کر دے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ تطہیر شرعی مراد ہے، تکوینی تطہیر جو خاصۃً انبیاء پر وہ مراد نہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ سب معصوم ہوں اور ان سے انبیاء علیہم السلام کی طرح کوئی گناہ سرزد ہونا ممکن نہ ہو، جو تکوینی تطہیر کا خاصہ ہے۔ اہل تشیع نے اس آیت میں جمہور امت سے اختلاف کر کے اول تو لفظ اہل بیت کا صرف اولاد و عصبائے رسول کے ساتھ مخصوص ہونے اور ازواج مطہرات کے ان سے خارج ہونے کا دعویٰ کیا۔ دوسرے آیت مذکورہ میں تطہیر سے مراد ان کی عصمت قرار دے کر اہل بیت کو انبیاء کی طرح معصوم کیا۔ اس کا جواب اور مسئلہ کی مفصل بحث احقر نے احکام القرآن سورۃ احزاب میں لکھی ہے، اس میں عصمت کی تعریف اور اس کا انبیاء اور ملائکہ کے ساتھ مخصوص ہونا اور ان کے علاوہ کسی کا معصوم نہ ہونا دلائل شرعیہ سے واضح کر دیا ہے، اہل علم اس کو دیکھ سکتے ہیں، عوام کو اس کی ضرورت نہیں۔

وَإِذْ كُنَّا فِي بُيُوتِكُمْ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ، آیات اللہ سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور سنت رسول ہے، جیسا کہ عامہ مفسرین نے حکمت کی تفسیر اس جگہ سنت سے کی ہے۔ اور لفظ اُذْ كُنَّا کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ان چیزوں کو خود یاد رکھنا جس کا نتیجہ اُن پر عمل کرنا ہے، دوسرے یہ کہ جو کچھ قرآن ان کے گھروں میں ان کے سامنے نازل ہوا یا جو تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیں اس کا ذکر امت کے دوسرے لوگوں سے کریں اور ان کو پہونچائیں۔

فائدہ کا :- ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی آیت قرآن یا حدیث سنے اس پر لازم ہے کہ وہ اُمت کو پہونچائے، یہاں تک کہ ازواج مطہرات پر بھی لازم کیا گیا کہ جو آیات قرآن ان کے گھروں میں نازل ہوں یا جو تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو حاصل ہوں اس کا ذکر امت کے دوسرے افراد سے کریں، اور یہ اللہ کی امانت ان کو پہونچائیں۔

قرآن کی طرح حدیث | اس آیت میں جس طرح آیات قرآن کی تبلیغ و تعلیم اُمت پر لازم کی گئی ہے اسی طرح لفظ حکمت فرما کر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ و تعلیم کو بھی لازم کیا گیا ہے۔ اسی لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس حکم کی تعمیل ہر حال میں کی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی، لیکن اس کو عام لوگوں کے سامنے اس لئے بیان نہیں کیا کہ خطرہ تھا کہ لوگ اس کو اس کے درجہ میں نہ رکھیں، اور کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں،

لیکن جب اُن کی وفات کا وقت آیا تو لوگوں کو جمع کر کے وہ حدیث سنا دی اور فرمایا کہ میں نے اس وقت تک دینی مصلحت سے اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا، مگر اب موت کا وقت قریب ہو اس لئے امت کی یہ امانت ان کو پہنچانا ضروری سمجھتا ہوں۔ صحیح بخاری میں اُن کے الفاظ یہ ہیں **فَاَخْبَرَنِي مَعَاذُ عَمِّنْ مَوْثِقَةٍ تَأْتِنَا** یعنی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث لوگوں کو وفات کے وقت اس لئے سنا دی کہ وہ گناہگار نہ ہوں کہ حدیث رسول امت کو نہیں پہنچائی۔

یہ واقعہ بھی اسی پر شاہد ہے کہ اس حکیم و سرآنی کی تعمیل سب صحابہ کرام واجب ضروری سمجھتے تھے، اور صحابہ کرام نے حدیث کو احتیاط کے ساتھ لوگوں تک پہنچانے کا اہتمام فرمایا تھا تو حدیث کی حفاظت بھی ایک درجہ میں قرآن کی حفاظت کے قریب ہو گئی، اس معاملہ میں شبہات نکالنا درحقیقت قرآن میں شبہات نکالنا ہے۔ واللہ اعلم

**اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَ**

تحقیق مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں اور

**الْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ**

بندگی کرنیوالے مرد اور بندگی کرنیوالی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت جھیلنے والے مرد

**وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ**

اور محنت جھیلنے والی عورتیں اور بے رنج و دل مرد اور بے رنج و دل عورتیں اور خیرات کرنیوالے مرد اور خیرات کرنیوالی عورتیں

**وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ**

اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور حفاظت کرنیوالے مرد اپنی شہوت کی جگہ کو اور حفاظت کرنیوالی عورتیں

**وَالَّذِيْنَ كَرِهَ اللّٰهُ كَثِيْرًا وَّ الَّذِيْنَ كَرِهَ اللّٰهُ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ**

اور یاد کرنے والے مرد اللہ کو بہت سا اور یاد کرنیوالی عورتیں رکھی ہے اللہ نے ان کے واسطے

**مَغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۳۵**

معافی اور ثواب بڑا۔

## خلاصہ تفسیر

بیشک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور



ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں (مسلمین و مسلمات کی اس تفسیر پر اسلام سے مراد اعمال نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ ہوئے اور مؤمنین و مؤمنات میں ایمان سے مراد عقائد ہوئے) جیسا صحیح بخاری و مسلم میں حضرت جبریل علیہ السلام کے پوچھنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام و ایمان کے متعلق بھی یہی جواب دینا منقول ہے) اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں (اس راست بازی میں صادق القول ہونا بھی داخل ہے صادق العمل ہونا بھی) اور ایمان اور نیت میں صادق ہونا بھی یعنی ان کے کلام میں کوئی جھوٹ ہو نہ عمل میں کم ہمتی اور سستی اور نہ ریاکاری یا نفاق) اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں (اس میں صبر کی سبب قسمیں آگئیں، یعنی طاعات و عبادات پر ثابت قدم رہنا اور معاصی سے اپنے نفس کو روکنا اور مصائب پر صبر کرنا) اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں (لفظ خشوع میں نماز و عبادت کا خشوع بھی داخل ہے کہ قلب سے بھی عبادت کی طرف متوجہ ہو اور اپنے اعضاء و جوارح کو بھی اس کے مناسب رکھے اور اس میں عام تواضع بھی داخل ہے جو تکبر کے بالمقابل ہے۔ یعنی یہ لوگ تکبر اور اپنی بڑائی سے بھی پاک ہیں) اور نماز وغیرہ عبادات میں بھی خشوع و خضوع ان کا وظیفہ ہے) اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں (اس میں زکوٰۃ اور صدقات نافلہ سب داخل ہیں) اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت خدا کی یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں (یعنی جواز کار فرض کے علاوہ نفلی اذکار کو بھی ادا کرتے ہیں) ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

## معارف و مسائل

قرآن کے عام خطابات مردوں کو ہیں عورتیں ضمناً شامل ہیں، مگر عموماً خطاب مردوں کو کیا گیا ہے، عورتیں اس میں ضمناً شامل ہیں۔ ہر جگہ یا ایہا الذین آمنوا کے الفاظ استعمال

فرما کر عورتوں کو ان کے ضمن میں مخاطب کیا گیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ عورتوں کے سب معاملات تستر اور پردہ پوشی پر مبنی ہیں، اس میں ان کا اکرام و اعزاز ہے۔ خصوصاً پورے قرآن میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت مریم بنت عمران کے سوا کسی عورت کا نام قرآن میں نہیں لیا گیا، بلکہ ذکر آیا تو مردوں کی نسبت کے ساتھ، امراۃ فرعون، امراۃ نوح، امراۃ لوط کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت مریم کی خصوصیت شاید یہ ہو کہ حضرت

علی علیہ السلام کی نسبت کسی باپ کی طرف نہ ہو سکتی تھی، اس لئے ماں کی طرف نسبت کرنا تھا اس نسبت کے لئے ان کا نام ظاہر کیا گیا۔ واللہ اعلم

قرآن کریم کا یہ اسلوب اگرچہ خود ایک بڑی حکمت و مصلحت پر مبنی تھا، مگر عورتوں کو اس کا خیال گزرنا ایک امر طبعی تھا۔ اسی لئے کتب حدیث میں ایسی متعدد روایات ہیں جن میں عورتوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ مردوں ہی کا ذکر قرآن میں فرماتے ہیں، انہی کو مخاطب فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہم عورتوں میں کوئی خیر ہی نہیں، ہمیں ڈر ہے کہ ہماری عبادت بھی قبول نہ ہو اور وہ البغوی عن الازواج الطہرات اور ترمذی میں بسند حسن حضرت ام عمارہ انصاریہ سے اور بعض روایات میں حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے اسی طرح کی عرضداشت پیش کرنا منقول ہے، اور ان سب روایات میں آیات مذکورہ کا سبب نزول اسی عرضداشت کو قرار دیا ہے۔

آیات مذکورہ میں عورتوں کی دل جوئی اور ان کے اعمال کی مقبولیت کا خصوصی ذکر فرمایا گیا ہے، جس میں یہ جملہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت اور فضیلت کا مدار اعمال صالحہ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اس میں مرد و عورت میں کوئی امتیاز نہیں۔

ذکر اللہ کی کثرت کا حکم | اسلام کے ارکان پانچ عبادتیں ہیں۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد اور اس کی حکمت لیکن پورے قرآن میں ان میں سے کسی عبادت کو کثرت کے ساتھ کرنے کا حکم نہیں۔ مگر ذکر اللہ کے متعلق فترآن کریم کی متعدد آیات میں بکثرت کرنے کا ارشاد ہے۔

سورۃ انفال، سورۃ جمعہ میں اور اس سورت میں وَالَّذَاکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَالَّذَاکِرَاتِ فرمایا۔ اس کی حکمت غالباً یہ ہے کہ اول تو ذکر اللہ سب عبادات کی اصل روح ہے، جیسا کہ حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا ہے کہ کسی شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مجاہدین میں سب سے زیادہ اجر و ثواب کس کا ہے؟ تو آپ نے فرمایا جو سب زیادہ اللہ کا ذکر کرے۔ پھر پوچھا کہ روزہ داروں میں کس کا ثواب سب سے زیادہ ہے؟ فرمایا جو سب زیادہ اللہ کا ذکر کرے۔ پھر اسی طرح نماز، زکوٰۃ اور حج و صدقہ کے متعلق سوالات کئے، ہر مرتبہ آپ نے یہی فرمایا کہ جو اللہ کا ذکر زیادہ کرے، وہی زیادہ مستحق اجر ہے۔ رواہ احمد (ابن کثیر)

دوسرے وہ سب عبادات میں سب سے زیادہ سہل ہے۔ شریعت نے بھی اس کے لئے کوئی شرط نہیں رکھی، وضو، بے وضو، لیٹے، بیٹھے، چلتے پھرتے، ہر وقت میں ذکر اللہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ نہ انسان سے کوئی محنت لیتا ہے، نہ کسی فرصت کو مقتضی ہے۔



اور اثر و فائدہ اس کا اتنا عظیم ہے کہ ذکر اللہ کے ذریعہ دنیا کے کام بھی دین اور عبادت بن جاتے ہیں۔ کھانے سے پہلے اور بعد کی دعا، گھر سے نکلنے اور واپس آنے کی دعائیں، سفر میں جانے اور دوران سفر اور وطن کی واپسی کی دعائیں، کوئی کاروبار کرنے سے پہلے اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم فرمودہ دعاؤں کا حاصل ہی یہ ہے کہ مسلمان کسی وقت اللہ سے غافل ہو کر کوئی کام نہ کرے، اور اس نے یہ ماثور دعائیں اپنے کاموں میں پڑھ لیں تو وہ دنیا کے کام بھی دین بن جاتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا

اور کام نہیں کسی ایمان دار مرد کا اور نہ ایمان دار عورت کا جبکہ مقررہ کر دے اللہ اور اس کا رسول

أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

کوئی کام کہ ان کو رہی اختیار اپنے کام کا، اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی اور

رَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا ۝۳۶ ۱۴۵ وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ

اس کے رسول کی سو وہ راہ بھولا صریح چھوڑ کر۔ اور جب تو کہنے لگا اس شخص کو جس پر اللہ

اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ

نے احسان کیا اور تو نے احسان کیا رہنے دے اپنے پاس اپنی جو روکو اور ڈر اللہ سے

اللَّهُ وَتَخَفِ فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ

اور تو چھپاتا تھا اپنے دل میں ایک چیز جو اللہ کھولا چاہتا ہو، اور ڈرتا تھا لوگوں سے

وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاهَا

اور اللہ سے زیادہ چاہئے ڈرنا تجھ کو پھر جب زید تمام کر چکا اس عورت سے اپنی غرض ہم نے اس کو

لَكَ لَا يَكُونُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ

تیرے نکاح میں دیدیا تانہ رہو مسلمانوں پر گناہ نکاح کر لینا جو ردی اپنے لے پا لکوں کی

إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ۝۳۷ ۱۴۶ مَا كَانَ

جب وہ تمام کر لیں ان سے اپنی غرض، اور ہے اللہ کا حکم بجالانا۔ - - -

عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ سُنَّةَ اللَّهِ فِي

کچھ مضائقہ نہیں اس بات میں جو مقرر کر دی اللہ نے اس کے واسطے جیسے دستور رہا ہر اللہ کا

الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَقْدُورًا ۝ (۳۸)

ان لوگوں میں جو گزرے پہلے اور ہر حکم اللہ کا مقرر ٹھہر چکا

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ

وہ لوگ جو پہنچاتے ہیں پیغام اللہ کے اور ڈرتے ہیں اس سے اور نہیں ڈرتے

أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ ط وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝ (۳۹)

کسی سے سوائے اللہ کے اور بس ہوا اللہ کفایت کرنے والا

## خلاصہ تفسیر

اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا رگو وہ دنیا ہی کی بات کیوں نہ ہو وجوہاً حکم دیدیں کہ (پھر) اُن (مؤمنین) کو ان کے اُس کام میں کوئی اختیار (باقی) رہے (یعنی اس اختیار کی گنجائش نہیں رہتی کہ خواہ کریں یا نہ کریں بلکہ عمل ہی کرنا واجب ہو جاتا ہے) اور جو شخص (بعد حکم وجوبی کے) اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا اور (اس وقت کو یاد کیجئے) جب آپ رہنمائی و مشورہ کے طور سے (اس شخص سے فرما رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا کہ اسلام کی توفیق دی جو انعام دینی ہے، اور غلامی سے چھڑایا کہ نعمت دنیویہ ہے) اور آپ نے بھی انعام کیا رعایم دین فرمائی، اور آزاد کیا، اور بچھو بھی زاد بہن سے نکاح کرایا مراد حضرت زیدؓ ہیں کہ آپ ان کو سمجھا رہے تھے کہ اپنی بی بی زینبؓ کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اس کی معمولی خطاؤں پر نظر نہ کر کہ گناہ ہے اس سے ناموافق ہو جاتی ہے اور خدا سے ڈر (اور اس کے حقوق میں بھی کوتاہی نہ کر کہ کبھی اس سے ناموافق ہو جائے) ہو جاتی ہے) اور (جب شکایتیں حد سے متجاوز ہو گئیں اور قرآن سے اصلاح و توفیق کی امید نہ رہی تو اس وقت رہنمائی کے ساتھ) آپ اپنے دل میں وہ بات بھی (چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ (آخر میں) ظاہر کرنے والا تھا) مراد اس سے آپ کا نکاح ہر حضرت زینبؓ سے جبکہ زیدؓ ان کو طلاق دیدیں جس کو حق تعالیٰ نے ردّ جُنَہُنَّ میں قولاً اور



خود نکاح کر دینے سے فعلاً ظاہر فرمایا) اور اس مشروط اور معلق ارادہ کے ساتھ ہی (آپ لوگوں کے طعن سے (بھی) اندیشہ کرتے تھے کیونکہ اس وقت اس نکاح میں کسی اہم مصلحت دینیہ کا ہونا ذہن مبارک میں نہ آیا ہوگا، محض دنیوی مصلحت خاص حضرت زینبؓ کی، خیال میں ہوگی اور امور دنیویہ میں ایسا اندیشہ ہونا مضائقہ نہیں، بلکہ بعض حیثیتوں سے مطلوب ہی، جبکہ اعتراض سے دوسروں کی دین کی خرابی کا احتمال ہو اور ان کو اس سے بچانا مقصود ہو) اور ڈرنا تو آپ کو خدا ہی سے زیادہ سزاوار ہے (یعنی چونکہ واقع میں اس میں دینی مصلحت ہے، جیسا کہ آگے بھی لایکون الخ میں مذکور ہے، اس لئے خلق سے اندیشہ نہ کیجئے، چنانچہ بعد اطلاق مصلحت دینیہ کے پھر اندیشہ آپ نے نہیں کیا اور ارادہ نکاح میں تو کیا اندیشہ ہوتا خود نکاح کے بعد بھی اندیشہ نہیں کیا، جس کا قصہ آگے ہے کہ) پھر جب زینبؓ کا اُس (زینبؓ) سے جی بھر گیا، (یعنی طلاق دیدی اور عدت بھی گزر گئی تو) ہم نے آپ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیبیوں کے (نکاح کے) بارے میں کچھ تنگی نہ رہے جب وہ (منہ بولے بیٹے) ان سے اپنا جی بھر چکیں (یعنی طلاق دیدیں، مطلب یہ کہ اس تشریح کا اظہار مقصود تھا) اور خدا کا یہ حکم تو ہونے والا تھا ہی (کیونکہ حکمت اس کو مقتضی تھی۔ آگے طعن کا جواب کہ) ان پیغمبر کے لئے خدا تعالیٰ نے جو بات (تکویناً یا تشریعاً) مقرر کر دی تھی اس میں نبی پر کوئی الزام (اور طعن کی بات) نہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن پیغمبروں کے حق میں (جی) یہی معمول کر رکھا ہے جو پہلے ہو گزرے ہیں کہ ان کو جس امر کی اجازت ہوتی ہے بے تکلف وہ اس کو کرتے رہے ہیں اور محل طعن نہیں بنے، ایسے ہی یہ نبی بھی محل اعتراض نہیں، اور اُن پیغمبروں کے بھی اس قسم کے جتنے کام ہوتے ہیں ان سب کے بارے میں بھی، اللہ کا حکم تجویز کیا ہوا (پہلے سے) ہوتا ہے (اور اسی کے موافق پھر اُن کو حکم ہوتا ہے اور وہ عمل کرتے ہیں۔ شاید آپ کے قصہ میں اس مضمون کو لانا اور پھر انبیاء کے تذکرہ میں اس کو مکرر لانا اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے امور مثل تمام امور تکوینیہ کے ایسے متضمن حکمت ہوتے ہیں کہ پہلے ہی سے علم الہی میں تجویز ہو چکے ہیں، پھر نبی پر طعن کرنا اللہ پر طعن کرنا ہے۔ بخلاف اُن امور کے جن پر خود حق تعالیٰ ملامت فرمادیں گو وہ مقدر ہونے کی وجہ سے متضمن حکمت ہوں مگر محل ملامت ہونا دلیل ہے، اس کے تضمن مفاسد کی۔ اس لئے ان مفاسد کے اعتبار سے اُن پر نکیر جائز ہے۔ آگے ایک مدح خاص ہے اُن پیغمبروں کی تاکہ آپ کو تسلی ہو یعنی)

یہ سب رسیخیران گذشتہ، ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچایا کرتے تھے (اگر تبلیغ قوی کے مامور ہوئے تو قولاً اور اگر تبلیغ فعلی کے مامور ہوئے تو فعلاً) اور (اس باب میں) اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے (پس آپ کو بھی جب تک معلوم نہ تھا کہ یہ نکاح تبلیغ فعلی ہے اندیشہ ہونا مضائقہ نہیں، لیکن آپ کو جب یہ بات معلوم ہو گئی تو آپ بھی اندیشہ نہ کیجئے جیسا کہ مقتضایہ ہے شان رسالت کا۔ چنانچہ اس کے انکشاف کے بعد پھر آپ نے اندیشہ نہیں کیا، اور باوجودیکہ خود آپ کو تبلیغ رسالت میں کسی سے خوف نہیں ہوا، نہ اس کا احتمال تھا پھر بھی انبیاء کا قصہ سنانا زیادہ تقویت قلب کے لئے ہے) اور (آپ کی زیادہ تسلی کے لئے فرماتے ہیں) اللہ اعمال کا حساب لینے کے لئے کافی ہے (پھر کسی سے کاہے کا ڈر ہے نیز آپ پر طعن کرنے والوں کو بھی سزا دے گا آپ طعن سے معصوم نہ ہو جئے)۔

## معارف و مسائل

یہ بات پہلے کئی مرتبہ معلوم ہو چکی ہے کہ سورہ احزاب میں زیادہ تر وہ احکام ہیں جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و محبت اور مکمل اطاعت سے یا آپ کو کسی قسم کی ایذا و تکلیف پہنچانے کی ممانعت سے ہے۔ آیات مذکورہ الصدر بھی اسی سلسلے کے چند واقعات سے متعلق نازل ہوئی ہیں۔

ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت زید بن حارثہ رضی کسی شخص کے غلام تھے۔ زمانہ جاہلیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بازار عکاظ سے خرید لیا تھا، ابھی عمر بھی کم تھی۔ آپ نے خریدنے کے بعد ان کو آزاد کر کے یہ شرف بخشا کہ عرب کے عمامہ رواج کے مطابق ان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا اور ان کی پرورش فرمائی۔ مکہ مکرمہ میں ان کو زید بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے اس کو جاہلیت کی رسم غلط قرار دے کر اس کی ممانعت کر دی کہ منہ بولے بیٹے کو اس شخص کا بیٹا کہہ کر پکارا جائے، اور حکم دیا کہ اس کو اس کے اصلی باپ کی طرف منسوب کیا جائے۔ اسی سلسلے میں وہ آیات نازل ہوئیں جو اسی سورہ میں پہلے آچکی ہیں اذِ عَوْھِمْ لَا یَا عَجِیْمَ الْآیۃ ان احکام کے نازل ہونے کے بعد صحابہ کرام نے ان کو زید بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہنا چھوڑ دیا اور ان کے والد حارثہ کی طرف منسوب کرنے لگے۔ ایک لطیفہ پورے قرآن میں انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی بڑے سے بڑے



صحابی کا بھی نام ذکر نہیں کیا گیا۔ بحر: حضرت زید بن حارثہؓ کے۔ اس کی حکمت بعض حضرات نے یہی بیان کی ہے کہ ان کی نسبت ولایت کو بحکمِ شرآنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطع کیا گیا تو ان کے لئے ایک بہت بڑے اعزاز سے محرومی ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے اس کا بدل اس طرح کر دیا کہ شرآن میں ان کا نام لے کر ذکر فرما دیا۔ اور لفظ زیدؓ قرآن کا ایک لفظ ہونے کی حیثیت سے اس کے ہر لفظ پر حسب وعدہ حدیث دس نیکیاں نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں ان کا نام جب قرآن میں پڑھا جائے تو صرف ان کا نام لینے پر تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کا اکرام فرماتے تھے۔ حضرت صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے جب کبھی کسی لشکر میں ان کو بھیجا ہے تو امیر لشکر انہی کو بنایا ہے (ابن کثیرؒ) **تنبیہ:** یہ تھی اسلام میں غلامی کی حقیقت کہ ان کو تعلیم و تربیت دے کر جو صاحب صلاحیت ثابت ہوا اس کو مقتداؤں کا درجہ دیا۔

زید بن حارثہؓ جو ان ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نکاح کے لئے اپنی پھوپھی کی لڑکی حضرت زینب بنت جحشؓ کا انتخاب فرما کر پیغامِ نکاح دیا۔ حضرت زیدؓ پر چونکہ یہ عرفی عیب لگا ہوا تھا کہ آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحشؓ نے اس رشتہ سے انکار کر دیا کہ ہم باعتبار خاندان و نسب کے ان سے اشرف ہیں۔

اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی مَا كَانَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَلَا الْمُؤْمِنَاتِ الْاٰیَةُ، جس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو کسی کام کا حکم بطور وجوب دیدیں تو اس پر وہ کام کرنا واجب ہو جاتا ہے، اس کو نہ کرنے کا اختیار شرعاً نہیں رہتا اگرچہ فی نفسہ وہ کام شرعاً واجب و ضروری نہ ہو، مگر جس کو آپؐ نے حکم دیدیا اس کے ذمہ لازم و واجب ہو جاتا ہے اور جو ایسا نہ کرے آخر آیت میں اس کو کھلی مگر ایسی فرمایا ہے۔ اس آیت کو حضرت زینبؓ بنت جحشؓ اور ان کے بھائی نے سنا تو اپنے انکار سے باز آ گئے، اور نکاح پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ یہ نکاح کر دیا گیا۔ ان کا ہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے ادا کیا۔ جو دس دینار سُرخ (جو پونے چار تولہ سونا ہوتا ہے) اور ساٹھ درہم (جس کی پونے سولہ تولہ چاندی ہوتی ہے) اور ایک بار برداری کا جانور اور پورا زنانہ جوڑا اور پچاس مُدِ اٹا، (یعنی تقریباً تینتالیس سیر) اور دس مُدِ (ساڑھے آٹھ سیر) ماشہ (جو تھا (ابن کثیرؒ) اس آیت کے نزول کا مشہور واقعہ جمہور مفسرین کے نزدیک یہی حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ بنت جحشؓ کے نکاح کا قصہ ہے (ابن کثیرؒ، قرطبیؒ، مظہریؒ)

ابن کثیر وغیرہ مفسرین نے اسی طرح کے دو واقعے اور بھی نقل کئے ہیں۔ ان میں بھی یہ مذکور ہے کہ آیت مذکورہ ان واقعات کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک واقعہ حضرت جلیبیتؓ کا واقعہ ہے کہ ان کا رشتہ ایک انصاری صحابی کی لڑکی سے کرنا چاہا تو اس انصاری اور ان کے گھر والوں نے اس رشتہ اور نکاح سے انکار کر دیا، جب یہ آیت نازل ہوئی تو سب راضی ہو گئے اور نکاح کر دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے وسعت رزق کی دعا فرمائی۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ اللہ نے ان کے گھر میں ایسی برکت دی تھی کہ مدینہ طیبہ کے گھروں میں سب سے زیادہ اُجلا اور بڑا خرچ اس گھر کا تھا، بعد میں حضرت جلیبیتؓ ایک جہاد میں شہید ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجہیز و تکفین اپنے دست مبارک سے فرمائی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ روایات حدیث میں اُمّ کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط کا منقول ہے (ابن کثیر، قرطبی) اور ان میں کوئی تضاد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے متعدد واقعات ہی نزول آیت کا سبب بنے ہوں۔

نکاح میں نسبی کفو کی رعایت کا حکم اور درجہ

نکاح مذکور میں حضرت زینب بنت جحشؓ اور ان کے بھائی عبد اللہؓ تے جو زید بن حارثہؓ سے نکاح کو ابتداء میں نامنظور کیا تھا، اس کی وجہ ان دونوں میں خاندانی اور نسبی کفارت و مماثلت کا نہ ہونا تھا۔ اور یہ وجہ شرعاً خود مطلوب ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لڑکیوں کا نکاح ان کے کفو میں کرنا چاہئے (جس کی تحقیق آگے آئے گی) اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی کا عذر کیوں مقبول نہ ہوا۔ جواب یہ ہے کہ دینی اعتبار سے کفارت و مماثلت زوجین کی تو لازم و ضروری ہے، کسی مسلمان لڑکی کا نکاح کسی کافر سے یا جماع امت حلال نہیں، اگرچہ لڑکی اس پر راضی ہو۔ کیونکہ یہ صرف عورت کا حق نہیں جو اس کی رضا مندی سے ساقط ہو جائے بلکہ حق اللہ اور فریضۃ الہیہ ہے بخلاف نسبی اور مالی کفارت کے کہ وہ لڑکی کا حق ہے اور خاندانی کفارت کے حق میں لڑکی کے ساتھ اس کے اولیاء بھی شریک ہیں۔ اگر عاقلہ بالغہ لڑکی مالدار خاندان سے ہونے کے باوجود کسی غریب فقیر سے نکاح پر راضی ہو کر اپنا حق ساقط کر دے تو اس کو اختیار ہے اور خاندانی کفارت میں لڑکی اور اس کے اولیاء سب اس حق کو کسی دوسری اہم مصلحت کی خاطر چھوڑ کر کسی ایسے شخص سے نکاح پر راضی ہو جائیں جو نسب اور خاندان کے اعتبار سے ان سے کم درجہ ہے تو ان کو اس کا



حق ہے۔ بلکہ مصالح دینیہ کے پیش نظر اس حق کو چھوڑ دینا محمود و مطلوب ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع میں اس حق کو نظر انداز کرنے اور مصالح دینیہ کی وجہ سے نکاح کر دینے کا مشورہ دیا۔

اور قرآن کریم کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق اپنی امت کے مرد و زن پر سب سے زیادہ ہے، بلکہ اپنے نفس سے بھی زیادہ ہے جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے: **الْمَنْبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ** یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حق مؤمنین پر ان کے اپنے نفس سے بھی زیادہ ہے، اس لئے حضرت زینبؓ اور عبداللہؓ کے معاملہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی کفارت کے حق کو نظر انداز کر کے زید بن حارثہ سے نکاح منظور کر لینے کا حکم دیدیا تو ان کا فرض تھا کہ اس حکم کے سامنے اپنی رائے اور اپنے نفس کے حقوق کو ترک کر دیتے، اس لئے ان کے انکاح پر قرآن کریم کا یہ حکم نازل ہوا۔

رہا یہ معاملہ کہ جب نبی کفارت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قابل رعایت ہو تو خود آپؐ نے اس کی رعایت کیوں نہ فرمائی؟ تو اس کا جواب بھی مذکورہ تقریر سے واضح ہو گیا کہ یہ رعایت دوسری دینی مصالح کے بالمقابل قابل ترک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں متعدد نکاح اسی طرح غیر کفو، میں اسی قسم کی دینی مصالح کی بناء پر کئے گئے، اس اصل مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

**مسئلہ کفارت** | نکاح ایک ایسا معاملہ ہے جس میں اگر زوجین کی طبائع میں موافقت نہ ہو تو مقاصد نکاح میں خلل آتا ہے، ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے میں خلل آتا ہے، باہمی جھگڑے نزاع پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے شریعت میں کفارت یعنی باہمی مماثلت کی رعایت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی اعلیٰ خاندان کا آدمی اپنے سے کم خاندان والے آدمی کو رذیل یا ذلیل سمجھے۔ ذلت و عورت کا اصل مدار اسلام میں تقویٰ اور دینداری ہے، جس میں یہ چیز نہیں اس کو خاندانی شرافت کتنی بھی حاصل ہو اللہ کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں، صرف انتظامی معاملات کو استوار رکھنے کیلئے نکاح میں کفارت کی رعایت کا حکم دیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لڑکیوں کا نکاح ان کے اولیاء ہی کے ذریعہ ہوتا چاہئے (یعنی بالغ لڑکی کو بھی یہ مناسب نہیں کہ اپنے نکاح کا معاملہ خود طے کرے، حیاء کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام اس کے والدین اور اولیاء

کریں) اور فرمایا کہ لڑکیوں کا نکاح ان کے کفو ہی میں کرنا چاہئے۔ اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے، مگر صحابہ کرام کے آثار و اقوال سے اس کی تائید ہو کر حدیث قابل استدلال ہو جاتی ہے۔ امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں حضرت فاروق اعظمؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں یہ حکم جاری کر دے گا کہ کسی بڑے اونچے معروف خاندان کی لڑکی کا نکاح دوسرے کم درجہ والے سے نہ کیا جائے، اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت انسؓ نے بھی اس کی تاکید فرمائی کہ نکاح میں کفارت کی رعایت کی جائے، جو متعدد اسانید سے منقول ہے۔ امام ابن ہمام نے بھی فتح القدیر میں اس کی تفصیل لکھی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نکاح میں کفارت و مماثلت کی رعایت کرنا دین میں مطلوب ہے تاکہ زوجین میں موافقت رہے، لیکن کوئی دوسری اہم مصلحت اس کفارت سے بڑھ کر سامنے آجائے تو عورت اور اس کے اولیاء کو اپنا یہ حق چھوڑ کر غیر کفو میں نکاح کر لینا بھی جائز ہے۔ خصوصاً جب کہ کوئی دینی مصلحت پیش نظر ہو تو ایسا کرنا افضل و بہتر ہے جیسا کہ صحابہ کرام کے متعدد واقعات سے ثابت ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان واقعات سے اصل مسئلہ کفارت کی نفی نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم

**دوسرا واقعہ** حضرت زینب بنت جحشؓ کا نکاح باہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو گیا، مگر دونوں کی طبیعتوں میں موافقت نہ ہوئی۔ حضرت زیدؓ ان کی تیز زبانی اور لہجہ شرافت کی بناء پر اپنے کو اونچا سمجھنے اور اطاعت میں کوتاہی کرنے کی شکایت کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ بتلادیا گیا تھا کہ زیدؓ ان کو طلاق دیں گے، اس کے بعد زینبؓ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔ ایک روز حضرت زیدؓ نے انہی شکایات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ ان کو طلاق دیدیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ منجانب اللہ یہ علم ہو گیا تھا کہ واقعی وہ یہی پیش آنے والا ہے، کہ زیدؓ ان کو طلاق دیدیں گے، پھر یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں گی، لیکن وہ وجہ سے آپ نے حضرت زیدؓ کو طلاق دینے سے روکا۔ ادلی یہ کہ طلاق دینا اگرچہ شریعت اسلام میں جائز ہے مگر پسندیدہ نہیں بلکہ ابغض المباحات یعنی جائز چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض و مکروہ ہے، اور تنکوینی طور پر کسی کام کا وقوع تشریعی حکم کو متاثر نہیں کرتا دوسرے قلب مبارک میں یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ اگر انھوں نے طلاق دیدی اور پھر زینبؓ کا نکاح آپ سے ہوا تو عرب اپنے دستور جاہلیت کے مطابق یہ طعن دیں گے کہ اپنے



بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اگرچہ قرآن نے اس دستور جاہلیت کو سورۃ احزاب کی ہی سابقہ آیات میں ختم کر دیا ہے۔ اس کے بعد کسی مومن کے لئے تو اس کے دسوسہ کا بھی خطرہ نہ تھا مگر کفار جو قرآن ہی کو نہیں مانتے وہ اپنی جاہلانہ رسم یعنی منہ بولے بیٹے کو تمام احکام میں حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کی بنا پر زبان طعن دراز کریں گے۔ یہ اندیشہ بھی حضرت زیدؓ کو طلاق دینے سے منع کرنے کا سبب بنا۔ اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے محبوبانہ عتاب قرآن کی ان آیات میں نازل ہوا: **وَاِذَا تَقُولُ لِلَّذِي اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاَتَى اللّٰهُ وَتَخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبِیْنٌ بِكَ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَخْوَنٌ اَنْ تَخْشَاهُ**، یعنی آپ اُس وقت کو یاد کریں جبکہ آپ کہہ رہے تھے اس شخص کو جس پر اللہ نے انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا، مراد اس شخص سے حضرت زیدؓ ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ نے پہلا انعام تو یہ فرمایا کہ ان کو مشرف باسلام کر دیا دوسرے آپؐ کی صحبت کا مشرف عطا فرمایا۔ اور آپؐ نے ان پر ایک انعام تو یہ کیا کہ ان کو غلامی سے آزاد کر دیا، دوسرا یہ کہ ان کی تربیت فرما کر ایسا بنا دیا کہ بڑے بڑے صحابہ بھی ان کی تعظیم کرتے تھے۔ آگے وہ قول نقل کیا جو آپؐ نے زیدؓ سے فرمایا **اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاَتَى اللّٰهُ**، یعنی اپنی بی بی کو آپؐ اپنے نکاح میں روکیں، طلاق نہ دیں، اور خدا سے ڈریں۔ خدا سے ڈرنے کا حکم اس جگہ اس معنی میں بھی ہو سکتا ہے کہ طلاق ایک مبغوض و مکروہ فعل ہے اس سے اجتناب کریں، اور اس معنی سے بھی ہو سکتا ہے کہ نکاح میں روکنے کے بعد طبعی منافرت کی وجہ سے ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔ آپؐ کا یہ فرمانا اپنی جگہ صحیح و درست تھا، مگر منجانب اللہ ہونے والے واقعہ کا علم ہو جانے اور دل میں حضرت زینبؓ سے نکاح کا ارادہ پیدا ہو جانے کے بعد زیدؓ کو طلاق نہ دینے کی نصیحت ایک طرح کی رسمی اظہارِ خیر خواہی کے درجہ میں تھی، جو شانِ رسالت کے مناسب نہ تھی، خصوصاً اس لئے کہ اس کے ساتھ لوگوں کے طعنوں کا اندیشہ بھی شامل تھا اس لئے آیت مذکورہ میں عتاب ان الفاظ میں نازل ہوا کہ آپؐ دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا۔ جب منجانب اللہ حضرت زینبؓ کے ساتھ آپؐ کے نکاح کی خبر مل چکی، اور آپؐ کے دل میں ارادہ نکاح پیدا ہو چکا تو اس ارادہ کو چھپا کر ایسی رسمی گفتگو جو آپؐ کی شان کے مناسب نہیں تھی کی۔ اور لوگوں کے طعنوں کے اندیشہ پر فرمایا کہ آپؐ لوگوں سے ڈرنے لگے، حالانکہ ڈرنا تو آپؐ کو اللہ ہی سے سزاوار ہوا۔ یعنی جب آپؐ کو یہ معلوم تھا کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والا ہے

اس کی ناراضی کا اس میں کوئی خوف و خطر نہیں تو پھر محض لوگوں کے طعنوں سے گھبرا کر آپ کے لئے یہ گفتگو مناسب نہیں تھی۔

اس واقعہ کی جو تفصیل اوپر لکھی گئی ہے، یہ سب تفسیر ابن کثیر اور سترطی اور روح المعانی سے لی گئی ہے، اور آیت تَتَخَفُ فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ کی یہ تفسیر کہ وہ چیز جس کو آپ نے دل میں چھپایا تھا وہ یہ ارادہ تھا کہ زیدؓ نے طلاق دیدی تو حکم الہی کے مطابق آپ ان سے نکاح کر لیں گے، یہ تفسیر حکیم ترمذی اور ابن ابی حاتم وغیرہ محدثین نے حضرت علی بن حسین زین العابدینؑ کی روایت سے نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

”یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ اطلاع دیدی تھی کہ حضرت زینبؓ کو زیدؓ طلاق دینی والے ہیں اور اس کے بعد وہ آپ کے نکاح میں آئیں گی“

أَوْحَى اللَّهُ تَعَالَى إِلَيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيَّ وَسَلَّمَ أَنَّ زَيْنَبَ سَيُطَلِّقُهَا زَيْدٌ وَيَتَزَوَّجُهَا بَعْدَهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ (روح از حکیم ترمذی)

اور ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کے حوالہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:-

”یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو پہلے ہی بتلادیا تھا کہ حضرت زینبؓ بھی ازواج مطہرات میں داخل ہو جائیں گی، پھر جب حضرت زیدؓ انکی شکایت لیکر آپکی خدمت میں آئے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تو آپ سے بتلادیا تھا کہ میں ان آپ کا نکاح کرادوں گا اور آپ اپنے دل میں اس چیز کو چھپا ہوئے تھے“

إِنَّ اللَّهَ أَعْلَمُ نَبِيِّهَ أَنْهَا... سَتَكُونُ مِنْ أَزْوَاجِهِ قَبْلَ أَنْ يَتَزَوَّجَهَا قَلَمًا أَقَامَهُ زَيْدٌ لِيَشْكُوَهَا إِلَيْهِ قَالَ اتَّقِ اللَّهَ وَآمِسْكَ عَلَيْكَ زَوْجَكَ فَقَالَ أَخْبَرْتُكَ إِنِّي مُزَوِّجُكُمَا وَتَتَخَفُ فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ،

جمہور مفسرین زہری، بکر بن العلاء، قشیری، قاضی ابوبکر بن العربی نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے کہ جس چیز کے دل میں چھپانے کا ذکر کیا گیا وہ بوحی الہی ارادہ نکاح تھا، اس کے خلاف جن روایات میں مافیٰ نَفْسِكَ کی تفسیر محبت زینبؓ سے منقول ہے، اس کے متعلق ابن کثیر نے فرمایا کہ ہم نے ان روایات کو ذکر کرنا اس لئے پسند نہیں کیا کہ ان میں کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔

اور خود الفاظ قرآن سے تاہید اسی تفسیر کی ہوتی ہے جو حضرت زین العابدینؑ کی



روایت سے اور بیان ہوتی ہے، کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود بتلادیا کہ دل میں چھپائی ہوئی چیز وہ تھی جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو اگلی آیت میں ظاہر فرمایا وہ نکاح ہے حضرت زینبؓ کے ساتھ جیسا کہ فرمایا **وَجَنِّهَا** (رو ۱۳) لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کے محمود ہو، جب تک کسی مقصود شرعی پر اثر انداز نہ ہو۔ جو سبب عتاب بنا۔ جواب یہ ہے کہ اس معاملہ میں اصل ضابطہ

جو قرآن و سنت سے ثابت ہے یہ ہے کہ جس کام کے کرنے سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے اور ان کے طعن و تشنیع میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو تو لوگوں کے دین کی حفاظت اور ان کو طعن و تشنیع کے گناہ سے بچنے کے نیت سے چھوڑ دینا اس صورت میں تو جائز ہے جب کہ یہ فعل خود مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اور کوئی دینی حکم حلال و حرام کا اس سے متعلق نہ ہو، اگرچہ فعل فی نفسہ محمود ہو۔ اس کی نظیر حدیث و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں جب بیت اللہ کی تعمیر کی گئی تو اس میں کئی چیزیں بنائے ابراہیمی کے خلاف کر دی گئی ہیں اول تو کہ بیت اللہ کا کچھ حصہ تعمیر سے باہر چھوڑ دیا، دوسرے بنائے ابراہیمی میں لوگوں کے بیت اللہ میں داخل ہونے کے لئے دو دروازے تھے، ایک مشرقی جانب میں دوسرا مغربی جانب میں، جس کی وجہ سے بیت اللہ میں داخل ہونے اور نکلنے میں زحمت نہ ہوتی تھی، اہل جاہلیت نے اس میں دو تصرف کئے کہ مغربی دروازہ تو بالکل بند کر دیا اور مشرقی دروازہ جو سطح زمین سے متصل تھا اس کو اتنا اونچا کر دیا کہ بغیر سیڑھی کے اس میں داخلہ نہ ہو سکے، جس سے مقصد یہ تھا کہ وہ جس کو اجازت دیں صرف وہ اندر جاسکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو مسلم لوگوں کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بیت اللہ کو پھر بنائے ابراہیمی کے مطابق بنا دیتا۔ یہ حدیث سب کتب معتبرہ میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے اپنا یہ ارادہ جو شرعاً محمود تھا اس کو ترک کر دیا، اور منجانب اللہ اس پر کوئی عتاب نہیں ہوا، جس سے اس عمل کا عند اللہ مقبول ہونا بھی معلوم ہو گیا۔ مگر یہ معاملہ بیت اللہ کعبہ ابراہیمی کے مطابق دوبارہ تعمیر کرنے کا ایسا نہیں جس پر کوئی مقصد شرعی موقوف ہو یا جس سے احکام حلال و حرام متعلق ہوں۔

بخلات واقعہ نکاح زینبؓ کے کہ اس سے ایک مقصد شرعی متعلق تھا کہ جاہلیت کی رسم بد اور اس خیال باطل کی عملی تردید ہو جائے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح حرام ہے۔ کیونکہ قوموں میں چلی ہوئی غلط رسموں کو توڑنا عمل واجب ہی ممکن ہوتا ہے جب اس کا عملی مظاہرہ ہو۔ حکم ربانی اسی کی تکمیل کے لئے حضرت زینبؓ کے نکاح سے متعلق ہوا تھا۔ اس تقریر سے بناء بیت اللہ کے ترک اور نکاح زینبؓ پر بارشاد خداوندی عمل کے ظاہری تعارض کا جواب ہو گیا۔

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی قوی تبلیغ جو سورۃ احزاب کی پہلی آیات میں آچکی ہے اس کو کافی سمجھا، اور اس کے عملی مظاہرہ کی حکمت کی طرف نظر نہیں گئی، اس لئے باوجود علم و ارادہ کے اس کو چھپایا۔ اللہ تعالیٰ نے آیات مذکورہ میں اس کی اصلاح فرمائی، اور اس کا اظہار فرمایا لَکِنَّ لَا یَكُونُ عَلَی الزَّوْجِ مِیْنَتَیْنِ حَرْجٌ فِیْ اَیِّ وَاجٍ اَدَّیَا کَھِمَّ اِذَا قَضَوْا مِنْھُنَّ وَطَرًا، یعنی ہم نے زینبؓ سے آپ کا نکاح اس لئے کیا تاکہ مسلمانوں پر اس معاملے میں کوئی عملی تنگی پیش نہ آئے، کہ منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں سے نکاح کر سکیں۔

اور زَوْجَتَھَا کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہم ان کا نکاح آپ سے کر دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو یہ امتیاز بخشا کہ خود ہی نکاح کر دیا جو عام شرائط نکاح سے مستثنیٰ رہا، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں ہم نے اس نکاح کا حکم دیدیا اب آپ شرعی قواعد و شرائط کے مطابق ان سے نکاح کر لیں۔ حضرات مفسرین میں بعض نے پہلے احتمال کو ترجیح دی، بعض نے دوسرے احتمال کو۔

اور حضرت زینبؓ کا دوسری عورتوں کے سامنے یہ فرمانا کہ تمہارا نکاح تو تمہارے والدین نے کیا میرا نکاح خود اللہ تعالیٰ نے آسمان پر کیا، جیسا کہ روایات میں آیا ہے، یہ دونوں صورتوں میں صادق ہے۔ پہلی صورت میں زیادہ واضح ہے اور دوسری صورت... بھی اس کے منافی نہیں۔

شہادت و اعتراضات | سُنَّةُ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنِ تَخْلَوْنَ مِنْ قَبْلِ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا  
کے جواب کی تمہید | مَقْدُورًا، یہ تمہید ہے اس نکاح پر پیش آنے والے شکوک و شبہات

کی کہ دوسری ازواج کے ہوتے ہوئے اس نکاح کا اہتمام کس لئے کیا گیا۔ ارشاد فرمایا کہ یہ سنت ہے اللہ کی جو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ سے پہلے انبیاء میں بھی جاری رہی ہے، کہ بمصالح دینیہ بہت سی عورتوں سے نکاح کی اجازت



دی گئی، جن میں حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام زیادہ معروف ہیں کہ داؤد علیہ السلام کے نکاح میں تنہا اور سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں تین سو بیبیاں تھیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دینی مصالح سے متعدد نکاح کی اجازت ہوئی اور یہ نکاح بھی ان میں شامل ہے تو کوئی وجہ استبعاد نہیں، نہ یہ شان نبوت و رسالت کے منافی ہے نہ زہد و تقویٰ کے آخری جملے میں یہ بھی فرما دیا کہ نکاح کا معاملہ بھی عام رزق کی طرح منجانب اللہ شرط شدہ ہو کہ کس کا نکاح کس سے ہوگا، تقدیر ازیلی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اس واقعہ میں حضرت زیدؓ اور زینبؓ کے درمیان اختلاف طبائع اور زیدؓ کی ناراضی پھر طلاق دینی کا عزم یہ سب اسی تکوینی اور تقدیری امر کی کڑیاں تھیں۔

آگے ان انبیاء علیہم السلام کی خاص صفات کا ذکر ہے جن کے لئے پچھلے زمانے میں متعدد دیوہیاں رکھنے کی اجازت اور پر معلوم ہوئی ہے، فرمایا اَلَّذِيْنَ مِنْ بَيْنِ يُّسُفُفِ رِسَالَتِ اللّٰهِ یعنی یہ حضرات انبیاء علیہم السلام سبھی اللہ تعالیٰ کے پیغامات اپنی اپنی امتوں کو پہونچاتے ہیں۔

**ایک حکمت** شاید اس میں انبیاء علیہم السلام کی کثرت ازدواج کی حکمت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ ان کے تمام اعمال و اقوال امت کو پہونچنا ضروری ہیں، اور مردوں کا ایک بڑا حصہ وقت کا اپنے زمانے مکان میں عورتوں اور بچوں کے ساتھ گزرتا ہے، اس وقت میں جو کوئی وحی نازل ہو یا خود پیغمبر کوئی حکم صادر فرما دیا یا کوئی عمل کریں، یہ سب امت کی امانت ہے جس کو ازدواج ہی کے ذریعہ سے بآسانی امت تک پہونچایا جاسکتا ہے۔ دوسری صورتیں مشکلات سے خالی نہیں، اس لئے انبیاء کے لئے اگر بیبیاں زیادہ ہوں تو ان کی خانگی زندگی کے افعال و اقوال اور ان کی خانگی سیرت عام امت تک پہونچنا سہل ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

دوسری صفت انبیاء علیہم السلام کی یہ بیان کی گئی کہ وَ يَخْشَوْنَ اللّٰهَ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ، یعنی یہ حضرات اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں، اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ بمصالح دینیہ اگر ان کو کسی کام کی عملی تبلیغ کا مامور کیا جاتا ہے وہ اس میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے، اگر کچھ لوگ اس پر طعنہ کریں تو اس سے نہیں ڈرتے

**ایک اشکال اور جواب** یہاں جبکہ تمام زمرة انبیاء کا یہ حال بیان فرمایا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو اس سے پہلی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ تَخْشَى النَّاسَ (یعنی آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں)

یہ کس طرح درست ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں انبیاء کا غیر اللہ سے نہ ڈرنا تبلیغ رسالات کے معاملے میں بیان ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوف طعنہ زنی کا ایک ایسے کام میں پیش آیا جو بظاہر ایک دنیوی کام تھا، تبلیغ رسالت سے اس کا تعلق نہ تھا۔ پھر جب آیات مذکورہ سے آپ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ نکاح بھی عمل تبلیغ رسالت کا ایک جزو ہے تو اس کے بعد آپ کو بھی کسی کا خوف طعنہ و تشنیع مانع عمل نہیں ہوا، اور یہ نکاح عمل میں لایا گیا، اگرچہ بہت سے کفار نے اعتراضات کئے اور آج تک کرتے رہتے ہیں۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ

محمد باپ نہیں کسی کا تمھارے مردوں میں سے لیکن رسول ہے اللہ کا

وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۲۰﴾

اور مہر سب نبیوں پر اور ہے اللہ سب چیزوں کا جاننے والا۔

## خلاصہ تفسیر

پہلی آیات میں نکاح زینب کا تبلیغ عملی ہونے اور سنت انبیاء ہونے کی حیثیت سے محمود ہونا بتلایا گیا تھا، آگے ان معترضین کا جواب ہی، جو اس نکاح کو مذموم سمجھ کر طعنہ زنی کرتے تھے، یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علاقہ اولاد نہیں رکھتے، جیسا کہ اس آیت میں عام صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا رِجَالُكُمْ یعنی تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ اس میں نسبت عام لوگوں کی طرف کی گئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت قطع کی گئی۔ اس لئے اپنے خاندان کے افراد میں سے کسی مرد کا باپ ہونا اس کے منافی نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ عام اُمت کے لوگوں کے ساتھ آپ کو ایسی اُبوت حاصل نہیں جو کسی دلیل صحیح سے ان کی مطلقہ بیوی کے ساتھ نکاح حرام ہونے کا موجب ہو، لیکن وہاں ایک دوسری قسم کی اُبوت روحانی ضرور حاصل ہے، چنانچہ اللہ کے رسول ہیں (اور ہر رسول روحانی مرتبی ہونے کی وجہ سے اُمت کا روحانی باپ ہوتا ہے) اور اس اُبوت روحانیہ میں اس درجہ کامل ہیں کہ سب رسولوں سے افضل و اکمل



ہیں، چنانچہ آپؐ سب نبیوں کے ختم پر ہیں (اور جو نبی ایسا ہوگا وہ ابوتِ روحانیہ میں سب سے بڑھ کر ہوگا، کیونکہ آپؐ کی ابوتِ روحانیہ کا سلسلہ قیامت تک چلے گا، جس کے نتیجہ میں آپؐ کی روحانی اولاد سب زیادہ ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ امت کے لئے آپؐ کی ابوتِ جسمانی اور نسبی نہیں ہے، جس سے حرمتِ نکاح متعلق ہوتی ہے بلکہ ابوتِ روحانی ہے۔ اس لئے متنبی بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کوئی قابلِ اعتراض نہیں، بلکہ اس روحانی ابوت کا تقاضا یہ ہے کہ سب لوگ آپؐ پر مکمل اعتماد و اعتقاد رکھیں، آپؐ کے کسی قول و فعل پر شک و شبہ نہ کریں) اور (اگر یہ دوسو سو ہو کہ یہ نکاح ناجائز تو نہیں تھا، لیکن اگر نہ ہوتا تو بہتر ہوتا تاکہ لوگوں کو اعتراض اور طعن کا موقع ہی نہ ملتا تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ) اللہ تعالیٰ ہر چیز کے وجود یا عدم کی مصلحت کو خوب جانتا ہے۔

## معارف و مسائل

آیت مذکورہ میں ان لوگوں کے خیال کا رد ہے جو اپنی رسمِ جاہلیت کے مطابق زید بن حارثہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا کہتے تھے، اور ان کی طلاق کے بعد حضرت زینبؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح پر طعن کرتے تھے، کہ بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اس کے رد کے لئے یہ کہہ دینا کافی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیدؓ کے باپ نہیں بلکہ زیدؓ کے باپ حارثہ ہیں، مگر اس میں مبالغہ اور تاکید کے لئے ارشاد فرمایا مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ جُنْدٍ لِّكَذِبٍ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ بھی نہیں، تو ایسے شخص پر جس کی اولاد میں کوئی بھی مرد نہ ہو یہ طعن دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، کہ اس کا کوئی بیٹا ہے، اور اس کی مطلقہ بیوی آپؐ کے بیٹے کی بیوی ہونے کی وجہ سے آپؐ پر حرام ہے۔

اس مضمون کے بیان کے لئے مختصر الفاظ یہ تھے کہ (أَبَا أَحَدٍ مِّنْ جُنْدٍ) کہا جاتا، اس کے سچے و سرائے حکیم نے لفظ رجال کا اضافہ کر کے اس شبہ کو دور کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو چار فرزندوں کے والد ہیں، تین فرزند حضرت خدیجہؓ سے قاسمؓ، طیبؓ، طاہرؓ ہیں، اور ایک حضرت ماریہ قبطیہؓ سے ابراہیمؓ، کیونکہ یہ سب بچپن ہی میں وفات پا گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی رجال کی حد میں داخل نہیں ہوا، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نزولِ آیت کے وقت آپؐ کا کوئی فرزند نہ تھا۔ قاسمؓ، طیبؓ اور طاہرؓ کی وفات ہو گئی تھی، اور ابراہیمؓ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔

مخالفین کے اعتراض اور طعن کا جواب اسی جملہ سے ہو گیا تھا، مگر آگے دوسرے شبہات کے ازالہ کے لئے فرمایا وَلَیْکُنْ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، حرف لَیْکُنْ عربی زبان میں اس کام کے لئے آتا ہے کہ پچھلے کلام میں جو کوئی شبہ ہو سکتا تھا اس کو دور کیا جائے۔ یہاں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بیان کیا گیا کہ آپ اُمّت کے مردوں میں کسی کے باپ نہیں تو اس پر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ہر نبی در رسول اپنی اُمّت کا باپ ہوتا ہے، اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّت کے سبھی مردوں کے بلکہ ہر مرد و عورت کے باپ ہیں آپ سے اُبُوّت کی نفی گویا نبوت کی نفی ہے۔

اس کا جواب لَیْکُنْ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے لفظ سے یہ دیا گیا کہ حقیقی اور نسبی باپ ہونا اور چیز ہے جس پر نکاح کے حلال و حرام کے احکام عائد ہوتے ہیں اور بحیثیت نبوت اُمّت کا روحانی باپ ہونا دوسری چیز ہے جس سے یہ احکام متعلق نہیں ہوتے، تو گویا مطلب اس پورے جملے کا یہ ہو گیا کہ آپ اُمّت کے مردوں میں سے کسی کے بھی نسبی باپ نہیں، لیکن روحانی باپ سب کے ہیں۔

اس میں ایک دوسرے طعن کا جواب بھی ہو گیا، جو بعض مشرکین نے کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ اَبتر یعنی مقطوع النسل ہیں۔ یعنی کوئی نرینہ اولاد آپ کی نہیں ہے جس سے نسب چلے، اور آپ کا پیغام آگے بڑھے، چند روز کے بعد ان کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ الفاظ مذکور نے یہ واضح کر دیا کہ اگرچہ نسبی اولاد نرینہ آپ کی نہیں لیکن آپ کی رسالت و نبوت کے پیغام کو پھیلانے اور قائم رکھنے اور بڑھانے کے لئے نسبی اولاد کی ضرورت نہیں، اس کے لئے روحانی اولاد کام کیا کرتی ہے۔ اور چونکہ آپ رسول اللہ ہیں، اور رسول اُمّت کا روحانی باپ ہوتا ہے، اس لئے آپ پوری اُمّت کے روحانی باپ ہونے کی حیثیت سے تم سب کے زیادہ کثیر الادلاد ہیں۔

یہاں جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا ذکر آیا، اور اس منصب نبوت میں آپ تمام دوسرے انبیاء سے خاص امتیازی فضیلت رکھتے ہیں تو آگے آپ کی مخصوص شان اور تمام انبیاء علیہم السلام پر آپ کا فائق ہونا اس لفظ سے واضح کیا گیا وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ، لفظ خاتم میں دو قرار تیں ہیں، امام حسنؑ اور امام کی قراءت خاتم بفتح تاء ہے اور دوسرے ائمہ قراءت خاتم بکسر تاء پڑھتے ہیں۔ حاصل معنی دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی انبیاء کو ختم کرنے والے، کیونکہ خاتم خواہ بکسر التاء ہو یا بفتح التاء دونوں کے معنی آخر کے بھی آتے ہیں، اور مہر کے معنی میں بھی



یہ دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں، اور نتیجہ دوسرے معنی کا بھی وہی آخر کے معنی ہوتے ہیں کیونکہ  
 ہر کسی چیز پر بند کرنے کے لئے آخر ہی میں کی جاتی ہے۔ لفظ خاتم بالکسر والفتح دونوں  
 کے دونوں معنی لغت عربی میں تمام کتابوں میں مذکور ہیں۔ قاموس، صحاح، لسان العرب  
 تاج العروس وغیرہ اسی لئے تفسیر روح المعانی میں خاتم بمعنی ہر کا حاصل بھی وہی معنی  
 آخر کے بتلائے ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں وَالْخَاتِمُ الرَّسْمُ الَّذِي لَهَا يَخْتَمُّ بِهِ  
 كَالطَّارِيعِ لَهَا يُطْبَعُ بِهِ فَمَعْنَى خَاتِمِ النَّبِيِّينَ الَّذِي خُتِمَ النَّبِيُّونَ بِهِ وَ  
 مَا لَهُ الْخَيْرُ النَّبِيُّونَ۔ یہی مضمون تفسیر بیضاوی اور احمدی میں بھی مذکور ہے، اور  
 امام راغب نے مفردات القرآن میں فرمایا وَخَاتِمُ النَّبِيِّينَ لِأَنَّهُ خَتَمَ النَّبِيُّونَ  
 أَيْ تَسَمَّيَ بِمَجِيئِهِ، یعنی آپ کو خاتم نبوت اس لئے کہا گیا کہ آپ نے نبوت کو اپنے  
 تشریف لانے سے ختم اور مکمل کر دیا ہے۔

اور محکم ابن سیدہ میں ہے وَخَاتِمُ كُلِّ شَيْءٍ وَخَاتِمَتُهُ عَاقِبَتُهُ وَآخِرُهُ  
 یعنی ہر چیز کا خاتم اور خاتمہ اس کے انجام اور آخر کو کہا جاتا ہے۔  
 خلاصہ یہ ہے کہ قراءت خواہ بفتح تاء کی لی جائے یا بکسر تاء کی، معنی دونوں صورتوں  
 میں یہ ہیں کہ آپ ختم کرنے والے ہیں انبیاء کے، یعنی سب کے آخر اور بعد میں آپ مبعوث  
 ہوئے ہیں۔

صفت خاتم الانبیاء ایک ایسی صفت ہے جو تمام کمالات نبوت و رسالت میں  
 آپ کی اعلیٰ فضیلت اور خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ کیونکہ عموماً ہر چیز میں تدریجی ترقی  
 ہوتی ہے، اور انتہا پر پہنچ کر اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور جو آخری نتیجہ ہوتا ہے وہی اصل  
 مقصود ہوتا ہے، قرآن کریم نے خود اس کو واضح کر دیا ہے أَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ  
 دِينَكُمْ وَأَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي، یعنی آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے  
 اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے۔

انبیاء سابقین کے دین بھی اپنے اپنے وقت کے لحاظ سے مکمل تھے، کوئی قص  
 نہ تھا، لیکن کمال مطلق اسی دین مصطفویٰ کو حاصل ہوا جو اولین و آخرین کے لئے حجت  
 اور قیامت تک چلنے والا دین ہے۔

اس جگہ صفت خاتم النبیین کے اضافہ سے اس مضمون کی بھی اور زیادہ وضاحت  
 اور تکمیل ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقطوع النسل کہنا جہالت ہے، جبکہ  
 ساری امت کے باپ ہونے کی حیثیت سے آپ متصف ہیں۔ کیوں کہ لفظ

خاتم النبیین نے یہ بھی بتلادیا کہ آپ کے بعد قیامت تک آنے والی سب نسلیں اور قومیں آپ ہی کی امت میں شامل ہوں گی۔ اس وجہ سے آپ کی امت کی تعداد بھی دوسری امتوں سے زیادہ ہوگی اور آپ کی روحانی اولاد دوسرے انبیاء کی نسبت سے بھی زیادہ ہوگی۔

صفت خاتم النبیین نے یہ بھی بتلادیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اپنی اولاد روحانی یعنی پوری امت پر دوسرے تمام انبیاء سے زائد ہوگی، اور آپ قیامت تک پیش آنے والی ضرورتوں کو واضح کرنے کا پورا اہتمام فرمائیں گے۔ کیونکہ آپ کے بعد کوئی نبی اور کوئی وحی دنیا میں آنے والی نہیں، بخلاف انبیاء سابقین کے کہ ان کو اس کی فکر نہ تھی وہ جانتے تھے کہ جب قوم میں گمراہی پھیلے گی تو ہمارے بعد دوسرے انبیاء آکر اس کی اصلاح کر دیں گے، مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فکر لاحق تھی کہ قیامت تک امت کو جن حالات سے سابقہ پڑے گا ان سب حالات کے متعلق ہدایات امت کو دے کر جائیں، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث شاہد ہیں کہ آپ کے بعد جتنے لوگ قابل اقتدار آنے والے تھے اکثر ان کے نام لے کر بتلادیا ہے۔ اسی طرح جتنے گمراہی کے علمبردار ہیں ان کے حالات اور پتے ایسے کھول کر بتلادیئے ہیں کہ ذرا غور کرنے والے کو کوئی اشتباہ باقی نہ رہ جائے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اِنِّیْ تَرٰکُمْ عَلٰی شَرِّ یَّعْنٰی بَیْضًا وَّلَیْلًا وَّنَهَارًا سَوَآءٌ، یعنی میں نے تم کو ایسے روشن راستے پر چھوڑا جو جس میں رات دن برابر ہیں کسی وقت بھی گمراہی کا خطرہ نہیں اس آیت میں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بصفہ رسول آیا ہے، اس کے لئے بظاہر مناسب یہ تھا کہ آگے "خاتم الرسل" یا "خاتم المرسلین" کا لفظ استعمال ہوتا، مگر قرآن حکیم نے اس کے بجائے "خاتم النبیین" کا لفظ اختیار فرمایا۔

وجہ یہ ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک نبی اور رسول میں ایک فرق ہے۔ وہ یہ کہ نبی تو ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو حق تعالیٰ اصلاح خلق کے لئے مخاطب فرمائیں، اور اپنی وحی سے مشرف فرمائیں، خواہ اس کے لئے کوئی مستقل کتاب اور مستقل شریعت تجویز کریں، یا پہلے ہی کسی نبی کی کتاب و شریعت کے تابع لوگوں کو ہدایت کرنے پر مامور ہو، جیسے حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب و شریعت کے تابع ہدایت کرنے پر مامور تھے۔

اور لفظ رسول خاص اس نبی کے لئے بولا جاتا ہے جس کو مستقل کتاب و شریعت



دی گئی ہو۔ اسی طرح لفظ نبی کے مفہوم میں یہ نسبت لفظ رسول کے عموم زیادہ ہی، تو آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ آپ انبیاء کے ختم کرنے والے اور سب آخر میں ہیں خواہ وہ صاحب شریعت نبی ہوں یا صرف پہلے نبی کے تابع۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی جتنی قبیلیں اللہ کے نزدیک ہو سکتی ہیں وہ سب آپ پر ختم ہو گئیں، آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔

امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں فرمایا

فَهَذِهِ الْآيَةُ فِي أَنَّ اللَّهَ لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ  
وَإِذَا كَانَ لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ فَلَا  
رِسُولَ بِالطَّرِيقِ إِلَّا دُلَىٰ لِأَنَّ  
مَقَامَ الرِّسَالَةِ آخِصٌّ مِنْ  
مَقَامِ النُّبُوَّةِ فَإِنَّ كُلَّ رَسُولٍ  
يَبِيءُ وَلَا يَنْعَكِسُ بِنِزَالِكَ وَرَدَّتْ  
الْأَحَادِيثُ الْمُنَوَاتِرَةُ عَنْ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ مِنْ حَدِيثِ جَمَاعَةٍ  
مِنَ الصَّحَابَةِ

”یعنی یہ آیت نص صریح ہے اس عقیدہ کے لئے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں اور جب نبی نہیں تو بدرجہ اولیٰ رسول بھی نہیں، کیونکہ لفظ نبی عام اور لفظ رسول خاص ہے، اور یہ وہ عقیدہ ہے جس پر احادیث متواترہ شاہد ہیں، جو صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کی روایت سے ہم تک پہنچی ہیں“

اس آیت کی لفظی تشریح میں کسی قدر تفصیل سے اس لئے کام لیا گیا کہ ہمارے ملک میں مرزا قادیانی مدعی نبوت نے اس آیت کو اپنے راستہ کی رکاوٹ سمجھ کر اس کی تفسیر میں طرح طرح کی تحریفات اور احتمالات پیدا کئے ہیں، مذکور الصدر تقریر سے الحمد للہ ان سب کا جواب ہو جاتا ہے۔

**مسئلہ ختم نبوت** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا اور آپ کا آخری پیغمبر ہونا، آپ کے بعد کسی نبی کا دنیا میں مبعوث نہ ہونا اور ہر مدعی نبوت کا کاذب و کافر ہونا ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابہ کرام سے لے کر آج تک ہر دور کے مسلمانوں کا اجماع و اتفاق رہا ہے۔ اس لئے ضرورت نہ تھی کہ اس پر کوئی تفصیلی بحث کی جائے، لیکن قادیانی فرقہ نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے بڑا زور لگایا ہے سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں شائع کر کے کم علم لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے احقر نے اس مسئلہ کی پوری تفصیل ایک مستقل کتاب ”ختم نبوت“ میں لکھ دی ہے، جس میں ایک سو آیات اور

دوسرے زائد احادیث اور سینکڑوں اقوال و آثار سلف و خلف سے اس مسئلہ کو پورا واضح کر دیا ہے، اور قادیانی دحل کے شبہ کا مفصل جواب دیا ہے، یہاں اس میں سے چند ضروری باتیں لکھی جاتی ہیں۔

آپ کا خاتم النبیین ہونا آخر زمانہ میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے منافی نہیں

چونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات اور احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہو کہ قیامت سے پہلے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر دنیا میں تشریف لائیں گے، اور

دجال اعظم کو قتل کریں گے، اور اس وقت ہر مگر ابی کو ختم کریں گے، جس کی تفصیل احقر کے رسالہ التصريح بما تواتر فی نزول المسیح میں مذکور ہے۔

مرزائی قادیانی نے عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان میں اٹھایا جانا اور پھر آخر زمانہ میں تشریف لانا جو قرآن و سنت کی بے شمار تصویص سے ثابت ہیں ان کا انکار کر کے خود مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا، اور استدلال میں یہ پیش کیا کہ اگر حضرت عیسیٰ بن مریم نبی بنی اسرائیل کا پھر دنیا میں آنا تسلیم کیا جائے تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے منافی ہوگا۔

جواب بالکل واضح ہے کہ خاتم النبیین اور آخر النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے بعد کوئی شخص عہدہ نبوت پر فائز نہ ہوگا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ سے پہلے جس کو نبوت عطا ہو چکی ہے اُن کی نبوت سلب ہو جائے گی، یا ان میں سے کوئی اس عالم میں پھر نہیں آ سکتا۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو بھی آپ کی اُمت میں اصلاح و تبلیغ کے لئے آئے گا وہ اپنے منصب نبوت پر قائم ہوتے ہوئے اس امت میں اصلاح کی خدمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہی کے تابع انجام دے گا، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں تصریح ہے۔

امام ابن کثیر نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا:-

”یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے سے یہ مراد ہو کہ وصف نبوت آپ کے بعد منقطع ہو گیا، اب کسی کو یہ وصف اور منصب نہیں ملے گا، اس سے اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا جس پر

والمراد بكونه عليه السلام خاتمهم انقطاع حدوث وصف النبوة في احد من الثقليين بعد تحليته عليه السلام بهما في هذه النشأة ولا يعتد في ذلك ما اجمعت عليه الامم



واشتهرت فیہ الاخبار واعلمها  
بلغت مبلغ التواتر المعنوی و  
نطق بہ الکتاب علی قول و حسب  
الایمان بہ و اکفر منکرہ  
کالفلان سفہ من نزول عیسیٰ  
علیہ السلام اخو الزمان لانہ  
کان نبیاً قبل ان یحیی نبینا صلی اللہ

امت کا اجماع ہے اور قرآن اس پر ظن  
ہے اور احادیث رسول جو تقریباً درجہ  
تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اس پر شاہد ہیں  
وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر  
زمانے میں نازل ہوں گے، کیونکہ ان کو  
نبوت اس دنیا میں ہمارے نبی صلی اللہ  
علیہ وسلم سے پہلے مل چکی تھی،

علیہ وسلم بالنبوة فی هذه الفساعة

نبوت کے مفہوم کی تحریف | اس مدعی نبوت نے دعویٰ نبوت کا راستہ ہموار کرنے کے لئے ایک  
ظلی اور بروزی نبوت کی ایجاد | نئی چال یہ چلی کہ نبوت کی ایک نئی قسم ایجاد کی، جس کا قرآن و سنت  
میں کوئی وجود و ثبوت نہیں اور پھر کہا کہ یہ قسم نبوت کی حکم شرعی ختم نبوت کے منافی  
نہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس نے نبوت کے مفہوم میں وہ راستہ اختیار کیا جو ہندوؤں  
اور دوسری قوموں میں معروف ہو کہ ایک شخص کسی دوسرے کے جنم میں دوسرے کے روپ  
میں آسکتا ہے، اور پھر یہ کہا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل اتباع کی وجہ  
سے آپ کا ہم رنگ ہو گیا ہو اس کا آنا گویا خود آپ ہی کا آنا ہے، وہ درحقیقت آپ ہی  
کا ظل اور بروز ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے دعوے سے عقیدہ ختم نبوت متاثر  
نہیں ہوتا۔

مگر اوّل تو خود یہ نو ایجاد نبوت اسلام میں کہاں سے آئی، اس کا کوئی ثبوت  
نہیں۔ اس کے علاوہ مسئلہ ختم نبوت چونکہ عقائد اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے،  
اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مختلف عنوانات سے مختلف اوقات میں ایسا  
واضح کر دیا ہے کہ کسی تحریف کرنے والے کی تحریف چل نہیں سکتی۔ اس جواب کی پوری  
تفصیل نواح حق کی کتاب ختم نبوت ہی میں دیکھی جاسکتی ہے، یہاں چند چیزیں بقتلہ  
ضرورت پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں تمام کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت  
اسناد صحیح کے ساتھ آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء  
کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے

ان مثلی و مثل الانبیاء من  
قبلی کمثل رجل بنی بیتاً

فاحسنہ واجملہ الاموضع  
لبنتہ من زاویۃ فجعل  
الناس یطوفون بہ ویعجبون  
لہ ویقولون ہلا وضعت  
ہذہ اللبنتہ وانا خاتم  
النبیین، رواہ احمد النسائی  
والترمذی وفی بعض الفاظہ  
فكنت اناسا دت موضع  
اللبنتہ وختم بی البنیان

ایک مکان بنایا ہوا اور اس کو خوب  
مضبوط اور مرتب کیا ہو مگر اس کے ایک  
گوشہ میں دیوار کی ایک اینٹ کی جگہ  
خالی چھوڑ دی ہو تو لوگ اس کو دیکھنے  
کے لئے اس میں چلیں پھریں اور تعمیر  
کو پسند کریں مگر سب یہ کہیں کہ اس  
مکان بنانے والے نے یہ اینٹ بھی  
کیوں نہ رکھ دی جس سے تعمیر بالکل مکمل  
ہو جاتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ (قصر نبوت کی) وہ آخری اینٹ میں ہوں، اور بعض الفاظ حدیث  
میں ہر کہ میں نے اس خالی جگہ کو پُر کر کے قصر نبوت کو مکمل کر دیا،

اس تمثیل بلیغ کا حاصل یہ ہر کہ نبوت ایک عالی شان محل کی طرح ہے، جس کے ارکان  
انبیاء علیہم السلام ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہ محل بالکل تیار ہو چکا تھا  
اور اس میں صرف ایک اینٹ کے سوا کسی اور قسم کی گنجائش تعمیر میں باقی نہیں تھی، آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ کو پُر کر کے قصر نبوت کی تکمیل فرمادی، اب اس میں نہ  
کسی نبوت کی گنجائش ہے نہ رسالت کی، اگر نبوت یا رسالت کی کچھ اقسام مان لی جائیں  
تو اب ان میں سے کسی قسم کی گنجائش قصر نبوت میں نہیں ہے۔

صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک دوسری حدیث  
ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

كانت بتوا سرا نيل تسوسهم  
الا نبيا كل ما هلك نبى خلفه  
نبى وانه لا نبى بعدى و  
سيكون خلفاء فيكثرون  
الحديث

”بنی اسرائیل کی سیاست اور انتظام  
خود انبیاء کے ہاتھ میں تھا، جب ایک  
نبی کی وفات ہو جاتی تو دوسرا نبی اس  
کے قائم مقام ہو جاتا تھا، اور میرے  
بعد کوئی نبی نہیں، البتہ میرے خلیفہ  
ہوں گے جو بہت ہوں گے“

اس حدیث نے یہ بھی واضح کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں  
اور آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا، تو امت کی ہدایت کا انتظام کیسے ہوگا؟



اس کے متعلق فرمایا کہ آپ کے بعد امت کی تعلیم و ہدایت کا انتظام آپ کے خلفاء کے ذریعہ سے ہوگا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے مقاصد نبوت کو پورا کریں گے، اگر ظلی برداری کوئی نبوت کی قسم ہوتی یا غیر شرعی نبوت باقی ہوتی، تو ضرور تھا کہ یہاں اس کا ذکر کیا جاتا کہ اگرچہ عام نبوت ختم ہو چکی مگر فلاں قسم کی نبوت باقی ہے جس سے اس عالم کا انتظام ہوگا۔

اس حدیث میں صاف واضح الفاظ میں بتلادیا کہ نبوت کی کوئی قسم آپ کے بعد باقی نہیں، اور ہدایت خلق کا کام جو پچھلی امتوں میں انبیاءِ ربی اسرائیل سے لیا گیا تھا، وہ اس امت میں آپ کے خلفاء سے لیا جائے گا۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث مرفوعہ ہے:  
 لَمْ يَبْقَ مِنَ النَّبُوءَةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ،  
 ”یعنی نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا،  
 بجز مبشرات کے“

مسند احمد وغیرہ میں حضرت صدیقہ عائشہؓ اور ام کریمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لا يبقى بعدى من النبوة شيء	”میرے بعد نبوت میں سے کچھ باقی
إلا المبشرات قالوا يا رسول	نہیں رہا بجز مبشرات کے، صحابہ نے
الله وما المبشرات قال الرويا	عرض کیا یا رسول اللہ مبشرات کیا چیز
الصالحه يراها المسلم او ترى	ہی؟ فرمایا سچے خواب جو مسلمان خود
له (طانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے کذا	دیکھے یا اس کے متعلق کوئی دوسرا دیکھو“
في الكنز)	

اس حدیث نے کس قدر وضاحت سے بتلادیا کہ نبوت کی کوئی قسم شرعی یا غیر شرعی اور بقول مرزا قادیانی ظلی یا برداری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں، صرف مبشرات یعنی سچے خواب لوگوں کو آئیں گے جن سے کچھ معلومات ہو جائیں گی۔  
 از مستند احمد اور ترمذی میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الرسالة والنبوة قد	”بیشک رسالت اور نبوت میرے بعد
انقطعت فلا رسول بعدى	منقطع ہو چکی ہے، میرے بعد نہ کوئی
ولا نبي، رواه الترمذی و	رسول ہوگا اور نہ نبی“

وقال هذا حديث صحيح

اس حدیث نے واضح کر دیا کہ غیر شرعی نبوت بھی آپ کے بعد باقی نہیں، اور ظلی بروزی تو نبوت کی کوئی قسم ہی نہیں نہ اسلام میں اس طرح کی کوئی چیز معروف ہے۔ اس جگہ مسئلہ ختم نبوت کی احادیث جمع کرنا مقصود نہیں، وہ تو دوسو سے زیادہ سالہ ختم نبوت میں جمع کر دی گئی ہیں، صرف چند احادیث سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ مرزائی قادیانی نے جو بقاء نبوت کے لئے ظلی اور بروزی کا عنوان ایجاد کیا ہے، اول تو اسلام میں اس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں، اور بالفرض ہوتی بھی تو ان احادیث مذکورہ نے واضح طور پر یہ تباہ کر آپ کے بعد نبوت کی کوئی قسم کسی طرح کی باقی نہیں ہے۔

اسی لئے صحابہ کرام سے لے کر آج تک امت مسلمہ کے سب طبقات کا اجماع اس عقیدہ پر رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی کسی قسم کا نبی یا رسول نہیں ہو سکتا، جو دعویٰ کرے وہ کاذب، منکر قرآن اور کافر ہے۔ اور صحابہ کرام کا سب سے پہلا اجماع اسی مسئلہ پر ہوا جس کی رد سے مسئلہ کذاب مدعی نبوت سے خلیفہ اول صدیق اکبر کے عہد میں جہاد کر کے اس کو اور اس کے ماننے والوں کو قتل کیا گیا۔

ائمہ سلف اور علماء امت کے اقوال و تصریحات بھی اس معاملہ میں رسالہ ختم نبوت کے تیسرے حصہ میں بڑی تفصیل سے لکھ دیئے گئے ہیں، اس جگہ چند کلمات نقل کئے جاتے ہیں۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے:

”اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث متواترہ میں خبر دی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ آپ کے بعد جو شخص اس مقام نبوت کا دعویٰ کرے وہ کذاب، مفتری، دجال، گمراہ، گمراہ کرنے والا ہے، اگرچہ وہ کتنی ہی شعبہ بازی کرے اور قسم قسم کے جادو اور طلسم اور نیزنگیاں دکھلائے کہ سب کے سب محال اندر

اخبار اللہ تعالیٰ فی کتابہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی السنۃ المتواترۃ عنہ انہ لا نبی بعدہ لیعلموا ان کل من ادعی ہذا المقام بعدہ فہو کذاب افالک دجال ضال مضل و لو حرق و شعبن و اتی بانواع السحر و الطلاسم و النیرنجیات فکلہا محال و ضلال عند



اولی الالباب کما اجری اللہ،  
سُبْحَانَهُ عَلٰی دِیْنِ الْاَسْوٰ الْعَنٰی  
بَالِیْمِنِّ وَهَسِیْلَةِ الْکَذٰبِ  
بَالِیْمَامَةِ مِنَ الْاَحْوَالِ لِفَاسِدٍ  
وَالْاَقْوَالِ الْبَارِحَةِ مَا عَلِمَ کُلُّ  
ذِی لُبٍّ وَفَہْمٍ وَحَسْبٰی اَنْہُمَا  
کَاذِبَانِ ضَالَّانِ لَعْنَهُمَا اللّٰہُ  
تَعَالٰی وَکَذٰلِکَ کُلُّ مُدْعٍ لِّذٰلِکَ  
اِلٰی یَوْمِ الْقِیَمَةِ حَتّٰی یَخْتَمُوْا  
بِالْمَسِیْحِ الدَّجَالِ  
(ابن کثیر)

اور گمراہی ہیں عقل والوں کے نزدیک  
جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسود عسی (مدعی  
نبوت) کے ہاتھ پر یمن میں اور مسیلہ  
کذاب (مدعی نبوت) کے ہاتھ پر یمامہ  
میں اس طرح کے حالات فاسدہ  
اور پیودہ اقوال ظاہر کرائے، جن کو  
دیکھ کر سن کر ہر عقل و فہم والے نے سمجھ  
لیا کہ یہ دونوں کاذب اور گمراہ ہیں،  
اللہ ان پر لعنت فرمائے، اسی طرح جو  
شخص بھی قیامت تک نبوت کا دعویٰ  
کرے وہ کاذب و کافر ہے، یہاں تک کہ

مدعیان نبوت کا یہ سلسلہ مسیح و جال پر ختم ہوگا۔  
امام غزالیؒ نے اپنی کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد میں آیت مذکورہ کی تفسیر اور حقیقہ  
ختم نبوت کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں:-

اِنَّ الْاُمَّةَ فَهِمَتْ بِالْاِجْمَاعِ مِنْ  
هٰذَا اللَّفْظِ وَمِنْ قَرَائِنِ اَحْوَالِہِ  
اَنَّہُ فُہِمَ عَدُّ مُرَبِّیِّ بَعْدَہٗ اَبَدًا  
وَعَدُّ مُرْسُوْلِ اللّٰہِ اَبَدًا اَوْ اِنَّہُ  
لَیْسَ فِیْہِ تَاوِیْلٌ وَلَا تَخْصِیْصٌ  
(الاقتصاد، طبع مصر ۱۳۸۰ھ)

”بیشک امت نے اس لفظ (یعنی خاتم  
النبتین اور لانی بعدی) سے اور قرائن احوال  
سے باجماع یہی سمجھا ہے کہ آپؐ کے بعد  
ابد تک نہ کوئی نبی ہوگا، اور نہ کوئی  
رسول، اور یہ کہ نہ اس میں کوئی تاویل  
چل سکتی ہے نہ تخصیص۔“

اور قاضی عیاضؒ نے اپنی کتاب شفا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعویٰ  
نبوت کرنے والے کو کافر اور کذاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے والا  
اور آیت مذکورہ کا منکر کہہ کر یہ الفاظ لکھے ہیں:-

وَاجْمَعْتَ الْاُمَّةَ عَلٰی حِمْلِ هٰذَا  
الْکَلَامِ عَلٰی ظَاہِرِہِ وَاِنَّ مَقْبُوْلَہُ  
الْمُرَادِ بِہٖ دَوْنِ تَاوِیْلِ وَلَا

”امت نے اجماع کیا ہے کہ اس کلام  
کو اپنے ظاہر پر محمول کیا جائے اور اس پر  
کہ اس آیت کا نفس مفہوم ہی مراد ہے

تخصیص فلا شک فی کفر  
هو لاء الطوائف کلمها قطعاً  
اجماعاً و سماعاً

بغیر کسی تاویل یا تخصیص کے اس لئے ان  
تمام فرقوں کے کفر میں کوئی شک نہیں  
رجو کسی مدعی نبوت کی پیروی کریں

بلکہ ان کا کفر قطعی طور سے اجماع امت اور نقل یعنی کتاب و سنت سے ثابت ہے۔  
رسالہ ختم نبوت کے تیسرے حصہ میں ائمہ دین اور ہر طبقے کے اکابر علماء کے بہت سے  
اقوال جمع کر دیئے گئے ہیں، اور جو یہاں نقل کئے گئے ہیں ایک مسلمان کے لئے وہ بھی کافی ہیں  
واللہ اعلم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ كُرُوا لِلَّهِ ذِكْرًا كَثِيرًا ۖ وَسَبِّحُوا

اے ایمان والو یاد کرو اللہ کی بہت سی یاد - اور پاکی بولتے رہو اس کی

بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۖ هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ

صبح اور شام - وہی ہر جو رحمت بھیجتا ہو تم پر اور اس کے فرشتے

لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ

تاکہ نکالے تم کو اندھیروں سے اُجالے میں، اور ہے ایمان والوں پر

رَحِيمًا ۖ تَحِيتُكُم يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ ۚ وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا

مہربان - دُعا ان کی جس دن اس سلیں گے سلام ہے، اور تیار رکھا ہو ان کے واسطے

كَرِيمًا ۖ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا

ثواب عزت کا۔ اے نبی ہم نے تجھ کو بھیجا ہے بتانے والا اور خوش خبری سنانے والا

وَنَذِيرًا ۖ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۖ

اور ڈرانے والا، اور بلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور چمکتا ہوا چراغ

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ۖ وَلَا تَطِعِ

اور خوش خبری سنانے ایمان والوں کو کہ ان کیلئے ہو خدا کی طرف بڑی بزرگی، اور کہا مت مان

الْكُفْرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعَا أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ كِيلًا ۖ

منکروں کا اور دغا بازوں کا اور چھوڑ دے ان کا ستانا اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ بس ہو کام بنانے والا۔



## خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو تم راہِ احساناتِ الہیہ کو عموماً اور ایسے اکمل رسل کی بعثت کے احسان کو خصوصاً یاد کر کے اس کا یہ شکر ادا کرو کہ اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو اور اس میں سب طاعات آگئیں، اور اس ذکر و طاعت پر دوام رکھو پس (صبح و شام یعنی علی الدوام) اس کی تسبیح (و تقدیس) کرتے رہو یعنی دل سے بھی اور اعضا سے بھی، اور زبان سے بھی پس جملہ اولیٰ سے عموم اعمال و طاعات کا اور جملہ ثانیہ میں عموم ازمنہ و اوقات کا حاصل ہو گیا یعنی نہ تو ایسا کرو کہ کوئی حکم بجالائے اور کوئی نہ بجالائے، اور نہ ایسا کرو کہ کسی دن کوئی کام کر لیا کسی دن نہ کیا، اور جیسا اس نے تم پر بہت احسان کئے ہیں اور آئندہ بھی کرتا رہتا ہے پس بالضرورۃ مستحق ذکر و شکر ہے، چنانچہ وہ ایسا (رحیم) ہو کہ وہ (خود بھی) اور (اس کے حکم سے) اس کے فرشتے (بھی) تم پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں اس کا رحمت بھیجتا تو رحمت کرنا ہے اور فرشتوں کا رحمت بھیجنا رحمت کی دعا کرنا ہے کما قال الذین یحملون العرش الی قولہ ذرہم السَّیِّئَاتِ، اور یہ رحمت بھیجتا اس لئے ہے تاکہ حق تعالیٰ (برکت اس رحمت کے) تم کو درجہا لست و ضلالت کی تاریکیوں سے (علم اور ہدایت کے) نور کی طرف لے آئے یعنی خدائی رحمت اور دعا ملائکہ کی برکت ہو کہ تم کو علم اور ہدایت کی توفیق اور اس پر ثبات حاصل ہے کہ یہ ہر وقت متحدہ دہوتی رہتی ہے اور (اس سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ مؤمنین پر بہت مہربان ہے اور یہ رحمت تو مؤمنین کے حال پر دنیا میں ہو اور آخرت میں بھی وہ مورد رحمت ہوں گے، چنانچہ وہ جس روز اللہ سے ملیں گے تو ان کو جو سلام ہو گا وہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ خود ان سے ارشاد فرمائے گا (اَسْلَامٌ عَلَیْکُمْ) کہ ازلہ خود سلام ہی علامت اعزاز کی ہے، پھر جب کہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ہو کما قال سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّ وَحِیْمٍ اور حدیث میں ہو کہ اللہ تعالیٰ خود اہل جنت سے فرمائے گا اَسْلَامٌ عَلَیْکُمْ رواہ ابن ماجہ وغیرہ اور یہ سلام تو روحانی انعام ہے جس کا حاصل اکرام ہے اور (آگے جسمانی انعام کی خبر بعنوان عام ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان (مؤمنین کے لئے) عمدہ صلہ (جنت میں) تیار کر رکھا ہے کہ ان کے جانے کی دیر ہے، یہ گئے اور وہ ملا، آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہو کہ اے نبیؐ! آپؐ مشے چند معترضین کے طعن سے معذور نہ ہوں، اگر یہ سفہاء آپؐ کو نہ جانیں تو کیا ہوا ہم نے تو ان بڑی بڑی

نعمتوں اور رحمتوں کا جو کہ خطابِ مؤمنین میں مذکور ہوئی ہیں، آپ ہی کو واسطہ بنایا ہے اور آپ کے مخالفین کی سزا کے لئے خود آپ کا بیان کافی قرار دیا گیا ہے کہ اُن کے مقابلہ میں آپ سے ثبوت نہ لیا جائے گا، پس اس سے ظاہر ہے کہ آپ ہمارے نزدیک کس درجہ محبوب و مقبول ہیں، چنانچہ ہم نے بے شک آپ کو اس شانِ کارِ رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ قیامت کے روز امت کے اعتبار سے خود سرکاری گواہ ہوں گے کہ آپ کے بیان کے موافق اُن کا فیصلہ ہوگا کما قال اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا مِّمَّا هُمْ عَلَيْنٰكُمْ اور ظاہر ہے کہ خود صاحبِ معاملہ کو دوسرے فریقِ اہلِ معاملہ کے مقابلہ میں گواہ قرار دینا اعلیٰ درجہ کا اکرام اور علو شان ہے جس کی قیامت کے روز ظہور ہوگا اور دنیا میں جو آپ کی صفاتِ کمال ظاہر ہیں وہ یہ ہیں کہ آپ (مؤمنین کے) بشارت دینے والے ہیں اور (کفار کے) ڈرانے والے ہیں اور (عام طور پر سب کو) اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں (اور یہ تبشیر و انذار و دعوتِ تبلیغی ہے) اور دیوں خود اپنی ذات و صفات و کمالات و عبادات و عادات و غیرہ مجموعی حالات کے اعتبار سے، آپ (سرتاپا نمونہ ہدایت ہونے میں بمنزلہ) ایک روشن چراغ کے، ہیں کہ آپ کی ہر حالت طالبانِ انوار کے لئے سرمایہ ہدایت ہے، پس قیامت میں ان مؤمنین پر جو کچھ رحمت ہوگی وہ آپ ہی کی ان صفاتِ تبشیر و نذیر و داعی و سراجِ منیر کے واسطہ سے ہی۔ پس آپ اس غم و پریشانی کو الگ کیجئے اور اپنے منصبی کام میں لگئے یعنی مؤمنین کو بشارت دیجئے کہ ان پر اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہونے والا ہے اور اسی طرح کافروں اور منافقوں کو ڈراتے رہئے جس کو ایک خاص عنوان سے تعبیر کیا ہے وہ یہ کہ کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ کیجئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تو امکان ہی نہ تھا کہ آپ کفار و منافقین کے کہنے میں آکر تبلیغ و دعوت چھوڑ دیں، لیکن لوگوں کی طعن و تشنیع سے بچنے کے لئے ممکن تھا کہ آپ اس عملِ تبلیغ میں جو نکاحِ رینہ کے ذریعہ مقصود تھی کوئی سُستی کریں اس کو کفار کا کہنا ماننے سے تعبیر کر دیا گیا، اور ان (کافروں اور منافقوں) کی طرف سے جو (کوئی) ایذا پہونچے (جیسا اس نکاح میں کہ تبلیغ فعلی ہی ایذا، قولی پہونچی، اس کا خیال نہ کیجئے اور فعلی ایذا کا بھی اندیشہ نہ کیجئے، اور اگر اس کا دوسرا سہ آئے تو) اللہ پر بھروسہ کیجئے اور اللہ کافی کارساز ہے، وہ آپ کو ہر ضرر سے بچائے گا اور اگر تبلیغ میں کوئی ظاہری ضرر پہونچتا ہے وہ باطناً نفع ہوتا ہے، وہ وعدہ کفایت و وکالت کے منافی نہیں)۔



## معارف و مسائل

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم اور آپ کی ایذا رسانی سے بچنے کے لئے ہدایات کے ضمن میں حضرت زید اور زینبؓ کا قصہ اور اس کی مناسبت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا بیان ہوا ہے، آگے بھی آپ کی صفات کمال کا بیان آنے والا ہے۔ اور آپ کی ذات و صفات سب مسلمانوں کے لئے دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہیں، ان کا شکر ادا کرنے کے لئے آیت مذکورہ میں ذکر اللہ کی کثرت کا حکم دیا گیا، ذکر اللہ ایسی عبادت ہو جس کے لئے کوئی شرط نہیں اور اس کے بکثرت کرنے کا حکم ہے کوئی ایسی عبادت عائد نہیں کی جس کی کوئی خاص حد مقرر نہ ہو، نماز پانچ وقت کی اور ہر نماز کی رکعات متعین ہیں، روزے ماہ رمضان کے متعین اور مستر ہیں، حج بھی خاص مقام پر خاص اعمال مقررہ کرنے کا نام ہے، زکوٰۃ بھی سال میں ایک ہی مرتبہ فرض ہوتی ہے، مگر ذکر اللہ ایسی عبادت ہے کہ نہ اس کی کوئی حد اور تعداد متعین ہو، نہ کوئی خاص وقت اور زمانہ مقرر ہو، نہ اس کے لئے کوئی خاص ہیئت قیام یا نشست کی مقرر ہو، نہ اس کے لئے ظاہر اور باطن ہونا شرط ہے۔ ہر وقت ہر حال میں ذکر اللہ بکثرت کرنے کا حکم ہی سفر ہو یا حضر، تندرستی ہو یا بیماری خشکی میں ہو یا دریا میں، رات ہو یا دن ہر حال میں ذکر اللہ کا حکم ہے۔

اسی لئے اس کے ترک میں انسان کا کوئی عذر مسموع نہیں، بجز اس کے عقل و حواس ہی نہ رہیں بے ہوش ہو جاتے، اس کے علاوہ دوسری عبادات میں بیماری اور مجبوری کے حالات میں انسان کو معذور قرار دے کر عبادت میں اختصار اور کمی یا معافی کی رخصتیں بھی ہیں، مگر ذکر اللہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی شرط نہیں رکھی۔ اس لئے اس کے ترک میں کسی حال کوئی عذر مسموع بھی نہیں، اور اس کے فضائل و برکات بھی بیشمار ہیں امام احمد نے حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو خطاب کر کے فرمایا کہ کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتلا دوں جو تمہارے سب اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول ہے، اور تمہارے درجات بلند کرنے والی ہو، اور تمہارے لئے سونے چاندی کے صدقہ و خیرات سے بہتر ہو اور اس سے بھی بہتر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلو اور تمہارا دشمن سے

مقابلہ ہو تم ان کی گروہیں مارو وہ تمہاری، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کونسی چیز اور کونسا عمل ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذِکْرُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ ”یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد (ابن کثیر)

نیز امام حنبل اور ترمذی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دعا سنی ہے جس کو میں کبھی نہیں چھوڑتا،

وہ یہ ہے :

اللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ اَعْظَمُ شُكْرًا وَأَتَمَّ نَصِيحَةً وَأَكْثَرَ ذِكْرًا وَأَحْفَظَ وَصِيَّتَكَ (ابن کثیر)	”یا اللہ مجھے ایسا بنادے کہ میں تیرا شکر بہت کروں اور تیری نصیحت کا تابع رہوں اور تیرا ذکر کثرت سے کیا کروں اور تیری وصیت کو محفوظ رکھوں“
---	--

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا کی کہ ذکر اللہ کی کثرت کی توفیق عطا ہو۔

ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اسلام کے اعمال و فرائض و واجبات تو بہت ہیں، آپ مجھے کوئی ایسی مختصر جامع بات بتلا دیں کہ میں اس کو مضبوطی سے اختیار کر لوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا بِذِكْرِ اللَّهِ تَعَالَى (مسند احمد، ابن کثیر)	”یعنی تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر و تازہ رہنی چاہئے“
---	---

اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا :-

أَذْكُرُ اللَّهَ تَعَالَى حَتَّى يَقُولُوا مَبْجُونٌ (ابن کثیر از مسند احمد)	”یعنی تم اللہ کا ذکر اتنا کرو کہ دیکھنے والے تمہیں دیوانہ کہنے لگیں“
---	---

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں جس میں اللہ کا ذکر نہ آئے تو قیامت کے روز یہ مجلس ان کے لئے حسرت ثابت ہوگی۔ (رواہ احمد، ابن کثیر)

وَسَبَّحُوْهُ بُكْرَةً وَأَصِيْلًا، یعنی اللہ کی پاکی بیان کرو صبح و شام۔ صبح و شام سے مراد یا تو تمام اوقات ہیں، یا پھر صبح و شام کی تخصیص اس لئے ہے کہ ان اوقات



میں ذکر اللہ کی تاکید بھی زیادہ ہے اور برکت بھی۔ ورنہ ذکر اللہ کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص و محدود نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُہٗ ، یعنی جب تم ذکر اللہ کی کثرت کے عادی ہو گئے اور صبح و شام کی تسبیح پر مداومت کرنے لگے تو اس کا اعزاز و اکرام اللہ کے نزدیک یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل فرمائے گا اور اس کے فرشتے تمہارے لئے دعا کریں گے۔

آیت مذکورہ میں لفظ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے اور فرشتوں کے لئے بھی، لیکن مصداق صلوٰۃ کا الگ الگ ہے۔ اللہ کی صلوٰۃ تو یہ ہے کہ وہ رحمت نازل فرمائے، اور فرشتے خود تو کسی کام پر قادر نہیں ان کی صلوٰۃ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے نزول رحمت کی دعا مانگیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صلوٰۃ اللہ کی طرف سے رحمت ہے اور فرشتوں کی طرف سے استغفار یعنی دعا بخیرت، اور باہم ایک دوسرے کی طرف سے دعا۔ لفظ صلوٰۃ ان تینوں معنی کے لئے شامل ہے جو عموم مشترک جائز قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک یہ لفظ معنی میں مشترک ہی، اور تینوں مراد ہیں جو عموم مشترک کو قواعد عربیہ کی رو سے جائز نہیں سمجھتے وہ بطور عموم مجاز کے ان سب معنوں پر لفظ صلوٰۃ کا اطلاق قرار دیں گے۔

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَكَ سَلَامٌ ، یہ اسی صلوٰۃ کی توضیح و تفسیر ہے جو اللہ کی طرف سے مومن بندوں پر ہوتی ہے، یعنی جس روز یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے ملیں گے تو اس کی طرف سے ان کا اعزازی خطاب سلام سے کیا جائے گا یعنی اَسْلَامٌ عَلَيْكُمْ کہا جائے گا۔ اللہ سے ملنے کا دن کو نسا ہو گا ہاں آم راغب وغیرہ نے فرمایا کہ مراد اس سے روز قیامت ہے، اور بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ جنت میں داخلہ کا وقت مراد ہے، جہاں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی سلام پہنچے گا اور سب فرشتے بھی سلام کریں گے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اللہ سے ملنے کا دن موت کا دن قرار دیا ہے کہ وہ دن سارے عالم سے چھوٹ کر صرف ایک اللہ کے سامنے حاضری کا دن ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ملک الموت جب کسی مومن کی رُوح قبض کرنے کے لئے آتا ہے تو اوّل اس کو یہ پیام پہنچاتا ہے کہ تیرے رب نے تجھے سلام کہا ہے۔

اور لفظ بقاء ان تینوں حالات پر صادق ہو اس لئے ان اقوال میں کوئی تضاد و تعارض نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سلام تینوں حالات میں ہوتا ہو۔ (روح المعانی) مسئلہ: اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے باہم ایک دوسرے کا تحیہ لفظ السلام علیکم ہونا چاہئے خواہ بڑی کی طرف سے چھوٹے کے لئے ہو یا چھوٹے کی طرف سے بڑے کے لئے ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَهِيدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا  
وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِآذَانِهِ وَسِرًّا جَانِبِيًّا، یہ پھر عود ہے

کی خاص صفت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفات کمال اور مناقب کی طرف، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ صفات کا ذکر فرمایا۔ شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ سراج منیر، شاہد سے مراد یہ ہے کہ آپ قیامت کے روز امت کے لئے شہادت دیں گے جیسا کہ صحیح بخاری، نسائی، ترمذی وغیرہ میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے ایک طویل حدیث روایت ہے جس کے بعض جملے یہ ہیں کہ قیامت کے روز نوح علیہ السلام پیش ہوں گے تو ان سے سوال کیا جائے گا کہ کیا آپ نے ہمارا پیغام اپنی امت کو پہنچا دیا تھا وہ عرض کریں گے کہ میں نے پہنچا دیا، پھر ان کی امت پیش ہوگی، وہ اس سے انکار کرے گی کہ ان کو اللہ کا کوئی پیغام پہنچا ہو۔ اس وقت حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائیگا کہ آپ جو پیغام حق پہنچانے کا دعویٰ کرتے ہیں اس پر کوئی آپ کا شاہد بھی ہے؟ وہ عرض کریں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت گواہ ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ گواہی میں امت محمدیہ کو پیش کریں گے، یہ امت ان کے حق میں گواہی دے گی، تو امت نوح علیہ السلام ان پر یہ جرح کرے گی کہ یہ ہمارے معاملہ میں کیسے گواہی دے سکتے ہیں، یہ تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، ہمارے زمانے سے بہت طویل زمانے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ اس جرح کا جواب امت محمدیہ سے پوچھا جائے گا، وہ یہ جواب دے گی کہ بیشک ہم اس وقت موجود نہیں تھے، مگر ہم نے اس کی خبر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، جس پر ہمارا ایمان و اعتقاد ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی امت کے اس قول کی تصدیق کے لئے شہادت لی جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شہادت کے ذریعہ اپنی امت کی تصدیق و توثیق فرمائیں گے کہ بیشک میں نے ان کو یہ اطلاع دی تھی۔

اور امت پر شاہد ہونے کا ایک مفہوم عام یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



اپنی اُمت کے سب افراد کے اچھے بُرے اعمال کی شہادت دیں گے۔ اور یہ شہادت اس بناء پر ہوگی کہ اُمت کے اعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر روز صبح و شام اور بعض اوقات میں ہفتہ میں ایک روز پیش ہوتے ہیں، اور آپ اُمت کے ایک ایک فرد کو اس کے اعمال کے ذریعہ پہچانتے ہیں۔ اس لئے قیامت کے روز آپ اُمت کے شاہد بنائے جائیں گے (رواہ ابن المبارک عن سعید بن المسیب، مظہری)

اور مبشر کے معنی بشارت دینے والا، مراد یہ ہو کہ آپ اپنی اُمت کے نیک باشرع لوگوں کو جنت کی خوش خبری سنانے والے ہیں۔ اور مذکور کے معنی ڈرانے والا، مراد یہ ہو کہ آپ اُمت کے لوگوں کو در صورت خلاف ورزی و نافرمانی کے عذاب سے ڈرانے والے بھی ہیں۔

داعی الی اللہ سے مراد یہ ہو کہ آپ اُمت کو اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید اور اطاعت کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔ دَاعِیَاۤیَۤیَ اللہ کو پاؤں کے ساتھ مشروط فرمایا کہ آپ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیں اور ملانے والے اللہ ہی کے اذن و اجازت سے ہیں۔ اس قید و شرط کا اضافہ اس اشارہ کے لئے ہے کہ تبلیغ و دعوت کی خدمت سخت دشوار ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اذن اور اعانت کے بغیر انسان کے بس میں نہیں آسکتی۔ سراج کے معنی چراغ اور منیر کے معنی روشن کرنے والا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچویں صفت اس میں یہ بیان فرمائی گئی کہ آپ روشن کرنے والے چراغ ہیں، اور بعض حضرات نے سراج منیر سے مراد قرآن لیا ہے، مگر نسق کلام سے قریب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے۔

بہیقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ آپ کی صفت داعی الی اللہ تو ظاہر اور زبان کے اعتبار سے ہے، اور سراج منیر آپ کی صفت آپ کے قلب مبارک کے اعتبار سے ہے کہ جس طرح سارا عالم آفتاب سے روشنی حاصل کرتا ہے اسی طرح تمام مومنین کے قلوب آپ کے نور قلب سے منور ہوتے ہیں اسی لئے صحابہ کرام جنہوں نے اس عالم میں آپ کی صحبت پائی وہ ساری اُمت کے افضل داعی قرار پائے کیونکہ ان کے قلوب نے قلب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ عیاناً فیض اور نور حاصل کیا، باقی اُمت کو یہ نور صحابہ کرام کے واسطے سے واسطہ درواسطہ ہو کر پہنچا (انتہی کلام) اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تمام انبیاء خصوصاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے گزرنے کے بعد بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں، انکی

یہ حیات برزخی عام لوگوں کی حیات برزخی سے بدرجہا زیادہ فائق و ممتاز ہوتی ہو جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

بہر حال اس حیات کی وجہ سے قیامت تک مؤمنین کے قلوب آپ کے قلب مبارک سے استفادہ نور کرتے رہیں گے، اور جو جتنی محبت و تعظیم اور درود و شریف کا زیادہ اہتمام کرے گا اس نور کا حصہ زیادہ پائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو چراغ سے تشبیہ دی گئی، حالانکہ آپ کا نور باطن آفتاب کے نور سے کہیں زیادہ ہے، آفتاب سے صرف دنیا کا ظاہر روشن ہوتا ہے لیکن آپ کے قلب مبارک سے سارے جہان کا باطن اور مؤمنین کے قلوب روشن ہوتے ہیں۔ وجہ اس تشبیہ کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ چراغ کی روشنی سے استفادہ خستہ یاری ہے، ہر وقت کر سکتے ہیں، اس تک رسائی بھی آسان ہے، اس کا حاصل کرنا بھی آسان ہے بخلاف آفتاب کے کہ وہاں تک رسائی بھی متعذر ہو اور اس سے استفادہ ہر وقت نہیں کیا جاسکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفات جیسے قرآن میں آئی ہیں قرآن سے پہلے تورات میں بھی مذکور ہیں جیسا کہ امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ حضرت عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ میں ایک روز حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے ملا، تو ان سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات تورات میں آئی ہیں وہ مجھے بتلائیے۔ انھوں نے فرمایا بیشک میں بتلاتا ہوں، خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض صفات جو قرآن میں مذکور ہیں وہ تورات میں بھی موجود ہیں، اور فرمایا:-

اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا ہوا شاہد بنا کر  
اور بشارت دینے والا اور ڈرنے والا  
اور پناہ و حفاظت امین یعنی عرب  
کی آپ میرے بندے اور رسول ہیں  
میں نے آپ کا نام متوکل دے دیا یعنی اللہ  
پر بھروسہ کرنے والا رکھا ہونہ آپ  
تند خو ہیں نہ سخت مزاج اور بازاروں  
میں شور مچانے والے، اور آپ برائی  
کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے، بلکہ معاف  
کر دیتے ہیں، اور آپ کو اللہ تعالیٰ

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا  
وَنَذِيرًا وَحُرًّا لِلْأُمِّيِّينَ  
أَنْتَ عَبْدِي وَرَسُولِي سَمَّيْتُكَ  
الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَقْطٍ وَلَا غَاظٍ  
وَلَا سَخَابٍ فِي الْأَمْوَاتِ  
وَلَا يَدُ فَعِ السَّيِّئَةِ بِالسَّيِّئَةِ  
وَلَكِنْ يَغْفِرُوا وَيَغْفِرُ لَنْ يَقْبِضَهُ  
اللَّهُ تَعَالَى حَتَّى يُقِيمَ بِهِ الْمِلَّةَ  
أَلْعَوْجَاءُ بَأَنْ يَقُولُوا لَا إِلَهَ إِلَّا  
اللَّهُ وَيَفْتَحُ بِهِ أَعْيُنًا عُمْيَا



اِذَا نَكَحْتُمُ امْرَاَتَكُمْ فَاَنْتُمْ بِنُفُسِكُمْ اُولٰٓئِكَ اَدَّبْنَا وَلَٰئِكَ اَمْرٌ عَظِيْمٌ  
 اور نیا سے اُس وقت تک نہیں واپس  
 لائیں گے جب تک کہ آپ کے ذریعہ طیر ہی اُمت کو سیدھا نہ کر دیں کہ وہ لا الہ الا اللہ  
 کہنے لگیں، آپ کے ذریعہ اللہ اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور بند دلوں کو کھول دے گا۔

بنی بنی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ امْرَاَتَكُمْ فَاَنْتُمْ بِنُفُسِكُمْ اُولٰٓئِكَ اَدَّبْنَا وَلَٰئِكَ اَمْرٌ عَظِيْمٌ

اے ایمان والو جب تم نکاح میں لاؤ مسلمان عورتوں کو پھر ان کو چھوڑ دو  
 مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَلُّوْنَ وَنَهَاجٍ  
 پہلے اس سے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ سو ان پر تم کو حق نہیں عدت میں بٹھلانا کہ گنتی پوری کراؤ

فَمَتَّعُوْهُنَّ وَسَرَٰحُهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾

سو ان کو دو کچھ فائدہ اور رخصت کرو بھل طرح سے۔

## خُلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (تمھارے نکاح کے احکام میں سے تو ایک حکم یہ ہے کہ) جب تم  
 مسلمان عورتوں سے نکاح کرو (اور) پھر ان کو قبل ہاتھ لگانے کے (کسی وجہ سے) طلاق  
 دیدو تو تمھاری ان پر کوئی عدت (واجب) نہیں جس کو تم شمار کرنے لگو (تاکہ ان کو اس عدت  
 میں نکاح ثانی سے روک سکو جیسا کہ عدت واجب ہونے کی صورت میں شرعیہ روکنا جائز  
 بلکہ واجب ہے اور جب اس صورت میں عدت نہیں) تو ان کو کچھ (مال) متاع دیدو اور  
 خوبی کے ساتھ ان کو رخصت کر دو اور مومنات کی طرح کتابیات کا بھی یہی حکم ہے،  
 آیت میں مومنات کی قید بطور شرط کے نہیں بلکہ ایک ترغیبی ہدایت ہے، کہ مومن کو اپنی  
 نکاح میں مسلمان عورت ہی کا انتخاب کرنا بہتر ہے۔

اور ہاتھ لگانا کنایہ ہے صحبت سے خواہ حقیقہً یا حکماً، جیسے باہم خلوت صحیح ہو جائے  
 تو یہ بھی صحبت کے حکم میں ہے، اور صحبت حقیقہً ہو یا حکماً دونوں صورتوں میں عدت  
 واجب ہے۔ کذا فی الہدایہ وغیرہ، اور اگر مہر مقرر ہو چکا ہے تو یہ متاع نصف مہر کی ادائیگی  
 ہے۔ اور سراح جمیل یہ ہے کہ ان کو بغیر حق کے نہ روکے، اور جو متاع دینا واجب ہے

وہ ادا کرنے اور دیا ہوا واپس نہ لے، زبان سے بھی کوئی سخت بات نہ کہے۔

## معارف و مسائل

پچھلی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند صفات کمال اور آپ کی مخصوص شان کا ذکر تھا آگے بھی آپ کی ان خصوصیات کا ذکر آنے والا ہے، جو نکاح و طلاق کے معاملات میں آپ کے ساتھ ایک گونہ خصوصیت رکھتی ہیں، اور عام امت کی نسبت سے آپ کو ان میں ایک امتیاز حاصل ہے۔ اس سے پہلے بطور تمہید کے ایک عام حکم متعلقہ طلاق ذکر کیا گیا ہے، جو سب مسلمانوں کے لئے عام ہے۔

آیت مذکورہ میں اس کے متعلق تین احکام بیان کئے گئے ہیں :-

پہلا حکم یہ کہ کسی عورت سے نکاح کر لینے کے بعد خلوت صحیحہ سے پہلے ہی کسی وجہ سے طلاق کی نوبت آجائے، تو مطلقہ عورت پر کوئی عدت واجب نہیں، وہ فوراً ہی دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ آیت مذکورہ ہاتھ لگانے سے مراد صحبت اور صحبت کا حقیقی یا حکمی ہونا اور دونوں کا ایک حکم ہونا خلاصہ تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اور صحبت حکمی خلوت صحیحہ ہو جاتا ہے۔

**دوسرا حکم** یہ ہے کہ مطلقہ عورت کو شرافت اور حسن خلق کے ساتھ کچھ سامان دے کر رخصت کیا جائے، کچھ سامان دے کر رخصت دینا ہر مطلقہ کے لئے مستحب و مسنون ہے اور بعض صورتوں میں واجب ہے۔ جس کی تفصیل خلاصہ تفسیر میں گزر چکی ہے اور سورۃ بقرہ کی آیت لَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ کے تحت میں گزر چکی ہے، اور ان الفاظ قرآنی میں لفظ متاع اختیار فرمانا شاید اس حکمت سے ہو کہ یہ لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے، ہر اس چیز کے لئے جس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس میں عورت کے حقوق واجبہ ہر وغیرہ بھی شامل ہیں کہ اگر اب تک مہر نہ دیا گیا ہو تو طلاق کے وقت خوش دلی سے ادا کر دیں، اور غیر واجب حقوق مثلاً مطلقہ کو رخصت کے وقت کپڑوں کا ایک جوڑا دے کر رخصت کرنا یہ بھی داخل ہے جو ہر مطلقہ عورت کو دینا مستحب (کذا فی المبسوط والمحیط، روح) اس لحاظ سے .... متعویہن کا صیغہ امر عام تر غیب کے لئے ہے، جس میں واجب اور غیر واجب دونوں قسمیں شامل ہیں (روح)

امام حدیث عبد بن حمید نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ متعویہ یعنی متاع



سامان دیتا ہر مطلقہ کے لئے، خواہ اس کے ساتھ خلوت صحیح ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو اور اس کا ہر مقرر ہو یا نہ ہو۔

طلاق کے وقت متعہ | بدائع میں ہے کہ متعہ طلاق سے مراد وہ لباس ہے جو عورت گھر سے نکلنے  
یعنی لباس کی تفصیل | کے وقت ضروری استعمال کرتی ہے۔ اس میں پا جامہ، کرتہ، اور سہنی  
اور ایک بڑی چادر جو سر سے پاؤں تک بدن کو چھپا سکے شامل ہے۔ اور چونکہ لباس قیمت  
کے اعتبار سے اعلیٰ، ادنیٰ، اوسط ہر طرح کا ہو سکتا ہے، اس لئے فقہاء نے اس کی یہ  
تفصیل فرمائی کہ اگر شوہر بیوی دونوں مالدار گھرانوں کے ہیں تو کپڑے اعلیٰ قسم کے دیئے  
جائیں، اور دونوں غریب ہیں تو کپڑے ادنیٰ درجہ کے دیئے جائیں، اور ایک غریب اور  
دوسرا مالدار ہی تو اوسط درجہ کا لباس دیا جائے۔ (کذا قال الخصاف فی النفقات)

اسلام میں حسن معاشرت | دنیا میں حقوق کی ادائیگی عام طور پر صرف دوستوں عزیزوں تک  
کی بے نظیر تعلیم | اور زیادہ سے زیادہ عام لوگوں تک محدود رہتی ہے، حسن اخلاق  
حسن معاشرت کا سارا زور صرف یہیں تک خرچ ہوتا ہے، اپنے مخالف اور دشمن کے  
بھی حقوق پہچاننا اس کے لئے قوانین وضع کرنا صرف شریعت اسلام ہی کا کام ہے۔

اس زمانہ میں اگرچہ حقوق انسانیت کی حفاظت کیلئے دنیا میں بہت سے مستقل ادارے  
قائم کئے گئے ہیں، اور اس کے لئے کچھ ضابطے قاعدے بھی بنائے ہوئے ہیں، اس مقصد  
کے لئے اقوام عالم سے لاکھوں روپیہ کا سرمایہ بھی جمع کیا جاتا ہے، مگر اول تو ان اداروں  
پر سیاسی مقاصد چھائے ہوئے ہیں۔ جو کچھ مصیبت زدگان کی امداد کی جاتی ہے وہ بھی  
بے غرض اور ہرجگہ نہیں، بلکہ جہاں اپنے سیاسی مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ اور بالفرض

یہ ادارے بالکل صحیح طور پر بھی خدمتِ خلق انجام دیں تو ان کی زیادہ سے زیادہ اس وقت  
پہنچ ہو سکتی ہے جب کسی خطہ زمین میں کوئی عام حادثہ طوفان، وبائی امراض وغیرہ کا  
پیش آجائے۔ افراد و احاد کی مصیبت و تکلیف کی کس کو خبر ہوتی ہے، کون مرد کو پہنچ

سکتا ہے، شریعت اسلام کی حکیمانہ تعلیم دیکھے کہ طلاق کا معاملہ ظاہر ہے کہ باہمی مخالفت  
غصے اور ناراضی سے پیدا ہوتا ہے، اور اس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ جو تعلق انتہائی یگانگت

اور محبت و الفت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا وہ اب اس کی نقیض بن کر نفرت، دشمنی، انتقامی  
جذبات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت مذکورہ اور اسی قسم کی بہت سی آیات نے

عین طلاق کے موقع پر جو مسلمان کو ہدایات دی ہیں وہی ایسی ہیں کہ ان میں حسن خلق  
اور حسن معاشرت کا پورا امتحان ہوتا ہے۔ نفس کا تقاضا ہوتا ہے کہ جس عورت نے

ہیں ستایا اذیت دی یہاں تک کہ قطع تعلق پر مجبوری ہوئی اس کو خوب ذلیل کر کے نکالا جائے اور جو انتقام اس سے لیا جاسکتا ہے لے لیا جائے۔

مگر قرآن کریم نے عام مطلقہ عورتوں کے لئے تو ایک بڑی پابندی عدت کی اور ایامِ عدت کو شوہر کے مکان میں گزارنے کی لگادی۔ طلاق دینے والے پر فرض کر دیا کہ اس مدت کے اندر عورت کو اپنے گھر سے نہ نکالے، اور اس کو بھی پابند کر دیا کہ ایامِ عدت میں اس گھر سے نہ نکلے۔ دوسرے شوہر پر فرض کر دیا کہ طلاق دیدینے کے باوجود اس زمانہ عدت کا نفقہ بدستور جاری رکھے۔ تیسرے شوہر کے لئے منتخب کیا کہ عدت پوری ہونے کے بعد بھی جب اس کو رخصت کرے تو متاع یعنی لباس دے کر عدت کے ساتھ رخصت کرے، صرف وہ عورتیں جن کے ساتھ صرف نکاح کا بول پڑھا گیا ہے رخصتی اور خلوت و صحبت کی نوبت نہیں آتی وہ عدت سے مستثنیٰ قرار دی گئیں، لیکن ان کے متاع کی تاکید بہ نسبت دوسری عورتوں کے زیادہ کر دی گئی۔ اسی کے ساتھ

تیسرا حکم یہ دیا گیا کہ سَرَّ حَوْضَہً سَرَّ حَاجِیۡلًا، یعنی ان کو رخصت کر دینوی کے ساتھ، جس میں یہ پابندی لگادی گئی کہ زبان سے بھی کوئی سخت بات نہ کہیں، طعن و تشنیع کا طریقہ اختیار نہ کریں۔

مخالفت کے وقت مخالف کے حقوق کی رعایت وہی کر سکتا ہے جو اپنے نفس کے جذبات پر قابو رکھے، اسلام کی ساری تعلیمات میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الَّتِي أَتَيْتَ أَجُورَهُنَّ

اے نبی، ہم نے حلال رکھیں تجھ کو تیری عورتیں جن کے ہر توڑے چکا ہے،

وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ

اور جو مال ہو تیرے ہاتھ کا جو ہاتھ لگا دے تیرے اللہ اور تیرے چچا کی بیٹیاں

وَبَنَاتِ عَمَّتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَلَّتِكَ الَّتِي هَاجَرْنَ

اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالوں کی بیٹیاں جنہوں نے وطن

مَعَكَ وَأَمْرَآةٌ مُّؤْمِنَةٌ إِنْ وَهَبْتَ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ

چھوڑا تیرے ساتھ اور جو عورت ہو مسلمان اگر بخش دے اپنی جان نبی کو اگر نبی



النَّبِيِّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ط

چاہے کہ اس کو نکاح میں لائے، یہ خاص ہے تیرے لئے سوائے سب مسلمانوں کے،

قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ

ہم کو معلوم ہر جو مقرر کر دیا، ہم نے ان پر ان کی عورتوں کے حق میں اور ان کے ہاتھ کے مال میں

لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرْجٌ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵

تاکہ نہ رہے تجھ پر تنگی اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان ۔

تُرْجَى مِنْ تَشَاءُ مِنْهُمْ وَتُؤْتَى اِلَيْكَ مِنْ تَشَاءُ ط وَمَنْ

پیچھے رکھ دے تو جس کو چاہے ان میں سے اور جگہ دے اپنی پاس جس کو چاہے اور جس کو

اِتَّغَيْتَ مِنْهُمْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ تَقْرَءَ

جی چاہے تیرا ان میں سے جن کو کنارے کر دیا تھا تو کچھ گناہ نہیں تجھ پر اس میں قریب ہے کہ ٹھنڈی

اَعْلٰنُهُمْ وَلَا يَحْزَنَ وَيَرْضَيْنِ بِمَا اَتَيْنَهُنَّ كُلُّهُنَّ ط وَاللّٰهُ

رہیں آنکھیں ان کی اور غم نہ کھائیں اور راضی رہیں اس پر جو تو نے دیا ان سب کی سب کو، اور اللہ

يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ۝۵ لَا يَحِلُّ

جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اور ہے اللہ سب کچھ جانتا والا تحمل والا ۔ حلال نہیں

لَكَ الْبَسَاطَةُ مِنْ بَعْدُ وَلَا اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ

تجھ کو عورتیں اس کے بعد اور نہ یہ کہ ان کے بدلے کرے اور عورتیں

وَلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ط وَكَانَ

اگرچہ خوش لگے تجھ کو ان کی صورت مگر جو مال ہو تیرے ہاتھ کا اور ہے

اللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ۝۶

اللہ ہر چیز پر نگہبان ؛ ؛

## خلاصہ تفسیر

اے نبی! بعض احکام آپ کے ساتھ مخصوص ہیں جن سے آپ کا اختصاص اور شرف

بھی ثابت ہوتا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں احکم اول، ہم نے آپ کے لئے آپ کی یہ بیبیاں  
 (جو کہ اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہیں اور) جن کو آپ انکے مہر سے چمکے ہیں (باوجود چا  
 سے زائد ہونے کے) حلال کی ہیں (حکم دوم) اور وہ عورتیں بھی (خاص طور پر حلال کی ہیں) جو  
 تمہاری ملوکہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو غنیمت میں دلوادی ہیں (اس خاص طور کا بیان ....  
 معارف مسائل میں آئے گا، حکم سوم) اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھوں کی بیٹیاں  
 (مراد اس سے باپ کے خاندان کی بیٹیاں ہیں) اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالائوں  
 کی بیٹیاں (مراد اس سے ماں کے خاندان کی بیٹیاں ہیں، یعنی ان سب کو) بھی (اللہ تعالیٰ نے  
 آپ کے لئے حلال کیا ہے، مگر یہ خاندان کی عورتیں مطلقاً نہیں بلکہ ان میں سے صرف وہی،  
 جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو) ساتھ کا مطلب یہ ہے کہ اس عمل ہجرت میں موافقت  
 کی ہو اور محبت زمانہ کی قید نہیں ہے اور اس قید سے وہ نکل گئیں جو مہاجرین ہوں،  
 حکم چہارم) اور اس مسلمان عورت کو بھی (آپ کے لئے حلال کیا) جو بلا عوض (یعنی بلا مہر)  
 اپنے کو پیغمبر کو دیدے (یعنی نکاح میں آنا چاہے، بشرطیکہ پیغمبر اس کو نکاح میں لانا چاہے  
 اور مسلمان کی قید سے کافرہ نکل گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے نکاح درست  
 نہ تھا، اور یہ حکم پنجم) یہ سب (احکام) آپ کیلئے مخصوص ہو گئے ہیں نہ اور مؤمنین کیلئے کہ انکے لئے اور احکام ہیں چنانچہ  
 ہم کو وہ احکام معلوم ہیں (اور آیات و احادیث کے ذریعہ اور ذکر بھی معلوم کر دیتے ہیں) جو ہم نے ان (عام مؤمنین)  
 پر ان کی بیبیوں اور لونڈیوں کے بارے میں مقرر کئے ہیں (جو ان احکام سے متماثر اور متخالف  
 ہیں جن میں سے نمونہ کے طور پر ایک اور بھی آیت اِذَا نَكَحْتُم مِّنْ ذٰلِكُم مَّوَدَّعًا فَسَتَعَوَّذُوهُنَّ مِّنْ مَّهْرٍ لَّزِيْمٍ ہر نکاح کے لئے ثابت ہوتا ہے خواہ حقیقتاً یا حکماً، اور خواہ باہم  
 قرار داد سے ہو یا شرعی حکم سے۔ اور نکاح نبوی حکم چہارم میں مہر سے خالی ہے اور یہ اختصاص  
 اس لئے ہے) تاکہ آپ پر کسی قسم کی تنگی (واقع) نہ ہو (پس جن احکام مخصوصہ میں اوروں سے  
 توسیع ہے جیسے حکم اول و چہارم، ان میں تو تنگی نہ ہونا ظاہر ہے اور جن میں ظاہراً تنقید و  
 تصدیق ہے جیسے حکم سوم اور پنجم وہاں تنگی نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے یہ قید آپ  
 کے بعض مصالح کے لئے لگائی ہے اگر یہ قید نہ ہوتی تو آپ کی وہ مصلحت فوت ہو جاتی اور  
 اس وقت آپ کو تنگی ہوتی جو ہم کو معلوم ہے، اس لئے رعایت اس مصلحت کی گئی تاکہ وہ  
 تنگی محتمل واقع نہ ہو اور حکم دوم کے متعلق معارف و مسائل میں آوے گی) اور رفع حرج  
 کی رعایت کچھ اپنی احکام مختصہ ہی میں نہیں ہے بلکہ عام مؤمنین کے متعلق جو احکام ہیں  
 ان میں بھی یہ امر ملحوظ رکھو کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (پس رحمت سے احکام میں



سہولت کی رعایت فرماتے ہیں، اور سہل احکام میں بھی کوتاہی ہو جانے پر احیاناً مغفرت فرماتے ہیں جو دلیل غایت رحمت ہی ہو بنا۔ ہے سہولت احکام و رفع حرج کی اور یہ تو بیان تھا ان عورتوں کی اقسام کا جو آپ کے لئے حلال کی گئیں، آگے اس کا بیان ہو کہ جو اقسام حلال کی گئیں ہیں ان میں سے جتنی جس وقت آپ کے پاس ہوں ان کے کیا احکام ہیں پس حکم ششم یہ ارشاد ہو کہ (ان میں سے آپ جس کو چاہیں) (اور جب تک چاہیں) اپنے سے دور رکھیں (یعنی اس کو باری نہ دیں) اور جس کو چاہیں (اور جب تک چاہیں) اپنے نزدیک رکھیں (یعنی اس کو باری دیں) اور جن کو دور کر رکھا تھا ان میں سے پھر کسی کو طلب کریں تب بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں (مطلب یہ ہوا کہ ازواج میں شب ناشی کی باری وغیرہ کی رعایت آپ پر واجب نہیں اور اس میں ایک بڑی ضروری مصلحت ہے وہ یہ کہ) اس میں زیادہ توقع ہے کہ ان (بیبیوں) کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی (یعنی خوش رہیں گی) اور آزرہ خاطر نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی آپ ان کو دیدیں گے اُس پر سب کی سب راضی رہیں گی (کیونکہ بنا رنج کی عادت دعویٰ استحقاق کا ہوتا ہے، اور جب معلوم ہو جائے کہ جو کچھ مال یا توجہ مبذول ہوگی وہ تبرع محض ہی، ہمارا حق واجب نہیں ہو تو کسی کو کوئی شکایت نہ رہے گی، اور لونڈیوں کا حق باری میں نہ ہونا سب ہی کو معلوم ہے) اور راے مسلمانوں! یہ احکام مختصہ سن کر دل میں یہ خیالات مت پکالینا کہ یہ احکام عام کیوں ہوئے اگر ایسا کرو گے تو خدا تعالیٰ کو تم لوگوں کے دلوں کی سب باتیں معلوم ہیں (ایسا خیال پکالنے پر تم کو سزا دے گا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد ہی جو موجب تعذیب ہو) اور اللہ تعالیٰ (یہی کیا) سب کچھ جاننے والا ہے (اور معترضین کو جو عاجلاً سزا نہیں ہوئی تو اس سے نفی علم لازم نہیں آتی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) بردبار (بھی) ہے (اس لئے کبھی سزا میں ڈھیل دیتا ہے، آگے بقیہ احکام مختصہ بحضرة الرسالة ارشاد فرماتے ہیں جن میں بعض تو احکام بالا کا نتیجہ ہیں اور بعض جدید ہیں، پس ارشاد ہے کہ اوپر جو حکم سوم و پنجم میں منکوحہ عورتوں میں ہجرت اور ایمان کی قید لگائی ہے سو) ان کے علاوہ اور عورتیں (جن میں یہ قید نہ ہو) آپ کے لئے حلال نہیں ہیں (یعنی اہل قرابت میں سے غیر مہاجرات حلال نہیں اور دوسری عورتوں میں سے غیر مومنات حلال نہیں، یہ تو تہمت ہوا حکم بالا کا، اور آگے حکم ہفتم جدید ہو کہ) نہ یہ درست ہے کہ آپ ان (موجودہ) بیبیوں کی جگہ دوسری بیبیاں کر لیں (اس طرح سے کہ ان میں سے کسی کو طلاق دیدیں اور بجاتے

ان کی دوسری کر لیں اور یوں بدون ان کے طلاق دیئے ہوئے اگر کسی سے نکاح کر لیں تو اس کی ممانعت نہیں اسی طرح اگر بلا قصد تبدل کسی کو طلاق دیدیں تو اس کی بھی ممانعت ثابت نہیں، بلکہ لفظ تبدل اس مجموعہ کی ممانعت پر دال ہے، پس یہ تبدل ممنوع ہے، اگرچہ آپ کو ان (دوسریوں) کا حسن اچھا معلوم ہو مگر جو آپ کی مملوکہ ہو کہ وہ حکم پنجم اور ہفتم دونوں سے مستثنیٰ ہے، یعنی وہ کتابیہ ہونے پر بھی حلال ہے، اور اس میں تبدل بھی درست ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کی حقیقت اور آثار و مصالح کا پورا نگران ہے اس لئے ان سب احکام میں مصالحتیں و حکمتیں ہیں گو عام مکلفین کو وہ تعیناً نہ بتلائی جائیں، اس واسطے کسی کو سوال یا اعتراض کا منصب مستحق نہیں۔

## معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں نکاح و طلاق وغیرہ سے متعلق اُن سات احکامات کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہیں۔ اور یہ خصوصیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک امتیازی شان اور خصوصی اعزاز کی علامت ہیں، ان میں سے بعض احکام تو ایسے ہیں کہ اُن کی خصوصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بالکل واضح اور جلی ہے اور بعض ایسے ہیں جو اگرچہ سب مسلمانوں کے لئے عام ہیں مگر ان میں کچھ قیدیں شرطیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہیں، اب ان کی تفصیل دیکھئے۔

پہلا حکم اِذَا أَحَلَّلْنَا لَكَ أَثْرًا وَاجَلَكَ الَّتِي آتَيْتَ أَجُورَهُنَّ، یعنی ہم نے حلال کر دیا آپ کے لئے آپ کی سب موجودہ ازواج کو جن کے ہر آپ نے ادا کر دیئے ہیں، یہ حکم بظاہر سبھی مسلمانوں کے لئے عام ہے، مگر اس میں وجہ خصوصیت یہ ہے کہ نزولِ آیت کے وقت آپ کے نکاح میں چار سے زیادہ عورتیں موجود تھیں اور عام مسلمانوں کے لئے چار سے زائد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حلال نہیں، تو یہ آپ کی خصوصیت تھی کہ چار سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں رکھنا آپ کے لئے حلال کر دیا گیا۔

اور اس آیت میں جو الَّتِي آتَيْتَ أَجُورَهُنَّ، فرمایا ہے یہ کوئی قید احترازی یا شرطِ حلت نہیں بلکہ واقعہ کا اظہار ہے کہ جتنی عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں آپ نے سب کا ہر نقد ادا کر دیا اُدھار نہیں رکھا۔ آپ کی عادتِ شریفیہ یہ تھی کہ جس چیز کا دینا آپ کے ذمہ عائد ہو اس کو فوراً دیکر سبکدوش ہو جاتے تھے،



بلا ضرورت تاخیر نہ فرماتے تھے۔ اس واقعہ کے اظہار میں عام مسلمانوں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب ہے۔

**دوسرا حکم:** وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا آفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ، یعنی آپ کے لئے حلال کر دیا ان عورتوں کو جو آپ کی ملک میں ہوں اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کا مالک بنا دیا ہو اس آیت میں لفظ آفآء، فئی سے مشتق ہے۔ اصطلاحی معنی کے لحاظ سے وہ مال جو کفار سے بغیر جنگ کے یا بطور مصالحت کے حاصل ہو جائے، اور کبھی مطلق مال غنیمت کو بھی لفظ فئی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں اس کا ذکر کسی شرط کے طور پر نہیں کہ آپ کے لئے صرف وہ کنیز حلال ہوگی جو مال فئی یا غنیمت میں سے آپ کے حصہ میں آئی ہو، بلکہ جس کو آپ نے قیمت دے کر خریدا ہو وہ بھی اس حکم میں شامل ہے۔

لیکن اس حکم میں بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اختصاص و امتیاز نہیں، پوری امت کے لئے یہ حکم ہے، جو کنیز مال غنیمت سے حصہ میں آئے یا جس کی قیمت دے کر خریدیں وہ ان کے لئے حلال ہے، اور بظاہر سیاق ان تمام آیات کا یہ چاہتا ہے کہ ان میں جو احکام آئے ہیں وہ کچھ نہ کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہوں۔ اسی لئے روح المعانی میں کنیزوں کی حلت سے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ جس طرح آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات میں سے کسی کا نکاح کسی امتی سے حلال نہیں۔

اسی طرح جو کنیز آپ کے لئے حلال کی گئی ہے آپ کے بعد وہ کسی کے لئے حلال نہ ہوگی، جیسا کہ حضرت ماریہ قبطیہؓ ہیں جن کو مقوقس بادشاہ روم نے آپ کے لئے بطور ہدیہ بھیجا تھا۔ تو جس طرح آپ کی وفات کے بعد ازواج مطہرات کا نکاح کسی سے جائز نہیں تھا ان کا بھی نکاح کسی سے جائز نہیں رکھا گیا۔ اس لحاظ سے مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ کے حلال ہونے میں بھی آپ کی ایک خصوصیت ثابت ہو گئی۔

اور سیدی حضرت حکیم الامتہ قدس سرہ نے اور دو خصوصیتیں بیان القرآن میں بیان فرمائی ہیں، جو مذکورہ خصوصیت سے زیادہ واضح ہیں:

اول یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ اختیار خصوصی دیا گیا تھا کہ مال غنیمت کو تقسیم کرنے سے پہلے آپ اس میں سے کسی چیز کا اپنے لئے انتخاب فرمائیں تو وہ آپ کی ملک خاص ہو جاتی تھی، اس خاص چیز کو اصطلاح میں صفی النبی کہا جاتا تھا، جیسا کہ غزوہ خیبر کی غنیمت میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت صفیہ کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا تو ملک یمن کے مسئلہ میں یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دارالحرب سے کسی غیر مسلم کی طرف سے اگر کوئی ہدیہ مسلمانوں کے امیر المؤمنین کے نام پر آئے تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کا مالک امیر المؤمنین نہیں ہوتا بلکہ وہ بیت المال شرعی کی ملک قرار دیا جاتا ہے، بخلاف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ایسا ہدیہ آپ کے لئے خصوصیت سے حلال کر دیا گیا، جیسا ماریہ قبطیہ کا معاملہ ہے کہ مقوقس نے ان کو بطور ہدیہ تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، تو یہ آپ ہی کی ملک قرار پائیں۔ واللہ اعلم

**تیسرا حکم:** بَنَتْ عَمَلًا وَبَنَتْ عَمَلًا الْاِیۡۃ، اس آیت میں عَم اور خال کو مفرد اور عَمَات اور خَالَات کو جمع لانے کی توجیہات علماء نے بہت لکھی ہیں، تفسیر روح المعانی نے ابو حیان کی اس توجیہ کو اختیار کیا ہے کہ محاورہ عرب کا اسی طرح ہے، اشعار عرب اس پر شاہد ہیں کہ عَم کی جمع استعمال نہیں کرتے مفرد ہی استعمال ہوتا ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ آپ کے لئے چچا اور بھوپھی کی لڑکیاں اور داموں خالہ کی لڑکیاں حلال کر دی گئیں، چچا بھوپھی میں باپ کے خاندان کی سب لڑکیاں اور داموں خالہ میں ماں کے خاندان کی سب لڑکیاں شامل ہیں، اور ان سے نکاح کا حلال ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں، سب مسلمانوں کا یہی حکم ہے۔ لیکن ان میں یہ قید کہ انھوں نے آپ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے ہجرت کی ہو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ عام اُمت کے لئے تو باپ اور ماں کے خاندان کی یہ لڑکیاں بغیر کسی شرط کے حلال ہیں، خواہ انھوں نے ہجرت کی ہو یا نہ کی ہو، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان میں سے صرف وہ حلال ہیں جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو۔ ساتھ ہجرت کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ سفر میں آپ کی معیت رہی ہو یا ایک ہی وقت میں ہجرت کی ہو، بلکہ مراد نفیس ہجرت میں معیت و موافقت ہے۔ ان میں سے جن نے کسی وجہ سے ہجرت نہیں کی اس سے آپ کا نکاح حلال نہیں رکھا گیا، جیسا کہ آپ کے چچا ابو طالب کی بیٹی اُمّ ہانیؓ نے فرمایا کہ مجھ سے آپ کا نکاح اس لئے حلال نہیں تھا کہ میں نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی، بلکہ میرا شمار طلقاء میں تھا۔ طلقاء اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کو فتح مکہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر دیا تھا نہ قتل کیا نہ غلام بنایا۔ (روح وجصاص)



اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے لئے مہاجرات کی شرط صرف انہی ماں باپ کے خاندان کی لڑکیوں میں تھی، عام امت کی عورتوں میں ہجرت کی شرط نہ تھی، بلکہ ان کا صرف مسلمان ہونا کافی تھا۔ اور خاندان کی لڑکیوں میں ہجرت کی شرط لگانے میں شاید یہ حکمت ہو کہ عموماً خاندان کی لڑکیوں کو اپنے خاندان کا ایک ناز اور فخر ہوتا ہے، اور رسول کی زوجیت کے لئے یہ شایان شان نہیں، اس کا علاج ہجرت کی شرط سے کیا گیا۔ کیونکہ ہجرت صرف وہی عورت کرے گی جو اللہ و رسول کی محبت کو اپنے سارے خاندان اور وطن و جا تہیاد کی ہجرت سے غالب رکھے۔ نیز ہجرت کے وقت انسان کو طرح طرح کی تکلیفیں پیش آتی ہیں اور اللہ کی راہ میں جو تکلیف و مشقت اٹھانی جائے اس کو اصلاح اعمال میں خاص دخل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ کے خاندان کی لڑکیوں سے نکاح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک خصوصی شرط یہ ہے کہ انھوں نے مکہ سے ہجرت کرنے میں آپ کا ساتھ دیا ہو۔

**چوتھا حکم:** وَأَمَّا الْمُؤْمِنَاتُ إِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهُنَّ لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لِّكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ، یعنی اگر کوئی مسلمان عورت اپنے نفس کو آپ کے لئے ہبہ کر دے، یعنی بغیر مہر کے آپ سے نکاح کرنا چاہے، اگر آپ اس سے نکاح کا ارادہ کریں تو آپ کے لئے بلا مہر کے بھی نکاح حلال ہے، اور یہ خاص حکم آپ کے لئے ہے دوسرے مؤمنین کے لئے نہیں ۱۱

اس معاملہ کی خصوصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بالکل واضح ہے کیونکہ عام لوگوں کے لئے نکاح میں ہر شرط لازم ہے، یہاں تک کہ اگر بوقت نکاح کسی مہر کا ذکر نہ ہو یا نفی کے ساتھ آیا کہ عورت نے کہا کہ مہر نہیں لوں گی، یا مرد نے کہا کہ نکاح اس شرط پر کرتے ہیں کہ مہر نہیں دیں گے، دونوں صورتوں میں ان کا کہنا اور شرط شرعی حیثیت سے لغو ہوگی، اور شرعاً مہر مثل واجب ہوگا۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نکاح بلا مہر حلال کیا گیا ہے جبکہ عورت بلا مہر نکاح کرنے کی خواہش مند ہو۔

**فائدہ:** یہ حکم کہ جو عورت آپ کے لئے اپنے آپ کو ہبہ کر دے، یعنی بلا مہر کے نکاح کرنا چاہے وہ آپ کے لئے حلال ہے، اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کوئی ایسا واقعہ پیش بھی آیا یا نہیں؟ بعض نے فرمایا کہ کسی ایسی عورت سے رسول اللہ علیہ وسلم کا نکاح کرنا ثابت نہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے کسی ہبہ کرنے والی عورت سے نکاح نہیں کیا، اور بعض حضرات نے بعض ایسی عورتوں سے نکاح ہونا ثابت کیا ہے (روح المعانی)

اس حکم کے ساتھ جو جملہ نَحَائِصَہٗ لَکَ کا آیا ہے، اس کو بعض حضرات نے صرف اسی حکم چہارم کے ساتھ مخصوص کہا ہے، اور زنجیری وغیرہ مفسرین نے اس جملے کو ان تمام احکام کے ساتھ لگایا ہے جو اد پر مذکور ہوئے ہیں کہ یہ سب خصوصیات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں۔ اس کے آخر میں فرمایا لَکِیْلًا یَّکُوْنُ عَلَیْکَ حَرْجٌ، یعنی یہ خصوصی احکام آپ کے لئے اس لئے دیئے گئے ہیں کہ آپ پر کوئی تنگی نہ ہو۔ جو احکام مخصوصہ اد پر بیان ہوئے ہیں ان میں پہلا حکم یعنی چار سے زائد بیبیاں آپ کے لئے حلال کر دی گئیں اور حکم چہارم کہ بغیر مہر کے نکاح حلال کر دیا گیا، ان میں تو تنگی کا رفع کرنا اور مزید سہولت دیا جاتا ظاہر ہے، مگر باقی تین حکم یعنی دوم و سوم اور پنجم ان میں تو بظاہر آپ پر کچھ مزید قیدیں لگا دی گئیں جن سے تنگی اور بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر اس میں اشارہ فرمادیا کہ اگرچہ ظاہر میں یہ قیدیں ایک تنگی بڑھاتی ہیں، مگر ان میں آپ کی ایسی مصلحتوں کی رعایت ہے کہ یہ قیدیں نہیں تو آپ کو بڑی تکلیف پیش آتی جو ضیق قلب کا سبب بنتیں، اس لئے قید زائد میں بھی آپ کی تنگی رفع کرنا ہی مقصود ہے۔

پانچواں حکم جو آیات مذکورہ میں مؤمنہ کی قید سے مستفاد ہوتا ہے یہ کہ اگرچہ عام مسلمانوں کے لئے یہود و نصاریٰ کی عورتوں یعنی کتابیات سے نکاح منہ قرآن حلال ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عورت کا مؤمن ہونا شرط ہے، کتابیات سے آپ کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

ان پانچوں احکام کی خصوصیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیان فرماتے کے بعد عام مسلمانوں کا حکم اجمالاً ذکر فرمایا ہے، قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَیْہِمُ فِیْ دِیْنِہُمْ وَ مَا مَنَعَتْ اَیْمَانُہُمْ، یعنی احکام مذکورہ آپ کے لئے مخصوص ہیں، باقی مسلمانوں کے نکاح کے لئے جو ہم نے فرض کیا ہے وہ ہم جانتے ہیں، مثلاً عام مسلمانوں کا نکاح بغیر مہر کے نہیں ہو سکتا، اور کتابیات سے ان کا نکاح ہو سکتا ہے اسی طرح سابقہ احکام میں جو قیدیں شرطیں آپ کے نکاح کے لئے ضروری قرار دی گئی ہیں وہ اوروں کے لئے نہیں ہیں۔

آخر میں فرمایا لَکِیْلًا یَّکُوْنُ عَلَیْکَ حَرْجٌ، یعنی نکاح کے معاملے میں آپ کے لئے یہ خصوصی احکام اس لئے ہیں کہ آپ پر کوئی تنگی نہ ہو، اور جو قیدیں شرطیں آپ پر نسبت دوسرے مسلمانوں کے زائد لگائی گئی ہیں اگرچہ بظاہر وہ ایک قسم کی تنگی ہے مگر جن مصالح اور حکمتوں کے پیش نظر آپ کے لئے یہ شرطیں لگائی ہیں ان میں



غور کریں تو وہ بھی آپ کی روحانی پریشانی اور تنگ دلی کو دور کرنے ہی کے لئے ہیں۔ یہاں تک نکاح کے متعلق پانچ احکام آئے ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی نہ کوئی خصوصیت رکھتے ہیں۔ آگے دو حکم ایسی پانچ احکام سے متعلق بیان فرمائی ہیں مثلاً چھٹا حکم: مَرْجُوٌّ مِّنْ تَشَاءُ مِنْهُمْ وَتَوَدُّنِي إِلَيْكَ مِّنْ تَشَاءُ، ترجمہ جی، ارجاء سے مشتق ہے، جس کے معنی مؤخر کرنے کے ہیں، اور تَوَدُّنِي، ایوار سے مشتق ہے جس کے معنی قریب کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو اختیار ہے کہ ازواج مطہرات میں سے جس کو چاہیں مؤخر کر دیں جس کو چاہیں اپنے قریب کریں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص حکم ہے، عام امت کے لوگوں کے لئے جب متعدد بیویاں ہوں تو سب میں برابری کرنا ضروری ہے، اس کے خلاف کرنا حرام ہے۔ برابری سے مراد نفقہ کی برابری اور شب باشی میں برابری ہے کہ جتنی راتیں ایک بیوی کے ساتھ گزاریں اتنی دوسری اور تیسری کے ساتھ گزارنا چاہئے، کمی بیشی ناجائز ہے۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاملے میں مکمل اختیار دیدیا گیا سب ازواج میں برابری کے حکم سے مستثنیٰ کر دیا گیا، اور آخر آیت میں یہ بھی اختیار دیدیا کہ جس بی بی سے ایک مرتبہ اجتناب کا ارادہ کر لیا پھر اگر چاہیں تو اس کو پھر قریب کر سکتے ہیں، وَمِنْ أَيْتَحَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ کا یہی مطلب ہے۔

حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعزاز بخشا کہ ازواج مطہرات میں برابری کرنے کے حکم سے مستثنیٰ فرما دیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس استثناء و اجازت کے باوجود اپنے عمل میں ہمیشہ برابری کرنے کا التزام ہی فرمایا۔ امام ابو بکر جصاصؓ نے فرمایا کہ حدیث کی روایت یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے نزول کے بعد بھی ازواج مطہرات میں برابری کی رعایت ہمیشہ رکھتے تھے، پھر انہی اسناد کے ساتھ حضرت صدیقہ عائشہؓ سے یہ حدیث نقل کی جو مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابوداؤد وغیرہ میں بھی موجود ہے:

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْسِمُ فَيَعْدِلُ فَيَقُولُ  
اللَّهُمَّ هَذَا قِسْمِي فِيمَا  
أَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِي فِيمَا لَا  
أَمْلِكُ قَالَ أَبُو دَاوُدَ يَعْنِي الْقَلْبَ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب ازواج میں برابری فرماتے تھے اور یہ عار کیا کرتے تھے کہ یا اللہ جس چیز میں میرا اختیار ہے اس میں تو میں نے برابری کر لی یعنی نفقہ اور شب باشی وغیرہ میں، مگر جس میں میرا اختیار نہیں اس میں

اور صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی بی بی کی نوبت میں ان کے یہاں جانے سے کوئی عذر ہو تو آپ اس سے اجازت لیتے تھے، جب کہ یہ آیت بھی نازل ہو چکی تھی، تَوَدَّیْ اَکْثِلُکَ الْاٰیَۃِ (جس میں — بیویوں میں برابری کرنے کا فرض آپ سے معاف کر دیا گیا)۔

یہ حدیث بھی سب کتب حدیث میں معروف ہے، کہ مرض وفات میں جب آپ کو ازواجِ مطہرات کے گھروں میں روزانہ منتقل ہونا مشکل ہو گیا تو آپ نے سب سے اجازت حاصل کر کے حضرت صدیقہ عائشہؓ کے بیت میں بیماری کے دن گزارنا اختیار فرمایا تھا۔

انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جن کاموں میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی رخصت آپ کی آسانی کے لئے دی جاتی تھی تو اس کی مشکر گزاری کے طور پر آپ عموماً عریضت پر عمل کرتے اور رخصت کو صرف ضرورت کے وقت استعمال فرماتے تھے۔

ذٰلِکَ اَدْنٰی اَنْ تَقْرَءَ عَلَیْہِمْ وَاَنْ یَّحْزَنَ وَیُوضِیْعَ الْاٰیَۃِ یہ حکم ششم یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ازواجِ مطہرات میں برابری کی فرضیت کا اٹھا دینا اور آپ کو ہر طرح کا اختیار دیدینا، اس کی علت و حکمت کا بیان ہے۔ آپ کو یہ عام اختیار دینے کی مصلحت یہ ہے کہ سب ازواجِ مطہرات کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ اپنے حصہ پر راضی رہیں۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ حکم تو بظاہر ازواجِ مطہرات کی مرضی اور منشا کے خلاف ادران کے رخ کا سبب ہو سکتا ہے، اس کو ازواج کی خوشی کا سبب کیسے قرار دیا گیا؟ اس کا جواب خلاصہ تفسیر میں اوپر آچکا ہے کہ دراصل ناراضی کا اصل سبب اپنا استحقاق ہوتا ہے، جس شخص کے متعلق انسان کو یہ معلوم ہو کہ میرا فلاں حق اس کے ذمہ واجب ہے، اگر وہ اس کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو بخ و غم پیش آتا ہے اور جس شخص پر ہمارا کوئی حق واجب نہ ہو پھر وہ جو کچھ بھی ہربانی کرے وہ خوشی ہی خوشی ہوتی ہے، یہاں بھی جب یہ بتلا دیا گیا کہ ازواج میں برابری کرنا آپ پر واجب نہیں، بلکہ آپ مختار ہیں تو اب جس بی بی کو جتنا حصہ بھی آپ کی توجہ اور صحبت کا ملے گا، وہ اس کو ایک احسان و تبرع سمجھ کر خوش ہوگی۔

آخر میں فرمایا وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَ کَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا



یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اور وہ بڑے علم والا بڑے حلم والا ہے۔ آیات مذکورہ میں اوپر سے یہاں تک ان احکام کا ذکر چلا آتا ہے جو دربارہ نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی طرح کی خصوصیت رکھتے ہیں، آگے بھی ایسے ہی بعض احکام کا بیان آرہا ہے، درمیان میں یہ آیت کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کا حال جانتا ہے اور علیم حلیم ہے، بظاہر ماقبل اور مابعد سے کوئی جوڑ نہیں رکھتا۔ روح المعانی میں فرمایا کہ احکام مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چار سے زیادہ ازواج کی اجازت اور بلا جہر کے نکاح کی اجازت سے کسی کے دل میں شیطانی وساوس پیدا ہو سکتے تھے، اس لئے درمیان میں اس آیت نے یہ ہدایت دیدی کہ مسلمان اپنے دلوں کی ایسے وساوس سے حفاظت کریں، اور اس پر ایمان کو بچتے کریں کہ یہ سب خصوصیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں جو بہت سی حکمتوں اور مصالح پر مبنی ہیں، نفسانی خواہشات کی تکمیل کا یہاں گزر نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعداء اسلام نے ہمیشہ مسئلہ تعدد ازواج اور خصوصاً کی زاپاد زندگی اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرت ازواج کو اسلام کی مخالفت میں موضوع بحث بنایا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کو سامنے رکھا جائے تو کسی شیطان کو بھی شان رسالت کے خلاف وسوسہ پیدا کرنے کی گنجائش نہیں رہتی جس سے ثابت ہے کہ آپ نے سب سے پہلا نکاح پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے کیا، جو بیوہ سن رسیدہ صاحب اولاد اور دو شوہروں کے نکاح میں رہنے کے بعد آئی تھیں، اور پچاس سال کی عمر تک صرف اسی ایک سن رسیدہ بیوی کے ساتھ شباب کا پورا زمانہ گزارا۔ یہ پچاس سالہ دور عمر مکہ کے لوگوں کے سامنے گزرا۔ چالیس سال کی عمر میں اعلان نبوت کے بعد شہر میں آپ کی مخالفت شروع ہوئی، اور مخالفین نے آپ کے ستانے اور آپ پر عیب لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ساحر کہا، شاعر کہا، مجنون کہا، مگر کبھی کسی دشمن کو بھی آپ کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرنے کا موقع نہیں مل سکا، جو تقویٰ و طہارت کو مشکوک کر سکے۔

پچاس سال عمر شریف کے گزرنے اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضرت سودہؓ نکاح میں آئیں یہ بھی بیوہ تھیں۔

ہجرت مدینہ اور عمر شریف چوں سال ہو جانے کے بعد سلسلہ ہجری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کی رخصتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہوئی۔ اس کے ایک سال بعد حضرت حفصہؓ سے اور کچھ دنوں کے بعد حضرت زینب بنت خزیمہ سے نکاح ہوا۔ یہ

حضرت زینبؓ چند ماہ کے بعد وفات پا گئیں۔ سلسلہ ہجری میں حضرت ام سلمہؓ جو صاحبہ اولاد بیوہ تھیں آپ کے نکاح میں آئیں۔ سلسلہ ہجری میں حضرت زینب بنت جحش سے حکم خداوندی نکاح ہوا جس کا ذکر سورۃ احزاب کے شروع میں آچکا ہے۔ اُس وقت آپ کی عمر شریف اٹھاون سال تھی۔ آخری پانچ سال میں باقی ازواجِ مطہراتؓ آپ کے حرم میں داخل ہوئیں۔ پیغمبر کی خانگی زندگی اور گھریلو معاملات سے متعلق احکام دین کا ایک بہت بڑا حصہ ہوتے ہیں۔ ان نو ازواجِ مطہرات سے جس قدر دین کی اشاعت ہوئی اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف حضرت صدیقہ عائشہؓ سے دو ہزار دوسو دس احادیث اور حضرت ام سلمہؓ سے تین سو اڑسٹھ احادیث کی روایت معتبر کتبِ حدیث میں جمع ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ نے جو احکام و فتاویٰ لوگوں کو بتلائے ان کے متعلق حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے، دوسو سے زیادہ حضرات صحابہ حضرت صدیقہ عائشہؓ کے شاگرد ہیں، جنہوں نے حدیث اور فقہ و فتاویٰ ان سے سیکھے ہیں۔

اور بہت سی ازواج کو حرمِ نبویؐ میں داخل کرنے میں ان کے خاندان کو اسلام کی طرف لانے کی حکمت بھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اس اجمالی نقشہ کو سامنے رکھیں تو کیا کسی کو یہ کہنے کی گنجائش رہ سکتی ہے کہ یہ تعدد اور کثرت ازواجِ معاذ اللہ کسی نفسانی اور جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے ہوا تھا، اگر یہ ہوتا تو ساری عمر تہجد یا ایک بیوہ کے ساتھ گزارنے کے بعد عمر کے آخری حصہ کو اس کام کے لئے کیوں منتخب کیا جاتا۔ یہ مضمون پوری تفصیل کے ساتھ، نیز اصل مسئلہ تعدد ازواج پر شرعی اور عقلی فطری اور اقتصادی حیثیت سے مکمل بحث معارف القرآن جلد دوم سورۃ نساء کی تیسری آیت کے تحت میں آچکی ہے وہاں دیکھا جائے (معارف جلد دوم، ص ۲۸۵ تا ۲۹۲)

سَاوَالِکُمْ لَا یَجِیْلُ لَکَ الْیَسَاءُ مِنْ بَعْدِ ذَٰلَکَ اِنَّ تَبَدُّلَ بَیِّنٍ مِنْ اَزْوَاجٍ وَ تَوَآخُجَ بَیْنَکُمْ حُسْنٌ، یعنی اس کے بعد آپ کے لئے دوسری عورتوں سے نکاح حلال نہیں، اور یہ بھی حلال نہیں کہ موجودہ ازواج میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بدلیں۔

اس آیت میں لفظ مِنْ بَعْدِ کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ مِنْ بَعْدِ سے مراد یہ کہ بعد اُن نو عورتوں کے جو اس وقت آپ کے نکاح میں ہیں، اور کسی سے آپ کا نکاح حلال نہیں، بعض صحابہ اور ائمہ تفسیر سے بھی یہی تفسیر منقول ہے، جیسا کہ حضرت انسؓ نے



فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو اختیار دیا کہ دنیا طلبی کے لئے آپ سے جدائی اختیار کریں یا پھرتنگی و فراخی جو کچھ پیش آئے اس پر قناعت کر کے آپ کی زوجیت میں رہیں تو سب ازواج مطہرات نے اپنے نفقہ کی زیادتی کے مطالبہ کو چھوڑ کر اسی حال میں زوجیت کے اندر رہنا اختیار کیا تو اس پر بطور انعام کے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات گرامی کو بھی یہی نوازواج کے لئے مخصوص کر دیا، ان کے سوا کسی سے نکاح جائز نہ رہا رواہ البیہقی فی سننہ کذا فی الروح

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو آپ کے لئے مخصوص فرما دیا کہ آپ کے بعد بھی وہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتیں، اسی طرح آپ کو بھی اُن کے لئے مخصوص فرما دیا کہ آپ ان کے علاوہ اور کوئی نکاح نہیں کر سکتے حضرت عکرمہؓ سے بھی ایک روایت میں یہی تفسیر منقول ہے۔

اور حضرت عکرمہؓ، ابن عباسؓ اور مجاہد ائمہ تفسیر سے ایک روایت میں لفظ مِنْ بَعْدِ کی یہ تفسیر نقل کی گئی ہے کہ مِنْ بَعْدِ الْأَصْنَافِ الثَّمَنُ کُورَہ یعنی شروع آیت میں آپ کے لئے جتنی اقسام عورتوں کی حلال کی گئی ہیں، اس کے بعد یعنی ان کے سوا کسی اور قسم کی عورتوں سے آپ کا نکاح حلال نہیں۔ مثلاً شروع آیت میں اپنے خاندان کی عورتوں میں سے صرف وہ حلال کی گئیں جنہوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت کرنے میں آپ کی موافقت کی تھی، خاندان کی عورتوں میں غیر مہاجرہات سے آپ کا نکاح حلال نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح مؤمنہ کی قید لگا کر آپ کے لئے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح ناجائز قرار دیدیا گیا۔ تو آیت کے جملہ مِنْ بَعْدِ کا مطلب یہ ہے کہ جتنی قسمیں آپ کے لئے حلال کر دی گئی ہیں صرف انہی میں سے آپ کا نکاح ہو سکتا ہے، عوام عورتوں میں تو مسلمان ہونا ہی شرط ہے اور خاندان کی عورتوں میں مسلمان ہونے کے تھے مہاجرہ ہونا بھی شرط ہے۔ جن میں یہ دو شرطیں موجود نہ ہوں، ان سے آپ کا نکاح حلال نہیں۔ اس تفسیر کے مطابق یہ جملہ کوئی نیا حکم نہیں، بلکہ پہلے ہی حکم کی تاکید و توضیح ہی جو شروع آیت میں بیان ہوا ہے۔ اور اس آیت کی وجہ سے نو کے بعد کسی اور عورت سے نکاح حرام نہیں کیا گیا، بلکہ غیر مؤمنہ اور خاندان کی غیر مہاجرہ سے نکاح ممنوع ہوا ہی، جو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے، باقی عورتوں سے مزید نکاح آپ کے اختیار میں رہا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک روایت سے بھی اس دوسری تفسیر کی تاکید ہوتی ہے، کہ آپ کیلئے مزید نکاح کرنے کی اجازت رہی ہے۔ واللہ اعلم

وَلَا أَنْ تَبْدُلَ مِنْ آذْوَاجٍ، آیت مذکورہ کی اگر دوسری تفسیر اختیار کی جائے تو اس جملے کا مطلب واضح ہے کہ اگرچہ آپ کو موجودہ ازواج کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح بشرائط مذکورہ جائز ہے، مگر یہ جائز نہیں کہ ایک کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری کو بدلے یعنی خالص تبدیلی کی نیت سے کوئی نکاح جائز نہیں، بغیر لحاظ و نیت تبدیلی کے جتنے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔

اور اگر آیت مذکورہ کی پہلی تفسیر مراد لی جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ آئندہ نہ کسی عورت کا اضافہ موجودہ ازواج میں آپ کر سکتے ہیں، اور نہ کسی کی تبدیلی کر سکتے ہیں، کہ اس کو طلاق دے کر اس کے قائم مقام کسی اور عورت سے نکاح کر لیں۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ

اے ایمان والو! مت جاؤ نبی کے گھروں میں مگر جو تم کو حکم

لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرٍ لِنَظَرٍ إِنَّهُ وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا

ہو کھانے کے واسطے نہ راہ دیکھنے والے اس کے پکنے کی، لیکن جب تم کو بلاؤ تب جاؤ

فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مَسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَلِكُمْ

پھر جب کھا چکو تو آپ آپ کو چلے آؤ اور نہ آپس میں جی لگا کر بیٹھو باتوں میں، اس بات تمہاری

كَانَ يُؤْذَى النَّبِيُّ فَيَسْتَجِیْ مِنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَجِیْ مِنَ الْخَطَاةِ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُ

تکلیف تھی نبی کو پھر تم سے شرم کرتا ہی اور اللہ شرم نہیں کرتا ٹھیک بات بلائے میں اور جب مانگے جاؤ

مَتَا عَافَسْكُمْ مِنْ وراءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ

بیبیوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردے کے باہر سے، اس میں خوب تمہاری ہے تمہارے دل کو

وَقُلُوبِكُمْ طَوَّاهُ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ

اور ان کے دل کو اور تم کو نہیں پہنچتا کہ تکلیف دو اللہ کے رسول کو اور نہ یہ کہ نکاح

تَنْكِحُوا أَنْفُسَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَبْطَأْنِ ذَلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ

کرد اس کی عورتوں سے اس کے پیچھے کبھی، البتہ یہ تمہاری بات اللہ کے یہاں بڑا



عَظِيمًا ۵۳) اِنْ تَبَدُّوا شَيْئًا وَتَخْشَوُہُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ

گناہ ہے۔ اگر کھول کر کہو تم کسی چیز کو یا اس کو چھپاؤ سو اللہ ہے ہر چیز کو

شَيْءٍ عَلِيمًا ۵۴) لَا جُنَاحَ عَلَیْہِمْ فِیْ اَبَآئِہُمْ وَلَا اَبْنَاہُمْ

جاننے والا۔ گناہ نہیں ان عورتوں کو سامنے ہونے کا اپنی باپوں سے اور نہ اپنے بیٹوں سے

وَلَا اِخْوَانِہُمْ وَلَا اَبْنَاءُ اِخْوَانِہُمْ وَلَا اَبْنَاۃُ اِخْوَانِہُمْ

اور نہ اپنے بھائیوں سے اور نہ اپنے بھائی کے بیٹوں سے اور نہ اپنے بہن کے بیٹوں سے،

وَلَا نِسَاءَہُمْ وَلَا مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُمْ ۵۵) وَالتَّقِیْنَ اللّٰهُ اِنْ

اور نہ اپنی عورتوں سے اور نہ اپنے ہاتھ کے مال سے اور ڈرتی رہو اے عورتو اللہ سے ہمیشہ

اللّٰهُ كَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدًا ۵۵)

اللہ کے سامنے ہے ہر چیز

## خُلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو نبی کے گھروں میں (بے بلائے) مت جایا کرو مگر جس وقت تم کو کھانے کے لئے (آنے کی) اجازت دی جائے (تو جانا مضائقہ نہیں، مگر تب بھی جانا) ایسے طور پر (ہو) کہ اس (کھانے) کی تیاری کے منتظر نہ رہو (یعنی بے دعوت تو جاؤ مت اور دعوت ہو تب بھی بہت پہلے سے مت جا بیٹھو) لیکن جب تم کو بلا یا جائے (کہ اب چلو کھانا تیار ہے) تب جایا کرو، پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھا کرو (کیونکہ) اس بات سے نبی کو ناگواری ہوتی ہے سو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں اور زبان سے نہیں فرماتے کہ اٹھ کر چلے جاؤ، اور اللہ تعالیٰ صاف بات کہنے سے (کسی کا) لحاظ نہیں کرتا (اس لئے صاف صاف کہہ دیا گیا) اور (اب سے یہ حکم کیا جاتا ہے کہ حضرت کی بیبیاں تم سے پردہ کیا کریں گی تو اب سے) جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر (کھڑے ہو کر وہاں) سے مانگا کرو (یعنی بے ضرورت تو پردہ کے پاس جانا اور بات کرنا بھی نہ چاہئے، لیکن ضرورت میں کلام کا مضائقہ نہیں، مگر رویت نہ ہونا چاہئے) یہ بات ہمیشہ کے لئے، تمہارے دلوں اور ان کے دلوں کے پاک رہنے کا عمدہ ذریعہ ہے (یعنی جیسے اب تک جانبین کے دل

پاک ہیں اس سے آئندہ بھی احتمال عدم طہارت کا مندرج ہو گیا جو کہ غیر معصوم کے اعتبار سے  
فی نفسہ محتمل ہو سکتا تھا، اور حرمت ایذا ربوی صرف فضولِ جم کر بیٹھ جانے ہی کی صورت  
میں منحصر نہیں بلکہ علی الاطلاق حکم ہے کہ تم کو کسی امر میں جائز نہیں کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کو کلفت پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم آپ کے بعد آپ کی بیبیوں  
سے کبھی بھی نکاح کر دینا خدا کے نزدیک بڑی بھاری (معصیت کی) بات ہے (اور جس طرح  
یہ نکاح ناجائز ہے ایسے ہی اس کا زبان سے ذکر کرنا یا دل میں ارادہ کرنا سب گناہ ہوسو)  
اگر تم (اس کے متعلق) کسی چیز کو (زبان سے) ظاہر کرو گے یا اس (کے ارادہ) کو (دل میں)  
پوشیدہ رکھو گے تو اللہ تعالیٰ کو دونوں کی خبر ہوگی، کیونکہ وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے  
اپس تم کو اس پر سزا دیں گے اور ہم نے جو اوپر حجاب کا حکم دیا ہے اس سے بعضے مستثنیٰ  
بھی ہیں جن کا بیان یہ ہے کہ پیغمبر کی بیبیوں پر اپنے باپوں کے سامنے ہونے کے بارہ  
میں کوئی گناہ نہیں اور نہ اپنے بیٹوں کے (یعنی جس کے بیٹا ہو) اور نہ اپنے بھائیوں  
کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ اپنے بھانجوں کے اور نہ اپنی (دین شریک) عورتوں  
کے اور نہ اپنی لونڈیوں کی (یعنی ان کے سامنے آنا جائز ہے) اور (اے پیغمبر کی بیبیوں!)  
ان احکام مذکورہ کی تعمیل میں، خدا سے ڈرتی رہو (کسی حکم کے خلاف نہ ہونے پاتے)  
بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر حاضر (ناظر) ہے (یعنی اس سے کوئی چیز مخفی نہیں جو اس  
کے خلاف کرے گا اس کو سزا سے ڈرنا چاہئے)۔

## معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اسلامی معاشرت کے چند آداب و احکام کا بیان ہے جس کا  
تعلق سابقہ آیات سے یہ ہے کہ جو آداب ان آیات میں تلقین کئے گئے وہ ابتداءً آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان اور آپ کی ازواج کے باسے میں نازل ہوئے ہیں، اگرچہ حکم  
ان کا آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرَ نَظِيرِ بْنِ إِنْ شَاءَ وَلَكِنْ إِذَا	پہلا حکم، دعوتِ طعام اور مہمان کے بعض آداب
دُعِيْتُمْ فَأَدْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْصَرُوا وَلَا مَسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ،	

اس میں دعوتِ طعام اور مہمانی کے متعلق تین احکام کا بیان ہے اور حکم اگرچہ  
سب مسلمانوں کے لئے عام ہے، مگر سببِ نزول چونکہ خاص واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



کے مکان میں ہوا، اس لئے عنوان میں بیوت النبی کا ذکر فرمایا گیا۔ پہلا یہ ہے کہ نبی کے مکانات میں بغیر اجازت داخل نہ ہوا، لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ

دوسرا دبت ہو کہ جب داخل ہونے کی اجازت بلکہ کھانے کی دعوت بھی ہو تو وقت سے پہلے آکر کھانا تیار ہونے کے انتظار میں نہ بیٹھ جاؤ۔ غَيْرَ نَاطِلِينَ اِنَّهُ نَاطِرُكُمْ مَعْنٰی اِس جگہ منتظر کے ہیں اور لفظ اِنَا بِمَسْرَمَزہ کھانا پکے کو کہتے ہیں۔ آیت میں لَا تَدْخُلُوْا سَے ایک استثناء تو اِلَّا اَنْ يُّوْذَنَ لَكُمْ کا بلفظ اِلَّا کہا گیا ہے، یہ دوسرا استثناء بلفظ غَيْرُ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ بلا اجازت داخل ہوا اور نہ وقت پہلے آکر کھانا پکے کا انتظار کرو۔

بلکہ وقت پر جب بلایا جائے اس وقت مکان میں داخل ہو و لیکن اِذَا اَدْعَيْتُمْ فَاَذْهَبُوا  
تیسرا ادب یہ ہو کہ کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے اپنے کاموں میں منتشر ہو جاؤ،  
دعوت کے گھر میں باہم باتیں کرنے کے لئے حجم کرنے بیٹھو، فَاِذَا الْحَاجَّتُمْ فَاَنْتَشِرُوا  
وَالْمُسْتَانِسِينَ لِحَاجَّتِهِ

مسئلہ: یہ عام حالات میں ہے جہاں عادتہ ہمانوں کا کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے رہنا میزبان کے لئے باعث کلفت ہو، خواہ اس لئے کہ وہ فارغ ہو کر اپنے دوسرے کاموں میں لگنا چاہتا ہے یا اس لئے کہ ان کو فارغ کر کے دوسرے ہمانوں کو کھانا مقصود ہو۔ اور جہاں حالات اور عادت سے یہ معلوم ہو کہ کھانے کے بعد ہمانوں کا دیر تک باہمی باتوں میں مشغول رہنا میزبان کے لئے موجب کلفت نہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہوگا، جیسا کہ آجکل کی پارٹیوں اور دعوتوں میں رواج ہو گیا ہے۔ دلیل اس کی آیت کا اٹھلا جملہ ہے جس میں

ارشاد ہے اِنْ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِ مِنَ الْحَقِّ  
یعنی کھانے کے بعد باتوں میں مشغول ہونے کی ممانعت کا سبب یہ ہو کہ ایسا کرنے سے نبی کریم  
صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچتی تھی۔ کیونکہ مہمانوں کے کھانے کا انتظام زمانہ مکان میں  
ہوتا تھا، وہاں مہمانوں کا دیر تک ٹھہرنا گھر والوں کے لئے موجب کلفت ہونا ظاہر ہے۔

آیت میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ مہمانوں کے اس طریقہ عمل سے تکلیف پہنچتی ہے مگر چونکہ خود اپنے گھر کے مہمان ہیں اس حالت میں ان کو ادب سکھانے سے حیا مانع ہوتی ہے، مگر حق بات کے اظہار میں اللہ تعالیٰ حیا نہیں کرتا۔

مسئلہ: اس جملے سے مہمانوں کے اکرام اور خاطر داری کا کتنا بڑا اہتمام معلوم ہوا کہ اگرچہ مہمانی کے آداب سکھانا آپ کے فرائض میں تھا، مگر اپنا جہان ہونے کی حالت میں آپ نے اس کو بھی مؤخر کیا۔ یہاں تک کہ خود حق تعالیٰ نے قرآن میں یہ آداب

سکھانے کا اہتمام فرمایا۔

دوسرا حکم عورتوں کا پردہ

وَإِذَا سَأَلَكَ الْمَوْتُ مَتَاعًا فَاسْأَلْهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ وَآيَةٌ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ  
 اَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ، اس میں بھی اگرچہ سبب نزول کے خاص واقعہ کی بناء پر بیان اور تعبیر میں خاص ازواج مطہرات کا ذکر ہے، مگر حکم ساری اُمت کے لئے عام ہے۔ خلاصہ حکم کا یہ ہے کہ عورتوں سے اگر دوسرے مردوں کو کوئی استعمالی چیز برتن، کپڑا وغیرہ لیتا ضروری ہو تو سامنے آکر نہ لیں، بلکہ پردہ کے پیچھے سے مانگیں۔ اور فرمایا کہ یہ پردہ کا حکم مردوں اور عورتوں دونوں کے دلوں کو نفسانی وساوس سے پاک رکھنے کیلئے دیا گیا ہے۔

اس جگہ یہ بات قابل نظر ہے کہ یہ پردے کے احکام جن عورتوں مردوں کو پردہ نسوان کی خاص اہمیت دیتے گئے ہیں ان میں عورتیں تو ازواج مطہرات ہیں، جن کے دلوں کو پاک صاف رکھنے کا حق تعالیٰ نے خود ذمہ لے لیا ہے، جس کا ذکر اس سے پہلی آیت لِيُنْزِلَ عَلَيْكُمْ الرِّهَانُ اَهْلَ الْبَيْتِ میں مفصل آچکا ہے۔ دوسری طرت جو مرد مخاطب ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ہیں جن میں بہت سے حضرات کا مقام فرشتوں سے بھی آگے ہے۔

لیکن ان سب امور کے ہوتے ہوئے ان کی طہارت قلب اور نفسانی وساوس سے بچنے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ مرد و عورت کے درمیان پردہ کرایا جائے۔ آج کون ہو جو اپنے نفس کو صحابہ کرام کے نفوس پاک سے اور اپنی عورتوں کے نفوس کو ازواج مطہرات کے نفوس سے زیادہ پاک ہونے کا دعویٰ کر سکے، اور یہ سمجھے کہ ہمارا اختلاط عورتوں کے ساتھ کسی خرابی کا موجب نہیں ہے؟

آیات مذکورہ کے اسباب نزول ان آیات کے سبب نزول میں چند واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن میں کوئی تضاد نہیں، ہو سکتا ہے کہ مجموعہ واقعات نزول آیات کا سبب بنیں۔ شروع آیت میں جو مہمانی کے آداب بیان ہوئے کہ بغیر بلائے کھانے کے لئے نہ جائیں، اور کھانے کے انتظار میں نہ بیٹھیں۔ اس کا سبب نزول ابن ابی حاتم نے سلیمان بن ارقم سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان ثقلار اور بوجھ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو بغیر دعوت کے کسی کے مکان میں جا بیٹھیں اور کھانے کا انتظار کریں۔

اور امام عبد بن حمید نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اُن بعض لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو انتظار میں رہتے اور کھانے کے وقت سے پہلے رسول اللہؐ



صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں جا کر بیٹھ جاتے اور باہمی باتوں میں مشغول رہتے، یہاں تک کہ کھانا تیار ہو جاتا تو اس میں شریک ہو جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ ہدایات جاری ہوئیں جو شروع آیت میں مذکور ہیں۔ یہ واقعات پردہ کے احکام نازل ہونے سے پہلے کے ہیں، جب عام مرد و زنہ مکان میں آتے جاتے رہتے تھے۔

دوسرا حکم جو عورتوں کے پردہ سے متعلق ہے اس کے شان نزول میں امام بخاری کی دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت حضرت انسؓ سے یہ ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے پاس نیک و بد ہر طرح کے آدمی آتے جاتے ہیں، اگر آپ ازواج مطہرات کو پردہ کرنے کا حکم دیدیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے، اس پر یہ آیت حجاب نازل ہوئی۔

صحیحین بخاری و مسلم میں حضرت فاروق اعظمؓ کا یہ قول منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا:

وَأَفْقَتُ رَبِّي فِي ثَلَاثٍ قُلْتُ  
يَا رَسُولَ اللَّهِ لَوْ اتَّخَذْتُ فِي  
مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مَصْلً فَاَنْزَلَ  
اللَّهُ تَعَالَى وَأَتَّخِذُ وَامِنَ  
مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مَصْلً وَقُلْتُ  
يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنْ نِسَاءً لَكَ  
يَدْخُلْنَ عَلَيْكَ الْبُرِّ وَالْفَاجِرِ  
فَلَوْ حَجَبْتَهُنَّ فَاَنْزَلَ اللَّهُ  
آيَةَ الْجَعَابِ وَقُلْتُ لِأَزْوَاجِ  
النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
لَمَّا قَامَ الْآنَ عَلَيْهِ فِي الْغَيُورَةِ  
عَلَى رِقَبَةٍ إِنْ طَلَّقْتِ أَتَى  
يُبْدِي لَكَ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِنْكِ  
فَنَزَلَتْ كَذَلِكَ

میں نے موافقت کی اپنے رب کے ساتھ  
تین چیزوں میں ایک یہ کہ میں نے رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مقام  
ابراہیمؑ کو اپنی جائے نماز بنالیں اس  
پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی،  
وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى  
اور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض  
کیا کہ آپ کی ازواج مطہرات کے سامنے  
ہر نیک و بد انسان آتا ہے، بہتر ہو کہ  
آپ ان کو پردہ کرائیں، اس پر آیت  
حجاب نازل ہو گئی۔ اور جب ازواج  
مطہرات میں باہمی غیرت و رشک پڑتی  
لگا تو میں نے ان سے کہا کہ اگر رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں طلاق دیدیں تو

بغیر نہیں کہ اللہ آپ کو تم سے بہتر ازواج عطا فرمادیں، چنانچہ ٹھیک اپنی الفاظ کے  
ساتھ قرآن نازل ہو گیا۔

فائن کا: حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا اپنے کلام میں ادب قابلِ نظر ہے کہ بظاہر کہنا یہ تھا کہ تین چیزوں میں میرے رب نے میری موافقت فرمائی۔

ایک دوسرا واقعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحیح بخاری میں یہ آیا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آیت حجاب کی حقیقت سے میں سب سے زیادہ واقف ہوں، کیوں کہ میں اس واقعہ میں حاضر تھا جب کہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے بعد رخصت ہو کر حرم نبویؐ میں داخل ہوئیں، اور مکان میں آپ کے ساتھ موجود تھیں۔ آپ نے ولیمہ کے لئے کچھ کھانا پکوا یا اور لوگوں کو دعوت دی، کھانے کے بعد کچھ لوگ وہیں جم کر آپس میں باتیں کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہیں تشریف رکھتے تھے، اور ام المؤمنین زینب بھی اسی جگہ موجود تھیں جو حیا کی وجہ سے دیوار کی طرف اپنا رخ پھیرے ہوئے بیٹھی تھیں۔ ان لوگوں کے اس طرح دیر تک بیٹھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی، آپ گھر سے باہر تشریف لائے اور دوسری ازواج مطہرات کے پاس ملاقات و سلام کے لئے تشریف لے گئے، جب آپ پھر گھر میں واپس آئے تو یہ لوگ وہیں موجود تھے۔ آپ کے ٹوٹنے کے بعد ان لوگوں کو احساس ہوا تو منتشر ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکان کے اندر تشریف لائے تو تھوڑا سا وقت گزرا تھا کہ آپ پھر باہر تشریف لائے میں وہاں موجود تھا۔ آپ نے یہ آیت حجاب جو اسی وقت نازل ہوئی تھی پڑھ کر سنائی، **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ** الآية،

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ میں ان آیات کے نزول میں سب سے زیادہ قریب ہوں، کہ میرے سامنے ہی نازل ہوئی ہیں (الترمذی، کتاب التفسیر) آیات حجاب کے نزول کے اسباب میں یہ تین واقعات روایات حدیث میں مذکور ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں ہو سکتا، یہ کہ تینوں واقعات کا مجموعہ ہی ان آیات کے نزول کا سبب بنا ہو۔

**تیسرا حکم** | ازواج مطہرات کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی نکاح جائز نہیں، **وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنكِحُوا نِسَاءَ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا أَنْ تُنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا**، اس کے پہلے جملے میں تو عام الفاظ میں ایسے ہر قول و فعل کو حرام کر دیا گیا، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا و تکلیف پہونچے، اس کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ آپ کی ازواج مطہرات سے آپ کی وفات کے بعد کسی کا نکاح حلال نہیں۔



آیت مذکورہ میں اوپر جتنے احکام آئے ہیں ان میں اگرچہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات کو ہوا ہے، مگر حکم عام ہے ساری اُمت کے لئے، بجز اس آخری حکم کے کہ عام اُمت کے لئے قانون یہ ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد جب عدت گزر جائے تو اس کی بیوی دوسرے آدمی سے نکاح کر سکتی ہے، ازواج مطہرات کے لئے یہ خصوصی حکم ہے کہ وہ آپ کی وفات کے بعد کسی سے نکاح نہیں کر سکتیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ بنصِ قرآن اہبات المؤمنین ہیں، اور اگرچہ اُن کے اہبات ہونے کا اثر ان کی اولادِ دُوحانی پر نہیں پڑتا کہ وہ سب بہن بھائی ہو کر باہم نکاح نہ کر سکیں، مگر ان کی اپنی ذات کی حد تک امتناعِ نکاح کا حکم دیا گیا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبرِ شریف میں زندہ ہیں آپ کی وفات کا درجہ ایسا ہے جیسا کوئی زندہ شوہر گھر سے غائب ہو، اسی لئے آپ کی میراث تقسیم نہیں ہوئی، اسی بنا پر آپ کی ازواج کا وہ حال نہیں جو عام شوہروں کی وفات پر ان کی ازواج کا ہوتا ہے۔

یہ حکمت بھی ہے کہ شرعی قاعدے سے جنت میں ہر عورت اپنے آخری شوہر کے ساتھ رہے گی۔ حضرت حذیفہؓ نے اپنی زوجہ کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر تم جنت میں میری بیوی رہو تو میرے بعد کوئی دوسرا نکاح نہ کرنا، کیونکہ جنت میں عورت اپنا آخری شوہر کو ملے گی۔ (قرطبی)

اس لئے ازواجِ مطہرات کو جو شرفِ حق تعالیٰ نے دنیا میں آپ کی زوجیت کا عطا فرمایا ہے اس کو آخرت اور جنت میں بھی باقی رکھنے کے لئے ان کا نکاح کسی دوسرے سے حرام کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ طبعی طور پر کوئی شوہر اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس کی بیوی دوسرے کے نکاح میں جائے، مگر اس طبعی خواہش کا پورا کرنا عام لوگوں کے لئے شرعاً ضروری نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طبعی خواہش کا بھی حق تعالیٰ نے احترام فرمایا، یہ آپ کا خصوصی اعزاز ہے۔

مسئلہ: اس پر تو اُمت کا اتفاق ہے کہ جوازِ ازواجِ مطہرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آپ کے حرم میں رہیں اُن سب کا یہی حکم ہے، لیکن جن کو آپ نے طلاق دیدی، یا کسی دوسری وجہ سے وہ آپ کی زوجیت سے علیحدہ ہو گئیں اُن کے بارے میں فقہاءِ اُمت کے مختلف اقوال ہیں، جن کو قرطبی نے تفصیل سے لکھا ہے۔

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح سے ایذا و تکلیف پہنچانا یا آپ کی وفات کے بعد آپ کی ازواج سے نکاح کرنا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا گناہ ہے۔

اِنَّ تَتَّبِعُوا شَيْئًا اَوْ تَخَفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا آخر آیت میں پھر اس مضمون کو دہرایا گیا، کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے ارادوں اور خیالات سے بھی واقف ہے، تم کسی چیز کو چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ تعالیٰ کے سامنے سب ظاہر ہی ہے۔ اس میں تاکید ہے کہ مذکورہ احکام میں کسی قسم کا شک و شبہ یا دوسوہ دل میں پیدا نہ ہونے دیں، اور احکام مذکورہ کی مخالفت سے بچنے کا پورا اہتمام کریں۔

آیت مذکورہ میں تین احکام بیان کئے گئے ہیں، ان میں عورتوں کے پردہ کا مسئلہ کسی وجہ سے تفصیل طلب ہے، اس لئے بقدر ضرورت لکھا جاتا ہے:-

## احکامِ حجاب

### انسدادِ فواحش کا اسلامی نظام

فواحش، بدکاری، زنا اور اس کے مقدمات دنیا کی اُن مہلک برائیوں میں سے ہے جن کے مہلک اثرات صرف اشخاص و افراد کو نہیں بلکہ قبائل اور خاندانوں کو اور بعض اوقات بڑے بڑے ملکوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں جتنے قتل و غارت گری کے واقعات پائے جاتے ہیں اگر صحیح تحقیق کی جائے تو اکثر واقعات کے پس منظر میں کوئی عورت اور شہوانی جذبات کا جال نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دنیا پیدا ہوئی ہے اس میں کوئی قوم کوئی مذہب، کوئی خطہ ایسا نہیں جو اس کی بُرائی اور مہلک عیب ہونے پر متفق نہ ہو۔

دنیا کے اس آخری دور میں یورپین اقوام نے اپنی مذہبی حدود اور قدیم دینی روایات سب کو توڑ کر اگرچہ زنا کو اپنی ذات میں کوئی جرم ہی نہیں رکھا، اور تہن و تمنا کو ایسے سانچوں میں ڈھال دیا ہے جن میں ہر قدم پر جنسی انار کی اور فواحش کو دعوت عام ہو، مگر ان کے ثمرات و نتائج کو وہ بھی جرائم سے خارج نہ کر سکے۔ عصمت فروشی، زنا با بکر، منظر عام پر فحش حرکات کو تعزیری جرم قرار دینا پڑا جس کی مثال اس کے سوا کچھ نہیں کہ کوئی شخص آگ لگانے کے لئے سوختہ کا ذخیرہ جمع کرے پھر اس پر تیل چھڑکے، پھر اس میں آگ لگائے، اور جب اس کے شعلے بھڑکنے لگیں تو ان شعلوں پر پابندی لگانے



اور روکنے کی فکر کرے، ہنڈیا پکانے کے لئے اس کے نیچے آگ جلائے پھر اس کے اُبال اور جوش کو روکنا چاہیے۔

اس کے خلاف اسلام نے جن چیزوں کو جرائم اور انسانیت کے لئے مضر قرار دیکر قابلِ سزا جرم کہا ہے، ان کے مقدمات پر بھی پابندیاں عائد کیں، اور ان کو ممنوع قرار دیا۔ اس معاملے میں مقصود اصلی زنا، اور بدکاری سے بچانا تھا تو اس کو نظر نہی رکھنے کے قانون سے شریع کیا، عورتوں مردوں کے بے محایا اختلاط کو روکا، عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں محدود رکھنے کی ہدایت کی اور ضرورت کے وقت باہر نکلنے کے لئے بھی برقع یا لمبی چادر سے پورا بدن چھپا کر نکلنے اور سڑک کے کنارے چلنے کی ہدایت کی، خوشبو لگا کر یا بچنے والا زین پہن کر نکلنے کی ممانعت کی۔ پھر جو شخص ان سب حدود و قیود اور پابندیوں کے حصار کو پھاند کر باہر نکل جائے اس پر ایسی سخت عبرت آموز سزا جاری کی کہ ایک مرتبہ کسی بدکردار پر جاری کر دی جائے تو پوری قوم کو مکمل سبق مل جائے۔

اہلِ یورپ اور ان کے مقلدین نے اپنی فحاشی کے جواز میں عورتوں کے پردہ کو عورتوں کی صحت اور اقتصادی اور معاشی حیثیت سے معاشرہ کے لئے مضر ثابت کرنے اور پردہ رہنے کے فوائد پر بحثیں کی ہیں۔ ان کا مفصل جواب بہت سے علمائے اہلِ عصر نے مفصل کتابوں میں لکھ دیا ہے، اس کے متعلق یہاں اتنا سمجھ لینا بھی کافی ہے کہ فائدہ اور نفع سے تو کوئی جرم و گناہ بھی خالی نہیں۔ چوری، ڈاکہ، دھوکہ فریب ایک اعتبار سے بڑا نفع بخش کاروبار ہے، مگر جب اس کے ثمرات و نتائج میں آنے والی ہلک مضر تین سامنے آتی ہیں تو کوئی شخص ان کو نافع کاروبار کہنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بے پردگی میں اگر کچھ معاشی فوائد بھی ہوں مگر جب پورے ملک و قوم کو ہزاروں فتنہ و فساد میں مبتلا کر دے تو پھر اس کو نافع کہنا کسی دانشمند کا کام نہیں ہو سکتا۔

انسدادِ جرائم کے لئے اسلام جس طرح اصولی عقائد، توحید، رسالت، آخرت، تمام انبیاء میں سب ذرائع کا اندر میں اصول، علیہم السلام کی شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں اور اس میں راہِ اعتدال، اسی طرح عام معاصی اور فواحش و منکرات ہر شریعت و مذہب میں حرام قرار دیئے گئے ہیں، لیکن شرائع سابقہ میں ان کے اسباب و ذرائع کو مطلقاً حرام نہیں کیا گیا تھا، جب تک کہ ان کے ذریعہ کوئی جرم واقع نہ ہو جائے۔

شریعتِ محمدیہ علی صابہا الصلوٰۃ والسلام چونکہ قیامت تک رہنے والی شریعت تھی، اس لئے اس کی حفاظت کا منجانب اللہ خاص اہتمام یہ کیا گیا کہ جرائم و معاصی تو حرام تھے ہی

ان اسباب و ذرائع کو بھی حرام قرار دیا گیا جو عادت غالبہ کے طور پر ان جرائم تک پہنچانے والے ہیں۔ مثلاً شراب نوشی کو حرام کیا گیا تو شراب کے بنانے، بیچنے، خریدنے اور کسی کو دینے کو بھی حرام قرار دیا گیا۔ سود کو حرام کرنا تھا تو سود سے ملتے جلتے معاملات کو بھی ناجائز کر دیا گیا۔ اسی لئے حضرات فقہاء نے تمام معاملات فاسدہ سے حاصل ہونے والے نفع کو سود کی طرح مالِ خبیث قرار دیا۔ شرک و بت پرستی کو قرآن نے ظلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی جرم قرار دیا، تو اس کے اسباب و ذرائع پر بھی کڑی یا بندی لگا دی۔ آفتاب کے طلوع، غروب، اور وسط میں ہونے کے اوقات میں چونکہ مشرکین آفتاب کی پرستش کرتے تھے، ان اوقات میں نماز پڑھی جاتی تو آفتاب پرستوں کے ساتھ ایک طرح کی مشابہت ہو جاتی، پھر یہ مشابہت کسی وقت خود شرک میں مبتلا ہونے کا سبب بن سکتی تھی، اس لئے شریعت نے ان اوقات میں نماز اور سجدہ کو بھی حرام و ناجائز کر دیا۔ بتوں کے مجسمات اور تصویریں چونکہ بت پرستی کا قریب ذریعہ تھیں، اس لئے بت تراشی، اور تصویر سازی کو حرام اور ان کے استعمال کو ناجائز کر دیا گیا۔

اسی طرح جبکہ شریعت نے زنا کو حرام قرار دیا تو اس کے تمام اسباب قریبہ اور ذرائع کو بھی محرمات میں داخل کر دیا، کسی اجنبی عورت یا امرد پر شہوت سے نظر ڈالنے کو آنکھوں کا زنا قرار دیا، اس کا کلام سننے کو کانوں کا، اس کے چھونے کو ہاتھوں کا، اس کے لئے جدوجہد میں چلنے کو پاؤں کا زنا فرمایا، جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے، اپنی جراثیم سے بچانے کے لئے عورتوں کے واسطے پردہ کے احکام نازل ہوئے۔

مگر اسباب و ذرائع کا قریب و بعید ایک طویل سلسلہ ہے، اگر دور تک اس سلسلے کو روکا جائے تو زندگی دشوار ہو جائے، اور عمل میں بڑی تنگی پیش آجائے، جو اس شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کا اس کے بارے میں کھلا ہوا اعلان یہ ہے کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ یعنی دین میں تمھارے اوپر کوئی تنگی نہیں لگائی۔ اس لئے اسباب و ذرائع کے معاملے یہ حکیمانہ فیصلہ کیا گیا کہ جو افعال و اعمال کسی معصیت کا ایسا سبب قریب ہوں کہ عام عادت کے اعتبار سے اس کا ارتکاب کرنے والا اس معصیت میں ضرور مبتلا ہو ہی جاتا ہے، ایسے اسباب قریبہ کو شریعت اسلام نے اصل معصیت کے ساتھ ملحق کر کے ان کو بھی حرام کر دیا، اور جو اسباب بعیدہ ہیں کہ ان کے عمل میں لانے سے معصیت میں مبتلا ہونا عادتاً لازم و ضروری تو نہیں، مگر کچھ نہ کچھ دخل معصیت میں ضرور ہے ایسے اسباب و ذرائع کو مکروہ قرار دیا۔



اور جو اسباب ان سے بھی زیادہ ابعید ہیں کہ معصیت میں ان کا دخل شاذ و نادر ہے ان کو نظر انداز کر کے مباحات میں داخل کر دیا۔

پہلے مسئلہ کی مثال شراب فروشی ہے کہ یہ شراب نوشی کا سبب قریب ہے، اس کو بھی شریعت نے اسی طرح حرام کر دیا جس طرح شراب نوشی حرام ہے۔ کسی غیر عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگانا اگرچہ عین زنا نہیں، مگر اس کا سبب قریب ہو شریعت نے اس کو اسی کی طرح حرام قرار دیدیا۔

اور دوسرے مسئلے کی مثال یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کے ہاتھ انگور فروخت کرنا جس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ اس سے شراب ہی بناتا ہے اس کا پیشہ یہی ہے یا اس نے صراحت کہہ دیا ہے کہ میں اس کام کے لئے خرید رہا ہوں، یہ اگرچہ شراب فروشی کے درجہ میں حرام تو نہیں مگر مکروہ و ناجائز یہ بھی ہے۔ یہی حکم سنیما گھر بنانے یا سودی بینک چلانے کے لئے زمین مکان کو رایہ پردینے کا ہے کہ معاملہ کے وقت جب معلوم ہو کہ یہ اس مکان کو ناجائز کام کے لئے لے رہا ہے تو کو رایہ پردینا مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے۔

تیسرے درجہ کی مثال یہ ہے کہ عام لوگوں کے ہاتھ انگور فروخت کئے جائیں جن میں یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص ان سے شراب کشید کر لے مگر نہ اس نے اس کا اظہار کیا نہ ہمالے علم میں وہ ایسا شخص ہو جو شراب کشید کرتا ہو تو شرعاً اس طرح کی بیع و شراء مباح و جائز قرار دی۔

**تنبیہ ضروری** یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ شریعت اسلام نے جن کاموں کو گناہ کا سبب قریب درجہ اول کا قرار دے کر حرام کر دیا، اس حکم حرمت کے بعد وہ سب کے لئے مطلقاً حرام ہے، خواہ ابتلا گناہ کا سبب بنے یا نہ بنے اب وہ خود ایک حکم شرعی ہے جس کی مخالفت حرام ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ سمجھئے کہ عورتوں کا پردہ بھی شرعاً اسی سد ذرائع کے مہل پر مبنی ہے کہ ترک پردہ سبب ہے معصیت میں مبتلا ہونے کا، اس میں بھی اسباب کی مذکورہ قسموں کے احکام جاری ہوں گے۔ مثلاً کسی جوان مرد کے سامنے جوان عورت کو اپنا بدن کھولنا ابتلا گناہ کا ایسا سبب قریب ہے کہ عادت اکثر یہ کے اعتبار سے اس پر گناہ کا مرتب ہونا لازمی جیسا ہے، اس لئے یہ تو شرعاً زنا کی طرح حرام ہو گیا، کیونکہ شرعاً اس عمل کو حکم فاحشہ کا دیدیا گیا ہے، اب وہ مطلقاً حرام ہے۔ اگرچہ معاملہ کسی معصوم کے ساتھ ہو یا کوئی شخص اپنے نفس پر مکمل قابو رکھنے کی وجہ سے۔

مطمئن ہو کر گناہ سے بچ جائے گا۔ مواقع ضرورت علاج وغیرہ کا مستثنیٰ ہونا الگ چیز ہے، اس سے اصل حرمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ مسئلہ اوقات اور حالات سے بھی متاثر نہیں ہوتا۔

قرن اول اسلام میں بھی اس کا حکم وہی تھا جو آج فسق و فجور کے زمانے میں ہے۔ دوسرا درجہ ترک حجاب کا یہ ہے کہ گھروں کی چار دیواری سے باہر برقع یا لائبی چادر سے پورا بدن چھپا کر باہر نکلے۔ یہ سبب بعید ہے فتنہ کا۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ایسا کرنا سبب فتنہ ہو تو ناجائز ہے اور جہاں فتنہ کا خوف نہ ہو وہاں جائز ہے۔ اسی لئے اس کا حکم زمانے اور حالات کے بدلنے سے بدل سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس طرح کا عورتوں کا خروج موجب فتنہ نہیں تھا، اسی لئے آپ نے عورتوں کو برقع وغیرہ میں سارا بدن چھپا کر مسجدوں میں آنے کی چند شرائط کے ساتھ اجازت دی تھی، اور ان کو مسجد میں آنے سے روکنے کو منع فرمایا تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی ان کو ترغیب اسی کی دی تھی کہ نماز اپنے گھروں میں ادا کریں، کیونکہ ان کے لئے مسجدوں میں آنے سے زیادہ ثواب گھر میں پڑھنے کا ہے، مگر فتنہ کا خوف نہ ہونے کے سبب منع نہیں فرمایا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرام نے دیکھا کہ اب عورتوں کا مسجدوں میں آنا فتنہ سے خالی نہیں رہا، اگرچہ برقع چادر وغیرہ لپیٹ کر آئیں، تو ان حضرات نے باجماع و اتفاق عورتوں کو مسجدوں کی جماعت میں آنے سے روک دیا۔ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج کے حالات کو دیکھتے تو ضرور عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روک دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ سے مختلف نہیں، بلکہ آپ نے جن شرائط کی بناء پر اجازت دی تھی، اب شرائط نہ رہیں تو حکم آپ ہی کے فیصلے سے بدل گیا۔

عورتوں کے پردہ کا بیان قرآن کریم کی سات آیتوں میں آیا ہے۔ تین سورۃ نور میں گذر چکی ہیں، چار آیتیں سورۃ احزاب میں ہیں، جن میں سے ایک پہلے آچکی ہے، ایک زیر نظر ہے باقی آگے آئیں گی جن میں پردہ کے درجات کی تعیین اور احکام کی تفصیل اور جو اس سے مستثنیٰ ہیں، ان کا مفصل بیان ہے۔ اسی طرح ستر سے زیادہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں قولاً اور عملاً پردہ کے احکام بتلائے گئے ہیں، ان سب کو یک جا معلوم کرنے کے لئے احقر نے ایک مستقل رسالہ بنام "تفصیل الخطاب فی تفسیر آیات الحجاب" لکھ دیا ہے جو بزبان عربی احکام القرآن سورۃ احزاب کا جز ہو کر شائع ہو چکا ہے اس تفسیر قرآن میں ہر آیت کی تفسیر تو اپنی جگہ پر آتی ہے باقی مضامین سالہ کے چند ضروری اقتباسات یہاں لکھے جاتے ہیں۔



## نزدول حجاب کی تاریخ

عورتوں اور مردوں میں بے محابا اختلاط تو دنیا کی پوری تاریخ میں آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی زمانے میں درست نہیں سمجھا گیا، اور صرف اہل شریعہ ہی نہیں دنیا کے عام شریف خاندانوں میں ایسے اختلاط کو روا نہیں رکھا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفرِ مدین کے وقت جن عورتوں کا اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لئے الگ روکے ہوئے کھڑے ہونے کا ذکر ہے، اس کی وجہ یہی بتلائی گئی ہے کہ ان عورتوں نے مردوں کے ہجوم میں گھسنا پسند نہ کیا، سب کے بعد بچے ہوئے پانی پر قناعت کی۔ حضرت زینب بنت جحش جن کے نکاح کے وقت پہلی آیتِ حجاب نازل ہوئی ہے اس کے نازل ہونے سے پہلے بھی جامع ترمذی کی روایت میں ان کی گھس نشست کی یہ صورت بیان کی ہے وَهِيَ مُوَلِّيَةٌ وَجَاهُهَا إِلَى الْحَاظِطِ، یعنی وہ اپنا رخ دیوار کی طرف پھیرے ہوئے بیٹھی تھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نزدول حجاب سے پہلے بھی عورتوں مردوں میں بے محابا اختلاط اور بے تکلف ملاقات و گفتگو کا رواج شریف اور نیک لوگوں میں کہیں نہ تھا۔ قرآن کریم میں جس جاہلیتِ اولیٰ اور اس میں عورتوں کے تبرج و ظہور کا ذکر ہے وہ بھی عرب کے شریف خاندانوں میں نہیں بلکہ لونڈیوں اور آوارہ عورتوں میں تھا عرب کے شریف خاندان اس کو معیوب سمجھتے تھے۔ عرب کی پوری تاریخ اس کی شاہد ہے۔ ہندوستان میں ہندو بدھ مت، اور دوسرے مشرکانہ مذاہب والوں میں عورتوں مردوں کے درمیان بے محابا اختلاط گوارا نہ تھا۔ یہ مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کے دعوے اور بازاروں اور سڑکوں پر پرٹیکر کرنے اور تعلیم سے لے کر ہر شعبہ زندگی میں مرد و زن کے بے تکلف اختلاط ضیافتوں اور کلبوں میں بے تکلف ملاقاتوں کا سلسلہ صرف یورپین اقوام کی بے حیائی اور فحاشی کی پیداوار ہے، جس میں یہ اقوام بھی اپنے ماضی سے ہٹ جانے کے بعد مبتلا ہوئی ہیں۔ قدیم زمانے میں ان کی بھی یہ صورت نہ تھی۔ حق تعالیٰ نے جس طرح عورت کی جسمانی تخلیق کو مردوں سے ممتاز رکھا ہے اسی طرح ان کی طبیعتوں میں ایک فطری حیا کا جوہر بھی رکھا ہے، جو ان کو فطری طور پر عام مردوں سے الگ تھلگ رہنے اور ستر پر آمادہ کرتی ہے۔ اور یہ فطری اور طبعی حیا کا پردہ عورتوں مردوں

کے درمیان ابتداء آفرینش سے حائل رہا ہے، ابتداء اسلام میں بھی باہمی پردہ کی یہی نوعیت تھی۔  
پردہ نسوان کی یہ خاص نوعیت کہ عورتوں کا اصل مقام گھروں کی چار دیواری ہو، اور  
جب کسی شرعی ضرورت سے باہر نکلتا ہو تو پورے بدن کو چھپا کر نکلیں یہ ہجرت مدینہ کے  
بعد شہ ہجری میں جاری ہوا ہے۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ باتفاق علمائے امت اس پردہ کے متعلق پہلی آیت وہ ہے  
جو اوپر مذکور ہوئی ہے لَا تَنْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ، اور یہ آیت حضرت زینب بنت جحش  
کے نکاح اور حرم نبوی میں داخلہ کے وقت نازل ہوئی ہے۔ اس نکاح کی تاریخ میں حافظ  
ابن حجر نے اصحاب میں اور ابن عبد البر نے استیعاب میں دو قول نقل کئے ہیں کہ شہ ہجری  
میں ہوا یا شہ ہجری میں ہوا۔ ابن کثیر نے شہ ہجری کو ترجیح دی، ابن سعد نے حضرت  
انس سے بھی شہ ہجری نقل کیا ہے، حضرت صدیقہ عائشہؓ کی بعض روایات سے بھی اسی  
کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

آیت مذکورہ میں عورتوں کو پس پردہ رہنے کا حکم دیا اور مردوں کو حکم یہ ملا کہ  
اگر ان سے کوئی چیز مانگنا ہے تو پردہ کے پیچھے سے مانگیں۔ اس میں پردہ کی خاص تاکید  
پائی گئی کہ بلا ضرورت تو مردوں عورتوں کو الگ ہی رہنا ہے، ضرورت کے وقت ان  
سے بات کرنا ہو تو پس پردہ کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم میں پردہ نسوان اور اس کی تفصیلات کے متعلق سات آیتیں نازل  
ہوئی ہیں، چار سورۃ احزاب میں اور تین سورۃ نور میں گزر چکی ہیں۔ اس پر سب کا اتفاق  
ہے کہ پردہ کے متعلق سب سے پہلے نازل ہونے والی یہی آیت ہے لَا تَنْخُلُوا بُيُوتَ  
النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُخْرِجَ نَفْسَهُ الْآیۃ، سورہ نور کی تینوں آیتیں اور سورۃ احزاب کے  
مشرع کی آیت جس میں ازواج مطہرات کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گھروں میں بیٹھیں،  
وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ، یہ سب اگرچہ ترتیب قرآن میں پہلے ہے مگر نزول کے اعتبار سے  
مؤخر ہیں۔ سورۃ احزاب کی پہلی آیت میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یہ حکم اس وقت  
دیا گیا ہے جب کہ ازواج مطہرات کو منجانب اللہ اختیار دیا گیا تھا کہ اگر دنیا کی وسعت  
چاہتی ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طلاق لے لیں، اور آخرت کو ترجیح دے کر دنیا  
کی معیشت میں موجودہ حالت پر قناعت کر لیں تو نکاح میں رہیں۔

اس واقعہ تخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جن ازواج کو یہ اختیار دیا گیا تھا ان میں  
حضرت زینب بنت جحش بھی شامل تھیں اس سے معلوم ہوا کہ ان کا نکاح اس



آیت سے پہلے ہو چکا تھا، یہ آیت بعد میں نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح سورۃ نور کی آیتیں جن میں پردہ کے متعلق تفصیلات ہیں، یہ اگرچہ ترتیب قرآنی میں مقدم ہیں مگر تردید کے اعتبار سے وہ بھی اس کے بعد قصہ افک کے ساتھ نازل ہوئی ہیں، جو غزوہ بنی المصطلق یا مریح سے واپسی میں پیش آیا تھا۔ یہ غزوہ ششہ ہجری میں ہوا ہے۔ اور پردہ شرعی کے احکام اس وقت سے جاری ہوئے ہیں جبکہ حضرت زینبؓ کے نکاح میں آیت پردہ نازل ہوئی، سورۃ نور کی آیات متعلقہ حجاب سورۃ نور میں گزر چکی ہیں۔

ستر عورت کے احکام | مرد و عورت کا وہ حصہ بدن جس کو عربی میں عورت اور اردو فارسی میں ستر اور حجاب نسائے میں فرق کہتے ہیں جس کا سب سے چھپانا شرعی، طبعی اور عقلی طور پر فرض ہے،

اور ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض جس پر عمل ضروری ہے، وہ ستر عورت یعنی اعضا کے مستورہ کا چھپانا ہے۔ یہ فریضہ تو ابتداء آفرینش سے فرض ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں فرض رہا ہے، بلکہ شرائع کے وجود سے بھی پہلے جب جنت میں شجر ممنوعہ کھا لینے کے سبب حضرت آدم و حوا علیہما السلام کا جنتی لباس اتر گیا اور ستر کھل گیا تو وہاں بھی آدم علیہ السلام نے ستر کھلا رکھنے کو جائز نہیں سمجھا۔ اسی لئے آدم و حوا دونوں نے جنت کے پتے اپنے ستر پر باندھ لئے طِفْقًا يَخِصِمَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ ذَرَقِ الْجَنَّةِ کا یہی مطلب ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر پیغمبر دین کی شریعت میں ستر چھپانا فرض رہا ہے۔ اعضا مستورہ کی تعمین اور تحدید میں اختلاف ہو سکتا ہے، کہ ستر کہاں سے کہاں تک ہے، مگر اصل فرضیت ستر عورت کی تمام شرائع انبیاء میں مسلمہ ہے، اور یہ فرض ہر انسان مرد و عورت پر فی نفسہ عائد ہے، کوئی دوسرا دیکھنے والا ہو یا نہ ہو اسی لئے اگر کوئی شخص اندھیری رات میں ننگا نماز پڑھے حالانکہ ستر چھپانے کے قابل کپڑا اُس کے پاس موجود ہو، تو یہ نماز بالاتفاق ناجائز ہے، حالانکہ اس کو ننگا کسی نے دیکھا نہیں (بجہ الرائق) اسی طرح نماز اگر کسی ایسی جگہ پڑھی جہاں کوئی دوسرا آدمی دیکھنے والا نہیں اس وقت بھی اگر نماز میں ستر کھل گیا تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ (کما فی عامۃ کتب الفقہ)

خارج نماز لوگوں کے سامنے ستر پوشی کے فرض ہونے میں تو کسی کا اختلاف ہی نہیں، لیکن خلوت میں جہاں کوئی دوسرا دیکھنے والا موجود نہ ہو وہاں بھی صحیح قول یہی ہے کہ خارج نماز بھی بلا ضرورت شرعیہ یا طبیعہ کے ستر کھول کر ننگا بیٹھنا جائز نہیں۔ (کما فی البحر عن مشرح المنیہ)

یہ حکم تو ستر عورت کا تھا، جو اول اسلام سے بلکہ اول آفرینش سے تمام مشراییہ انبیاء میں فرض رہا ہے، جس میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ خلوت و جلوت میں بھی برابر ہیں، جیسے لوگوں کے سامنے نہنگا ہونا جائز نہیں، ایسے ہی خلوت و تنہائی میں بھی بلا ضرورت نہنگا رہنا جائز نہیں۔

دوسرا مسئلہ: حجاب اور پردہ کا ہے کہ عورتیں اجنبی مردوں سے پردہ کریں۔ اس مسئلہ میں بھی اتنی بات تو انبیاء و صلحاء اور شرفاء میں ہمیشہ سے رہی ہے کہ اجنبی مردوں کے ساتھ عورتوں کا بے محابا اختلاط نہ ہو۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی دو لڑکیوں کا قصہ جو قرآن کریم میں پڑھا ہے اس میں لڑکیاں اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لئے بستی کے کنویں پر گئیں جہاں لوگوں کا ہجوم تھا وہ اپنے اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے تو قرآن کریم میں ہے کہ یہ لڑکیاں ایک طرف الگ کھڑی ہو گئیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کا اس وقت اتفاقی طور پر مسافرانہ انداز میں وہاں گذر ہوا تو ان لڑکیوں کو علیحدہ کھڑے دیکھ کر سبب پوچھا تو لڑکیوں نے دو باتیں بتلائیں۔

اول یہ کہ اس وقت یہاں مردوں کا ہجوم ہے ہم اپنے جانوروں کو پانی اس وقت پلائیں گے جب یہ لوگ قاغ ہو کر چلے جائیں گے۔

دوسری بات یہ بھی بتلائی کہ ہمارے والد بوڑھے ضعیف ہیں جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جانوروں کو پانی پلانے کے لئے نکلنا یہ عرف و عادت کے اعتبار سے عورتوں کا کام نہیں تھا، مگر والد کے ضعف و مجبوری اور کسی دوسرے آدمی کے موجود نہ ہونے کے سبب یہ کام ہمیں کرنا پڑ گیا۔

یہ حال قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی لڑکیوں کا بتلایا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے اور ان کی شریعت میں بھی عورتوں مردوں کا دوش بدوش چلنا اور بے محابا اختلاط پسند نہیں تھا، اور ایسے کام جن میں مردوں کے ساتھ اختلاط ہو وہ عورتوں کے سپرد ہی نہیں کئے جاتے تھے۔ بہر حال اس مجموعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو باقاعدہ پردہ میں رہنے کا حکم اس وقت نہیں تھا، اسی طرح ابتداء اسلام میں بھی یہی صورت جاری رہی۔ ۳۳ یا ۳۴ میں عورتوں پر اجنبی مردوں سے پردہ کرنا فرض کر دیا گیا، جس کی تفصیلات آگے آتی ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ ستر عورت، اور حجاب نسائے یہ دو مسئلے الگ الگ ہیں، ستر عورت ہمیشہ سے فرض ہے، حجاب نسائے ہجری میں فرض ہوا۔ ستر عورت



مرد و عورت دونوں پر فرض ہے اور حجاب صرف عورتوں پر، ستر عورت لوگوں کے سامنے اور خلوت دونوں میں فرض ہے حجاب صرف اجنبی کی موجودگی میں۔ یہ تفصیل اس لئے لکھی گئی کہ ان دونوں مسئلوں کو غلط ملط کر دینے سے بہت سے شبہات مسائل اور احکام قرآن کے سمجھنے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں ستر عورت سے باجماع مستثنیٰ ہیں، اسی لئے نماز میں چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی ہوں تو نماز بالاتفاق و باجماع جائز ہے۔ چہرہ اور ہتھیلیاں تو از روئے نص مستثنیٰ ہیں، قد مئین کو فقہاء نے ان پر قیاس کر کے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

لیکن اجنبی مردوں سے پردہ میں بھی چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں یا نہیں، اس میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل سورۃ نور کی آیت لَا یُبْصِرْنَ زَیْفَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے تحت گزر چکی ہے، جس کا خلاصہ آگے آتا ہے۔

حجاب شرعی کے درجات اور پردہ نسوان کے متعلق قرآن مجید کی سات آیات اور حدیث ان کے احکام کی تفصیل کی ستر روایات کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مطلوب

شرعی حجاب اشخاص ہے، یعنی عورتوں کا وجود اور ان کی نقل و حرکت مردوں کی نظروں سے مستور ہو، جو گھروں کی چار دیواری یا خیموں اور معلق پردوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی صورتیں حجاب کی منقول ہیں وہ سب ضرورت کی بناء پر اور وقت ضرورت اور قدر ضرورت کے ساتھ مقید اور مشروط ہیں۔

اس طرح پردہ کا پہلا درجہ جو اصل مطلوب شرعی ہے وہ حجاب اشخاص ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں رہیں۔ لیکن شریعت اسلامیہ ایک جامع اور مکمل نظام ہے جس میں انسان کی تمام ضروریات کی رعایت پوری کی گئی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ عورتوں کو ایسی ضرورتیں پیش آنا ناگزیر ہے کہ وہ کسی وقت گھروں سے نکلیں اس کے لئے پردہ کا دوسرا درجہ قرآن و سنت کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر سے پاؤں تک برقع یا لائبی چادر میں پورے بدن کو چھپا کر نکلیں۔ راستہ دیکھنے کے لئے چادر میں سے صرف ایک آنکھ کھولیں، یا برقع میں جو جالی آنکھوں کے سامنے استعمال کی جاتی ہے وہ لگالیں، ضرورت کے مواقع میں پردہ کا دوسرا درجہ بھی پہلے کی طرح سب علماء و فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے۔

ایک تیسرا درجہ بھی بعض روایات سے مفہوم ہوتا ہے، جس میں صحابہ و تابعین اور فقہاء ائمہ کی رائیں مختلف ہیں۔ وہ یہ کہ عورتیں جب بضرورت گھروں سے باہر نکلیں تو

وہ اپنا چہرہ اور ہتھیلیاں بھی لوگوں کے سامنے کھول سکتی ہیں بشرطیکہ سارا بدن مستور ہو، پردہ شرعی کے ان تینوں درجوں کی تفصیل یہ ہے کہ:-

**پہلا درجہ حجاب اشخاص بالبیوت** | قرآن و سنت کی رو سے اصل مطلوب یہی درجہ ہی سورۃ احزاب کی زیر بحث آیت **قَدْ اَسَاءَ فَمَا كُنْتُمْ بِمَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ**، اس کی واضح دلیل اور اس سے زیادہ واضح سورۃ احزاب ہی کے شروع کی آیت **وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ** ہی۔ ان آیتوں پر جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا، اس سے اور زیادہ اس کی تشریح سامنے آجاتی ہے۔

یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ پردہ نسواں کے متعلق پہلی آیت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے وقت نازل ہوئی، روایات حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس واقعہ حجاب کو اور سب زیادہ اس لئے جانتا ہوں کہ میں اس وقت حضور ص کی خدمت میں موجود تھا۔ جب پردہ کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، تو آپ نے مردوں کے سامنے ایک چادر وغیرہ کا پردہ ڈال کر حضرت زینبؓ کو اندر مستور کر دیا۔ یہ نہیں کیا کہ ان کو برقع یا چادر میں مستور کر دیتے، شان نزول میں جو واقعہ حضرت عمر بن خطابؓ کا اوپر گزر چکا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ اہل بیتؓ مردوں کی نظروں سے الگ اندر رہیں۔ جیسا کہ ان کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے **يَدْخُلُ عَلَيْكَ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ**

صحیح بخاری باب غزوہ موتہ میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زید بن حارثہ اور جعفرؓ اور عبد اللہ بن رواحہؓ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ مسجد نبویؐ میں تشریف رکھتے تھے، آپ کے چہرہ مبارک پر سخت غم و صدمہ کے آثار تھے، میں حجرہ کے اندر دروازہ کی ایک شق (ریخ) سے یہ سب ماجرا دیکھ رہی تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اُم المؤمنینؓ اس حادثہ کے وقت بھی باہر آ کر برقع کے ساتھ جمع میں شامل نہیں ہوئیں بلکہ دروازہ کی شق سے اس جلسہ کا مشاہدہ کیا۔

اور صحیح بخاری کتاب المغازی عمرۃ القضاء کے باب میں ہے کہ حضرت عروہ ابن زبیر صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور عبد اللہ بن عمرؓ مسجد نبویؐ میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کے حجرے کے باہر متصل تشریف رکھتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کے متعلق باہم گفتگو کر رہے تھے۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں، کہ اسی درمیان میں ہم نے حضرت صدیقہ کی مسواک کرنے اور حلق صاف کرنے کی آواز حجرہ کے اندر سے سنی۔ آگے واقعہ میں



عمرات نبی کا ذکر ہے۔ اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ آیات حجاب نازل ہونے کے بعد ازواجِ مطہرات کا معمول یہ ہو گیا تھا کہ گھروں میں رہ کر پردہ کرتی تھیں۔

اسی طرح صحیح بخاری باب غزوة الطائف میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پانی کے برتن میں کلی کر کے حضرت ابوموسیٰ اور بلالؓ کو عطا فرمایا کہ اس کو پی لیں اور اپنے چہرے پر مل لیں۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ پر وہ کے پیچھے یہ واقعہ دیکھ رہی تھیں انھوں نے اندر سے آواز دے کر ان دونوں بزرگوں سے کہا کہ اس تبرک میں سے کچھ اپنی ماں یعنی ام سلمہؓ کے لئے چھوڑ دینا۔

یہ حدیث بھی شاہد ہے کہ نزولِ حجاب کے بعد ازواجِ مطہرات گھروں اور پردوں کے اندر رہتی تھیں۔

فائدہ: اس روایت میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ ازواجِ مطہرات بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کی ایسی ہی شائق تھیں جیسے دوسرے مسلمان۔ یہ بھی آپ کی ذاتِ اقدس ہی کی خصوصیت تھی ورنہ بیوی سے جو بے تکلف تعلق شوہر کا ہوتا ہے، اس کے ساتھ اس کے تقدس و عظیم کا یہ درجہ قائم رہنا عادتاً ناممکن ہے۔

اور صحیح بخاری کتاب الادب میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ وہ اور ابو طلحہؓ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیٹھا کہیں جا رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سوار تھے، آپ کے ساتھ ام المؤمنین حضرت صفیہؓ بھی سوار تھیں، راستہ میں اچانک اونٹ کے ٹھوکر لگی، اور ابو طلحہ کے بیان کے مطابق آپ اور حضرت صفیہؓ اونٹ سے گر گئے۔ تو ابو طلحہؓ آپ کے پاس حاضر ہوئے، اور عرض کیا اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کر دے آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، تم عورت کی خبر لو، ابو طلحہؓ نے پہلے تو اپنا چہرہ کپڑے میں چھپایا، پھر حضرت صفیہؓ کے پاس پہنچے اور ان کے اوپر سپر اڈال دیا تو وہ کھڑمی ہو گئیں۔ پھر اسی طرح پردہ میں مستوران کو ان کی سواری پر سوار کیا۔

اس واقعہ میں بھی جو ایک حادثہ کی صورت میں اچانک پیش آیا، صحابہ کرام اور ازواجِ مطہرات کا — پردہ کے معاملہ میں اتنا اہتمام اس کی بڑی اہمیت کا شاہد ہے۔

اور جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِذَا خَرَجْتَ الْمَرْأَةُ اسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ رَقَالَ التَّرْمَذِيُّ هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ (معنی یہ ہیں کہ عورت جب گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاک لیتا ہے) (یعنی اس کو مسلمانوں میں بُرائی پھیلانے کا ذریعہ بناتا ہے)۔

اور ابن حزمیہ و ابن حبان نے اس حدیث میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں: "وَأَقْرَبُ مَا تَكُونُ مِنْ رَجُلٍ رَهَقَ فِي قَعْرِ بَيْتِهِ"۔ یعنی عورت اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے گھر کے بیچ میں مستور ہو۔

اس حدیث میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ اصل عورتوں کے لئے یہی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھیں باہر نہ نکلیں (ضرورت کے مواقع مستثنیٰ ہیں)۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لَيْسَ لِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ فِي الْخُرُوجِ إِلَّا مُصْطَرَّةً (رواہ الطبرانی کذا فی الکنز ص ۲۱۳ ج ۸) "یعنی عورتوں کا باہر نکلنے کے لئے کوئی حصہ نہیں، بجز اس کے کہ باہر نکلنے کے لئے کوئی اضطراری صورت پیش آجائے۔"

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ میں ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، آپ نے صحابہ کرامؓ سے سوال فرمایا آئی شئی خیرٌ للنِّسَاءِ (عورت کے لئے کیا چیز بہتر ہے) صحابہ کرام خاموش رہے، کوئی جواب نہیں دیا، پھر جب میں گھر میں گیا اور فاطمہؓ سے میں نے یہی سوال کیا تو انھوں نے فرمایا لَا يَرْثَنَّ السَّجَّالَ وَلَا يَرَوْنَ نَهْمًا، یعنی عورتوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ نہ وہ مردوں کو دیکھیں اور نہ مرد ان کو دیکھیں۔ میں نے ان کا یہ جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نقل کیا، تو آپ نے فرمایا صَدَقَتْ! تَهَايَصَّرَهُ مَيْمَنِي "انھوں نے درست کہا بیشک وہ میرا ایک جزیرہ ہیں۔" واقعہ انک میں جو سبب حضرت صدیقہؓ کے جنگل میں رہ جانے کا پیش آیا وہ یہی تھا

کہ ازواجِ مطہرات کا پردہ صرف برقع چادر ہی کا نہیں تھا بلکہ وہ سفر میں بھی اپنے ہودج (شخوف) میں رہتی تھیں، یہ شخوف ہی اونٹ کے اوپر سوار کر دیا جاتا تھا اور اسی طرح اتارا جاتا تھا۔ شخوف مسافر کا مثل مکان کے ہوتا ہے۔ اس واقعہ میں جب قافلہ چلنے لگا تو حسبِ عادت خادموں نے شخوف کو یہ سمجھ کر اونٹ پر سوار کر دیا کہ اُم المؤمنین اس کے اندر موجود ہیں، اور واقعہ یہ تھا کہ وہ اس میں نہیں تھیں، بلکہ طبعی ضرورت کے لئے باہر گئی ہوئی تھیں۔ اس مغالطہ میں قافلہ روانہ ہو گیا اور اُم المؤمنین جنگل میں تنہا رہ گئیں۔ یہ واقعہ بھی اس بات کا قوی شاہد ہے کہ حجاب شرعی کا مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواجِ مطہراتؓ نے یہی سمجھا تھا کہ عورتیں اپنے مکانوں میں، سفر میں ہوں تو اپنے شخوف میں رہیں، ان کا وجود مردوں کے سامنے نہ آئے، اور جب سفر کی حالت میں حجاب اشخاص کا یہ اہتمام تھا تو حضرت میں کتنا اہتمام ہوگا؟



دوسرا درجہ حجاب بالبرقع | ضرورت کے مواقع میں جب عورت کو گھر سے باہر جانا پڑے تو اس وقت کسی برقع یا لمبی چادر کو سر سے پیر تک اوڑھ کر نکلنے

کا حکم ہے، جس میں بدن کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو۔ یہ سورۃ احزاب کی اس آیت سے ثابت ہو جو آگے آرہی ہے، **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّزَوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبٍ يَنْبَغِي**، یعنی اے نبی! آپ اپنی ازواج مطہرات اور بنات طاہرات کو اور عام مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیں کہ اپنی جلیباب استعمال کریں، جلیباب اس لمبی چادر کو کہتے ہیں جس میں عورت سر سے پیر تک مستور ہو جائے (ردیٰ ذلک عن ابن عباسؓ)

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے استعمال جلیباب کی صورت یہ نقل کی ہے کہ عورت سر سے پاؤں تک اس میں لپیٹی ہوئی ہو اور چہرہ اور ناک بھی اس سے مستور ہو، صرف ایک آنکھ راستہ دیکھنے کے لئے کھلی ہو۔ اس آیت کی پوری تفسیر آگے آتی ہے، یہاں صرف یہ بتلانا منظور ہے کہ ضرورت کے وقت جب عورت گھر سے نکلنے پر مجبور ہو تو اس کو پردہ کا یہ درجہ اختیار کرنا ضروری ہے کہ جلیباب وغیرہ میں سر سے پاؤں تک مستور ہو اور چہرہ بھی بجز ایک آنکھ کے چھپا ہوا ہو۔

یہ صورت بھی باتفاق فقہاء اُمت ضرورت کے وقت جائز ہے، مگر احادیث صحیحہ میں اس صورت کے اختیار کرنے پر بھی چند پابندیاں عائد کی ہیں، کہ خوشبو نہ لگائے ہو، نہ بجنے والا کوئی زیور نہ پہنا ہو، راستہ کے کنارے پر چلے، مردوں کے ہجوم میں داخل نہ ہو وغیرہ۔ **تیسرا درجہ پردہ شرعی کا** | یہ ہے کہ سر سے پیر تک سارا بدن مستور ہو، مگر چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی ہوں، جن حضرات نے **إِلَّا مَا ظَهَرَ** کی تفسیر چہرے اور ہتھیلیوں سے کی ہے، ان کے نزدیک چونکہ چہرہ اور ہتھیلیاں حجاب مستثنیٰ ہو گئیں، اس لئے ان کو کھلا رکھنا جائز ہو گیا۔ (کماروی عن ابن عباسؓ)

اور جن حضرات نے **مَا ظَهَرَ** سے برقع، جلیباب وغیرہ مراد لی ہے وہ اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ (کماروی عن ابن مسعودؓ) جنہوں نے جائز کہا ہے اُن کے نزدیک بھی یہ شرط ہے کہ فتنہ کا خطرہ نہ ہو، مگر چونکہ عورت کی زینت کا سارا مرکز اس کا چہرہ ہے، اس لئے اس کو کھولنے میں فتنہ کا خطرہ نہ ہونا شاذ و نادر ہے، اس لئے انجام کار عام حالات میں ان کے نزدیک بھی چہرہ وغیرہ کھولنا جائز نہیں۔

ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ تین اماموں نے تو پہلا مذہب اختیار کر کے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی مطلقاً اجازت نہیں دی، خواہ فتنہ کا خوف ہو یا

نہ ہوا امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اگرچہ دوسرا مسلک اختیار فرمایا مگر خوفِ فتنہ کا نہ ہونا شرط قرار دیا، اور چونکہ عادیۃً یہ شرط مفقود ہو اس لئے فقہاء حنفیہ نے بھی غیر محرموں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی اجازت نہیں دی۔

مذاہب ائمہ اربعہ کی روایتیں ان مذاہب کی مستند کتابوں کے حوالہ سے رسالہ تفصیل الخطاب بسبب احکام القرآن میں مفصل بیان کر دی گئی ہیں، حنفیہ کا اصل مذاہب چونکہ چہرے اور ہتھیلیوں کو حجاب سے مستثنیٰ ہونے کا ہے اس لئے اس جگہ مذاہب حنفیہ کی چند روایات نقل کی جاتی ہیں جن میں بوجہ خوفِ فتنہ ممانعت کرنے کا حکم مذکور ہے۔

”سمجھ لو کہ کسی عضو کے ستر میں داخل نہ ہونے اور اس کی طرف نظر کے جائز ہونے میں کوئی تلازم نہیں، کیونکہ نظر کا جواز تو اس پر موقوف ہے کہ شہوت کا خطرہ نہ ہو حالانکہ وہ عضو ستر میں داخل نہیں اسی وجہ سے اجنبی عورت کا چہرہ یا کسی بے ریش لڑکے کے چہرے کی طرف نظر کرنا حرام ہی جب کہ شہوت پیدا ہونے میں شک ہو حالانکہ چہرہ ستر میں داخل نہیں“

اعْلَمُوا أَنَّهُ لَا مُلَاجَاةَ بَيْنَ  
كَوْنِهِ لَيْسَ عَوْرَةً وَجَوَازِ  
النَّظَرِ إِلَيْهِ فَجِلُّ النَّظَرِ  
مَنْوُطٌ لِحَدِّمْ خَشْيَةِ الشَّهْوَةِ  
مَعَ انْتِقَاعِ الْعَوْرَةِ وَلِذَا احْتَرَأَ  
النَّظَرُ إِلَى وَجْهِهَا وَوَجْهِهِ  
الْأَمْرُ إِذَا شَلَقَ فِي الشَّهْوَةِ  
وَلَا عَوْرَةَ ،

فتح القدیر، ص ۱۸۱ ج ۱

فتح القدیر کی مذکورہ عبارت سے خطرہ شہوت کی یہ تفسیر بھی معلوم ہو گئی کہ اگرچہ بالفعل کوئی شہوانی نیت نہ ہو مگر ایسا خیال پیدا ہو جانے کا شک ہو۔ جب ایسا شک ہو تو نہ صرف اجنبی عورتوں کے بلکہ بے ریش لڑکوں کے چہرے کو دیکھنا بھی حرام ہے، اور خیال شہوت پیدا ہونے کی تشریح جامع الرموز میں یہ کی ہے کہ نفس میں اس کے قریب ہونے کا میلان پیدا ہو جائے، اور یہ ظاہر ہے کہ نفس میں اتنا میلان بھی پیدا نہ ہو، یہ چیز تو سلف کے زمانے میں بھی شاذ تھی۔ حدیث میں حضرت فضل کو ایک عورت کی طرف دیکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے چہرے کو اپنے ہاتھ سے دوسری طرف پھیر دینا اس کی واضح دلیل ہے تو اس زمانہ فساد میں کون کہہ سکتا ہے کہ اس خطرے سے خالی ہے۔

اور شمس الاممہ سرخسی نے اس مسئلہ پر مفصل بحث کے بعد لکھا ہے :  
وَهَذِهِ أَكْلَةُ إِذَا الْمَرْيُوكُنِ النَّظَرُ  
”یہ چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف نظر کا“



عَنْ شَهْوَةٍ فَإِنْ كَانَ يَحْكُمُ  
أَنَّهُ إِنْ نَظَرَ أَشْتَهَى  
لَمْ يَحِلَّ لَهُ النَّظَرُ إِلَى  
شَيْءٍ مِّنْهَا  
(مبسط، ص ۱۵۲، ج ۱۰)

جائز ہونا صرف اس صورت میں ہی  
جبکہ یہ نظر شہوت سے نہ ہو، اور اگر  
دیکھنے والا جانتا ہے کہ چہرہ دیکھنے سے  
بُرے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں تو اس  
کو عورت کی کسی چیز کی طرف بھی نظر کرنا  
حلال نہیں۔

اور علامہ شامی نے رد المحتار کتاب الکراہیۃ میں فرمایا ہے :-

فَإِنْ خَافَ الشَّهْوَةَ أَوْ شَقَّ  
إِمْتِنَاعَ النَّظَرِ إِلَى وَجْهِهَا  
فَحِلُّ النَّظَرِ مُقَيَّدٌ بِإِعْدَمِ  
الشَّهْوَةِ وَإِلَّا فَحَرَامٌ وَهَذَا  
فِي زَمَانِهِمْ وَأَمَّا فِي زَمَانِنَا  
فَمَنْعٌ مِنَ الشَّابَةِ إِلَّا النَّظَرُ  
لِحَاجَةٍ كَقَاضٍ وَشَاهِدٍ يَحْكُمُ  
وَشَهِيدٍ وَأَيْضًا قَالِي فِي شَرْحِ  
الصَّلَاةِ وَتَمْنَعِ الشَّابَةِ مِنْ  
كَشْفِ التَّوَجُّهِ بَيْنَ رَجَالٍ  
لَا لِأَنَّهُ عَوْرَةٌ بَلْ لِخَوْفِ  
الْفِتْنَةِ

”اگر شہوت کا خطرہ یا شک ہو تو عورت  
کے چہرے کی طرف نظر ممنوع ہوگی،  
کیونکہ نظر کا حلال ہونا شہوت نہ ہونے  
کے ساتھ مشروط ہے، اور جب یہ شرط  
نہ ہو تو حرام ہے، اور یہ بات سلف کے  
زمانے میں تھی لیکن ہمارے زمانے میں تو  
مطلقاً عورت کی طرف نظر ممنوع ہے  
مگر یہ کہ کسی حاجت شرعیہ کی وجہ سے  
نظر کرنا پڑے، جیسے قاضی یا شاہد  
جن کو کسی معاملہ میں اس عورت کے  
متعلق شہادت یا فیصلہ دینا پڑے  
اور شرط صلوة میں فرمایا کہ جو ان عورت کو (اجنبی)

خلاصہ اس بحث و اختلاف فقہار کا یہ ہے کہ امام شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ  
نے نوجوان عورت کی طرف نظر کرنے کو عادت عامہ کی بناء پر سبب فتنہ قرار دے کر اس کے  
مطلقاً منع کر دیا، خواہ واقع میں فتنہ ہو یا نہ ہو، جیسے شریعت کے بہت سے احکام میں  
اس کی نظائر موجود ہیں۔ مثلاً سفر چونکہ عادت مشقت و محنت کا سبب ہوتا ہے، اس لئے  
خود سفر ہی کو مشقت کا حکم دے کر تمام احکام رخصت کے سفر متحقق ہونے پر دائر کر دیئے  
خواہ کسی شخص کو سفر میں کوئی بھی مشقت نہ ہو، بلکہ اپنے گھر سے زیادہ آرام ملے، مگر قصر نماز  
اور رخصت روزہ وغیرہ کے احکام اس کو بھی شامل ہیں۔ اسی طرح نیند کی حالت میں  
چونکہ انسان بے خبر ہوتا ہے اور عادت ریاح خارج ہو جاتی ہیں، اس لئے خود نیند ہی کو

خروج ریح کے قائم مقام قرار دے کر نیند سے وضو ٹوٹ جانے کا حکم دیدیا خواہ واقع میں ریح حاج ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔

مگر امام اعظم ابو حنیفہ نے عورت کے چہرے اور ہتھیلیاں کھولنے کو یہ درجہ نہیں دیا کہ چہرہ کھولنے ہی کو فتنہ کا قائم مقام قرار دیدیں، بلکہ حکم اس پر دائر رکھا کہ جہاں فتنہ یعنی عورت کی طرف قریب ہونے کے میلان کا خطرہ یا احتمال ہو وہاں ممنوع ہے اور جہاں یہ احتمال نہ ہو جائز ہے۔ مگر اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اس زمانے میں ایسا احتمال نہ ہو بالکل شاذ و نادر ہے اس لئے متاخرین فقہاء حنفیہ نے بھی بالآخر وہ بھی حکم دیدیا جو ائمہ ثلاثہ نے دیا تھا، کہ جو عورت کے چہرے یا ہتھیلیوں کی طرف بھی نظر ممنوع ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ اب باتفاق ائمہ اربعہ یہ تیسرا درجہ پردہ کا ممنوع ہو گیا کہ عورت برقع چادر وغیرہ میں پوئے بدن کو چھپا کر مگر صرف چہرہ اور ہتھیلیوں کو کھول کر مردوں کے سامنے آئے۔ اس لئے اب پردے کے صرف پہلے ہی دو درجے رہ گئے، ایک اہل مقصود یعنی عورتوں کا گھروں کے اندر رہنا بلا ضرورت باہر نہ نکلنا، اور دوسرا یعنی برقع وغیرہ کے ساتھ نکلنا ضرورت کی بناء پر بوقت ضرورت و بقدر ضرورت۔

مسئلہ: پردہ کے احکام مذکورہ میں بعض صورتیں مستثنیٰ بھی ہیں، مثلاً بعض مرد یعنی محارم پردہ سے مستثنیٰ ہیں اور بعض عورتیں مثلاً بہت بوڑھی وہ بھی پردے کے عام حکم کی قدر مستثنیٰ ہیں۔ ان کی تفصیل کچھ تو سورۃ نور میں گذر چکی ہے کچھ آگے سورۃ احزاب کی ان آیات میں آئے گی جن میں یہ استثنا مذکور ہو۔

پردہ کے مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر اپنے رسالہ تفصیل الخطاب فی احکام الحجاب کا کچھ خلاصہ یہاں لکھ دیا ہے جو عوام کے لئے کافی ہے، پوری تحقیق مطلوب ہو تو رسالہ مذکورہ میں دیکھی جاسکتی ہے، یہ رسالہ احکام القرآن تفسیر سورۃ احزاب میں شائع ہو چکا ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر، اے ایمان والو !

صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ⑤۶

رحمت بھیجو اس پر اور سلام بھیجو سلام کہہ کر



## خلاصہ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں ان پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اے ایمان والو تم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو (تاکہ آپ کا حق عظمت جو تمھارے ذمہ ہے ادا ہو جائے)۔

## معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ خصوصیات و امتیازات کا ذکر تھا، جن کے ضمن میں ازواج مطہرات کے پردہ کا حکم آیا تھا، اور آگے بھی کچھ احکام پردے کے آئیں گے، درمیان میں اس چیز کا حکم دیا گیا جس کے لئے یہ سب خصوصیات و امتیازات رکھے گئے ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا اظہار اور آپ کی عظمت و محبت اور اطاعت کی ترغیب ہے۔

اصل مقصود آیت کا مسلمانوں کو یہ حکم دینا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجا کریں، مگر اس کی تعبیر و بیان میں اس طرح فرمایا کہ پہلے حق تعالیٰ نے خود اپنا اور اپنے فرشتوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عمل صلوٰۃ کا ذکر فرمایا، اس کے بعد عام مؤمنین کو اس کا حکم دیا، جس میں آپ کے شرف اور عظمت کو اتنا بلند فرما دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جس کام کا حکم مسلمانوں کو دیا جاتا ہے وہ کام ایسا ہے کہ خود حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے بھی وہ کام کرتے ہیں تو عام مؤمنین جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات بے شمار ہیں ان کو تو اس عمل کا بڑا ہتمام کرنا چاہئے۔ اور ایک فائدہ اس تعبیر میں یہ بھی ہے کہ اس سے درود و سلام بھیجنے والے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی فضیلت یہ ثابت ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کام میں شریک فرمایا جو کام حق تعالیٰ خود بھی کرتے ہیں اور اس کے فرشتے بھی۔

صلوٰۃ و سلام کے معنی | لفظ صلوٰۃ عربی زبان میں چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، رحمت، دعا، مدح و ثناء، آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ

کی طرف نسبت صلوٰۃ کی ہے اس سے مراد رحمت نازل کرنا ہے، اور فرشتوں کی طرف سے صلوٰۃ ان کا آپ کے لئے دعا کرنا ہے، اور عام مؤمنین کی طرف سے صلوٰۃ کا مفہوم دعا اور مدح و ثناء کا مجموعہ ہے۔ عامہ مفسرین نے یہی معنی لکھے ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے

ابو العالیہ سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ سے مراد آپ کی تعظیم اور فرشتوں کے سامنے  
مدح و ثناء ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف آپ کی تعظیم دنیا میں تو یہ ہے کہ آپ کو بلند مرتبہ عطا  
فرمایا کہ اکثر مواقع اذان و اقامت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ آپ کا ذکر شامل  
کر دیا ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کو دنیا بھر میں پھیلادیا، اور غالب کیا، اور آپ  
کی شریعت پر عمل قیامت تک جاری رکھا، اس کی بنا پر آپ کی شریعت کو محفوظ رکھنے کا ذمہ حق تعالیٰ  
نے لے لیا۔ اور آخرت میں آپ کی تعظیم یہ ہے کہ آپ کا مقام تمام خلایق سے بلند و بالا کیا،  
اور جس وقت کسی پیغمبر اور فرشتے کو شفاعت کی مجال نہ تھی اس حال میں آپ کو مقام شفاعت  
عطا فرمایا، جس کو مقام محمود کہا جاتا ہے۔

اس معنی پر جو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ صلوٰۃ و سلام میں تو روایات حدیث کے مطابق  
آپ کے ساتھ آپ کے آل و اصحاب کو بھی شامل کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور مدح  
و ثناء میں آپ کے سوا کسی کو کیسے شریک کیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب روح المعانی وغیرہ  
میں یہ دیا گیا ہے کہ تعظیم اور مدح و ثناء وغیرہ کے درجات بہت ہیں، رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم کو اس کا اعلیٰ درجہ حاصل ہے، اور ایک درجہ میں آل و اصحاب اور عام مؤمنین  
بھی شامل ہیں۔

اور ایک لفظ صلوٰۃ سے بیک وقت متعدد معنی رحمت، دعاء،  
تعظیم و ثناء مراد لینا جو اصطلاح میں عموم مشترک کہلاتا ہے،  
ایک شبہ کا جواب

اور بعض حضرات کے نزدیک وہ جائز نہیں، اس لئے اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ لفظ  
صلوٰۃ کے اس جگہ ایک ہی معنی لئے جائیں، یعنی آپ کی تعظیم اور مدح و ثناء اور خیر خواہی  
پھر یہ معنی جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں تو اس کا حاصل رحمت ہوگا، اور فرشتوں  
کی طرف منسوب ہوں تو دعاء و استغفار ہوگا، عام مؤمنین کی طرف منسوب کیا جائے تو  
دعاء اور مدح و ثناء و تعظیم کا مجموعہ ہوگا۔

اور لفظ سلام مصدر بمعنی السلامة ہے، جیسے سلام بمعنی ملائت مستعمل ہوتا ہے۔  
اور مراد اس سے نقائص و عیوب اور آفتوں سے سالم رہنا ہے۔ اور اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ کے معنی  
یہ ہیں کہ نقائص اور آفات سے سلامتی آپ کے ساتھ رہے۔ اور عربی زبان کے قاعدہ سے  
یہاں حرف علی کا موقع نہیں، مگر چونکہ لفظ سلام معنی ثناء کو متضمن ہے، اس لئے  
حرف علی کے ساتھ عَلَیْکَ یا عَلَیْکُمْ کہا جاتا ہے۔

اور بعض حضرات نے یہاں لفظ سلام سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات لی ہے،



کیونکہ سلام اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے تو مراد اَلْسَّلَامُ عَلَیْکَ کی یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت و رعایت پر متولی اور کفیل ہے۔

**صَلوٰۃ و سلام کا طریقہ** صحیح بخاری و مسلم وغیرہ سب کتب حدیث میں یہ حدیث آئی ہے کہ حضرت کعب بن عجرہ نے فرمایا کہ (جب یہ آیت نازل ہوئی

تو) ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ (آیت میں ہمیں دو چیزوں کا حکم ہے صَلوٰۃ اور سلام) سلام کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ اَلْسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ کہتے ہیں، صَلوٰۃ کا طریقہ بھی بتلا دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ الفاظ کہا کرو اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰهٖمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰهٖمَ اِنَّکَ تَحْمِیْدُ تَحْمِیْدًا اَللّٰهُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰهٖمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰهٖمَ اِنَّکَ تَحْمِیْدُ تَحْمِیْدًا دوسری روایات میں اس میں کچھ کلمات اور بھی منقول ہیں۔

اور صحابہ کرام کے سوال کرنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کو سلام کرنے کا طریقہ تو شہد (یعنی الخیات) میں پہلے سکھایا جا چکا تھا کہ اَلْسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُہٗ کہا جائے، اس لئے لفظ صَلوٰۃ میں انھوں نے اپنی طرف سے الفاظ مقرر کرنا پسند نہیں کیا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر کے الفاظ صَلوٰۃ متعین کرائے۔ اسی لئے نماز میں عام طور پر اپنی الفاظ کے ساتھ صَلوٰۃ کو اختیار کیا گیا ہی، مگر یہ کوئی ایسی تعین نہیں جس میں تبدیلی ممنوع ہو، کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صَلوٰۃ یعنی درود شریف کے بہت سے مختلف صیغے منقول و ماثور ہیں صَلوٰۃ و سلام کے حکم کی تعمیل ہر اس صیغہ سے ہو سکتی ہے جس میں صَلوٰۃ و سلام کے الفاظ ہوں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعینہ منقول بھی ہوں، بلکہ جس عبارت سے بھی صَلوٰۃ و سلام کے الفاظ ادا کئے جائیں اس حکم کی تعمیل اور درود شریف کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جو الفاظ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں وہ زیادہ بابرکت اور زیادہ ثواب کے موجب ہیں، اسی لئے صحابہ کرام نے الفاظ صَلوٰۃ آپ سے متعین کرانے کا سوال فرمایا تھا۔

**مسئلہ:** قعدۂ نماز میں توقیامت تک الفاظ صَلوٰۃ و سلام اُسی طرح کہنا

مسنون ہے، جس طرح اوپر منقول ہوئے ہیں اور خارج نماز میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود مخاطب ہوں جیسا کہ آپ کے عہد مبارک میں وہاں تو وہی الفاظ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ کے اختیار کئے جائیں، آپ کی وفات کے بعد روضۂ اقدس کے سامنے

جب سلام عرض کیا جائے تو اس میں بھی صیغہ السلام علیک کا اختیار کرنا مسنون ہے۔ اس کے علاوہ جہاں غائبانہ صلوٰۃ و سلام پڑھا جائے تو صحابہ و تابعین اور ائمہ امت سے صیغہ غائب کا استعمال کرنا منقول ہے، مثلاً **صلی اللہ علیہ وسلم** جیسا کہ امام محدثین کی کتابیں اس سے لبریز ہیں۔

صلوٰۃ و سلام کے مذکورہ جو طریقہ صلوٰۃ و سلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک طریقہ کی حکمت اور آپ کے عمل سے ثابت ہوا اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم سب مسلمان آپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے رحمت و سلامتی کی دعا کریں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقصود آیت کا تو یہ تھا کہ ہم آپ کی تعظیم و تکریم کا حق خود ادا کریں، مگر طریقہ یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق تعظیم و اطاعت پورا ادا کرنا ہمارے کسی کے بس میں نہیں، اس لئے ہم پر یہ لازم کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں (روح)

نماز کے قعدہ اخیرہ میں صلوٰۃ (درود شریف) سنت مؤکدہ تو صلوٰۃ و سلام کے احکام سب کے نزدیک ہے، امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے

نزدیک واجب ہی، جس کے ترک سے نماز واجب اعادہ ہو جاتی ہے۔  
**مسئلہ:** اس پر بھی جمہور فقہاء کا اتفاق ہے جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرے یا سنے تو اس پر درود شریف واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حدیث میں آپ کے ذکر مبارک کے وقت درود شریف نہ پڑھنے پر وعید آئی ہے، جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: **رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عَنْهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ**، یعنی دلیل ہو وہ آدمی جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے (قال الترمذی حدیث حسن درواہ ابن اسنی باسناد جید)

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے **أَلْبَيْحُ لِمَنْ ذُكِرْتُ عَنْهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ** یعنی بخیل وہ شخص ہے جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

**مسئلہ:** اگر ایک مجلس میں آپ کا ذکر مبارک بار بار آئے تو صرف ایک مرتبہ درود پڑھنے سے واجب ادا ہو جاتا ہے، لیکن مستحب یہ ہے کہ جتنی بار ذکر مبارک خود کرے یا کسی سے سنے ہر مرتبہ درود شریف پڑھے۔ حضرات محدثین سے زیادہ کون آپ کا ذکر کر سکتا ہے کہ اُن کا ہر وقت کا مشغلہ ہی حدیث رسولؐ ہے، جس میں ہر وقت بار بار آپ کا



ذکر آتا ہے تمام ائمہ حدیث کا دستور یہی رہا ہے کہ ہر مرتبہ درود و سلام پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ تمام کتب حدیث اس پر شاہد ہیں۔ انھوں نے اس کی بھی پروا نہیں کی کہ اس تکرار صلوٰۃ و سلام سے کتاب کی ضخامت کافی بڑھ جاتی ہے کیونکہ اکثر تو چھوٹی چھوٹی حدیثیں آتی ہیں جن میں ایک دو سطر کے بعد نام مبارک آتا ہے، اور بعض جگہ تو ایک سطر میں ایک سے زیادہ مرتبہ نام مبارک مذکور ہوتا ہے، حضرات محدثین کہیں صلوٰۃ و سلام ترک نہیں کرتے۔

مَسْئَلَةٌ: جس طرح زبان سے ذکر مبارک کے وقت زبانی صلوٰۃ و سلام واجب ہے اسی طرح قلم سے لکھنے کے وقت صلوٰۃ و سلام کا قلم سے لکھنا بھی واجب ہے، اور اس میں جو لوگ حروف کا اختصار کر کے "صلعم" لکھ دیتے ہیں یہ کافی نہیں، پورا صلوٰۃ و سلام لکھنا چاہئے۔

مَسْئَلَةٌ: ذکر مبارک کے وقت افضل و اعلیٰ اور مستحب تو یہی ہے کہ صلوٰۃ اور سلام دونوں پڑھے اور لکھے جائیں، لیکن اگر کوئی شخص ان میں سے ایک یعنی صرف صلوٰۃ یا صرف سلام پر اکتفا کرے تو جمہور فقہاء کے نزدیک کوئی گناہ نہیں شیخ الاسلام نوویؒ وغیرہ نے دونوں میں سے صرف ایک پر اکتفا کرنا مکروہ فرمایا ہے۔ ابن حجر مہیسیؒ نے فرمایا کہ ان کی مراد کراہت سے خلافت اولیٰ ہونا ہے، جس کو اصطلاح میں مکروہ تنزیہی کہا جاتا ہے۔ اور علماء امت کا مسلسل عمل اس پر شاہد ہے کہ وہ دونوں ہی کو جمع کرتے ہیں، اور بعض اوقات ایک پر بھی اکتفا کر لیتے ہیں۔

مَسْئَلَةٌ: لفظ صلوٰۃ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کے لئے استعمال کرنا جمہور علماء کے نزدیک جائز نہیں۔ امام بیہقی نے اپنے سنن میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے: لَا يُصَلِّي عَلَى أَحَدٍ إِلَّا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَكُنْ يَدْعُو لِلْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ بِالْإِسْتِغْفَارِ

امام شافعیؒ کے نزدیک غیر نبی کے لئے لفظ صلوٰۃ کا استعمال مستقلاً مکروہ ہے، امام اعظم ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے، البتہ تبعاً جائز ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام کے ساتھ آل و اصحاب یا تمام مؤمنین کو شریک کر لے اس میں مضائقہ نہیں۔

اور امام جوینیؒ نے فرمایا کہ جو حکم لفظ صلوٰۃ کا ہے وہی لفظ سلام کا بھی ہے کہ غیر نبی کے لئے اس کا استعمال درست نہیں، بجز اس کے کہ کسی کو خطاب کرنے کے وقت بطور تحیہ کے السلام علیکم کہے، یہ جائز و مستنون ہے۔ مگر کسی غائب کے نام کے ساتھ

”علیہ السلام“ کہنا اور لکھنا غیر نبی کے لئے درست نہیں (خصوصاً نص، کبریٰ سیوطی ص ۲۶۲) علامہ لقانی نے فرمایا کہ قاضی عیاض نے فرمایا ہے کہ محققین علماء امت اس طرف گئے ہیں اور میرے نزدیک بھی یہی صحیح ہے، اور اسی کو امام مالک، سفیان اور بہت سے فقہاء و مکتبین نے اختیار کیا ہے کہ صلوٰۃ و تسلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کے لئے مخصوص ہے غیر نبی کے لئے جائز نہیں، جیسے لفظ سبحانہ اور تعالیٰ، اللہ جل شانہ کے لئے مخصوص ہے۔ انبیاء کے سوا عام مسلمانوں کے لئے مغفرت اور رضا کی دعا ہونا چاہئے، جیسے قرآن میں حضرات صحابہ کے متعلق آیا رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ وَ رَضُوا عَنْہُ (روح المعانی) صلوٰۃ و سلام کے احکام کی مفصل بحث احقر کے رسالہ تنقیح الکلام فی احکام الصلوٰۃ والسلام میں ہو جو زبان عربی احکام القرآن سورۃ احزاب کا جزء ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَ

جو لوگ سقائے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول کو اُن کو پھٹکارا اللہ نے دنیا میں اور

الْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ۝۵۰ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ

آخرت میں اور تیار رکھا ہو ان کے واسطے ذلت کا عذاب۔ اور جو لوگ تہمت لگاتے ہیں مسلمان

الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغْيٍ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدْ احْتَمَلُوا

مردوں کو اور مسلمان عورتوں کو بدون گناہ کئے تو اٹھایا انھوں نے بوجھ

بُھٹاناً وَ اِثْمًا مُّبِينًا ۝۵۱

جھوٹ کا اور صریح گناہ کا

## خُلاصۃ تفسیر

بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رقصداً

ایذا دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر دنیا و آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لئے ذلیل

کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے، اور اسی طرح جو لوگ ایمان والے مردوں اور ایمان

والی عورتوں کو بدون اس کے کہ انہوں نے کچھ (ایسا کام) کیا ہو (جس سے وہ مستحقِ سزا ہو جائیں) ایذا پہنچاتے ہیں

تو وہ لوگ بہتان اور صریح گناہ کا (اپنے اپنے) بار لیتے ہیں (یعنی اگر وہ ایذا تو لی ہے تو بہتان ہے اور اگر فعلی ہے تو مطلق گناہ ہے)۔



## معارف و مسائل

سابقہ آیات میں مسلمانوں کو ان چیزوں پر تنبیہ کی گئی تھی جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا و تکلیف پہنچتی تھی، مگر کچھ مسلمان ناواقفیت یا بے توجہی کی وجہ سے بلا قصد ایذا اس میں مبتلا ہو جاتے تھے، جیسا کہ آپ کے بیوت میں بلا دعوت چلے جانا یا دعوت کے وقت بہت پہلے آکر بیٹھ جانا یا کھانے کے بعد آپ کے گھر میں باہمی بات چیت میں مشغول ہو کر دیر لگانا وغیرہ جن پر آیت **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُدْعِيَ إِلَيْكُمْ** میں تنبیہ کی گئی ہے۔ یہ وہ ایذا ہے جو بلا قصد و ارادہ غفلت سے پہنچ جاتی تھی، اس پر تو صرف تنبیہ کر دینا کافی سمجھا گیا۔ مذکورہ صدر دو آیتوں میں اس ایذا و تکلیف کا ذکر ہے جو مخالفین اسلام کفار و منافقین کی طرف سے قصداً آپ کو پہنچائی جاتی تھی۔ اسی لئے خلاصہ تفسیر میں یہاں قصد کا لفظ بڑھایا ہے، جس میں جسمانی ایذائیں بھی داخل ہیں، جو مختلف اوقات میں کفار کے ہاتھوں آپ کو پہنچتی ہیں اور روحانی ایذائیں بھی جو آپ پر طعن و تشنیع اور ازدواج مطہرات پر بہتان تراشی کے ذریعہ پہنچائی گئیں۔ اس بالارادہ ایذا پہنچانے پر لعنت اور عذاب شدید کی وعید بھی آیت مذکورہ میں آتی ہے۔

اس آیت کے شروع میں جو یہ ارشاد ہوا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچاتے ہیں اس میں ایذا پہنچانے سے مراد وہ افعال و اقوال ہیں جو عادتاً ایذا کا سبب بنا کرتے ہیں۔ اگرچہ حق تعالیٰ کی ذات پاک ہر تاثر و انفعال سے بالاتر ہے کسی کی مجال ہی نہیں کہ اس تک کوئی تکلیف پہنچا سکے، لیکن ایسے افعال جن سے عادتاً ایذا پہنچا کرتی ہے ان کو ایذا اللہ سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

اس میں ائمہ تفسیر کا اختلاف ہے کہ یہاں پر اللہ کو ایذا دینے سے کیا مراد ہے؟ بعض ائمہ تفسیر نے ان افعال و اقوال کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے، جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی احادیث میں بتلایا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایذا کا سبب ہیں، مثلاً حوادث و مصائب کے وقت زمانہ کو بُرا کہنا کہ درحقیقت فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہے، یہ لوگ زمانہ کو فاعل سمجھ کر گالیاں دیتے تھے تو درحقیقت وہ فاعل حقیقی تک پہنچتی تھیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ جان دار چیزوں کی تصویریں بنانا اللہ تعالیٰ کی ایذا کا سبب ہے۔ تو آیت میں اللہ کو ایذا دینے سے مراد یہ اقوال یا افعال ہیں۔ اور دوسرے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہاں درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی ایذا سے روکنا اور اس پر وعید کرنا مقصود ہے۔ مگر آیت میں ایذا رسول کو ایذا چق تعالیٰ کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا، کیونکہ آپ کو ایذا پہونچانا اور حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو ایذا پہونچانا ہے جیسا کہ حدیث میں آگے آتا ہے۔ اور قرآن کے سیاق و سباق سے بھی ترجیح اسی دوسری قول کی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ پہلے بھی ایذا رسول کا بیان تھا اور آگے بھی اسی کا بیان آ رہا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کا اللہ تعالیٰ کے لئے ایذا ہونا حضرت عبدالرحمن بن مغفل مرزی رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے کہ:-

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو اللہ سے ڈرو ان کو میرے بعد اپنی اعتراف و تنقیدات کا نشانہ نہ بناؤ، کیونکہ ان سے جس نے محبت کی میری محبت کی وجہ سے کی اور جس نے بغض رکھا میرے بغض کی وجہ سے رکھا، اور جس نے ان کو ایذا پہونچائی اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی اور جس نے اللہ کو ایذا دی تو قریب ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے گرفتار کرے“

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
لَا تَخِذُوا مِنِّي غَرَضًا مِنْ  
بَعْدِي فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَيُحِبِّي  
أَحَبَّهُمْ وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ  
فَيَبْغِضِي أَبْغَضَهُمْ وَمَنْ  
أَذَاهُمْ فَقَدْ أَذَانِي وَمَنْ  
أَذَى لِي فَقَدْ أَذَى اللَّهِ وَمَنْ  
أَذَى لِلَّهِ يُوْشِكُ أَنْ يَأْخُذَ

(ترمذی)

اس حدیث سے جیسا یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا سے اللہ تعالیٰ کی ایذا ہوتی ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام میں سے کسی کو ایذا پہونچانا یا ان کی شان میں گستاخی کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا ہے۔ اس آیت کے شان نزول کے متعلق متعدد روایات ہیں بعض ہیں کہ یہ حضرت صدیقہ عائشہؓ پر بہتان لگانے کے متعلق نازل ہوئی ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہو کہ جس زمانہ میں حضرت صدیقہ عائشہؓ پر بہتان باندھا گیا تو عبداللہ بن ابی منافق کے گھر میں کچھ لوگ جمع ہوئے اور اس بہتان کو پھیلانے چلتا کرنے کی باتیں کرتے تھے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے اس کی شکایت فرمائی کہ یہ شخص مجھے ایذا پہونچاتا ہے۔ (مظہری)

بعض روایات میں ہے کہ حضرت صفیہؓ سے نکاح کے وقت کچھ منافقین نے طعن کیا اس کے متعلق نازل ہوئی۔ اور صحیح بات یہی ہے کہ یہ آیت ہر ایسے معاملہ کے متعلق



نازل ہوئی ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہونچے اس میں صدیقہ عائشہؓ پر بہتان بھی داخل ہے اور حضرت صفیہؓ اور زینبؓ کے نکاحوں پر طعن و تشنیع بھی شامل ہے دوسرے صحابہ کرام کو برا کہنا اور ان پر تبرک کرنا بھی داخل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح کی ایذا پہونچانا کفر ہے | **مَسْئَلَةٌ**: جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح کی ایذا پہونچائے، آپ کی ذات یا صفات میں کوئی عیب نکالے خواہ صراحت ہو یا کنایت وہ کافر ہو گیا، اور اس آیت کی رو سے اُس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت دنیا میں بھی ہوگی اور آخرت میں بھی (کذا قال القاضي شتاء اللہ فی التفسیر المنطوری)

دوسری آیت میں عام مؤمنین کو ایذا پہونچانے کے حرام اور بہتان عظیم ہونے کو بیان کیا ہے جبکہ وہ شرعاً اس کے مستحق نہ ہوں۔ عام مؤمنین میں یہ قید اس لئے لگائی کہ ان میں دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس کے بدلے میں اس کو ایذا دینا شرعاً جائز ہے، اور پہلی آیت میں چونکہ معاملہ اللہ و رسول کی ایذا کا تھا اس میں کوئی قید نہیں لگائی اس لئے کہ وہاں جائز ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔ کسی مسلمان کو بغیر وجہ شرعی | مذکورہ آیت میں **الَّذِينَ يُؤْخَذُونَ الْمُؤْمِنِينَ** (الی، بھٹتانا دیکھ پہونچانا حرام ہے | **عَظِيمًا** سے کسی مسلمان کو بغیر وجہ شرعی کے کسی قسم کی ایذا اور دیکھ پہونچانے کی حرمت ثابت ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:-

الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلَى دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (منطوری)

”مسلمان تو صرف وہ آدمی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے سب مسلمان محفوظ ہوں کسی کو تکلیف نہ پہونچے، اور مؤمن تو صرف وہی ہے جس سے لوگ اپنے خون اور مال کے معاملہ میں محفوظ و مامون ہوں“

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَنفُسِكُمْ وَبَنَاتِكُمْ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ

اے نبی کہہ دے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں کو

يُنِّينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَا بَيْتِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰی اَنْ يَّحْضَرْنَ

نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں، اس میں بہت قریب ہے کہ پہچانی پڑیں تو

فَلَا يُؤَدِّينَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝۵۹ لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ

کوئی ان کو دستاویز، اور ہر اللہ بخشنے والا مہربان۔ البتہ اگر باز نہ آئے

السَّافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي

مناقض اور جن کے دل میں روگ ہے اور جھوٹی خبریں اڑانے والے

السِّلَيطَةِ لَنْغَرِيبَكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۝۶۰

مہینہ میں تو ہم لگا دیں گے تجھ کو ان کے پیچھے پھر نہ رہیں یا نہیں تیری ساتھ اس شہر میں مگر تھوڑی دنوں

مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثَقِفُوا أَخِذُوا وَقِطِّلُوا الْقَتِيلَ ۝۶۱ سُنَّةَ اللَّهِ

پھٹکا رہے ہو، جہاں پائے گئے پکڑے گئے، اور مارے گئے جان سے۔ دستور پڑا ہوا ہی اللہ کا

فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبِيلًا ۝۶۲

ان لوگوں میں جو پہلے ہو چکے ہیں اور تو نہ دیکھے گا اللہ کی حیل بدلتی۔

## خلاصہ تفسیر

اے پیغمبر اپنی بیبیوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ (سرسے) نہی کر لیا کریں اپنے (چہرے کے) اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی تو آزار نہ دی جایا کریں گی یعنی کسی ضرورت سے باہر نکلنا پڑے تو چادر سے سر اور چہرہ بھی چھپا لیا جائے جیسا کہ سورۃ نور کے ختم کے قریب غَیْرُ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ میں اس کی تفسیر روایت سے گذر چکی ہے، چونکہ کنیزوں کے لئے سر فی نَفْسٍ داخل ستر نہیں، اور چہرہ کھولنے میں ان کو آزاد عورتوں سے زیادہ رخصت ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی خدمت میں لگی رہتی ہیں، اس لئے کام کاج کے لئے ان کو باہر نکلنے اور چہرہ وغیرہ کھولنے کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے، بخلاف آزاد عورتوں کے کہ وہ اتنی مجبور نہیں، اور چونکہ او با ش لوگ آزاد عورتوں کو چھیڑنے کی ہمت ان کی خاندانی وجاہت و حمایت کی وجہ سے نہ کرتے تھے، کنیزوں کو چھیڑتے تھے، بعض اوقات کنیزوں کے دھوکے میں آزاد عورتوں کو بھی چھیڑنے لگتے تھے، اس لئے اس آیت نے آزاد عورتوں کو کنیزوں سے ممتاز کرنے کے لئے بھی اور اس لئے بھی کہ سر اور گردن وغیرہ ان کا ستر میں داخل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج و بنات اور عام مسلمانوں کی بیبیوں کو یہ حکم دیا کہ



یہی چادر میں مستور ہو کر نکلیں جس کو سر سے کچھ نیچے چہرے پر لٹکالیا کریں جس کو اردو میں گھونگٹ کرنا کہتے ہیں۔ اس حکم سے پردہ شرعی کے حکم کی تعمیل بھی ہو جائے گی اور بہت سہولت کے ساتھ ادب و باش اور شریر لوگوں سے حفاظت بھی رہے گی۔ غیر حرائر یعنی کنیزیں سوان کی حفاظت کا انتظام اگلی آیت میں آئے گا، اور اس چہرہ کے اردو سر کے ڈھانکنے میں اگر کوئی کمی یا بے احتیاطی بلا قصد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے اس کو معاف کر دے گا۔ آگے ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی جو کنیزوں کو چھیڑا کرتے تھے اور ان لوگوں کو بھی جو ایک دوسری شرارت کے مرتکب تھے کہ مسلمانوں کے خلاف غلط افواہیں پھیلا کر ان کو پریشان کرنا چاہتے تھے فرمایا: یہ (خاص اصل) منافقین اور (عام منافقین میں سے) وہ لوگ جن کے دلوں میں (شہوت پرستی کی) تحریقی ہے (جس کی وجہ سے کنیزوں کو چھیڑنے اور پریشان کرتے ہیں) اور (انہی منافقین میں) وہ لوگ جو مدینہ میں (جھوٹی اور پریشان کرنے والی) افواہیں اڑایا کرتے ہیں (یہ لوگ) اگر (اپنی ان حرکتوں سے) باز نہ آئے تو ضرور (ایک نہ ایک دن) ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے (یعنی ان کے مدینہ سے اخراج کا حکم کر دیں گے) پھر (اس حکم کے بعد) یہ لوگ آپ کے پاس مدینہ میں بہت ہی کم رہنے پائیں گے وہ بھی (ہر طرف سے) پھٹکارے ہوئے (یعنی مدینہ سے نکل جانے کا سامان کرنے کے لئے جو کچھ قلیل مدت معین کی جائے گی اس مدت میں تو یہ یہاں رہ لیں گے اور اس مدت میں بھی ہر طرف سے ذلیل و خوار ہوں گے، پھر نکال دیئے جائیں گے اور نکالنے کے بعد بھی کہیں امن نہ ہوگا بلکہ) جہاں ملیں گے پکڑ دھکڑ اور مار دھار کی جائے گی (وجہ یہ کہ ان منافقین کے کفر کا مقتضا تو یہی تھا، لیکن نفاق کی آڑ میں ان کو پناہ ملی ہے جب علی الاعلان ایسی مخالفتیں کرنے لگیں گے، تو وہ مانع اٹھ گیا اس لئے ان کے ساتھ بھی کفر کے اصلی اقتضاء کے موافق معاملہ ہوگا کہ ان کا اخراج اور قید اور قتل سب جائز ہے، اور اگر خروج کے لئے کچھ مدت معین ہو جائے تو اس مدت کے اندر بوجہ معاہدہ کے مأمون ہوں گے، اس کے بعد جہاں ملیں گے عہد ختم ہو جانے کی بناء پر ان کے قتل و قید کی اجازت ہوگی۔ منافقین کو جو یہ دھمکی دی گئی اس میں کنیزوں کو چھیڑنے کا بھی انتظام کیا اور دوسری شرارت افواہیں پھیلانے کا بھی انسداد ہو گیا۔

مطلب آیت کا یہ ہو گیا کہ اگر یہ لوگ علی الاعلان مخالفت احکام اور مسلمانوں کے خلاف حرکتوں سے باز آگئے گو اپنی درپردہ منافقانہ چالوں میں لگے رہیں۔ تو یہ سزا جاری نہ ہوگی، ورنہ پھر عام کفار کے حکم میں داخل ہو کر سزاوار سزا ہو جائیں گے، اور فساد و شورش پر سزا جاری کرنا کچھ انہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان (مفسد) لوگوں میں بھی

اپنا یہی دستور (جاری) رکھا ہی جو دان سے پہلے ہو گزرے ہیں کہ ان کو آسمانی سزائیں یا انبیاء کے ہاتھ سے جہاد کے ذریعہ سزائیں دلوائی ہیں، پس اگر پہلے ایسا نہ ہو چکتا تو ایسی سزا میں کچھ استبعاد ہو سکتا تھا، اور اب تو اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں، اور آپ اللہ تعالیٰ کے دستور میں کسی شخص کی طرف سے رد و بدل نہ پائیں گے کہ خدا تو کوئی حکم جاری کرنا چاہے اور کوئی اس کو روک سکے، لفظ سنتہ اللہ میں تو اس کا اظہار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ سے پہلے کوئی کام نہیں کر سکتا، اور وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا، میں یہ بتلا دیا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرمالیں تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا،

## معارف و مسائل

سابقہ آیات میں عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کو ایذا پہنچانے کا حرام اور گناہ کبیرہ ہونا اور خصوصاً سید المؤمنین صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کا کفر موجب لعنت ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ منافقین کی طرف سے دو طرح کی ایذائیں سب ملنا فوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچتی تھیں، آیات مذکورہ میں ان ایذاؤں کے السداد کا انتظام ہی، اور اس کے ضمن میں عورتوں کے پردے کے کچھ مزید احکام کا بیان ایک مناسبت سے آیا ہے جو آگے معلوم ہو جائے گی۔ ان دونوں ایذاؤں میں ایک یہ تھی کہ منافقین کے عوام اور آوارہ قسم کے لوگ مسلمانوں کی باندیوں کنیزوں کو جب وہ کام کاج کے لئے باہر نکلتیں چھیڑا کرتے تھے، اور کبھی کنیزوں کے شبہ میں حرائر کو ستاتے تھے، جس کی وجہ سے عام مسلمانوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچتی تھی۔

دوسری ایذا یہ تھی کہ یہ لوگ ہمیشہ ایسی جھوٹی خبریں اڑاتے تھے کہ اب فلاں غنیمت مدینہ پر چڑھائی کرنے والا ہے وہ سب کو ختم کر دے گا۔ آیات مذکورہ میں پہلی ایذا سے حرائر (آزاد بیبیوں) کو بچانے کا فوری اور سہل انتظام یہ ہو سکتا تھا کہ ان کو یہ لوگ ان کے خاندان کی وجاہت اور حمایت کی وجہ سے بالقصد چھیڑنے کی جرأت نہ کرتے تھے، کبھی کنیزوں کے شبہ میں یہ بھی ان کی چھیڑ چھاڑ کی زد میں آجاتی تھیں، اگر ان کی پہچان ہو جاتی تو یہ نوبت نہ آتی، اس لئے ضرورت پیش آتی کہ حرائر کا کوئی خاص امتیاز ہو جائے تاکہ آسانی کے ساتھ خود بخود ہی کم از کم حرائر تو ان شریروں کے فساد سے فوری طور پر محفوظ ہو جائیں اور کنیزوں کا دوسرا انتظام کیا جائے۔

دوسری طرف شریعت اسلام نے حرائر اور کنیزوں کے پردہ شرعی میں بصورت



ایک فرق بھی رکھا ہے کہ کنیزوں کا شرعی پردہ وہ ہے جو حرائر کا اپنے محرموں کے سامنے ہوتا ہے کہ مثلاً چہرہ وغیرہ کھولنا جو حرائر کے لئے اپنے محرموں کے سامنے جائز ہے، کنیزوں کے لئے باہر بھی اس کی اجازت اس لئے دی گئی کہ ان کا کام ہی اپنے آقا اور اس کے گھر کی خدمت ہے جس میں ان کو باہر بھی بار بار نکلنا پڑتا ہے، اور چہرہ اور ہاتھ مستور رکھنا مشکل ہوتا ہے، بخلاف حرائر کے کہ ان کو کسی ضرورت سے باہر نکلنا بھی پڑے تو کبھی کبھی ہوگا جس میں پوشے پر فے کی رعایت مشکل نہیں، اس لئے حرائر کو یہ حکم دیدیا گیا کہ وہ لمبی چادر جس میں مستور ہو کر نکلتی ہیں اس کو اپنے سر پر سے چہرے کے سامنے لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ اجنبی مردوں کے سامنے نہ آئے اس سے ان کا پردہ بھی مکمل ہو گیا، اور باندیوں کنیزوں سے امتیاز خاص بھی ہو گیا، جس کے سبب وہ شریر لوگوں کی پھینٹ چھاڑ سے خود بخود مامون ہو گئیں۔ اور کنیزوں کی حفاظت کا انتظام ان منافقین کو سزا کی وعید سنا کر کیا گیا کہ اس سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں بھی اپنے جی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دلوائیں گے۔

آیت مذکورہ میں حرۃ (آزاد) عورتوں کے پردہ کے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ یُنِیْنِ عَلَیْھُنَّ مِنْ جَلَابِیْہِہُنَّ، اس میں یُنِیْنِ، اِدْنًا سے مشتق ہے، جس کے لفظی معنی قریب کرنے کے ہیں اور لفظ عَلَیْھُنَّ کے معنی اپنے اوپر اور جَلَابِیْہُ جمعِ جَلَبَاب کی جو ایک خاص لمبی چادر کو کہا جاتا ہے، اس چادر کی ہیئت کے متعلق حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ وہ چادر ہے جو دو پٹے کے اوپر اوڑھ لی جاتی ہے (ابن کثیر) اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کی ہیئت یہ بیان فرمائی ہے۔

”اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے نکلیں تو اپنے سروں کے اوپر سے یہ چادر لٹکا کر چہروں کو چھپالیں اور صرف ایک آنکھ (راستہ دیکھنے کے لئے) کھلی رکھیں“

أَمَرَ اللّٰهُ نِسَاءَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا خَرَجْنَ مِنْ بُیُوْتِهِنَّ فِیْ حَاجَۃٍ اَنْ یَّغْطِیْنَ وُجُوْھَهُنَّ مِنْ فَوْقٍ رُّءُوسِهِنَّ بِالْجَلَابِیْبِ وَیُبدِلْنَ عِیْنًا وَّاحِدَةً (ابن کثیر)

اور امام محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبیدہ سلمانیؓ سے اس آیت کا مطلب اور جلیباب کی کیفیت دریافت کی تو انھوں نے سر کے اوپر سے چادر... چہرہ پر لٹکا کر چہرہ چھپالیا، اور صرف بائیں آنکھ کھلی رکھ کر اِدْنًا و جَلَبَاب کی تفسیر عملاً بیان فرمائی۔

سر کے اوپر سے چہرہ پر چادر لٹکانا جو حضرت ابن عباسؓ اور عبیدہ سلمانی کے بیان میں آیا ہے یہ لفظ عَلَیْہُمْ کی تفسیر ہے کہ اپنے اوپر چادر کو قریب کرنے کا مطلب چادر کو سر کے اوپر سے چہرہ پر لٹکانا ہے۔

اس آیت نے بصراحت چہرہ کے چھپانے کا حکم دیا ہے جس سے اس مضمون کی مکمل تائید ہو گئی جو اوپر حجاب کی پہلی آیت کے ذیل میں مفصل بیان ہو چکا ہے، کہ چہرہ اور ہتھیلیاں اگرچہ فی ثوبہ ستر میں داخل نہیں مگر بوجہ خوفِ فتنہ کے ان کا چھپانا بھی ضروری ہے، صرف مجبوری کی صورتیں مستثنیٰ ہیں۔

اس آیت میں حرّہ عورتوں کو ایک خاص طرح کے پردہ کی ہدایت

### تنبیہ ضروری

فرمائی کہ چادر کو سر کے اوپر سے لٹکا کر چہرے کو چھپالیں، تاکہ عام کنیزوں سے ان کا امتیاز ہو جائے اور یہ شریر لوگوں کے فتنہ سے محفوظ ہو جائیں۔ مذکور الصدر بیان میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام نے عصمتِ عفت کی حفاظت میں حرائر اور کنیزوں کے درمیان کوئی فرق کر دیا کہ حرائر کی حفاظت کرائی، کنیزوں کو چھوڑ دیا، بلکہ درحقیقت یہ فرق ادبائش شریر لوگوں نے خود کر رکھا تھا، کہ حرائر پر دست اندازی کی تو جرأت و ہمت نہیں کرتے تھے، مگر امار یعنی کنیزوں کو چھیڑتے تھے، شریعت اسلام نے ان کے اختیار کردہ اس فرق سے یہ فائدہ اٹھایا کہ عورتوں کی اکثریت تو خود اپنی کے مسلمہ عمل کے ذریعہ — خود بخود محفوظ ہو جائے، باقی رہا کنیزوں کا معاملہ سو ان کی عصمت کی حفاظت بھی اسلام میں ایسی ہی فرض و ضروری ہے جیسی حرائر کی۔ مگر اس کے لئے قانونی تشدد اختیار کئے بغیر چارہ نہیں، تو اگلی آیت میں اس کا قانون بتلا دیا کہ جو لوگ اپنی اس حرکت سے باز نہ آئیں گے ان کو کسی طرح معاف نہ کیا جائے گا، بلکہ جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے، اور قتل کر دیئے جائیں گے، اس نے کنیزوں کی عصمت کو بھی حرائر کی طرح محفوظ کر دیا۔

اس سے واضح ہو گیا کہ علامہ ابن حزم وغیرہ نے جو مذکورہ شبہ سے بچنے کے لئے آیت کی تفسیر جمہور علماء سے مختلف کرنے کی تاویل کی ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں، شبہ توجب ہوتا جبکہ کنیزوں کی حفاظت کا انتظام نہ کیا گیا ہوتا۔

جو شخص مسلمان ہونے کے بعد مرتد آیت مذکورہ میں منافقین کی دو شرائط کا ذکر کر کے ان سے ہو جائے اس کی سزا قتل ہے۔ باز نہ آنے کی صورت میں جس سزا کا ذکر کیا گیا ہے کہ مَآخُورَیْنِ اَیْنَمَا تَقْفُوْا اِخْلُوْا وَ قَتِلُوْا تَقْتِیْلًا، یعنی یہ لوگ جہاں رہیں گے لعنت



اور پٹھکاران کے ساتھ ہوگی، اور جہاں ملیں گے گرفتار کئے جائیں گے اور قتل کر دیئے جائیں گے، یہ سزا عام کفار کی نہیں، بے شمار نصوص قرآن و سنت اس پر شاہد ہیں کہ عام کفار کے لئے شریعت اسلام میں یہ قانون نہیں ہے، بلکہ قانون یہ ہے کہ اول ان کو دعوت اسلام دی جائے ان کے شبہات دور کرنے کی کوشش کی جائے اس پر بھی وہ اسلام نہ لائیں تو مسلمانوں کے تابع ذمی بن کر رہنے کا حکم دیا جائے، اگر وہ اس کو قبول کر لیں تو ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت مسلمانوں پر مسلمانوں ہی کی طرح فرض ہو جاتی ہے، ہاں جو اس کو بھی قبول نہ کریں اور جنگ ہی پر آمادہ ہو جائیں تو ان کے مقابلہ میں جنگ کرنے کا حکم ہے۔ اس آیت میں ان لوگوں کو مطلقاً قید و قتل کی سزا سنائی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاملہ منافقین کا تھا جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے۔ اور جب کوئی مسلمان احکام اسلام کی کھلی مخالفت اور انکار کرنے لگے تو وہ اصطلاح شرع میں مرتد کہلاتا ہے، اس کے ساتھ شریعت اسلام میں کوئی مصالحت نہیں، بجز اس کے کہ وہ تائب ہو کر پھر مسلمان ہو جائے، اور احکام اسلام کو قولاً و عملاً تسلیم کر لے ورنہ پھر اس کو قتل کیا جائے گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات اور صحابہ کرام کے اجماعی تعامل سے ثابت ہے۔ میلہ کذاب اور اس کی جماعت کے خلاف باجماع صحابہ جنگ و جہاد اور میلہ کا قتل اس کی کافی شہادت ہے، اور آخر آیت میں اس کو اللہ تعالیٰ کی قدیم سنت و دستور قرار دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انبیاء سابقین کی شرائع میں بھی مرتد کی سزا قتل ہی تھی۔ مذکورہ صدر خلاصہ تفسیر میں ان سزاؤں کو عام کفار کے ضابطہ میں لانے کے لئے جو توجیہ کی گئی ہے اس تقریر سے اس کی ضرورت نہیں رہتی۔

اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ :-

### چند مسائل

(۱) عورتوں کو جب کسی ضرورت کی بناء پر گھر سے نکلتا پڑے تو لمبی چادر سے تمام بدن چھپا کر نکلیں، اور اس چادر کو سر کے اوپر سے لٹکا کر چہرہ بھی چھپا کر چلیں، مروجہ برقع بھی اس کے قائم مقام ہے۔

(۲) مسلمانوں میں ایسی افواہیں پھیلانا حرام ہے جن سے ان کو تشویش اور پریشانی ہو اور نقصان پہنچے۔

يَسْأَلُ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ وَمَا

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کو، تو کہہ اس کی خبر ہی اللہ ہی کے پاس، اور تو کیا

يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ۝ (۶۳) اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ

جانے شاید وہ گھڑی پاس ہی ہو۔ بے شک اللہ نے پھٹکار دیا ہر منکروں کو

وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا ۝ (۶۴) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا لَا يَجِدُوْنَ وِلِيًّا

اور رکھی ہر ان کے واسطے دہکتی آگ۔ رہا کریں اسی میں ہمیشہ نہ پائیں کوئی حمایتی

وَلَا نَصِيْرًا ۝ (۶۵) يَوْمَ تَقْلَبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ

اور نہ مددگار۔ جن دن آوندھے ڈالے جائیں گے ان کے منہ آگ میں کہیں گے

يٰلَيْتَنَا اطْعَمْنَا اللّٰهَ وَاَطْعَمْنَا الرَّسُوْلَ ۝ (۶۶) وَقَالُوْا رَبَّنَا اِنَّا

کیا اچھا ہوتا جو ہم نے کہا مانا ہوتا اللہ کا اور کہا مانا ہوتا رسول کا۔ اور کہیں گے اے رب ہم نے

اَطْعَمْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرٰءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَ ۝ (۶۷) رَبَّنَا ارْحَمْ

کہا مانا اپنے سرداروں کا اور اپنے بڑوں کا پھر انھوں نے چکا دیا ہم کو راہ سے۔ اے رب اُن کو دے

ضَعْفِيْنَ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنَهُمُ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (۶۸)

دوڑنا عذاب اور پھٹکار ان کو بڑی پھٹکار۔

## خلاصہ تفسیر

یہ (منکر) لوگ آپ سے قیامت کے متعلق (منکرانہ) سوال کرتے ہیں کہ کب ہوگی (آپ) ان کے جواب میں (فرمادیجئے کہ اس (کے وقت) کی خبر بس اللہ ہی کے پاس ہے، اور آپ کو کیا خبر) کہ کب ہے، البتہ اجمالاً ان لوگوں کو جان رکھنا چاہئے کہ (عجب نہیں کہ قیامت ابھی واقع ہو جائے) کیونکہ جب کوئی وقت معین نہیں تو قریب زمانے میں اُس کے واقع ہو جانے کا بھی احتمال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس کا مقتضاء یہ تھا کہ یہ لوگ انجام سے ڈرتے اور اس کی تیاری میں لگتے، منکرانہ سوالات اور استہزاء سے بچتے۔

اور قیامت کو قریب فرمانے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قیامت ہر روز قریب ہی ہوتی جا رہی ہے، اور جو چیز سامنے سے آرہی ہو اس کو قریب ہی سمجھنا دانشمندی ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی قیامت کو قریب کہا جاسکتا ہے کہ قیامت کے ہولناک واقعات اور شدائد کے پیش نظر یہ ساری دنیا کی عمر بھی قلیل نظر آئے گی، اور ہزاروں سال کی یہ مدت چند روز



کی برابر محسوس ہوگی، بے شک اللہ تعالیٰ نے کافروں کو رحمت سے دور کر رکھا ہے، اور ان کے لئے آتش سوزاں تیار کر رکھی ہے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، (اور) نہ کوئی یار پائیں گے اور نہ کوئی مددگار جس روز ان کے چہرے دوزخ میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے (یعنی چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے کبھی چہرے کی اس کروٹ پر کبھی دوسری کروٹ پر) اور اس وقت غایت حسرت سے یوں کہیں گے اے کاش! ہم نے (دنیا میں) اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی (تو آج اس مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے) اور (حسرت کے ساتھ اپنے گمراہ کرنے والوں پر غصہ آئے گا تو) یوں کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم اپنے سرداروں کا، (یعنی اہل حکومت کا) اور اپنے بڑوں کا (جن میں کسی دوسری وجہ سے یہ صفت پائی جاتی تھی کہ انکی بات ماننا اور اتباع کرنا ہمارے ذمے ضروری تھا) کہنا مانا تھا سوا انھوں نے ہم کو (سیدھے) رستہ سے گمراہ کیا تھا اے ہمارے رب ان کو دوسری سزا دیجئے اور ان پر بڑی لعنت کیجئے یہ ایسا مضمون ہے جیسا سورۃ اعراف کے چوتھے رکوع میں پہلے آچکا ہے، رَبَّنَا هَؤُلَاءِ أَضَلُّوْنَا قَاتِلْهُمْ عَدَّ ابًا ضَعُفَانِ النَّارِ، جس کا جواب اسی آیت میں یہ بیان فرمایا ہے لِكُلِّ ضَعْفٍ،

## معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اللہ و رسول کی مخالفت کر لے والوں کو دنیا اور آخرت میں لعنت و عذاب کی وعید سنائی گئی تھی، اور کفار کے بہت سے فرقے خود قیامت اور آخرت ہی کے منکر تھے اور انکار کی وجہ سے بطور استہزاء کے پوچھا کرتے تھے کہ وہ قیامت کب آئے گی؟ آخر سورۃ میں ان کا جواب مذکورہ آیات میں دیا گیا ہے، جن کی تفسیر اوپر آچکی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ إِذْ وَاسَىٰ مُوسَىٰ فَبَرَّاهُ

اے ایمان والو تم مت ہو ان جیسے جنھوں نے ستایا موسیٰ کو پھر بے عیب کھلایا

اللَّهُ مَسًّا قَالُوا هُوَ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ وَجِيهًا ﴿٦٩﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

اس کو اللہ نے ان کے کہنے سے اور تھا اللہ کے یہاں آبرو والا ۔ اے ایمان والو

آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٧٠﴾ يُصْلِحْ لَكُمْ

ڈرتے رہو اللہ سے اور کہو بات سیدھی، کہ سنو ارچے تمھارے واسطے

أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرَ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

تمھارے کام اور بخش دے تم کو تمھارے گناہ اور جو کوئی کہنے پر چلا اللہ کے اور اس کے رسول

فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝۷۱

کے اس نے پائی بڑی مراد ۔

## خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو تم ان لوگوں کی طرح مت ہونا جنہوں نے کچھ تہمت تراش کر (موسیٰ علیہ السلام) کو ایذا دی تھی سو ان کو خدا تعالیٰ نے بری ثابت کر دیا اس چیز سے جو وہ کہتے تھے (یعنی ان کو نو کچھ نقصان نہ پہنچا تہمت لگانے والے ہی کذاب اور مستحق سزا ٹھہرے) اور وہ (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اللہ کے نزدیک بڑے معزز و پیغمبر تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی برائت ظاہر فرمادی جیسا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے لئے اس طرح کی تہمتوں سے برائت عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم رسول کی مخالفت کر کے ان کو ایذا نہ دینا کیونکہ ان کی مخالفت اللہ کی مخالفت ہے، ورنہ اس کے نتیجہ میں تم خود اپنا ہی نقصان کرو گے اس لئے ہر کام میں اللہ و رسول کی اطاعت کرنا جس کا حکم آگے آتا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو (یعنی ہر امر میں اس کی اطاعت کرو) اور (بالخصوص کلام کرنے میں اس کی بہت رعایت رکھو کہ جب بات کرو) راستی کی بات کہو (جس میں عدل و اعتدال سے تجاوز نہ ہو) اللہ تعالیٰ (اس کے صلہ میں) تمھارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا (کچھ ان اعمال کی برکت سے کچھ توبہ کی برکت سے جو تقویٰ اور قول مدید میں داخل ہے) اور یہ ثمرات اطاعت کے ہیں اور اطاعت ایسی چیز ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔

## معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں اللہ و رسول کی ایذا کا مہلک اور خطرناک ہونا بیان کیا گیا تھا اس آیت میں خاص طور سے مسلمانوں کو اللہ و رسول کی مخالفت سے بچنے کی ہدایت ہے کیونکہ یہ مخالفت ان کی ایذا کا سبب ہے۔

پہلی آیت میں ایک واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جس میں ان کی قوم نے ان کو ایذا پہنچائی تھی ذکر کر کے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا۔ اس کے لئے یہ ضروری



نہیں کہ مسلمانوں سے کوئی ایسا کام سرزد ہوا ہو بلکہ حفظِ مآقتِ دم کے طور پر ان کو یہ قصہ سنا کر ہدایت کی گئی ہے۔ اور ایک روایت میں جو قصہ بعض صحابہ کا منقول ہے اس کا محمل بھی یہی ہے کہ ان کو اس وقت اس طرف توجہ نہ ہوئی ہوگی کہ یہ کلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کا موجب ہے، بالقصد ایذا پہنچانے کا کسی صحابی سے امکان نہیں، جتنے قصے بالقصد ایذا کے ہیں وہ سب منافقین کے ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما کر اس آیت کی تفسیر بیان فرمادی ہے جس کو امام بخاری نے کتاب التفسیر اور کتاب الانبیاء میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت فرمایا ہے، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت حیا کرنے والے اور اپنے بدن کو چھپانے والے تھے، ان کے بدن کو کوئی نہ دیکھتا تھا، جب غسل کی ضرورت ہوتی تو پردہ کے اندر غسل کرتے تھے، ان کی قوم بنی اسرائیل میں عام طور پر یہ رواج تھا کہ مرد سب کے سامنے ننگے ہو کر نہاتے تھے، تو بعض بنی اسرائیل کہنے لگے کہ موسیٰ علیہ السلام جو کسی کے سامنے نہیں نہاتے اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے بدن میں کوئی عیب ہے، یا تو برص ہو یا خصبیتیں بہت بڑھے ہوئے ہیں، یا کوئی اور آفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی اس طرح کے عیوب برائت کا اظہار فرمادیں۔ ایک روز موسیٰ علیہ السلام نے خلوت میں غسل کرنے کے لئے اپنے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیئے، جب غسل سے فارغ ہو کر اپنے کپڑے لینا چاہا تو یہ پتھر بحکم خداوندی حرکت میں آگیا، اور کپڑے لے کر بھاگنے لگا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی لالچی اٹھا پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے چلے تو بَی حَجَرٌ تَوْبَتِی حَجَرٌ، یعنی اے پتھر میرے کپڑے، اے پتھر میرے کپڑے، مگر پتھر چلتا رہا یہاں تک کہ یہ پتھر ایسی جگہ جا کر ٹھہرا جہاں بنی اسرائیل کا ایک مجمع تھا، اس وقت بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو سر سے پاؤں تک نہنگا دیکھا تو بہترین صحیح و سالم بدن دیکھا (جس میں ان کا منسوب کیا ہوا کوئی عیب نہ تھا) اس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی برائت ان عیوب سے سب کے سامنے ظاہر فرمادی۔ پتھر یہاں پہنچ کر ٹھہر گیا تھا، موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے اٹھا کر پہن لئے، پھر موسیٰ علیہ السلام نے پتھر کو لالچی سے مارنا شروع کیا۔ خدا کی قسم! اس پتھر میں موسیٰ علیہ السلام کی ضرب سے تین یا چار یا پانچ اثر قائم ہو گئے۔

یہ واقعہ بیان فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کی اس آیت کا یہی مطلب ہے۔ یعنی آیت مذکورہ کا لَئِیْنِ اَذُوْا مُوسٰی کا، آیت مذکورہ میں





زبان کی اصلاح باقی سب اعضاء و اعمال کی اصلاح میں مؤثر ذریعہ ہو

اس آیت میں اصل حکم سب مسلمانوں کو یہ دیا گیا ہے کہ اتَّقُوا اللَّهَ یعنی تقویٰ اختیار کرو جس کی حقیقت تمام احکام الہیہ کی مکمل اطاعت ہے کہ تمام اوامر کی تعمیل کر لے اور تمام منہیات و مکروہات سے اجتناب کر لے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام انسان کے لئے آسان نہیں، اس لئے اتَّقُوا اللَّهَ کے بعد ایک خاص عمل کی ہدایت ہے، یعنی اپنے کلام کی درستی اور اصلاح۔ یہ بھی اگرچہ تقویٰ کا ہی ایک جز ہے مگر ایسا جز ہے کہ اس پر قابو پالیا جائے تو باقی اجزاء تقویٰ خود بخود حاصل ہوتے چلے جائیں گے جیسا کہ خود آیت مذکورہ میں قول سدید اختیار کرنے کے نتیجہ میں یُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ کا وعدہ ہے یعنی اگر تم نے اپنی زبان کو غلطی سے روک لیا، اور کلام درست اور بات سیدھی کہنے کے خوگر ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی اصلاح فرمائیں گے، اور سب کو درست کر دیں گے۔ اور آخر آیت میں یہ وعدہ فرمایا کہ یُخَفِّرْ كُم مِّنْ ثِقَلِكُمْ یعنی جس شخص نے اپنی زبان پر قابو پالیا، راست گوئی اور سیدھی بات کا عادی بن گیا، اللہ تعالیٰ اس کے باقی اعمال کی بھی اصلاح فرما دیں گے اور جو غمزدگی اس سے ہوئی ہیں انکو معاف فرما دیں گے۔

قرآن کریم کے عام اسلوب میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کوئی حکم ایسا دیا گیا جس کی تعمیل میں کچھ مشقت و دشواری ہو تو ساتھ ہی اس کے آسان کرنے کا طریقہ بھی بتلادیا گیا ہے۔ اور چونکہ سارے دین کا خلاصہ تقویٰ ہے اور اس میں پورا اترنا بڑی مشقت ہے، اس لئے عموماً جہاں اتَّقُوا اللَّهَ کا حکم دیا گیا ہے تو اس سے پہلے یا بعد ہی کوئی ایک عمل ایسا بتلادیا ہے جس کے اختیار کرنے سے تقویٰ کے باقی ارکان پر عمل منجانب اللہ آسان کر دیا جاتا ہے۔ اسی کی ایک نظیر اس آیت میں اتَّقُوا اللَّهَ کے بعد قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا کی تلقین ہے، اور اس سے پہلی آیت میں اتَّقُوا اللَّهَ سے پہلے وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ أَذُوا مَوْسٰی فرما کر اس بات کی طرف ہدایت فرمادی کہ تقویٰ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اللہ کے نیک اور مقبول بندوں کو ایذا دینا ہے اسے چھوڑ دو تو تقویٰ آسان ہو جائے گا۔

ایک آیت میں ارشاد فرمایا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ، اس میں تقویٰ کو آسان کرنے کے لئے ایسے لوگوں کی صحبت و مجالست کی تلقین فرمائی جو بات کے سچے ہوں اور عمل کے بھی سچے ہوں، جس کا حاصل ولی اللہ ہونا ہے۔ اور دوسری آیت میں اتَّقُوا اللَّهَ کے ساتھ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِخَيْرٍ بڑھا دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان کو

اس کی فکر چاہئے کہ اس نے کل یعنی روز محشر کے لئے کیا سامان بھیجا ہے؟ جس کا خلاصہ فکر آخرت ہی، اور یہ فکر تقویٰ کے تمام ارکان کو آسان کر دینے والی چیز ہے۔

زبان و کلام کی درستی دین دنیا | حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو دونوں کے کام درست کر دیوالی ہے ترجمہ اس آیت کا کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں جو سیدھی بات کا عادی ہونے پر اصلاح اعمال کا وعدہ ہے وہ صرف دینی اعمال ہی نہیں، بلکہ دنیا کے سب کام بھی اس میں داخل ہیں، جو شخص قول سید کا عادی ہو جائے یعنی کبھی جھوٹ نہ بولے، سوچ سمجھ کر کلام کرے جو خطا و لغزش سے پاک ہو، کسی کو فریب نہ دے، دل خراش بات نہ کرے، اس کے اعمال آخرت بھی درست ہو جائیں گے، اور دنیا کے کام بھی بن جائیں گے۔ حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ یہ ہے کہ (کہو بات سیدھی کہ سنو ار دے تم کو تمھارے کام)۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ

ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو

فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ

پھر کسی نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے اور اٹھالیا اس کو انسان نے

إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝۳۱ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ

یہ ہے بڑا بے ترس نادان، تاکہ عذاب کرے اللہ منافق مردوں کو

وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى

اور عورتوں کو اور شرک کرنے والے مردوں کو اور عورتوں کو اور معاف کرے اللہ

الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝۳۲

ایمان دار مردوں کو اور عورتوں کو، اور ہر اللہ بخشنے والا مہربان

## خلاصہ تفسیر

ہم نے یہ امانت دینی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں، آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی یعنی ان میں کچھ شعور پیدا کر کے جو کہ اب بھی ہے ان کے بروہو اپنے احکام اور بصورت ماننے کے اس پر انعام و اکرام اور بصورت نہ ماننے کے



اس پر تعذیب و آلام پیش کر کے ان کو لینے نہ لینے کا اختیار دیا۔ اور حاصل اس پیش کرنے کا یہ تھا کہ اگر تم ان احکام کو اپنے ذمہ رکھتے ہو تو ان کے موافق عمل کرنے کی صورت میں تم کو ثواب ملے گا اور خلاف کرنے کی صورت میں عذاب ہوگا، اور اگر نہیں لیتے تو مکلف نہ بنائے جاؤ گے، اور ثواب و عذاب کے بھی مستحق نہ ہو گے، تم کو دونوں اختیار ہیں، کہ اس کو نہ لینے سے نافرمان نہ ہو گے جس قدر ان کو شعور تھا وہ اجمالاً اس قدر مضمون سمجھ لینے کے لئے کافی تھا، چونکہ ان کو اختیار بھی دیا گیا تھا، سو انھوں نے (خوف و عذاب کے سبب احتمال ثواب سے بھی دست برداری کی اور) اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس (کی ذمہ داری) سے ڈر کر وہ خدا جانے کیا انجام ہو، اور اگر وہ اپنے ذمہ رکھ لیتے تو مثل انسان کے ان کو بھی عقل عطا کی جاتی، جو تفصیل احکام و مشروبات و عقوبات کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے، چونکہ اس کو نہیں منظور کیا، اس لئے عقل کی بھی ضرورت نہ ہوئی۔ غرض انھوں نے تو عذر کر دیا، اور جب ان سموات و ارض و جبال کے بعد انسان کو پیدا کر کے اس سے یہی بات پوچھی گئی تو انسان نے (بوجہ اس کے کہ علم الہی میں اس کا خلیفہ ہونا مقرر تھا) اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔ غالباً اُس وقت تک اس میں بھی اتنا ہی ضرورت کے قدر شعور ہوگا اور غالباً یہ پیش کرنا اخذ میثاق سے مقدم ہے، اور وہ میثاق اسی حمل امانت کی فرع ہے، اور اس میثاق کے وقت اس میں عقل عطا کی گئی ہوگی، اور یہ کسی خاص انسان سے مثل آدم علیہ السلام کے نہیں پوچھا گیا، بلکہ مثل اخذ میثاق کے یہ عرض بھی عام ہوگا اور التزام بھی عام تھا۔ پس سموات و ارض و جبال مکلف نہ ہوئے اور یہ مکلف بنا دیا گیا۔ آیت میں اس کا یاد دلانا غالباً اسی حکمت سے ہے جیسا کہ میثاق یاد دلایا، یعنی ان احکام کا تم نے از خود التزام کیا ہے تو پھر نباہنا چاہئے۔ اور چونکہ مکلف جن بھی ہے اس لئے غالباً اس عرض اور حمل میں شریک ہی، مگر تخصیص ذکر انسان کی صرف اس لئے ہے کہ اس مقام میں کلام اسی سے ہو رہا ہے، پھر اس التزام کے بعد انسان کی حالت باعتبار اکثر افراد کے یہ ہوتی کہ وہ (انسان عملیات میں) ظالم ہے (اور عملیات میں) جاہل ہے (یعنی دونوں امر میں اعمال میں بھی اور عقائد میں بھی خلاف ورزی کرتا ہے یہ تو حالت باعتبار اکثر افراد کے ہے، باقی مجموعہ کے اعتبار سے اس ذمہ داری کا) انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کو (کہ یہ لوگ احکام کے ضائع کرنے والے ہیں) سزا دے گا اور مؤمنین و مؤمنات پر توبہ (اور رحمت) فرمائے گا اور (بعد مخالفت بھی اگر کوئی باز آجائے تو پھر اس کو بھی مؤمنین و مؤمنات کے زمرہ میں شامل کر لیا جائیگا

کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۔

## معارف و مسائل

اس پوری سورۃ میں تعظیم و تکریم رسولؐ اور ان کی اطاعت پر زور دیا گیا ہے آخر سورۃ میں اس اطاعت کا مقام بلند اور اس کا درجہ بتلایا گیا ہے، اس میں اللہ و رسول کی اطاعت اور ان کے احکام کی تعمیل کو امانت سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کی وجہ آگے آجائے گی۔ امانت سے کیا مراد ہے | اس جگہ لفظ امانت کی تفسیر میں ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین و غیرہم کے بہت سے اقوال منقول ہیں۔ فرائض شرعیہ، حفاظت عفت، امانات اموال، غسل جنابت نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج وغیرہ، اسی لئے جہور مفسرین نے فرمایا ہے کہ دین کے تمام وظائف و اعمال اس میں داخل ہیں (قرطبی) تفسیر مظہری میں فرمایا کہ شریعت کی تمام تکلیفات امر و نہی کا مجموعہ امانت ہے ابو حنیفہ نے بحر محیط میں فرمایا:-

”یعنی ہر وہ چیز جس میں انسان پر اعتماد کیا جاتا ہے یعنی امر و نہی اور ہر حال جس کا دین یا دنیا سے تعلق ہو اور شریعت پوری کی پوری امانت ہی یہی چیز کا قول ہے“

الظاہرُ اَنَّهُ اَكْلُ مَا يَوْعَدُ نَفْسُ  
عَلَيْهِ مِنْ اَمْرٍ وَ نَهْيٍ وَ شَأْنٍ  
دِينٍ وَ دُنْيَا وَ الشَّرْعُ كُلُّهُ اَمَانَةٌ  
وَ هَذَا قَوْلُ الْجَمْعِ مَعْرُورٍ

خلاصہ یہ ہے کہ امانت سے مراد احکام شرعیہ کا مکلف و مامور ہونا ہے، جن میں پورا اترنے پر جنت کی دائمی نعمتیں اور خلاف ورزی یا کوتاہی پر جہنم کا عذاب موعود ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ امانت سے مراد احکام الہیہ کا بار اٹھانے کی صلاحیت و استعداد ہے جو عقل و شعور کے خاص درجہ پر موقوف ہے، اور ترقی اور استحقاق خلاۃ الہیہ اسی خاص استعداد پر موقوف ہے جن اجناس مخلوقات میں یہ استعداد نہیں ہے وہ اپنی جگہ کتنا ہی اونچا اعلیٰ مقام رکھتے ہوں مگر وہ اس مقام سے ترقی نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے آسمان زمین وغیرہ میں یہاں تک کہ فرشتوں میں بھی ترقی نہیں جس کا جو مقام قرب ہے بس وہی ہے، ان کا حال یہ مَآئِنَا اِلَّا لَكَ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ۔ یعنی ہم میں سے کوئی نہیں مگر اس کا ایک معین مقام ہے۔ امانت کے اس مفہوم میں تمام روایات حدیث جو امانت کے متعلق آئی ہیں مربوط و مطابق ہو جاتی ہیں، جہور مفسرین کے اقوال بھی اس میں تقریباً متفق ہو جاتے ہیں۔ صحیحین بخاری و مسلم اور مسند احمد میں حضرت حذیفہ رضی کی روایت ہے کہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دو حدیثیں سنائی تھیں، ان میں سے ایک کو تو ہم نے خود آنکھوں سے دیکھ لیا، دوسری کا انتظار ہے۔

پہلی حدیث یہ ہے کہ اول رجال دین کے قلوب میں امانت نازل کی گئی، پھر قرآن اتارا گیا، تو اہل ایمان نے قرآن سے علم حاصل اور سنت سے عمل حاصل کیا۔

اس کے بعد دوسری حدیث یہ سنائی کہ (ایک وقت ایسا آنے والا ہے جس میں آدمی سوکر اٹھے گا تو اس کے قلب سے امانت سلب کر لی جائے گی اور اس کا کچھ اثر و نشا ایسا رہ جائے گا جیسے تم کوئی آگ کا انگارہ اپنے پاؤں پر لڑھکا دو (وہ انگارہ تو چلا گیا مگر) اس کا اثر پاؤں پر ورم یا چھالے کی صورت میں رہ گیا حالانکہ اس میں آگ کا کوئی جزو نہیں رہا) قولہ یہاں تک کہ لوگ باہم معاملات اور معاہدات کریں گے، مگر کوئی امانت کا حق ادا نہ کرے گا اور (امانتدار آدمی کا ایسا قحط ہو جائے گا کہ) لوگ یہ کہا کریں گے کہ فلاں قبیلہ میں ایک آدمی امانتدار ہے۔

اس حدیث میں امانت ایک ایسی چیز کو قرار دیا ہے جس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے، اور وہی تکالیف شرعیہ اور وظائف دینیہ کے مکلف ہونے کی صلاحیت استعدا رکھنا ہے اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ جب وہ تمہیں حاصل ہو جائیں تو دنیا کی اور کوئی چیز تمہیں حاصل نہ ہو تو کوئی افسوس کی بات نہیں، (وہ چار چیزیں یہ ہیں) :- امانت کی حفاظت، بات کی سچائی، حُسنِ خلق اور لقمہ حلال۔ (از ابن کثیر)

عرض امانت کی تحقیق آیت مذکورہ میں یہ ارشاد ہے کہ ہم نے امانت کو آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا تو سب نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا، اور اس سے ڈر گئے، کہ ہم اس کا حق ادا نہ کر سکیں گے، اور انسان نے یہ بوجھ اٹھا لیا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہو کہ آسمان، زمین، پہاڑ جو غیر ذی روح اور بظاہر ہر بے علم و شعور ہیں ان کے سامنے پیش کرنے اور ان کے جواب دینے کی کیا صورت ہوتی ہے؟ بعض حضرات نے تو اس کو مجاز اور تمثیل قرار دیدیا جیسے قرآن کریم نے ایک موقع پر بطور تمثیل کے فرمایا **لَوْ أَنزَلْنَاهُ الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْنَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ**، یعنی ہم اگر یہ قرآن پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ بھی اس کے بوجھ سے جھک جاتا، اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اللہ کے خوف سے کہ اس میں بطور فرض کے یہ مثال دی گئی ہے، یہ نہیں کہ حقیقت پہاڑ پر اتارا ہو۔ ان حضرات نے

آیت اِنَّا عَرَضْنَا لَکُمُوهَا اسی طرح کی تمثیل و مجاز قرار دیدیا۔  
 مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ صحیح نہیں، کیونکہ جس آیت سے تمثیل پر استدلال کیا گیا  
 ہے وہاں تو قرآن کریم نے حرفِ نون کے ساتھ بیان کر کے اس کا قضیہ فرضیہ ہونا خود واضح  
 کر دیا ہے، اور آیت اِنَّا عَرَضْنَا لَکُمُوهَا ایک واقعہ کا اثبات ہے، جس کو مجاز و تمثیل پر حمل کرنا  
 بغیر کسی دلیل کے جائز نہیں۔ اور اگر دلیل میں یہ کہا جائے کہ یہ چیزیں بے حس و بے شعور ہیں،  
 ان سے جواب سوال نہیں ہو سکتا، تو یہ قرآن کی دوسری تصریحات سے مردود ہے۔ کیوں کہ  
 قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے: **وَ اِنَّ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا نُصِیْحَ بِحُکْمِہِ**، یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو  
 اللہ کی حمد و تسبیح نہ پڑھتی ہو، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہچانتا اور اس کو خالق و مالک اور  
 سب سے اعلیٰ و برتر جان کر اس کی تسبیح کرنا بغیر ادراک و شعور کے ممکن نہیں۔ اس لئے اس  
 آیت سے ثابت ہوا کہ ادراک و شعور تمام مخلوقات میں یہاں تک کہ جمادات میں بھی موجود ہے  
 اسی ادراک و شعور کی بنا پر ان کو مخاطب بھی بنایا جاسکتا ہے اور وہ جواب بھی دے سکتے ہیں  
 جواب کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، الفاظ و حروف کے ذریعہ بھی، ہو سکتا ہے، اور اس میں  
 عقلی مستلذع نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان جمادات، آسمان، زمین اور پہاڑوں کو نطق و گویائی عطا  
 فرمادیں۔ اس لئے جمہور ائمہ کے نزدیک آسمان، زمین اور پہاڑوں پر عرض امانت حقیقی طور  
 پر کیا گیا اور انہوں نے حقیقی طور پر ہی اپنا اس بار سے عاجز ہونا ظاہر کیا، اس میں کوئی تمثیل  
 یا مجاز نہیں۔

عرض امانت اختیاری تھا | رہا یہ سوال کہ جب حق تعالیٰ شانہ نے آسمان، زمین وغیرہ پر اس  
 امانت کو خود پیش فرمایا تو ان کو مجال انکار کیسے ہوئی، حکم الہی  
 جبری نہیں  
 سے روگردانی کی تھی تو ان کو نیست و نابود ہو جانا چاہئے تھا، اس کے علاوہ آسمان، زمین  
 کا مطیع اور تابع فرمان ہونا قرآن کریم کی آیت **اَتِیْنَا طَائِفًا مِّنْہَا** سے بھی ثابت ہے یعنی  
 جب حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکم دیا کہ (ہمارے حکم کی تعمیل کے لئے) آ جاؤ خواہ  
 اپنی خوشی یا زبردستی سے تو دونوں نے یہ جواب دیا کہ ہم تعمیل حکم کے لئے خوشی سے حاضر ہیں  
 جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں ان کو ایک حاکمانہ پابندی کا حکم دیا گیا تھا، جس  
 میں یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ تم اس حکم پر دل سے راضی ہو یا نہ ہو بہر حال یہ حکم مانتا پڑے گا  
 بخلاف اس آیت عرض امانت کے کہ اس میں امانت کو پیش کر کے ان کو اختیار دیا گیا تھا کہ  
 قبول کریں یا نہ کریں۔

ابن کثیر نے متعدد سندوں کے ساتھ متعدد صحابہ و تابعین ابن عباس رضی اللہ عنہما



مجاہد وغیرہ سے عرضِ امانت کی یہ تفصیل نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اول آسمان پر پھر زمین پر پھر پہاڑوں پر اختیاری صورت میں یہ پیش کیا کہ ہماری امانت (یعنی طاعتِ احکام) کا بار اٹھا لو اس معاوضہ کے ساتھ جو اس کے لئے معسر رہے۔ ہر ایک نے سوال کیا کہ معاوضہ کیا ہے تو بتلایا گیا کہ امانت (یعنی طاعتِ احکام) تم نے پوری طرح کی تو تمہیں جزاء و ثواب اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعزاز خاص ملے گا اور اگر تعمیلِ احکام نہ کی یا اس میں کوتاہی کی تو عذاب و سزا ملے گی۔ ان سب بڑے بڑے اجسام نے یہ سن کر جواب دیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم اب بھی آپ کے تابع فرمان چل رہے ہیں، لیکن (جب ہمیں اختیار دیا گیا تو) ہم اس بار کو اٹھانے سے اپنے کو عاجز پاتے ہیں، ہم نہ ثواب چاہتے ہیں نہ عذاب کے متحمل ہیں۔

اور تفسیر قرطبی میں حکیم ترمذی کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (آسمان زمین وغیرہ پر عرضِ امانت اور ان کے جواب کے بعد) حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خطاب فرمایا اور فرمایا کہ ہم نے اپنی امانت آسمان زمین کے سامنے پیش کی تو وہ اس کا بار اٹھانے سے عاجز ہو گئے، تو آپ اس بار امانت کو اٹھائیں گے مع اس چیز کے جو اس کے ساتھ ہے۔ آدم علیہ السلام نے سوال کیا کہ اے پروردگار وہ چیز جو اس کے ساتھ ہے کیا ہے؟ جواب ملا کہ اگر حملِ امانت میں پورے اترے (یعنی طاعتِ مکمل کی) تو آپ کو جزاء ملے گی، (جو اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا اور جنت کی دائمی نعمتوں کی صورت میں ہوگی) اور اگر اس امانت کو ضائع کیا تو سزا ملے گی۔ آدم علیہ السلام نے (اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا میں ترقی ہونے کے شوق میں) اس کو اٹھالیا، یہاں تک کہ بار امانت اٹھانے پر اتنا وقت بھی نہ گزرا تھا جتنا ظہر سے عصر تک ہوتا ہے کہ اس میں شیطان نے ان کو مشہور لغزش میں مبتلا کر دیا، اور جنت سے نکالے گئے۔

عرضِ امانت کا واقعہ | ابھی جو روایت حضرت ابن عباسؓ کی ادھر گزری ہے اس سے معلوم کس زمانے میں ہوا؟ ہوتا ہے کہ یہ عرضِ امانت آسمان زمین وغیرہ پر تخلیقِ آدم سے پہلے ہوا تھا، پھر جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تو ان کے سامنے یہ بھی بیان فرمایا گیا کہ کہ آپ سے پہلے آسمان زمین پر بھی یہ امانت پیش کی جا چکی ہے، جس کی ان کو طاقت نہ تھی، اس لئے عذر کر دیا۔

اور ظاہر یہ ہے کہ یہ عرضِ امانت کا واقعہ میثاقِ ازل یعنی عہدِ اُتس سے پہلے کا ہی کیونکہ عہدِ اُتس بزرگم اسی بار امانت کی پہلی کڑی اور اپنی منصب کا حلف اٹھانے کے قائم مقام ہے۔

خلافت ارضی کیلئے بار امانت | حق تعالیٰ نے تقدیر ازیلی میں آدم علیہ السلام کو زمین میں اپنا  
اٹھانے کی صلاحیت ضروری تھی | خلیفہ بنانا طے فرمایا تھا اور یہ خلافت اسی کو سپرد کی جاسکتی تھی  
جو احکام الہیہ کی اطاعت کا بار اٹھائے، کیونکہ اس خلافت کا حاصل ہی یہ ہے کہ زمین پر اللہ  
کے قانون کو نافذ کرے، خلیق خدا کو احکام الہیہ کی اطاعت پر آمادہ کرے۔ اس لئے تکوینی  
طور پر حضرت آدم علیہ السلام اس امانت کے اٹھانے کے لئے آمادہ ہو گئے، حالانکہ دوسری  
بڑی بڑی مخلوقات کا اس سے عاجز ہونا بھی معلوم ہو چکا تھا۔ (مظہری و بیان لقرآن)  
إِنَّكَ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا، ظُوم سے مراد اپنے نفس پر ظلم کرنے والا، اور جہول سے  
مراد انجام سے ناواقف۔ اس جملے سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مطلقاً انسان کی مذمت میں  
آیا ہے کہ اس نادان نے اپنی جان پر ظلم کیا کہ اتنا بڑا بار اٹھا لیا۔ جو اس کی طاقت سے باہر  
تھا، مگر قرآنی تصریحات کے مطابق واقعہ ایسا نہیں، کیونکہ انسان سے مراد حضرت  
آدم علیہ السلام ہوں یا پوری نوع انسانی، ان میں آدم علیہ السلام تو نبی معصوم ہیں،  
انہوں نے جو بار اٹھایا تھا اس کا حق بھی یقینی طور سے ادا کر دیا۔ اسی کے نتیجہ میں ان کو  
خلیفۃ اللہ بنا کر زمین پر بھیجا گیا، ان کو فرشتوں کا سجود بنایا گیا، اور آخرت میں ان کا مقام  
فرشتوں سے بھی بلند و بالا ہے۔ اور اگر نوع انسانی ہی مراد ہو تو اس پوری نوع میں لاکھوں  
تو انبیاء علیہم السلام ہیں اور کروڑوں وہ صالحین اور اولیاء اللہ ہیں جن پر فرشتے بھی  
رشک کرتے ہیں، جہفول نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ اس امانت الہیہ کے اہل  
اور مستحق تھے۔ انہیں حق امانت کو ادا کرنے والوں کی بناء پر قرآن حکیم نے نوع انسانی کو  
اشرف المخلوقات ٹھہرایا۔ وَتَقَدَّرَ كَرَمًا بَنِيَّ آدَمَ، اس سے ثابت ہوا کہ نہ آدم علیہ السلام  
قابل مذمت ہیں نہ پوری نوع انسانی، اسی لئے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ جملہ مذمت  
کے لئے نہیں بلکہ اکثر افراد نوع کے اعتبار سے بیان واقعہ کے طور پر ارشاد ہوا ہے۔ مطلب  
ہے کہ نوع انسانی کی اکثریت ظلوم و جہول ثابت ہوئی، جس نے اس امانت کا حق ادا نہ کیا،  
اور خسارہ میں پڑی، اور چونکہ اکثریت کا یہ حال تھا، اس لئے اس کو نوع انسانی کی طرف  
منسوب کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ آیت میں ظلوم و جہول خاص ان افراد انسانی کو کہا گیا ہے جو احکام  
شرعیہ کی اطاعت میں پورے نہ اترے۔ اور امانت کا حق ادا نہ کیا، یعنی امت کے  
کفار و منافقین اور فاسق و فجار اور گناہگار مسلمان۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ، ابن جبر  
حسن بصریؒ وغیرہ سے منقول ہے۔ (قرطبی)



اور بعض حضرات نے فرمایا کہ لفظ ظلوم و جہول اس جگہ بھولے بھالے کے معنی میں بطور محبانہ خطاب ہے کہ اس نے اللہ جل شانہ کی محبت اور اس کے مقام قرب کی جستجو میں اور کسی انجام کو نہیں سوچا۔ اسی طرح یہ لفظ پوری بنی نوع کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ تفسیر مظہری میں حضرت محمد دالت ثانیؑ اور دوسرے صوفیائے کرام سے اسی طرح کا مضمون منقول ہے۔

لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ "یعنی تا آنکہ عذاب دے گا اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو، اور شرکین مردوں اور عورتوں کو اور رحمت و مغفرت سے نوازے گا مؤمنین و مؤمنات کو" لِيُعَذِّبَ میں حرف لام بیان علت و غرض کے لئے نہیں بلکہ اصطلاح عربیت کے لحاظ سے لام عاقبت ہے۔ یعنی جو کسی چیز کا انجام بیان کرے جیسے ایک عربی شعر میں ہے "لِيُنْزِلُوا إِلَيْنَا الْمَوْتَ وَالْخِرَابَ" یعنی پیدا ہو موت کے لئے اور تعمیر کر دیران ہونے کے لئے "مراد یہ ہو کہ ہر پیدا ہونے والے کا انجام موت اور ہر تعمیر کا انجام ویرانی ہے۔

اس جملے کا تعلق خَلَقَ الْإِنْسَانَ سے ہے، یعنی انسان کے بار امانت اٹھانے کا انجام یہ ہوگا کہ نوع انسانی میں دو فریق ہو جائیں گے، ایک کفار و منافق و غیرہ جو اطاعتِ الہیہ سے سرکش ہو کر امانت کے ضائع کرنے والے ہو گئے، ان کو عذاب دیا جائے گا، دوسرے مؤمنین و مؤمنات جو اطاعتِ احکامِ شرعیہ کے ذریعہ حق امانت ادا کر چکے، ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ ہوگا۔

اس آخری جملے میں بھی ظلوم و جہول کے الفاظ کی اس تفسیر کی تائید ہوئی جو اکثر ائمہ تفسیر سے اوپر نقل کی گئی ہے، کہ یہ تمام نوع انسانی کے لئے نہیں بلکہ خاص اُن افراد کے لئے ہے جنہوں نے امانتِ الہیہ کو ضائع کیا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

## مَسَائِد

سُورَةُ الْاَحْزَابِ بِعَوْنِ اللَّهِ تَعَالَى وَحَمْدِهِ  
لِلْعَشِيرَةِ مِنْ مُحَرَّمِ الْحَوَائِمِ الْمُسْلِمِ  
يَوْمَ الْمَثَلَتَاءِ

# سُورَةُ السَّجْدَةِ

سُورَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ أَرْبَعٌ وَتِسْعُونَ آيَةً وَسِتُّ رُكُوعَاتٌ

سورۃ سبا مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں چوتن آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

سب خوبی اللہ کی ہے جس کا ہر جو کچھ کہ ہے آسمان اور زمین میں

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْآخِرَةِ ط وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ① يَعْلَمُ

اور اسی کی تعریف ہے آخرت میں اور وہی ہے حکمتوں والا سب کچھ جاننے والا ۔ جانتا ہے

مَا يَلْبِغُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ

جو کچھ کہ اندر گھستا ہے زمین کے اور جو کچھ کہ نکلتا ہے اس سے اور جو اترتا ہے آسمان سے

وَمَا يَعْصِرُ فِيهَا ط وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ ②

اور جو چڑھتا ہے اس میں اور وہی ہے رحم والا بخشنے والا ۔

## خلاصہ تفسیر

تمام تر حمد و ثناء اسی اللہ کو سزاوار ہے، جس کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

اور جو کچھ زمین میں ہے اور (جس طرح وہ فی الحال مستحق حمد ہے اسی طرح) اسی کو حمد و ثناء

آخرت میں (بھی) سزاوار ہے (اس کا ظہور اس طرح ہوگا کہ اہل جنت جنت میں داخل



ہوئیے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد ان الفاظ سے کریں گے، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰۤاَنَا لِهٰذَا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَّقَنَا وَعْدًا، وغیرہ اور وہ حکمت والا ہے کہ آسمان و زمین کی تمام مخلوقات کو بے شمار مصالح اور منافع پر مشتمل بنایا ہے، اور وہ (خبردار) بھی ہے کہ ان مصالح اور منافع کو پیدا کرنے سے پہلے سے جانتا ہے، ہر چیز میں مصالح اور منافع بڑی حکمت کے ساتھ رکھ دیئے اور وہ ایسا خبیر ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو چیز زمین کے اندر داخل ہوتی ہے (مثلاً بارش کا پانی) اور جو چیز اس میں سے نکلتی ہے (مثلاً درخت اور عام نباتات) اور جو چیز آسمان سے اُترتی ہے اور جو چیز اس میں چڑھتی ہے (مثلاً فرشتے جو آسمان سے اُترتے ہیں اور چڑھتے رہتے ہیں، اور مثلاً احکام شرعیہ جو آسمان سے اتارے جاتے ہیں اور اعمال صالحہ جو آسمان میں لے جاتے جاتے ہیں) اور چونکہ ان سب چیزوں میں جسمانی یا روحانی منافع ہیں جن کا مقتضایہ ہے کہ سب لوگ پورا شکر ادا کریں، اور جو کوتاہی کرے وہ مستحق سزا ہو، لیکن وہ (اللہ) رحیم (اور) غفور (بھی) ہے، اور اپنی رحمت صغیرہ گناہ کو نیک اعمال سے اور کبیرہ کو توبہ سے، اور کبھی دونوں قسم کے گناہوں کو محض اپنے اپنے فضل سے معاف فرما دیتا ہے۔ اور جو گناہ کفر و شرک کی حد تک پہنچ جائے اس کو ایمان لانے سے معاف کر دیتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لَا تَأْتِنَا السَّاعَةُ ط قُلْ بَلٰی وَ سَرِیُّ

اور کہنے لگے منکر نہ آئے گی ہم پر قیامت، تو کہہ کیوں نہیں قسم ہو میرے رب کی

لَتَأْتِيَ نَّكُمْ عَلِمِ الْغِیْبِ لَا یَعْرُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ فِی

الْبَیِّنَةِ آئے گی تم پر اس عالم الغیب کی، غائب نہیں ہو سکتا اس سے کچھ ذرہ بھر آسمانوں

السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرُ اِلَّا

میں اور نہ زمین میں اور کوئی چیز نہیں اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی جو

فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝ لِّیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ط

نہیں ہو کھلی کتاب میں۔ تاکہ بدلہ دے ان کو جو یقین لائے اور کئے بھلے کام۔

اُولٰٓئِکَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ ۝ وَالَّذِیْنَ سَعَوْا فِی

وہ لوگ جو ہیں ان کیلئے ہو معافی اور عزت کی روزی۔ اور جو لوگ دوڑے ہماری

إِلَيْنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رَّجْزٍ أَلِيمٍ ⑤ وَ

آیتوں کے ہر آلے کو ان کو ہلاک کا عذاب ہے دردناک - اور

يَرَى الَّذِينَ أُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ

دیکھ لیں جن کو ملی ہے سمجھ کہ جو سمجھ پر اُترا تیرے رب سے وہی

الْحَقُّ لَا يَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ⑥ وَقَالَ الَّذِينَ

ٹھیک ہو، اور سمجھاتا ہے راہ اس زبردست خوبیوں والے کی - اور کہنے لگے

كُفَرُوا أَهْلَ نَدِ تُكْمُ عَلَى رَجُلٍ يَنْبَغِيكُمْ إِذَا امْرَأْتُمْ كَلَّ هُمْزُ لَا

منکر ہم بتلا میں تم کو ایک مرد کہ تم کو خبر دیتا ہے جب تم پھٹ کر ہو جاؤ گے ٹھٹھو ٹھٹھو

إِنَّا كُفَرْنَا خَلَقَ جَدِيدٍ ⑦ أَفَلَا تَرَى عَلَى اللَّهِ كِنَ بَأْ آمٍ بِهِ جِنَّةٌ

تم کو پھرنے سے بٹنا ہے - کیا بتالایا ہو اللہ پر جھوٹ یا اس کو سودا ہے

بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ

کچھ بھی نہیں پر جو یقین نہیں رکھتے آخرت کا آفت میں ہیں اور دُور جا پڑے

الْبَعِيدِ ⑧ أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَى مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّن

غلطی میں - کیا دیکھتے نہیں جو کچھ اُن کے آگے ہے اور پیچھے ہے

السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ لَشَأْنَ خَسِيفَ بِهِمُ الْأَرْضِ أَوْ لُسِيطُ

آسمان اور زمین سے اگر ہم جائیں دھنسا دیں ان کو زمین میں یا گرا دیں

عَلَيْهِمْ كَسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ⑨

ان پر ٹھٹھو آسمان سے، تحقیق اس میں نشانی ہو ہر بندے رجوع کرنے والے کے واسطے -

## خلاصہ تفسیر

اور یہ کافر کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہ آئے گی، آپ فرمادیجئے کہ کیوں نہیں (آدگی)

قسم اپنے پروردگار عالم الغیب کی کہ وہ ضرور تم پر آوے گی اس کا علم ایسا وسیع اور محیط

ہو کہ، اس (کے علم) سے کوئی ذرہ برابر بھی غائب نہیں نہ آسمانوں میں نہ زمین میں



(بلکہ سب اس کے علم میں حاضر ہیں) اور نہ کوئی چیز اس (مقدار مذکور) سے چھوٹی ہے اور نہ کوئی چیز اس سے بڑی ہے مگر یہ سب (بوجہ احاطہ علم الہی کے) کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (مرقوم) ہے قیامت کے متعلق کفار کے کئی شبہات تھے، ایک یہ کہ اگر آنے والی ہو تو اس کا وقت بتلائیے، کما قال تعالیٰ آیات مزیہا، دوسرا یہ کہ جن اجزاء کو جمع کر کے اُن میں حیات پیدا کرنا بتلایا جاتا ہے، ان کا کہیں نشان بھی نہ رہے گا پھر جمع کیسے ہوں گے؟

اس مضمون اثبات علم غیب سے شبہ اول کا جواب ہو گیا، کہ اس کا علم بوجہ حکمت کے مختص ہے باری تعالیٰ کے ساتھ، اگر نبی کو اس کا معین وقت معلوم نہ ہو تو لازم نہیں آتا کہ اس کا وقوع ہی نہ ہو، کما قال تعالیٰ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُنَا عِنْدَ اللَّهِ اور مضمون اثبات علم محیط سے دوسرے شبہ کا جواب ہو گیا ہے کہ ان تمام اجزاء کے زمین میں منتشر اور ہوا میں پھیل جانے کے باوجود وہ ہمارے علم سے خارج نہ ہوں گے، ہم جب چاہیں گے جمع کر لیں گے کما قال تعالیٰ أَفَلَمْ يَرَوْا الْغُيَابَ قِيَامَتِ کی غایت بتلاتے ہیں کہ وہ قیامت اس لئے آئے گی تاکہ ان

لوگوں کو صلہ (نیک) دے جو ایمان لائے تھے اور انھوں نے نیک کام کیا تھا (سو) ایسے لوگوں کے لئے مغفرت اور (بہشت میں) عزت کی روزی ہے، اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کے متعلق (ان کے ابطال کی) کوشش کی تھی (نبی کو) ہرانے کے لئے (گو اس کوشش میں ناکام ہی ہے) ایسے لوگوں کے واسطے سختی کا دردناک عذاب ہوگا اور آیات قرآنیہ کی تکذیب پر یہ سزا ہونی ہی چاہئے، کیونکہ اول تو قرآن فی نفسه امر حق منزل من اللہ ہے اور ایسے امر حق کی تکذیب خود حق تعالیٰ کی تکذیب ہے، اس پر جتنی سزا ہو، بجا ہے۔ دوسرے قرآن راہ راست کی تعلیم و ہدایت کرتا ہے، جو شخص اس کو نہ مانے گا وہ راہ راست سے قصداً دور رہے گا، نہ اس کو عقائد حقہ کا پتہ لگے گا نہ اعمال صالحہ کا اور یہی طریقہ تھا نجات کا۔ پس طریقہ نجات سے قصداً دور رہنے پر سزا کا ہونا بے جا نہیں ہے، اور قرآن کا حق اور ہادی ہونا ایسا واضح ہے کہ علاوہ اس کے اور دلائل سے ثابت ہے۔ ایک سہل طریق اس کے ثبوت کا یہ ہے کہ جن لوگوں کو (آسمانی کتابوں کا) علم دیا گیا ہے وہ اس قرآن کو جو کہ آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ حق ہے اور وہ خداے غالب محمود (کی رضا) کا راستہ بتلاتا ہے اس استدلال کی تقریر شروع رکوع اخیر سورہ شعراء میں گذر چکی ہے۔ اور شاید منجملہ جمیع امور واجبۃ الایمان کے، بیان حقیقت قرآن کا اہتمام اس لئے فرمایا ہو کہ یہ اُن امور واجبۃ الایمان پر مشتمل ہے بالخصوص خبر قیامت پر جس میں اس مقام میں کلام ہے۔ پس اس بنا پر

حاصل یہ ہوا کہ قیامت کے روز اسی قیامت کی تکذیب پر بھی منرا ہوگی) اور آگے پھر قیامت کا اثبات ہے یعنی یہ کافر (آپس میں) کہتے کہ کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی بتائیں جو تم کو یہ (عجیب) خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو (اس کے بعد قیامت کو) تم ضرور ایک نئے جہنم میں آؤ گے معلوم نہیں اس شخص نے خدا پر (قصداً) جھوٹ بہتان باندھا ہے یا اس کو کسی طرح کا جنون ہے کہ بلا قصد جھوٹ بول رہا ہے، کیونکہ یہ امر تو محال ہے تو اس کے وقوع کی خبر ضرور غلط ہے، خواہ قصد سے ہو یا فسادِ تخیل سے ہو۔ حق تعالیٰ ان دونوں شقوں کو رد فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی تو مفتری اور مجنون کچھ بھی نہیں، بلکہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے (وہی) عذاب اور دردِ دراز گمراہی میں (مبتلا) ہیں، اس گمراہی کا حالی اثر یہ ہے کہ سچے بھی مفتری اور مجنون نظر آتے ہیں، اور مالی اثر یہ ہے کہ عذاب بھگتنا پڑے گا۔ اور یہ جاہل جو اس جمع و احیاء جزاء متفرقہ جمادیہ کو محال بعید از قدرت سمجھ رہے ہیں) تو کیا انھوں نے (دلائل عظمتِ قدرتِ الہیہ میں سے) آسمان اور زمین کی طرف نظر نہیں کی جو ان کے آگے (بھی) اور ان کے پیچھے (بھی) موجود ہیں کہ جد دیکھیں وہ نظر آرہے ہیں۔ پس ان اجرامِ عظیمہ کا ابتداء پیدا کرنے والا کیا اجسامِ صغیرہ کے ثانیاً پیدا کرنے پر قادر نہیں، لہذا قال اللہ تعالیٰ تَخْلُقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ الخ اور بآب و وجود و ضوح دلائل حق کے پھر بھی انکار و عناد کرنے کی وجہ سے یہ ہیں تو اس قابل کہ انکو ابھی سزا دی جائے اور سزا بھی ایسی کہ یہ دلائل قدرتِ آسمان و زمین جو ان کے لئے نعمتِ عظیمہ بھی ہیں انہی کو ان کے لئے آئہ تعذیب بنا دیا جائے کہ جس نعمت کا کفران ہو اسی نعمت کو نعمت یعنی عذاب بنانے سے سخت حسرت ہوتی ہے۔ اور ہم اس سزا پر بھی قادر ہیں چنانچہ اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا اگر چاہیں تو ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں (لیکن حکمت مقتضی ہے تاخیر کو اس لئے ہمت دے رکھی ہے، غرض ان لوگوں کو دفع توہم استحالہ کے لئے آسمان و زمین پر نظر کرنا چاہئے کیونکہ) اس (دلیل مذکور) میں (قدرتِ الہیہ کی) پوری دلیل ہے (مگر) اس بندہ کے لئے جو (خدا کی طرف) متوجہ (بھی) ہو اور حق کی طلب ہو یعنی دلیل تو کافی ہے مگر ان کی طرف سے طلب نہیں اس لئے محسوس ہیں)۔

## معارف و مسائل

عَالِمِ الْغَيْبِ، یہ صفت رب کی ہے جس کی اوپر قسم کھائی گئی ہے اور اللہ جل شانہ



کی تمام صفات میں سے اس جگہ صفتِ علم غیب و علم محیط کو شاید اس لئے خاص کیا گیا کہ کلام منکرین قیامت کے معاملہ میں ہے، اور قیامت کے انکار کا بڑا سبب کفار کے لئے یہ تھا کہ جب سب انسان مر کر مٹی ہو جائیں گے اور اس مٹی کے ذرات بھی دنیا میں منتشر ہو جائیں گے تو سارے جہان میں پھیلے ہوئے ذرات کو جمع کرنا پھر ہر ایک انسان کے ذرات کو دوسرے انسانوں کے ذرات سے الگ کر کے ہر ایک کے ذرات اسی کے وجود میں پیوست کرنا کیسے ممکن ہے؟ اور اس کو ناممکن سمجھنا اسی بنا پر تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت پر قیاس کر رکھا تھا۔ حق تعالیٰ نے بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم سارے عالم پر ایسا محیط ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی ہے اس کو سب معلوم ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے، کوئی ذرہ مخلوقات کا اس کے علم سے باہر نہیں، اور یہ علم محیط حق تعالیٰ کی خصوصیت ہی کسی مخلوق کو خواہ فرشتہ ہو یا پیغمبر ایسا علم محیط کہ کوئی ذرہ جہاں کا اس سے خارج نہ ہو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور جس ذات کو ایسا علم محیط حاصل ہو اس کے لئے ایک انسان کے ذرات کو الگ الگ سارے جہان میں سے جمع کر لینا اور اس سے ان کے اجسام کو دوبارہ مرکب کر دینا کیا مشکل ہے۔

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا، اس جملہ کا تعلق اس سے پہلے جملے لَتَأْتُنَّكُم سے ہے، یعنی قیامت ضرور آئے گی، اور قیامت آنے کا مقصد یہ ہو گا کہ ایمان والوں کو جزا اور بہترین رزق جنت کا دیا جائے اور ان کے مقابل الَّذِينَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا، یعنی وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات پر اعتراض کئے اور لوگوں کو ان کے ماننے سے روکنے کی کوشش کی۔ مُعْجِزَاتٍ یعنی ان کی یہ کوشش گویا اس لئے تھی کہ وہ ہمیں گرفت سے عاجز کر دیں گے اور قیامت کی حاضری سے چھوٹ جائیں گے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رَّجْزٍ اَلِيْمٍ، یعنی ایسے لوگوں کے لئے عذاب ہو گا رَجْزِ اَلِيْمٍ کا جس کے معنی سخت عذاب کے ہیں جو دردناک ہو۔

وَيَتَوَرَّى الَّذِيْنَ اٰوْتُوْا الْعِلْمَ، یہ منکرین قیامت کے بالمقابل ان مومنین کا ذکر ہے جو قیامت پر ایمان لائے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا وہ اس علم سے مستفید ہوئے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُكُمُ عَلٰی رَجُلٍ يُنٰبِيْكُمْ اِذَا مَرَّ قُرْبَكُمْ فَتَمُرُّوْا عَنْكُمْ فَتَبٰتِلُوْنَ، یہ کفار منکرین قیامت کا قول نقل کیا گیا ہے، جو بطور تحقیر و استہزاء کے یوں کہا کرتے تھے کہ آؤ ہم تمہیں ایک ایسے عجیب شخص کا پتہ دیں جو یوں

ہستہ ہو کہ جب تم پوری طرح ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے، اس کے بعد پھر تمہیں نئی پیدائش دی جائے گی اور پھر تم اسی شکل و صورت میں تیار کر کے زندہ کر دیے جاؤ گے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس شخص سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو قیامت اور اس میں سب مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کی خبر دیتے اور لوگوں کو اس پر ایمان لانے کی تاکید کرتے تھے، اور یہ سب لوگ آپ کو پوری طرح جانتے تھے، مگر یہاں اس انداز سے ذکر کیا کہ گویا یہ آپ کے متعلق اور کچھ نہیں جانتے، بجز اس کے کہ آپ قیامت میں مردوں کے زندہ ہونے کی خبر دیتے ہیں۔ یہ طرز کلام استہزاء و تحقیر کے لئے اختیار کیا تھا۔

اور مَہِیْنٌ قُتْمٌ مَرْقٍ سے مشتق ہے، جس کے معنی چیرنے پھاٹنے اور ٹکڑے کرنے ہیں اور مَہِیْنٌ مَرْقٍ سے مراد بدن انسانی کا ریزہ ریزہ ہو کر الگ ہو جانا ہے، آگے آپ کے قول اور ذکر قیامت کے متعلق اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:-

أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَمْ بِهِ جِنَّةٌ ۚ مطلب یہ ہو کہ جسم کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد سب ذرات کا جمع ہو کر پھر بدن انسانی بن جانا اور زندہ ہونا تو ایسی نامعقول بات ہو جس کو تسلیم کرنے اور ماننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے ان کا یہ قول یا تو جان بوجھ کر خدا تعالیٰ پر افتراء و بہتان باندھنا ہے، یا پھر یہ کہنے والا مجنون ہے جس کے کلام کی کوئی بنیاد صحیح نہیں ہوتی۔

أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ الْآیۃ جیسا کہ خلاصہ تفسیر سے معلوم ہو چکا ہے اس آیت میں قیام قیامت کے دلائل بھی ہیں کہ آسمان و زمین کی مخلوق میں غور کرنے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا مشاہدہ کرنے سے وہ استبعاد و رفع ہو سکتا ہے جو منکرین قیامت کو اس کی تسلیم سے مانع تھا، اور ساتھ ہی منکرین کے لئے سزا کی دھمکی بھی ہے کہ یہ آسمان و زمین کی تمام مخلوقات عظیمہ جو تمہارے لئے بڑی نعمتیں ہیں، اگر ان کے مشاہدہ کے بعد بھی تم تکذیب و انکار پر جے رہے تو اللہ کی قدرت میں یہ بھی ہو کہ انہی نعمتوں کو تمہارے لئے عذاب بنا دے کہ زمین تمہیں نگل جائے، یا آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تم پر گر پڑے۔

وَلَقَدْ أَنشَأْنَا دَاوُدَ كَوًّا بَنِي إِسْرَٰءِيلَ وَأَوْفَىٰ بِوَعْدِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ مُبِیْنًا ۚ

اور ہم نے دے دی ہے داؤد کو اپنی طرف بڑائی، اے پہاڑ و خوش آوازی سے پڑھو اسکے کلمے اور اڑتے جانوروں کو اور



أَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ ۚ ۱۰ أَنْ أَعْمَلَ سَبْعَ سَاعَاتٍ وَقَدْ رَفِيَ السَّرْدُ

نرم کر دیا ہم نے اس کے آگے لوہا، کہ بنا زریں کشادہ اور اندازے سے جوڑ کر طیاں

وَأَعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۙ ۱۱ وَلَسَكُمُ الرِّجْ

اور کرو تم سب کام بھلا میں جو کچھ تم کرتے ہو دیکھتا ہوں۔ اور لیماں کے آگے ہوا کو

عْدُ وَهَاشْهَرُ ۚ وَرَوَّاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَأَسْلَنَّا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ وَمِنْ

صبح کی منزل کی ایک مہینہ کی اور شام کی منزل ایک مہینہ کی اور بہا دیا ہم نے اس کے واسطے چشمہ پھلے ہوئے تابو کا،

الْجِنِّ مَنْ يَعْمَلْ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ

اور جنوں میں کتنے لوگ تھے جو محنت کرتے اس کے سامنے اس کے رب کے حکم سے اور جو کوئی پھرے ان میں سے

عَنْ أَمْرِنَا ذِنْ قَبْهِ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ۙ ۱۲ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا

ہمارے حکم سے چکھائیں ہم اس کو آگ کا عذاب۔ بناتے اس کے واسطے جو کچھ

يَشَاءُ مِنْ تَحَارِيْبٍ وَتَمَائِيلٍ وَجَفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقَدْ وَرَدِ

چاہتا قلعے اور تصویریں اور لگن جیسے تالاب اور دیگیں

رُسُلَاتٍ أَعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ

چوٹھوں پر بھی ہوئی، کام کر دے داؤد کے گھر والو احسان مان کر اور تھوڑے ہیں میرے بندوں میں

الشَّاكِرِينَ ۙ ۱۳ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ

احسان ماننے والے۔ پھر جب مقرر کیا ہم نے اس پر موت کو نہ بتلایا ان کو اس کا مرنا

إِلَّا دَابَّةَ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَاتَهُ ۖ فَلَمَّا خِرَّ تَبَيَّنَتْ إِلَيْهِ الْجِنَّ

مگر کیڑے نے گھن کے کھاتا رہا اس کا عصا، پھر جب وہ گر پڑا معلوم کیا جنوں نے

أَنْ لَّوْكَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۙ ۱۴

کہ اگر خبر رکھتے ہوتے غیب کی نہ رہتے ذلت کی تکلیف میں۔

## خلاصہ تفسیر

اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو اپنی طرف سے بڑی نعمت دی تھی (چنانچہ

ہم نے پہاڑوں کو حکم دیا تھا کہ) اے پہاڑو! داؤد کے ساتھ بار بار تسبیح کرو (یعنی جب یہ ذکر میں مشغول ہوں تم بھی ان کا ساتھ دو) اور اسی طرح پرندوں کو بھی حکم دیا کہ ان کے ساتھ تسبیح کرو (کما قال اللہ تعالیٰ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ یُسَبِّحُوْنَ بِاَلْحَمْدِ وَالْاَشْرَاقِ وَالطُّيُورُ مَخْشُوْرَةً) الخ شاید اس میں ایک حکمت یہ ہو کہ ان کو ذکر میں نشاط ہوگا، اور یہ بھی حکمت ہو کہ آپ کا ایک معجزہ ظاہر ہوگا اور غالباً یہ تسبیح ایسی ہوگی کہ سننے والے بھی سمجھ لیں ورنہ غیر مفہوم تسبیح تو عام ہے، اس میں معیت داؤد علیہ السلام کی کیا تخصیص ہے؟ کما قال تعالیٰ دَانَ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِن تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَہُمْ) اور (ایک نعمت یہ دیدی کہ) ہم نے ان کے واسطے لوہے کو (مثل موم کے) نرم کر دیا (اور یہ حکم دیا) کہ تم (اس لوہے کی اچھی) پوری زریں بناؤ اور (کرڑیوں کے) جوڑنے میں (مناسب) اندازہ (کا خیال) رکھو اور (جیسے ہم نے تم کو نعمتیں دی ہیں اُن کے شکر میں) تم سب (یعنی داؤد علیہ السلام اور ان کے متعلقین) نیک کام کیا کرو میں تمہارے سب کے اعمال کو دیکھ رہا ہوں (اس لئے رعایتِ حدود کا پورا اہتمام رکھو) اور سلیمان (علیہ السلام) کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اس (ہوا) کا صبح کا چلنا پہینے بھر کی مسافت تھی اور (اسی طرح) اس کا شام کا چلنا پہینے بھر کی مسافت تھی (یعنی وہ ہوا سلیمان علیہ السلام کو اتنی اتنی دور پہنچاتی تھی، کما قال تعالیٰ وَسَخَّرْنَا لَہُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِیْ) اور (ایک نعمت اُن کو یہ دی کہ) ہم نے ان کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا (یعنی تانبے کو اس کے معدن میں رستین سیال کر دیا تاکہ اس سے مصنوعات بنانے میں بدون آلات کے سہولت ہو، پھر وہ منجمد ہو جاتا، یہ بھی ایک معجزہ ہے) اور (ایک نعمت یہ تھی کہ ہم نے جنات کو ان کے تابع کر دیا تھا چنانچہ جنات میں بعضے وہ تھے جو اُن کے آگے (طرح طرح کے) کام کرتے تھے ان کے رب کے حکم (تسخیری) سے (یعنی چونکہ پروردگار نے مسخر کر دیا تھا) اور (حکم تسخیری کے ساتھ ان کو حکم تشریعی بھی مع عید یہ دیا تھا کہ) ان میں جو شخص ہمارے (اس) حکم سے (کہ سلیمان علیہ السلام کی اطاعت کرو) سرتابی کرے گا (یعنی تسلیمِ انقیاد سے کام نہ کرے گا) گو بوجہ تسخیر کے سلیمان علیہ السلام اس سے جبراً کام لینے پر قادر ہوں گے جیسے بیگاریوں سے کام لیا جاتا ہے تو) ہم اس کو (آخرت میں) دوزخ کا عذاب چکھا دیں گے (اس سے یہ بھی مفہوم ہوا کہ جو تسلیم و انقیاد سے کام کرے گا اور پورا انقیاد یہ ہے کہ ایمان بھی اختیار کرے کیونکہ ہر نبی اپنے محکومین کو اس کا امر کرتا ہے تو بدون اس کے انقیاد نہیں پس حاصل یہ کہ جو جن ایمان و اطاعت اختیار کرے گا وہ عذابِ سعیر سے محفوظ رہے گا، جیسا کہ



ایمان کا مقتضا ہے آگے ان کاموں کو بتلاتے ہیں جن پر جنات مامور تھیں، یعنی وہ جنات ان کے لئے وہ وہ چیزیں بناتے جو ان کو (بنوانا) منظور ہوتا بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لنگن، (ایسے بڑے، جیسے حوض اور (بڑی بڑی) دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں (ہلائے بل نہ سکیں اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا کہ جیسے ہم نے تم کو نعمتیں بھی دی ہیں) اسے داؤد کے خاندان والو (یعنی سلیمان علیہ السلام اور ان کے متعلقین) تم سب (ان نعمتوں کے) شکریہ میں نیک کام کیا کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں (اس لئے اس شکر گزاری کرنے سے جس کا طریق مقصود عمل صالح ہے تم کو خلق کثیر پر امتیاز ہو جائے گا پس اس جملہ میں تحریریں ہو گئی شکر و عمل صالح پر جیسے داؤد علیہ السلام کو بھی اَعْمَلُوا صَالِحًا حکم ہوا تھا اور اسی طرح وہاں تسخیر جبال و طیور تھی، اور یہاں تسخیر ریح و جن مذکور ہوئی اور وہاں لوگوں کو نرم کر دینا تھا یہاں تانبے کو، غرض زندگی بھر سلیمان علیہ السلام کے سامنے جنات کا یہ معاملہ رہا، پھر جب ہم نے ان پر (یعنی سلیمان علیہ السلام پر) موت کا حکم جاری کر دیا، (یعنی انتقال فرما گئے) تو (ایسے طور پر موت واقع ہوئی کہ جنات کو خبر نہیں ہوئی وہ یہ کہ سلیمان علیہ السلام موت کے قریب عصا کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کو زیرِ ذقن لگا کر تخت پر بیٹھ گئے اور اسی حالت میں رُوح قبض ہو گئی اور اسی طرح سال بھر تک بیٹھ رہے، جنات آپ کو بیٹھا دیکھ کر زندہ سمجھتے رہے، یہ کسی کی مجال نہ تھی کہ پاس جا کر یا خوب گھور کر دیکھ سکے، خصوصاً جب کہ کوئی وجہ شبہ کی نہ ہو اور زندہ سمجھ کر بدستور کام کرتے رہے اور) کسی چیز نے اُن کے مرنے کا پتہ نہ بتلایا مگر گھن کے کیڑے نے کہ وہ سلیمان (علیہ السلام) کے عصا کو کھاتا تھا (یہاں تک کہ ایک حصہ اس کا کھا لیا، تو وہ عصا گر پڑا، اس کے گرنے سے سلیمان علیہ السلام گر پڑے) سو جب وہ گر پڑے (اور گھن کے کھانے کا تجنیہ لگانے سے معلوم ہوا کہ ان کو تو وفات پائے ہوئے ایک سال ہوا) تب جنات کو (اپنے دعویٰ غیب دانی کی) حقیقت معلوم ہوئی (وہ یہ کہ) اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو (سال بھر تک) اس ذلت کی مصیبت میں نہ رہتے (مراد اعمالِ شاقہ ہیں جن میں بوجہ محکومیت کے ذلت بھی تھی اور مشقت کی وجہ سے مصیبت بھی ہے)۔

## معارف و مسائل

اوپر منکرین قیامت کفار سے خطاب تھا، جو مرنے اور جسم کے اجزاء منتشر ہو جانے کے بعد دوبارہ ان کے جمع کرنے اور ان میں حیات پیدا کرنے کو خلاف عقل سمجھ کر انکار کیا

کرتے تھے، آیات مذکورہ میں ان کا استبعاد دور کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے قصے اس لئے ذکر فرمائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں اسی دنیا میں ایسے کاموں کا مشاہدہ کرا دیا جن کو یہ لوگ محال سمجھا کرتے تھے، مثلاً لوہے کو موم بنا دینا، ہوا کو تابع فرمان بنا دینا، تانبے کو ایک سیال چیز پانی کی طرح کر دینا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا، یعنی عطا کیا ہم نے داؤد کو اپنا فضل، فضل کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں، مراد وہ خاص صفات ہیں جو دوسروں سے زائد ان کو عطا کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی و پیغمبر کو بعض خاص صفات امتیازی عطا فرمائی ہیں جو انکی مخصوص فضیلت سمجھی جاتی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی مخصوص صفات یہ تھیں کہ ان کو اپنی نبوت و رسالت کے ساتھ پوری دنیا کی سلطنت و حکومت بھی عطا فرمائی تھی۔ اور خوش آوازی کی ایسی صفت عطا فرمائی تھی کہ جب آپ اللہ کے ذکر یا زبور کی تلاوت میں مشغول ہوتے تو پرندے ہوا میں اڑتے ہوئے سننے کو جمع ہو جاتے تھے، اسی طرح متعدد معجزات خصوصی عطا ہوئے تھے جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

يَا حِجَابُ اَوْبِي، اَوْبِي، تَاوْبِي سے مشتق ہے، جس کے معنی دہرانے اور لوٹانے کے آتے ہیں۔ مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو حکم دیدیا تھا کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کا ذکر و تسبیح کریں تو پہاڑ بھی وہ کلمات پڑھ کر لوٹائیں۔

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ نے اَوْبِي کی تفسیر سَجَّی سے فرمائی ہو (ابن کثیر) یہ پہاڑوں کی تسبیح جو وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ کرتے تھے اس عام تسبیح کے علاوہ ہے جس میں کُل مخلوقات شریک ہیں، اور جو ہر جگہ ہر وقت ہر زمانے میں جاری ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے: وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِیْ وَلَا تَعْقِلُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ، یعنی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی تسبیح نہ پڑھتی ہو مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔ یہاں جس تسبیح کا ذکر ہے وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے یہ ظاہر ہے کہ اس تسبیح کو عام سننے والے بھی سنتے سمجھتے ہوں گے، ورنہ پھر معجزہ ہی نہ ہوتا۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ داؤد علیہ السلام کی آواز کے ساتھ پہاڑوں کا آواز ملتا اور تسبیح کو دہرانے کی آواز بازگشت کے طور پر نہ تھا جو عام طور پر گنبد یا کنوئیں وغیرہ میں آواز دینے کے وقت آواز کے لوٹنے سے سنی جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے اس کو حضرت داؤد علیہ السلام پر خصوصی فضل و انعام کی حیثیت میں ذکر فرمایا ہے، آواز بازگشت



میں کسی کی فضیلت و خصوصیت سے کیا تعلق ہے وہ تو ہر انسان چاہے کافر ہی ہو بازگشت کی جگہ میں اس کی آواز بھی ٹوٹتی ہے۔

وَالطَّيْرُ، یہ لفظ نحوی ترکیب میں سُخْر کا مخذوف کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے (روح) معنی یہ ہیں کہ ہم نے پرندوں کو حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا تھا مراد اس تسخیر سے یہ ہے کہ پرندے بھی آپ کی آواز پر ہوا میں جمع ہو جاتے۔ اور آپ کے ساتھ پہاڑوں کی طرح تسلیج کرتے تھے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں مذکور ہے، اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحُنَ بِالْعِثَّةِ وَالْاِشْرَاقِ وَالطَّيْرُ مَحْشُورَةً یعنی ہم نے پہاڑوں کو داؤد علیہ السلام کا مسخر کر دیا تھا کہ صبح شام ان کے ساتھ تسلیج کیا کریں اور پرندوں کو بھی مسخر کر دیا۔

وَاَنْتَ اَلْحَدِيْدُ اِنْ اَعْمَلْ مِثْلَ مَا تُعْمَلُ، یہ دوسرا معجزہ ہے کہ لوہے کو ان کے لئے نرم کر دیا تھا۔ حسن بصری، قتادہ، الحمش وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ کے لوہے کو ان کیلئے موم کی طرح نرم بنا دیا تھا کہ اس سے کوئی چیز بنانے میں نہ اُن کو آگ کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ کسی ہتھوڑے یا دوسرے آلات کی۔ آگے آیت میں اس کا بیان ہے کہ لوہے کو ان کے لئے نرم اس لئے بنایا گیا تھا کہ وہ لوہے کی زرہ آسانی سے بنا سکیں، اور ایک دوسری آیت میں یہ بھی مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زرہ سازی کی صنعت آپ کو خود سکھائی تھی وَ عَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ نَبْوَسٍ لِّكُمَّ، یعنی ہم نے سکھائی ان کو صنعت زرہ بنانے کی، اور اس آیت میں بھی آگے جو قَدْ رَفِیَ الشَّرُّ آیا ہے، یہ بھی اس صنعت کے سکھانے کی تکمیل ہے۔ لفظ قَدْ رَفِیَ سے مشتق ہے جس کے معنی ایک اندازے پر بنانے کے ہیں، اور تَرَدُّد کے لفظی معنی بننے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زرہ کے بنانے میں اس کی کڑیوں کو متوازن اور متناسب بنائیں، کوئی چھوٹی کوئی بڑی نہ ہو، تاکہ وہ مضبوط بھی بنے اور دیکھنے میں بھی بھلی معلوم ہو۔ قَدْ رَفِیَ الشَّرُّ کی یہ تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے (ابن کثیر)

فَاعْلَمْ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صنعت میں ظاہری خوش نمائی کی رعایت بھی پسندیدہ چیز ہے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص ہدایت فرمائی۔

فَاعْلَمْ: بعض حضرات نے قَدْ رَفِیَ الشَّرُّ کی تفسیر میں تقدیر سے یہ مراد لیا ہے کہ اس صنعت کے لئے ایک مقدار وقت کی معین کر لینا چاہئے۔ سارے اوقات اس میں صرف نہ ہو جائیں، تاکہ عبادت اور امور سلطنت میں اس کی وجہ سے خلل نہ آئے۔ اس تفسیر پر

معلوم ہوا کہ صنعت کار اور محنت کش لوگوں کو بھی یہ چاہئے کہ عبادت اور اپنی معلومات حاصل کرنے کے لئے اپنے کام سے کچھ وقت بچا یا کریں اور اوقات کا انضباط رکھیں۔ (روح المعانی) صنعت و حرفت کی آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ اشیاء ضرورت کی ایجاد و صنعت ایسی اہم بڑی فضیلت ہے۔ چیز ہے کہ حق تعالیٰ نے خود اس کی تعلیم دینے کا اہتمام فرمایا، اور اپنے

عظیم الشان پیغمبروں کو سکھلایا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھانا اسی آیت سے ثابت ہوا، حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کی صنعت اسی طرح سکھائی گئی، **وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا** یعنی ہمارے سامنے کشتی بناؤ۔ سامنے بنانے کا مطلب یہی ہے کہ جس طرح ہم بتلاتے ہیں اسی طرح بناؤ۔ اسی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کو بھی مختلف صنعتیں سکھانا بعض روایات سے ثابت ہے۔ **الطَّبَّ النَّبِيُّ** کے نام سے ایک کتاب امام حدیث حافظ شمس الدین ذہبی کی طرف نسبت کے ساتھ چھپی ہے، اس میں تو ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جتنی اہم اور ضروری صنعتیں ہیں مثلاً مکان بنانا، کپڑا بنانا، درخت بونا اور اگانا، کھانے کی چیزیں تیار کرنا، حمل و نقل کے لئے پہیوں کی گاڑی بنا کر چلانا وغیرہ یہ سب ضروری صنعتیں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے انبیاء علیہم السلام کو سکھلاتی تھیں۔

صنعت پیشہ لوگوں کو عرب میں مختلف آدمی مختلف صنعتیں اختیار کرتے تھے، کسی صنعت حقیر سمجھنا گناہ ہے۔ کو حقیر یا ذلیل نہیں سمجھا جاتا تھا، اور پیشہ و صنعت کی بنیاد پر کسی

شخص کو کم یا زیادہ نہ سمجھا جاتا تھا، نہ پیشوں کی بنیاد پر کوئی برادری بنتی تھی۔ پیشوں کی بنیاد پر برادریاں بنانا اور بعض پیشوں کو بحیثیت پیشہ حقیر و ذلیل سمجھنا یہ ہندوستان میں ہندوؤں کی پیداوار ہے، ان کے ساتھ رہنے بہنے سے مسلمانوں میں بھی یہ اثرات قائم ہو گئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو تفسیر ابن کثیر میں امام حدیث حافظ ابن عساکر کی روایت سے صنعت زرہ سکھانے کی حکمت نقل کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنی خلافت و سلطنت

کے زمانہ میں بھیس بدل کر بازاروں وغیرہ میں جاتے، اور مختلف اطراف سے آنے والے لوگوں سے پوچھا کرتے تھے کہ داؤد کیسا آدمی ہے؟ چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی سلطنت میں عدل و انصاف عام تھا، اور سب انسان آرام و عیش کے ساتھ گزارہ کرتے تھے، کسی کو حکومت سے کوئی شکایت نہ تھی، اس لئے جس سے سوال کرتے وہ داؤد علیہ السلام کی مدح و ثناء اور عدل و انصاف پر اظہارِ شکر کرتا تھا۔

حق تعالیٰ نے ان کی تعلیم کے لئے اپنے ایک فرشتے کو شکل انسان بھیج دیا، جب



داؤد علیہ السلام اس کام کے لئے نکلے تو یہ فرشتہ ان سے ملا۔ حسب عادت اس سے بھی وہی سوال کیا، فرشتے نے جواب دیا کہ داؤد بہت اچھا آدمی ہے اور سب آدمیوں سے وہ اپنے نفس کے لئے بھی اور اپنی امت و رعیت کے لئے بھی بہتر ہے، مگر اس میں ایک عادت ایسی ہے کہ وہ نہ ہوتی تو وہ بالکل کامل ہوتا۔ داؤد علیہ السلام نے پوچھا وہ کیا عادت سے؟ فرشتے نے کہا کہ وہ اپنا کھانا پینا اور اپنے اہل و عیال کا گزارہ مسلمانوں کے مال یعنی بیت المال میں سے لیتے ہیں۔

یہ بات سن کر حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف الحاح و زاری اور دعا کا اہتمام کیا کہ مجھے کوئی ایسا کام سکھادیں جو میں اپنے ہاتھ کی مزدوری سے پورا کروں، اور اس کی اجرت سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا گزارہ کروں، اور مسلمانوں کی خدمت اور سلطنت کے تمام کام بلا معاوضہ کروں۔ ان کی دعا کو حق تعالیٰ نے قبول فرمایا، ان کو ذرہ سازی کی صنعت سکھادی، اور پیغمبرانہ اعزاز یہ دیا کہ لوہے کو ان کے لئے موم بنا دیا تاکہ یہ صنعت بہت آسان ہو جائے، اور تھوڑے وقت میں اپنا گزارہ پیدا کر کے باقی وقت عبادت اور امور سلطنت میں لگا سکیں۔

مسئلہ : خلیفہ وقت یا سلطان کو جو اپنا پورا وقت امور سلطنت کی انجام دہی میں صرف کرتا ہے شرعاً یہ جائز ہے کہ اپنا متوسط گزارہ بیت المال سے لے لے، لیکن کوئی دوسری صورت گزارہ کی ہو سکے تو وہ زیادہ پسند ہے۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کے خزانے کھول دیئے تھے، اور زر و جواہرات اور تمام اشیاء ضرورت کی بڑی فراوانی تھی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو بیت المال کے مال میں حسب منشاء ہر تصرف کی اجازت بھی دیدی گئی تھی۔ آیت فَاَمْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ یَغْنِیْ حِسَابِ میں یہ بھی اطمینان دلایا تھا کہ آپ جس طرح چاہیں خرچ کریں، آپ کے ذمہ حساب دینا نہیں ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کو حق تعالیٰ جس مقام بلند پر رکھنا چاہتے ہیں اس کے تقاضہ سے یہ واقعہ پیش آیا اور اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام اتنی بڑی سلطنت کے ہوتے ہوئے اپنی مزدوری سے اپنا گزارہ پیدا کرتے اور اسی پر قناعت کرتے تھے۔

علماء جو تعلیم و تبلیغ کی خدمت مفت انجام دیتے ہوں، اور قاضی و مفتی جو لوگوں کے کام میں اپنا وقت صرف کرتے ہوں اُن کا بھی یہی حکم ہے کہ بیت المال سے اپنا خرچ لے سکتے ہیں، مگر کوئی دوسری صورت گزارہ کی ہو جو دینی خدمت میں خلل انداز بھی نہ ہو تو

وہ بہتر ہے۔

فائدہ: حضرت داؤد علیہ السلام کے اس طرز عمل سے کہ اپنے اعمال و عبادت کے متعلق لوگوں کی رائیں بے تکلف آزادانہ معلوم کرنے کا اہتمام فرماتے تھے یہ ثابت ہوا کہ اپنے عیوب چونکہ آدمی کو خود معلوم نہیں ہوتے، اس لئے دوسروں سے تحقیق کرنا چاہئے۔ حضرت امام مالکؒ بھی اس کا اہتمام فرماتے تھے کہ یہ معلوم کریں کہ عام لوگ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّجْمُ عُدُّ وَهَاشْمَرُ وَرَوَاحُهَا شَمَرٌ، حضرت داؤد علیہ السلام کے خصوصی فضائل و انعامات کے ذکر کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر فرمایا اور ارشاد ہوا کہ جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا، اسی طرح سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر فرما دیا تھا، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت کو جس پر وہ مع اپنے اہل دربار کے بڑی تعداد میں سوار ہوتے تھے، ہوا ان کے حکم کے تابع جہاں وہ چاہتے لے جاتی تھی۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ تسخیر ہوا کا معجزہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس عمل کے صلہ میں عطا ہوا تھا کہ ایک روز وہ اپنے گھوڑوں کے معائنہ میں مشغول تھے، اس میں ایسی مشغولیت ہوئی کہ عصر کی نماز قضا ہو گئی، چونکہ گھوڑے اس غفلت کا سبب ہوئے تھے اس سبب غفلت کو ختم کرنے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان گھوڑوں کو ذبح کر کے قربان کر دیا کیونکہ سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں گائے بیل کی طرح گھوڑے کی قربانی بھی جائز تھی، اور یہ گھوڑے خود حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملک میں تھے، اس لئے بیت المال کے نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور قربانی کی وجہ سے اپنا مال ضائع کرنے کا اشکال بھی نہیں ہوتا۔ اس کی پوری تفصیل سورہ ص میں آئے گی، چونکہ سلیمان علیہ السلام نے اپنی سواری کے جانور قربان کر دیئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بہتر سواری عطا فرمادی (شرطی)

عُدُّ وَهَاشْمَرُ وَرَوَاحُهَا شَمَرٌ، عُدُّ کے معنی صبح کو چلنے اور رَوَاحُ کے معنی شام کو چلنے کے ہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہوا کہ صبح سے دوپہر تک یہ تخت سلیمانی ہوا کے کاندھوں پر ایک مہینہ کی مسافت طے کر لیتا تھا، اور پھر شام سے رات تک ایک مہینہ کی اس طرح دو مہینے کی مسافت ایک دن میں طے کرتا تھا۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام صبح کو بیت المقدس سے



روانہ ہوتے تو دوپہر کو صطخر میں جا کر قیام فرماتے، اور دوپہر کا کھانا کھاتے تھے، پھر یہاں سے بعد ظہر واپس چلتے تو کابل میں جا کر رات ہوتی تھی، اور بیت المقدس اور صطخر کے درمیان اتنی مسافت ہی جو تیز سواری پر چلنے والا ایک ماہ میں طے کر سکتا ہے، اسی طرح صطخر سے کابل تک کی مسافت بھی تیز سواری پر چلنے والا ایک ماہ میں طے کر سکتا ہے۔ (ابن کثیر)

وَأَسْلَمْنَا لَهُ عَلَيْنَا الْفِطْرَ، یعنی بہادیاہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے چشمہ تانبے کا یعنی تانبے جیسی سخت دھات کو اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے لئے پانی کی طرح بہنے والا سیال بنا دیا، جو پانی کے چشمہ کی طرح جاری تھا اور گرم بھی نہ تھا، تاکہ آسانی کے ساتھ اس کے برتن اور دوسری ضروریات بنا سکیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ چشمہ اتنی دور تک جاری ہوا جس کی مسافت تین دن تین رات میں طے ہو سکے، اور یہ ارض یمن میں تھا۔ اور مجاہد کی روایت میں ہے کہ یہ چشمہ صنعاء یمن سے شروع ہوا اور تین دن تین رات کی مسافت تک پانی کے چشمہ کی طرح جاری ہوا، خلیل نحوی نے فرمایا کہ لفظ قِطْر جو اس آیت میں آیا ہے اس سے مراد پگھلا ہوا تانبہ ہے (قرطبی)

وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَّحْمِلُ بَيْنَ يَدَيْهِ، یہ جملہ بھی تسخیر نامحذوف سے متعلق ہے یعنی یہ ہیں کہ مسخر کر دیا ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات میں سے ایسے لوگوں کو جو ان کے سامنے ان کے کام انجام دیں اپنے رب کے حکم کے موافق، بَيْنَ يَدَيْهِ یعنی ان کے سامنے کے الفاظ بڑھانے سے شاید یہ بتلانا ہو کہ سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات کی تسخیر اس طرح کی نہیں جس طرح چاند سورج وغیرہ کو انسان کے لئے مسخر کرنے کا ارشاد قرآن میں آیا ہے، بلکہ یہ تسخیر ایسی تھی کہ جنات نوکروں چاکروں کی طرح ان کے سامنے مفوضہ خدمات میں لگے رہتے تھے۔

**تسخیر جنات کا مسئلہ** جنات کی تسخیر جو اس جگہ مذکور ہو وہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی، اس میں تو کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا، اور بعض صحابہ

کرام کے متعلق جو روایات میں آیا ہے کہ جنات ان کے مسخر اور تابع تھے، تو یہ تسخیر بھی اسی قسم کی تسخیر باذن اللہ تھی جو بطور کرامت ان حضرات کو عطا کی گئی تھی اس میں کسی عمل و وظیفہ کا کوئی دخل نہیں تھا، جیسا کہ علامہ شربینی نے تفسیر سراج المنیر میں اس آیت کے تحت میں حضرت ابوہریرہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، عمر بن خطاب، ابوالیوب انصاری، زید بن ثابت وغیرہ رضی اللہ عنہم کے متعدد واقعات ایسے لکھے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جنات ان کی اطاعت و خدمت کرتے تھے۔ مگر یہ سب محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم

تھا کہ سلیمان علیہ السلام کی طرح کچھ جنّات کو ان حضرات کا مسخر بنا دیا، لیکن جو تسخیر عملیات کے ذریعہ عالموں میں مشہور ہے وہ قابل غور ہے، کہ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ قاضی بدرالدین شمس الحنفی جو آٹھویں صدی کے علماء میں سے ہیں انھوں نے جنّات کے احکام پر ایک مستقل کتاب "آکام المرجان فی احکام الجنان" لکھی ہے۔ اس میں بیان کیا ہے کہ جنّات سے خدمت لینے کا کام سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے باذن اللہ بطور معجزہ کے کیا ہے، اور اہل فارس جمشید بن اورنجیان کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ انھوں نے جنّات سے خدمت لی ہے۔ اسی طرح آصف بن برخیا وغیرہ جن کا تعلق حضرت سلیمان علیہ السلام سے رہا ہے، ان کے متعلق بھی استخدام جن کے واقعات مشہور ہیں، اور مسلمانوں میں سب سے زیادہ ہنرت ابو نصر احمد بن ہلال البکیل اور ہلال بن وصیف کی ہے جن سے استخدام جنّات کے عجیب عجیب واقعات مذکور ہیں۔ ہلال بن وصیف نے ایک مستقل کتاب میں جنّات کے کلمات جو انھوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے پیش کئے اور جو عہد و میثاق سلیمان علیہ السلام نے ان سے لئے ان کو جمع کر دیا۔ قاضی بدرالدین نے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ عام طور سے تسخیر جنّات کا عمل کر نیوالے عاملین کلمات کفریہ شیطانیہ سے اور سحر سے کام لیتے ہیں، جن کو کافر جنّات و شیاطین پسند کرتے ہیں، اور ان کے مسخر و تابع ہونے کا راز صرف یہ ہے کہ وہ ان کے اعمال کفریہ شرکیہ سے خوش ہو کر بطور رشوت کے ان کے کچھ کام بھی کر دیتے ہیں، اور اسی لئے بکثرت ان عملیات میں قرآن کریم کو نجاست یا خون وغیرہ سے لکھتے ہیں، جس سے کفار جنّ اور شیاطین راضی ہو کر ان کے کام کر دیتے ہیں۔ البتہ ایک شخص ابن الامام کے متعلق لکھا ہے کہ یہ خلیفہ معتضد باللہ کے زمانہ میں تھا، جنّات کو اس نے اسماء الہیہ کے ذریعہ سے مسخر کیا تھا، اس میں کوئی بات خلاف شرع نہیں تھی۔ (آکام المرجان، ص ۱۰۰)

خلاصہ یہ ہے کہ جنّات کی تسخیر اگر کسی کے لئے بغیر قصد و عمل کے محض منجانب اللہ ہو جائے جیسا کہ سلیمان علیہ السلام اور بعض صحابہ کرام کے متعلق ثابت ہے وہ تو معجزہ یا کرامت میں داخل ہے، اور جو تسخیر عملیات کے ذریعہ کی جاتی ہے اس میں اگر کلمات کفریہ یا اعمال کفریہ ہوں تو کفر، اور صرف معصیت پر مشتمل ہوں تو گناہ کبیرہ ہے، اور جن عملیات میں ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن کے معنی معلوم نہیں ان کو بھی فقہاء نے اس بنا پر ناجائز کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان کلمات میں کفر و شرک یا معصیت پر مشتمل کلمات ہوں، قاضی بدرالدین نے "آکام المرجان" میں ایسے نامعلوم المعنی کلمات کے استعمال کو بھی ناجائز لکھا ہے۔



اور اگر یہ عمل تسخیرِ اسماءِ آہیہ یا آیاتِ قرآنیہ کے ذریعہ ہو اور اس میں نجاست وغیرہ کے استعمال جیسی کوئی معصیت بھی نہ ہو تو وہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ مقصود اس جنات کی ایذا سے خود بچنا یا دوسرے مسلمانوں کو بچانا ہو، یعنی دفعِ مضرت مقصود ہو جو جلبِ منفعت مقصود نہ ہو۔ کیونکہ اگر اس کو کسبِ مال کا پیشہ بنایا گیا تو اس لئے جائز نہیں کہ اس میں ہترقاقِ حر یعنی آزاد کو اپنا غلام بنانا اور بلا حق شرعی اس سے بیگار لینا ہے، جو حرام ہے۔ واللہ اعلم

وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرٍ فَإِنَّهُ مِنْ أَبِ السَّعِيرِ، یعنی ہم نے جنات کو سلیمان علیہ السلام کی خدمت و اطاعت کا جو حکم دیا ہے اگر ان میں کوئی فرد اس اطاعت کے انحراف کرے گا تو اس کو آگ کا عذاب دیا جائے گا، اکثر مفسرین نے اس سے ... آخرت کا عذاب جہنم مراد لیا ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک فرشتہ کو مسلط کر دیا تھا کہ جو جن سلیمان علیہ السلام کی اطاعت میں کوتاہی کرے اس کو آتشیں کوڑے مار کر کام کرنے پر مجبور کرتا تھا (تشرطی) اور اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جنات تو خود آگ سے بنے ہوئے ہیں، آگ اُن پر کیا اثر کرے گی۔ کیونکہ جنات کے آگ سے بننے کا مطلب وہی ہے جو انسان کے مٹی سے بننے کا مطلب ہے، یعنی عنصرِ غالب انسان کے وجود کا مٹی ہے، مگر اس کو مٹی پتھر سے مارا جائے تو تکلیف پہنچتی ہے اسی طرح جنات کا عنصرِ غالب آگ ہے، مگر خالص اور تیز آگ سے وہ بھی جل جاتے ہیں۔

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِبٍ وَ تَمَاثِيلٍ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُورٍ وَ سِيِّبٍ، اس آیت میں اُن کاموں کی کچھ تفصیل ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام جنات سے لیتے تھے۔ محارِب، محراب کی جمع ہے جو مکان کے اشرف و اعلیٰ حصہ کو کہتے ہیں۔ قُدُور، بادشاہ اور بڑے لوگ جو اپنے لئے حکومت کا کمرہ بناتے ہیں اس کو بھی محراب کہا جاتا ہے۔ اور لفظ محرابِ حرب بمعنی جنگ سے مشتق ہے، کوئی آدمی جو اپنا حکومت کدہ خاص بناتا ہے اس کو دوسروں کی رسائی سے محفوظ رکھتا ہے، اس میں کوئی دست اندازی کرے تو اس کے خلاف لڑائی کرتا ہے۔ اس مناسبت سے مکان کے مخصوص حصہ کو محراب کہتے ہیں۔ مساجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو بھی اسی امتیاز کی بنا پر محراب کہتے ہیں، اور کبھی خود مساجد کو محاریب کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں محاریب بنی اسرائیل اور اسلام میں محاریب صحابہ سے ان کی مساجد مراد ہوتی ہیں۔

مساجد میں محراب کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد تک امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو ایک علیحدہ مکان کی حیثیت سے بنانے کے کھڑے ہونے کی جگہ کو ایک علیحدہ مکان کی حیثیت سے بنانے

کا رواج نہیں تھا، قرونِ اولیٰ کے بعد سلاطین نے اس کا رواج اپنے تحفظ کے لئے دیا۔ اور عام مسلمانوں میں اس کا رواج اس مصلحت سے بھی ہوا کہ امام جس جگہ کھڑا ہوتا ہے وہ پوری صفِ خالی رہتی ہے۔ نمازیوں کی کثرت اور مساجد کی تنگی کے پیش نظر صرف امام کے کھڑے ہونے کی جگہ دیوارِ قبلہ میں گہری کر کے بنا دی جاتی ہے، تاکہ اس کے پیچھے پوری صفوں کھڑی ہو سکیں، چونکہ یہ طریقہ قرونِ اولیٰ میں نہ تھا، اس لئے بعض علما نے اس کو بدعت کہہ دیا ہے۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اس مسئلہ پر مستقل رسالہ بنام اعلام الارباب فی بدعت المحارب لکھا ہے۔ اور تحقیق اور صحیح بات یہ ہے کہ اگر اس طرح کی محرابیں نمازیوں کی سہولت اور مسجد کے مصالح کے پیش نظر بنائی جائیں اور ان کو سنتِ مقصودہ نہ سمجھا جائے تو ان کو بدعت کہنے کی کوئی وجہ نہیں، ہاں اس کو سنتِ مقصودہ بنا لیا جائے اس کے خلاف کرنے والے پر تکبر ہونے لگے تو اس غلو سے یہ عمل بدعت میں داخل ہو سکتا ہے۔

مسئلہ: جن مساجد میں محراب امام ایک مستقل مکان کی صورت میں بنائی جاتی ہے وہاں امام پر لازم ہے کہ اس محراب سے کسی قدر باہر اس طرح کھڑا ہو کہ اس کے قدم محراب سے باہر نمازیوں کی طرف رہیں، تاکہ امام الگ مکان میں تہنا کھڑا ہو، اور سب مقتدی ورنہ یہ صورت مکروہ و ناجائز ہے کہ امام الگ مکان میں تہنا کھڑا ہو، اور سب مقتدی دوسرے مکان میں۔ بعض مساجد محراب اتنی وسیع و عریض بنائی جاتی ہے کہ ایک مختصر سی صفِ مقتدیوں کی بھی اس میں آجائے، ایسی محراب میں اگر ایک صفِ مقتدیوں کی بھی محراب میں کھڑی ہو اور امام ان کے آگے پورا محراب میں کھڑا ہو تو امام و مقتدیوں کے مکان کا اشتراک ہو جانے کی وجہ سے کراہت نہیں رہے گی۔

تَمَثَالٌ، تمثال کی جمع ہے۔ قاموس میں ہے کہ تَمَثَالٌ بفتح التاء مصدر ہے اور بکسر التاء تمثال تصویر کو کہا جاتا ہے۔ ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ تَمَثَالٌ یعنی تصویر دو طرح کی ہوتی ہے، ایک ذی روح جاندار چیزوں کی تصویر، دوسرے غیر ذی روح بے جان چیزوں کی۔ پھر بے جان چیزوں میں دو قسمیں ہیں، ایک جماد جس میں زیادتی اور نمو نہیں ہوتا، جیسے پتھر مٹی وغیرہ، دوسرے نامی جس میں نمو اور زیادتی ہوتی رہتی ہے، جیسے درخت اور کھیتی وغیرہ۔ جنات حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے ان سب قسم کی چیزوں کی تصویریں بناتے تھے۔ اول تو لفظ تَمَثَالٌ کے عموم ہی سے



یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ یہ تصاویر کسی خاص قسم کی نہیں، بلکہ ہر قسم کے لئے عام تھیں۔

دوسرے تاریخی روایات میں تحت سلیمان پر پرندوں کی تصاویر ہونا بھی مذکور ہے۔

شرع اسلام میں جاندار کی تصویر

بنانے اور استعمال کرنے کی ممانعت

کی شریعت میں جان داروں کی تصاویر بنانا اور استعمال

کرنا حرام نہیں تھا، مگر چونکہ پچھلی امتوں میں اس کا مشاہدہ ہوا کہ لوگوں کی تصاویر ان کی

یادگار کے طور پر بنائیں اور ان کو اپنے عبادت خانوں میں اس غرض کے لئے رکھا کہ ان کو

دیکھ کر ان کی عبادت گزاری کا نقشہ سامنے آئے تو خود ہمیں بھی عبادت کی توفیق ہو جائیگی

مگر رفتہ رفتہ ان لوگوں نے انہی تصویروں کو اپنا معبود بنالیا، اور بت پرستی شروع ہو گئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلی امتوں میں جانداروں کی تصاویر بت پرستی کا ذریعہ بن گئیں،

شریعت اسلام کے لئے چونکہ قیامت تک قائم اور باقی رکھنا تقدیر الہی ہے، اس لئے

اس میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ جس طرح اصل حرام چیزوں اور معاصی کو حرام

و ممنوع کیا گیا ہے، اسی طرح ان کے ذرائع اور اسباب قریبہ کو بھی اصل معاصی کے

ساتھ ملحق کر کے حرام کر دیا گیا ہے۔ اصل جرم عظیم شرک و بت پرستی ہے، اس کی

ممانعت ہوتی تو جن راستوں سے بت پرستی آ سکتی تھی ان راستوں پر بھی شرعی پہرہ بٹھا دیا

گیا اور بت پرستی کے ذرائع اور اسباب قریبہ کو بھی حرام کر دیا گیا۔ ذی روح کی تصاویر

کا بنانا اور استعمال کرنا اسی اصول کی بنا پر حرام کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

احادیث صحیحہ و متواترہ سے اس کی حرمت ثابت ہے۔

اسی طرح شراب حرام کی گئی تو اس کی خرید و فروخت، اس کو لانے لے جانے کی

مزدوری اس کی صنعت سب حرام کر دی گئی جو شراب نوشی کے ذرائع ہیں۔ چوری حرام

کی گئی تو کسی کے مکان میں بلا اجازت داخل ہونا بلکہ باہر سے جھانکنا بھی ممنوع کر دیا گیا

زنا حرام کیا گیا تو غیر محرم کی طرف بالقصد نظر کرنے کو بھی حرام کر دیا گیا۔ شریعت اسلام

میں اس کی بے شمار نظائر موجود ہیں۔

حرمت تصویر پر ایک عام

شبہ اور اس کا جواب

یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک

میں تصاویر کو جس حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا وہ ذریعہ

بت پرستی بن سکتی تھی، لیکن آجکل تصویر سے جس طرح کے کام لئے جاتے ہیں، ملزموں

کی شناخت، تجارتوں کے خاص مارک، دوستوں عزیزوں سے ملاقات و واقعات و

حالات کی تحقیق میں امداد وغیرہ جس کی وجہ سے وہ ضروریات زندگی میں داخل کر لی گئی ہیں

اس میں بہت پرستی اور عبادت کا کوئی تصور درود و رنج نہیں، تو یہ ممانعت جو بت پرستی کے خطرہ سے کی گئی تھی اب مرتفع ہو جانی چاہئے۔

جواب یہ ہے کہ اولاً یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ آجکل تصویر ذریعہ بت پرستی نہیں رہی، آج بھی کتنے فرقے اور گروہ ہیں جو اپنے پیروؤں کی تصویر کی پوجا پاٹ کرتے ہیں، اور جو حکم کسی علت پر دائر ہو، یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر فرد میں پایا جائے۔ اس کے علاوہ تصویر کی ممانعت کا سبب صرف ایک ہی نہیں کہ وہ بت پرستی کا ذریعہ ہے، بلکہ احادیث صحیحہ میں اس کی حرمت کی دوسری وجوہ بھی مذکور ہیں۔ مثلاً یہ کہ تصویر سازی حق تعالیٰ کی صفت خاص کی نقالی ہے، موصوٰر حق تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے، اور صورت گرمی درحقیقت اسی کے لئے منزاوار اور اسی کی قدرت میں ہے کہ مخلوقات کی ہزاروں اجناس اور انواع اور ہر نوع میں اس کے کروڑوں افراد ہوتے ہیں، ایک کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی، انسان ہی کو لے لو تو مرد کی صورت اور عورت کی صورت میں نمایاں امتیاز یا پھر عورتوں اور مردوں کے کروڑوں افراد میں دو فرد بالکل یکساں نہیں ہوتے۔ ایسے کھلے ہوئے امتیاز ہوتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو کسی تامل اور غور و فکر کے بغیر ہی امتیاز واضح ہو جاتا ہے۔ یہ صورت گرمی اللہ رب العزت کے سوا اس کی قدرت میں ہے، جو انسان کسی جاندار کا مجسمہ یا نقوش اور رنگ سے اس کی تصویر بناتا ہے وہ گویا عملی طور پر اس کا مدعی ہے کہ وہ بھی صورت گرمی کر سکتا ہے۔ اسی لئے صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ہے کہ قیامت کے روز تصویریں بنانے والوں کو کہا جائے گا کہ جب تم نے ہماری نعت اُتاری تو اس کو مکمل کر کے دکھلاؤ، اگر تمھارے بس میں ہو کہ ہم نے تو صرف صورت ہی نہیں بنائی اس میں روح بھی ڈالی ہے، اگر تمھیں اس تخلیق کا دعویٰ ہے تو اپنی بنائی ہوئی صورت میں روح بھی ڈال کر دکھلاؤ۔

ایک سبب تصویر کی ممانعت کا احادیث صحیحہ میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ کے فرشتوں کو تصویر اور کتے سے نفرت ہے جس گھر میں یہ چیزیں ہوتی ہیں، اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے، جس کے سبب اس گھر کی برکت اور نورانیت مٹ جاتی ہے، گھر میں بسنے والوں کو عبادت و طاعت کی توفیق گھٹ جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ مشہور مقولہ بھی غلط نہیں کہ ”خاناہ خالی را دیومی گیرد“ یعنی خالی گھر پر جن بھوت قبضہ کر لیتے ہیں جب کوئی گھر رحمت کے فرشتوں سے خالی ہوگا تو شیطاں اس کو گھیر لیں گے اور ان کے بسنے والوں کے دلوں میں گناہوں کے دوسرے اور پھر ارادے پیدا کرتے رہیں گے۔



ایک سبب بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ تصویریں دنیا کی زائد از ضرورت زینت ہیں اور اس زمانے میں جس طرح تصاویر سے بہت سے فوائد حاصل کئے جاتے ہیں ہزاروں جرائم اور فحاشی بھی انہی تصاویر سے جنم لیتے ہیں۔ غرض شریعت اسلام نے صرف ایک وجہ سے نہیں بہت سے اسباب پر نظر کر کے جاندار کی تصاویر بنانے اور اس کے استعمال کرنے کرنے کو حرام قرار دیدیا ہے۔ اب اگر کسی خاص فرد میں فرض کر لیں کہ وہ اسباب اتفاق سے موجود نہ ہوں تو اس اتفاقی واقعہ سے قانون شرعی نہیں بدل سکتا۔

صحیح بخاری و مسلم میں بروایت عبداللہ بن مسعودؓ یہ حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَمَةِ الْمُصَوِّرُونَ، یعنی سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے روز تصویر بنانے والے ہوں گے۔

اور بعض روایات حدیث میں تصویر بنانے والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے، اور صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ، الحدیث، یعنی ہر مصوِّر جہنم میں جائے گا۔

اس مسئلہ کے متعلق روایات حدیث اور تعامل سلف کے شواہد تفصیل کے ساتھ احقر نے اپنے رسالہ ”التصویر لاحکام التصویر“ میں جمع کر دیئے ہیں، اور لوگوں کے شبہات کے جوابات بھی اس میں مفصل ہیں، ضرورت ہو تو اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔

فوٹو کی تصویر بھی بعض لوگوں کا یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ فوٹو تصویر سے خارج ہے، کیونکہ وہ تصویر ہی ہے وہ تو ظل اور عکس ہے، جیسے آئینہ اور پانی وغیرہ میں آجاتا ہے تو جس طرح آئینہ میں اپنی صورت دیکھنا جائز ہے ایسے ہی فوٹو کی تصویر بھی جائز ہے۔ جواب واضح ہے کہ عکس اور ظل اُس وقت تک عکس ہے جب تک وہ کسی ذریعہ سے قائم اور پائدار نہ بنالیا جائے، جیسے آئینہ یا پانی میں اپنا عکس جس وقت پانی کے مقابلہ سے آپ ہٹ جائیں گے ختم ہو جائے گا، اگر آئینہ کے اوپر کسی مسالہ یا آلہ کے ذریعہ اس صورت کے عکس کو پائدار بنادیا جائے تو یہی تصویر ہو جائے گی، جس کی حرمت و ممانعت احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ فوٹو کی مفصل بحث بھی رسالہ مذکورہ تصویر میں لکھ دی گئی ہے۔

جَفَّان، جَفَنہ کی جمع ہے، جو پانی کے بڑے برتن جیسے تشلہ یا ٹب وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ گالَجَوَاب، جَابِیہ کی جمع ہے، چھوٹے حوض کو جَابِیہ کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ پانی بھرنے کے بڑے برتن ایسے بناتے تھے جس میں چھوٹے حوض کے برابر پانی آتا ہے۔ قُدْرُ قِدْرٌ بکسر القاف کی جمع ہے، ہنڈیا کو کہا جاتا ہے۔

رَاسِیَاتٍ، اپنی جگہ ٹھہری ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ اتنی وزنی اور بڑی دیگیں بناتے تھے جو ہلاکے نہ ہوں، اور ممکن ہو کہ یہ دیگیں پتھر سے تراش کر پتھر ہی کے چوڑھوں پر لگی ہوئی بناتے ہوں جو ناقابل حمل و نقل ہوں۔ امام تفسیر ضحاک نے قُدُورَ رَاسِیَاتٍ کی یہی تفسیر کی ہے۔  
 اَعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا وَ قَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرِ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے نوازا اور مخصوص انعامات عطا فرمائے، ان کا بیان فرمانے کے بعد ان کو مع ان کے اہل و عیال کے شکر گزاری کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے۔

شکر کی حقیقت | قربی نے فرمایا کہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا اعتراف کرے کہ یہ نعمت اور اس کے احکام | فلاں منعم نے دی ہے، اور پھر اس کو اس کی طاعت و مرضی کے مطابق استعمال کرے، اور کسی کی دی ہوئی نعمت کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرنا ناشکری اور کفرانِ نعمت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شکر جس طرح زبان سے ہوتا ہے اسی طرح عمل سے بھی شکر ہوتا ہے، اور عملی شکر اس نعمت کا منعم کی طاعت و مرضی کے مطابق استعمال ہے۔۔۔ اور ابو عبد الرحمن اسلمی نے فرمایا کہ نماز شکر ہے، روزہ شکر ہے اور ہر نیک کام شکر ہے، اور محمد بن کعب قرظی نے فرمایا کہ شکر تقویٰ اور عمل صالح کا نام ہے۔ (ابن کثیر)

آیت مذکورہ میں قرآن حکیم نے حکم شکر کے لئے مختصر لفظ اَشْكُرُوْا کے بجائے اَعْمَلُوا شُكْرًا استعمال فرمایا شاید اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ آلِ دَاوُد سے مطلوب شکر عملی ہے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام اور ان کے خاندان نے قول و عمل دونوں سے اس طرح کی کہ ان کے گھر میں کوئی وقت ایسا نہ گذرتا تھا جس میں گھر کا کوئی فرد اللہ کی عبادت میں نہ لگا ہوا ہو۔ افراد خاندان پر اوقات تقسیم کر دیتے گئے تھے۔ اس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کا مصلیٰ کسی وقت سنانہ پڑھنے والے سے خالی نہ رہتا تھا۔ (ابن کثیر)

بخاری و مسلم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نمازوں میں اللہ کے نزدیک محبوب تر نماز داؤد علیہ السلام کی ہے، وہ نصف رات سوتے تھے پھر ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے تھے، پھر آخری چھٹے حصہ میں سوتے تھے اور سب روزوں میں محبوب تر اللہ کے نزدیک صیام داؤد علیہ السلام ہیں کہ وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ (ابن کثیر)



حضرت فضیلؓ سے منقول ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ حکم شکر نازل ہوا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا اے میرے پروردگار میں آپ کا شکر کس طرح پورا کر سکتا ہوں جب کہ میرا شکر قوی ہو یا عملی وہ بھی آپ ہی کی عطا کردہ نعمت ہی، اس پر بھی مستقل شکر واجب ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلَا نَشْكُرُكَ نِيَّيَا دَاوُدُ، یعنی اے داؤد اب آپ نے شکر ادا کر دیا، کیونکہ حق شکر ادا کرنے سے اپنے عجز و قصور کو سمجھ لیا، اور اعتراف کر لیا۔

حکیم ترندی اور امام ابو بکر جصاص نے حضرت عطاء بن یسارؓ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اَعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور اس آیت کو تلاوت فرمایا پھر ارشاد فرمایا کہ تین کام ایسے ہیں کہ جو شخص ان کو پورا کر لے تو جو فضیلت آل داؤد کو عطا کی گئی تھی وہ اس کو بھی مل جائے گی۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ وہ تین کام کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ رضا اور غضب کی دونوں حالتوں میں انصاف پر قائم رہنا، اور غنا، اور فقر کی دونوں حالتوں میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا، اور خفیہ اور علانیہ دونوں حالتوں میں اللہ سے ڈرنا و شرمنا، احکام القرآن، جصاص،

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ، شکر کے حکم اور تاکید کے بعد اس واقعہ کا بھی اظہار فرما دیا کہ میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوں گے۔ اس میں بھی مومن کے لئے تنبیہ اور تحریض ہے شکر پر۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ الْآیۃ، آیت میں لفظ منساة عصاء اور لاٹھی کے معنی میں ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے، بمعنی عصاء، اور بعض نے فرمایا کہ عربی لفظ ہے۔ نساء کے معنی ہٹانے اور موخر کرنے کے ہیں، لاٹھی کے ذریعے انسان مضر چیزوں کو ہٹاتا ہے، اس لئے اس کو منساة کہا گیا، یعنی ہٹانے کا آلہ۔ اس آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا واقعہ عجیبہ بیان فرما کر بہت سی عبرتوں اور ہدایتوں کا دروازہ کھول دیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا عجیب واقعہ | اس واقعہ میں بہت سی ہدایات ہیں، مثلاً یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جن کو ایسی بے مثل حکومت و سلطنت حاصل

تھی کہ صرف ساری دنیا پر ہی نہیں بلکہ جنات اور طیور اور ہوا پر بھی ان کی حکومت تھی، مگر ان سب سامانوں کے باوجود موت سے ان کو بھی نجات نہ تھی۔ اور یہ کہ موت

تو مقررہ وقت پر آئی تھی، بیت المقدس کی تعمیر جو حضرت داؤد علیہ السلام نے شروع کی، پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی تکمیل فرمائی، اس میں کچھ کام تعمیر کا باقی تھا، اور یہ تعمیر کا کام جنات کے سپرد تھا جن کی طبیعت میں سرکشی غالب تھی، حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے کام کرتے تھے، ان کی وفات کا جنات کو علم ہو جائے تو فوراً کام چھوڑ بیٹھیں، اور تعمیر رہ جائے۔ اس کا انتظام حضرت سلیمان علیہ السلام نے باذن ربانی یہ کیا کہ جب موت کا وقت آیا تو موت کی تیاری کر کے اپنی محراب میں داخل ہو گئے، جو شفاف شیشے سے بنی ہوئی تھی، باہر سے اندر کی سب چیزیں نظر آتی تھیں، اور اپنے معمول کے مطابق عبادت کے لئے ایک سہارا لے کر کھڑے ہو گئے کہ روح پرواز کرنے کے بعد بھی جسم اس عصا کے سہارے اپنی جگہ جا رہے۔ سلیمان علیہ السلام کی روح وقت مقرر پر قبض کر لی گئی، مگر وہ اپنے عصا کے سہارے اپنی جگہ جمے ہوئے باہر سے ایسے نظر آتے تھے کہ عبادت میں مشغول ہیں، جنات کی یہ مجال نہ تھی کہ پاس آکر دیکھ سکتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو زندہ سمجھ کر کام میں مشغول رہے، یہاں تک کہ سال بھر گزر گیا، اور تعمیر بیت المقدس کا بقیہ کام پورا ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ نے گھن کے کپڑے کو جس کو فارسی میں رپوک اور اردو میں دسک کہا جاتا ہے، اور قرآن کریم نے اس کو دابة الارض کے نام سے موسوم کیا ہے، عصاے سلیمانی پر مسلط کر دیا۔ دسک نے عصا کی لکڑی کو اندر سے کھا کر کمزور کر دیا، عصا کا سہارا ختم ہوا تو سلیمان علیہ السلام گر گئے، اس وقت جنات کو ان کی موت کی خبر ہوئی۔

جنات کو اللہ تعالیٰ نے دو دراز کی مسافت چند لمحات میں قطع کر لینے کی قوت عطا فرمائی ہے وہ بہت سے ایسے حالات و واقعات سے واقف ہوتے تھے، جن کو انسان نہیں جانتے، جب وہ انسانوں کو ان واقعات کی خبر دیتے تو انسان یہ سمجھتے تھے کہ یہ غیب کی خبر ہے اور جنات کو بھی علم غیب حاصل ہے، خود جنات کو بھی علم غیب کا دعویٰ ہو تو بعید نہیں، موت کے اس عجیب واقعہ نے اس کی بھی حقیقت کھول دی۔ خود جنات کو بھی پتہ چل گیا اور سب انسانوں کو بھی کہ جنات عالم الغیب نہیں ہیں، کیونکہ ان کو غیب کا علم ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت سے ایک سال پہلے ہی باخبر ہو جاتے۔ اور یہ سال بھر کی محنت و مشقت جو ان کو زندہ سمجھ کر برداشت کرتے رہے اس سے رخ جاتے۔ آیت کے آخری جملے میں اسی کا بیان ہے فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ اَنْ لَّوْكَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِئُوا فِي الْعَدَاۗءِ الْمُحِبِّينَ، اس میں عذاب مہین سے مراد وہ محنت و مشقت کا کام ہے جس پر تعمیر بیت المقدس کی تکمیل کے لئے ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے لگا دیا تھا۔ سلیمان علیہ السلام کی



موت کا یہ عجیب واقعہ کچھ تو خود قرآن کی اس آیت میں مذکور ہی، باقی تفصیل حضرت ابن عباس وغیرہ ائمہ تفسیر سے منقول ہے جو ابن کثیر وغیرہ سب تفاسیر میں نقل کی گئی ہے۔

اس عجیب واقعہ سے یہ عبرت بھی حاصل ہوئی کہ موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کو جو کام لینا ہوتا ہے اس کا جس طرح چاہیں انتظام کر سکتے ہیں، جیسا اس واقعہ میں ہوا کہ موت کے باوجود سلیمان علیہ السلام کو سال بھر تک اپنی جگہ قائم رکھ کر جنات کے کام پورا کرالیا۔ اور یہ بھی کہ دنیا کے سارے اسباب و آلات اسی وقت تک اپنا کام کرتے ہیں جب تک منظور حق ہوتا ہے، جب منظور نہیں ہوتا تو آلات و اسباب جواب دیدیتے ہیں، جیسے یہاں عصا کا سہارا دیمک کے ذریعہ ختم کر دیا گیا۔ اور یہ بھی کہ سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد خطرہ تھا کہ لوگ جنات کے حیرت انگیز عمل اور کارناموں اور بظاہر غیب کی چیزوں سے ان کے باخبر ہونے وغیرہ کے اعمال عجیبہ کو دیکھ کر کہیں انہی کو اپنا معبود نہ بنا بیٹھیں، اس خطرہ کو بھی اس واقعہ موت نے ختم کر دیا، سب کو جنات کی بے خبری اور بے بسی معلوم ہو گئی۔

تقریر مذکور سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سلیمان علیہ السلام نے موت کے وقت اس خاص طریقہ کو دو وجہ سے اختیار کیا تھا، اول یہ کہ تعمیر بیت المقدس کا باقی ماندہ کام پورا ہو جائے، دوسرے یہ کہ ان لوگوں پر جنات کی بے خبری اور بے بسی واضح ہو جائے تاکہ ان کی عبادت کا خطرہ نہ رہے۔ (قرطبی)

امام نسائیؒ نے باسناد صحیح حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ سے چند دعائیں کیں، جو مقبول ہوئیں۔ ان میں سے ایک دعا یہ کہ جو شخص اس مسجد میں صرف نماز کی نیت سے داخل ہو (اور کوئی دنیاوی غرض نہ ہو) اس مسجد سے نکلنے سے پہلے اس کو تمام گناہوں سے ایسا پاک کر دے جیسا کہ اس وقت پاک تھا جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔

اور سدی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہونے پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے بطور شکرانہ کے بارہ ہزار گائے بیل اور بیس ہزار بکریوں کی قربانی کر کے لوگوں کو دعوت عام دی، اور اس دن کی خوشی منائی، اور حجرۃ بیت المقدس پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں مانگیں کہ "یا اللہ آپ نے ہی مجھے یہ قوت اور وسائل عطا فرمائے، جن سے تعمیر بیت المقدس مکمل ہوئی تو یا اللہ مجھے اسکی

بھی توفیق دیجئے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں اور مجھے اپنے دین پر وفات دیجئے اور ہدایت کے بعد میرے قلب میں کوئی زہیغ اور کجی نہ ڈالے۔ اور عرض کیا کہ اے میرے پروردگار جو شخص اس مسجد میں داخل ہو میں اس کے لئے آپ سے پانچ چیزیں مانگتا ہوں۔ ایک یہ کہ جو گناہگار توبہ کرنے کے لئے اس مسجد میں داخل ہو تو آپ اس کی توبہ قبول فرمائیں اور اس کے گناہوں کو معاف فرمادیں۔ دوسرے یہ کہ جو آدمی کسی خوف و خطرہ سے بچنے کے لئے اس مسجد میں داخل ہو تو آپ اس کو امن دیدیں، اور خطرات سے نجات عطا فرمادیں۔ تیسرے یہ کہ جو بیمار آدمی اس میں داخل ہو اس کو شفا عطا فرمادیں۔ چوتھے یہ کہ جو فقیر آدمی اس میں داخل ہو اس کو غنی کر دیں۔ پانچویں یہ کہ جو شخص اس میں داخل ہو جب تک وہ اس میں رہے آپ اپنی نظر عنایت و رحمت اس پر رکھیں بجز اس شخص کے جو کسی ظلم یا بے دینی کے کام میں مشغول ہو۔ (قرطبی)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر کا کام حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیات میں مکمل ہو چکا تھا، مگر جو واقعہ اوپر مذکور ہوا ہے وہ کچھ اس کے منافی نہیں کہ اصل تعمیر مکمل ہونے کے بعد بڑی تعمیرات میں کچھ کام رہا کرتے ہیں وہ باقی ہوں ان کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے مذکورہ تدبیر اختیار کی ہو۔

حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ موت کے بعد عصائے سہارے حضرت سلیمان علیہ السلام ایک سال کھڑے رہے۔ (قرطبی) اور بعض روایات میں ہے کہ جب جنات کو یہ معلوم ہوا کہ سلیمان علیہ السلام کی موت کو عرصہ ہو گیا، ہم بے خبر رہے تو مدت موت معلوم کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک لکڑی پر دیمک چھوڑ دی، ایک دن رات میں جتنی لکڑی دیمک نے کھائی اس سے حساب لگا لیا کہ عصائے سلیمانی پر ایک سال اس طرح گزرا۔

فائدہ: بغوی نے علماء تاریخ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر کل تریپن سال کی ہوئی، اور ان کی سلطنت و حکومت چالیس سال رہی، تیسرے سال کی عمر میں سلطنت کا کام سنبھال لیا تھا، اور بیت المقدس کی تعمیر اپنی سلطنت کے چوتھے سال میں شروع کی تھی۔ (منہری، قرطبی)

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكِهُمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتِ ثَمَرَاتُ ثَمَرَاتٍ ۖ وَشِمَالُهُ

تحقیق قوم سبا کو تھی ان کی بستی میں نشانی، دوبارہ دانے اور بائیں،



كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلَدًا طَيِّبَةً رَبُّكُمْ غَفُورٌ ۝۱۵

کھاؤ روزی اپنے رب کی اور اس کا شکر کرو، شہر ہی پاکیزہ اور رب، گناہ بخشت والا۔

فَاعْرَضُوا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ

سو دھیان میں نہلائے پھر چھوڑ دیا ہم نے اپنی ایک نالا زور کا اور دیگر ہم نے انکو بدلے ان دو

جَنَّتَيْنِ ذَوَاتِیْ اَكْلِ تَخْمِطٍ وَّاَثَلٍ وَشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ ۝۱۶ ذٰلِكَ

باغوں کے دو اور باغ جن میں کچھ میوہ کیلا تھا اور جھاڑ اور کچھ بیر تھوڑے سے - یہ بدلہ

جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا وَهَلْ نُجْزِيْ اِلَّا الْكَافِرَ ۝۱۷ وَجَعَلْنَا

دیا ہم نے اُن کو اس پر کہ ناشکری کی، اور ہم یہ بدلہ اسی کو دیتے ہیں جو ناشکر ہو۔ اور رکھی تھیں ہم نے

بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدْ رَنَا

ان میں اور ان بستیوں میں جہاں ہم نے برکت رکھی ہے ایسی بستیاں جو راہ پر نظر آتی تھیں اور منزلیں مقرر

فِيْهَا السَّيْرُ سَيَرُوا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اَمِنِينَ ۝۱۸ فَقَالُوْا رَبَّنَا

کردیں ہم نے انہیں آنے جانے کی پھر وہ ان میں راتوں کو اور دنوں کو امن سے - پھر کہنے لگے اور ب

بَعْدَ بَلَيْنَآ اَسْفَارَنَا وَظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيْثَ

دراز کردے ہمارے سفروں کو اور آپ اپنا بُرا کیا پھر کروا لا ہم نے ان کو کہانیاں،

وَمَزَقْنَاهُمْ كُلٌّ مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ اِنْ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۱۹

اور کر ڈالا پھر کر ٹکڑے ٹکڑے اس میں پتے کی باتیں ہیں ہر صبر کرنے والے شکر گزار کو۔

## خلاصہ تفسیر

سبأ کے لوگوں، کے لئے (خود) اُن کے وطن (کی مجموعی حالت) میں (جو ب اطماعت خداوندی کی) نشانیاں موجود تھیں (ان میں سے ایک نشانی) دو قطاریں تھیں باغ کی (ان کی سڑک کے) داہنے اور بائیں (یعنی ان کے تمام علاقہ میں دو طرفہ متصل باغات چلے گئے تھے کہ جس میں آمدنی بھی وافر پھل بھی اس قدر کہ ختم کئے ختم نہ ہوں، سایہ بھی ردق بھی ہم نے انبیاء علیہم السلام وناصحین کی معرفت ان کو حکم دیا کہ) اپنے رب کا (دیا ہوا)

رزق کھاؤ اور (کھا کر) اس کا شکریہ کر دو یعنی اطاعت کرو کہ دو قسم کی نعمتیں مقتضی اطاعت ہیں، ایک زمینی کہ رہنے کو عمدہ شہر اور ایک اخروی کہ در صورت ایمان و اطاعت کے اگر کچھ کوتاہی ہو جائے تو گناہ بخشنے کو، بخشنے والا پروردگار ہی (پس ایسے مقتضی پر مقتضی کا ترتیب ضرور ہونا چاہی) سو (اس پر بھی) انھوں نے (اس حکم سے) سربتالی کی (شاید یہ لوگ آفتاب پرست بھی ہوں جیسے بعض کی نسبت سورہ نمل میں ہے وَجَدْتَهُمَا وَتَوَّهَّيَا لِنَجْدِ الْوَنِّ لِلشَّمْسِ) تو ہم نے (اُن پر اپنا قہر اس طرح نازل کیا کہ اُن پر بند کا سیلاب چھوڑ دیا) یعنی جو سیلاب بند سے رُکار ہوتا تھا بند ٹوٹ کر اس سیلاب کا پانی چڑھ آیا جس سے اُن کے وہ دورویہ باغات سب غارت ہو گئے) اور ہم نے ان کے ان دورویہ باغوں کے بدلے اور دو باغ دیدیئے جن میں یہ چیزیں رہ گئیں، بدمزہ پھل اور جھاؤ اور قدرے قلیل ہیری (اور وہ بھی شہری نہیں جنگلی خود رو جس میں کانٹے بہت اور پھل میں لطافت ندارد) ان کو یہ سزا ہم نے اُن کی ناسپاسی کے سبب دی اور ہم ایسی سزا بڑے ناسپاس ہی کو دیا کرتے ہیں (ورنہ معمولی خطاؤں پر تو ہم دگڑ ہی کرتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کفر سے بڑھ کر کیا ناسپاسی ہوگی جس میں وہ مبتلا تھے)۔ اور (اس نعمت مذکورہ عامہ للمساکن کے علاوہ ایک اور نعمت خاص متعلق سفر کے تھی وہ یہ کہ) ہم نے ان کے اور اُن بستیوں کے درمیان میں جہاں ہم نے (باعث سبار پیداوار وغیرہ کے) برکت کر رکھی ہے بہت سے گاؤں آباد کر رکھے تھے جو (سڑک پر سے) نظر آتے تھے (کہ مسافر کو سفر میں بھی وحشت نہ ہو اور کہیں ٹھہرنا چاہے تو وہاں جانے میں تکلف و تردد بھی نہ ہو) اور ہم نے ان دیہات کے درمیان ان کے چلنے کا ایک خاص اندازہ رکھا تھا یعنی ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک چال کے حساب سے ایسا سب فاصلہ رکھا تھا کہ دوران سفر میں عادت کے مطابق آرام کرے، وقت پر کوئی نہ کوئی گاؤں مل جاتا جہاں کھاپی سکے آرام کر سکے کہ بے خوف و خطر اُن میں (چاہو) راتوں کو اور (چاہو) دنوں کو چلو (یعنی نہ خطرہ رہزن کا کہ پاس پاس گاؤں تھے نہ خطرہ آب و دانہ و زاد راہ کے میسر نہ ہونے کا کہ ہر جگہ ہر سامان ملتا تھا) سو ان نعمتوں کی انھوں نے جیسے اصلی شکر گزاری یعنی طاعتِ الہیہ نہیں کی، ایسے ہی ظاہری شکر گزاری یعنی نعمتِ الہیہ کو غنیمت سمجھنا اور اس کی قدر کرنا ہے وہ بھی نہیں کی چنانچہ وہ کہنے لگے اے ہمارے پروردگار (ایسے پاس پاس دیہات ہونے سے سفر کا لطف نہیں آتا، لطف تو اسی میں ہے کہ کہیں زاد راہ ختم ہو گیا کہیں پیاس ہے اور پانی نہیں ملتا، اشتیاق ہے انتظار ہے کہیں چوروں کا اندیشہ ہو، نوکر پہرہ دے رہے ہیں، ہتھیار بندھے ہوئے ہیں، جیسے



بنی اسرائیل مَنّ و سلوٰی سے اُکتا گئے تھے اور بقل و قشاہ (ترکاری اور گلڑی کھیرے) کی درخواست کی تھی و نیز اس حالت موجودہ میں ہم کو اپنی امارت کے اظہار کا موقع بھی نہیں ملتا، امیر غریب سب یکساں سفر کرتے ہیں، اسی لئے یوں جی چاہتا ہے کہ ہمارے سفروں میں درازی (اور فاصلہ) کر دے (یعنی بیچ کے دیہات اجاڑ دے کہ منزلوں میں خوب فاصلہ ہو جائے) اور (علاوہ اس ناشکری کے) انھوں نے (اور بھی نافرمانیاں کر کے) اپنی جانوں پر ظلم کیا سو ہم نے انکو افسانہ بنا دیا اور ان کو بالکل تتر بتر کر دیا (یا تو اس طرح کہ بعض کو ہلاک کر دیا کہ ان کے قصے ہی رہ گئے اور بعض کو پریشان کر دیا اور یا بحیثیت اس حالت تنعم کے سب ہی افسانہ ہو گئے، یعنی وہ سامان تنعم سب کا جاتا رہا اور یا باین معنی کہ ان کی حالت کو عبرت بنا دیا ای جعلناہم ذات حکایات یعتبر بہا، غرض خود ان کے مساکن و باغات بھی اور انکی وہ متصل بستیاں بھی سب ویران ہو گئے) بے شک اس (قصہ) میں ہر صابر شاکر (یعنی مؤمن) کے لئے بڑی بڑی عبرتیں ہیں۔

## معارف و مسائل

منکرین نبوت و رسالت اور منکرین قیامت کو حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر متنبہ کرنے اور انبیاء سابقین کے ہاتھوں فوق القیاس حیرت انگیز واقعات و معجزات کے صدور کے سلسلے میں پہلے حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعات کا ذکر فرمایا، اب اسی سلسلہ میں قوم سبا پر اللہ کے بے حساب انعامات کا پھران کی ناشکری کی وجہ سے ان پر عذاب آنے کا ذکر آیات مذکورہ میں کیا گیا۔

قوم سبا اور ان پر اللہ تعالیٰ ابن کثیر نے فرمایا کہ سبا یمن کے بادشاہوں اور اس ملک کے خاص انعامات باشندوں کا لقب ہے۔ تبابعہ جو اس ملک کے مقتدر و پیشوا تھے وہ بھی اسی قوم سبا میں سے تھے، اور ملکہ بلقیس جن کا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ سورۃ نمل میں گزر چکا ہے وہ بھی اسی قوم میں سے تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے رزق کے دروازے کھول دیئے تھے، اور ان کے شہر میں آرام و عیش کے تمام اسباب جہیا کر دیئے تھے، اور اپنے انبیاء کے ذریعے ان کو اللہ کی توحید اور اس کے احکام کی اُطاعت کے ذریعہ نعمتوں کے شکر کا حکم دیا گیا تھا۔ ایک مدت تک یہ لوگ اس حال پر قائم اور ہر طرح کی راحت و عیش سے مالا مال رہے، پھر ان میں عیش و عشرت میں اہنماک خدا تعالیٰ سے غفلت بلکہ انکار تک نہایت پہنچ گئی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تنبیہ کے لئے اپنے تیرہ انبیاء بھیجے

جنہوں نے ان کی ہمائش اور راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کی، مگر یہ لوگ اپنی غفلت بے ہوشی سے باز نہ آئے تو ان پر ایک سیلاب کا عذاب بھیجا گیا جس نے ان کے شہر اور باغات سب کو دیران و برباد کر دیا (رواہ محمد بن اسحق، ابن کثیر)

امام احمد حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سبأ جس کا قرآن میں ذکر ہے یہ کسی مرد یا عورت کا نام ہے یا زمین کے کسی حصہ کا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ایک مرد کا نام ہے، جس کی اولاد میں دس لڑکے ہوئے، جن میں سے چھ یمن میں آباد رہے، اور چار شام میں چلے گئے یمن میں رہنے والوں کے نام یہ ہیں:۔ مدحج، بکندہ، ازد، اشعری، اشکار، خمیر، (ان چھ لڑکوں سے چھ قبیلے پیدا ہوئے، جو انہی مذکورہ ناموں سے معروف ہیں)۔

اور شام میں بسنے والوں کے نام یہ ہیں: نخم، جذام، عاملہ، غسان، (ان کی نسل کے قبائل انہی ناموں سے مشہور ہوئے)۔ یہ روایت حافظ امام ابن عبد البر نے بھی اپنی کتاب رالقصد والامم بمعرفة انساب العرب والعجم میں نقل کی ہے۔

ابن کثیر کی تحقیق بحوالہ علماء نسب یہ ہے کہ یہ دس لڑکے سبا کے صلبی اور بلا واسطہ بیٹے نہیں تھے، بلکہ سبا کی دوسری تیسری یا چوتھی نسل میں یہ لوگ ہوئے ہیں پھر ان کے قبیلے شام و یمن میں پھیلے، اور انہی کے ناموں سے موسوم ہوئے۔ اور سبا کا اصل نام عبد شمس تھا، سبا عبد شمس بن شجب بن یعرب بن قحطان سے ان کا نسب نامہ واضح ہو جاتا ہے۔ اور اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ سبا عبد شمس نے اپنے زمانے میں نبی آخر الزماں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سنائی تھی ممکن ہے کہ ان کو اس کا علم کتب قدیمہ تور و انجیل سے ہوا ہو، یا بخومیوں کا ہمنوں کے ذریعہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اس نے چند عربی اشعار بھی کہے ہیں جن میں آپ کی بعثت کا ذکر کر کے یہ تمنا کی ہے کہ کاش میں ان کے زمانے میں ہوتا تو میں ان کی مدد کرتا، اور اپنی قوم کو ان پر ایمان لانے اور مدد کرنے کی تلقین کی ہے۔

اور حدیث مذکور میں جو یہ مذکور ہے کہ سبا کے دس لڑکوں میں سے چھ یمن میں آباد ہوئے، چار شام کی طرف چلے گئے، یہ واقعہ ان پر سیلاب کا عذاب آنے کے بعد کا ہے، کہ سیلاب آنے کے وقت یہ لوگ مختلف سمتوں اور شہروں میں منتشر ہو گئے (ابن کثیر) قرطبی نے بحوالہ قتیری قوم سبا کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمانہ فرت نقل کیا ہے۔



**سبیل عزم** اور **سدّ مآرب** **فَاَسْلَمْنَا عَلَیْهِمْ سَبِيلَ الْعِزِّ**، لفظ عزم کے عربی لغت کے اعتبار سے کئی معنی معروف ہیں، اور علماء تفسیر نے ہر معنی کے اعتبار سے اس آیت کی تفسیر فرمائی ہے، مگر ان میں سیاق و سرائے کے مناسب وہ معنی ہیں جو قاموس اور صحاح جوہری وغیرہ کتب لغت میں ہیں کہ عزم کے معنی سدّ یعنی بند کے ہیں جو پانی روکنے کے لئے بنایا جاتا ہے جو آجکل ڈیم کے نام سے معروف ہے، حضرت ابن عباسؓ نے بھی عزم کے معنی سدّ یعنی بند کے بیان فرمائے ہیں (قرطبی)

واقعہ اس بند (ڈیم) کا حسب بیان ابن کثیرؒ یہ ہے کہ ملک یمن میں اس کے دار الحکومت صنعاء سے تین منزل کے فاصلہ پر ایک شہر مآرب تھا، جس میں قوم سبأ آباد تھی۔ دو پہاڑوں کے درمیان وادی میں شہر آباد تھا، دونوں پہاڑوں کے درمیان سے اور پہاڑوں کے اوپر سے بارش کا سیلاب آتا تھا، یہ شہر ہمیشہ ان سیلابوں کی زد میں رہتا تھا۔ ایک شہر کے بادشاہوں نے (جن میں ملکہ بلقیس کا نام خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے) ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک بند (ڈیم) نہایت مستحکم مضبوط تعمیر کیا، جس میں پانی اتر نہ کر سکے۔ اس بند نے پہاڑوں کے درمیان سے آنے والے سیلابوں کو روک کر پانی کا ایک عظیم الشان ذخیرہ بنادیا، پہاڑوں کی بارش کا پانی بھی اس میں جمع ہونے لگا، اس بند کے اندر اوپر نیچے پانی نکالنے کے لئے تین دروازے رکھے گئے تاکہ پانی کا یہ ذخیرہ انتظام کے ساتھ شہر کے لوگوں کے اور ان کی زمین باغ کی آب پاشی کے... کام آدے۔ پہلے اوپر کا دروازہ کھول کر اس سے پانی لیا جاتا تھا، جب اوپر کا پانی ختم ہو جاتا تو اس سے نیچے کا اور اس کے بعد سب سے نیچے کا تیسرا دروازہ کھولا جاتا تھا، یہاں تک کہ دوسرے سال کی بارشوں کا زمانہ آکر پھر پانی اوپر تک بھر جاتا۔ بند کے نیچے ایک بہت بڑا تالاب تعمیر کیا گیا تھا، جس میں پانی کے بارے راستے بنا کر بارہ نہریں شہر کے مختلف اطراف میں پہونچائی گئی تھیں، اور سب نہروں میں پانی یکساں انداز میں چلتا اور شہر کی ضرورتوں میں کام آتا تھا (منظری)

شہر کے واسطے باتیں جو دو پہاڑ تھے ان کے کناروں پر باغات لگائے گئے تھے جن میں پانی کی نہریں جاری تھیں، یہ باغات ایک دوسرے کے متصل مسلسل دور و در پہاڑوں کے کناروں پر تھے، یہ باغات اگرچہ تعداد میں بہت تھے، مگر قرآن کریم نے ان کو جنتان یعنی دو باغ کے لفظ سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ ایک رخ کے تمام باغوں کو بوجہ اتصال کے ایک باغ اور دوسرے رخ کے تمام باغوں کو دوسرا باغ قرار دیا ہے۔ ان باغوں میں ہر طرح کے درخت اور ہر قسم کے پھل اس کثرت سے پیدا ہوتے تھے

کہ ائمہ سلف قتادہ وغیرہ کے بیان کے مطابق ان باغوں میں ایک عورت اپنے سر پر خالی ٹوکری لے کر چلتی تو درختوں سے ٹوٹ کر گرنے والے پھلوں سے خود بخود بھر جاتی تھی، اس کو ہاتھ بھی لگانا نہ پڑتا تھا (ابن کثیر)

كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ بَلَدًا طَيِّبَةً وَرَبُّ غَفُورٌ رَحِيمٌ  
انبیاء کے ذریعہ ان کو یہ حکم دیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس رزق وسیع کو استعمال کرو اور اس کی شکر گزاری اعمال صالحہ اور اطاعت احکام الہیہ کے ساتھ کرتے رہو، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس شہر کو بلدہ طیبہ بنایا ہے، جس میں سردی گرمی کا بھی اعتدال تھا اور آب ہوا ایسی صحت بخش لطیف و لطیف تھی کہ ان کے پورے شہر میں چھڑ، مکھی، پسوا در سانپ بچھو جیسے موذی جانوروں کا نام و نشان نہ تھا، بلکہ باہر سے آنے والے مسافر جب اس شہر میں پہنچتے تو اگر ان کے کپڑوں میں جھڑکیں یا دوسرے موذی حشرات ہوتے تھے وہ یہاں پہنچ کر خود بخود مر جاتے تھے۔ (ابن کثیر)

بَلَدًا طَيِّبَةً کے ساتھ رَبُّ غَفُورٌ، فرما کر اپنی نعمت کو اس طرح مکمل کر دیا کہ یہ عیش و راحت صرف دنیا کی زندگی تک نہیں، بلکہ اگر تم شکر گزاری پر قائم رہے تو آخرت میں اس سے بڑی اور دائمی نعمتوں کا بھی وعدہ ہے، کیونکہ ان تمام نعمتوں کا خالق و مالک اور تمہیں پالنے والا غفور ہے، کہ اگر کبھی اتفاقی طور پر شکر گزاری میں کمی یا غفلت کوتاہی بھی ہو گئی تو اس کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا۔

فَاَعْرِضُوا آفَاسًا سَلْنَا عَلَيْهِمُ سَيْلَ الْعِرمِ، یعنی اللہ تعالیٰ کی ایسی وسیع نعمتوں اور انبیاء علیہم السلام کی تنبیہات کے باوجود جب قوم سبا کے لوگوں نے اللہ کے احکام سے سرکشی اور روگردانی کی تو ہم نے اُن پر سَیْلِ عِرم چھوڑ دیا۔ عِرم کے معنی اوپر گزر چکے ہیں کہ بند کئے ہیں اس سیلاب کو عِرم کی طرف اس لئے منسوب کیا کہ جو عِرم ان کی حفاظت اور خوش حالی کا ذریعہ تھا اسی کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آفت و مصیبت بنا دیا۔ واقعہ اس کا حضرت ابن عباسؓ و ہب بن منبہ، قتادہ، ضحاک وغیرہ ائمہ تفسیر نے یہ بیان کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو سزا دینے کے لئے سد مأرب یعنی عِرم کو توڑ کر سیلاب سے تباہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس پانی کے عظیم الشان بند پر اندھے چوہے مسلط کر دیئے جنہوں نے اس کی بنیاد کو کھوکھلا اور کمزور کر دیا۔ جب بارش اور سیلاب کا وقت آیا تو پانی کے دباؤ نے اس کمزور بنیاد کو توڑ کر رخنے پیدا کر دیئے، اور بالآخر اس بند کے پیچھے جمع شدہ پانی اس پوری وادی میں پھیل گیا جس میں یہ شہر مأرب واقع تھا۔ تمام مکانات منہدم اور درخت تباہ ہو گئے، اور دو طرفہ پہاڑوں پر



جو باغات تھے ان کا پانی خشک ہو گیا۔

وہب بن منبہ کی روایت میں ہے کہ ان لوگوں کی کتابوں میں یہ بات لکھی چلی آتی تھی کہ اس بند کی خرابی و تباہی چوہوں کے ذریعہ ہوگی، جب لوگوں نے اس بند کے قریب چوہوں کو دیکھا تو خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس کی تدبیر یہ کی گئی کہ بند کے نیچے بہت سی بلیاں پالی گئیں جو چوہوں کو بند کے قریب نہ آنے دیں مگر جب تقدیر الہی نافذ ہوئی تو یہ چوہے بلیوں پر غالب آ گئے اور بند کی بنیاد میں داخل ہو گئے۔ (ابن کثیر)

اور تاریخی روایات میں یہ بھی ہے کہ کچھ ہوشیار دور اندیش لوگوں نے چوہوں کو دیکھ کر ہی یہ جگہ چھوڑ کر کسی دوسری طرف منتقل ہو جانے کا قصد کر لیا اور تدریجاً انتظام کر کے بکھل گئے، باقی لوگ وہاں رہے، مگر جب سیلاب شروع ہوا، اس وقت منتقل ہو گئے، اور بہت دیر سیلاب کی نذر ہو گئے۔ غرض یہ پورا شہر تباہ و برباد ہو گیا، شہر کے کچھ باشندے جو دوسرے ملکوں میں شہروں کی طرف چلے گئے، ان کی کچھ تفصیل مسند احمد کی حدیث میں جو اوپر گذر چکی ہے مذکور ہے۔ چھ قبیلے ان کے یمن میں پھیلے اور چار شام میں، مدینہ طیبہ کی آبادی بھی انہی قبائل میں سے بعض سے شروع ہوئی، جس کی تفصیل کتب تاریخ میں مذکور ہے۔ سیلاب آنے اور شہر تباہ ہونے کے بعد دور وہ باغات کا جو حال ہوا وہ آگے اس طرح ذکر فرمایا کہ:-

وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتِ اَکْثِ خَمْطٍ وَ اَمْلٍ وَ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے قیمتی پھلوں اور میوؤں کے درختوں کے بدلے اس میں ایسے درخت اُگادیے، جن کے پھل بدمزہ خراب تھے۔ لفظ خَمْط کے معنی اکثر حضرات مفسرین درخت اَرَاک کے کئے ہیں، اور جوہری لغوی نے لکھا ہے کہ درخت اَرَاک کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس پر کچھ پھل ہوتا ہے اور کھایا جاتا ہے، مگر اس درخت کے پھل بھی بدمزہ تھے۔ اور ابو عبیدہ نے فرمایا کہ خَمْط ہر ایسے درخت کو کہا جاتا ہے جو خاردار بھی ہو کڑوا بھی۔ اور لفظ اَمْل جہور مفسرین کے نزدیک ایک قسم طرفار کی ہے، جس کو اردو میں جھاؤ کہا جاتا ہے۔ اس پر کوئی پھل کھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ اَمْل بمعنی سمر یعنی بول اور کیکر کا درخت جو خاردار ہوتا ہے جس کا پھل بکریوں کو کھلایا جاتا ہے۔

سِدْر کے معنی بری کے ہیں۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے، ایک وہ جو باغات میں اہتمام سے لگائی جاتی ہے، اس کا پھل شیریں خوش ذائقہ ہوتا ہے، اس کے درخت میں کانٹے کم اور پھل زیادہ ہوتا ہے۔ دوسری قسم جنگلی بری کی ہے جو جنگلوں میں خود رو اور خاردار جھاڑیاں ہوتی ہیں ان میں کانٹے زیادہ اور پھل کم ہوتا ہے، اور پھل بھی ترش ہوتا ہے۔ آیت مذکورہ میں

سِدْر کے ساتھ قِلْبِل کے لفظ سے غالباً اشارہ اس طرف ہے کہ ہیری بھی جنگلی خود رو تھی جس پر پھل کم اور ترش ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

ذَٰلِكَ جَزَاؤُنَا لَهُمْ بِمَا كَفَرُوا، یعنی یہ سزا ہم نے ان کو اس لئے دی کہ انھوں نے کفر کیا۔ کفر کے معنی ناشکری کے بھی آتے ہیں، اور دین حق سے انکار کے بھی آتے ہیں۔ یہاں دونوں معنی ہو سکتے ہیں، کیونکہ انھوں نے ناشکری بھی کی اور جو تیرہ انبیاء اُن کی طرف بھیجے گئے تھے ان کی تکذیب بھی کی۔

فَاَمَّا ذَٰلِكَ: اس واقعہ میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ سبا کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے تیرہ پیغمبر بھیجے تھے، اور اس کے ساتھ یہ بھی اوپر گزر گیا ہے کہ اس قوم اور سبیل عرم کا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے درمیانی زمانے میں تھا جس کو زمانہ فترت کا کہا جاتا ہے، اور جمہور علماء کے نزدیک اس زمانے میں کوئی نبی پیغمبر مبعوث ہی نہیں ہوا، اسی لئے اس کو فترت کے زمانے سے تعبیر کرتے ہیں، تو یہ تیرہ انبیاء کی بعثت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ روح المعانی میں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ واقعہ سبیل عرم کا فترت کے زمانے میں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ انبیاء بھی اسی زمانے میں آئے ہوں ہو سکتا ہے کہ انبیاء کی بعثت اس قوم کی طرف زمانہ فترت سے پہلے ہو اور ان کی سرکشی اور کفر زمانہ فترت میں بڑھی ہو جس پر سبیل عرم کا عذاب زمانہ فترت میں اُن پر بھیجا گیا ہو واللہ اعلم وَهَلْ نُجْزِي إِلَّا الْكَافِرِينَ، کافر کا صیغہ مبالغہ ہے، جس کے معنی ہیں بہت کفر کرنے والا اور آیت کے معنی یہ ہوئے کہ ہم بہت کفر کرنے والے کے سوا کسی کو سزا نہیں دیتے۔ یہ بظاہر اُن تمام آیات قرآن اور احادیث صحیحہ کے خلاف ہے جن سے ثابت ہو کہ مسلمان گناہگاروں کو بھی جہنم کی سزا اُن کے عمل کے مطابق دی جائے گی، اگرچہ آخر کار سزا بھگتنے کے بعد وہ ایمان کی وجہ سے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ اس اشکال کے جواب میں بعض حضرات نے فرمایا کہ مراد یہاں مطلق عذاب نہیں، بلکہ ایسا عذاب عام جیسا کہ قوم سبا پر بھیجا گیا یہ کافروں کے ساتھ مخصوص ہے، مسلمان گناہگاروں پر ایسا عذاب نہیں آتا (روح)

اس کی تائید ایک تابعی ابن خیرہ کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے فرمایا جَزَاءُ الْمُعَصِيَةِ الْوَهْنُ فِي الْعِبَادَةِ وَالضُّيُقُ فِي الْمَعِيشَةِ وَالنَّعْسُ فِي اللَّذَّةِ قَالَ لَا يُصَادَفُ لَذَّةٌ حَلَالًا إِلَّا لَأَجَاءَهُ مَنْ يَنْغَصُّهَا، یعنی معصیت کی سزا یہ ہے کہ عبادت میں سستی پیدا ہو جائے، معیشت میں تنگی پیدا ہو جائے، اور لذت میں تعسر یعنی



دشواری پیدا ہو جائے۔ جس کا مطلب ابن خیرہ نے یہ بیان فرمایا کہ جب اس کو کوئی حلال لذت نصیب — ہوتی ہے تو کوئی نہ کوئی ایسا سبب پیدا ہو جاتا ہے جو اس لذت کو مکدر کر دیتا ہے۔ (ابن کثیر) معلوم ہوا کہ مؤمن گناہگار کی سزائیں دنیا میں اس قسم کی ہوتی ہیں، اس پر آسمان سے یا زمین سے کوئی کھلا عذاب نہیں آتا، یہ کفار ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: - صَدَقَ اللَّهُ الْعَظِيمُ لَا يُعَاقَبُ بِمِثْلِ فِعْلِهِ إِلَّا الْكَافِرُ، یعنی اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا کہ بُرے عمل کی سزا اس کے برابر بجز کفو کے کسی کو نہیں دی جاتی۔ (ابن کثیر) کیونکہ غیر کفو یعنی مؤمن کو اس کے گناہوں میں بھی کچھ چھوٹ دی جاتی ہے۔

اور روح المعانی میں بحوالہ کشف اس آیت کے مفہوم کی توجیہ یہ کی ہے کہ کلام اپنی حقیقت پر یہ کہ سزا بطور سزا کے تو صرف کافر کو دی جاتی ہے اور مؤمن گناہگار کو جو تکلیف آگ وغیرہ کی دی جاتی ہے وہ صرف صورت سزا کی ہوتی ہے، درحقیقت اس کو گناہ سے پاک کرنا مقصود ہوتا ہے، جیسے سونے کو بھٹی میں ڈال کر تپانے سے اس کا میل دور کرنا مقصود ہوتا ہے اسی طرح مؤمن کو بھی اگر کسی گناہ کی پاداش میں جہنم میں ڈالا گیا تو اس لئے کہ اس کے بدن کے وہ اجزاء جل جائیں جو حرام سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور جب یہ ہو چکتا ہے تو وہ جنت میں جانے کے قابل ہو جاتا ہے، اس وقت جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمُ الْوَادِيَّ الْوَعْدَى الَّذِي بَيْنَهُمَا قَرْيَتَا ظَاهِرَةٌ ۖ وَفَدَّرْنَا فِيهَا

السَّيْرَ الْآيَةَ، اس آیت میں اہل سباء پر اللہ تعالیٰ کی ایک اور نعمت کا اور اس پر اہل سباء کی ناشکری اور نادانی کا ذکر ہے کہ انھوں نے خود اس نعمت کو بدل کر شدت کی دعا اور تمنا کی۔ الْقَرْيَتَا الَّذِي بَيْنَهُمَا قَرْيَتَا ظَاهِرَةٌ، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول رحمت کا ذکر متعدد آیتوں میں ملکِ شام ہی کے لئے آیا ہے۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جن بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے صاحب برکت بنایا تھا، یعنی ملکِ شام کی بستیاں اور ان لوگوں کو اپنی تجارت وغیرہ کے لئے ملکِ شام کا سفر اکثر کرنا پڑتا تھا۔ عام دنیا کے حالات کے مطابق شہرِ مآرب سے ملکِ شام کا طویل فاصلہ ہے، راستے ہموار نہیں اللہ تعالیٰ نے قومِ سباء پر یہ انعام فرمایا کہ ان کے شہرِ مآرب سے لے کر ملکِ شام تک تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بستیاں بنا دی تھیں، یہ بستیاں لبِ مڑک تھیں۔ اس لئے ان کو قری ظاہرہ فرمایا۔ ان مسلسل بستیوں کا فائدہ یہ تھا کہ ان کا مسافر گھر سے نکل کر دوپہر میں آرام کرنا یا کھانا کھانا چاہتا تو آسانی سے کسی بستی میں پہنچ کر معمول کے مطابق

کھانا کھا کر آرام کر سکتا تھا۔ پھر اسی طرح ظہر کے بعد روانہ ہو کر آفتاب کے غروب ہونے تک اگلی بستی میں پہنچ کر رات گزار سکتا تھا، قَدْ رَافَتْهَا الشَّيْرُ لَا يَهْ كَامَطْلَب يَهْ ہے کہ یہ بستیاں ایسے متوازن اور مساوی فاصلوں پر بنائی گئی تھیں کہ ایک مفترکہ وقت کے اندر ایک بستی سے دوسری بستی تک پہنچ جاتے۔

سَيُورُ فِيهَا كَالْيَاثِي وَآيَاتُهَا مَبِينَاتٌ، یہ ایک تیسری نعمت کا ذکر ہے جو قوم مبارکہ پر مبذول ہوئی تھی، کہ اس کی بستیاں ایسے مساوی اور متوازن فاصلوں پر تھیں کہ قطع مسافت میں کمی بیشی نہ ہوتی تھی، اور راستے سب مامون تھے، کسی چور ڈاکو کا وہاں گزرنہ تھا، رات دن میں ہر وقت بے فکر سفر کیا جاسکتا تھا۔

فَقَاتِلُوا رَبَّنَا بَعْدَ بَلَاءِنَا أَفْجَاءَ تَحْمِلُوهَا أَنْفُسُهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ، یعنی ان ظالموں نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی کہ سفر کی تکلیف ہی نہ رہے ناقدری اور ناشکری کر کے خود یہ دعاء مانگی کہ ہمارے سفر میں بعد پیدا کر دے، قریب قریب کے گاؤں نہ رہیں، جنگل بیابان آئے، جس میں کچھ محنت مشقت بھی اٹھانی پڑے۔ اُن کی مثال وہی ہے جو بنی اسرائیل کی تھی کہ بے محنت بہترین رزق من و سلویٰ ان کو ملتا تھا، اس سے اکتا کر اللہ سے یہ مانگا کہ اس کے بجائے ہمیں سبزی ترکاری دیدیجئے، حق تعالیٰ نے ان کی ناشکری اور نعمت کی بے قدری پر وہ سزا جاری فرمائی جو اوپر سبیلِ غم کے عنوان سے مذکور ہوئی ہو۔ اسی کا آخری نتیجہ اس آیت میں یہ بیان فرمایا کہ ان کو ایسا تباہ و برباد کیا کہ دنیا میں ان کی عیش و عشرت اور دولت و نعمت کے قصے ہی رہ گئے، اور یہ لوگ افسانہ بن گئے۔

مَزَقْنَاهُمْ، تزیق سے مشتق ہے، جس کے معنی ٹکڑے ٹکڑے اور پارہ پارہ کرنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس مقام شہرِ مارب کے بنے والے کچھ ہلاک ہو گئے، کچھ ایسے منتشر ہو گئے کہ اُن کے ٹکڑے مختلف ملکوں میں پھیل گئے، عرب میں قوم سبا کی تباہی اور منتشر ہونا ایک ضرب المثل بن گیا، ایسے مواقع میں عرب کا محاورہ ہے تَفَرَّقُوا أَيَادِي سَبَا، یعنی یہ لوگ ایسے منتشر ہوئے جیسے قوم سبا کے نعمت پروردہ لوگ منتشر ہو گئے تھے۔

ابن کثیر وغیرہ مفسرین نے اس جگہ طویل قصہ ایک کاہن کا کہن کا نقل کیا ہے، کہ سیلاب کا عذاب آنے سے کچھ پہلے اس کاہن کو اس کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے ایک عجیب تدبیر کے ذریعہ پہلے تو اپنی زمین جائداد مکان وغیرہ سب فروخت کر دیا، جب رقم اس کے ہاتھ آگئی تو اس نے اپنی قوم کو آنے والے سیلاب و عذاب سے باخبر کیا، اور کہا کہ جس کو اپنی جان سلامت رکھنا ہو وہ فوراً یہاں سے نکل جائے۔ اس نے لوگوں کو یہ بھی بتلایا کہ تم میں جو لوگ سفرِ سعید



اختیار کر کے محفوظ مقام کا ارادہ کریں، وہ عمان چلے جائیں اور جو لوگ شراب اور خمیری روٹی اور پھل وغیرہ چاہیں وہ ملک شام کے مقام بصریٰ میں چلے جائیں، اور جو لوگ ایسی سواریاں چاہیں جو کچھڑ میں ثابت قدم رہیں، اور قحط کے زمانے میں کام آئیں، اور جلدی سفر کی ضرورت کے وقت ساتھ دیں تو وہ یثرب (مدینہ منورہ) چلے جائیں جس میں کھجور کثرت سے ہے۔ اس کی قوم نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ قبیلہ ازد عمان کی طرف چلے گئے اور غسان بصریٰ ملک شام کی طرف اور اوس و خزرج اور بنو عثمان یثرب ذات النخل کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ بطن مر کے مقام پر پہنچ کر بنو عثمان نے تو اسی جگہ کو پسند کر لیا اور یہیں رہ پڑے، اور اسی انقطاع کی وجہ سے بنو عثمان کا لقب خزاعہ ہو گیا۔ یہ بطن مرہ میں جو مکہ مکرمہ کے قریب ہو رہ پڑے، اور اوس و خزرج یثرب پہنچ کر مقیم ہو گئے۔ ابن کثیر میں طویل قصہ کے بعد لوگوں کے متفرق مقامات میں منتشر ہو جانے کی یہی تفصیل بسند سعید عن قتادہ عن الشعبي نقل کر کے فرمایا کہ اس طرح یہ قوم سبا ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، جس کا ذکر فَنَّا هُمْ كُلَّ مَصْرَفٍ میں آیا ہے۔ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ، یعنی قوم سبا کے عروج و نزول اور ان کے احوال کے انقلاب میں بڑی نشانی اور عبرت ہے، اس شخص کے لئے جو بہت صبر کرنے والا اور بہت شکر کرنے والا ہو۔ یعنی کوئی مصیبت و تکلیف پیش آئے تو اس پر صبر کرے، اور کوئی نعمت و راحت حاصل ہو تو اس پر اللہ کا شکر کرے، اس طرح وہ زندگی کے ہر حال میں نفع ہی نفع کماتا ہے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا حال عجیب ہے، کہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی تقدیر کا حکم نافذ فرماتے ہیں سب خیر ہی خیر اور نفع ہی نفع ہوتا ہے، کہ اگر اس کو کوئی نعمت و راحت اور اس کی خوشی کی چیز حاصل ہوتی ہے تو یہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے وہ اس کی آخرت کے لئے خیر اور نفع بن جاتا ہے اور اگر کوئی تکلیف و مصیبت پیش آجائے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے جس کا اس کو بہت بڑا اجر و ثواب ملتا ہے، اس طرح یہ مصیبت بھی اس کے لئے خیر اور نفع بن جاتی ہے۔ (از ابن کثیر)

اور بعض حضرات مفسرین نے لفظ صبار کو صبر کے عام معنی میں لیا ہے، جس میں طاماً پر ثابت قدم رہنا اور معاصی سے پرہیز کرنا بھی داخل ہے، اس تفسیر پر مومن ہر حال میں صبر و شکر کا جامع رہتا ہے اور ہر صبر و شکر بھی ہے، واللہ اعلم

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۰﴾

اور سچ کر دکھلائی اُن پر ابلیس نے اپنی اھل پھراس کی راہ چلے مگر تھوڑے سے ایمان دار۔

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِم مِّن سُلْطٰنٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يُّؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ

اور اس کا اُن پر کچھ زور نہ تھا مگر اتنے واسطے کہ معلوم کر لیں ہم اس کو جو یقین لاتا ہے آخرت پر بعد اکر کے

مِن مَّنْ هُوَ مَتَّعٰنٍ فِیْ شَقٍّ ۖ وَرَبُّكَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ حَفِیْظٌ ﴿۲۱﴾

اس سے جو رہتا ہے آخرت کی طرف دھوکہ میں، اور تیرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔

## خلاصہ تفسیر

اور واقعی ابلیس نے اپنا گمان ان لوگوں کے بارے میں (یعنی بنی آدم کے بارے میں) صحیح پایا (یعنی اس کو جو یہ گمان تھا کہ میں آدم کی اکثر ذریت کو گمراہ کر دوں گا، کیونکہ یہ مٹی سے اور میں آگ سے پیدا ہوا ہوں) (درمنثور) اس کا یہ گمان صحیح نکلا، کہ یہ سب اسی راہ پر ہوئے مگر ایمان والوں کا گروہ (کہ ان میں ایمان کامل والے تو بالکل محفوظ رہے، اور ضعیف الایمان گو گناہوں میں مبتلا ہو گئے، مگر مشرک و کفر سے وہ بھی محفوظ رہے) اور ابلیس کا ان لوگوں پر (جو) تسلط بطور اغوار کے ہے (وہ) بجز اس کے اور کسی وجہ سے نہیں کہ ہم کو (ظاہری طور پر) اُن لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے (الگ کر کے) معلوم کرنا ہے جو اس کی طرف سے شک میں ہیں (یعنی مقصود امتحان ہے کہ مؤمن و کافر میں امتیاز ہو جائے، تاکہ بمقتضائے عدل و حکمت ثواب و عذاب کے احکام جاری ہوں) اور (چونکہ) آپ کا رب ہر چیز کا نگران ہے (جس میں لوگوں کا ایمان و کفر بھی داخل ہے، اس لئے ہر ایک کو مناسب جزاء و سزا ملے گی)۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

تو کہہ پکارو ان کو جن کو گمان کرتے ہو سوائے اللہ کے وہ مالک نہیں ایک

ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِیْهِمَا مِّنْ شَرٍّ لِّیْ

ذرہ بھر کے آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کچھ سا جھا ہے

وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِّن ظَهِیْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَہٗ إِلَّا

اور نہ اُن میں کوئی اس کا مددگار - اور کام نہیں آتی سفارش اس کے پاس، مگر



لَمَنْ أَدْنَىٰ لَهُ طَحْتِي إِذَا فُزِعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ ط

اس کو کہ جس کے واسطے حکم کر رہے یہاں تک کہ جب گھبراہٹ دور ہو جائے ان کے دل سے کہیں کیا فرمایا تمہارے رب نے

قَالُوا الْحَقُّ ۖ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۚ ۲۳ قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَوَاتِ

وہ کہیں فرمایا جو واجب ہے اور وہی ہے سب سے اوپر بڑا۔ تو کہہ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے

وَالْأَرْضِ ط قُلْ اللَّهُ وَإِنَّا أَوْ أَيْكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ

اور زمین کے بتلا دے کہ اللہ اور یا ہم یا تم بیشک ہدایت پر ہیں یا پڑے ہیں مگر اسی میں

مُبَيِّنٍ ۚ ۲۴ قُلْ لَا تَسْأَلُونَنَا عَمَّا آجُرَمْنَا وَلَا نَسْأَلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۚ ۲۵

صریح۔ تو کہہ تم سے پوچھ نہ ہوگی اس کی جو ہم نے گناہ کیا اور ہم سے پوچھ نہ ہوگی اکی جو تم کرتے ہو

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ

تو کہہ جمع کر گیا ہم سب کو رب ہمارا پھر فیصلہ کر گیا ہم میں انصاف کا، اور وہی قصہ چکانے والا سب کچھ

الْعَلِيمُ ۚ ۲۶ قُلْ أَرُونِي الَّذِينَ أَلْحَقْتُمْ بِهِ شُرَكَاءَ كَلَّا بَلْ

جاننے والا ہے، تو کہہ مجھ کو دکھاؤ تو وہی جن کو اس سے ملاتے ہو سا بھی قرار دیکر کوئی نہیں وہی

هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۚ ۲۷

اللہ ہے زبردست حکمتوں والا۔

## خُلاصۂ تفسیر

آپدان لوگوں سے) فرمائیے کہ جن (معبودوں) کو تم خدا کے سوا (دخیل خدائی)

سمجھ رہے ہو ان کو (اپنی حاجتوں کے لئے) پکارو (تو وہی معلوم ہو جائے گا کہ کتنی قدرت اور

اختیار رکھتے ہیں ان کی حالت واقعیہ تو یہ ہے کہ) وہ ذرہ برابر (کسی چیز کا) اختیار نہیں رکھتے

نہ آسمانوں (کی کائنات) میں اور نہ زمین (کی کائنات) میں اور نہ اُن کی ان دونوں کے پیدا

کرنے) میں کوئی شرکت ہے اور نہ اُن میں سے کوئی اللہ کا (کسی کام میں) مددگار ہے، اور خدا

کے سامنے (کسی کی) سفارش کسی کے لئے کام نہیں آتی (بلکہ سفارش ہی نہیں ہو سکتی) مگر

اس کے لئے جس کی نسبت وہ (کسی سفارش کرنے والے کو) اجازت دیدے، (کفار و

مشرکین میں کچھ جاہل تھے تو ایسے تھے جو پتھر کے خود تراشیدہ بتوں ہی کو حاجت روا

اور کار فرما اور خدائی کا شریک سمجھتے تھے، اُن کے رد کے لئے تو آیت کے پہلے جملے آئے،  
 لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَ مَا لَهُمْ فِيهَا مِنْ شَرْحٍ اور بعض لوگ اتنا قادر تو نہیں  
 کہتے تھے مگر یہ عقیدہ رکھتے کہ یہ بت خدا تعالیٰ کے کاموں میں اس کے مددگار ہیں، اُن کے  
 رد کے لئے یہ فرمایا (مَا لَكُمْ مِنْ شَيْءٍ ظَاهِرٍ) اور کچھ ایسے سمجھدار تھے کہ ان بے جان بتوں کو کسی  
 چیز کا خالق یا خالق کا مددگار تو نہیں مانتے تھے، مگر یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ کے نزدیک  
 مقبول ہیں کہ جس کی سفارش کر دیں اس کا کام بن جاتا ہے، جیسا کہ وہ کہا کرتے تھے (هَؤُلَاءِ  
 شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ) ان کے رد کے لئے فرمایا (وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ) جس کا  
 حاصل یہ ہے کہ ان بتوں میں کسی قابلیت کے تو تم بھی قائل نہیں مگر تم اس دھوکہ میں ہو  
 کہ ان کو اللہ کے نزدیک مقبولیت حاصل ہے۔ یہ محض تمہارا خیال بے بنیاد ہے، نہ ان میں  
 کوئی قابلیت اور نہ اللہ کے نزدیک مقبولیت۔ آگے یہ ارشاد فرمایا کہ ان میں تو نہ کوئی قابلیت  
 ہو نہ مقبولیت، جن میں قابلیت بھی موجود ہو اور مقبولیت بھی جیسے اللہ کے فرشتے وہ بھی  
 کسی کی سفارش کرنے میں خود مختار نہیں، بلکہ ان کے لئے شفاعت کا قانون یہ ہے کہ جس  
 شخص کے لئے سفارش کرنے کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل جائے صرف اس کی  
 سفارش کر سکتے ہیں اور وہ بھی بڑی مشکل سے۔ کیونکہ وہ خود اللہ تعالیٰ کی ہیبت و  
 جلال سے مغلوب ہیں، جب اُن کو کوئی عام حکم دیا جاتا ہے یا کسی کے لئے سفارش  
 ہی کا حکم ملتا ہے تو وہ حکم سننے کے وقت ہیبت سے مدہوش ہو جاتے ہیں۔ جب یہ  
 ہیبت کی کیفیت رفع ہو جاتی ہے اس وقت حکم پر غور کرتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے  
 سے پوچھ کر تحقیق کر لیتے ہیں کہ ہم نے جو حکم سنا ہے وہ کیا ہے، اس تحقیق کے بعد وہ  
 حکم کی تعمیل کرتے ہیں جس میں کسی کی سفارش کا حکم بھی داخل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ کے فرشتے جو قابلیت بھی رکھتے ہیں، مقبولیت عند اللہ  
 بھی، وہ بھی کسی کی سفارش از خود بلا اجازت نہیں کر سکتے، اور جب کسی کے لئے اجازت  
 ملتی بھی ہے تو خود ہیبت سے مدہوش جیسے ہو جاتے ہیں، اس کے بعد جب مدہوشی دور  
 ہوتا ہے تو سفارش کرتے ہیں، تو یہ پتھروں کے خود تراشیدہ بت جن میں نہ کسی طرح کی  
 قابلیت ہو نہ مقبولیت، وہ کیسے کسی کی سفارش کر سکتے ہیں؟ فرشتوں کے مدہوش ہو جانے  
 وغیرہ کا ذکر آگے آیت میں اس طرح آیا ہے کہ (یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے  
 گھبراہٹ جو حکم سننے کے وقت طاری ہوتی تھی) دور ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے  
 سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم فرمایا وہ کہتے ہیں کہ (فلاں) حق بات



کا حکم فرمایا (جیسے طالب علم سبق پڑھنے کے بعد استاد کی تقریر کو صحیح کرنے اور یاد کرنے کے لئے باہم اس کا اعادہ کیا کرتے ہیں، یہ فرشتے بھی اپنے سنے ہوئے حکم کی باہم ایک دوسرے سے تحقیق و تصدیق کرتے ہیں۔ اس کے بعد حکم کی تعمیل کرتے ہیں، اور اس کے روپر فرشتوں کا ایسا حال ہو جانا کیا بعید ہے) وہ عالی شان سب سے بڑا ہے۔

اور آپ (ان سے تحقیق و توحید کے لئے یہ بھی) پوچھتے کہ تم کو آسمان و زمین سے (پانی برساکر اور نباتات نکال کر) کون روزی دیتا ہے (چونکہ اس کا جواب ان کے نزدیک ہی متعین ہے، اس لئے) آپ (یہی) کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ (روزی دیتا ہے) اور یہ بھی کہتے کہ اس مسئلہ توحید میں، بیشک ہم یا تم ضرور راہ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں (یعنی یہ تو ہونہیں سکتا کہ دو متضاد چیزیں توحید اور شرک دونوں صحیح اور حق ہوں، اور دونوں طرح کے عقیدے رکھنے والے اہل حق ہوں بلکہ ضروری ہے کہ ان دونوں عقیدوں میں سے ایک صحیح دوسرا غلط ہو۔ صحیح عقیدے کے رکھنے والے ہدایت پر اور غلط کا عقیدہ رکھنے والے گمراہی پر ہونگے۔ اب تم غور کرو کہ ان میں سے کونسا عقیدہ صحیح ہے اور کون حق و ہدایت پر ہے کون گمراہی پر) آپ (ان سے اس بحث و مناظرہ میں یہ بھی) فرمادیجئے (کہ ہم نے کھولی کر حق و باطل کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے، اب تم اور ہم ہر ایک اپنے عمل کا ذمہ دار ہے) تم سے ہمارے جرائم کی باز پرس نہ ہوگی اور ہم سے تمہارے اعمال کی باز پرس نہ ہوگی اور (آپ ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (ایک وقت ضرور آنے والا ہے جس میں) ہمارا رب سب کو (ایک جگہ) جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ (عملی) کر دے گا اور وہ بڑا فیصلہ کرنیوالا اور (سب کا حال) جاننے والا ہے، آپ (یہ بھی) کہتے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی شان عالی اور قدرت کاملہ کے دلائل سن لئے اور اپنے بتوں کی بے بسی بھی دیکھ لی، مجھ کو ذرا وہ تو دکھلاؤ جن کو تم نے شریک بنا کر (استحقاق عبادت میں) خدا کے ساتھ ملا رکھا ہے، ہرگز اس کا کوئی شریک (نہیں بلکہ) واقع میں (وہی ہے اللہ یعنی معبود برحق) زبردست حکمت والا۔

## معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں حکیم ربانی کے نزول کے وقت جو فرشتوں کا مدہوش ہو جانا پھر آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ پاچھ کرنے کا ذکر ہے، اس کا بیان صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے اس طرح آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کوئی حکم نافذ فرماتے ہیں تو سب فرشتے خشوع و خضوع سے اپنے پر مارنے لگتے ہیں (اور مدہوش جیسی ہو جاتے ہیں)۔

جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ اور ہیبت و جلال کا وہ اثر دور ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ دوسرے کہتے ہیں کہ فلاں حکم حق ارشاد فرمایا ہے۔ الحدیث اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارا رب تبارک اسمہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو عرش کے اٹھائیوں فرشتے تسبیح کرنے لگتے ہیں، ان کی تسبیح کو سن کر ان کے قریب والے آسمان کے فرشتے تسبیح پڑھنے لگتے ہیں، پھر ان کی تسبیح کو سن کر اس سے نیچے والے آسمان کے فرشتے تسبیح پڑھنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ یہ نوبت سماء دنیا (نیچے کے آسمان) تک پہنچ جاتی ہے اور سب آسمانوں کے فرشتے تسبیح میں مشغول ہو جاتے ہیں، پھر وہ فرشتے جو حملہ عرش کے قریب ہیں ان سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے رب نے کیا فرمایا وہ بتلا دیتے ہیں، پھر اسی طرح ان سے نیچے کے آسمان والے اور والدوں سے یہی سوال کرتے ہیں، یہاں تک کہ سوال و جواب کا یہ سلسلہ سماء دنیا تک پہنچ جاتا ہے۔ الحدیث (مظہری)

بجٹ و مناظرہ میں مخاطب کے  
نفیات کی رعایت اور اشتعال  
انگریزی گریمر

وَاِنَّا آدَاٰ اَيَّاكُمْ تَعَالٰی هٰکِیْ اَدْوٰی فِی ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ، یہ مشرکین کفار کے ساتھ خطاب ہے۔ دلائل واضحہ سے اللہ تعالیٰ کا خالق و مالک ہونا اور قادر و مطلق ہونا واضح کر دیا گیا، بتوں اور غیر اللہ کی بے بسی اور کمزوری کا مشاہدہ کر دیا گیا، ان سب باتوں کے بعد موقع اس کا تھا کہ مشرکین کو خطاب کر کے کہا جاتا کہ تم جاہل اور گمراہ ہو کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں اور شیاطین کی پرستش کرتے ہو۔ مگر قرآن حکیم نے اس جگہ جو حکیمانہ عنوان اختیار فرمایا وہ دعوت و تبلیغ اور مخالفین اسلام اور اہل باطل سے بجٹ و مناظرہ کرنے والوں کے لئے ایک اہم ہدایت نامہ ہے کہ اس آیت میں ان کو کا فر گمراہ کہنے کی بجائے عنوان یہ رکھا کہ ان دلائل واضحہ کی روشنی میں یہ تو کوئی سمجھدار آدمی کہہ نہیں سکتا کہ توحید و شرک دونوں باتیں حق ہیں، اور اہل توحید اور مشرک دونوں حق پرست ہیں، بلکہ یقینی ہے کہ ان دونوں میں سے ایک حق پرست اور گمراہی پرست ہے۔ اب تم خود سوچ لو اور فیصلہ کر لو کہ ہم حق پر ہیں یا تم۔ مخاطب کو خود کا فر گمراہ کہنے سے اس کو اشتعال ہوتا، اس سے گریز کیا گیا، اور ایسا مشفقانہ عنوان اختیار کیا کہ سنگدل مخالفت بھی مغور کرنے پر مجبور ہو جائے (از قرطبی و بیان القرآن) یہ پیغمبرانہ دعوت و موعظت اور مجادلہ بالحق ہی احسن کا طریقہ جو علماء کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہئے، اس کے نظر انداز ہونے ہی سے دعوت و تبلیغ اور بجٹ و مناظرہ بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ مخالفین ضد پر آجاتے ہیں ان کی گمراہی اور پختہ ہو جاتی ہے۔



وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ

اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو سارے لوگوں کے واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو لیکن

أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾

بہت لوگ نہیں سمجھتے۔

## خلاصہ تفسیر

اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے (خواہ جن ہوں یا انسان، عرب ہوں یا عجم موجود ہوں یا آئندہ ہونے والے ہوں سب کے لئے) پیغمبر بنا کر بھیجا ہے (ایمان لانے پر ان کو ہماری رضا و ثواب کی خوش خبری سنانے والا اور ایمان نہ لانے پر ان کو ہمارے غضب و عذاب سے ڈرانے والا، لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے) جہالت یا عناد کی وجہ سے انکار و تکذیب میں لگ جاتے ہیں۔

## معارف و مسائل

سابقہ آیات میں توحید اور حق تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کا بیان تھا، اس آیت میں رسالت کا اور بالخصوص ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تمام اقوام عالم موجودہ و آئندہ کے لئے عام ہونا بیان کیا گیا ہے۔

كَافَّةً لِّلنَّاسِ لفظ کافۃً، عربی محاورہ میں کسی چیز کے سب کو عام و شامل ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس میں کوئی مستثنیٰ نہ ہو۔ اصل عبارت ترکیبی کا تقاضا یہ تھا کہ لِّلنَّاسِ کافۃً کہا جاتا، کیونکہ لفظ کافۃً حال ہے ناس کا، مگر عموم بعثت بیان کرنے کا اہتمام واضح کرنے کے لئے لفظ کافۃً کو مقدم کر دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاء مبعوث ہوئے ہیں، ان کی رسالت و نبوت کسی خاص قوم اور خاص خطہ زمین کے لئے تھی۔ یہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی فضیلت ہے کہ آپ کی نبوت ساری دنیا کے لئے عام ہے۔ اور صرف انسان ہی نہیں جنات کے لئے بھی ہے اور صرف ان لوگوں کے لئے نہیں جو آپ کے زمانہ میں موجود تھے بلکہ قیامت تک آنے والی انسانی نسلوں کے لئے عام ہے۔ اور آپ کی نبوت و رسالت کا تا قیامت باقی اور مسلسل رہنا ہی اس کا مقتضی ہے کہ آپ خاتم النبیین ہوں آپ کے

بعد کوئی نبی مبعوث نہ ہو۔ کیونکہ دوسرا نبی اس وقت مبعوث ہوتا ہے جب پہلے کی شریعت اور تعلیمات مسخ و محرف ہو جائیں، تو دوسرا نبی اصلاح خلق کے — مقصد کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور اپنی کتاب قرآن کی حفاظت کا تا قیامت خود ذمہ لے لیا ہے، اس لئے وہ قیامت تک اپنی اصلی حالت میں قائم رہے گی اور کسی اور نبی کے مبعوث ہونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں۔ ایک یہ کہ میری مدد اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا رعب دے کر فرمائی کہ ایک مہینہ کی مسافت تک لوگوں پر میرا رعب چھا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ میرے لئے پوری زمین کو مسجد اور طہور قرار دیا گیا ہے۔ (پچھلے انبیاء کی شریعتوں میں ان کی عبادت خاص عبادت گاہوں ہی میں ہوتی تھی، ان کی مساجد سے باہر میدان یا گھر میں عبادت نہ ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کے لئے پوری زمین کو اس معنی میں مسجد بنادیا کہ ہر جگہ نماز ادا ہو سکتی ہے۔ اور زمین کی مٹی کو پانی نہ ملنے یا پانی کا استعمال مضر ہونے کی صورت میں طہور یعنی پاک کرنے والا بنادیا کہ اس سے تیمم کر لیا جائے تو وضو کے قائم مقام ہو جاتا ہے)۔ تیسرے یہ کہ میرے لئے مال غنیمت حلال کر دیا گیا، مجھ سے پہلے کسی امت کے لئے یہ مال حلال نہیں تھا، بلکہ حکم یہ تھا کہ جنگ میں جو مال کفار کا ہاتھ آتا اس کو جمع کر کے ایک جگہ رکھ دیں، وہاں ایک آسانی آگ بجلی وغیرہ آکر اس کو جلا دے گی، اور یہ جلا دینا ہی اس جہاد کی مقبولیت کی علامت ہوگی۔ امت محمدیہ کے لئے مال غنیمت کو قرآن کے بتلائے ہوئے اصول کے مطابق تقسیم کر لینا اور اپنی ضروریات میں صرف کرنا جائز کر دیا گیا، چوتھے یہ کہ مجھے شفاعت کبریٰ کا مقام دیا گیا (یعنی حشر کے میدان میں جس وقت کوئی پیغمبر شفاعت کی ہمت نہ کرے گا، مجھے اس وقت شفاعت کا موقع دیا جائے گا) پانچویں یہ کہ مجھ سے پہلے ہر نبی اپنی مخصوص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، مجھے تمام اقوام عالم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے (ابن کثیر)

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٩﴾ قُلْ لَّكُمْ

اور کہتے ہیں کب ہے یہ وعدہ اگر تم سچے ہو - تو کہہ دیجئے

مَّيِّعَادُ يَوْمٍ لَا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْقِدُونَ ﴿٣٠﴾

لئے وعدہ ہر ایک دن کا نہ دیر کر دو گے اس سے ایک گھڑی نہ جلدی



وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالَّذِينَ تُؤْمِنُونَ هَذَا الْقُرْآنُ بِاللِّزِيِّ

اور کہنے لگے منکر ہم ہرگز نہ مانیں گے اس قرآن کو اور نہ اس سے

بَیِّنَ يَدَيْهِ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ

اگلے کو، اور کبھی تو دیکھے جب کہ گنہگار کھڑے کئے جائیں اپنے رب کے پاس،

يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا

ایک دوسرے پر ڈالتا ہے بات کو، کہتے ہیں وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے تھے

لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ﴿٣١﴾ قَالَ

بڑائی کرنے والوں کو اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایمان دار ہوتے۔ کہنے لگے

الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدٌ لَّكُمْ عَنِ

بڑائی کرنے والے اُن سے جو کہ کمزور ہو گئے تھے کیا ہم نے روکا تم کو

الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُجْرِمِينَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الَّذِينَ

حق بات سے تمہارے پاس پہنچ چکنے کے بعد کوئی نہیں تم ہی تھے گنہگار۔ اور کہنے لگے

اسْتَضَعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ الْيَلِّ وَالنَّهَارِ إِذْ

وہ لوگ جو کمزور گئے تھے بڑائی کرنے والوں کو کوئی نہیں پرفریک رات دن کے جب

تَأْمُرُونَ أَنَّا نَكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا وَأَسَرُّوا

تم ہم کو حکم کیا کرتے کہ ہم نہ مانیں اللہ کو اور ٹھہرائیں اس کے ساتھ برابر کے سبھی اور چھپے

النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا الْأَغْلَالِ فِي أَعْنَاقِ

پچھانے لگے جب دیکھ لیا عذاب، اور ہم نے ڈالے ہیں طوق گردنوں میں

الَّذِينَ كَفَرُوا أَهْلُ يَجْرُونَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٣٣﴾

منکروں کے، وہی بدلہ پاتے ہیں جو عمل کرتے تھے۔

### خلاصہ تفسیر

اور یہ لوگ (قیامت کے متعلق مضامین صحیح بیننا ربنا ثم یفرج الخ منکر) کہتے ہیں

کہ یہ وعدہ کب واقع ہوگا اگر تم (یعنی نبی اور آپ کے متبعین) سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے واسطے ایک خاص دن کا وعدہ (مقرر) ہے اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکتے ہو اور نہ آگے بڑھ سکتے ہو (یعنی گو ہم وقت نہ بتلائیں گے جو تم پوچھ رہے مگر آئے گی ضرور جس کا اس پوچھنے سے انکار کرنا تمہارا مقصود ہے) اور یہ کفار (دنیا میں تو خوب خوب باتیں بناتے ہیں اور) کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور نہ اس سے پہلی کتابوں پر اور (قیامت میں یہ ساری بلی چوڑی باتیں ختم ہو جائیں گی چنانچہ) اگر آپ (ان کی) اس وقت کی حالت دیکھیں (تو ایک ہولناک منظر نظر آئے) جبکہ یہ ظالم اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے ایک دوسرے پر بات ڈالتا ہوگا (جیسا کوئی کام بگڑ جانے کے وقت عادت ہوتی ہے چنانچہ) ادنیٰ درجہ کے لوگ (یعنی متبعین) بڑے لوگوں سے (یعنی اپنے مقتداؤں سے) کہیں گے کہ (ہم تو تمہارے سبب برباد ہوئے) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لے آئے ہوتے (اس پر) یہ بڑے لوگ ان ادنیٰ درجہ کے لوگوں سے کہیں گے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت (پر عمل کرنے) سے (زبردستی) روکا تھا بعد اس کے کہ وہ (ہدایت) تم کو پہنچ چکی تھیں نہیں بلکہ تم ہی قصور وار ہو (کہ حق کے ظاہر ہونے کے بعد بھی اس کو قبول نہ کیا، اب ہمارے سر دھرتے ہو) اور (اس کے جواب میں) یہ کم درجہ کے لوگ ان بڑے لوگوں سے کہیں گے کہ (ہم یہ نہیں کہتے کہ تم نے زبردستی کی تھی) نہیں، بلکہ تمہاری رات دن کی تدبیروں نے روکا تھا جب تم ہم سے فراموش کرتے رہتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لئے شریک قرار دیں (تدبیر سے مراد ترغیب و ترہیب ہی، یعنی رات دن کی ان تعلیمات اور ان تدبیرات کا اثر ہو گیا، اور تباہ و برباد ہوئے۔ بس ہم کو تم ہی نے خراب کیا) اور (اس گفتگو میں تو ہر شخص دوسرے پر الزام دے گا، مگر دل میں اپنا اپنا قصور بھی سمجھیں گے۔ مصلحتیں سمجھیں گے کہ واقعی ہم نے ایسا کیا تو تمہارا رضائیں سمجھیں گے کہ گواہوں نے ہم کو غلط راستہ بتلایا تھا، لیکن آخر ہم بھی تو اپنا نفع نقصان سمجھ سکتے تھے، ضرور ہمارا بھی بلکہ زیادہ ہمارا ہی قصور ہو گیا) وہ لوگ (اپنی اس) پشیمانی کو (ایک دوسرے سے) مخفی رکھیں گے جبکہ (اپنے اپنے عمل پر) عذاب (ہوتا ہوا) دیکھیں گے (تاکہ نقصان مایہ کے ساتھ شہادت ہمسایہ نہ ہو، لیکن آخر میں شدت عذاب سے وہ تحمل جاتا رہے گا) اور (ان سب کو مشترک یہ عذاب دیا جائے گا کہ) ہم کافروں کی گردلوں میں طوق ڈالیں گے (اور ہاتھ پاؤں میں زنجیر پھر مشکیں کسا ہوا جہنم میں جھونک دیا جائے گا) جیسا کرتے تھے ویسا ہی تو بھرا۔



وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّازِلٍ إِلَّا قَالَ مُتَرَفِّعُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ

اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا مگر کہنے لگے وہاں کے آسودہ لوگ جو تمہارے ہاتھ بھیجا گیا

بِهِ كُفْرًا ۚ وَكَانُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا ۚ وَمَا نَحْنُ

ہم اس کو نہیں مانتے۔ اور کہنے لگے ہم زیادہ ہیں مال اور اولاد میں، اور ہم پر آفت

بِمَعَذَرَتَيْنِ ۚ ۳۵ قُلْ إِن رَّبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ

نہیں آنے والی، تو کہہ میرا رب ہی جو کشادہ کر دیتا ہر روزی جس کو چاہی اور باپ کر دیتا ہے

وَلَٰكِنَّا أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۚ ۳۶ وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا

لیکن بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ اور تمہارے مال اور تمہاری اولاد

أَوْلَادُكُمْ بِأَلَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِندَ رَبِّكُمُ إِلَّا مَن أَمَنَ وَعَمِلَ

وہ نہیں کہ نزدیک کر دیں ہمارے پاس تمہارا درجہ پر جو کوئی یقین لایا اور بھلا

صَالِحًا حَازَ فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الصَّعْعِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي

کام کیا سوا ان کے لئے ہے بدلہ دونا ان کے کئے کام کا اور وہ بھروسوں

الْخُرُفِ أَمِنُونَ ۚ ۳۷ وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ

میں بیٹھے ہیں دل جمعی سے، اور جو لوگ دوڑتے ہیں ہماری آیتوں کے ہرانے کو

أُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ ۚ ۳۸

وہ عذاب میں پکڑے ہوئے آتے ہیں۔

## خلاصہ تفسیر

اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کے اقوالِ ضلالت و اقوالِ جہالت سے آپ مغموم نہ ہوں، کیونکہ یہ معاملہ انوکھا آپ ہی کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ، ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈر سنانے والا (پیغمبر) نہیں بھیجا، مگر وہاں کے خوش حال لوگوں نے (ان کفار معاصرین کی طرح) یہی کہا کہ ہم تو ان احکام کے منکر ہیں جو تم کو دے کر بھیجا گیا ہے، اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم مال اور اولاد میں تم سے زیادہ ہیں، (لما قال فی الکہف انا اکثر

مِنْكَ مَا لَا وَاعٍ لَكُمْ، اور یہ دلیل ہے ہمارے مکرم و مقبول عند اللہ ہونے کی پس ہم کو کبھی عذاب نہ ہوگا اور یہی بات کفار کہتے ہیں کما قال تعالیٰ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا آمَنُوا آمَنُوا الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَّتَّقَامَا، پس غم نہ کیجئے، البتہ ان کے قول کو رد کیجئے اور ان سے یوں کہہ دیجئے کہ وسعت رزق کا مدار قبول عند اللہ نہیں ہے، بلکہ محض مشیت ہے، چنانچہ میرا پروردگار جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے (اور اس میں حکمتیں ہوتی ہیں، لیکن اکثر لوگ اس سے) واقف نہیں (کہ مدار اس کا دوسری مصلحتوں پر ہے قبولیت عند اللہ پر نہیں ہے) اور (اے کفار یہ بھی سن رکھو کہ جس طرح تمہارے اموال و اولاد دلیل و علامت قرب عند اللہ کے نہیں اسی طرح) تمہارے اموال و اولاد ایسی چیزیں نہیں جو تم کو درجہ میں ہمارا مقرب بنادے (یعنی مؤثر و علت قرب کی بھی نہیں پس نہ اموال و اولاد قبولیت پر مرتب ہیں، اور نہ اموال و اولاد پر قبولیت مرتب ہے) ہاں مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے (یہ دونوں چیزیں البتہ سبب قرب ہیں) سو ایسے لوگوں کے لئے ان کے (نیک) عمل کا دو ناصلہ ہے (یعنی عمل سے زیادہ خواہ دوئے سے بھی زیادہ لقولہ تعالیٰ مَنْ جَاءَ بِالْخَيْرِ فَلَهُ عَشْرُ مَثَابٍ) اور وہ (بہشت کے) بالائے خافوں میں چین سے (بیٹھے) ہوں گے اور جو لوگ (ان کے خلاف محض اموال و اولاد پر مغرور ہیں اور ایمان و عمل صالح کو اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ) ہماری آیتوں کے متعلق (ان کے ابطال کی) کوشش کر رہے ہیں (نبی کو) ہرانے کے لئے ایسے لوگ عذاب میں لائے جائیں گے۔

## معارف و مسائل

دنیا کی دولت دعوت کو  
مقبولیت عند اللہ کی دلیل  
سمجھنے کا قدیم شیطانی فریب  
ابتداء دنیا سے دنیا کی دولت اور عیش و عشرت کے نشہ میں مخمور  
ہونے والوں نے ہمیشہ حق کی آواز کی مخالفت اور انبیاء و صلحاء سے  
عداوت کا طریقہ اختیار کیا ہے، اِلَّا مَا شَاءَ اللہ، اس پر طرہ یہ کہ  
وہ اہل حق کے مقابلہ میں اپنی موجودہ حالت پر مگن اور مطمئن ہونے کی یہ دلیل بھی  
دیتے تھے کہ اگر ہمارے اعمال و عادات اللہ کو پسند نہ ہوتے تو ہمیں دنیا کی دولت عزت  
حکومت کیوں دیتے؟ قرآن کریم نے اس کا جواب متعدد آیات میں مختلف عنوانات سے  
دیا ہے۔ آیات مذکورہ کا نزول بھی اسی طرح کے ایک واقعہ سے متعلق اور اس لغو  
دلیل کا جواب ہے۔

حدیث میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں دو شخص ایک کاروبار میں شریک تھے،



پھر ان میں سے ایک یہ جگہ چھوڑ کر کسی ساحلی علاقہ میں چلا گیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، آپ کی نبوت و رسالت کا چرچا ہوا تو ساحلی ساتھی نے مکتی ساتھی کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ ان کے دعوائی نبوت کا تم لوگوں نے کیا اثر لیا؟ اس پر مکتی ساتھی نے جواب لکھا کہ قریش میں سے تو کوئی بھی ان کا تابع نہیں ہوا، صرف غریب مسکین بے حیثیت لوگ انکے پیچھے لگے ہیں۔ ساحلی ساتھی وہاں کی اپنی تجارت چھوڑ کر مکہ مکرمہ آیا، اور اپنے ساتھی سے کہا کہ مجھے ان کا بہتہ بتلاؤ جو نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ ساحلی ساتھی کچھ کتب قدیمہ تورات و انجیل وغیرہ کا مطالعہ کیا کرتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا کہ آپ کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟ آپ نے اپنی دعوت اسلام کے اہم اجزاء کا ذکر فرمایا، دعوت اسلام کو آپ کی زبان مبارک سے سنتے ہی اس نے کہا اَشْهَدُ اَنْكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ، یعنی میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس نے عرض کیا کہ (آپ کی دعوت کا حق ہونا تو عقل سے سمجھا اور اس کی علامت یہ دیکھی کہ) جتنے انبیاء علیہم السلام پہلے آئے ہیں سب کے ماننے والے ابتداء میں قوم کے غریب و فقیر دنیا میں کم حیثیت لوگ ہوئے ہیں، اس پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی مَا اَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّحْنُ يَرٰ اِلٰهًا قَالُ مُتَرَفُّوْهَا (ابن کثیر و مظہری) مُتَرَفُّ، تَرَفُّ سے مشتق ہے، جس کے معنی ناز و نعمت کی فراوانی کے آتے ہیں۔ مُتَرَفُّوْنَ سے مراد اغنیاء اور مالدار اور قوم کے رؤساء ہیں۔ قرآن کریم نے مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں فرمایا ہے کہ جب کبھی ہم نے کوئی رسول بھیجا، تو مال و دولت کے نشہ اور ناز و نعمت میں پلے ہوئے لوگوں نے اس کا مقابلہ کفر و انکار ہی سے کیا ہے۔ دوسری آیت میں اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ فَحَنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِيْنَ، یعنی ہم تم سے مال و دولت میں بھی زیادہ اولاد میں بھی زیادہ، اس لئے ہم عذاب میں مبتلا نہیں ہو سکتے؛ (بظاہر اُن کے قول کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہم قابل عذاب ہوتے تو ہمیں اتنی دولت و عزت کیوں دیتا، قرآن کریم نے تیسری اور چوتھی آیت میں اُن کا یہ جواب دیا ہے قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ اور مَا اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ بِالْاٰیَةِ، خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ دنیا میں مال و دولت یا عزت و جاہ کی کمی بیشی اللہ کے نزدیک مقبول یا مردود ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ تکوینی مصالح کے پیش نظر دنیا میں تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مال و دولت فراوانی کے ساتھ دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے، جس کی تکوینی حکمت

کو وہی جانتا ہے، مگر مال و اولاد کی بہتات کو اللہ کے نزدیک مقبولیت کی دلیل سمجھنا چاہت ہے، کیونکہ اس کے نزدیک مقبولیت کا مدار صرف ایمان اور عمل صالح پر ہے جس کو یہ حامل نہیں مال و اولاد کتنا ہی زیادہ ہو وہ اس کو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں بنا سکتا۔

اسی مضمون کو قرآن کریم نے متعدد آیات میں بیان فرمایا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے اَيَحْسَبُونَ اَنَّمَا نُسِطُ لَهُمْ مِّنْ مَّالٍ وَبَنِينَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَلْ لَا يَشْعُرُونَ یعنی کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم جو مال اور اولاد کی بہتات سے ان کی امداد کرتے ہیں یہ کچھ ان کے لئے انجام و آخرت کے اعتبار سے خیر ہے (ہرگز نہیں) بلکہ یہ لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں کہ جو مال و اولاد انسان کو اللہ سے غافل کرے وہ اس کے لئے وبال ہے۔

دوسری آیت میں فرمایا فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَرْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ، یعنی ان کافروں کے مال و اولاد سے آپ تعجب نہ کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کو اسی مال و اولاد کے ذریعے دنیا میں مبتلائے عذاب کر دے، اور انجام کار ان کی جان اسی حالت کفر میں بکھل جائے جس کا نتیجہ آخرت کا دائمی عذاب ہو۔ مال و اولاد کے ذریعے دنیا میں عذاب دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں مال و دولت کی محبت میں ایسے مبتلا ہو جائیں کہ اپنے انجام اور خدا و آخرت کی طرف کبھی التفات نہ ہو جس کا انجام دائمی عذاب ہے، اور بہت سے مال و اولاد والوں کو اس دنیا میں بھی مال و اولاد ہی کی خاطر بلکہ انہی کے ذریعے ہزاروں مصائب و تکالیف گھسیٹتی پڑتی ہیں، ان کی سزا و عذاب تو اسی عالم سے شروع ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے اموال کو نہیں دیکھتا، وہ تو تمہارے دلوں کو اور اعمال کو دیکھتا ہے۔ (رواہ احمد، ابن کثیر)

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُوْنَ اَوْهُمْ فِي النَّارِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَمَلُكُمْ لَہٗ جَزَاءٌ مِّمَّا كَانْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ یَبْصُرُ مَا تَعْمَلُوْنَ

والوں کا حال بتلایا گیا ہے، کہ اللہ کے نزدیک مقبول یہی لوگ ہیں، دنیا میں کوئی ان کی قدر پہچانے یا نہ پہچانے، آخرت میں ان کو جزا سے ضیعت ملے گی۔ ضیعت بکسر ضا د مصدر ہے جس کے معنی ایک شے کے مثل یا امثال کے آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں دولت والے اپنی دولت کو بڑھانے میں لگے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی جزا کو آخرت میں بڑھا دیں گے، کہ ایک عمل کی جزا اس کے مثل امثال ہوں گے، اور اس میں بھی منحصر نہیں اس کے اخلاص عمل اور دوسرے اسباب کے ایک عمل کی جزا اس کے سات سو گنا تک ملنا



بھی احادیث صحیحہ میں ثابت ہو۔ اور اس میں بھی حصر نہیں، اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے، اور یہ لوگ جنت کے غرقوں میں مامون اور ہمیشہ کے لئے ہر بخ و غم سے محفوظ رہیں گے۔ غرقات غرقہ کی جمع ہے، مکان کا جو حصہ دوسرے حصوں سے ممتاز اور اعلیٰ سمجھا جائے اس کو غرقہ کہتے ہیں (منطویٰ)

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ وَمَا

تو کہہ میرا رب ہو جو کشادہ کر دیتا ہے روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور پکڑ دیتا ہے اور

أَنْفَقَ مِنْ شَيْءٍ فَهُمْ لَا يَخِلْفُهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (۳۹)

جو خرچ کرتے ہو کچھ چیز وہ اس کا عوض دیتا ہے اور وہ بہتر ہے روزی دینے والا۔

## خلاصہ تفسیر

آپ (مؤمنین سے) یہ فرمادیجئے کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے فراخ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے تنگی دیتا ہے اور خرچ میں امساک اور بخل سے رزق بڑھ نہیں سکتا، اور شریعت کے مطابق خرچ کرنے سے گھٹ نہیں سکتا، اس لئے تم مال سے دل نہ لگاؤ بلکہ جہاں جہاں اللہ کے حقوق اور اپنے عیال کے حقوق اور فقراء و مساکین وغیرہ میں خرچ کرنے کا حکم ہے بے دھڑک خرچ کرتے رہو، کہ اس سے رزق مقسوم و مقدر میں تو کسی کمی کا ضرر نہ ہوگا اور آخرت میں اس سے نفع حاصل ہوگا، کیونکہ جو چیز تم (حکیم خداوندی کے مواقع میں) خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کا آخرت میں تو ضرور اور اکثر دنیا میں بھی) بدلہ دے گا اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔

## معارف و مسائل

یہ آیت تقریباً اپنی الفاظ کے ساتھ اوپر گزری ہے (قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ) یہاں بظاہر یہی مضمون مکرر آیا ہے مگر ایک فرق کے ساتھ کہ اس جگہ مَنْ يَشَاءُ کے بعد مِنْ عِبَادِهِ اور يَقْدِرُ کے بعد لَهُ کا اضافہ ہے۔ مِنْ عِبَادِهِ کے لفظ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ حکم اپنے مخصوص بندوں یعنی مؤمنین کے لئے ارشاد ہوا ہے، اور مقصود اس سے یہ ہے کہ ایمان والے مال کی محبت میں ایسے نہ لگیں کہ اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے حقوق و مواقع

میں خرچ کرنے سے دل تنگ ہونے لگیں اور اس سے پہلی جو آیت اسی مضمون کی آئی ہے اس کا خطاب کفار و مشرکین کو تھا جو دنیا کے مال و اولاد پر فخر کرتے اور ان کو اپنی آخرت کی فلاح کی دلیل بتاتے تھے۔ اس طرح مخاطب اور مقصود و کلام کے اعتبار سے تکرار نہ رہا، خلاصہ تفسیر میں جو شروع آیت کی تفسیر میں مومنین کا لفظ بڑھایا ہے یہ اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اور بعض حضرات نے ان دونوں آیتوں میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ پہلی آیت میں تو مختلف انسانوں میں تقسیم رزق کا ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مصالح عالم کے پیش نظر کسی کو مال زیادہ کسی کو کم دیتے ہیں، اور اس آیت میں ایک ہی شخص کے مختلف احوال کا ذکر ہے کہ ایک شخص کو کبھی مال کی فراخی اور وسعت عطا ہوتی ہے، کبھی اسی کو تنگی اور تنگ دستی بھی پیش آتی ہے۔ لفظ کہ جو اس آیت میں یقید کے بعد آیا ہے اس میں اس طرف اشارہ نکلتا ہے اس تقریر کے مطابق بھی تکرار نہ رہا بلکہ پہلی آیت مختلف افراد کے متعلق اور یہ آیت ایک ہی فرد کے مختلف احوال کے متعلق ہو گئی۔

وَمَا آتَيْنَاكَ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُ۔ اس آیت کے لفظی معنی یہ ہیں کہ تم جو چیز بھی خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ خیب سے تمہیں اس کا بدلہ دیدیتے ہیں، کبھی دنیا میں اور کبھی آخرت میں اور کبھی دونوں میں۔ کائنات عالم کی تمام چیزوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے انسان اور جانور اس کو بے دھڑک خرچ کرتے رہتے ہیں، کھیتوں اور درختوں کو سیراب کرتے ہیں وہ پانی ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا اس کی جگہ اور نازل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زمین سے کنواں کھود کر جو پانی نکالا جاتا ہے اس کو جتنا نکال کر خرچ کرتے ہیں اس کی جگہ دوسرا پانی قدرت کی طرف سے جمع ہو جاتا ہے، انسان غذا کھا کر بظاہر ختم کر لیتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسری غذا مہیا کر دیتے ہیں، بدن کی نقل و حرکت اور محنت سے جو اجزاء تحلیل ہو جاتے ہیں ان کی جگہ دوسرے اجزاء بدل مایتحلل بن جاتے ہیں۔ غرض انسان دنیا میں جو چیز خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی عام عادت یہ ہے کہ اس کے قائم مقام اسی جیسی دوسری چیز دیدیتے ہیں، کبھی کسی کو سزا دینے کے لئے یا کسی دوسری تکوینی مصلحت سے اس کے خلاف ہو جاتا اس صلابہ اکہیہ کے منافی نہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر روز جب لوگ صبح میں داخل ہوتے ہیں دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں اور یہ دعاء کرتے ہیں اَللّٰهُمَّ اعْطِ مَنْفَقًا خَلْفًا وَاَعْطِ مَسْجَا تَلْفًا، یعنی یا اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما اور بخل کرنے والے کا مال ضائع کر دے، اور ایک دوسری حدیث میں ہے



کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ لوگوں پر خرچ کریں میں آپ خرچ کروں گا۔

جو خرچ شریعت کے مطابق نہ ہو | حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک کام صدقہ ہے، اور کوئی آدمی جو اپنی نفس یا اپنے عیال پر خرچ کرتا ہے وہ بھی صدقہ کے حکم میں ہے موجب ثواب ہے، اور جو شخص کچھ خرچ کر کے اپنی آبرو بچائے وہ بھی صدقہ ہے، اور جو شخص اللہ کے حکم کے مطابق کچھ خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا ہے کہ اس کا بدل اس کو دے گا، مگر وہ خرچ جو فضول زائد از ضرورت، تعمیر میں یا کسی گناہ کے کام میں کیا ہو اس کے بدل کا وعدہ نہیں۔

حضرت جابرؓ کے شاگرد ابن المنکدر نے یہ حدیث سن کر ان سے پوچھا کہ آبرو بچانے کے لئے خرچ کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ جس شخص کے متعلق یہ خیال ہو کہ نہیں دیں گے تو عیب جوئی کرے گا، برا کہتا پھرے گا یا بدگوئی کرے گا اس کو اپنی آبرو بچانے کے لئے دینا مراد ہے (رواہ الدارقطنی، قرطبی)

جس چیز کا خرچ گھٹ جاتا ہے | اس آیت کے اشارہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اشیا اس کی پیداوار بھی گھٹ جاتی ہے | صرف انسان اور حیوانات کے لئے پیدا فرمائی ہیں، جب تک وہ خرچ ہوتی رہتی ہیں ان کا بدل منجانب اللہ پیدا ہوتا رہتا ہے، جس چیز کا خرچ زیادہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی پیداوار بھی بڑھا دیتے ہیں۔ جانوروں میں بکرے اور گائے کا سب سے زیادہ خرچ ہے کہ ان کو ذبح کر کے گوشت کھایا جاتا ہے، اور شرعی قربانیوں اور کفارات و جنایات میں ان کو ذبح کیا جاتا ہے، وہ جتنے زیادہ کام آتے ہیں اللہ تعالیٰ اتنی ہی زیادہ اس کی پیداوار بڑھا دیتے ہیں جس کا ہر جگہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ بکروں کی تعداد ہر وقت چھری کے نیچے رہنے کے باوجود دنیا میں زیادہ ہوتی ہے، کتے بلی کی تعداد اتنی نہیں، حالانکہ کتے بلی کی نسل بظاہر زیادہ ہونی چاہئے کہ وہ ایک ہی پیٹ سے چار پانچ بچے تک پیدا کرتے ہیں، گائے بکری زیادہ سے زیادہ دو بچے دیتی ہے، گائے بکری ہر وقت ذبح ہوتی رہتی ہے، کتے، بلی کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا، مگر پھر یہ مشاہدہ ناقابل انکار ہے کہ دنیا میں گائے اور بکروں کی تعداد بہ نسبت کتے بلی کے زیادہ ہے۔ جب سے ہندوستان میں گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگی ہے اس وقت سے وہاں گائے کی پیداوار اسی نسبت سے گھٹ گئی ہے، ورنہ ہر بستی اور ہر گھر گایوں سے بھرا ہوا ہوتا جو ذبح نہ ہونے کے سبب بچی رہیں۔

عرب نے جب سے سواری اور بار برداری میں اونٹوں سے کام لینا کم کر دیا وہاں

اونٹوں کی پیداوار بھی گھٹ گئی، اس سے اس ملحدانہ شبہ کا ازالہ ہو گیا، جو احکام قربانی کے مقابلہ میں اقتصادی اور معاشی تنگی کا اندیشہ پیش کر کے کیا جاتا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهْلُوا لِي يَا كَرُمٌ

اور جس دن جمع کرے گا ان سب کو پھر کے گا فرشتوں کو کیا یہ لوگ تم کو پوجا

کائنوا یعبدون ﴿۳۰﴾ قَالُوا سُبْحٰنَكَ أَنْتَ وَلِيْنَا مِنْ دُونِهِمْ

کرتے تھے ؟ وہ کہیں گے پاک ذات، تیری ہم تیری طرف میں ہیں ان کی طرف میں نہیں

بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ ﴿۳۱﴾ قَالِيَوْمَ

پر پوجتے تھے جنوں کو یہ اکثر انہی پر اعتقاد رکھتے تھے۔ سو آج تم

لَا يَسْئَلُكُمْ لِبَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ نَفَعًا وَلَا ضَرًّا وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا

مالک نہیں ایک دوسرے کے بھلے کے نہ بُرے کے، اور کہیں گے ہم اُن گنہگاروں کو

ذُرْقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿۳۲﴾

چھو تکلیف اس آگ کی جسکو تم جھوٹ بتلاتے تھے۔

## خلاصہ تفسیر

اور وہ دن قابل ذکر ہے، جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو (میدان قیامت میں) جمع فرمائے گا، پھر فرشتوں سے ارشاد فرمائے گا کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کیا کرتے تھے (ملائکہ سے یہ سوال مشرکین کو لا جواب کرنے کے لئے ہوگا، جو ملائکہ اور غیر الملائکہ کو اس خیال سے پوجتے تھے کہ یہ راضی ہو کر ہماری شفاعت کریں گے، جیسے ایک آیت میں اسی طرح کا سوال حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا ہے، اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ - مطلب سوال کا یہ ہے کہ کیا تمہاری رضا سے تمہاری عبادت کیا کرتے تھے، و نیز جواب میں بھی اسی قید کا قرینہ ہے جیسا ترجمہ جواب معلوم ہوگا) وہ (اولیٰ حق تعالیٰ کا شریک سے بالاتر اور پاک ہونا ظاہر کرنے کے لئے، عرض کریں گے کہ آپ (شریک سے) پاک ہیں (یہ جواب پہلے اس لئے کہا گیا کہ ان کی طرف جو نسبت الی الشریک کی حکایت .... کی گئی ہے اس سے گہرا کر پہلے یہ جملے عرض کئے پھر گئے اس سوال کا جواب یہ دیں گے کہ) ہمارا تو (محض) آپ سے تعلق ہے نہ کہ ان سے (اس سے



رضا اور مردوں کی نفی ہو گئی۔ یعنی نہ ہم نے ان سے کہا نہ ہم ان کے فعل سے راضی ہم تو آپ کے مطیع ہیں جو چیز آپ کو ناپسند ہو مثل شرک وغیرہ اس سے ہم بھی ناخوش ہیں، جب اس شرک میں نہ ہمارا امر ہے نہ رضا تو فی الواقع یہ ہماری عبادت نہ کرتے تھے، بلکہ یہ لوگ شیاطین کو پوجا کرتے تھے کیونکہ شیاطین ہی اس کی ترغیب بھی دیتے تھے اور اس سے راضی بھی تھے اس لئے وہی ان کے معبود ہوئے۔ کیونکہ عبادت مستلزم ہے اطاعت مطلقہ کو کہ اس کے سامنے اور کسی کی اطاعت نہ کرے، اسی طرح ایسی اطاعت مطلقہ مستلزم ہے عبادت کو پس جب ہماری طرف سے امر و رضا محقق نہیں تو ہماری اطاعت نہ ہوئی، اور جب شیاطین کی اطاعت مطلقہ کی تو عبادت بھی درحقیقت انہی کی ہوئی، گو یہ لوگ اس کا نام کچھ ہی رکھیں، عبادت ملائکہ کہیں یا بتوں کی عبادت مگر واقع میں وہ عبادت شیاطین ہی کی ہے اور حبیباً تقریر مذکور سے ان لوگوں کا عابد شیاطین ہونا لازم آیا اسی طرح ان میں اکثر لوگ (التراما بھی) انہی (شیاطین) کے معتقد تھے (یعنی قصداً بھی بہت سے ان کو پوجتے تھے، جیسے سورۃ جن کی آیت میں ہے **وَأَن تَكُنَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ وَغَيْرِ ذَلِكَ** من الآیات) سو رکافروں سے کہا جائے گا کہ جن سے تم امیدیں رکھتے تھے (آج) خود ان کی اس برأت سے بھی اور ان کے عجز و بے بسی سے بھی تمھارے گمان کے خلاف یہ حالت ظاہر ہوئی کہ تم (مجموع عابدین و معبودین) میں سے نہ کوئی کسی کو نفع پہنچانے کا اختیار رکھتا ہے اور نہ نقصان پہنچانے کا (مطلب تو یہ ہے کہ یہ معبودین تم کو نفع نہیں پہنچا سکتے، مگر مبالغہ کے لئے **بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ** سے تعبیر فرمایا تاکہ اس ابہام سے دونوں کی برابری اس امر میں ثابت ہو جائے کہ جیسی تم عاجز ہو وہ بھی عاجز ہیں اور ضرر کا ذکر تعظیم عجز کے لئے ہے اس سے کلام اور بھی مؤکد ہو گیا) اور (اُس وقت) ہم ظالموں (یعنی کافروں) سے کہیں گے کہ جس دوزخ کے عذاب کو تم جھٹلایا کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو۔

وَإِذَا تَنَادَوْا بِدِينِ آلِ أَبِي لَهُ إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ

اور جب پڑھی جاتیں ان کے پاس ہماری آیتیں کھلی کھلی کہیں اور کچھ نہیں مگر یہ ایک مرد ہو چاہتا ہو

أَن يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ وَقَالُوا مَا هَذَا إِلَّا

کہ روک دے تم کو ان سے جن کو پوجتے رہی تمھارے باپ دادے، اور کہیں اور کچھ نہیں یہ

إِنَّكَ مُفْتَرٍ ۖ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ إِنَّ هَذَا

جھوٹ ہی باندھا ہوا ہے اور کہتے ہیں منکر حق بات کو جب پہنچے اُن تک اور کچھ نہیں یہ

إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۳۳﴾ وَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا وَمَا

ایک جادو ہے صریح - اور ہم نے دی نہیں ان کو کچھ کتابیں کہ جن کو وہ پڑھتے ہوں اور

أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَذِيرٍ ﴿۳۴﴾ وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ

بھیجا نہیں ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا - اور جھٹلایا ہے ان سے

قَبْلِهِمْ ۖ وَمَا بَلَغُوا مَعَشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۚ

انہوں نے اور یہ نہیں پہنچے دسویں حصہ کو اس کے جو ہم نے ان کو دیا تھا پھر جھٹلایا انہوں نے میرے بھیجے ہوؤں کو

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿۳۵﴾ قُلْ إِنَّمَا أَعْطِيكُمْ وَإِحْدَةً أَنْ تَقُومُوا

تو کیسا ہوا انکار میرا - تو کہہ میں تو ایک ہی نصیحت کرتا ہوں تم کو کہ اٹھ کھڑے ہو

لِللّٰهِ مَشْنٰی وَفَرَادٰی ثُمَّ تَتَفَكَّرُونَ ۚ وَمَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ ۚ

اللہ کے نام پر دودو ایک ایک پھر دھیان کرو کہ اس تمہارے رفیق کو کچھ سودا نہیں

إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ﴿۳۶﴾

یہ تو ایک ڈرانے والا ہے تم کو ایک بڑی آفت کے آنے سے -

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ إِنِ اجْتَرَىٰ إِلَّا عَلَىٰ

تو کہہ جو میں نے تم سے مانگا ہو کچھ بدلہ سودہ تم ہی رکھو میرا بدلہ ہے اُسی

اللّٰهِ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۳۷﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَقْضِي بِالْحَقِّ

اللہ پر اور اس کے سامنے ہے ہر چیز - تو کہہ میرا رب پھینک رہا ہے سچا دین

عَلَامُ الْغُيُوبِ ﴿۳۸﴾ قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِيهِ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ ﴿۳۹﴾

اور وہ جانتا ہے چھپی چیزیں - تو کہہ آیا دین سچا اور جھوٹ تو کسی چیز کو نہ پیدا کرے اور نہ پھیر کر لائے -

قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۚ وَإِنِ اهْتَدَيْتُ

تو کہہ اگر میں بہکا ہوا ہوں تو بہکوں گا اپنے ہی نقصان کو اور اگر ہوں سیدھے راستہ پر



فِي مَائِدَةٍ إِلَىٰ رَبِّي ط إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ⑤

تو اس سبب کے کہ وحی بھیجتا ہے مجھ کو میرا رب بیشک سب کچھ سنتا ہے نزدیک ہے

## خلاصہ تفسیر

اور جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں جو (حق اور ہادی ہونے کی صفت میں) صاف صاف ہیں پڑھی جاتی ہیں تو یہ لوگ (پڑھتے والے یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت) کہتے ہیں کہ (نحوہ باللہ) یہ محض ایک ایسا شخص ہے جو یوں چاہتا ہے کہ تم کو ان چیزوں (کی عبادت) سے باز رکھے جن کو (قدیم سے) تمھارے بڑے پوجتے (آ رہے) تھے اور ان سے باز رکھ کر اپنا تابع بنانا چاہتا ہے۔ مطلب ان کم بختوں کا یہ تھا کہ یہ نبی نہیں اور ان کی دعوت منجانب اللہ نہیں بلکہ اس میں خود ان کی ذاتی غرض اپنی ریاست کی ہے) اور (قرآن کی نسبت) کہتے ہیں کہ (نحوہ باللہ) یہ محض ایک تراشا ہوا جھوٹ ہے (یعنی خدا کی طرف اس کی نسبت کرنا محض تراشی ہوئی بات ہے) اور یہ کافر اس امر حق (یعنی قرآن) کی نسبت جبکہ وہ ان کے پاس پہونچا داس اعتراض کے جواب کے لئے کہ اگر یہ تراشا ہوا جھوٹ ہے تو پھر بہت سے عاقل اس کا اتباع کیوں کرتے ہیں اور یہ ایسا موثر کیوں ہے) یوں کہتے ہیں کہ یہ محض ایک صریح جادو ہے جس اس کو سن کر لوگ مغلوب العقل اور فریفتہ ہو جاتے ہیں) اور ان کو تو قرآن کی اور نبی کی بڑی قدر کرنا چاہئے تھی، کیونکہ ان کے لئے تو یہ محض غیر مترقبہ نعمتیں تھیں اس سبب کے کہ ہم نے (اس قرآن سے پہلے) ان کو کبھی آسمانی کتابیں نہیں دی تھیں کہ ان کو پڑھتے پڑھاتے ہوں جیسے بنی اسرائیل کے پاس کتابیں تھیں تو ان کے حق میں تو قرآن بالکل ایک نئی چیز تھی، اس لئے اس کی قدر کرنا چاہئے تھا) اور (اسی طرح) ہم نے آپ سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) نہیں بھیجا تھا تو ان کے حق میں نبی بھی ایک نئی دولت تھی، اس لئے ان کی بھی قدر کرنا چاہئے تھی۔ خصوصاً جبکہ علاوہ نعمتِ جدیدہ ہونے کے خود ان کی تمنا بھی تھی کہ ان کے پاس کوئی نبی آئے تو یہ اس کا اتباع کریں جیسا اس آیت میں ہے **وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَهُمْ مِنْ نَبِيٍّ لَّيَكُونُنَّ أَهْلًا مِنْ آلِهِمْ** مگر ان لوگوں نے پھر بھی قدر نہ کی، لہذا قال تعالیٰ **فَلَمَّا جَاءَهُمْ مِنْ نَبِيٍّ مَبَايَدَهُمْ إِلَّا نُفُورًا** بلکہ تکذیب کی) اور یہ لوگ تکذیب کر کے بے فکر نہ ہو بیٹھیں کیونکہ تکذیب کا وبال بڑا سخت ہے، چنانچہ ان سے پہلے جو (کافر) لوگ تھے انھوں نے (بھی انبیاء اور وحی کی) تکذیب کی تھی اور یہ (مشرکین عرب) تو اس سامان کے جو ہم نے اُن کو دے رکھا تھا دسویں

حصے کو بھی نہیں پہنچتے یعنی اُن کی سی قوت اُن کی سی عمریں اُن کی سی ثروت ان کو نہیں ملی جو کہ سرمایہ غرور اور سبب افتخار ہوتا ہے، کما قال تعالیٰ گَانُوا أَشْتَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَآكَثَرًا مَّاؤًا لَا تَزَالُ تَزِيدُهُمْ غُرُضَ الْغُرُصِ انہوں نے میرے رسول کی تکذیب کی سو (دیکھو) میرا (ان پر) کیسا عذاب ہوا سو یہ بیچارے تو کیا چیز ہیں کہ ان کے پاس تو اتنا سامان بھی نہیں جب اس قدر ثروت و دولت کام نہ آتی تو یہ کس دھوکہ میں ہیں۔ و نیز جب اُن کے پاس سامان کم ہے جو سبب غرور ہوتا ہے، تو ان کا جرم بھی اس قدر بڑھ چکا ہے کہ یہ کیسے بچ جائیں گے۔ یہاں تک انکار نبوت پر کفار کو تہدید فرما کر آگے اُن کو تصدیق نبوت کا ایک طریقہ بتلاتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ (ان سے) یہ کہتے کہ میں تم کو صرف ایک بات (مختصری) سمجھاتا ہوں راس سے واضح ہو جائے گا بس اس کو کر لو، وہ یہ کہ تم (محض) خدا کے واسطے کہ اس میں نفسانیت و تعصب نہ ہو) کھڑے (یعنی مستعد) ہو جاؤ (کسی موقع پر) دو دو اور کسی موقع پر ایک ایک (یعنی چونکہ مقصود غرور و فکر ہے جیسا آگے آتا ہے، اور فکر کا قاعدہ ہے کہ بعض اوقات اور بعض طبائع کے اعتبار سے دو کے ملنے سے ہر شخص کی فکر کو دو سرے تقویت ملتی ہے، اور بعض اوقات اور بعض طبائع کے اعتبار سے اکیلے خوب فکر میں جولانی ہوتی ہے، اور بہت زیادہ مجمع میں اکثر قوتِ فکریہ مشغوش ہو جاتی ہے، اس لئے اسی پر اکتفا فرمایا، غرض اس طرح مستعد ہو جاؤ) پھر (خوب) سوچو کہ جیسے دعوے میں کرتا ہوں مثلاً یہ کہ قرآن کا مماثل ممکن نہیں جیسے کئی مکی سورتوں میں یہ مضمون ہے ایسے دعوے دو ہی شخص کر سکتے ہیں یا تو وہ جس کے دماغ میں خلل ہو کہ انجام کی خبر نہ ہو اور یا وہ کہ جو نبی ہو جس کو پورا اعتماد اس دعوے کے صدق و من اللہ ہونے کا ہو ورنہ اگر نبی نہ ہو اور عاقل بھی ہو تو وہ ایسے دعوے کے وقت میں رسوائی سے اندیشہ کریگا، اگر اس کا مماثل بنالائے گا تو میری کیا رہ جائے گی۔ اس تردیدِ حاضر کے بعد میرے مجموعی احوال میں غور کر کے یہ سوچو کہ آیا مجھ کو جنون ہے یا نہیں، سو یہ امر مشاہدہ سے معلوم ہو جائے گا) کہ تمھارے اس ساتھی کو (جو ہر وقت تمھارے سامنے رہتا ہے اور جس کے تمام حالات تم مشاہدہ کیا کرتے ہو یعنی مجھ کو) جنون (تو) نہیں ہے (جب حصر کی دو شکوں میں سے ایک شق باطل ہو گئی تو دوسری شق متعین ہو گئی کہ) وہ (تمھارا ساتھی پیغمبر ہے اور بحیثیت پیغمبر) تم کو ایک سخت عذاب آنے سے پہلے ڈرانے والا ہے (پس اس طریق سے نبوت کا ثبوت اور اس کی تصدیق بہت آسان ہے۔ اور دوسری جگہ بھی اس کے قریب قریب مضمون ہے) کما قال لَمْ يَعْزِفُوا رَسُوْلَهُمْ الْخ، اب آگے اثباتِ نبوت کے بعد کفار کے اس شبہ کا جواب ہے کہ یہ رسول نہیں بلکہ اپنی ریاست و اقتدار کے طالب ہیں، فرماتے ہیں اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!



آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں نے تم سے اس تبلیغ پر کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تمہارا ہی رہا یعنی تم اپنے ہی پاس رکھو یہ محاورہ نفی ہے طلب اجر کی بطریق مبالغہ) میرا معاوضہ تو بس (حسب وعدہ فضل) اللہ ہی کے ذمہ ہو اور وہی ہر چیز پر اطلاع رکھنے والا ہے پس وہ آپ ہی میرے حال کے لائق مجھ کو اجر دیدیں گے معاوضہ میں مال اور جاہ یعنی ریاست سب آگیا۔ کیونکہ اعیان و اعراض دونوں میں اجر بننے کی صلاحیت ہے، مطلب یہ کہ میں تم سے کسی غرض کا طالب نہیں ہوں جو شبہ ریاست کا کیا جائے۔ رہا یہ معاملہ کہ میں لوگوں کے معاملات اور حالات کی اصلاح کرتا ہوں، مجرم کو سزا دیتا ہوں، باہمی جھگڑوں میں فیصلہ کرتا ہوں تو یہ موجب شبہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اس میں میری کوئی غرض نہیں۔ چنانچہ آپ کے طرز معاشرت اور معیشت سے صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں سے آپ نے کوئی ذاتی منفعت حاصل نہیں کی بلکہ خود قوم ہی کا نفع تھا کہ ان کی جان، مال، آبرو محفوظ رہتے تھے۔ باپ جو اپنے چھوٹے بچوں کی حفاظت اور ان کی تادیب محض خیر خواہی سے کرتا ہے اس کو خود غرضی اور طلب ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، جب نبوت بھی ثابت ہو چکی اور شبہ مقامیہ بھی دفع ہو گیا آگے اس کی نقیض کے ابطال کو اس کے اثبات پر متفرع فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب حق بات کو یعنی ایمان اور ثبوت ایمانیات کو باطل یعنی کفر اور انکار ایمانیات، غالب کر رہا ہو (محتاجہ و مکالمہ سے بھی، چنانچہ ابھی دیکھا اور مقاتلہ اور مصارمہ کا بھی سامان کرنے والا ہے، غرض ہر طرح حق غالب ہو اور وہ علام الغیوب ہو) اس کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ حق غالب ہوگا اور دن کو تو اب وقوع کے بعد معلوم ہوا اور اسی طرح اس کو معلوم ہو کہ آئندہ غلبہ بڑھے گا۔ چنانچہ فتح مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اگلی آیت کو پڑھنا کما رواہ ابن کثیر عن اشیخین وغیرہما قرینہ ہے کہ اس مضمون میں جو غلبہ کی خبر دی گئی ہے اس میں غلبہ بالسیف بھی داخل ہے۔ آگے اسی مضمون کی زیادہ توضیح کے لئے ارشاد ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کہہ دیجئے کہ (دین) حق آگیا اور (دین) باطل نہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا (یعنی محض گیا گذرا ہوا) اس کا یہ مطلب نہیں کہ اہل باطل کو کبھی شوکت و قوت حاصل نہ ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے اس دین حق کے آنے سے پہلے کبھی باطل پر شبہ حق ہونے کا ہو جایا کرتا تھا اب باطل اس صفت کی حیثیت سے بالکل نیست و نابود ہو گیا۔ یعنی اس کا بطلان خوب ظاہر ہو گیا، اور ہمیشہ قرب قیامت تک یوں ہی ظاہر رہے گا، آگے حق بات کے ثابت اور واضح ہو جانے کے بعد نجات کا اس کے اتباع میں منحصر ہونا بیان فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جب اس دین کا حق ہونا ثابت ہو گیا

تو اس سے یہ بھی لازم آگیا کہ اگر بالفرض میں اس حق کو چھوڑ کر، گمراہ ہو جاؤں تو میری گمراہی مجھ ہی کو بال ہوگی (دوسروں کا کیا ضروری) اور اگر میں اس حق کا اتباع کر کے (راہِ راست) پر رہوں تو یہ بدولت اس قرآن (اور دین) کے ہے جس کو میرا رب میرے پاس بھیج رہا ہے (اصل مقصود مخاطبین کو سنانا ہے کہ باوجود وضوح کے اگر تم نے حق کا اتباع نہ کیا تو تم بھگتو گے میرا کیا بھڑے گا اور اگر راہ پر آگئے تو یہ راہ پر آنا اسی دین حق کے اتباع کی بدولت ہو گا پس تم کو چاہئے کہ راہِ راست پر آنے کے لئے اس دین کو اختیار کرو اور گمراہ ہونا کسی کا یا راہ پر آنا خالی نہ جائے گا کہ بے فکری کی گنجائش ہو، بلکہ ہر ایک کا حال اللہ کو معلوم ہے کیونکہ وہ سب کچھ سنتا (اور) بہت نزدیک ہے (وہ ہر ایک کو اس کے مناسب جزا دے گا)۔

## معارف و مسائل

وَمَا يَلْعَنُوا مِثْرًا مَّا أَتَيْنَاهُمْ ، لفظ معشار بعض نے بمعنی عشر کہا ہے۔ یعنی دسواں حصہ اور بعض علماء نے عشر العشر یعنی سوواں حصہ اور بعض نے عشر العشر یعنی ہزارویں حصہ کو معشار کہا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس لفظ میں بہ نسبت عشر کے مبالغہ ہے۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ دنیا کی ثروت و دولت و حکومت اور عمر طویل اور صحت قوت وغیرہ جو پچھلی امتوں کو دی گئی تھی اہل مکہ کو اس کا دسواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی حاصل نہیں، اس لئے ان کو چاہئے کہ ان پچھلی اقوام کے حالات اور انجامِ بد سے عبرت حاصل کریں کہ وہ لوگ رسولوں کی تکذیب کر کے خدا تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہوئے اور وہ عذاب آگیا تو ان کی قوت و شجاعت اور مال و دولت اور محفوظ قلعے کچھ کام نہ آ سکے۔

سفارِ مکہ کو دعوت | اِنَّمَا اَعْطٰكُمْ بِوَاحِدَةٍ ، اس میں اہل مکہ پر حجت تمام کرنے کے لئے ان کو تحقیق حق کا ایک مختصر رہتہ بتلایا گیا ہے کہ صرف ایک کام کر لو کہ اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ دو دو اور ایک ایک اللہ کیلئے کھڑے ہوئے مراد جیسی کھڑا ہوا نہیں کہ بیٹھے یا لیٹے ہوئے آٹھ کھڑا ہو جائے، بلکہ اس سے مراد محاورہ کے مطابق کام کا پورا اہتمام کرنا ہے۔ اور یہاں قیام کے ساتھ لفظ اللہ بڑھا کر یہ بتلانا منظور ہے کہ خالص اللہ کے راضی کرنے کے لئے پچھلے خیالات و عقائد سے خالی الذہن ہو کر حق کی تلاش میں لگو تا کہ پچھلے خیالات اور اعمال قبول حق کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ اور دو دو یا ایک ایک میں کوئی عدد خاص مقصود نہیں، مطلب یہ ہے کہ غور کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں، ایک خلوت و تنہائی میں خود غور کرنا، دوسرا اپنے احباب و اکابر سے مشورہ اور باہم بحث و تحقیق کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ ان دونوں طریقوں کو یا ان میں سے جو پسند ہو اس کو اختیار کرو۔



ثُمَّ تَفَكَّرُوا ۱، اس جملہ کا عطف اَنْ تَفَكَّرُوا پر ہو جس میں قیام کے مقصد کو واضح کیا گیا ہے کہ سب خیالات سے خالی الذہن ہو کر خالص اللہ کے لئے اس کام کے واسطے تیار ہو جاؤ کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں غور و فکر سے کام لو کہ حق ہے یا نہیں خواہ یہ غور و فکر تنہا تنہا کر دیا دوسروں کے ساتھ مشورہ اور بحث و تمحیص کے ساتھ۔

آگے اس غور و فکر کی ایک واضح راہ بتلائی گئی۔ وہ یہ کہ ایک اکیلا آدمی جس کے ساتھ نہ کوئی طاقتور جہت اور جماعت ہے نہ مال و دولت کی بہتات وہ اپنی پوری قوم بلکہ پوری دنیا کے خلاف کسی ایسے عقیدہ کا اعلان کرے جو صدیوں سے ان میں راسخ ہو چکا ہے اور وہ سب اس پر متفق ہیں، ایسا اعلان صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کہنے والا بالکل مجنون دیوانہ ہو جو اپنے نفع نقصان کو نہ سوچے اور پوری قوم کو اپنا دشمن بنا کر مصائب کو دعوت دے، دوسرے یہ کہ اس کی وہ بات سچی ہو کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہے، اس کے حکم کی تعمیل میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔

اب ہم خالی الذہن ہو کر اس میں غور کر دے کہ ان دونوں باتوں میں کونسی بات واقع میں ہے۔ اس طریقے سے غور کر دے تو تمہیں اس یقین کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا کہ یہ دیوانے اور مجنون نہیں ہو سکتے ان کی عقل و دانش اور کردار و عمل سے سارا کلمہ اور سب قرینہ واقف ہیں۔ ان کی عمر کے چالیس سال اپنی قوم کے درمیان گزرے، بچپن سے جوانی تک کے سارے حالات ان کے سامنے ہیں کبھی کسی نے ان کے کسی قول و فعل کو عقل و دانش اور سنجیدگی و شرافت کے خلاف نہیں پایا، اور صرف ایک کلمہ لا الہ الا اللہ جس کی یہ دعوت دیتے ہیں اس کے سوا آج بھی کسی کو ان کے کسی قول و فعل پر یہ گمان نہیں ہو سکتا، کہ یہ عقل و دانش کے خلاف ہے۔ ان حالات میں یہ تو ظاہر ہو گیا کہ یہ مجنون نہیں ہو سکتے، اسی کا اظہار آیت کے اگلے جملے میں اس طرح فرمایا: مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اس میں لفظ صَاحِبُكُمْ سے اس طرف اشارہ ہے کہ کوئی اجنبی مسافر باہر سے آجائے جس کے حالات معلوم نہ ہوں، اس کی کوئی بات پوری قوم کے خلاف سمجھیں تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ دیوانہ ہے، لیکن یہ تو تمہارے شہر کے رہنے والے تمہاری برادری سے اور دن رات کے تمہارے ساتھی ہیں، جن کی کوئی حالت و کیفیت تم سے مخفی نہیں، اور تم نے بھی کبھی اس سے پہلے ان پر اس طرح کا کوئی مشبہ نہیں کیا۔

اور جب پہلی صورت کا نہ ہونا واضح ہو گیا تو دوسری صورت متعین ہو گئی، جس کا ذکر آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے، اِنْ هُوَ اِلَّا ذِیْ یُرِیْكُمْ بَیِّنَاتٍ مِّنْ اٰیٰتِہِ عِنْدَ اٰیٰتِہِ عَذَابٍ شَدِیْدٍ یعنی آپ کا حال اس کے سوا نہیں کہ وہ لوگوں کو قیامت کے آنے والے عذاب شدید سے بچانے

کے لئے اس سے ڈرانے والے ہیں۔

إِنَّ رَبِّي يَقَوِّتُ بِالْحَقِّ عِلَامُ الْغُيُوبِ، یعنی میرا پروردگار جو علام الغیوب ہے وہ حق کو باطل پر مٹے مارتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باطل پاش پاش ہو جاتا ہے، مکا قال تعالیٰ فَإِذَا هُوَ رَاهِقٌ، لفظ قَوِّتُ کے لغوی معنی پھینک مارنے کے ہیں، یہاں باطل کے مقابلہ میں حق کو پیش کرنا مراد ہے، اور لفظ يَقَوِّتُ سے تعبیر کرنے میں شاید یہ حکمت ہو کہ باطل پر حق کی زد پڑنے کا اثر بتلانا مقصود ہو۔ یہ ایک تمثیل ہے کہ جس طرح کوئی بھاری چیز کسی نازک چیز پر پھینک دی جائے تو وہ چیز پاش پاش ہو جاتی ہے، اسی طرح حق کے مقابلہ میں باطل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اسی لئے آگے فرمایا وَمَا يُبْدِيَنَّ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ، یعنی حق کے مقابلہ میں باطل ایسا پست و ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ وہ کسی چیز کی ابتداء کرنے کے قابل نہیں رہتا نہ دوبارہ ٹوٹانے کے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فَرَغُوا فَلَا قُوَّةَ وَاتَّخَذُوا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ۝۵۱

اور کبھی تو دیکھے جب یہ گھبرائیں پھر نہ بچیں بھاگ کر اور پکڑے ہوئے آئیں نزدیک جگہ سے

وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ وَأَنَّىٰ لَهُمُ التَّنَازُلُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ۝۵۲ وَقَدْ

اور کہنے لگیں ہم نے اس کو یقیناً لیا اور اب کہاں ان کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے بعید جگہ سے۔ اور اس سے

كَفَرُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ وَيَقْنُ فُؤَادُ الْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ۝۵۳

منکر رہی پہلے سے، اور پھینکتے رہے بن دیکھے نشانے پر دور کی جگہ سے۔

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ مِّنْ

اور رکاوٹ پڑ گئی ان میں اور ان کی آرزو میں جیسا کہ کیا گیا ہو ان کے طریقہ والوں کے ساتھ

قَبْلُ مَا كَانُوا فِي شَكٍّ مَُّرِيبٍ ۝۵۴

اس سے پہلے وہ لوگ تھے ایسے تردد میں جو چین نہ لینے دے

## خلاصہ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ وہ وقت ملاحظہ کریں (تو آپ کو حیرت ہو)



جب یہ کفار (قیامت کے ہول و ہیبت) گھبرائے پھر بچے پھر نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور پاس کے پاس ہی سے (یعنی فوراً) پکڑ لئے جائیں گے اور (اس وقت) کہیں گے کہ ہم اس حق پر ایمان لے آئے (اور جن لوگوں اس میں مبتلا ہو گئے ہیں سب کو مان لیا اس لئے ہماری توبہ قبول کر لیجئے خواہ دوبارہ دنیا میں بھیج کر یا بغیر بھیجے ہوئے) اور تمی و درجہ کو دیا گیا، انکے ہاتھ آنا کہا ممکن ہے (یعنی ایمان لانیسی جگہ پر جو دارالعمل ہونیکے دنیا تھی جو بڑی دور ہوگئی، اب آخرت کا عالم ہے جو دارالعمل نہیں دارالجزا، یہی اس میں ایمان مقبول نہیں کیونکہ اب جو ایمان ہوگا وہ ایمان بالغیب نہیں بلکہ مشاہدہ کے بعد ہے، مشاہدہ کے بعد کسی چیز کا اقرار کرنا تو طبعی امر ہے، اس میں اطاعت حکم کا کوئی پہلو نہیں) حالانکہ پہلے سے (دنیا میں) یہ لوگ اس حق کا انکار کرتے رہے اور ان کا انکار بھی ایسا جس کا کوئی صحیح منشاء نہ تھا بلکہ بے تحقیق باتیں دور ہی دور سے ہانکا کرتے تھے، (دور کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تحقیق سے دور تھے، یعنی دنیا میں تو کفر کرتے رہے اب ایمان سو بھا ہے، اور اس کے مقبول ہونے کی آرزو ہے) اور چونکہ آخرت دارالعمل نہیں ہے اس لئے ان میں اور ان کے (قبول ایمان کی) آرزو میں ایک آڑ کر دی جائے گی (یعنی ان کی آرزو پوری نہ ہوگی، جیسا کہ ان کے ہم مشربوں کے ساتھ (بھی) یہی رہتاؤ) کیا جائے گا جو ان سے پہلے (کفر کر چکے) تھے، یہ سب بڑے شک میں تھے جس نے ان کو تر و دو میں ڈال رکھا تھا۔

## معارف و مسائل

وَأَخِذُوا مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ، اکثر مفسرین کے نزدیک یہ حال روز حشر کا ہے کہ کفار و فجار گھبرا کر بھاگنا چاہیں گے تو چھوٹ نہ سکیں گے۔ اور یہ بھی نہ ہوگا جیسے دنیا میں کوئی مجرم بھاگ جائے تو اس کو تلاش کرنا پڑتا ہے، بلکہ سب کے سب اپنی ہی جگہ میں گرفتار کر لئے جائیں گے کسی کو بھاگ نکلنے کا موقع نہ ملے گا۔ بعض حضرات نے اس کو وقت نزع اور موت کا حال قرار دیا ہے، کہ جب موت کا وقت آجائے گا اور ان پر گھبراہٹ طاری ہوگی تو فرشتوں کے ہاتھ سے چھوٹ نہ سکیں گے، اور وہیں اپنی جگہ سے رُوح قبض کر کے پکڑ لئے جائیں گے۔

وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ وَآتَىٰ لَهُمُ التَّنَادُ شُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ، تنادش کے معنی ہاتھ بڑھا کر کسی چیز کو اٹھا لینے کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ہاتھ بڑھا کر وہی چیز اٹھائی جاسکتی ہے جو بہت دور نہ ہو ہاتھ وہاں تک پہنچ سکے۔ مضمون آیت کا یہ ہے کہ کفار و منکرین قیامت کے روز حقیقت سامنے آجانے کے بعد کہیں گے ہم قرآن پر یا رسول پر ایمان لے آئے، مگر ان کو معلوم نہیں کہ ایمان کا مقام ان سے بہت دور ہو چکا ہے۔ کیونکہ ایمان صرف دنیا کی

زندگی کا مقبول ہو، آخرت دار العمل نہیں وہاں کا کوئی عمل حساب میں نہیں آ سکتا۔ اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ دولتِ ایمان کو ہاتھ بڑھا کر اٹھالیں۔

وَقَدْ كَفَرُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ وَيَقْذِفُونَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بُعِيدٍ، قَذْفُ کے معنی کوئی چیز پھینک کر مارنے کے آتے ہیں۔ عرب کا محاورہ ہے کہ جو شخص بلا دلیل محض اپنے خیال سے باتیں کرتا ہے اس کو رجم بالغیب اور قذف بالغیب کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، کہ یہ اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں جس کا کوئی نشانہ نہیں ہوتا، اور یہاں مِنْ مَّكَانٍ بُعِيدٍ کے الفاظ سے مراد یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں ان کے دلوں سے دور ہوتا ہے دل میں اس کا عقیدہ نہیں رکھتے۔

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ، یعنی ان لوگوں کو جو چیز محبوب اور مقصود تھی ان کے اور اس چیز کے درمیان پردہ حائل کر کے ان کو محروم کر دیا گیا۔ یہ مضمون قیامت کے حال پر بھی صادق ہے کہ قیامت میں یہ لوگ نجات اور جنت کے طالب ہوں گے وہاں تک نہ پہنچ سکیں گے اور دنیا میں وقت موت پر بھی صادق ہے کہ دنیا میں ان کو یہاں کی دولت و سامان مقصود تھا موت نے ان کے اس مطلوب کے درمیان حائل ہو کر ان کو اس سے جدا کر دیا۔

كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ، اشیاء شیعہ کی جمع ہے، کسی شخص کے تابع اور بحیال کو اس کا شیعہ کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو عذاب ان کو دیا گیا کہ اپنے مطلوب محبوب سے محروم کر دیئے گئے، یہی عذاب اس سے پہلے انہی جیسے اعمالِ کفر کرنے والوں کو دیا جا چکا ہے۔ کیونکہ یہ سب لوگ شک میں پڑے ہوئے تھے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کے کلامِ الہی ہونے پر ان کو یقین و ایمان نہیں تھا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

تَمَّتْ سُورَةُ سَبْأٍ بِالْحَمْدِ لِلَّهِ

لَا خَيْرَ يَوْمٍ مِنَ الْمَحْرَمِ الْحَرَامِ ۱۳۹۲ھ



## سُورَةُ فَاطِرٍ

سُورَةُ فَاطِرٍ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانِيَةٌ وَأَرْبَعُونَ آيَةً وَخَمْسُونَ رُكُوعًا

سورۃ فاطر مکہ میں نازل ہوئی اس میں پینتالیس آیتیں ہیں اور پانچ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَكَةِ

سب خوبی اللہ کو ہی جس نے بنا نکالے آسمان اور زمین جس نے ٹھہرایا فرشتوں کو

رُسُلًا أُولَىٰ أَجْنَحَةٍ مِّثْنَىٰ وَثَلَاثَ وَرُبْعَ طَيْرٍ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ

پیغام لانے والے جن کے پر ہیں دو دو اور تین تین اور چار چار، بڑھاتا ہی پیدا کس میں

مَا يَشَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ① مَا يَفْعَلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ

جو چاہے، بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے ۔ جو کچھ کہہ لے اللہ لوگوں پر

مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا هُمْسِيكَ لَهَابٌ وَمَا يُنَسِّكُ فَلَا مَرْسِلَ لَهُ

رحمت میں سے تو کوئی نہیں اس کو روکنے والا اور جو کچھ روک رکھے تو کوئی نہیں اس کو بھیجنے والا

مِنْ بَعْدِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ② يَا أَيُّهَا النَّاسُ ارْكَعُوا

اس کے سوائے اور وہی ہی زبردست حکمتوں والا ۔ اے لوگو! یاد کرو

نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ

احسان اللہ کا اپنے اوپر، کیا کوئی ہے بنانے والا اللہ کے سوائے روزی دیتا ہو تم کو

مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَىٰ تَوَفَّاكَ ③

آسمان سے اور زمین سے کوئی حاکم نہیں مگر وہ پھر کہاں اُٹھ جاتے ہو ۔

## خلاصہ تفسیر

تمام تر حمد و ثناء اسی (اللہ کو لائق ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، جو فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے جن کے دود و اور تین تین اور چار چار پر دار بازو ہیں (پیغام سے مراد انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی لانا ہے خواہ وہ شرائع احکام سے متعلق ہو یا محض بشارت وغیرہ سے، اور بازوؤں کی تعداد کچھ چار چار ہی میں منحصر نہیں بلکہ) وہ پیدائش میں جو چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے یہاں تک بعض فرشتوں کے چھ سو بازو پیدا کرتے ہیں جیسا حدیث میں حضرت جبریل کے متعلق آیا ہے) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (اور قادر بھی ایسا جس کا کوئی مزاحم نہیں کہ وہ) اللہ جو رحمت لوگوں کے لئے کھول دے (مثلاً بارش، نباتات اور عام رزق) تو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس کو بند کرتے تو اس کے (بند کرنے کے) بعد اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں (البتہ وہ خود ہی بند و کشادہ کر سکتا ہے) اور وہی غالب (یعنی قادر اور) حکمت والا ہے (یعنی کھولنے اور بند کرنے پر قادر بھی ہو اور بند و کشادہ ہمیشہ حکمت کے ساتھ ہوتی ہے) اے لوگو! جیسے اس کی قدرت کامل ہے اسی طرح اس کی نعمت بھی کامل ہے، اس کی نعمتوں کی کوئی شمار نہیں، اس لئے تم پر جو اللہ کے احسانا ہیں ان کو یاد کرو اور ان کا شکر ادا کرو اور وہ شکر یہ ہے کہ توحید اختیار کرو شرک چھوڑو کم از کم اس کی دو بڑی نعمتوں میں غور کرو جو مخلوقات کی ایجاد پھر ان کو باقی اور قائم رکھنا ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق ہے جو تم کو آسمان و زمین سے رزق پہنچاتا ہو (یعنی اس کے سوا نہ کوئی تخلیق و ایجاد کر سکتا ہے اور نہ کوئی ایجاد کردہ کو باقی اور قائم رکھنے کے لئے رزق پہنچانے کا کام کر سکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ ہر طرح کامل ہے تو یقیناً) اس کے سوا کوئی لائق عبادت (بھی) نہیں تو رجب مجبور ہونا اسی کا حق ہے تو تم (شرک کر کے) کہاں اُلٹے جا رہے ہو۔

## معارف و مسائل

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا، فرشتوں کو رسول یعنی اللہ تعالیٰ کا پیغام اور احکام پہنچانے والا بنانے کا مطلب ظاہر یہ ہے کہ ان کو انبیاء علیہم السلام کی طرف اللہ کا قصد و رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے وہ اللہ کی وحی اور احکام ان کو پہنچاتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول سے مراد اس جگہ واسطہ ہو اللہ تعالیٰ اور اس کی عام مخلوقات کے درمیان



جن میں انبیاء علیہم السلام سب افضل و اعلیٰ ہیں، ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان بھی وحی کا واسطہ بنتے ہیں، اور مخلوقات تک اللہ تعالیٰ کی رحمت یا عذاب پہنچانے کا بھی واسطہ فرشتے ہی ہوتے ہیں۔  
 اَوْ لٰی اَاجِیْنَحَیْ مُمْتَنٰی وَ ثَلَاثَ دُرِّبَاۗعٍ ، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پُرولے بازو عطا فرمائے ہیں، جن سے وہ اڑ سکتے ہیں حکمت اس کی ظاہر ہے کہ وہ آسمان سے زمین تک کی مسافت بار بار طے کرتے ہیں، یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کو سرعۃ سیر کی قوت عطا کی جائے اور وہ اڑنے کی صورت میں ہوتی ہے۔

اور لفظ مُمْتَنٰی وَ ثَلَاثَ دُرِّبَاۗعٍ ، ظاہر یہ ہے کہ آجحہ کی صفت ہے کہ فرشتوں کے پر مختلف تعداد پر مشتمل ہیں۔ بعض کے صرف دو د پر ہیں بعض کے تین تین بعض کے چار چار اور اس میں کوئی حصر نہیں، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث سے جبریل علیہ السلام کے چھ سو پر ہونا ثابت ہوتا ہے، بطور تمثیل کے چار تک ذکر کر دیا گیا ہے (قرطبی، ابن کثیر) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ مُمْتَنٰی وَ ثَلَاثَ دُرِّبَاۗعٍ کی صفت ہو یعنی یہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالات دنیا میں پہنچاتے ہیں، کبھی دو دو آتے ہیں کبھی تین تین یا چار چار، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی چار کا عدد حصر کے لئے نہیں، محض تمثیل کے طور پر ہے، کیونکہ اس سے بہت زیادہ مقدار میں فرشتوں کا نزول خود قرآن کریم سے ثابت ہے (ابو حیان فی البحر المحیط)

یٰۤاٰیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرٰکُوْنَ ، یعنی اللہ تعالیٰ کو سب اختیار ہے کہ اپنی مخلوقات کی تخلیق میں جتنی چاہے اور جس قسم کی چاہے زیادتی کرے۔ اس کا تعلق بظاہر تو آجحہ ہی کے ساتھ ہے، کہ فرشتوں کے پر دو بازو کچھ دو چار میں منحصر نہیں، اللہ تعالیٰ چاہے تو اس سے بہت زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اکثر مفسرین کا قول یہی ہے، اور زہری، قتادہ وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس زیادتِ خلق سے عام معنی مراد ہیں، جس میں فرشتوں کے پر دو بازو کی زیادتی بھی شامل ہے، اور مختلف انسانوں کی تخلیق میں خاص خاص صفات کی زیادتی بھی۔ جس میں حسن صورت، حسن سیرت، حسن صوت وغیرہ سب داخل ہیں۔ ابو حیان نے بحر محیط میں اسی کو اختیار کر کے فرمایا ہے کہ اس زیادتِ خلق میں حسنِ خلق، حسن صوت اور حسن خط اور حسن صورت کمال عقل و علم، شیریں کلامی وغیرہ سب داخل ہیں۔ اس دوسری تفسیر سے ثابت ہوا کہ کسی چیز کا بھی حسن کمال جو انسان کو حاصل ہو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور نعمت ہے، اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

مَا یَفْتَحُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ فَلَا تُحِسُّۢہَا ، یہاں لفظ رحمت عام ہے اس میں دینی اور اخروی نعمتیں داخل ہیں، جیسے ایمان اور علم اور عمل صالح اور نبوت و

ولایت وغیرہ اور دنیوی نعمتیں بھی، جیسے رزق اور اسباب اور آرام و راحت اور صحت و تندرستی اور مال و عزت وغیرہ۔ معنی آیت کے ظاہر میں اللہ تعالیٰ جس شخص کے لئے اپنی رحمت کھولنے کا ارادہ کرے اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔

اسی طرح دوسرا جملہ مَا يُمْسِكُ عام ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ روکتا ہے اس کو کوئی کھول نہیں سکتا۔ اس میں دنیا کے مصائب و آلام بھی داخل ہیں، کہ جب اللہ ان کو اپنے کسی بندے سے روکنا چاہیں تو کسی کی مجال نہیں کہ ان کو کوئی گزند و مصیبت پہنچائے اور اس میں رحمت بھی داخل ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی کسی حکمت سے کسی شخص کو رحمت سے محروم کرنا چاہیں تو کسی کی مجال نہیں کہ اس کو روک سکے (ابو حیان)

اسی مضمون آیت کے متعلق ایک حدیث اس طرح آتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے عامل (گورنر) کو فہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو خط لکھا کہ مجھے کوئی حدیث لکھ کر بھیجو جو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ حضرت مغیرہؓ نے اپنے میر منشی رواد کو بلا کر لکھوایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس وقت جبکہ آپ نماز سے فارغ ہوئے یہ کلمات پڑھتے ہوئے سنا اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِي لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَنَّةِ مِنْكَ الْجَدُّ (یعنی یا اللہ جو چیز آپ کسی کو عطا فرمادیں اس کا کوئی روکنے والا نہیں، اور جب کو آپ روکیں اس کو کوئی دینے والا نہیں، آپ کے ارادے کے خلاف کسی کوشش کرنے والے کی کوشش نہیں چلتی) (ابن کثیر از مسند احمد)

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت یہ ہے کہ یہ کلمہ آپ نے رکوع سے سر اٹھانے کے وقت فرمایا اور اس کلمہ سے پہلے فرمایا اَحَقُّ مَا قَالِ الْمُحِبُّ وَكُنَّا لَكَ، یعنی یہ کلمہ ان تمام کلمات میں جو کوئی بندہ کہہ سکتا ہے سب زیادہ اَحَقُّ اور مقدم و اعلیٰ ہی اللہ پر توکل و اعتماد سارے آیت مذکورہ نے انسان کو جو سبق دیا ہے کہ غیر اللہ سے نفع و ضرر کی مصائب نجات ہے۔ کی امید و خوف نہ رکھے، صرف اللہ تعالیٰ کی طرف نظر رکھے۔ دین و دنیا کی درستی اور دائمی راحت کا نسخہ اکسیر ہے، اور انسان کو ہزاروں غموں اور فکروں سے نجات دینے والا ہے (روح)

حضرت عامر بن عبد قیسؓ نے فرمایا کہ جب میں صبح کو چار آیتیں قرآن کریم کی پڑھ لوں تو مجھے یہ فکر نہیں رہتی صبح کو کیا ہوگا شام کو کیا، وہ آیتیں یہ ہیں۔ ایک یہی آیت مَا يَفْتَحُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَتِهِ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكُ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ دوسری آیت اسی کے ہم معنی یہ ہے اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ...



إِلَّا هُوَ، وَإِنْ يُرِيدْ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ، تيسری آیت سے جعلُ اللہ بعد عسی  
یسراً، چوتھی و پانچویں آیتیں فی الارض الا علی اللہ رزقہا (اخراجہ ابن المنذر، ۲۷)

اور حضرت ابو ہریرہؓ جب بارش ہوتے دیکھتے تو فرمایا کرتے تھے مَطَرٌ نَا بِنُوعِ الْفَتْحِ  
اور پھر آیت مَا يَفْتَحُ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ طرہتے تھے۔ یہ عرب کے باطل خیالات کی تردید ہے،  
جو بارش کو خاص خاص ستاروں کی طرف منسوب کر کے کہا کرتے کہ ہمیں یہ بارش فلاں ستارے  
کی وجہ سے ملی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ بارش آیت فتح سے ملی ہے۔ مراد  
آیت فتح سے یہی مذکورہ آیت ہے جس کو وہ ایسے وقت تلاوت فرمایا کرتے (رواہ مالک فی الموطا)

وَإِنْ يَكُنْ بُوْلُكَ فَقَدْ كَذَّبْتَ رَسُولٌ مِّنْ قَبْلِكَ ط وَاللّٰهُ تَرْجَمُ

اور اگر تجھ کو بھٹلائیں تو بھٹلائے گئے کتنے رسول تجھ سے پہلے اور اللہ تک پہنچتے ہیں

الْأُمُورُ ۝ يٰۤأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا وَعَدَ اللّٰهُ حَقًّا فَلَا تَغُرُّكُمْ

سب کام۔ اے لوگو! بیشک اللہ کا وعدہ تمہارے سونے بہکتے تم کو

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا تَفَرُّ وَلَا يَغُرُّكُمْ بِاللّٰهِ الْغُرُورُ ۝ اِنَّ الشَّيْطٰنَ

دنیا کی زندگی گمان اور نہ دغا دے تم کو اللہ کے نام سے وہ دغا باز۔ تحقیق شیطان

تَكُمُّ عَدُوًّا فَاتَّخِذْ وَّكَاءً وَّ اِنَّا لَنَسَآئِدٌ عٰوَا حِزْبٍ لَّيْكُوْنُوْا

تمہارا دشمن ہے سو تم بھی سمجھ رکھو اس کو دشمن، وہ تو بلاتا ہے اپنی گروہ کو اس واسطے کہ ہوں

مِّنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝

دوزخ والوں میں، جو منکر ہوئے ان کو سخت عذاب ہے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝

اور جو یقین لائے اور کئے بھلے کام ان کے لئے ہے معافی اور بڑا ثواب۔

اَفَمَنْ زَيْنَ لَهُ سُوْءُ عَمَلِهٖ قَرِاٰ حَسَنًا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ

بھلا ایک شخص کہ بھلی سمجھائی گئی اس کو اس کے کام کی بُرائی، پھر دیکھا اس کو بھلا، کیونکہ اللہ بھٹکاتا ہے

مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ فَلَا تَدْرِيْ نَفْسٌ

جس کو چاہے اور بھٹاتا ہے جس کو چاہے، سو تیرا جی نہ جانتا رہے

عَلَيْهِمْ حَسْرَاتٌ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ﴿۸﴾

ان پر بچتا بچتا کر، اللہ کو معلوم ہے جو کچھ کرتے ہیں۔

## خلاصہ تفسیر

اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ لوگ (در بارۃ توحید و رسالت وغیرہ) آپ کو جھٹلائیں تو آپ غم نہ کریں کیونکہ آپ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر جھٹلاتے جا چکے ہیں، (ایک تو اس سے تسلی حاصل کیجئے) اور (دوسری بات یہ کہ) سب امور اللہ ہی کے روبرو پیش کئے جاویں گے (وہ خود سب سے سمجھ لے گا) آپ کیوں فکر میں پڑے۔ آگے عام لوگوں کو خطاب ہے کہ اے لوگو! اللہ تَرْجِیْحُ الْأُمُورِ جس میں قیامت کی خبر ہے اس کو سن کر تعجب و استبعاد مت کرنا، اللہ تعالیٰ کا دیہ (عدہ ضرور سچا ہے، سو ایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی زندگی تم کو دھوکہ میں ڈالے رکھے) کہ اس میں منہمک ہو کر اس یوم موعود سے غافل رہو) اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں ڈال دے کہ تم اس کے اس بہکانے میں نہ آ جاؤ کہ اللہ تعالیٰ تم کو عذاب نہ دے گا جیسا کہ کہا کرتے تھے وَ لَئِنْ رُجِیْتُ إِلَى رَبِّیْ إِنَّ لَیْ عِنْدَهُ لَلْحُكْمَ اور یہ شیطان (جس کے دھوکہ کا اوپر ذکر ہے) بیشک تمہارا دشمن ہے سو تم اس کو (اپنا) دشمن (ہی) سمجھتے رہو وہ تو اپنے گروہ کو (یعنی اپنے متبعین کو) محض اس لئے (باطل کی طرف) بلاتا ہے تاکہ وہ لوگ دوزخیوں میں سے

ہو جاویں پس جو لوگ کافر ہو گئے (اور اس کی دعوت و غرور میں پھنس گئے) ان کے لئے سخت عذاب ہو اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے (اور اس کی دعوت و غرور میں نہیں پھنسے) ان کے لئے (معاصی کی) بخشش اور (ایمان و عمل صالح پر) بڑا اجر ہے (اور جب کافر کا انجام شدید اور مؤمن کا انجام مغفرت و اجر کبیر ہے) تو کیا (دونوں مساوی ہو سکتے ہیں یعنی) ایسا شخص جس کو اس کا عمل بد اچھا کر کے دکھلایا گیا، پھر وہ اس کو اچھا سمجھنے لگا اور ایسا شخص جو بُرے کو بُرا سمجھتا ہے کہیں برابر ہو سکتے ہیں؟ پہلے شخص سے مراد کافر ہے جو اغواءِ شیطان سے باطل کو حق اور مضر کو نافع سمجھتا ہے، اور دوسرے شخص سے مراد مؤمن ہے جو اتباعِ انبیاء و مخالفتِ شیطان سے باطل کو باطل، حق کو حق، صار کو صار، نافع کو نافع جانتا ہے۔ یعنی دونوں برابر کہاں ہوئے بلکہ ایک جہتی اور دوسرا جہتی ہے۔ پس شیطان کے دھوکہ میں آنے والے اور اس کو دشمن سمجھنے والوں میں یہ تفاوت ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں لَا یَغْنُرْ لَکُمْ اور إِنَّ الشَّیْطَانَ لَکُمْ دَعُو، اور اگر اس پر تعجب ہو کہ عاقل آدمی بد کو نیک کیسے سمجھ لیتا ہے، سو اس کی وجہ



یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ جسکو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے (اس کی عقل اکٹی ہو جاتی، اور جسکو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے (اس کا اور اک صحیح رہتا ہے، پھر جب ہدایت و اعتدال کا اصل مدار مشیت ہی تو ان پر افسوس کر کر کے کہیں آپ کی جان نہ جاتی رہے (یعنی کچھ افسوس نہ کیجئے صبر سے بیٹھے رہیں) اللہ تعالیٰ کو ان کے کاموں کی خبر ہے (وقت پر ان سے سمجھ لے گا)۔

## معارف و مسائل

لَا يَخْشَى تَلَكُمُ بِاللَّهِ الْغَشُورَ، غرور بفتح غین مبالغہ کا صیغہ ہے، جس کے معنی ہیں بہت دھوکہ دینے والا، اور مراد اس سے شیطان ہے کہ اس کا کام ہی لوگوں کو دھوکہ میں ڈال کر کفر و معصیت میں مبتلا کرنا ہے۔ اور لَا يَخْشَى تَلَكُمُ بِاللَّهِ یعنی وہ تمہیں اللہ کے معاملہ میں دھوکہ نہ دیدے، اس دھوکہ سے مطلب یہ ہو کہ شیطان بڑے کاموں کو اچھا ثابت کر کے تمہیں اس میں مبتلا نہ کر دے اور تمہارا حال یہ ہو جائے کہ گناہ کرتے رہو اور ساتھ ہی یہ سمجھتے رہو کہ ہم اللہ کے نزدیک مقبول ہیں ہمیں عذاب نہیں ہوگا (قرطبی)

كَانَ اللَّهُ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ، امام بغوی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عہدہ کی تھی کہ یا اللہ اسلام کو عزت و قوت عطا کر دے، عمر بن خطاب کے ذریعہ یا ابو جہل کے ذریعہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے عمر بن خطاب کو ہدایت دے کر اسلام کی عزت و قوت کا سبب بنا دیا اور ابو جہل اپنی گمراہی میں رہا۔ (مظہری)

وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْتُهُ إِلَىٰ بَلَدٍ

اور اللہ ہے جس نے چلائی ہیں ہوائیں پھر وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پھر ہانک لے گئی ہم اس کو

مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ الْآرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ كَذَٰلِكَ النُّشُورُ ۙ ⑨

ایک مردہ دیس کی طرف پھر زندہ کر دیا ہم نے اس زمین کو اس کے مرجانے کے بعد اسی طرح ہو گا جی اٹھنا۔

مَنْ كَانَ يُرِيدِ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا ۚ إِلَيْهِ يَصْعَدُ

جسکو چاہئے عزت تو اللہ کے لئے ہی ساری عزت، اس کی طرف چڑھتا ہے

الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ وَالَّذِينَ

کلام ستھرا، اور کام نیک اس کو اٹھا لیتا ہے اور جو لوگ

يَمْكُرُونَ السَّيَّاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ

داؤ میں ہیں برائیوں کے اُن کے لئے سخت عذاب ہے اور ان کا داؤ ہے

هُوَ يَبُورُ ⑩ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْقَةٍ ثُمَّ

ٹوٹے کا۔ اور اللہ نے تم کو بنایا مٹی سے پھر بوند پانی سے پھر

جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا وَمَا تَحِیلُ مِنْ أَنْثَى وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلِّهِ ط

بنایا تم کو جوڑے جوڑے اور نہ پیٹ رہتا ہے کسی مادہ کو اور نہ وہ جنتی ہے بن خبر اس کے

وَمَا يَعْتَرِفُ مِنْ مُعْتَرٍ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ عُسْرَةٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ ط

اور نہ عمر پاتا ہے کوئی بڑی عمر والا اور نہ گھٹتی ہے کسی کی عمر مگر لکھا ہے کتاب میں

إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ⑪ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ تِلْكَ أَعْدَابُ

بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔ اور برابر نہیں دو دریا، یہ میٹھا ہے

فِرَاتٍ سَالِحٌ شَرَابُهُ وَهَذَا أَمِلٌ أُجَابٌ ط وَمِنْ كُلِّ

پیاس بجھاتا ہے خوشگوار اور یہ کھارا کڑوا، اور دونوں میں سے

تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حَلِيَّةً تَلْبَسُونَ هَاجًا وَتَرَى

کھاتے ہو گوشت تازہ اور نکالتے ہو گھنا جسکو پہنتے ہو اور تو دیکھے

الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاحِرٌ لِّتَبَعُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ⑫

جہازوں کو اس میں چلتے ہیں پانی کو بچاڑتے تاکہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم حق مانو،

يُوجِبُ اللَّيْلُ فِي النَّهَارِ وَيُوجِبُ النَّهَارُ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ

رات گھساتا ہے دن میں اور دن گھساتا ہے رات میں اور کام میں لگا دیا سورج

وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ

اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے ایک مقررہ وقت تک، یہ اللہ ہی تمہارا رب اسی کے لئے

الْمُلْكُ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ

بادشاہی ہے اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوائے وہ مالک نہیں کجور کی گھٹلی کے





کرنا چاہیے اور یہ چاہنا اس لئے ضروری بھی ہے کہ آخرت کا واقع ہونا امر یقینی ہے، تو اس کو چاہئے کہ اللہ سے عزت حاصل کرے کیونکہ تمام عزت بالذات خدا ہی کے لئے حاصل ہوگی اور دوسرے کے لئے جب ہوگی بالعرض ہوگی، اور بالعرض ہمیشہ بالذات کا محتاج ہوتا ہے پس اس میں سب خدا ہی کے محتاج ہوتے۔ اور خدا سے اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ قولاً و عملاً اس کی اطاعت و انقیاد اختیار کرے کہ خدا کے نزدیک یہی چیزیں پسندیدہ ہیں چنانچہ اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے، یعنی وہ اس کو قبول کرتا ہو، اور اچھا کام اس کو پہنچاتا ہو اور اچھے کلام میں کلمہ توحید اور تمام اذکار اکیہ اور اچھے کام میں تصدیق قلبی، اور جمیع اعمال صالحہ ظاہرہ و باطنہ داخل ہیں۔ تو معنی یہ ہوتے کہ کلمہ توحید اور تمام اذکار کے مقبول بنانے کا ذریعہ عمل صالح ہے۔ اور مقبولیت عام ہے اصل قبولیت اور مکمل قبولیت دونوں کو، اور اس اجمال کو دوسری دلائل نے اس طرح مفصل کر دیا کہ تصدیق قلبی تو جمیع کلم طیب کے لئے نفس قبول کی شرط ہے، اس کے بغیر کوئی ذکر مقبول نہیں، اور دوسرے اعمال صالحہ جمیع کلم طیب کے لئے مکمل قبول کی شرط ہے نہ کہ نفس قبول کی۔ کیونکہ فاسق سے اگر کلمہ طیب کا صدور ہو تو بھی قبول تو ہو جاتا ہے مگر مکمل قبولیت نہیں ہوتی، پس جب یہ چیزیں عند اللہ پسندیدہ ہیں تو جو شخص اس کو اختیار کرے گا وہ معزز ہوگا، اور جو لوگ اس کے خلاف طریقہ اختیار کر کے آپ کی مخالفت کر رہے ہیں کہ وہ اللہ ہی کی مخالفت ہے۔ اور آپ کے ساتھ بُری بُری تدبیریں کر رہے ہیں ان کو سخت عذاب ہوگا، جو موجب ان کی ذلت کا ہوگا اور ان کے خود ستا معبودان کو خاک عزت نہ دے سکیں گے، بلکہ بالعکس خود وہ ان کے خلاف ہو جائیں گے، لہذا قال تعالیٰ فی سورہ مریم سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادِهِمْ وَيَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرًا، یہ تو ان کا خسران آخرت میں ہوگا، اور دنیا میں بھی ان کو یہ خسران ہوگا کہ ان لوگوں کا یہ مکر نیست و نابود ہو جائے گا (یعنی ان تدبیروں میں ان کو کامیابی نہ ہوگی، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ اسلام کو مٹانا چاہتے تھے خود ہی مٹ گئے۔ یہ مضمون بطور حیلہ معترضہ کے تمام ہو کر آگے پھر عود ہے مضمون توحید کی طرف، یعنی حق تعالیٰ کی قدرت کا مظہر ایک تو وہ تھا جو اوپر اللہ الذی ارسل الخ میں بیان کیا گیا، اور دوسرا مظہر جو توحید پر دلالت کرتا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (ضمناً خلق آدم میں) مٹی سے پیدا کیا، پھر (استقلالاً) نطفہ سے پیدا کیا، پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا (یعنی کچھ مذکر کچھ مؤنث بنائے یہ تو اس کی قدرت ہے) اور (علم اس کا ایسا ہے کہ) کسی عورت کو نہ حمل رہتا ہے اور نہ وہ جنتی ہے مگر سب اس کی اطلاع سے ہوتا ہے (یعنی اس کو پہلے سے سب کی خبر ہوتی ہے) اور (اسی طرح)



نہ کسی کی عمر زیادہ (مقرر) کی جاتی ہے اور نہ کسی کی عمر کم (مقرر) کی جاتی ہے مگر یہ سب  
 لوح محفوظ میں (لکھا ہوا) ہوتا ہے (جو حق تعالیٰ نے اپنے علم قدیم کے موافق اس  
 میں ثبت فرمادیا ہے) اور گو معلومات بے شمار اور لامتناہی ہیں، مگر یہ تعجب نہ کرو کہ قبل  
 از وقوع سب واقعات کو کیسے مقدر و مقرر فرمایا کیونکہ یہ سب اللہ کو آسان ہے (کیونکہ  
 اس کا علم ذاتی ہے جس کی نسبت جمیع معلومات کے ساتھ قبل از وقوع و بعد از وقوع  
 یکساں ہے) اور آگے قدرت کے اور دلائل سنو کہ باوجودیکہ پانی مادّہ واحدہ ہے مگر باوجود  
 وحدت قابل کے اس میں اختلاف افعال سے دو مختلف قسمیں پیدا کر دیں (دونوں دریا برابر  
 نہیں ہیں بلکہ) ایک تو شیریں پیاس بجھانے والا ہے جس کا پینا بھی (بوجہ قبول طبیعت  
 کے) آسان ہو اور ایک شور تلخ ہے (تو یہ امر بھی عجائب قدرت سے ہے) اور (دوسرے  
 دلائل قدرت بھی ہیں جو دلالت علی القدرة کے ساتھ دال علی النعمۃ بھی ہیں بعض تو انہی  
 دریاؤں کے متعلق ہیں مثلاً یہ کہ) تم ہر ایک (دریا) سے (مچھلیاں نکال کر ان کا) تازہ گوشت  
 کھاتے ہو اور (نیز زیور (یعنی موتی) نکالتے ہو جو کو تم پہنتے ہو اور (اے مخاطب) تو کشتیوں  
 کو اس میں دیکھتا ہے پانی کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم (ان کے ذریعہ سے سفر کر کے)  
 اس کی روزی ڈھونڈو اور تاکہ (روزی حاصل کر کے تم (اللہ کا) شکر کرو (اور بعض  
 اور نعمتیں ہیں مثلاً یہ کہ) وہ رات (کے اجزاء) کو دن (کے اجزاء) میں داخل کر دیتا ہے  
 اور دن (کے اجزاء) کو رات (کے اجزاء) میں داخل کر دیتا ہے (جس سے دن اور رات  
 گھٹنے بڑھنے کے متعلق منافع حاصل ہوتے ہیں) اور (مثلاً یہ کہ) اس نے سورج اور چاند  
 کو کام میں لگا رکھا ہے (ان میں سے) ہر ایک وقت مقرر (یعنی یوم قیامت) تک (اسی طرح)  
 چلتے رہیں گے، یہی اللہ (جس کی یہ شان ہے) تمہارا پروردگار ہے، اسی کی سلطنت ہے، اور  
 اس کے سوا جن کو پکارتے ہو وہ تو کجور کی گھٹلی کے چمکے کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے،  
 چنانچہ جمادات میں تو ظاہر ہے اور ذوات الارواح میں بایں معنی کہ بالذات اختیار نہیں  
 رکھتے اور ان کی یہ حالت ہے کہ اگر تم پکارو تو بھی وہ تمہاری پکار (اڈل تو) سنیں گے نہیں (جمادات  
 تو اس لئے کہ ان میں سننے کی صلاحیت نہیں اور ذوات الارواح بایں معنی کہ مرنے کے  
 بعد ان کا سننا لازمی اور دائمی نہیں، جب اللہ چاہے سنا دے جب نہ چاہے نہ سنا دے) اور اگر  
 (بالضرر) سن بھی لیں تو تمہارا کہنا نہ کریں گے، اور قیامت کے روز وہ (خود) تمہاری  
 شرک کرنے کی مخالفت کریں گے (کہ قولہ تعالیٰ مَا كَانُوا اِيَّانَا يَعْبُدُونَ وَغَيْرِ ذَلِكَ مِنْ اَلْيَا)  
 اور (ہم نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے صدق میں ذرا شک و شبہ نہیں کیونکہ ہم حقائق امور

کی پوری خبر رکھنے والے ہیں اور اسے مخاطب (تجہ کو خبر رکھنے والے کی برابر کوئی نہیں بتلائے گا، پس ہمارا بتلانا سب سے زیادہ صحیح ہے)۔

## معارف و مسائل

اَلَّذِي يَصْعَدُ الْكَلِمَ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ اس سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جو شخص عزت و قوت کا طلب گار ہو تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے بس میں نہیں۔ جن چیزوں کو انھوں نے معبود بنا رکھا ہے یا جن سے عزت کی توقع پر دوستی کر رکھی ہے وہ کسی کو عزت نہیں دے سکتے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ سے عزت و قوت حاصل کرنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے، جس کے دو احسنا ہیں، ایک کلم طیب، یعنی کلمہ توحید اور اللہ کی ذات و صفات کا علم دوسرے عمل صالح یعنی دل سے ایمان لانا پھر اس کے مقتضی کے موافق تابع شریعت عمل کرنا۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے موضح القرآن میں فرمایا کہ حصول عزت کا یہ نسخہ بالکل صحیح و مجرب ہے، شرط یہ ہے کہ ذکر اللہ اور عمل صالح پر مداومت ہو، یہ مداومت ایک حد مقرر پر پہنچ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے کرنے والے کو وہ لازوال عزت دینا و آخرت میں نصیب فرماتے ہیں جس کی نظیر نہیں۔

آیت مذکورہ میں ان دونوں جزوؤں کی تعبیر ان الفاظ سے کی گئی ہے کہ اچھا کلام اللہ کی طرف چڑھتا اور پہنچتا ہے، اور عمل صالح اس کو اٹھاتا ہے، اور پہنچاتا ہے۔ اَلْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ کی ترکیب نحوی میں چند احتمال ہیں، ہر احتمال کے اعتبار سے جملے کے معنی الگ ہو جاتے ہیں۔ ائمہ تفسیر نے ان احتمالوں کے مطابق تفسیر اپنی اپنی صواب دید کے مطابق کی ہے۔ پہلا احتمال تو وہی ہے جس کے مطابق خلاصہ تفسیر میں ترجمہ کیا گیا ہے کہ یَرْفَعُهُ کی ضمیر فاعل عمل صالح کی طرف راجع ہو، اور ضمیر مفعول کلم طیب کی طرف، اور معنی یہ ہوں کہ کلم طیب اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتے ہیں، مگر ان کے چڑھانے کا ذریعہ عمل صالح ہوتا ہے۔ جمہور ائمہ تفسیر ابن عباسؓ، حسن بصریؒ، ابن جریرؒ، مجاہد، ضحاک، شہر بن حوشب وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور اللہ کی طرف چڑھنے اور چڑھانے سے مراد اللہ کے نزدیک مقبول ہونا ہے۔ اس لئے خلاصہ اس جملے کا یہ ہو گا کہ کلم طیب خواہ کلمہ توحید ہو یا دوسرے اذکار تبلیغ و تحمید وغیرہ ان میں سے کوئی چیز بغیر عمل صالح کے عند اللہ مقبول نہیں ہوتی۔ اس میں عمل صالح کا اہم جز، تصدیق قلبی ہے، یعنی دل سے اللہ پر اور اس کی توحید پر ایمان لانا یہ تو مطلقاً قبولیت اعمال کی شرط لازم ہے، اس کے بغیر نہ کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مقبول ہے نہ کوئی دوسرا ذکر۔



اور عمل صالح کے دوسرے اجزاء نماز، روزہ وغیرہ اعمال صالحہ اور محرمات و مکروہات سے پرہیز ہے۔ یہ اگرچہ مطلقاً قبولیت کی شرط نہیں، مگر قبولیتِ تامہ کی شرط یہ اعمال بھی ہیں۔ تو اگر ایک شخص دل میں ایمان و تصدیق ہی نہیں رکھتا تو وہ کتنا بھی زبان سے کلمہ توحید پڑھے اور تسبیح و تحمید کرے اللہ کے نزدیک اسکو کوئی حصہ قبولیت کا حاصل نہ ہوگا، اور جو تصدیق و ایمان تو رکھتا ہے مگر دوسرے اعمال صالحہ نہیں کرتا یا ان میں کوتاہی کرتا ہے اس کا ذکر اللہ اور کلمہ توحید بالکل ضائع تو نہیں ہوگا صرف اتنا کام دے گا کہ ہمیشہ کے عذاب سے اس کو نجات مل جائے گی، مگر مکمل قبولیت اس کو حاصل نہیں ہوگی، جس کا یہ اثر ہوگا کہ بہت دراپنے ترکِ عمل کے اور کوتاہی کے عذاب بھگتے گا۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قول کو بغیر عمل کے اور کسی قول و عمل کو بغیر نیت کے اور کسی قول و عمل اور نیت کو بغیر مطابقت سنت کے قبول نہیں کرتا (قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ مکمل قبولیت کی شرط سنت کے مطابق ہونا ہے، اگر قول بھی عمل بھی اور نیت بھی، یہ سب درست بھی ہوں مگر طریقہ عمل سنت کے مطابق نہ ہو تو قبولیت تامہ حاصل نہیں ہوگی۔

اور بعض مفسرین نے اس جملہ کی ترکیب نحوی یہ قرار دی ہے کہ یَرْفَعُہُ کی ضمیر فاعل کلم طیب کی طرف اور ضمیر مفعول عمل صالح کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں معنی جملہ کے پہلے سے بالکل مختلف یہ ہو گئے کہ کلم طیب یعنی ذکر اللہ عمل صالح کو چڑھاتا اور اٹھاتا ہے، یعنی قابل قبول بناتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوگا کہ جو شخص عمل صالح کے ساتھ ذکر اللہ بھی بکثرت کرتا ہے تو یہ ذکر اللہ اس کے عمل کو مزین اور قابل قبول بنا دیتا ہے،

اور حقیقت یہی ہے کہ جس طرح صرف کلمہ توحید اور تسبیحات بغیر عمل صالح کے کافی نہیں اسی طرح عمل صالح ادا و نواہی کی پابندی بھی بغیر کثرت ذکر اللہ کے بے رونق رہتی ہے، ذکر اللہ کی کثرت ہی اعمال صالحہ کو مزین کر کے قابل قبول بناتی ہے۔

وَمَا يَعْتَرُ مِنْهُنَّ مُعْتَرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمْرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ، اس آیت کا مفہوم جہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو عمر طویل عطا فرماتے ہیں وہ پہلے ہی لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، اسی طرح جس کی عمر کم رکھی جاتی ہے وہ بھی سب لوح محفوظ میں پہلے ہی درج ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں عمر کا طول اور نقص فرد واحد کے متعلق مراد نہیں، بلکہ کلام نوع انسانی کے متعلق ہے کہ اس کے کسی فرد کو عمر طویل دی جاتی ہے

کسی کو اس سے کم۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے ابن کثیر نے نقل کی ہے۔ جصاص نے حسن بصری اور ضحاک کا یہی قول نقل کیا ہے، اسی لئے ابن جریر، ابن کثیر، روح المعانی وغیرہ عام تفاسیر میں اسی کو جمہور کی تفسیر قرار دیا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اگر عمر کی کمی زیادتی کو ایک ہی شخص کے متعلق کہا جائے تو عمر میں کمی کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ہر شخص کی جو عمر اللہ تعالیٰ نے لکھ دی ہے وہ یقینی ہے، اور جو دن گزرتا ہے اس مقررہ مدت عمر میں سے ایک دن کی کمی کر دیتا ہے، دو دن گزرتے ہیں تو دو کم ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہر دن بلکہ ہر سانس اس کی عمر کو گھٹاتا رہتا ہے۔ یہ تفسیر شعبی، ابن جریر، ابومالک، ابن عطیہ اور سدی سے منقول ہے (روح)

اسی مضمون کو اس شعر میں ادا کیا گیا ہے، ۵

حَيَاتُكَ أَفْكَاسٌ تُعَدُّ فَكْلًا ۖ مَضَى نَفْسٌ مِّنْهَا انْقَصَتْ بِهٖ حَيَاتُكَ  
یعنی تیری زندگی چند گنے ہوئے سالوں کا نام ہے، تو جب بھی ایک سانس گزرتا ہے  
تیری عمر کا ایک جز گھٹ جاتا ہے۔

امام نسائی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت انس بن مالکؓ سے یہ روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: مَنْ تَسَرَّعَ آتٍ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ وَيُنَاسَ فِيْهِ أَشْرُهُ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد نے بھی یہ حدیث یونس بن یزید اہلی کی روایت سے نقل کی ہے۔ معنی حدیث کے یہ ہیں کہ جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت اور عمر میں زیادتی ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے یعنی اپنی ذی رحم رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرے۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی سے عمر بڑھ جاتی ہے، مگر اس کا مطلب ایک دوسری حدیث نے خود واضح کر دیا ہے وہ یہ ہے: ابن ابی حاتم نے حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس (مضمون کا ذکر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ (عمر تو اللہ کے نزدیک ایک ہی مقررہ اور مقررہ ہے) جب مقررہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو کسی شخص کو ذرا بھی مہلت نہیں دی جاتی۔ بلکہ زیادت عمر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اولاد صالح عطا فرما دیتا ہے وہ اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔ یہ شخص نہیں ہوتا ہے اور ان لوگوں کی دعائیں اس کو قبر میں ملتی رہتی ہیں یعنی مرنے کے بعد بھی ان کو وہ فائدہ پہنچتا رہتا ہے، جو خود زندہ رہنے سے حاصل ہوتا ہے، اسی طرح گویا اس کی عمر بڑھ گئی۔ یہ دونوں روایتیں ابن کثیر نے نقل کی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ جن احادیث میں بعض اعمال کے متعلق یہ آیا ہے کہ ان سے عمر بڑھ جاتی ہے، اس سے مراد عمر کی برکت کا بڑھ جانا ہے۔



وَمِنْ كُلِّ ثَمَرٍ ثَمَرَاتٍ لَّحْنًا طَيِّبًا وَتَسْتَخْرِجُ حَبًا حَلِيبًا تَلْبَسُونَهَا، یعنی دریائے شور  
 و شیریں دونوں سے تمھیں تازہ گوشت کھانے کو ملتا ہے، مراد اس سے مچھلی ہے۔ اس آیت میں  
 مچھلی کو گوشت کے لفظ سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ مچھلی خود بخود حلال  
 گوشت ہے اس کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں۔ بخلاف دوسرے بڑی جانوروں کے کہ جب تک  
 ان کو اللہ کے نام پر ذبح نہ کر دہ حلال نہیں۔ مچھلی میں یہ شرط نہیں اس لئے وہ بنا بنا یا گوشت  
 ہے۔ اور حلیہ کے معنی زیور کے ہیں مراد اس سے موتی ہیں۔ آیت سے معلوم ہوا کہ موتی جس طرح  
 دریائے شور میں پیدا ہوتے ہیں شیریں دریاؤں میں بھی ہوتے ہیں جو عام شہرت کے خلاف ہے  
 کیونکہ معروف و مشہور یہی بات ہے کہ موتی دریائے شور (سمندر) میں پیدا ہوتے ہیں، اور  
 حقیقت یہی ہے جو قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ دونوں میں موتی پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ  
 شیریں دریاؤں میں بہت کم اور سمندر میں بہت زیادہ پیدا ہوتے ہیں زیادتی کی وجہ سے یہ  
 شہرت ہو گئی کہ موتی صرف دریائے شور سے نکلتے ہیں۔

اور تَلْبَسُونَہَا میں صیغہ مذکر استعمال کرنے سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ موتیوں کا  
 استعمال مردوں کے لئے بھی جائز ہے بخلاف سونے چاندی کے کہ ان کا بطور زیور استعمال کرنا  
 مردوں کے لئے جائز نہیں (روح)

إِنْ خَشِيَ غَوَاهُمْ لَا يَسْمَعُوا دَعَاءَ كُفْرٍ وَكُفْرٌ مِمَّا اسْتَجَابُوا لَكُمْ، یعنی یہ بت یا  
 بعض نبیاء یا فرشتے جن کو تم خدا سمجھ کر پرستش کرتے ہو اگر ان کو مصیبت کے وقت پکارو گے  
 تو وہ لایہ تمھاری بات سن ہی نہ سکیں گے، کیونکہ بتوں میں تو سننے کی صلاحیت ہے ہی نہیں، انبیاء  
 اور فرشتوں میں اگرچہ صلاحیت ہے مگر نہ وہ ہر جگہ موجود ہیں نہ ہر ایک کے کلام کو سنتے ہیں۔  
 آگے فرمایا کہ اگر بالعرض وہ سن بھی لیں جیسے فرشتے اور انبیاء تو پھر بھی وہ تمھاری درخواست  
 پوری نہ کریں گے۔ کیونکہ ان کو خود قدرت نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اس سے کسی  
 کی سفارش نہیں کر سکتے۔

سماع موتی کا مسئلہ جو پہلے گذر چکا ہے اس آیت سے نہ اس کا اثبات ثابت ہوتا  
 ہے نہ نفی، اس بحث کے دلائل دوسرے ہیں جن کا ذکر سورۃ روم میں مفصل آچکا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (۱۵)

اے لوگو! تم ہو محتاج اللہ کی طرف، اور اللہ وہی ہے پر داسب تعریفوں والا

إِنْ يَشَاءُ يُدْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۝۱۶ وَمَا ذَلِكُ عَلَى اللَّهِ

اگر چاہے تم کو لے جائے اور لے آئے ایک نئی خلقت ، اور یہ بات اللہ پر

يَعَزِيزٌ ۝۱۷ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ

مشکل نہیں ۔ اور نہ اٹھائے گا کوئی اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا اور اگر پکارے کوئی بوجھل اپنا بوجھ

حِمْلَهَا لَا يُحْمَلُ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۚ إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ

بٹانے کو کوئی نہ اٹھائے اس میں سے ذرا بھی ، اگرچہ ہو قریبی ، تو تو ڈر سنا دیتا ہوں ان کو

يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۚ وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا

جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے دیکھے اور قائم رکھتے ہیں نماز ، اور جو کوئی سنورے گا تو یہی ہو کہ

يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ۝۱۸ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ

سنورے گا اپنے فائدہ کو اور اللہ کی طرف ہر سب کو پھر جانا ۔ اور برابر نہیں اندھا

وَالْبَصِيرُ ۝۱۹ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۚ وَلَا الظِّلُّ وَلَا

اور دیکھتا ، اور نہ اندھیرا اور نہ اُجبالا ، اور نہ سایہ اور

الْحَرُورُ ۚ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ

نہ تو ۔ اور برابر نہیں جیتے اور نہ مردے ، اللہ

يَسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ ۝۲۰ إِنْ

سنا دے جس کو چاہے اور تو نہیں سنانے والا قبر میں پڑے ہوؤں کو ، تو تو بس

أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ ۝۲۱ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا

ڈر کی خبر پہنچانے والا ہے ۔ ہم نے بھیجا ہے تجھ کو سچا دین دیکر خوشی اور ڈر سنانے والا ،

وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝۲۲ وَإِنْ يَكُنْ بِكَ فَخْرٌ

اور کوئی فرقہ نہیں جس میں نہیں ہو چکا کوئی ڈر سننے والا ۔ اور اگر وہ تجھ کو جھٹلاتیں تو آگے

كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِالْبَيِّنَاتِ

جھٹلا چکے ہیں جو لوگ کہ ان سے پہلے تھے ، پہنچے ان کے پاس رسول اُن کے لیکر کھلی باتیں ،



وَبِالْزُّبُرِ وَبِالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ۝۲۵ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا

اور صحیفے اور روشن کتاب - پھر پکڑا میں نے منکروں کو

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ۝۲۶

سو کیسا ہوا انکار میرا۔

## خلاصہ تفسیر

اے لوگو تم (ہی) خدا کے محتاج ہو اور اللہ (تو) بے نیاز (اور خود تمام) نبیوں والا (اور پس تمہاری جستیاں دیکھ کر تمہارے لئے توحید وغیرہ کی تعلیم کی گئی ہے، اگر تم نہیں مانو گے تو تم اپنا ضرر کرو گے۔ باقی حق تعالیٰ کو تو بوجہ غنائے ذاتی و کمال ذاتی کے تمہاری یا تمہارے عمل کی کوئی حاجت ہی نہیں، کہ اس کے ضرر کا احتمال ہو اور کفر یہ جو ضرر ہونے والا ہے خدا تعالیٰ اس کے فی الحال ایقاع پر بھی قادر ہی، چنانچہ اگر وہ چاہے تو (تمہارے کفر کی سزائیں) تم کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق پیدا کر دے (جو تمہاری طرح کفر و انکار نہ کریں) اور یہ بات خدا کو کچھ مشکل نہیں لیکن مصلحت مہلت دے رکھی ہے۔ غرض یہاں تو وہ ضرر محض محتمل الوقوع ہے، لیکن قیامت میں وہ ضرر واقع ہو جائے گا، اور اس وقت یہ حالت ہوگی کہ کوئی دوسرے کا بوجھ (گناہ کا) نہ اٹھاوے گا اور (خود تو کوئی کسی کی کیا رعایت کرتا یہ حالت ہوگی کہ) اگر کوئی بوجھ کا لدا ہو (یعنی کوئی گنہگار) کسی کو اپنا بوجھ اٹھانے کیلئے بلائے گا (بھی) تب بھی اس میں سے کچھ بھی بوجھ نہ ہٹایا جائے گا، اگرچہ وہ شخص (جس کو اس نے بلایا تھا اس کا) قرابت دار ہی (کیوں نہ ہو) پس اس وقت پورا ضرر اس کفر و بد عملی کا خود ہی بھگتنا پڑے گا یہ تو تحریر منکرین کی ہو گئی۔ آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تسلیہ ہے، کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اُن کے انکار پر جس کی سزا یہ ایک دن ضرور بھگتیں گے اس قدر غم و افسوس کیوں کرتے ہیں) آپ تو ایسا ڈرانا جس پر نفع مرتب ہو) صرف ایسے لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں (مراد اس الَّذِينَ سے مومنین ہیں، یعنی آپ کے انداز سے صرف مومنین منتفع ہوتے ہیں فی الحال ہوں یا باعتبار آئندہ کے اور امر مشترک دونوں میں طلب حق ہے۔ مطلب یہ ہو کہ طالب حق کو نفع ہو اگر تاہی یہ لوگ طالب حق ہیں ہی نہیں، اُن سے امید نہ رکھتے) اور آپ ان کے ایمان نہ لانے سے اس قدر فکر کیوں کرتے ہیں) جو شخص (ایمان لا کر شرک و کفر سے) پاک ہوتا ہے وہ اپنے

رفع کے لئے پاک ہوتا ہے اور (جو نہیں ایمان لاتا وہاں بھگتے گا، کیونکہ سب کو) اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے (پس نفع ہے تو ان کا آپ کیوں غم کرتے ہیں) اور ان لوگوں سے کیا توقع رکھی جائے کہ ان کا علم و ادراک مثل ادراکِ مؤمنین کے ہو، اور مؤمنین کی طرح یہ بھی حق کو قبول کر لیں، اور قبولِ حق کے ثمرات دینی میں بھی یہ لوگ شریک ہو جائیں، کیونکہ مؤمنین کی مثال حق بینی میں بنی آدمی کی سی اور ان کی مثال عدمِ ادراکِ حق میں اندھے آدمی کی سی ہے۔ اور اسی طرح مؤمن نے ادراکِ حق کے ذریعہ سے جس طریقِ ہدایت کو اختیار کیا ہے اس طریقِ حق کی مثال نور کی سی ہے، اور کافر نے عدمِ ادراکِ حق سے جس طریقہ کو اختیار کیا ہے اس کی مثال ظلمت کی سی ہے کما قال تعالیٰ وَجَعَلْنَا لِقَوْمِ الْكُفْرِ أَتَيْنًا يَبْهِي النَّاسَ كَمَنْ تَمَلَّكَ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا، اور اسی طرح جو ثمرہ جنت وغیرہ اس طریق پر مرتب ہوگا اس کی مثال ظلِ بار کی سی ہے، اور جو ثمرہ جہنم وغیرہ طریقِ باطل پر مرتب ہوگا، اس کی مثال جلتی دھوپ کی سی ہے، کما قال تعالیٰ ظِلٌّ مِّمُّدُّ وُدِّ اِلٰی قَوْلِهِ فِي سَمُومٍ اور ظاہر ہے کہ) اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں، اور نہ تاریکی اور روشنی اور چھاؤں اور دھوپ پس نہ ان کا اور مؤمنین کا علم و ادراک برابر ہوگا اور نہ ان کا طریقہ اور نہ اس طریقہ کا ثمرہ اور (مؤمن اور کافر میں جو تفاوت بنانا بنا کر کہا گیا ہے تو اس سے مقصد نفی کی ہے نہ کہ زیادتی کی۔ کیونکہ ان میں تفاوت مردہ اور زندہ کا سا ہے، پس ان کی برابری کی نفی کیلئے یوں بھی کہنا صحیح ہے کہ) زندے اور مردے برابر نہیں ہو سکتے (اور جب یہ مردے ہیں تو مردوں کو زندہ کرنا تو خدا کی قدرت میں ہی، بندہ کی قدرت میں نہیں۔ پس اگر خدا ہی اُن کو ہدایت کر دے تب تو اور بات ہے، کیونکہ) اللہ جس کو چاہتا ہے سنوا دیتا ہے (باقی آپ کی کوشش سے یہ لوگ حق کو قبول نہیں کریں گے، کیونکہ ان کی مثال تو مردوں کی آپ نے سن لی) اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں (مدفون) ہیں۔ (لیکن اگر یہ نہ مانیں تو آپ غم میں نہ پڑیے کیونکہ) آپ تو کافروں کے حق میں، صرف ڈرانے والے ہیں (آپ کے ذمہ یہ نہیں کہ وہ کافر ڈر کر مان بھی جائیں۔ اور یہ ڈرانا آپ کا اپنی طرف سے نہیں جیسا منکرینِ نبوت کہتے تھے بلکہ ہماری طرف سے ہے کیونکہ) ہم ہی نے آپ کو (دین) حق دے کر (مسلمانوں کو) خوش خبری سنانے والا اور (کافروں کو) ڈرسانے والا... بنا کر بھیجا ہے اور یہ بھیجا کوئی انوکھی بات نہیں جیسا کافر کہتے تھے بلکہ) کوئی ایسی امت نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرسانے والا (یعنی پیغمبر) نہ گذرا ہو اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا دیں تو آپ ان گزشتہ پیغمبروں کا جن کا ابھی اجمالاً ذکر ہوا ہے اور تفصیلاً دوسری آیات میں ذکر ہو، کافروں کے ساتھ معاملہ یاد کر کے اپنے دل کو سمجھا لیجئے، کیونکہ) جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انھوں نے بھی (اپنے وقت کے پیغمبروں کو)



جھٹلایا تھا (اور) اُن کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے اور صحیفے اور روشن کتابیں لے کر آئے تھے، (یعنی بعض صحائف اور بعض بڑی کتابیں اور بعض صرف معجزات تصدیق نبوت کے لئے اور احکام انبیاء سابقین لے کر آئے، پھر جب انھوں نے جھٹلایا تو) میں نے ان کافروں کو پکڑ لیا سو روکھو، میرا کیسا عذاب ہوا اسی طرح ان کے وقت پر اُن کو سزا دوں گا۔

## معارف و مسائل

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ، یعنی قیامت کے روز کوئی آدمی دوسرے آدمی کے گناہوں کا بوجھ نہ اٹھاسکے گا، ہر ایک کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا پڑے گا۔ اور سورہ عنکبوت میں جو آیا ہے کہ وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ یعنی گمراہ کرنے والے لوگ اپنے گمراہ ہونے کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اتنا ہی دوسرا بوجھ اس کا اٹھائیں گے کہ انھوں نے دوسرے کو گمراہ کیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن کو گمراہ کیا تھا اُن کا بوجھ یہ لوگ کچھ ہلکا کر دیں گے، بلکہ ان کا بوجھ اپنی جگہ ان پر پورا رہے گا، اور گمراہ کرنے والوں کا جرم دہرا ہونے کی وجہ سے ان کا بوجھ بھی دہرا ہو جائے گا، ایک گمراہ ہونے کا دوسرا دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔ اُن لئے ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں (روح)

اور حضرت عکرمہؓ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ اس روز ایک باپ اپنے بیٹے سے کہے گا کہ تم جانتے کہ میں تمہارا کیسا شفیق اور مہربان باپ تھا وہ اقرار کرے گا کہ بیشک آپ کے احسانات بے شمار ہیں، اور میرے لئے آپ نے دنیا میں بہت کلفتیں اٹھاتی ہیں۔ اب باپ کہے گا کہ بیٹا آج میں تمہارا محتاج ہوں، اپنی نیکیوں میں سے تھوڑی مجھے دید و کہ میری نجات ہو جائے۔ بیٹا کہے گا کہ ابا جان آپ نے بہت تھوڑی سی چیز طلب کی، مگر میں کیا کروں اگر میں وہ آپ کو دیدوں تو میرا یہی حال ہو جائے گا، اس لئے مجبور ہوں۔ پھر وہ اپنی توجہ سے یہی کہے گا کہ میں نے دنیا میں تم پر اپنا سب کچھ قربان کیا، آج مجھے تمہاری تھوڑی نیکیوں کی ضرورت ہے، وہ دیدو۔ یہی بھی وہی جواب دیگی جو بیٹے نے دیا تھا۔

حضرت عکرمہؓ نے فرمایا کہ یہی مراد ہے اس آیت کی، لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ، اور فرمایا کہ قرآن کریم نے متعدد آیات میں اس مضمون کو بیان فرمایا ہے، ایک جگہ لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدٍ وَلَا مَوْلَاٌ هُوَ جَانِبُ وَالِدٍ شَيْئًا، یعنی اس روز نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو عذاب چھڑاسکے گا نہ بیٹا باپ کو۔ مراد یہی ہے کہ کوئی دوسرے کا گناہ اپنے سر پر لے کر اس کو نہ بچائے گا۔ شفاعت کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں

فرمایا یَوْمَ یَفْرَأُ الْمَرْءُ مِنْ أَخِیْهِ وَأُمِّهِ وَأَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِیْهِ، یعنی اس روز انسان بھاگے گا اپنے بھائی اور ماں باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اولاد سے، بھاگنے کا حاصل یہی ہر وہ ڈرے گا کہ کہیں یہ اپنا گناہ مجھ پر ڈالنے کی یا میری کسی نیکی کو لینے کی فرمائش نہ کریں (ابن کثیر)

وَمَا أَنتَ بِمُسْلِمٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ، اس آیت کے شروع میں کفار کی مثال مردوں سے اور مؤمنین کی زندوں سے دی گئی ہے۔ اسی کی مناسبت سے یہاں مَنْ فِي الْقُبُورِ سے مراد کفار ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے ان زندہ کافروں کو بھی نہیں سنا سکتے۔

اس آیت نے خود یہ بات واضح کر دی کہ یہاں سنانے سے مراد وہ سنانا ہے جو مفید مؤثر اور نافع ہو، ورنہ مطلق سنانا تو کفار کو ہمیشہ ہوتا ہی رہا، اور مشاہدہ میں آتا رہا ہے کہ ان کو تبلیغ کرتے اور وہ سنتے تھے۔ اس لئے مراد اس آیت کی یہ ہے کہ جس طرح آپ مردوں کو کلام حق سنا کر راہِ حق پر نہیں لاسکتے کیونکہ وہ دنیا کے دارالعمل سے آخرت کے دارالجزا میں منتقل ہو چکے ہیں، اداں اگر وہ ایمان کا اقرار بھی کر لیں تو معتبر نہیں، اسی طرح کفار کا حال ہے اس کے ثابت ہوا کہ مردوں کے سنانے کی جو نفی اس آیت میں کی گئی ہے اس سے مراد خاص اسماع نافع ہے جس کی وجہ سے سننے والا باطل کو چھوڑ کر حق پر آجائے۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ مسئلہ اسماع موتی سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں، یہ مسئلہ اپنی جگہ مستقل ہے کہ مردے زندوں کا کلام سنتے ہیں یا نہیں۔ اس کی مفصل تحقیق سورۃ روم میں اور سورۃ نمل میں گذر چکی ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی بھر ہم نے نکالے اس سے میوے

مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا ۚ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ ۚ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ

طرح طرح کے ان کے رنگ، اور پہاڑوں میں گھاٹیاں ہیں سفید اور سرخ طرح طرح کے

أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ۚ (۲۹) وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ أَلْوَانٌ

ان کے رنگ اور بھنگے کالے، اور آدمیوں میں اور کیڑوں میں اور چوہاؤں میں

مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ ۚ كَذَٰلِكَ طِإِنَّهَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۚ

کتنے رنگ ہیں اسی طرح، اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے،



إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ۝۲۸

تحقیق اللہ زبردست اور بخشنے والا

## خلاصہ تفسیر

راے مخاطب، کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا پھر ہم نے (پانی) کے ذریعہ مختلف رنگتوں کے پھل لگائے (خواہ اس طرح کہ ان کی انواع و اقسام ہی الگ الگ ہوں یا ایک ہی نوع اور ایک ہی قسم کے پھل مختلف رنگتوں کے ہوں) اور اسی طرح (پھاڑوں کے بھی مختلف ہوتے ہیں) بعض سفید اور (بعض) سُرخ کہ (پھر خود) اُن سفید سُرخ کی بھی رنگتیں مختلف ہیں، بعض بہت سفید اور بہت سُرخ، بعض ہلکے سفید اور ہلکے سُرخ) اور (بعض نہ سفید نہ سُرخ بلکہ) بہت گہرے سیاہ اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپاؤں میں بھی بعض ایسے ہیں کہ ان کی رنگتیں مختلف ہیں، بعض اوقات اختلاف اقسام و اصناف کے ساتھ یہ اختلاف رنگ ہوتا ہے، اور بعض اوقات ایک ہی قسم میں مختلف رنگ ہوتے ہیں، تو جو لوگ دلائل قدرت میں غور کرتے ہیں، ان کو خدا تعالیٰ کی عظمت کا علم ہوتا ہے، اور خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں (اگر علم عظمت کا محض اعتقادی اور عقلی ہے تو یہ خشیت بھی اعتقادی عقلی ہی رہے گی اور اگر علم عظمت درجہ حال تک پہنچ گیا ہو تو خشیت بھی درجہ حال کی ہوگی کہ اس کے خلاف سے طبعی نفرت و تکلیف ہونے لگے گی) واقعی اللہ تعالیٰ (سے ڈرنائی نفسہ بھی ضروری ہے کیونکہ وہ) زبردست ہے، کہ سب کچھ کر سکتا ہے اور اپنے مطلب کے لئے بھی ضروری ہے کیونکہ وہ ڈرنے والوں کے گناہوں کا) بڑا بخشنے والا ہے۔

## معارف و مسائل

ربط آیات | بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ان آیات میں عود ہے مضمون توحید کی طرف جس کو دلائل قدرت سے مدلل کیا گیا ہے۔ اور بعض نے فرمایا ہے کہ سابقہ آیات میں لوگوں کے احوال کا مختلف ہونا اور اس کی تمثیلات بیان فرمائی ہیں، وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ، یہ اسی کا مزید بیان و توضیح ہے کہ مخلوقات آپس میں باہمی تفاوت ایک خلقی اور طبعی امر ہے، اور نباتات و جمادات تک میں موجود ہے، اور یہ اختلاف صرف صورت اور لون ہی میں نہیں بلکہ طبائع میں بھی ہے۔

تَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا، ثمرات میں اختلافِ الوان کو ترکیبِ نحوی کے اعتبار سے حال بنا کر مُخْتَلِفًا منصوب ذکر فرمایا ہو۔ اور آگے پہاڑوں میں رنگتوں کا اختلاف اسی طرح انسانوں اور چوپایوں وغیرہ میں یہ اختلاف بصورتِ صفت بیان فرمایا ہے۔ اسی لئے مُخْتَلِفٌ مرفوع لایا گیا۔ اس میں یہ اشارہ ہو سکتا ہے کہ ثمرات کا اختلافِ الوان تو ایک حال پر نہیں، وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بدلتا رہتا ہے، بخلاف پہاڑوں کے اور انسانوں اور جانوروں کے کہ ان کے جو رنگ ہیں وہ عموماً قائم رہنے والے ہیں بدلتے نہیں۔

اور پہاڑوں میں مُجَدُّ فرمایا، یہ جُذَّہ کی جمع ہے جس کے معروف معنی اس چھوٹے سے رستہ کے ہیں جس کو جاؤہ بھی کہا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے جُذَّہ بمعنی قطعہ حصہ قرار دیا ہو مطلب دونوں صورتوں میں پہاڑوں کے اجزاء کا مختلف الوان ہوتا ہے، جن میں سب سے پہلے سفید کا اور آخر میں سیاہ کا ذکر فرمایا، درمیان میں احمر یعنی سرخ کے ذکر کے ساتھ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُ فرمایا اس میں اس طرف اشارہ نکل سکتا ہے کہ اصل رنگ دنیا میں دو ہی ہیں، سفید سیاہ، اور باقی رنگ اسی سفیدی اور سیاہی کے مختلف درجوں سے مرکب ہو کر بنتے ہیں۔

كَذَٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ، اس جگہ لفظ كَذَٰلِكَ پر جمہور کے نزدیک وقف ہے، جو اس کی علامت ہو کہ یہ لفظ پچھلے مضمون کے ساتھ متعلق ہے۔ یعنی مخلوقات کو مختلف انواع و اقسام اور مختلف الوان پر بڑی حکمت کے ساتھ بنانا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی خاص نشانی ہے۔

اور بعض روایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ اس لفظ کا تعلق اگلے جملے سے ہے۔ یعنی جس طرح ثمرات، پہاڑ، حیوانات اور انسان مختلف رنگوں پر منقسم ہیں اسی طرح خشیت اللہ میں بھی لوگوں کے درجات مختلف ہیں، کسی کو اس کا اعلیٰ درجہ حاصل ہے، کسی کو کم، اور مدار اس کا علم پر ہے جس درجہ کا علم ہو اسی درجہ کی خشیت بھی ہے (روح)

سابقہ آیات میں ارشاد فرمایا تھا اِنَّمَا تُذْنِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے فرمایا تھا کہ آپ کے انذار و تبلیغ کا فائدہ تو صرف وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو غائبانہ اللہ تعالیٰ سے خوف و خشیت رکھتے ہیں اس کی مناسبت سے آیت اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ میں اُن لوگوں کا ذکر ہو جن کو اللہ تعالیٰ کی خشیت حاصل ہے۔ اور جیسا پہلے کفار و مشکربین کا اور ان کے احوال کا ذکر آیا ہے، اس میں .... خاص اولیاء اللہ کا ذکر ہے۔ لفظ اِنَّمَا عربی زبان میں حصر بیان کرنے کے لئے آتا ہے، اس لئے اس جملے کے معنی بظاہر یہ ہیں کہ صرف علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں



مگر ابن عطیہ وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ حرف اِنَّمَا جیسے حصر کے لئے آتا ہے ایسے ہی کسی کی خصوصیت کے بیان کرنے کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے، اور یہاں یہی مراد ہے کہ خشیت اللہ علماء کا وصف خاص اور لازم ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ غیر عالم میں خشیت نہ ہو (بجرحیط البوحیان) اور آیت میں لفظ علماء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کی ذات و صفات کا کما حقہ علم رکھتے ہیں، اور مخلوقات عالم میں اس کے تصرفات پر اور اس کے احسانات و انعامات پر نظر رکھتے ہیں۔ صرف عربی زبان یا اس کے صرف ونحو اور فنون بلاغت جاننے والوں کو قرآن کی اصطلاح میں عالم نہیں کہا جاتا جب تک اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت مذکورہ طریق پر حاصل نہ ہو۔ حسن بصریؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ عالم وہ شخص ہے جو خلوت و جلوت میں اللہ سے ڈرے، اور جس چیز کی اللہ تعالیٰ نے ترغیب دی ہے وہ اس کو مرغوب ہو اور جو چیز اللہ کے نزدیک مبغوض ہے اس کو اس سے نفرت ہو۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:-

لَيْسَ الْعَالِمُ بِكَثْرَةِ الْحَدِيثِ	”یعنی بہت سی احادیث یاد کر لینا یا
وَلَكِنَّ الْعِلْمَ عَنْ كَثْرَةِ	بہت باتیں کرنا کوئی علم نہیں بلکہ علم وہ ہے
الْخَشْيَةِ	جس کے ساتھ اللہ کا خوف ہو۔“

حاصل یہ ہے کہ جس قدر کسی میں خدا تعالیٰ کا خوف ہے وہ اسی درجہ کا عالم ہے۔ اور احمد بن صالح مصری نے فرمایا کہ خشیت اللہ کو کثرت روایت اور کثرت معلومات سے نہیں پہچانا جاسکتا بلکہ اس کو کتاب و سنت کے اتباع سے پہچانا جاتا ہے (ابن کثیر) شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس شخص میں خشیت نہ ہو وہ عالم نہیں (منظری) اس کی تصدیق اکابر سلف کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ربیع بن انسؒ نے فرمایا:-

مَنْ لَمْ يَخْشَ فَلَيْسَ بِعَالِمٍ	”یعنی جو اللہ سے نہیں ڈرتا وہ عالم نہیں“
-------------------------------------	--

اور مجاہدؒ نے فرمایا:-

إِنَّمَا الْعَالِمُ مَنْ خَشِيَ اللَّهَ	”یعنی عالم تو صرف وہی ہے جو اللہ سے ڈرے“
---	--

سعد بن ابراہیم سے کسی نے — پوچھا کہ مدینہ میں سب سے زیادہ آفقہ کون ہے؟ تو فرمایا: اَلْقَاهُكُمْ لِرَبِّهِ ”یعنی جو اپنے رب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔“ اور حضرت علی مرتضیٰؒ نے فقیہ کی تعریف اس طرح فرمائی:-

إِنَّ الْفَقِيهَ حَقَّ الْفَقِيهَةِ مَنْ لَمْ	”فقیہ مکمل فقیہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی
---	---

يَقْنُطُ النَّاسُ مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ  
وَلَمْ يَرْخِصْ لَهُمْ فِي مَعَاصِي  
اللَّهِ تَعَالَى، وَلَمْ يُزِمْهُمْ مِنْ  
عَذَابِ اللَّهِ تَعَالَى وَلَمْ يَدَعْ  
الْقُرْآنَ رَغْبَةً عَنْهُ إِلَى غَيْرِهِ  
أَنَّهُ لَا خَيْرَ فِي عِبَادَةٍ إِلَّا عِلْمُهُ  
فِيهَا وَلَا عِلْمٌ إِلَّا فِيهِ وَ  
لَا قِرَاءَةٍ إِلَّا تِلْكَ فِيهِ

(قرطبی)

رحمت سے مایوس بھی نہ کرے اور ان کو  
گناہوں کی رخصت بھی نہ دے اور ان کو  
اللہ کے عذاب سے مطمئن بھی نہ کرے، اور  
قرآن کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف  
رغبت نہ کرے، (اور فرمایا) اس عبادت  
میں کوئی خیر نہیں جو بے علم کے ہو اور اس  
علم میں کوئی خیر نہیں جو بے فقہ یعنی بے سمجھ  
بوجھ کے ہو اور اس قرأت میں کوئی خیر نہیں  
جو بغیر تدبر کے ہو۔

مذکورہ تصریحات سے یہ شبہ بھی جا نا کہ بہت سے علماء کو دیکھا جاتا ہے کہ ان میں  
خدا کا خوف و خشیت نہیں۔ کیونکہ تصریحات بالا سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک صرف عربی  
جاننے کا نام علم اور جاننے والے کا نام عالم نہیں جس میں خشیت نہ ہو وہ قرآن کی اصطلاح  
میں عالم ہی نہیں۔ البتہ خشیت کبھی صرف اعتقادی اور عقلی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے آدمی  
بہ تکلف احکام شرعیہ کا پابند ہوتا ہے، اور کبھی یہ خشیت حالی اور ملکہِ راسخہ کے درجہ میں ہو جاتی  
ہے جس میں اتباع شریعت ایک تقاضائے طبیعت بن جاتا ہے۔ خشیت کا پہلا درجہ مأمور  
اور عالم کے لئے ضروری ہے، دوسرا درجہ افضل و اعلیٰ ہو ضروری نہیں (از بیان القرآن)

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا

جو لوگ پڑھتے ہیں کتاب اللہ کی اور سیدھی کرتے ہیں نماز اور خرچ کرتے ہیں کچھ

رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تَجَارَةً لَّنْ تَبُورَ ۚ (۲۹) لِيُؤْفِقَهُمُ

ہمارا دیا ہوا چھپے اور کھلے امیدوار ہیں ایک ہو پار کے جس میں ٹوٹا نہ ہو، تاکہ پورا دے ان کو

أَجْرَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ (۳۰)

ثواب ان کا اور زیادہ دے اپنے فضل سے، تحقیق وہ ہر بخشنے والا قہر دان۔

وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا

اور جو ہم نے تجھ پر اتاری کتاب وہی ٹھیک ہے تصدیق کرنے والی اپنے سے



بَلِّغْ يَدَيَّ إِنَّ اللَّهَ بِعِبَادِهِ لَخَبِيرٌ بَصِيرٌ ﴿٣١﴾ ثُمَّ آوَرْنَا الْكِتَابَ

اگلی کتابوں کی، بیشک اللہ اپنی بندوں سے خبردار ہی دیکھنے والا۔ پھر ہم نے وارث کے کتاب

الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فِي مَنَاصِبٍ خَالِدِينَ فِيهَا وَلَهُمْ فِيهَا مَنَاصِبٌ

کے وہ لوگ جن کی جن لیا ہم نے اپنی بندوں میں سے، پھر کوئی ان میں ہڑا کرتا ہو اپنی جان کا اور کوئی انہیں

مَقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ذَلِكَ هُوَ

ہی نیک کی چال پر اور کوئی ان میں آگے بڑھ گیا ہو نیک خوبیاں اللہ کے حکم سے، یہی ہے

الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿٣٢﴾ جَنَّاتٌ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ

بڑی بڑی۔ باغ ہیں بسنے کے جن میں وہ جائیں گے وہاں ان کو گھنا پہنایا جائے گا

أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿٣٣﴾ وَقَالُوا

کسنگن سونے کے اور موتی کے اور ان کی پوشاک وہاں ریشمی ہو۔ اور کہیں گے

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ ﴿٣٤﴾

شکر ہے اللہ کا جس نے دور کیا ہم سے غم بیشک ہمارا رب بخشنے والا قدردان ہے

الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمَقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ

جس نے اتارا ہم کو آباد رہنے کے گھر میں اپنے فضل سے نہ پہنچے ہم کو اس میں مشقت،

وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِينَ

اور نہ پہنچے ہم کو اس میں تھکنا، اور جو لوگ

كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فِيمَوْتُؤُهُمْ وَلَا يُخَفَّفُ

مسکریں ہیں ان کے لئے ہر آگ دوزخ کی، نہ تو ان پر حکم پہنچے کہ مر جائیں اور نہ ان پر ہلکی ہو

عَنْهُمْ مَنْ عَدَّ ابَهُمَا كَذْلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَافِرٍ ﴿٣٦﴾ وَهُمْ يَصْطَرِّخُونَ

وہاں کی کچھ کلفت، یہ سزا دیتے ہیں ہم ہر ناشکر کو۔ اور وہ چلاتے ہیں

فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ

اس میں اور ہم کو نکال کہ ہم کچھ بھلا کام کر لیں وہ نہیں جو کرتے رہے،

أَوَلَمْ نَعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمْ النَّذِيرُ

کیا ہم نے عمر نہ دی تھی تم کو اتنی کہ جس میں سوچ لے جس کو سوچنا ہو اور پہنچا تھا کہ پاس ڈرانے والا

فَذُرُّوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ (۳۷)

اب چھو کہ کوئی نہیں گنہگاروں کا مددگار۔

## خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ کتاب اللہ (یعنی قرآن) کی تلاوت (مع العمل) کرتے رہتے ہیں اور (خصوصاً) واہتمام کے ساتھ نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ (جس طرح بن پڑتا ہے) خرچ کرتے ہیں وہ (بوجہ وعدۃ الہیہ کے) ایسی (دائم النفع) تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماند نہ ہوگی (کیونکہ اس سودے کا خریدار کوئی مخلوقات میں سے نہیں ہے جو کبھی تو سودے کی قدر کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا خریدار خود حق تعالیٰ ہوگا، جو ضرور حسب وعدہ اپنی غرض سے نہیں بلکہ محض اُن کی نفع رسانی کے لئے اس کی قدر کرے گا) تاکہ ان کو اُن کے اعمال کی اجر تیں (بھی) پوری (پوری) دیں (جس کا بیان آگے آئے گا، جنت عدن الخ) اور (علاوہ اجرت کے) اُن کو اپنے فضل سے اور زیادہ (بھی) دیں، (مثلاً یہ کہ ایک نیکی کا ثواب دس کے برابر دیں، کما قال تعالیٰ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ مَثَلًا) بے شک وہ بڑا بخشنے والا بڑا قدر دان ہے (پس ان کے اعمال میں کچھ کوتاہی رہ بھی گئی تب بھی اس کی ایسی قدر کی کہ اجرت کے علاوہ انعام بھی دیا) اور (قرآن مجید پر عمل کرنے کی برکت سے جو ان کو اجر و فضل ملا سو واقعی قرآن مجید ایسی ہی چیز ہے، کیونکہ) یہ کتاب جو ہم نے آپ کے پاس وحی کے طور پر بھیجی ہے یہ بالکل ٹھیک ہو جو کہ اپنے سے پہلی کتابوں کی بھی (بائیں معنی) تصدیق کرتی ہے کہ ان کو اصل کے اعتبار سے منزل من اللہ بتلاتی ہے، اگرچہ بعد میں محرف ہو گئی ہوں، غرض یہ کتاب ہر طرح کامل ہے، اور چونکہ (بِقِنَا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی حالت کی) پوری خبر رکھنے والا (اور ان کی مصلحتوں کو) خوب دیکھنے والا ہے (اس لئے اس وقت ایسی ہی کتاب کامل کا نازل کرنا قرین حکمت بھی تھا اور کتاب کامل کا عامل مستحق جزائے کامل ہی کا ہوگا جو کہ مجموعہ ہر اصل اجر اور مزید فضل کا پس اس اجر و فضل کے افاصلہ کے لئے یہ کتاب ہم نے اول آپ پر نازل کی اور) پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچائی جن کو ہم نے اپنے (تمام دنیا جہان کے) بندوں میں سے (باعتبار ایمان کے) پسند فرمایا،



مراد اس سے اہل اسلام ہیں جو اس حیثیت ایمان سے تمام دنیا والوں میں مقبول عند اللہ ہیں گوان میں کوئی دوسری وجہ مثل بد عملی کے موجب ملامت بھی ہو۔ مطلب یہ کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں وہ کتاب پہنچائی (پھر ان منتخب اور پسندیدہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں، کہ بعضے تو ان میں کوئی گناہ کر کے) اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعضے ان میں (جو نہ گناہ کرتے ہیں اور نہ طاعات میں ضروریات سے تجاوز کرتے ہیں) متوسط درجہ کے ہیں اور بعضے ان میں وہ ہیں جو خدا کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں کہ گناہوں سے بھی بچتے ہیں اور فرائض کے ساتھ غیر فرائض کی بھی ہمت کرتے ہیں۔ غرض ہم نے تینوں قسم کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں وہ کتاب پہنچائی اور یہ (یعنی ایسی کتاب کامل کا پہنچا دینا خدا کا بڑا فضل ہے) کیونکہ اس پر عمل کرنے کی بدولت کیسے اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے آگے اس اجر و فضل مذکورۃ بالا کا بیان ہے کہ وہ (اجر و فضل) باغات ہیں ہمیشہ رہنے کے جس میں یہ لوگ (مذکورین آیت) اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْلُوْنَ الْخَیْرَ داخل ہوں گے (اور) ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے، اور پوشاک ان کی وہاں رشیم کی ہوگی اور وہاں (داخل ہو کر) کہیں گے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے (ہمیشہ کے لئے) بچو (و غم دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا قادر دان ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں نہ ہم کو کوئی کلفت پہنچے گی، اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہنچے گی) (یہ تو عاملان کتاب اللہ و احکام کا حال ہوا) اور جو لوگ (برخلاف انکے) کافر ہیں ان کے لئے دوزخ کی آگ ہے، نہ تو ان کو موت ہی آئے گی کہ مر ہی جا دیں (اور) مر کر چھوٹ جا دیں) اور نہ دوزخ کا عذاب ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا، ہم ہر کافر کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں اور وہ لوگ اس (دوزخ) میں (پڑے ہوئے) چلا دیں گے، کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو (یہاں سے) نکال لیجئے ہم (اب خوب) اچھے (اچھے) کام کریں گے برخلاف ان کاموں کے جو (پہلے) کیا کرتے تھے (ارشاد ہو گا کہ) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی کہ جس کو سمجھنا ہوتا وہ سمجھ سکتا اور (صرف عمر ہی دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ) تمہارے پاس (ہماری طرف سے) ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) بھی پہنچا تھا (خواہ بواسطہ یا بلا واسطہ) مگر تم نے ایک نہ سنی، سو (اب اُس نہ ماننے کا) مزہ چکھو کہ ایسے ظالموں کا (یہاں) کوئی مددگار نہیں (ہم تو بوجہ ناراضی کے مدد نہ کریں گے) اور دوسرے لوگ بوجہ عدم قدرت۔

## معارف و مسائل

ان آیات سے پہلی آیت میں علماء حق جو عارف باللہ ہوں ان کی ایک ایسی صفت کا ذکر تھا جس کا تعلق قلب سے ہے، یعنی خشیت اللہ۔ مذکور الصدر پہلی آیت میں انہی اولیاء اللہ کی چند ایسی صفات کا ذکر ہے جو اعضاء و جوارح سے ادا ہوتی ہیں۔ ان میں پہلی صفت تلاوت قرآن ہی اور مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو تلاوت کتاب اللہ پر مداومت کرتے ہیں۔ یَتْلُوْنَ بِصَیْغَةِ مَضَارِعِ اس کی طرف مشیر ہے۔ اور بعض حضرات نے اس جگہ یَتْلُوْنَ اس کے لغوی معنی میں لیا ہے، یعنی وہ عمل میں اتباع کرتے ہیں قرآن کا، مگر پہلی تفسیر راجح ہے۔ اگرچہ سیاق و سباق سے یہ بھی متعین ہے کہ تلاوت وہی معتبر ہے جس کے ساتھ قرآن پر عمل بھی ہو، مگر لفظ تلاوت اپنے معنی معنی میں ہے۔ اسی طرح حضرت مطرف بن عبد اللہ ابن شخیخ نے فرمایا ہے هَذِهِ آيَةُ الْفُقَرَاءِ یعنی یہ آیت قرآن کے لئے ہے، جو تلاوت قرآن کو اپنا مشغلہ زندگی بناتے ہیں۔

ان کی دوسری صفت اقامت صلوٰۃ اور تیسری اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے۔ خرچ کرنے کے ساتھ ستراً و علانیۃً فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ اکثر عبادات میں ریا سے بچنے کے لئے خفیہ کرنا بہتر ہوتا ہے، مگر بعض اوقات مصالح دینیہ اس کو بھی مقتضی ہوتی ہیں کہ اعلان کے ساتھ کیا جائے، جیسے نماز جماعت کہ میناروں پر اذان دے کر اور زیادہ سے زیادہ اجتماع کے ساتھ علانیہ طور پر ادا کرنے کا حکم ہے۔ اسی طرح بعض اوقات اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اظہار بھی دوسروں کی ترغیب کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ حضرات فقہائے نماز اور اتفاق فی سبیل اللہ دونوں میں یہ تفصیل فرمائی ہے کہ فرض و واجب یا سنت مؤکدہ ہے اس کو تو علانیہ کرنا بہتر ہے اس کے سوا نفلی نماز کا خفیہ ادا کرنا بہتر ہے۔ اسی طرح جہاں مال خرچ کرنا فرض یا واجب ہے، جیسے زکوٰۃ فرض یا صدقۃ الفطر یا قربانی ان میں علانیہ خرچ کرنا بہتر اور افضل ہے، باقی صدقات نافلہ کو خفیہ خرچ کرنا افضل ہے۔

جو لوگ ان تینوں صفات کے حامل ہوں یعنی تلاوت قرآن پر مداومت اور اقامت صلوٰۃ اور اللہ کی راہ میں خوش دلی کے ساتھ مال خرچ کرنا کہ صرف فرض و واجب ہی کی حد تک نہ رہے بلکہ نفلی صدقات بھی کریں۔ آگے ان کی ایک صفت یہ بتلائی کہ یَرْجُوْنَ تِجَارَةً تَرْجُوْنَ تَبَوُّرًا، تَرْجُوْنَ تَبَوُّرًا، بَوَّارًا، مشتق ہے، جس کے معنی ضائع ہو جانے کے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ صفات مذکورہ کے پابند مومنین ایک ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس میں کبھی خسارہ نہیں ہوتا۔ امیدوار



ہونے کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہوا کہ مومن کو دنیا میں اپنے کسی بھی نیک عمل پر یقین کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ ہمیں ضرور بخشوا دے گا، اور اس کا اجر و ثواب ہمیں یقینی ملے گا۔ کیونکہ مکمل مغفرت اور بخشش تو کسی انسان کی بھی صرف اس کے عمل سے نہیں ہو سکتی، کیونکہ انسان کتنا بھی عمل صالح کرے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و عبادت کے حق کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے مغفرت سب کی اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر نہیں ہوگی، جیسا کہ ایک حدیث میں اس مضمون کی تصریح آئی ہے۔ اس کے علاوہ ہر نیک عمل کے ساتھ آدمی کو اس خطرہ سے بھی غافل نہیں ہونا چاہئے کہ بہت سے نیک اعمال میں کوئی مخفی کید شیطانی یا نفسانی شامل ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ مقبول نہیں ہوتا، یا بعض اوقات ایک نیک عمل کے ساتھ کوئی بُرا عمل ایسا ہو جاتا ہے جو نیک عمل کی مقبولیت سے بھی مانع ہو جاتا ہے۔ اس لئے آیت میں لفظ یُجَوِّنْ لاکر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ سارے اعمال صالحہ کی پابندی کے بعد بھی کسی کو اپنی نجات اور درجات عالیہ کا یقین کر لینے کا حق نہیں، بس زیادہ سے زیادہ امید ہی کر سکتے ہیں۔ (روح)

اعمال صالحہ کی مثال تجارت سے | اس آیت میں ان اعمال صالحہ مذکورہ کو بطور تشبیہ و مثال ایک تجارت سے تعبیر کیا گیا، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کو تجارت سے تعبیر فرمایا ہے: هَلْ أَذِلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ تَوَّابُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ، تجارت کی مثال اس وصف میں ہے کہ تاجر اپنا سرمایہ اور وقت کسی کام میں اس وقت لگاتا ہے کہ اس سے اس کا سرمایہ بڑھ جائے گا، اور نفع پہنچے گا۔ لیکن دنیا کی ہر تجارت میں نفع کے ساتھ نقصان و خسارہ کا بھی احتمال لگا رہتا ہے۔ آیت مذکورہ میں تجارت کے ساتھ کن تَبَوَّرَ کا لفظ بڑھا کر اشارہ کر دیا کہ اس تجارت آخرت میں نقصان و خسارہ کا کوئی احتمال نہیں۔ اور اللہ کے نیک بندے جو اعمال صالحہ میں مشقت و محنت اٹھاتے ہیں وہ عام تجارتوں کی طرح تجارت نہیں کرتے، بلکہ ایک ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس میں کبھی خسارہ نہیں ہوتا۔ اور ان کی امید داری کا ذکر کرنا اشارہ خفی اس طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کریم الکرم ہیں وہ امیدواروں کی امید کو قطع نہیں کریں گے بلکہ پورا کریں گے، بلکہ اگلے جملے میں یہ بھی فرمادیا کہ ان کی امید تو صرف اپنے عمل کا پورا بدلہ ملنے تک محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ان کی امیدوں سے بھی زیادہ عطا فرمائیں گے۔ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ، لفظ لِيُوَفِّيَهُمْ کا تعلق کن تَبَوَّرَ سے ہے۔ یعنی ان کی تجارت خسارے کی محفل

نہیں بلکہ ان کے اجر و ثواب ان کو پورے پورے ملیں گے، اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے منظورہ اجر و ثواب سے بھی کہیں زیادہ عطا فرمائیں گے۔

اس فضل و زیادتی میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی شامل ہے کہ مؤمن کے عمل کا اجر حق تعالیٰ چند در چند کر کے عطا فرماتے ہیں، جس کی ادنیٰ مقدار عمل کا دس گنا اور زیادہ سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے، اور دوسرے گناہگاروں کے حق میں ان کی سفارش قبول کرنا اس فضل میں شامل ہے جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس فضل کی تفسیر میں یہ روایت کی ہے کہ ان لوگوں پر دنیا میں جس نے احسان کیا تھا یہ لوگ اس کی سفارش کریں گے تو باوجود سزائے جہنم کے مستحق ہونے کے ان کی سفارش سے ان کو نجات ہو جائے گی۔ (تفسیر منطہری بحوالہ ابن ابی حاتم) اور یہ ظاہر ہے کہ شفاعت صرف اہل ایمان کے لئے ہو سکے گی، کافر کی شفاعت کی کسی کو اجازت نہ ہوگی، اسی طرح جنت میں حق تعالیٰ کا دیدار بھی اس فضل کا جزو اعظم ہے۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا، حرف ثم عطف کے لئے آتا ہے اور اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس حرف سے پہلے اور بعد کی دونوں چیزیں اصل وصف میں مشترک ہونے کے باوجود تقدیم و تاخیر رکھتی ہیں۔ پہلی چیز مقدم اور بعد کی چیز مؤخر ہوتی ہے، پھر یہ تقدیم و تاخیر بھی زمانے کے اعتبار سے ہوتی ہے، کبھی رتبہ اور درجہ کے اعتبار سے۔ اس آیت میں حرف ثم عطف ہو اس سے پہلی آیت کے لفظ أَوْحَيْنَا پر، معنی یہ ہیں کہ ہم نے یہ کتاب یعنی قرآن جو خالص حق ہی ہے، اور تمام پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، پہلے بطور وحی آپ کے پاس بھیجی، اس کے بعد ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنادیا جن کو ہم نے منتخب اور پسند کر لیا ہے اپنے بندوں میں سے۔ یہ اول و آخر اور مقدم و مؤخر ہونا رتبہ اور درجہ کے اعتبار سے تو ظاہر ہے ہی کہ قرآن کا بذریعہ وحی آپ کے پاس بھیجنا رتبہ اور درجہ میں مقدم ہو اور امت محمدیہ کو عطا فرمانا اس سے مؤخر ہے۔ اور اگر امت کو وارث قرآن بنانے کا مطلب یہ لیا جائے کہ آپ نے اپنے بعد کے لئے امت کے واسطے زر و زمین کی وراثت چھوڑنے کے بجائے اللہ کی کتاب بطور وراثت چھوڑی، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی شہادت موجود ہے کہ انبیاء و رہم و دینار کی وراثت نہیں چھوڑا کرتے، وہ وراثت میں علم چھوڑتے ہیں، اور ایک دوسری حدیث میں علماء کو وارث انبیاء فرمایا ہے، تو اس لحاظ سے یہ تقدیم و تاخیر زمانی بھی ہو سکتی ہے کہ ہم نے یہ کتاب آپ کو عنایت فرمائی ہے پھر آپ نے اس کو امت کے لئے بطور وراثت چھوڑا۔ وارث بنائے مراد عطا کرنا ہے، اس عطا کو بلفظ میراث تعبیر کرنے میں اس طر اشارہ ہو کہ جس طرح وارث کو میراث کا حصہ بغیر کسی عمل اور



کوشش کے مل جاتا ہے، قرآن کریم کی یہ دولت بھی ان منتخب بندوں کو اسی طرح بغیر کسی محنت و مشقت کے دیدی گئی ہے۔

اُمّتِ محمدیہ خصوصاً اس کے علماء کی ایک اہم فضیلت و خصوصیت

قراردیدیا اپنے بندوں میں سے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد اُمّتِ محمدیہ ہے، اس کے علماء بلا واسطہ اور دوسرے لوگ بواسطہ علماء۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اصْطَفَيْنَا سے مراد اُمّتِ محمدیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر اس کتاب کا وارث بنایا ہے جو اس نے اُتاری ہے، (یعنی قرآن سب کتب سابقہ کی تصدیق و حفاظت کرنے والی کتاب ہونے کی حیثیت سے۔ تمام آسمانی کتابوں کے مضامین کی جامع ہے، اس کا وارث بننا گویا سب آسمانی کتابوں کا وارث بننا ہے) پھر فرمایا قَدْ خَفِیْ لَهُمْ فَتَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَحْسَبُ حِسَابًا یَسِیْرًا وَ سَابِقُہُمْ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ یَغِیْرُ حِسَابٍ، یعنی اُس اُمّت کا ظالم بھی بخشا جائے گا اور میانہ روی کرنے والے سے آسان حساب لیا جائے گا، اور سابق بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا (ابن کثیر)

اس آیت میں لفظ اصْطَفَيْنَا سے اُمّتِ محمدیہ کی سب سے بڑی عظیم فضیلت ظاہر ہوئی۔ کیونکہ لفظ اصطفاء قرآن کریم میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے لئے آیا ہے، اَللّٰهُ یُصْطَفِیْ مِنْ اَمَلِکَ رُسُلًا مِنْ النَّاسِ، اور ایک آیت میں ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰ اٰدَمَ وَ نُوحًا وَ اٰلَ اِبْرٰہِیْمَ وَ اٰلَ عِمرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ، آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اُمّتِ محمدیہ کو اصطفاء یعنی انتخاب میں انبیاء اور ملائکہ کے ساتھ شریک فرمادیا، اگرچہ اصطفاء کے درجہ مختلف ہیں، انبیاء و ملائکہ کا اصطفاء اعلیٰ درجہ میں اور اُمّتِ محمدیہ کا بعد کے درجہ میں ہے۔

اُمّتِ محمدیہ کی تین قسمیں | فِیْنِہُمْ ظٰلِمٌ لِّنَفْسِہٖ مِنْہُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْہُمْ سَابِقٌ بِالْخَیْرٰتِ یہ جملہ پہلے جملے کی تفسیر و توضیح ہے۔ یعنی ہم نے اپنی جن بندوں کو منتخب اور پسند فرمایا ان کو قرآن کا وارث بنایا ہے، ان کی تین قسمیں ہیں، ظالم، مقتصد، سابق۔

ان تینوں قسموں کی تفسیر امام ابن کثیرؒ نے اس طرح بیان فرمائی ہے کہ ظالم سے مراد وہ آدمی ہے جو بعض واجبات میں کوتاہی کرتا ہے اور بعض محرمات کا بھی ارتکاب کر لیتا ہے اور مقتصد (یعنی درمیانی چال چلنے والا) وہ شخص ہے جو تمام واجبات شرعیہ کو ادا کرتا ہے اور تمام محرمات سے بچتا ہے، مگر بعض اوقات بعض مستحبات کو چھوڑ دیتا ہے اور بعض مکروہات میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور سابق بالخیرات وہ شخص ہے جو تمام واجبات اور مستحبات کو ادا کرتا ہے، اور تمام محرمات و مکروہات سے بچتا ہے، اور بعض مباحات

کو اشتغال عبادت یا شبہ حرمت کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے۔

یہ ابن کثیر کا بیان ہے۔ دوسرے مفسرین نے ان تین قسموں کی تفسیر میں بہت مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ روح المعانی میں بحوالہ تحریر تینتالیس اقوال کا ذکر کیا ہے، مگر غور کیا جائے تو ان میں سے اکثر کا حاصل وہی ہے جو اد پر ابن کثیر کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک شبہ اور جواب [مذکورہ تفسیر سے یہ ثابت ہوا کہ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا سے مراد اُمّتِ محمدیہ ہے اور اس کی یہ تین قسمیں ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس کی پہلی قسم یعنی ظالم بھی الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا یعنی اللہ کے منتخب بندوں میں شامل ہے، اس کو بظاہر مستبعد سمجھ کر بعض لوگوں نے کہا کہ یہ اُمّتِ محمدیہ اور اصطفینا سے خارج ہے۔ مگر بہت سی احادیث صحیحہ معتبرہ سے ثابت ہے کہ یہ تینوں قسمیں اُمّتِ محمدیہ کی ہیں اور اصطفینا کے وصف سے خارج نہیں۔ یہ اُمّتِ محمدیہ کے مؤمن بندوں کی انتہائی خصوصیت اور فضیلت ہے کہ ان میں جو عملی طور پر ناقص بھی ہیں وہ بھی اس شرف میں داخل ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے اس جگہ وہ سب روایات حدیث جمع کر دی ہیں۔ ان میں بعض یہ ہیں :-

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا کی تینوں قسموں کے متعلق فرمایا کہ یہ سب ایک ہی مرتبے میں ہیں اور سب جنت میں ہیں۔ (رداہ احمد ابن کثیر) ایک مرتبہ میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ سب کی مغفرت ہو جائے گی اور سب جنت میں جائیں گے، یہ مطلب نہیں کہ درجات کے اعتبار سے ان میں تفاضل نہ ہوگا۔

اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے باسانید متعدد ایک حدیث منقول ہے، ابن کثیر نے ان سب کو نقل کیا ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو ابن جریر نے ابو ثابتؓ سے نقل کی ہے کہ وہ ایک روز مسجد میں گئے تو وہاں ابوالدرداءؓ پہلے سے بیٹھے تھے، ابو ثابتؓ ان کے برابر جا کر بیٹھ گئے اور یہ دعا کرنے لگے، اَللّٰهُمَّ اِنِّسْ وَحْشَتِيْ وَارْحَمْ عُرْبَتِيْ وَكَيْسِرَتِيْ جَلِيْسًا صَالِحًا، یعنی یا اللہ میری قلبی وحشت و پریشانی کو دور فرما، اور میری حالتِ مسافرت پر رحم فرما، اور مجھے کوئی جلیس رہنشین، صالح نصیب فرما دے (یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سلف صالحین میں جلیس صالح کی طلب و تلاش کا کیا درجہ تھا کہ اس کو اہم مقصد اور سب پریشانیوں کا علاج سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے اس کی دعائیں مانگتے تھے) ابوالدرداءؓ نے یہ دعا سنی تو فرمایا کہ اگر آپ اپنی اس دعا و طلب میں سچے ہیں تو میں اس معاملہ میں آپ سے زیادہ خوش نصیب ہوں۔ (مطلب یہ ہے کہ مجھے اللہ نے آپ جیسا جلیس صالح بے مانگے دیدیا) اور فرمایا کہ



ہیں آپ کو ایک حدیث سنا تا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، مگر جب سے میں نے اس کو سنا ہے اب تک کسی سے بیان کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ یہ ہو کہ آپ نے اس آیت کا ذکر فرمایا ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اتَّخَذُوا آيَاتِنَا هُتُوًا أُولَٰئِكَ هُمُ الَّذِينَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ الَّذِي هُم مِّنْهُ لَا يَرْجُونَ نُجَاً أُولَٰئِكَ هُمُ الَّذِينَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ الَّذِي هُم مِّنْهُ لَا يَرْجُونَ نُجَاً۔ ان میں سے جو سابق بالخیرات ہیں وہ تو بے حساب جنت میں جاتے ہیں اور جو مقتصد یعنی درمیانے ہیں ان سے ہلکا حساب لیا جائے گا، اور ظالم یعنی جو اعمال میں کوتاہی کرنے والے اور گناہوں کی لغزش میں مبتلا ہوئے ہیں، اُن کو اس مقام میں سخت رنج و غم طاری ہوگا، پھر ان کو بھی جنت میں داخلہ کا حکم ہو جائے گا، اور سب رنج و غم دور ہو جائیں گے۔ اسی کا ذکر اگلی آیت میں آیا ہے، وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ۔ یعنی وہ کہیں گے شکر ہوا اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کر دیا۔

اور طبرانی نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تِلْكَ الْوَاوِيَّةَ، یعنی یہ تینوں قسمیں اسی اُمت محمدیہ میں سے ہوں گی۔ اور ابو داؤد طیالسی نے عقبہ ابن صہبان ہنالی سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے اُم المؤمنین حضرت صدیقہ عائشہؓ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی تو انھوں نے فرمایا، بیٹا یہ تینوں قسمیں جنتی ہیں۔ ان میں سے سابق بالخیرات تو وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں گزر گئے، جن کے جنتی ہونے کی شہادت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیدی، اور مقتصد وہ لوگ ہیں جو ان کے نشان قدم پر چلے، اور سابقین کی اقتداء پر قائم رہ کر یہاں تک کہ ان کے ساتھ مل گئے، باقی رہے ظالم لنفسہ، تو ہم تم جیسے لوگ ہیں۔ یہ صدیقہ عائشہؓ کی تواضع تھی کہ اپنے آپ کو بھی انھوں نے تیسرے درجہ میں یعنی ظالم لنفسہ میں شمار کیا حالانکہ وہ احادیث صحیحہ کی تصریحات کے مطابق سابقین اولین میں سے ہیں۔

اور ابن جریر نے حضرت محمد بن حنفیہؓ سے نقل کیا، فرمایا کہ یہ اُمت اُمت مرحومہ ہے اس کا ظالم بھی مغفور ہو اور مقتصد یعنی میانہ رُوح جنت میں ہے، اور سابق بالخیرات اللہ کے نزدیک درجات عالیہ میں ہے۔

اور حضرت محمد بن علی باقر رضی اللہ عنہ نے ظالم لنفسہ کی تفسیر میں فرمایا الَّذِي خَلَطَ عَمَلًا صَلَاحًا وَآخَرَ سَيِّئًا، یعنی وہ شخص جس نے نیک و بد دونوں طرح کے اعمال میں خلط ملط کیا ہو۔

علماء اُمت محمدیہ کی عظیم شان فضیلت | اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ہم نے

اپنی کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جو ہمارے بندوں میں منتخب اور برگزیدہ ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کتاب اللہ اور علوم نبوت کے بلا واسطہ وارث حضرات علماء ہیں، جیسا کہ حدیث میں بھی ارشاد ہے **الْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ**۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن و سنت کے علوم کا مشغلہ اخلاص کے ساتھ نصیب فرمایا یہ اس کی علامت ہے کہ وہ اللہ کے برگزیدہ اولیاء ہیں، جیسا کہ حضرت ثعلبہ بن الحکمؓ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز علماء پر اُمت سے خطاب فرما کر کہیں گے کہ میں نے تمہارے سینوں میں اپنا علم و حکمت صرف اسی لئے رکھا تھا کہ میرا ارادہ یہ تھا کہ تمہاری مغفرت کر دوں عمل تمہارے کیسے بھی ہوں (یہ ادھر معلوم ہو چکا ہے کہ جس شخص میں خشیت اور خوف خدا نہیں وہ علماء کی فہرست ہی سے خارج ہے۔ اس لئے یہ خطاب اپنی لوگوں کو ہو گا جو خشیت اللہ میں رنگے ہوئے ہوں ان سے یہ ممکن ہی نہیں ہو گا کہ بے فکری سے گناہوں میں ملوث رہیں، ہاں طبیعت بشریہ کے تقاضوں سے کبھی کبھی لغزش اُن سے بھی ہوتی ہے۔ اسی کو اس حدیث میں فرمایا کہ عمل تمہارے کیسے بھی ہوں تمہارے لئے مغفرت مقدر ہے)۔

یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں، اور آخری حدیث جو حضرت ثعلبہؓ سے روایت کی گئی ہے اس کو طبرانی نے بھی روایت کیا ہے، جس کی سند کے سب رجال ثقہ ہیں۔ (تفسیر مظہری) اور تفسیر مظہری میں بحوالہ ابن عساکر حدیث مذکور کا یہی مضمون ابو عمر صنعانی سے بھی روایت کیا ہے، اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں اللہ اپنے سب بندوں کو جمع فرما دیں گے پھر ان میں سے علماء کو ایک ممتاز مقام پر جمع کر کے فرما دیں گے:

اِنِّیْ لَمَّا صَنَعْتُ عَلَیْکُمْ اِلٰہًا	یعنی میں نے اپنا علم تمہارے قلوب
لَعَلِّیْ بِکُمْ وَ لَمَّا صَنَعْتُ عَلَیْکُمْ	میں اسی لئے رکھا تھا کہ میں تم سے دعا
فِیْکُمْ لَا عِزَّ بِکُمْ اِنْ طَلَعْتُ اَیُّ	تمہارا کہ تم اس امانت علم کا حق ادا کر دو گے
قَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ	میں نے اپنا علم تمہارے سینوں میں اس لئے

نہیں رکھا تھا کہ تمہیں عذاب و دوزخ میں نے تمہاری مغفرت کر دی (مظہری)  
**فائدہ:**۔ اس آیت میں سب سے پہلے ظالم کو پھر مقتصد کو آخر میں سابق بالخیرات کو ذکر فرمایا ہے۔ اس ترتیب کا سبب شاید یہ ہو کہ تعداد کے اعتبار سے ظالم بنفسہ سب سے زیادہ ہیں ان سے کم مقتصد اور ان سے کم سابق بالخیرات ہیں، جن کی تعداد زیادہ تھی ان کو مقدم کیا گیا۔



ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ جَنَّتٌ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيُؤْتَوْنَ عُقَاقِيبًا سُمُّهُمْ فِيهَا خَرِيرٌ، شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ منتخب لوگوں کی تین قسمیں بتلائی ہیں، پھر فرمایا ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ، یعنی ان تینوں کو برگزیدہ بندوں میں شمار کرنا یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔ آگے ان کی جزا کا بیان ہے کہ یہ جنت میں جائیں گے، ان کو سونے کے کنگن اور موتیوں کے زیور پہنائے جائیں گے، اور لباس ان کا ریشمی ہوگا۔

دنیا میں مردوں کے لئے سونے کا زیور پہننا بھی حرام ہے اور ریشمی لباس بھی، اس کے عوض میں ان کو جنت میں یہ سب چیزیں دی جائیں گی۔ اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ زیور پہننا تو عورتوں کا کام ہے، مردوں کے شایانِ شان نہیں، کیونکہ آخرت اور جنت کے حالات کو دنیا کے حالات پر قیاس کرنا بے عقلی ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کے سروں پر تاج موتیوں سے مرتع ہوں گے، ان کے ادنی موتی کی روشنی ایسی ہوگی کہ مشرق سے مغرب تک پورے عالم کو روشن کر دے گی۔ (رواہ الترمذی والحاکم وصحیحہ والبیہقی، از مظہری)

امام قرطبی نے فرمایا کہ حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ ہر جنتی کے ہاتھ میں کنگن پہنائے جائیں گے، ایک سونے کا ایک چاندی کا ایک موتیوں کا۔ جنتی کنگن کے متعلق ایک آیت میں چاندی کے اور دوسری میں سونے کے مذکور ہیں۔ اس تفسیر سے ان دونوں آیتوں میں تطبیق بھی ہوگئی۔

جو شخص دنیا میں سونے چاندی کے برتن اور ریشمی لباس استعمال کرے گا جنت میں ان محروم ہوگا۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ریشمی لباس نہ پہنو، اور سونے چاندی کے برتنوں میں پانی نہ پیو، اور نہ ان کی پلیٹ کھانے میں استعمال کرو، کیونکہ یہ چیزیں دنیا میں کفار کے لئے ہیں اور تمھارے لئے آخرت میں (بخاری و مسلم) اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس مرد نے دنیا میں ریشمی کپڑا پہنا وہ آخرت میں نہ پہن سکے گا۔ (بخاری و مسلم) اور حضرت ابوسعید خدریؓ کی ایک روایت میں ہے کہ دنیا میں ریشمی لباس پہننے والا مرد آخرت میں اس سے محروم ہوگا، اگرچہ جنت میں چلا بھی جائے۔ (مظہری)

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ، یعنی اہل جنت جنت میں داخل ہونے کے وقت کہیں گے، شکر ہو اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کر دیا۔ اس غم سے کیا مراد

اس میں ائمہ تفسیر کے مختلف اقوال ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ سالے ہی رنج و غم اس میں داخل ہیں دنیا میں انسان کتنا ہی بڑا بادشاہ بن جائے یا بنی و دلی رنج و غم کسی کو چھٹکارا نہیں دے دریں دنیا کسے بے غم نباشد و گر باشد بنی آدم نباشد اس دنیا میں غموں اور فکروں سے کسی ایک یا بد کو نجات نہیں، اسی لئے اہل دانش دنیا کو دارالاحزان کہتے ہیں۔ اس آیت میں جس غم کے دور کرنے کا ذکر ہے اس میں یہ دنیا کے غم بھی سب کے سب داخل ہیں، دوسرا غم و فکر قیامت اور حشر و نشر کا، تیسرا حساب کتاب کا، چوتھا جہنم کے عذاب کا، اہل جنت سے اللہ تعالیٰ یہ سب غم دور فرمادیں گے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلمہ لا الہ الا اللہ والوں میں نہ موت کے وقت کوئی وحشت ہوتی ہے، نہ قبر میں اور نہ محشر میں۔ گویا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ جس وقت یہ لوگ اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو یہ کہتے ہوں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا اَلْحَزْنَ، (رواہ الطبرانی، منظری) اور حضرت ابوالدرداء کی حدیث جو اوپر گزری ہو اس میں جو یہ فرمایا ہے کہ یہ قول اُن لوگوں کا ہوگا جو ظالم لنفسہ ہیں۔ کیونکہ محشر میں ان کو ابتداءً سخت رنج و غم اور اضطراب پیش آئے گا۔ آخر میں دخول جنت کا حکم مل کر یہ رنج و غم دور ہو جائے گا۔ اس حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متافی نہیں، کیونکہ ظالم لنفسہ کو دوسروں کے غموں سے زیادہ ایک غم محشر میں بھی پیش آئے گا، جو دخول جنت کے وقت دور ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ قول تو سہی اہل جنت کہیں گے، خواہ سابقین میں سے ہوں یا مقتصدین میں سے یا ظالم لنفسہ، لیکن ہر ایک کے غموں کی فہرست الگ الگ ہونا کچھ مستبعد نہیں۔ امام جصاص نے فرمایا کہ مؤمن کی شان یہی ہے کہ دنیا میں فکر و غم سے خالی نہ رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ کے حالات میں ہے کہ یہ حضرات اکثر محزون و مغموم نظر آتے تھے۔

اَلَّذِیْ اٰخَلَّنَا دَارَ الْمَقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا الْغُوْبُ، اس آیت میں جنت کی چند خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ اول یہ کہ وہ دارالمنافاة ہے اس کے زوال یا وہاں سے نکالے جانے کا کسی وقت خطرہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہاں کسی کو کوئی غم پیش نہ آئے گا۔ تیسرے یہ کہ وہاں کسی کو تکوان بھی محسوس نہیں ہوگا جیسے دنیا میں آدمی کو تکوان ہوتا ہے، کام چھوڑ کر نیند کی ضرورت محسوس کرتا ہے، جنت اس



سے بھی پاک ہوگی۔ بعض روایات حدیث میں بھی یہ مضمون مذکور ہے (منظری)

اَوْ لَعَنَ نَعِيْرُكُمْ مَّا يَشْنُكُمْ فَيُؤَيِّدُ مِنْ تَنْكُرٍ وَجَاءَ كُفْرُ النَّاسِ حُرًّا، یعنی جب جہنم میں یہ فریاد کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار آپ ہمیں اس عذاب سے نکال دیجئے اب ہم نیک عمل کریں گے اور پچھلی بد اعمالیوں کو چھوڑ دیں گے۔ اس وقت یہ جواب دیا جائے گا کہ کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر کی مہلت نہیں دی تھی جس میں غور کرنے والا غور کر کے صحیح راستہ پر آجائے۔ حضرت علی ابن حسین زین العابدین رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے مراد سترہ سال کی عمر ہے۔ اور حضرت قتادہؒ نے اٹھارہ سال کی عمر بتلائی اور مراد اس سے عمر بلوغ ہے، اور سترہ اٹھارہ کا فرق بلوغ میں ہو سکتا ہے کہ کوئی سترہ سال میں بالغ ہو کوئی اٹھارہ سال میں۔ عمر بلوغ شریعت میں پہلی حد ہے جس میں داخل ہو کر انسان کو منجانب اللہ اتنی عقل دیدی جاتی ہے کہ اپنے بھلے بُرے کو سمجھنے لگے۔ اس لئے یہ خطاب عام کفار سے ہوگا، خواہ طویل العمر ہوں یا قصیر العمر۔ البتہ جس کو عمر طویل ملی اور پھر بھی اس نے ہوش نہ سنبھالا، اور دلائل قدرت کو دیکھ کر اور انبیاء کی باتیں سن کر حق کو نہ پہچانا وہ زیادہ مستحق ملامت ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کو صرف عمر بلوغ ملی اس کو بھی قدرت نے اتنا سامان دیدیا تھا کہ حق و باطل میں امتیاز کر سکے جب نہ کیا تو وہ بھی مستحق ملامت و عذاب کا ہے، لیکن جس کو زیادہ عمر طویل ملی اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت اور زیادہ پوری ہو گئی وہ اگر اپنے کفر و معصیت سے باز نہ آیا وہ زیادہ مستحق عذاب و ملامت ہے۔

حضرت علی مرتضیٰؑ نے فرمایا وہ عمر جس پر اللہ تعالیٰ نے گناہگار بندوں کو عار دلائی ساٹھ سال ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے ایک روایت میں چالیس اور دوسری میں ساٹھ سال کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ وہ عمر ہے جس میں انسان پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے، اور انسان کو کوئی عذر کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ ابن کثیر نے حضرت ابن عباسؓ کی اس دوسری حدیث کو ترجیح دی ہے۔

تقریر مذکور سے واضح ہو چکا ہے کہ سترہ اٹھارہ سال کی روایات اور ساٹھ سال کی روایات میں کوئی تعارض نہیں۔ اگرچہ انسان سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں اس قابل ہوتا ہے کہ غور و فکر کر کے حق و باطل میں تمیز کرے، اسی لئے اسی عمر بلوغ سے اس کو احکام شرعیہ کا مکلف قرار دیا گیا ہے، مگر ساٹھ سال ایسی عمر طویل ہے کہ اگر اس میں بھی کسی نے حق کو نہ پہچانا تو اسے کسی عذر کی گنجائش نہیں رہی، اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری طرح تمام ہو چکی۔ اسی لئے امت مرحومہ کی عام عمریں ساٹھ سال سے ستر سال تک مقدریں ہیں، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:-

أَعْمَارًا مَّتًى مَّا بَلَغَ الْبَسِيتَيْنِ  
إِلَى السَّبْعَيْنِ وَأَقْلَهُمْ مَرَجٌ  
يَجُوزُ ذَلِكَ، (رواه الترمذی و

ابن ماجہ، ابن کثیر)

”یعنی میری امت کے عمریں ساٹھ سے  
ستر سال تک ہوں گی، کم لوگ ہوں گے  
جو اس سے تجاوز کریں گے“

آخر آیت میں فرمایا زَجَاءَ كُمْ الثَّانِي يُرَى، اس میں اشارہ ہے کہ انسان کو عمر بلوغ  
کے وقت سے اتنی عقل و تمیز منجانب اللہ عطا ہو جاتی ہے کہ کم از کم اپنے خالق و مالک کو پہچانے  
اور اس کی رضا جوئی کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے۔ اتنے کام کے لئے خود انسانی عقل بھی کافی  
تھی، مگر اللہ جل شانہ نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ اس عقل کی امداد کے لئے نذیر  
بھی بھیجے، نذیر کے معنی اردو میں ڈرانے والے کے کئے جاتے ہیں، درحقیقت نذیر وہ شخص  
ہو جو اپنی رحمت و شفقت کے سبب اپنے لوگوں کو ایسی چیزوں سے بچنے کی ہدایت کرے  
جو اس کو ہلاکت یا مضرت میں ڈالنے والی ہیں اور ان چیزوں سے لوگوں کو ڈرائے۔ مراد اس سے  
معروف معنی کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء ہیں۔ حاصل آیت کا یہ  
ہو کہ ہم نے حق و باطل کو پہچاننے کے لئے عقل بھی دی، اس کے ساتھ اپنے پیغمبر بھی بھیجے جو  
حق کی طرف ہدایت کریں باطل سے بچائیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی عنہما، اور امام جعفر باقر سے منقول ہے کہ نذیر سے مراد  
بڑا صحابہ کے سفید بال ہیں، کہ جب وہ ظاہر ہو جائیں تو وہ انسان کو — اس کی ہدایت  
کرتے ہیں کہ اب رخصت کا وقت قریب آگیا ہے۔ یہ قول بھی پہلے قول سے متعارض نہیں  
کہ سفید بال بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نذیر ہوں اور انبیاء و علماء بھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کو بالغ ہونے کے بعد سے جتنے حالات پیش آتے ہیں اس  
کے اپنے وجود اور گرد و پیش میں جو تغیرات و انقلابات آتے ہیں، وہ سب ہی اللہ تعالیٰ کی  
طرف سے نذیر اور انسان کو متنبہ کرنے والے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمُ غَيْبِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ عَلِيمُ بِذَاتِ

اللہ بھید جاننے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اس کو خوب معلوم ہے جو بات ہے

الْصُّدُورِ (۳۸) هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ فَسَنُ

دلوں میں، وہی ہے جس نے کیا تم کو قائم مقام زمین میں پھر کوئی



كُفِّرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ط وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

ناشکری کرے تو اس پر پڑے اس کی ناشکری، اور منکروں کو نہ بڑھے گی ان کے انکار سے ان کے رب کے سامنے

إِلَّا مَقْتَبًا وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾ قُلْ

مگر بیزاری، اور منکروں کو نہ بڑھے گا ان کے انکار سے مگر نقصان۔ تو کہہ بھلا

أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَ كُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي

دیکھو تو اپنے شریکوں کو جن کو پکارتے ہو اللہ کے سوائے دکھلاؤ تو مجھ کو

مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ أَمْ

کیا بنایا انھوں نے زمین میں یا کچھ ان کا سا جہاں آسمانوں میں یا ہم نے

أَتَيْنَهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَى بَيِّنَةٍ مِّنْهُ بَلْ إِنَّا نَعِدُ الظَّالِمُونَ

دی ہوا ان کو کوئی کتاب سو یہ سندر رکھتے ہیں اس کی، کوئی نہیں پر جو وعدہ بتلاتے ہیں گنہگار

بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ﴿۴۰﴾ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَ

ایک دوسرے کو سب فریب ہے۔ تحقیق اللہ تمام رہا ہے آسمانوں کو اور

الْأَرْضِ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ

زمین کو کہ ٹل نہ جائیں، اور اگر ٹل جائیں تو کوئی نہ تھا سچے اُن کو

مَنْ بَعْدَهُ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿۴۱﴾

اس کے سوائے وہی تحمل والا بخشنے والا۔

## خُلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ وہی، جاننے والا ہے آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کا بیشک وہی جاننے والا ہے دل کی باتوں کا پس کمال علی تو اس کا ایسا ہے، اور کمال عملی جو کہ قدرت اور نعمت دونوں پر دلالت کرتا ہے یہ ہے کہ وہی ایسا ہی جس نے تم کو زمین میں آباد کیا، (اور ان دلائل احسانات کا مقتضایہ تھا کہ استدلالاً و مشکراً توحید و اطاعت اختیار کر لیتے، مگر بعضے اس کے خلاف کفر و عداوت پر مصر ہیں) سو کسی دوسرے کا کیا بگڑتا ہے، بلکہ جو شخص کفر کریگا

اس کے کفر کا وبال اسی پر پڑے گا اور اس وبال کی تفصیل یہ ہے کہ (کافروں کے لئے ان کا کفر ان کے پروردگار کے نزدیک ناراضی ہی بڑھنے کا باعث ہوتا ہے جو دنیا ہی میں متحقق ہو جاتی ہے اور (نیز) کافروں کے لئے ان کا کفر آخرت میں خسارہ بڑھنے کا باعث ہوتا ہے کہ وہ حرامان ہے جنت سے اور کُندہ بننا ہے جہنم کا اور یہ جو کفر و شرک پر مصر ہیں) آپ ران سے ذرا یہ تو کہتے کہ تم اپنے قرار دادہ شریکوں کا حال تو بتلاؤ جن کو تم خدا کے سوا پوجا کرتے ہو، یعنی مجھ کو یہ بتلاؤ کہ انھوں نے زمین کا کونسا حصہ بنایا ہے یا ان کا آسمان (بنائے) میں کچھ سا بچھا ہے، (تاکہ دلیل عقلی سے ان کا استحقاق عبادت ثابت ہو) یا ہم نے ان کافروں کو کوئی کتاب دی ہے (جس میں شرک کے اعتقاد کو درست لکھا ہو) کہ یہ اس کی دلیل پر قائم ہوں (اور اس دلیل نقلی سے اپنے دعوے کو ثابت کر دیں۔ اصل یہ ہے کہ نہ دلیل عقلی ہے نہ دلیل نقلی ہی) بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے نری دھوکہ کی باتوں کا وعدہ کرتے آئے ہیں کہ ان کے بڑوں نے ان کو بے سند غلط بات بتلا دی کہ (ہُمْ لَا يَشْفَعُ آؤْنَا عِنْدَ اللَّهِ) حالانکہ واقع میں وہ محض بے اختیار ہیں، پس وہ مستحق عبادت نہیں ہو سکتے۔ البتہ مختار مطلق حق تعالیٰ ہے تو وہی قابل عبادت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے مختار اور دوسروں کے غیر مختار ہونے کے دلائل میں سے نمونہ کے طور پر ایک مختصر سی بات بیان کرتے ہیں کہ دیکھو یہ تو یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو (اپنی قدرت سے) تھامے ہوئے ہے کہ وہ موجودہ حالات کو چھوڑ نہ دیں اور اگر (بالفرض) وہ موجودہ حالت کو چھوڑ بھی دیں تو پھر خدا کے سوا اور کوئی ان کو تھام بھی نہیں سکتا۔ (جب ان سے پیدا شدہ عالم کی حفاظت بھی نہیں ہو سکتی تو عالم کو جو دیں لانے اور ایجاد کرنے کی ان سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے، پھر استحقاق عبادت کیسا اور باوجود بطلان کے شرک کرنا مقتضی اس کو تھا کہ ان کو ابھی سزا دی جاوے مگر چونکہ وہ حلیم رہے اس لئے مہلت دے رکھی ہے، اور اگر اس مہلت میں یہ لوگ حق کی طرف آجاویں تو چونکہ وہ (غفور) بھی ہے، اس لئے سب گزشتہ شرارتیں ان کی معاف کر دی جاویں)۔

## معارف و مسائل

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خُلَافَ فِي الْأَرْضِ، خلافت خلیفہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں نائب اور قائم مقام۔ مراد یہ ہے کہ ہم نے انسانوں کو یہ بعد دیگرے زمین و مکان وغیرہ کا مالک بنایا ہے ایک جانا ہو تو دوسرے کو اس کی جگہ ملتی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لئے بڑی عبرت ہے۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ خطاب امت محمدیہ کو



ہو کہ ہم نے پچھلی قوموں کے بعد ان کے خلیفہ کی حیثیت سے تم کو مالک و متصرف بنایا ہے، لہذا تمہارا فرض ہے کہ اپنے سے پہلے لوگوں کے حالات سے عبرت حاصل کرو، عمر کے قیمتی لمحات کو غفلت میں نہ گزارو۔

إِنَّ اللَّهَ يُتَسَبِّحُ السَّمَوَاتِ، آسمانوں کو روکنے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی حرکت بند کر دی بلکہ مراد اپنی جگہ سے ہٹ جانا اور ٹل جانا ہے، جیسا کہ لفظ اَنْ تَزُولَا اس پر شاہد ہو اس لئے اس آیت میں آسمان کے متحرک یا ساکن ہونے میں سے کسی جانب پر کوئی دلیل نہیں۔

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْدِيهِمْ لَئِنْ جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ

اور قسمیں کھاتے تھے اللہ کی تاکید کی قسمیں اپنی کہ اگر آئے گا ان کے پاس ڈر سنانے والا البتہ بہتر

أَهْدَىٰ مِنْ أَحَدٍ أَلَا مِرٌّ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ

راہ چلیں گے ہر ایک اُمت سے پھر جب آیا ان کے پاس ڈر سنانے والا اور زیادہ ہو گیا

إِلَّا نُفُورًا ۖ (۳۲) إِنْ تَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَكْرُ السَّيِّئِ ط وَلَا يَحِيقُ

ان کا بد کرنا، غرور کرنا ملک میں اور داؤ کرنا بُرے کام کا اور بُرائی کا داؤ الٹو گا

الْمَكْرُ السَّيِّئِ إِلَّا بِأَهْلِهِ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ج

انہی، داؤ والوں پر، پھر اب وہی راہ دیکھتے ہیں پہلوں کے دستور کی،

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ۖ (۳۳)

سو تو نہ پائے گا اللہ کا دستور بدلتا، اور نہ پائے گا اللہ کا دستور ٹلتا۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ

کیا پھر نہیں ملک میں کہ دیکھ لیں کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو

مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ط وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ

ان سے پہلے تھے اور تھے ان سے بہت سخت زور میں اور اللہ وہ نہیں جس کو تھکائے

مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ۖ (۳۴)

کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہی ہر سب کچھ جانتا کر سکتا۔

وَلَوْ يَوَاحِدُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ

اور اگر پکڑ کرے اللہ لوگوں کی آن کی کمائی پر نہ چھوڑے زمین کی پیٹھ پر ایک بھی

دَآبَّةٍ وَلَٰكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا أَجَاءَ أَجَلُهُمْ

پلنے چلنے والا پر اُن کو ڈھیل دیتا ہوا ایک مقرر وعدہ تک ، پھر جب آئے گا ان کا وعدہ

فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيرًا ﴿۲۵﴾

تو اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے سب بندے

## خلاصہ تفسیر

اور ان کفار (قریش) نے (قبل بعثت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) بڑی زوردار قسم

کھائی تھی کہ اگر ان کے (یعنی ہمارے) پاس کوئی ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) آئے تو وہ (یعنی ہم)

ہر ہر امت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں (یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ کی طرح ہم تکذیب

نہ کریں گے سو پہلے سے تو یہ قسمیں کھایا کرتے تھے) پھر جب اُن کے پاس ایک پیغمبر (یعنی رسول

صلی اللہ علیہ وسلم) آ پہنچے تو بس ان کی نفرت ہی کو ترقی ہوتی دنیا میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے

اور صرف نفرت ہی پر اکتفا نہیں ہوا بلکہ ان کی بُری تدبیروں کو دیکھ کر بھی ترقی ہوئی، یعنی تکبر

کی وجہ سے آپ کے اتباع سے عار تو ہوئی ہی تھی، مگر یہ بھی نہ کیا کہ نہ اتباع ہوتا اور نہ درپے آزار

ہوتے، بلکہ آپ کی ایذا سانی کی فکر میں لگ گئے۔ چنانچہ ہر وقت اُن کا اسی میں لگا رہنا معلوم

(مشہور ہے) اور (یہ جو کچھ ہمارے رسول کے لئے بُری بُری تدبیریں کر رہے ہیں خود اپنا ہی ضرر

کر رہے ہیں، کیونکہ) بُری تدبیروں کا وبال (حقیقی) ان تدبیرلوں ہی پر پڑتا ہے (گو ظاہر میں

کبھی اس شخص کو بھی ضرر پہنچ جائے جس کو ضرر پہنچانا چاہا ہے، لیکن وہ ضرر دنیوی ہے

بخلاف ظالم ضرر سال کے کہ اُس پر اخروی ضرر و وبال پڑے گا اور دنیوی ضرر اخروی ضرر

کے سامنے لاشے ہے۔ پس اس ضرر حقیقی کے اعتبار سے حصر بالکل واقعی ہے) سو (یہ جو

آپ کی عداوت اور ضرر سانی پر مصر ہیں تو) کیا یہ (اپنے ساتھ بھی حق تعالیٰ کے) اسی دستور

کے منتظر ہیں جو اگلے (کافر) لوگوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے (یعنی عذاب و ہلاکت) سو (واقعی

ان کے لئے بھی یہی ہوتا ہے کیونکہ) آپ خدا کے (اس) دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پا دیں گے کہ

ان پر بجائے عذاب کے عنایت ہونے لگے) اور (اسی طرح) آپ — خدا کے (اس) دستور

کو بھی منتقل ہوتا ہوا نہ پا دیں گے کہ ان کی جگہ دوسروں کو جو ایسے نہ ہوں عذاب ہونے لگے



مطلب یہ کہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ کافروں کو عذاب ہوگا، خواہ دنیا میں بھی خواہ صرف آخرت میں، اور حق تعالیٰ کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ پس نہ یہ احتمال ہے کہ ان کو عذاب نہ ہو اور نہ یہ احتمال ہو کہ دوسرے بے گناہوں کو عذاب ہونے لگے۔ مقصود اس تکریر سے تاکید و وقوع عذاب کی، اور یہ جو سمجھتے ہیں کہ کفر موجب تعذیب نہیں ہے تو ان کی بڑی غلطی ہو۔ کیا یہ لوگ زمین میں (مثلاً شام اور یمن کے سفروں میں عادی و نمود قوم لوط علیہ السلام کی مہبتوں میں) چلے پھرے نہیں جن میں دیکھتے بھالتے کہ جو (منکر) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا (آخری) انجام (اسی تکذیب کے سبب) کیا ہوا کہ معذب ہوئے، حالانکہ وہ قوت میں ان سے بڑھے ہوئے تھے اور کسی میں خواہ کیسی ہی قوت ہو لیکن (خدا ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز قوت والی) اس کو ہر ادے نہ آسمان میں اور نہ زمین میں (کیونکہ) وہ بڑے علم والا (اور) بڑی قدرت والا ہے پس علم سے اپنے ہر ارادہ کے نافذ کرنے کا طریقہ جانتا ہو اور اپنی قدرت سے اس کو نافذ کر سکتا ہے، اور دوسرا کوئی ایسا ہے نہیں۔ پھر اس کو کون چیز ہرا سکتی ہے) اور اگر یہ اس دھوکہ میں ہوں کہ اگر ہم کو عذاب ہونا ہوتا تو ہو چکتا، اور اس سے اپنے شرک و کفر کے اچھے ہونے پر استدلال کریں تو یہ بھی اُن کی غلطی ہے، کیونکہ بمقتضائے حکمت ان کے لئے فوری عذاب تجویز نہیں کیا گیا ورنہ اگر اللہ تعالیٰ (ان) لوگوں پر ان کے اعمال (کفریہ) کے سبب (فورا) دارِ دیگر فرمانے لگتا تو روسے زمین پر ایک متنفس کو نہ چھوڑتا، (کیونکہ کفار کو کفر سے ہلاک ہو جاتے اور اہل ایمان بوجہ قلت کے دنیا میں نہ رکھو جاتے۔ کیونکہ نظامِ عالم بمقتضائے حکمت مجموعہ کے ساتھ وابستہ ہی، اور یہ ضرور نہیں کہ وہ اسی عذاب سے ہلاک ہوتے۔ اور دوسری مخلوقات اس لئے کہ مقصود ان کی تخلیق کا انتفاع بنی آدم ہے، جب یہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ رہتے) لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ایک میعاد معین (یعنی قیامت) تک ہمت دے رہا ہے، سو جب ان کی وہ میعاد آ پہنچے گی (اس وقت) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آپ دیکھ لے گا (یعنی ان میں جو کفار ہوں گے اُن کو سزا دے لے گا)۔

## معارف و مسائل

وَلَا يَخِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ، لَا يَخِيقُ کے معنی لَا يَحْصِيْطُ یا لَا يُصِيبُ کے ہیں جس کا حاصل یہ ہو کہ بُری تدبیر کا وبال اور کسی پر نہیں پڑتا، بلکہ خود ایسی تدبیر کرنے والے ہی پر پڑتا ہے۔ یعنی جو شخص دوسروں کا بُرا چاہتا ہے وہ خود بُرائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس پر جو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں تو بہت مرتبہ یہ بھی مشاہدہ ہوتا ہے کہ بُری

تدبیر کرنے والے کی تدبیر چلی جاتی ہے اور جس کو نقصان پہونچانا ہوتا ہے اس کو نقصان پہونچ جاتا ہے اس کا ایک جواب تو خلاصہ تفسیر میں آگیا ہے کہ اس کو جو تکلیف یا نقصان پہونچا وہ تو دنیا کا نقصان ہے، اور ایسی بُری تدبیر کرنے والے کا نقصان آخرت کا عذاب ہے، جو اس شد بھی ہے اور دائمی بھی، اس کے مقابلہ میں اس کا دنیوی نقصان کا عدم ہے۔

دوسرا جواب بعض حضرات نے یہ بھی دیا ہے کہ کسی بے گناہ کے خلاف تدبیر کرنے اور اس پر ظلم کرنے کا وبال ظالم پر اکثر دنیا میں بھی پڑ جاتا ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے فرمایا کہ تین کام ایسے ہیں جن کا کرنے والا دنیا میں بھی وبال و عذاب سے نہیں بچتا، ایک کسی بے گناہ کے حق میں بُری تدبیر کر کے اس کو ایذا پہونچانا، دوسرے عام ظلم، تیسرے عہد شکنی (ابن کثیر) خصوصاً جو کسی ایسے شخص پر کیا جائے جو بے گناہ ہو، انتقام پر قدرت نہ رکھتا ہو یا باوجود قدرت انتقام کے صبر کرے، اس پر ظلم کے وبال سے دنیا میں بھی کسی کو بچتے نہیں دیکھا ہے بس تجربہ کر دیکھ دریں دیر مکافات ۛ با در دکشاں ہر کہ در افتاد براققاد اس کا حاصل یہ ہوگا کہ آیت میں جو حصر یہاں کیا گیا ہے وہ اکثری قاعدہ کے اعتبار سے ہے کھلی نہیں۔ واللہ اعلم ۛ

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ بِحَسَنِ اللَّهِ  
فِي تَاسِعِ صَفْرِ ثَمَنِيٍّ يَوْمَ السَّبْتِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



## سُورَةُ يُسْ

سُورَةُ يُسْ بِمَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلَاثٌ وَثَمَانُونَ آيَةً وَتَجُزُّ بِرُكُوعَاتٍ

سورۃ یس مکہ میں نازل ہوئی اس میں تراسی آیتیں ہیں اور پانچ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

يُس ۱ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ۲ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۳

قسم ہے اس پتے قرآن کی ، تو تحقیق ہے بھیجے ہوؤں میں سے

عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۴ تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۵ لِتُنذِرَ

اد پر سیدھی راہ کے ، اتارا زبردست رحم والے نے ، تاکہ تو ڈرائے

قَوْمًا مَّا أَنْذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ ۶ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ

ایک قوم کو کہ ڈر نہیں سنا ان کے باپ دادوں نے سو ان کو خبر نہیں ، ثابت ہو چکی ہر بات

عَلَى أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۷ إِنَّا جَعَلْنَا فِي آعْنَاقِهِمْ

ان میں بہتوں پر سودہ نہ مانیں گے ۔ ہم نے ڈالے ہیں ان کی گردنوں میں

عہ آج جبکہ میں سورۃ یس کی تفسیر شروع کر رہا ہوں ماہ صفر کی نویں تاریخ ہی، ماہ صفر ۱۳۵۵ھ میں اسی تاریخ

کو میرے والد ماجد مولانا محمد یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تھی اس سورۃ کے ساتھ نام میں اشتراک

اور تاریخ وفات نے ان کی یاد کو تازہ کر دیا۔ مطالعہ کرنے والے حضرات درخواست ہو کہ احقر اور میرے والدین

کے لئے دعا، مغفرت فرمادیں اور کوئی ہمت کرے اور سورۃ یس پڑھ کر ایصالِ ثواب کرے تو سبحان اللہ

أَغْلَا فَرِهَىٰ إِلَىٰ الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُونَ ﴿٨﴾ وَجَعَلْنَا مِنْ

طوقِ سروہ میں ٹھوڑیوں تک پھر ان کے سر اُٹل رہی ہیں، اور بنائی ہم نے  
بَیِّنَ آيِدٍ يَّهِيْمٍ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ  
ان کے آگے دیوار اور پیچھے دیوار پھر اوپر سے ڈھانک دیا سو ان کو

لَا يَبْصُرُونَ ﴿٩﴾ وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرَتْهُمْ أَمْ لَمْ يُنذِرْهُمْ

کچھ نہیں سوجھتا۔ اور برابر ہے ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے،

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠﴾ إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَنَ

یقین نہیں کریں گے۔ تو تو ڈر سنائے اس کو جو چلے سمجھائے پر اور ڈرے رحمن سے

بِالْغَيْبِ فَبَشِيرٌ رَّحِيمٌ ﴿١١﴾ إِنَّا نَحْنُ مُخِي الْمَوْتِ

بن دیکھے سو اس کو خوش خبری دے معافی کی اور عزت کے ثواب کی۔ ہم ہیں جو زندہ کرتے ہیں مردوں

وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ وَكُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ

کو اور لکھتے ہیں جو آگے بھیج چکے اور جو نشان ان کے پیچھے رہا اور ہر چیز گن لی ہم نے ایک

مَبِیِّنٍ ﴿١٢﴾

کھلی اصل میں۔

## خلاصہ تفسیر

یٰس (اس کی مراد اللہ ہی کو معلوم ہے) قسم ہے قرآن باحکمت کی کہ بیشک آپ منجملہ پیغمبروں کے ہیں (اور) سیدھے رستہ پر ہیں کہ اس میں جو آپ کی پیروی کرے خدا تک پہنچ جاتے نہ کہ جیسا کفار کہتے ہیں تَسْتُمِرُّ سَدًّا، یعنی آپ رسول نہیں، یا کہتے تھے بَلْ افْتَرَاہُ یعنی آپ نے خود گھڑ لیا ہے، جس کے لئے گمراہ ہونا لازم ہے اور قرآن تعظیم ہدایت کے ساتھ آپ کی رسالت و نبوت کی دلیل بھی ہے کیونکہ یہ قرآن خدا سے زبردست ہر بان کی طرف سے نازل کیا گیا ہے (اور آپ پیغمبر اس لئے بنائے گئے ہیں) تاکہ آپ (اولاً) ایسے لوگوں کو غذا (خداوندی سے) ڈراویں جن کے باپ دادا (قریب کے کسی رسول کے ذریعہ سے) نہیں ڈرا گئے تھے، سو اسی سے یہ بے خبر ہیں (کیونکہ گو عرب میں بعض مضامین شرائع رسل سابقہ کے



منقول بھی تھے جیسا اس آیت میں ہے (اَمْ جَاءَهُمْ مَّا لَمْ يَأْتِ اٰبَاءَهُمُ الْاَوَّلِينَ) یعنی کیا قرآن ان کے پاس کوئی ایسی چیز لایا ہے جو ان کے آباء کے پاس نہیں آئی تھی، یعنی دعوتِ توحید کوئی نئی چیز نہیں، یہ ہمیشہ ان کے آباء و اجداد میں بھی جاری رہی ہے، مگر پھر بھی نبی کے آنے سے جس قدر تنبہ ہوتا ہے محض اس کے بعض احکام و اخبار نقل ہو کر پہنچنے سے جبکہ وہ ناتمام اور متغیر بھی ہو گئے ہوں ویسا تنبہ نہیں ہوتا۔ اور اولاد پرانا آپ کا قریش کو تھا، اس لئے اس جگہ انہی کا ذکر فرمایا، پھر عام لوگوں کو بھی آپ نے دعوت فرمائی، کیونکہ بعثت آپ کی عام ہے اور باوجود آپ کی صحت رسالت و صدق قرآن کے یہ لوگ جو نہیں مانتے آپ اس کا غم نہ کیجئے، کیونکہ ان میں اکثر لوگوں پر (تقدیری) بات ثابت ہو چکی ہے (وہ بات یہ ہے کہ یہ ہدایت کے راستہ پر نہ آئیں گے) سو یہ لوگ ہرگز ایمان نہ لائیں گے (یہ حال ان کے اکثر کا تھا اور بعض کی قسمت میں ایمان بھی تھا وہ ایمان بھی لے آئے اور ان لوگوں کی مثال ایمان سے دوری میں ایسی ہو گئی کہ گویا) ہم نے ان کی گردنوں میں (بھاری بھاری) طوق ڈال دیئے ہیں پھر وہ ٹھوڑیوں تک (اڑ گئے) میں جس سے ان کے سر اُپر کو اُل گئے (یعنی اُٹھ رہ گئے، نیچے کو نہیں ہو سکتے، خواہ اس وجہ سے کہ طوق میں جو موقع تحت ذقن رہتے کا ہر وہاں کوئی میخ وغیرہ ایسی ہو جو ذقن میں جا کر اڑ جاوے، اور یا طوق کا چکلا ایسا ہو کہ اس کی سکر ذقن میں اڑ جاوے۔ بہر حال دونوں طور پر وہ راہ دیکھنے سے محروم رہے) اور نیز ان کی مثال بعد عن الایمان ایسی ہو گئی کہ گویا) ہم نے ایک آڑان کے سامنے کر دی اور ایک آڑان کے پیچھے کر دی جس سے ہم نے (ہر طرف سے) ان کو (پردوں میں) گھیر دیا سو وہ (اس احاطہٗ محاببات کی وجہ سے کسی چیز کو) نہیں دیکھ سکتے، اور (دونوں تمثیلوں سے حاصل یہ ہے کہ) ان کے حق میں آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں، یہ (کسی حالت میں بھی) ایمان نہیں لائیں گے (اس لئے آپ اُن سے مایوس ہو کر راحت حاصل کر لیجئے) بس آپ تو ایسا ڈرانا جس پر نفع مرتب ہو، صرف ایسے شخص کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت پر چلے اور خدا سے بے دیکھے ڈرے (کہ ڈر ہی سے طلب حق ہوتی ہے اور طلب وصول اور یہ ڈرتے ہی نہیں) سو (جو ایسا شخص ہو) آپ اس کو (گناہوں کی) مغفرت اور (طاعت پر) عملہ عوض کی خوش خبری سنا دیجئے (اور اسی سے اس پر بھی دلالت ہو گئی کہ جو ضلالت اور اعراض کا مرتکب ہو وہ مغفرت اور اجر سے محروم اور مستحق عذاب ہے، اور گودنیا میں اس جزا و سزا کا ظہور لازم نہیں، لیکن) بیشک ہم (ایک روز) مردوں کو زندہ کریں گے (اس وقت ان سب کا ظہور ہو جائے گا) اور (جن اعمال پر جزا و سزا ہو گی) ہم ان کو برابر لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال

بھی جن کو لوگ آگے بھیجتے جاتے ہیں اور ان کے وہ اعمال بھی جنکو چھوڑے جاتے ہیں رماؤں سے مراد جو کام اپنے ہاتھ سے کیا اور آثارِ ہم سے مراد وہ اثر جو اس کام کے سبب پیدا ہوا اور بعد موت بھی باقی رہا، مثلاً کسی نے کوئی نیک کام کیا اور وہ سبب ہو گیا دوسروں کی بھی ہدایت کا یا کسی نے کوئی بُر کام کیا اور وہ سبب ہو گیا دوسروں کی بھی گمراہی کا۔ غرض یہ سب لکھے جا رہے ہیں اور وہاں ان سب پر جزاء و سزا مرتب ہو جائے گی اور ہمارا علم تو ایسا وسیع ہے کہ ہم اس کتابت کے بھی محتاج نہیں جو بعد الوقوع ہوئی ہے کیونکہ ہم نے (تو) ہر چیز کو (جو کچھ کیا) تک ہوگا وقوع سے پہلے ہی) ایک واضح کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں ضبط کر دیا تھا (محض بعض حکمتوں سے اعمال کی کتابت ہوتی ہے۔ پس جب قبل وقوع ہم کو سب چیزوں کا علم ہے تو بعد وقوع تو کیوں نہ ہوتا، اس لئے کسی عمل سے ٹکرنے یا پوشیدہ رکھنے کی گنجائش نہیں، ضرور سزا ہوگی اور لوح محفوظ کو واضح باعتبار تفصیل اشیاء کے کہا گیا ہے۔

## معارف و مسائل

**فضائل سورۃ یٰسین** | حضرت معقل بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یٰسَ قَلْبُ الْقُرْآنِ، یعنی سورۃ یٰس قرآن کا دل ہے۔ اور اس حدیث کے بعض الفاظ میں ہے کہ جو شخص سورۃ یٰس کو خالص اللہ اور آخرت کے لئے پڑھتا ہے اس کی مغفرت ہو جاتی ہے اس کو اپنے مردوں پر پڑھا کر جو رواہ احمد و ابوداؤد و النسائی و ابن حبان و الحکم و غیرہم، کذا فی الروح و المنہری

اہم غزالیؒ نے فرمایا کہ سورۃ یٰس کو قلب قرآن فرمانے کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ اس سورۃ میں قیامت اور حشر و نشر کے مضامین خاص تفصیل اور بلاغت کے ساتھ آئے ہیں اور اصولِ ایمان میں سے عقیدۂ آخرت وہ چیز ہے جس پر انسان کے اعمال کی صحت موقوف ہے۔ خوفِ آخرت ہی انسان کو عملِ صالح کے لئے مستعد کرتا ہے اور وہی اس کو ناجائز خواہشات اور حرام سے روکتا ہے۔ تو جس طرح بدن کی صحت قلب کی صحت پر موقوف ہے اسی طرح ایمان کی صحت فکرِ آخرت پر موقوف ہے (روح) اور اس سورۃ کا نام جیسا سورۃ یٰس معروف ہے اسی طرح ایک حدیث میں اس کا نام عظیمہ بھی آیا ہے (احقرجہ ابو نصر السجری عن عائشہ رضی اللہ عنہا) اور ایک حدیث میں ہے کہ اس سورۃ کا نام تورات میں مُعِثَہ آیا ہے، یعنی اپنے پڑھنے والے کے لئے دنیا و آخرت کی خیرات و برکات عام کرنے والی۔ اور اس کے پڑھنے والے کا نام شریف آیا ہے اور فرمایا کہ قیامت کے روز اس کی



شفاعت قبیلہ ربیعہ کے لوگوں سے زیادہ کے لئے قبول ہوگی۔ (رواہ سعید بن منصور و البیہقی  
عن حسان بن عطیہ) اور بعض روایات میں اس کا نام مدافعہ بھی آیا ہے، یعنی اپنے پڑھنے والے  
والے سے بلاؤں کو دفع کرنے والی اور بعض میں اس کا نام قاضیہ بھی مذکور ہے، یعنی حاجات  
کو پورا کرنے والی (روح المعانی)

اور حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ جس مرنے والے کے پاس سورۃ یس  
پڑھی جائے تو اس کی موت کے وقت آسانی ہو جاتی ہے (رواہ الدیلمی ابن حبان، مظہری)  
اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے فرمایا کہ جو شخص سورۃ یس کو اپنی حاجت کے آگے  
کردے تو اس کی حاجت پوری ہو جاتی ہے (اخرجہ المحاملی فی المالیہ، مظہری)

ادریجی بن کثیر نے فرمایا کہ جو شخص صبح کو سورۃ یس پڑھ لے وہ شام تک خوشی اور  
آرام سے رہے گا، اور جو شام کو پڑھ لے تو صبح تک خوشی میں رہے گا۔ اور فرمایا کہ مجھے یہ بات  
ایسے شخص نے بتلائی ہے جس نے اس کا تجربہ کیا ہے (اخرجہ ابن الفریس، مظہری)

یس، اس لفظ کے متعلق مشہور قول تو وہی ہے جس کو ادھر خلاصہ تفسیر میں لیا  
ہے۔ کہ حروف مقطعات میں سے ہے، جن کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے عام بندوں کو نہیں دیا  
اور ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ اللہ کے ناموں میں سے  
ایک نام ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت یہی ہے کہ اسماء الہیہ میں سے  
ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں اے انسان  
اور مراد انسان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور حضرت ابن جبرؒ کے کلام سے یہ استفادہ  
ہے کہ لفظ یس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ان دو عظیم الشان حروف سے رکھنا، یعنی یا اور سین اس میں بزرگ رازیں  
یس کسی کا نام امام مالکؒ نے اس کو اس لئے پسند نہیں کیا کہ ان کے نزدیک یہ اسماء الہیہ  
رکھنا کیسا ہے میں سے ہے، اور اس کے صحیح معنی معلوم نہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ کوئی

ایسے معنی ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے خالق، رازق، وغیرہ البتہ اس لفظ  
کو یاسین کے رسم الخط سے لکھا جائے تو یہ کسی انسان کا نام رکھنا جائز ہے۔ کیونکہ قرآن کریم  
میں آیا ہے سَلَامٌ عَلَیْہِ اَیُّہَا سِیِّئُ الرَّبِّ اَیُّہَا سِیِّئُ الرَّبِّ اَیُّہَا سِیِّئُ الرَّبِّ اَیُّہَا سِیِّئُ الرَّبِّ  
ہے مگر بعض قراءتوں میں اَیُّہَا سِیِّئُ الرَّبِّ بھی آیا ہے۔

لَسْتُمْ بِدَارِ قَوْمٍ مَّا اُنْذِرَ اَبَاؤُہُمْ، مراد اس سے عرب ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ ان کے  
آباء و اجداد میں کوئی نذیر یعنی پیغمبر عرصہ دراز سے نہیں آیا۔ اور آباء و اجداد سے مراد قریبی

آباء و اجداد ہیں ان کے جدِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھ حضرت اسمعیل علیہ السلام کے بعد کتنی صدیوں سے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا۔ اگرچہ دعوت و تبلیغ اور انذار و تبشیر کا سلسلہ برابر جاری رہا جس کا ذکر قرآن کریم کی آیت میں بھی ہے جو خلاصہ تفسیر میں آچکی ہے اور آیت **إِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ** کا بھی یہی مقتضی ہے، کہ رحمت خداوندی نے کسی قوم و ملت کو دعوت و انذار سے کسی زمانے اور کسی خطہ میں محروم نہیں رکھا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کی تعلیمات ان کے نابینوں کے ذریعہ پہنچنا وہ اثر نہیں رکھتا جو خود نبی یا پیغمبر کی دعوت و تعلیم کا ہوتا ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ میں عربوں کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ ان میں کوئی نذیر نہیں آیا۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ عرب میں عام طور پر پڑھنے پڑھانے اور تعلیم کا کوئی مستحکم نظام نہیں تھا، اسی وجہ سے ان کا لقب اُمّیین ہوا۔

**لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ**، **إِنَّا جَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِم** **أَعْمَالًا** **الْأَيَّة** مراد یہ ہو کہ حق تعالیٰ نے کفر و ایمان اور جنت و دوزخ کے دونوں راستے انسان کے سامنے کر دیئے، اور ایمان کی دعوت کے لئے انبیاء اور کتابیں بھی بھیج دیں، پھر انسان کو اتنا اختیار بھی دیدیا کہ وہ اپنے بھلے بُرے کو پہچان کر کوئی راستہ اختیار کرے۔ جو بد نصیب نہ غور و فکر سے کام لے نہ دلائل قدرت میں غور کرے، نہ انبیاء کی دعوت پر کان دھرے نہ اللہ کی کتاب میں غور و تدبر کرے تو اس نے اپنے اختیار سے جو راہ اختیار کر لی تو حق تعالیٰ .... اسی کے سامان اس کے لئے جمع فرمادیتے ہیں، جو کفر میں لگ گیا پھر اس کے واسطے کفر بڑھاتا ہی کے سامان ہوتے رہتے ہیں۔ اسی کو اس طرح تعبیر فرمایا، **لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ**، یعنی ان میں سے بیشتر لوگوں پر تو ان کے سوا اختیار کی بناء پر یہ قول حق جاری ہو چکا ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں گے۔

آگے ان کے حال کی ایک تمثیل بیان فرمائی ہے، کہ ان کی مثال ایسی ہے کہ جس کی گردن میں ایسے طوق ڈال دیئے گئے ہوں کہ اس کا چہرہ اور آنکھیں اوپر اٹھ جائیں، نیچے رہتہ کی طرف دیکھ ہی نہ سکے۔ تو ظاہر ہے کہ اپنے آپ کو کسی کھڑ میں گرنے سے نہیں بچا سکتا دوسری مثال یہ دی کہ جیسے کسی شخص کے چاروں طرف دیوار حائل کر دی گئی ہو وہ اس چار دیواری میں محصور ہو کر باہر کی چیزوں سے بے خبر ہو جاتا ہو، ان کافروں کے گرد بھی انکی جہالت اور اس پر عناد و ہٹ دھرمی نے محاصرہ کر لیا ہے، کہ باہر کی حق باتیں ان تک گویا پہنچتی ہی نہیں۔

امام رازیؒ نے فرمایا کہ نظر سے مافع دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مافع تو ایسا ہوتا ہے



کہ خود اپنے وجود کو بھی نہ دیکھ سکے، دوسرا یہ کہ اپنی گرد و پیش کو نہ دیکھ سکے۔ ان کفار کیلئے حق بینی سے دونوں قسم کے مانع موجود تھے، اس لئے پہلی مثال پہلے مانع کی ہو کہ جس کی گردن نیچے کو جھک سکے وہ اپنے وجود کو بھی نہیں دیکھ سکتا، اور دوسری مثال دوسرے مانع کی ہو کہ گرد و پیش کو نہیں دیکھ سکتا (روح)

جہور مفسرین نے آیت مذکورہ کو ان کے کفر و عناد کی تمثیل ہی قرار دیا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس کو بعض روایات کی بنا پر ایک واقعہ کا بیان قرار دیا ہے، کہ ابو جہل اور بعض دوسرے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے یا ایذا پہنچانے کا پختہ عزم کر کے آپ کی طرف بڑھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، عاجز ہو کر واپس آ گئے۔ اسی طرح کے متعدد واقعات کتب تفسیر ابن کثیر، روح المعانی، قرطبی، مظہری وغیرہ میں منقول ہیں، مگر وہ بیشتر روایات ضعیفہ ہیں اس پر مدار آیت کی تفسیر کا نہیں رکھا جاسکتا۔

وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ، یعنی ہم لکھیں گے ان اعمال کو جو انھوں نے آگے بھیجے ہیں۔ عمل کرنے کو آگے بھیجنے سے تعبیر کر کے یہ بتلادیا کہ جو اعمال اچھے یا بُرے اس دنیا میں کئے ہیں وہ یہیں ختم نہیں ہو گئے، بلکہ وہ تمہارا سامان بن کر آگے پہنچ گئے ہیں جن سے اگلی زندگی میں سابقہ پڑنا ہے، اچھے اعمال ہیں تو جنت کی باغ و بہار بنیں گے، بُرے ہیں تو جہنم کے انگارے۔ اور ان اعمال کو لکھنے سے اصل مقصود ان کو محفوظ رکھنا ہے، لکھنا بھی اس کا ایک ذریعہ ہے کہ خطا و نسیان اور زیادت و نقصان کا احتمال نہ رہے۔

اعمال کی طرح اعمال	وَآثَارَهُمْ، یعنی جس طرح ان کے کئے ہوئے اعمال لکھے جاتے ہیں اسی
کے اثرات بھی لکھے جاتے ہیں۔	طرح اُن کے آثار بھی لکھے جاتے ہیں۔ آثار سے مراد اعمال کے وہ ثمرات و نتائج ہیں جو بعد میں ظاہر ہوتے اور باقی رہتے ہیں، مثلاً کسی نے لوگوں کو دین کی تعلیم دی، دینی احکام بتلائے، یا اس کے لئے کوئی کتاب تصنیف کی جس سے لوگوں نے دین کا نفع اٹھایا یا کوئی وقف کر دیا، جس سے لوگوں کو اس کے بعد نفع پہنچا، یا اور کوئی ایسا کام کیا جس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا، تو جہاں تک اس کے اس عمل خیر کے آثار پہنچیں گے اور جب تک پہنچتے رہیں گے وہ سب اس کے اعمال نامہ میں لکھے جاتے رہیں گے۔ اسی طرح بُرے اعمال جن کے بُرے ثمرات و آثار دنیا میں باقی رہیں، مثلاً ظالمانہ قوانین جاری کر دیئے، ایسے ادارے قائم کر دیئے جو انسانوں کے اعمال و اخلاق کو خراب کر دیتے ہیں، یا لوگوں کو کسی غلط اور بُرے راستہ پر ڈال دیا۔ تو جہاں تک اور جب تک اس کے عمل کے بُرے نتائج اور مفساد وجود میں آتے رہیں گے، اس کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے رہیں گے، جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

کے اثرات بھی لکھے جاتے ہیں۔

فرمایا ہے۔ حضرت جریر بن عبد اللہ بجلي سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ  
أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا  
مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْقُصَ  
مِنْ أَجْوَرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ  
سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ  
وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ  
بَعْدِهِ لَا يُنْقُصُ مِنْ أَثَرِهَا  
شَيْءٌ، ثُمَّ قُلْنَا وَتَكْتُبُ مَا  
قَدَّمَ مِنْ أَوَّلِهَا هُمْ، رَأَيْنَا كَثِيرًا  
عَنِ ابْنِ أَبِي حَاتِمٍ،

”جس شخص نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا  
تو اس کو اس کا بھی ثواب ملے گا اور جو  
آدمی اس طریقہ پر عمل کریں گے ان کا بھی  
ثواب اس کو ملے گا بغیر اس کے کہ ان  
عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی  
آوے۔ اور جس نے کوئی بُرا طریقہ جاری  
کیا تو اس کو اس کا بھی گناہ ہوگا اور جتنے  
آدمی جب تک اس بُرے طریقہ پر عمل  
کرتے رہیں گے ان کا گناہ بھی اس کو  
ہوتا رہے گا بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں  
کے گناہوں میں کمی آوے۔“

آثار کے ایک معنی نشانِ قدم کے بھی آتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ انسان جب نماز کے لئے مسجد کی طرف چلتا ہے تو اس کے ہر قدم پر نیکی لکھی جاتی ہے۔ بعض روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں آثار سے مراد یہی نشانِ قدم ہیں، جس طرح نماز کا ثواب بھی لکھا جاتا ہے اسی طرح نماز کے لئے جانے میں جتنے قدم پڑتے ہیں ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ ابن کثیر نے ان روایات کو اس جگہ جمع کر دیا ہے جن میں یہ مذکور ہے کہ مدینہ طیبہ میں جن لوگوں کے مکانات مسجدِ نبوی سے دُور تھے انھوں نے ارادہ کیا کہ مسجد کے قریب مکان بنالیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ جہاں رہتے ہو وہیں رہو، دُور سے چل کر آؤ گے تو یہ وقت بھی ضائع نہ سمجھو، جتنے قدم زیادہ ہوں گے اتنا ہی تمہارا ثواب بڑھے گا۔

اس پر جو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے، اور جو واقعہ ان احادیث میں مذکور ہے وہ مدینہ طیبہ کا ہے۔ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ آیت تو اپنے عام معنی میں ہو کہ اعمال کے اثرات بھی لکھے جاتے ہیں اور یہ آیت مکہ ہی میں نازل ہوئی ہو، پھر مدینہ طیبہ میں جب واقعہ پیش آیا تو آپ نے بطور استدلال کے اس آیت کا ذکر فرمایا۔ اور نشانِ قدم کو بھی ان آثارِ باقیہ میں شمار فرمایا ہے جن کے لکھے جانے کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے۔ اس طرح ان دونوں تفسیروں کا ظاہری تھناؤ بھی رفع ہو جاتا ہے (کمنا صرح بہ ابن کثیر و اختارہ)



وَأَضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ ۝۱۳

اور بیان کران کے واسطے ایک مثل اس گاؤں کے لوگوں کی جب کہ آئے اس میں بھیجے ہوئے۔

إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا

جب بھیجے ہم نے ان کی طرف دو تو ان کو جھٹلایا، پھر ہم نے توت دی تیسرے سے تب کہا انھوں نے

إِنَّا إِلَيْكُمْ مُّرْسَلُونَ ۝۱۴ قَالُوا مَا آتَانَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا

ہم تمھاری طرف آئے ہیں بھیجے ہوئے۔ وہ بولے تم تو یہی انسان ہو جیسے ہم، اور

أَنْزَلَ الرَّحْمَنُ مِنْ شَيْءٍ ۚ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ۝۱۵ قَالُوا

رحمن نے کچھ نہیں اتارا، تم سارے جھوٹ کہتے ہو، کہا

رَبَّنَا عَلِّمْنَا لَنَا إِلَيْكُمْ لَمْرُسَلُونَ ۝۱۶ وَمَا عَلَّمْنَا إِلَّا الْبَلْغُ

ہمارا رب جانتا ہے ہم بیشک تمھاری طرف بھیجے ہوئے ہیں۔ اور ہمارا ذمہ ہی ہی پیغام پہنچا دینا

السَّبِيلِ ۝۱۷ قَالُوا إِنَّا نَطِيرُنَا بِكُمْ لَعِنَ لَمْ تَنْتَهُوْا

کھول کر۔ بولے ہم نے نامبارک دیکھا تم کو، اگر تم باز نہ رہو گے تو

لَنَرْجِمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۸ قَالُوا

ہم تم کو سنگسار کریں گے اور تم کو پہنچے گا ہمارے ہاتھ سے عذاب دردناک۔ کہنے لگے

طَائِفٌ مِّنْكُمْ مَّعَكُمْ طَائِفٌ مِّنْكُمْ أَتَيْنَاكُمْ بِبَلٍّ أَنْتُمْ قَوْمٌ

تمھاری نامبارک کی تمھارے ساتھ ہے کیا اتنی بات پر کہ تم کو سمجھایا، کوئی نہیں پر تم لوگ ہو کہ

مُسْرِفُونَ ۝۱۹ وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ رَجُلٌ

حد پر نہیں رہتے، اور آیا شہر کے پرے سرے سے ایک مرد

يَسْعَى قَالَ يَاقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ۝۲۰ اتَّبِعُوا مَن لَّا

دوڑتا ہوا بولالے قوم چلو راہ پر بھیجے ہوؤں کی، چلو راہ پر ایسے شخص کی جو تم

يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ لَا يَسْأَلُونَ ۝۲۱

سے بدلہ نہیں چاہتے اور وہ تمھیں کہتے ہیں۔

وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدَ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۲﴾

اور مجھ کو کیا ہوا کہ میں بندگی نہ کروں اس کی جس نے مجھ کو بنایا اور اسی کی طرف سب پھر جائیں گے

أَتَتَّخِذُ مِنْ دُونِهِ آلِهَةً إِنْ يُرَدَّنَ الرَّحْمَنُ بِصُرٍّ لَا تُغْنِ

بھلا میں پکڑوں اس کے سوائے اور وہ کو پوجنا کہ اگر مجھ پر چاہے رحمن تکلیف تو کچھ کام نہ آئے

عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْعًا وَلَا يُنْقِذُونِ ﴿۲۳﴾ إِنْ أَرَادْتُ إِذًا لِي ضَلَالٌ

مجھ کو ان کی سفارش اور نہ وہ مجھ کو بھڑائیں۔ تو تو میں بھٹکتا رہوں

مُبِينٌ ﴿۲۴﴾ إِنْ أَمِنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُونِ ﴿۲۵﴾ قِيلَ

صریح۔ میں یقین لایا تمہارے رب پر مجھ سے سن لو۔ حکم ہوا

ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يَلِيَّتْ قَوْمِي يَعْلمُونَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرْتُ لِي

چلا جا بہشت میں، بولا کسی طرح میری قوم معلوم کر لیں، کہ بخشا مجھ کو

رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ ﴿۲۷﴾ وَمَا أَنْزَلْنَاهُ إِلَّا قَوْمَهُ

میرے رب نے اور کیا مجھ کو عزت والوں میں۔ اور نہیں اتاری ہم نے اس کی قوم پر

مِنْ بَعْدِهِ مِنْ جُنْدٍ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِينَ ﴿۲۸﴾

اُس کے پیچھے کوئی فوج آسمان سے اور ہم (فوج) نہیں اتارا کرتے۔

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صِخْرَةٌ وَأُحْدَةٌ فَآذَاهُمْ خِيسِدُونَ ﴿۲۹﴾ يَحْزَنُونَ

بس یہی تھی ایک چنگھاڑ پھر اسی دم سب بچ گئے۔ کیا افسوس ہے

عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۳۰﴾

بندوں پر کوئی رسول نہیں آیا ان کے پاس جس سے ٹھٹھا نہیں کرتے۔

الْمَرِيرُوا كَمَا هَلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ أَهْلُهُمُ إِلَيْهِمْ لَا

کیا نہیں دیکھتے کتنی غارت کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں کہ وہ ان کے پاس پھر کر

يَرْجِعُونَ ﴿۳۱﴾ وَإِنْ كُلُّ لَمَّا جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿۳۲﴾

نہیں آئیں گی، اور ان سب میں کوئی نہیں جو اکٹھے ہو کر نہ آئیں ہمارے پاس پکڑے ہوئے

وقف غفران

۲  
بیج



## خلاصہ تفسیر

اور آپ ان (کفار) کے سامنے اس غرض سے کہ رسالت کی تائید اور ان کو انکارِ توحید و رسالت پر تہدید ہو) ایک قصہ یعنی ایک بستی والوں کا قصہ اس وقت کا بیان کیجے جبکہ اس بستی میں کئی رسول آئے یعنی جبکہ ہم نے اُن کے پاس (اول) دو کو بھیجا سو ان لوگوں نے اول دونوں کو جھوٹا بتلایا پھر تیسری (رسول) سے ان دونوں کی تائید کی (یعنی تائید کیلئے پھر تیسری کو دہا جانیکا حکم دیا) سو ان تینوں نے ان بستی والوں سے کہا کہ ہم تمہارے پاس (خدا کی طرف سے) بھیجے گئے ہیں، (تاکہ تم کو ہدایت کریں کہ توحید اختیار کرو اور بت پرستی چھوڑ دو کیونکہ وہ لوگ بت پرست تھے، کمایدل علیہ قولہ تعالیٰ وَمَا يَلِيَّ لَا آئِبُنِي فِطْرَتِي وَقَوْلُهُ وَنُحْيِي الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ) ان لوگوں نے (یعنی بستی والوں نے) کہا کہ تم تو ہماری طرح (محض) معمولی آدمی ہو (تم کو رسول ہونے کا امتیاز حاصل نہیں) اور تمہاری کیا تخصیص ہے، مسئلہ رسالت ہی خود بے اصل ہے اور (خدا سے رحمن نے) کوئی چیز (کتاب و احکام کی قسم سے کبھی) نازل (ہی) نہیں کی، تم نرا جھوٹ بولتے ہو اُن رسولوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار علیم ہے کہ بے شک ہم تمہارے پاس (بطور رسول کے) بھیجے گئے ہیں اور اس قسم سے یہ مقصود نہیں کہ اسی سے اثباتِ رسالت کرتے ہیں بلکہ بعد اقامتِ دلائل کے بھی جب انھوں نے نہ مانا تب آخری جواب کے طور پر مجبور ہو کر قسم کھائی جیسا آگے خود ان کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ) ہمارے ذمہ تو صرف واضح طور پر (حکم کا) پہنچا دینا تھا (چونکہ واضح ہونا اس پر موقوف ہے کہ دلائل واضح سے دعوے کو ثابت کر دیا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ اول دلائل قائم کر چکے تھے، آخر میں قسم کھائی غرض یہ کہ ہم اپنا کام کر چکے تھے نہ مانو تو ہم مجبور ہیں) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں (یہ یا تو اس لئے کہا کہ ان پر قحط پڑا تھا (کمانی المعالم) اور یا اس لئے کہا کہ جب کوئی نئی بات سنی جاتی ہے، گو لوگ اس کو قبول نہ کریں، مگر اس کا چرچا ضرور ہوتا ہے، اور اکثر عام لوگوں میں اس کی وجہ سے گفتگو اور اس گفتگو میں اختلاف اور کبھی نزاع دنا اتفاقی کی ذبت پہنچ ہی جاتی ہے۔ پس مطلب یہ ہوگا کہ تمام لوگوں میں ایک فتنہ جھگڑا ڈال دیا جس سے مضرتیں پہنچ رہی ہیں، یہ نحوست ہے۔ اور اس نحوست کے سبب تم ہو) اور اگر تم (اس دعوت اور دعوے سے) باز نہ آئے تو (یاد رکھو) ہم پتھروں سے تمہارا کام تمام کر دیں گے اور (سنگساری سے پہلے بھی) تم کو ہماری طرف سے سخت تکلیف پہنچے گی (یعنی اور طرح طرح سے ستا دیں گے، نہیں مانو گے تو آخر میں سنگسار

کر دیں گے) اُن رسولوں نے کہا کہ تمہاری نحوست تو تمہارے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے (یعنی جس کو تم مصرت و مصیبت کہتے ہو اس کا سبب تو حق کا قبول نہ کرنا ہے، اگر حق قبول کرنے پر متفق ہو جاتے نہ یہ جھگڑے اور فتنے ہوتے، نہ قحط کے عذاب میں مبتلا ہوتے۔ رہا پہلا اتفاق بہت پرستی پر تو ایسا اتفاق جو باطل پر ہو خود فساد و وبال ہے جس کو چھوڑنا لازماً ہے اور اس زمانے میں قحط نہ ہونا وہ بطور استدراج کے اللہ کی طرف سے ڈھیل دی ہوئی تھی، یا اس وجہ سے تھا کہ اس وقت تک ان لوگوں پر حق واضح نہیں ہوا تھا۔ اور اللہ کا قانون ہے کہ حق کو واضح کرنے سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیتے، جیسا کہ ارشاد ہے کہ حَقِّیُّبِّئِنَّ لَہُمْ مَّا یَتَّقُونَ، اور یہ ڈھیل یا حق کا نہ ہونا بھی تمہاری ہی غفلت، جہالت اور شامت اعمال تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر حال میں اس نحوست کا سبب خود تمہارا فعل تھا) کیا اس کو نحوست سمجھتے ہو کہ تم کو نصیحت کی جاوے (جو بنیاد سعادت ہو یہ تو واقع میں نحوست نہیں) بلکہ تم (خود) حد (عقل و شرع) سے نکل جانے والے لوگ ہو (پس مخالفتِ شرع سے تم پر یہ نحوست آئی اور مخالفتِ عقل سے تم نے اس کا سبب غلط سمجھا) اور اس گفتگو کی خبر جو شائع ہوئی تو ایک شخص (جو مسلمان تھا) اس شہر کے کسی دور مقام سے (جو یہاں سے دور تھا یہ خبر سنکر اپنی قوم کی خیر خواہی کے لئے کہ ان رسولوں کا وجود قوم کی فلاح تھی، یا رسولوں کی خیر خواہی کیلئے کہ کہیں یہ لوگ اُن کو قتل نہ کر دیں) دوڑتا ہوا (یہاں) آیا (اور ان لوگوں سے) کہنے لگا کہ اے میری قوم ان رسولوں کی راہ پر چلو (ضرور) ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، اور وہ خود راہِ راست پر بھی ہیں (یعنی خود غرضی جو مانعِ اتباع ہو وہ بھی نہیں اور راہِ راست پر ہونا جو مقتضیِ اتباع ہو وہ موجود ہو پھر اتباع کیوں نہ کیا جاوے) اور میرے پاس کو نسا عذر ہے کہ میں اُس (معبود) کی عبادت نہ کروں جس نے مجھ کو پیدا کیا (جو کہ منجملہ دلائل استحقاقِ عبادت کے ہے) اور اپنے اوپر رکھ کر اس لئے کہا کہ مخاطب کو اشتعال نہ ہو جو کہ مانعِ تدبیر ہو جاتا ہے اور اصل مطلب یہی ہے کہ تم کو ایک اللہ کی عبادت کرنے میں کو نسا عذر ہے) تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے (اس لئے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے رسولوں کا اتباع کرو۔ یہاں تک تو معبودِ حق کے استحقاقِ عبادت کا بیان کیا، آگے معبوداتِ باطلہ کے عدمِ استحقاقِ عبادت کا مضمون ہے یعنی کیا میں خدا کو چھوڑ کر اسیسے ایسے معبود قرار دے لوں (جن کی کیفیت بے بسی کی یہ ہے) کہ اگر خدا سے رحمن مجھ کو کچھ تکلیف پہنچانا چاہے تو نہ اُن معبودوں کی سفارش میرے کچھ کام آوے گی اور نہ وہ مجھ کو (خود اپنی قدرت و زور کے ذریعہ اس تکلیف سے)



چھڑا سکیں (یعنی نہ وہ خود قادر ہیں نہ قادر تک واسطہ سفارش بن سکتے ہیں، کیونکہ اول تو جمادات میں شفاعت کی اہلیت ہی نہیں، دوسرے شفاعت وہی کر سکتے ہیں جن کو اللہ کی طرف سے اجازت ہو اور) اگر میں ایسا کروں تو صریح گمراہی میں جا پڑا رہ بھی اپنے اوپر رکھ کر ان لوگوں کو سنانا ہی میں تو تمھارے پروردگار پر ایمان لا چکا سو ہم (بھی) میری بات سن لو اور ایمان لے آؤ، مگر ان لوگوں پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ اس کو پتھروں سے یا آگ میں ڈال کر یا گھلا گھونٹ کر (کافی الدار المنثور) شہید کر ڈالا، شہید ہوتے ہی اس کو خدا کی طرف سے، ارشاد ہوا کہ جا جنت میں داخل ہو جا۔

اس وقت بھی اس کو اپنی قوم کی فکر ہوئی کہنے لگا کہ کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے ایمان اور اتباعِ رسل کی برکت سے مجھ کو بخش دیا اور مجھ کو عزت و اوروں میں شامل کر دیا تو اس حال کو معلوم کر کے وہ بھی ایمان لے آتے اور اسی طرح وہ بھی مغفورا و مکرّم ہو جاتے) اور جب اُن بستی والوں نے رسل اور مسیح رسل کے ساتھ یہ معاملہ کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور انتقام لینے کے لئے ہم نے اس (شخص شہید) کی قوم پر اس کی شہادت کے بعد کوئی لشکر فرشتوں کا آسمان سے نہیں اُتارا اور نہ ہم کو اتارنے کی ضرورت تھی، (کیونکہ اُن کا ہلاک کرنا اس پر موقوف نہ تھا کہ اس کے لئے کوئی بڑی جمعیت لائی جاتی) (کذا فسرہ ابن مسعود فیما نقل ابن کثیر عن ابن اُحّٰق حجت قال ما کاثرنا ہم بالجموع فان الامر کان الیسر علینا من ذلک، بلکہ وہ سزا ایک آواز سخت تھی) جو جبریل علیہ السلام نے لردی، کذا فی المعالم، یا اور کسی فرشتہ نے کر دی ہو۔ یا صیحّہ سے مطلق عذاب مراد ہو جس کی تعیین نہیں کی گئی، جیسا کہ سورۃ مؤمنون کی آیت فَاَحْزَنُوا لِمَا هُمْ بِاصْبِرُ کی تفسیر میں گذر چکا ہے) اور وہ سب اسی دم (اس سے) بچھ کر (یعنی مکر) رہ گئے (آگے قصہ کا انجام بتلانے کے لئے مکذبین کی مذمت فرماتے ہیں کہ) افسوس (ایسے) بندوں کے حال پر کہ کبھی اُن کے پاس کوئی رسول نہیں آیا جس کی انھوں نے ہنسی نہ اڑائی ہو کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم ان سے پہلے بہت سی امتیں (اسی تکذیب و استہزاء کے سبب) غارت کر چکے کہ وہ (پھر) اُن کی طرف (دنیا میں) لوٹ کر نہیں آتے، (اگر اس میں غور کرتے تو تکذیب و استہزاء سے باز آجاتے اور یہ سزا تو مکذبین کو دنیا میں دی گئی) اور (پھر آخرت میں) ان سب میں کوئی ایسا نہیں جو مجتمع طور پر ہماری رو برو نہ کیا جائے (وہاں پھر سزا ہوگی اور وہ سزا دائمی ہوگی)۔

## معارف و مسائل

وَاضْرِبْ لَهُم مِّثْلًا مِّنْ أَصْحَابِ الْقُرْآنِ، ضرب مثل کسی معاملے کو ثابت کرنے کے لئے اسی جیسے واقعہ کی مثال بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ اور جن منکرین نبوت و رسالت کفار کا ذکر آیا ہے، اس کو متنبہ کرنے کے لئے قرآن کریم بطور مثال کے پہلے زمانے کا ایک قصہ بیان کرتا ہے جو ایک بستی میں پیش آیا تھا۔

وہ کونسی بستی ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے اس بستی کا نام نہیں بتلایا، تاریخی روایات میں محمد بن حنفیہ نے حضرت ابن عباسؓ اور کعب احبار، وہب بن منبہ سے نقل کیا ہے اس قصہ میں آیا ہے ؟

کہ یہ بستی انطاکیہ تھی۔ اور جہور مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ ابو حیان اور ابن کثیر نے فرمایا کہ مفسرین میں اس کے خلاف کوئی قول منقول نہیں۔ معجم البلدان کی تصریح کے مطابق انطاکیہ ملک شام کا مشہور عظیم الشان شہر ہے جو اپنی شادابی اور استحکام میں معروف ہے اس کا قلعہ اور شہر پناہ کی دیوار ایک مثالی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس شہر میں نصاریٰ کے عبادت خانے کیسا بے شمار اور بڑے شاندار سونے چاندی کے کام سے مزین ہیں، ساحلی شہر ہے، زمانہ اسلام میں اس کو فاتح شام حضرت امین اللاتۃ ابو عبیدہ بن جراح نے فتح کیا ہے معجم البلدان میں یا قوت حموی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حبیب بن جراح اس آیت میں آگے آ رہا ہے اس کی قبر بھی انطاکیہ میں معروف ہے، دور دور سے لوگ اس کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ ان کی تصریح سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس قریہ کا ذکر اس آیت میں آیا ہے وہ یہی شہر انطاکیہ ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ انطاکیہ ان چار مشہور شہروں میں سے ہے جو دین عیسوی اور نصرانیت کے مرکز سمجھے گئے ہیں، یعنی قدس، رومیہ، اسکندریہ اور انطاکیہ۔ اور فرمایا کہ انطاکیہ سب پہلا شہر ہے، جس نے دین مسیح علیہ السلام کو قبول کیا۔ اسی بناء پر ابن کثیر کو اس میں تردد ہے کہ جس قریہ کا ذکر اس آیت میں ہے وہ مشہور شہر انطاکیہ ہو، کیونکہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق یہ قریہ منکرین رسالت و نبوت کی بستی تھی، اور تاریخی روایات کے مطابق وہ بت پرست مشرکین تھے تو انطاکیہ جو دین مسیح اور نصرانیت کے قبول کرنے میں سب سے اولیت رکھتا ہے، وہ کیسے اس کا مصداق ہو سکتا ہے۔

نیز قرآن کریم کی مذکورہ آیات ہی سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس واقعہ میں اس پوری بستی پر ایسا عذاب آیا کہ ان میں کوئی زندہ نہیں بچا۔ شہر انطاکیہ کے متعلق تاریخ میں اس کا ایسا



کوئی واقعہ منقول نہیں کہ کسی وقت اس کے سارے باشندے بیک وقت مر گئے ہوں۔ اس لئے ابن کثیر کی رائے میں یا تو اس آیت میں جس قریہ کا ذکر ہے وہ انطاکیہ کے علاوہ کوئی اور بستی ہے یا پھر انطاکیہ نام ہی کی کوئی دوسری بستی ہے جو مشہور شہر انطاکیہ نہیں ہے۔

صاحب فتح المنان نے ابن کثیر کے ان اشکالات کے جوابات بھی دیے ہیں، مگر سہل اور بے غبار بات وہی ہے جس کو سیدی حضرت حکیم الامتؒ نے بیان القرآن میں اختیار فرمایا ہے، کہ آیات قرآن کا مضمون سمجھنے کے لئے اس بستی کی تعیین ضروری نہیں، اور قرآن کریم نے اس کو مبہم رکھا ہے، تو ضرورت ہی کیا ہے کہ اس کی تعیین پر اتنا زور خرچ کیا جائے۔ سلف صالحین کا یہ ارشاد کہ ابھیئوا ما آتھم اللہ، یعنی جس چیز کو اللہ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اسے مبہم ہی رہنے دو، اس کا مقتضی بھی یہی ہے۔

اِذْ جَاءَ هَا التَّمْرِ سَلُونَهُ اِذْ اَمْرًا سَلْنَا اِلَيْهِمْ اَتَيْنُوْهُمُ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَبَّوْا زَنَا ثَالِثَ فَعَالُوْا اِنَّا اَلَيْكُم مَّرْسَلُوْنَ ہ مذکورہ بستی میں تین رسول بھیجے گئے تھے، پہلے ان کا بیان اجمالی اِذْ جَاءَ هَا التَّمْرِ سَلُونَهُ میں فرمایا، اس کے بعد اس کی یہ تفصیل دی گئی کہ پہلے دو رسول بھیجے گئے تھے، بستی والوں نے ان کو جھٹلایا اور ان کی بات نہ مانی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تائید تقویت کے لئے ایک تیسرا رسول بھیج دیا۔ پھر ان تینوں رسولوں نے بستی والوں کو خطاب کیا اِنَّا اَلَيْكُم مَّرْسَلُوْنَ، یعنی ہم تمہاری ہدایت کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

اس بستی میں جو رسول بھیجے گئے لفظ رسول اور مرسل قرآن کریم میں عام طور پر اللہ کے نبی پیغمبر ان سے کیا مراد ہے اور وہ کون حضرات تھے

طرف منسوب کیا ہے، یہ بھی علامت اس کی ہے کہ اس سے مراد انبیاء مرسلین ہیں۔ ابن اسحق نے حضرت ابن عباسؓ، کعب احبارؓ اور وہب بن منبہؓ کی روایت یہی نقل کی ہے کہ یہ تینوں بزرگ جن کا اس قریہ میں بھیجنے کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، ان کے نام اس روایت میں صادق، صدوق اور شکوم مذکور ہیں، اور ایک روایت میں تیسرے کا نام شمعون آیا ہے (ابن کثیر)

اور حضرت قتادہؓ سے یہ منقول ہے کہ یہاں لفظ مَّرْسَلُوْنَ اپنے اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ قاصد کے معنی میں ہے، اور یہ تین بزرگ جو اس قریہ کی طرف بھیجے گئے خود پیغمبر نہیں تھے، بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریں میں سے تھے۔ انہی کے حکم سے یہ اس قریہ کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے (ابن کثیر) اور چونکہ ان کے بھیجنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے، ان کا بھیجنا بھی بالواسطہ اللہ تعالیٰ ہی کا بھیجنا تھا اس لئے آیت میں

ان کے ارسال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مفسرین میں سے ابن کثیر نے پہلے قول کو اور قرطبی وغیرہ نے دوسرے کو اختیار کیا ہے، ظاہر قرآن سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ حضرات اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے۔ واللہ اعلم

قَالُوا إِنَّا تَطَيَّرُ نَا بِكُمْ، تطیّر کے معنی بد فالی لینے اور کسی کو منخوس سمجھنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس شہر کے لوگوں نے اللہ کے ان فرستادوں کی بات نہ مانی، اور یہ کہنے لگے کہ تم لوگ منخوس ہو۔ بعض روایات میں ہے کہ ان کی نافرمانی اور رسولوں کی بات نہ ماننے کے سبب اس بستی میں قحط پڑ گیا تھا، اس لئے بستی والوں نے ان کو منخوس کہا، یا اور کوئی تکلیف پہنچی ہوگی تو جیسے کفار کی عام عادت یہی ہے کہ کوئی مصیبت آئے تو اس کو ہدایت کرنے والے انبیاء و صلحاء کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں، اس کو بھی ان حضرات کی طرف منسوب کر دیا۔ جیسا کہ قوم مدینہ علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ہے: فَإِذَا جَاءَهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَذِهِ وَإِنْ تُصِيبَهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ، اسی طرح قوم صالح علیہ السلام نے ان کو کہا تَطَيَّرُ نَا بِكُمْ، یعنی تمہاری نحوست تمہارے ہی ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ طائر کا لفظ اہل میں بد فالی کے لئے بولا جاتا ہے، اور کبھی بد فالی کے اثر یعنی نحوست کے معنی میں بھی آتا ہے یہاں یہی مراد ہے (ابن کثیر، قرطبی)

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى، پہلی آیت میں اس مقام کو جس میں یہ قصہ پیش آیا لفظ قریہ سے تعبیر کیا گیا، جو عربی زبان کے اعتبار سے صرف چھوٹے گاؤں کو نہیں بلکہ مطلق بستی کو کہتے ہیں، چھوٹی بستی ہو یا بڑا شہر۔ اور اس آیت میں اس مقام کو لفظ مدینہ سے تعبیر کیا، جو صرف بڑے شہر ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس بستی میں یہ واقعہ ہوا ہے وہ کوئی بڑا شہر تھا، اس سے بھی اُس قول کی تائید ہوتی ہے جس میں اس کو انطاکیہ قرار دیا ہے۔ أَقْصَى الْمَدِينَةِ سے مراد شہر کے کسی گوشہ سے آنا ہے۔ رَجُلٌ يَسْعَى، لفظ يَسْعَى سعى سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی دوڑ کر چلنے کے ہیں۔ اس لئے معنی یہ ہوئے کہ شہر کے کسی دور گوشہ سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، اور کبھی لفظ سعى اہتمام کے معنی چلنے کے معنی میں بھی آتا ہے چاہے دوڑ کر نہ چلے، جیسے سورۃ جمعہ میں فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ میں یہی معنی مراد ہیں۔

قرآن کریم نے اس کو بھی مبہم رکھا ہے، اس شخص کا نام اور حال ذکر نہیں فرمایا۔ تاریخی روایات میں ابن اسحق نے حضرت ابن عباسؓ کا واقعہ!!!



اور کعب احبار اور وہب بن منبہ کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے کہ اس شخص کا نام حبیب تھا، اس کے پیشہ کے متعلق مختلف اقوال ہیں، ان میں مشہور یہ ہے کہ نجار تھا لکڑی کا کام کرتا تھا راجہ کنیر اور تاریخی روایات۔ جو مفسرین نے اس جگہ نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شخص بھی شروع میں بت پرست تھا، دو رسول جو پہلے اس شہر میں آئے اس کی ملاقات ان سے ہوئی ان کی تعلیم سے اور بعض روایات کے اعتبار سے ان کا حجرہ یا کرامت دیکھ کر اس کے دل میں ایمان پیدا ہوا۔ بت پرستی سے تائب ہو کر مسلمان ہو گیا اور کسی غار وغیرہ میں عبادت میں مشغول ہو گیا جب اس کو یہ خبر ملی کہ شہر کے لوگ ان رسولوں کی تعلیم و ہدایت کو جھٹلا کر ان کے درپے آزار ہو گئے، اور قتل کی دھمکیاں دے رہے ہیں، تو یہ اپنی قوم کی خیر خواہی اور ان رسولوں کی ہمدردی کے لیے جُلے جذبے سے جلدی کر کے اپنی قوم میں آیا اور ان کو رسولوں کا اتباع کرنے کی نصیحت کی۔ اور پھر اپنے مومن ہونے کا اعلان کر دیا۔ اِنِّیْ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاَسْمَعُوْا یعنی میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا ہوں تم سن لو۔ اس کا مخاطب اس کی قوم بھی ہو سکتا ہو، اور اس میں اللہ تعالیٰ کو ان کا رب کہنا انہما حقیقت کے لئے تھا، اگرچہ وہ اس کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خطاب رسولوں کو ہو، اور فَاَسْمَعُوْا کہنے کا مقصد یہ ہو کہ آپ سن لیں اور اللہ کے سامنے میرے ایمان کی شہادت دیں۔

قِيلَ اَدْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ الذِّیَّةَ، یعنی اس شخص کو جو گوشہ شہر سے رسولوں پر ایمان لانے کی تلقین کے لئے آیا تھا اس کو کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب کسی قرشتے کے ذریعے ہوا ہے، کہ جنت میں چلے جاؤ۔ اور مراد جنت میں داخل ہونے سے یہ خوش خبری دینا ہے کہ جنت تمہارا مقام متعین ہو چکا ہے، جو اپنے وقت پر حشر و نشر کے بعد حاصل ہو گا۔ (قرطبی)

اور یہ بھی بعید نہیں کہ ان کو ان کا مقام جنت اس وقت دکھلا دیا گیا ہو، اس کے علاوہ برزخ میں بھی اہل جنت کو جنت کے پھل پھول اور راحت کی چیزیں ملتی ہیں۔ اس لئے ان کا عالم برزخ میں پہنچنا ایک حیثیت سے جنت ہی میں داخل ہونا ہے۔

قرآن کریم کے اس لفظ سے کہ اس کو کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس شخص کو شہید کر دیا گیا تھا، کیونکہ دخول جنت یا آثار جنت کا مشاہدہ بعد موت ہی ہو سکتا ہے۔

تاریخی روایات میں حضرت ابن عباس، مقاتل، مجاہد ائمہ تفسیر سے منقول ہے کہ یہ شخص حبیب ابن اسماعیل نجار تھا، اور یہ ان لوگوں میں سے ہے جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

پر آپ کی بعثت کے چھ سو سال پہلے ایمان لایا ہے۔ جیسا کہ شیخ اکبر کے متعلق منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کتب سابقہ میں پڑھ کر آپ کی ولادت سے بہت پہلے آپ پر ایمان لایا تھا تیسرے بزرگ آدمی جو آپ پر آپ کی بعثت اور دعوت سے پہلے ایمان لائے وہ ابن نوفل ہیں جن کا ذکر صحیح بخاری کی حدیث ابتداء وحی کے واقعات میں آیا ہے۔ یہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ کی ولادت و بعثت سے پہلے آپ پر یہ تین آدمی ایمان لے آئے تھے یہ معاملہ کسی اور رسول و نبی کے ساتھ نہیں ہوا۔

وہب بن منبہ کی روایت میں ہے کہ یہ شخص جذامی تھا، اور ان کا مکان شہر کے سب سے آخری دروازہ پر تھا۔ اپنے مفروضہ معبودوں سے دعا کرتا تھا کہ مجھے تندرست کر دیں جس پر ستر سال گزر چکے تھے۔ یہ رسول شہر انطاکیہ میں اتفاقاً اسی دروازے سے داخل ہوئے تو اس شخص سے پہلے پہل ملاقات ہوئی تو انھوں نے اس کو بت پرستی سے باز آنے اور ایک خدا تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت دی۔ اس نے کہا کہ آپ کے پاس آپ کے دعویٰ کی کوئی دلیل و علامت صحت بھی ہے؟ انھوں نے کہا ہاں ہے۔ اس نے اپنی جذام کی بیماری بتلا کر پوچھا کہ آپ یہ بیماری دور کر سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں ہم اپنے رب سے دعا کریں گے، وہ تمہیں تندرست کر دے گا۔ اس نے کہا کہ کیا عجیب بات کہتے ہو، میں ستر سال سے اپنے معبودوں سے دعا مانگتا ہوں کچھ فائدہ نہیں ہوا، تمہارا رب کیسے ایک دن میں میری حالت بدل دے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ہمارا رب ہر چیز پر قادر ہے، اور جب کو تم نے خدا بنا رکھا ہے ان کی کوئی حقیقت نہیں، یہ کسی کو نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ سن کر یہ شخص ایمان لے آیا، اور ان بزرگوں نے اس کے لئے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا تندرست کر دیا کہ بیماری کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ اب تو اس کا ایمان پختہ ہو گیا، اور اس نے عہد کیا کہ دن بھر میں جو کچھ کمائے گا اس کا آدھا اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا۔ جب ان رسول پر شہر کے لوگوں کی یلغار کی خبر پائی تو یہ دوڑ کر آیا، اور اپنی قوم کو سمجھایا اور اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ پوری قوم اس کی دشمن ہو گئی، اور سب مل کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں ہے کہ لاتوں اور ٹھوکروں سے سب نے مل کر اس کو شہید کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس پر پتھر برسائے، اور اس وقت بھی ان سب کی بے تحاشا مار پڑنے کے وقت وہ کہتا جاتا تھا رَبِّ اِهْدِنِی صِرَاطَکَ الَّذِیْ اَنْتَ اَخْتَارُ! میری قوم کو ہدایت کر دے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ان لوگوں نے تینوں رسولوں کو بھی شہید کر دیا مگر کسی صحیح روایت میں اس کا ذکر نہیں ہو کہ ان کا کیا حال رہا بظاہر وہ مقتول نہیں ہوئے (قرطبی)



يَلَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ ۝

یہ بزرگ چونکہ بڑی بہادری کے ساتھ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے، حق تعالیٰ نے ان کے ساتھ خاص اکرام و اعزاز کا معاملہ فرمایا، اور جنت میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ اس نے انعام و اکرام اور جنت کی نعمتوں کا مشاہدہ کیا، تو پھر اپنی قوم یا دآئی، اور تمنا کی کہ کاش میری قوم کو میرا حال معلوم ہو جاتا کہ رسول پر ایمان لانے کی جزاء میں مجھے اعزاز و اکرام اور دائمی نعمتیں کیسی ملیں تو شاید ان کو بھی ایمان کی توفیق ہو جاتی۔ اس تمنا کا اظہار مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ہے۔

پیغمبرانہ دعوت و اصلاح کا طریقہ اس بستی کی طرف جو تین رسول بھیجے گئے، انھوں نے مشرکین و مبتغین اسلام کیلئے اہم ہدایت کفار سے جس طرح خطاب کیا اور ان کی سخت و تلخ باتوں اور

دھمکیوں کا جس طرح جواب دیا اسی طرح ان کی دعوت سے مسلمان ہونے والے حبیبِ نجات نے اپنی قوم سے جس طرح خطاب کیا ان سب چیزوں کو ذرا مکرر دیکھئے، تو اس میں تبلیغ دین اور اصلاحِ خلق کی خدمت انجام دینے والوں کے لئے بڑے سبق ہیں۔

ان رسولوں کی ناصحانہ تبلیغ و تلقین کے جواب میں مشرکین نے تین باتیں کہیں :-

(۱) تم تو ہمیں جیسے انسان ہو ہم تمھاری بات کیوں مانیں؟

(۲) اللہ رحمن نے کسی پر کوئی پیغام اور کتاب نہیں اتاری۔

(۳) تم خالص جھوٹ بولتے ہو۔

آپ غور کیجئے کہ بے غرض ناصحانہ کلام کے جواب میں یہ اشتعال انگیز گفتگو کیا جو آج چاہتی تھی، مگر ان رسولوں نے کیا جواب دیا۔ صرف یہ کہ رَبَّنَا يَعْلَمُ لَنَا إِلَهُكُمْ كَمَا تَعْلَمُونَ یعنی ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمھاری طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں، اور مَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاءُ الْمُبِينُ، یعنی ہمارا جو کام تھا وہ کہہ چکے کہ تمھیں اللہ کا پیغام واضح کر کے پہونچا دیا، آگے تمھیں اختیار ہے، مانو یا نہ مانو۔ دیکھئے ان کے کسی لفظ میں کیا ان کی اشتعال انگیزی کا کوئی تاثر ہے؟ کیسا مشفقانہ جواب دیا۔

پھر ان لوگوں نے اور آگے بڑھ کر یہ کہا کہ تم لوگ منحوس ہو، تمھاری وجہ سے ہم مصیبت میں پڑ گئے۔ اس کا متعین جواب یہ تھا کہ منحوس تم خود ہو، تمھارے اعمال کی شامت تمھارے گلے میں آ رہی ہے۔ مگر ان رسولوں نے اس بات کو ایسے مجمل الفاظ میں ادا کیا جس میں ان کے منحوس ہونے کی تصریح نہیں فرمائی، بلکہ یہ فرمایا تَايُرْكُم مَّعَكُمْ یعنی تمھاری بدفالی تمھارے ساتھ ہے۔ اور پھر وہی مشفقانہ خطاب کیا، اَبِئِنَّ ذُنُوبَكُمْ یعنی تم یہ تو سوچو کہ ہم نے تمھارا کیا بگاڑا ہے، ہم نے تو صرف تمھیں خیر خواہانہ نصیحت کی ہو

بس سب سے بھاری جملہ جو بولا تو یہ کہ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِ قُونَ یعنی تم لوگ حد و دوسے تجاوز کرنے والے ہو، بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہو۔

یہ تو ان رسولوں کا مکالمہ تھا، اب وہ مکالمہ دیکھتے جو ان رسولوں کی دعوت پر ایمان لانے والے نو مسلم نے کیا۔ اس نے پہلے تو اپنی قوم کو دو باتیں بتا کر رسولوں کی بات ماننے کی دعوت دی۔ اول یہ کہ ذرا یہ تو سوچو کہ یہ لوگ دور سے چل کر تمہیں نصیحت کرنے آئے ہیں، سفر کی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم سے کچھ مانگتے نہیں، یہ بات خود انسان کو غور کی دعوت دیتی ہے کہ یہ بے غرض لوگ ہیں ان کی بات میں غور تو کر لیں۔ دوسرے یہ کہ جو بات کہہ رہے ہیں وہ سراسر عقل و انصاف اور ہدایت کی بات ہے۔ اس کے بعد قوم کو ان کی غلطی اور گمراہی پر متنبہ کرنا تھا کہ اپنے پیدا کرنے والے قادر مطلق کو چھوڑ کر تم لوگ خود تراشیدہ بتوں کو اپنا حاجت روا سمجھ بیٹھے ہو، جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ خود تمہارا کوئی کام بنا سکتے ہیں اور نہ اللہ کے یہاں ان کا کوئی مقام اور درجہ ہے کہ اس سے سفارش کر کے تمہارا کام کرا دیں۔

مگر جیب بخار نے یہ ساری باتیں ان کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنی طرف منسوب کرنے کا عنوان اختیار کیا کہ میں ایسا کروں تو بڑی گمراہی کی بات ہوگی، وَمَا لِيْ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ الْاٰیۃ یہ سب اس لئے کہ مخالف کو اشتعال نہ ہو، بات میں ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ پھر جب اس کی قوم نے اس کی شفقت و رحمت کا بھی کچھ اثر نہ لیا، اور ان کو قتل کرنے کے لئے ان پر پل پڑی تو اس وقت بھی ان کی زبان پر کوئی بددعا کا کلمہ نہ آیا بلکہ یہی کہتے ہوئے جان دیدی کہ رَبِّ اِهْنِ قَوْمِیْ یعنی میرے پروردگار میری قوم کو ہدایت فرما دے، اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ قوم کے اس ظلم و ستم سے شہید ہونے والے کو جب اللہ کی طرف سے انعام و اکرام اور جنت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہوا تو اس وقت بھی اپنی یہی ظالم قوم یاد آئی، اور اس کی خیر خواہی و ہمدردی سے یہ تمنا کی کہ کاش میری قوم میرے حالات انعام و اکرام سے واقف ہو جاتی، تو شاید وہ بھی اپنی گمراہی سے باز آکر ان نعمتوں کی شریک بن جاتی۔ سبحان اللہ خلق اللہ کی خیر خواہی ان کے مظالم کے باوجود کس طرح ان حضرات کی رگ دپے میں پیوست ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے قوموں کی کایا پلٹی ہے، کفر و ضلالت سے نکال کر وہ مقام بختا ہے کہ فرشتے بھی ان پر رشک کرتے ہیں۔

آجکل کے مبلغین اور خدمت دعوت و اصلاح کے انجام دینے والوں نے عموماً اس پیغمبرانہ اسوہ کو چھوڑ دیا ہے، اسی لئے ان کی دعوت و تبلیغ بے اثر ہو کر رہ گئی ہے۔ تقریر و خطاب میں غصہ کا اظہار، مخالف پر فقرے چست کرتا بڑا کمال سمجھا جاتا ہے،



جو مخالفت کو اور زیادہ ضد و عناد کی طرت و تیل دیتا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مُتَّبِعِيْنَ اَنْبِيَائِكَ  
وَرَفَقَتِنَا مُحِبِّبِ وَرَفَضَاهُ

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلٰی قَوْمِهِ مِنْ بَعْضٍ مِّنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ  
اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَاِذَا هُمْ تَحَامِلُ قَوْمٌ۔ یہ اس قوم پر آسمانی عذاب کا ذکر  
ہے جس نے رسولوں کی تکذیب کی اور حبیبِ نجار کو مار مار کر شہید کر دیا تھا۔ اور عذاب کی تہمید  
میں یہ فرمایا کہ اس قوم کو عذاب میں پکڑنے کے لئے ہمیں آسمان سے کوئی فرشتوں کا لشکر بھیجنا  
نہیں پڑا اور نہ ایسا لشکر بھیجنا ہمارا دستور ہے۔ کیونکہ اللہ کا تو ایک ہی فرشتہ بڑی بڑی قوی  
بہادر قوموں کو تباہ کر دینے کے لئے کافی ہے، اس کو فرشتوں کا لشکر بھیجے کی کیا ضرورت ہے۔  
پھر ان پر آنے والے عذاب کو بیان فرمایا کہ بس اتنا ہوا کہ فرشتے نے ایک زور کی آواز لگائی  
جس سے یہ سب کے سب ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔

روایات میں ہے کہ جبریل امین نے شہر کے دروازے کے دونوں بازو پکڑ کر ایک  
سخت ہیبتناک آواز لگائی جس کے صدمہ کو کسی کی روح برداشت نہ کر سکی سب کے سب  
مرے رہ گئے۔ اُن کے مرجانے کو قرآن نے خَابِدُونَ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ خود آگ بجھ جانے  
کے معنی میں آتا ہے، جاندار کی حیات حرارتِ غریزی پر موقوف ہے، جب یہ حرارت ختم ہو جائے  
تو اسی کا نام موت ہے۔ خَابِدُونَ یعنی بجھے والے ٹھنڈے ہو جانے والے۔

وَاٰیَةٌ لَهُمُ الْاَرْضُ الْمَيِّتَةُ ۚ اَحْيَيْنَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا

اور ایک نشانی ہر ان کے واسطے زمینِ مُردہ اس کو ہم نے زندہ کر دیا اور نکالا اس میں سے اناج

فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝۳۳ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنَّتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ

سو اسی میں سے کھاتے ہیں۔ اور بنائے ہم نے اس میں باغ کھجور کے اور انگور کے

وَفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۝۳۴ لِّیَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهَا ۚ وَمَا عَمِلَتْهُ

اور بہاؤیہ اس میں بعضے چٹھے، کہ کھائیں اس کے میوؤں سے اور اس کو بنایا نہیں

اٰیْدٍ یَّمِیْنٌ ۙ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ۝۳۵ سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ

ان کے ہاتھوں نے پھر کیوں شکر نہیں کرتے۔ پاک ذات ہر جس نے بنائے جوڑے

كُلُّهَا مِمَّا تُنْبِئُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۶﴾ وَ

سب چیز کے اس قسم میں سے جو اگتا ہے زمین میں سے اور خود ان میں سے اور ان چیزوں میں کہ جن کی ان کو خبر نہیں اور

آيَةُ لَهُمُ اللَّيْلُ بِمَا تَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارُ فَإِذَا هُمْ مُظْلِمُونَ ﴿۳۷﴾ وَ

ایک نشانی ہر ان کے واسطے رات، کھینچ لیتے ہیں ہم اس پر سے دن کو پھر تب ہی یہ رہ جاتے ہیں اندھیرے میں، اور

الشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۳۸﴾

سورج چلا جاتا ہے اپنے مستقر پر یہ سادھا ہے اس زبردست باخبر نے۔

وَالْقَمَرَ قَدْ رَزَقْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ﴿۳۹﴾

اور چاند کو ہم نے بانٹ دی ہیں منزلیں یہاں تک کہ پھر آ رہا جیسے ٹہنی پرانی،

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ

نہ سورج سے ہو کہ پکڑے چاند کو اور نہ رات آگے بڑھے دن

النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿۴۰﴾ وَآيَةُ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا

سے، اور ہر کوئی ایک چکر میں پیرتے ہیں۔ اور ایک نشانی ہر ان کے واسطے کہ ہم نے اٹھالیا

ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿۴۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ

ان کی نسل کو اس بھری ہوئی کشتی میں۔ اور بنا دیا ہم نے ان کے واسطے کشتی جیسی

مَائِرَ كَبُورٍ ﴿۴۲﴾ وَإِنْ نَشَأْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيحَ لَهُمْ وَلَا هُمْ

چیزوں کو جس پر سوار ہوتے ہیں، اور اگر ہم چاہیں تو ان کو ڈبا دیں پھر کوئی نہ پہنچے ان کی فریاد کو اور نہ وہ

يُنْقِذُونَ ﴿۴۳﴾ إِلَّا رَحْمَةً مِنَّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿۴۴﴾

بچھڑے جائیں، مگر ہم اپنی مہربانی سے اور ان کا کام چلانے کو ایک وقت تک۔

## خلاصہ تفسیر

اور قدرت کی نشانیاں اور عظیم اشیان نعمتیں جو توحید کے دلائل بھی ہیں، ان میں سے،

ایک نشانی ان لوگوں کے استدلال کے لئے مردہ زمین ہے (اور اس میں نشانی کی بات یہ

ہے کہ، ہم نے اس کو (بارش سے) زندہ کیا اور ہم نے اس (زمین) سے (مختلف) غلے نکالے



سو ان میں سے لوگ کھاتے ہیں اور دیتے ہیں، ہم نے اس زمین میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ لگائے اور اس میں رباغ کی آب پاشی کے لئے چٹنے (اور نالے) جاری کئے تاکہ (مثل غلے کے) لوگ باغ کے پھلوں میں سے (بھی) کھائیں اور اس (پھل اور غلے) کو ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا، گو تم ریزی اور آب پاشی بظاہر انہی کے ہاتھوں ہوتی ہو مگر بیج سے درخت اور درخت سے پھل پیدا کرنے میں ان کا کوئی دخل نہیں، خاص خدا ہی کا کام ہے) سو ایسے دلائل دیکھ کر بھی کیا شکر نہیں کرتے (جس کا اول زینہ اللہ کے وجود اور توحید کا اقرار ہے۔ یہ استدلال تو زمینی اور آفاقی خاص نشانیوں سے تھا، آگے عام زمینی اور نفسیاتی نشانیوں سے استدلال ہو یعنی وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا، نباتات زمین کی قسم سے بھی (خواہ مقابلہ مماثلت کا ہو جیسے ایک غلے، ایک پھل، خواہ مقابلہ مضاد و مخالفت کا ہو جیسے گہوا اور جوار شیریں پھل اور ترش پھل) اور (خود) ان آدمیوں میں سے بھی (جیسے مرد اور عورت) اور ان چیزوں میں بھی جن کو (عام) لوگ نہیں جانتے (مقابلہ کے عام مفہوم کے اعتبار سے مخفی چیزوں میں بھی کوئی شے مقابل سے خالی نہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا بے مقابل ہونا معلوم ہو گیا یہاں سے آیت وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ کی بھی توضیح ہو گئی) اور آگے بعض آیات آفاقیہ سماویہ اور ان کے بعض آثار سے استدلال ہو یعنی، ایک نشانی ان لوگوں کے لئے رات (کا وقت) ہے کہ روبرو اصل ہونے ظلمت کے گویا اصل وقت وہی تھا اور نور آفتاب عارضی تھا، گویا اس ظلمت کو دن نے چھپا لیا تھا، جیسے بکری کے گوشت کو اس کی کھال چھپا لیتی ہے پس) ہم (اسی عارض کو زائل کر کے گویا) اس (رات) پر سے دن کو اتار لیتے ہیں سو یکایک (پھر رات نمودار ہو جاتی ہے اور) وہ لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور (ایک نشانی) آفتاب (ہے کہ وہ) اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے، (یہ عام ہو اس نقطہ کو بھی جہاں سے چل کر سالانہ دورہ کر کے پھر اسی نقطہ پر جا پہنچتا ہے اور نقطہ افقیہ کو بھی، کہ حرکت یومیہ میں وہاں پہنچ کر غروب ہو جاتا ہے) اور یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اس (خدا) کا جو زبردست (یعنی قادر ہو اور) علم والا ہے کہ علم سے ان انتظامات میں مصلحت و حکمت جانتا ہے اور قدرت سے ان انتظامات کو نافذ کرتا ہے) اور (ایک نشانی) چاند (ہے کہ اُس کی چال) کے لئے منزلیں معتر رکھیں کہ ہر روز ایک منزل قطع کرتا ہے، یہاں تک کہ اپنے آخر دورے میں پتلا ہوتا ہوتا، ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پُرانی ٹہنی (کہ پتلی اور خمدار ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ ضعف نور کی وجہ سے زردی میں بھی تشبیہ کا اعتبار کیا جاوے اور سورج اور چاند کی چال اور رات و دن کی آمد و رفت ایسے انداز اور انتظام سے رکھی گئی ہے کہ نہ آفتاب کی چال ہے کہ چاند کو اس کے ظہور نور کے وقت

میں یعنی رات میں جبکہ وہ منور ہوا جا پکڑے یعنی قبل از وقت غروب و طلوع ہو کر اس کو اور اس کے وقت  
یعنی رات کو ہٹا کر دن بنا دے جیسا کہ قمر بھی اسی طرح آفتاب کو اس کے ظہور نور کے وقت نہیں  
پکڑ سکتا کہ دن کو ہٹا کر رات بنا دے اور اس میں قمر کا نور ظاہر ہو جائے اور (اسی طرح) نہ رات  
دن کے زمانہ مقررہ کے ختم ہونے سے پہلے آسکتی ہے (جیسے دن بھی رات کے زمانہ  
مقررہ کے ختم ہونے سے پہلے نہیں آسکتا) اور (چاند اور سورج) دونوں ایک ایک کے  
دائرہ میں (حساب سے اس طرح چل رہے ہیں جیسے گویا) تیرہے ہیں (اور حساب سے باہر نہیں  
ہو سکتے کہ رات دن کے حساب میں خلل واقع ہو سکے) اور (آگے آیات آفاقہ ارضیہ میں سے  
ایک خاص نشانی سفر اور سواری وغیرہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں یعنی) ایک نشانی ان کے  
لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا، (اپنی اولاد کو اکثر لوگ تجارت  
کے لئے سفر میں بھیجتے تھے، پس اس تعبیر میں تین نعمتوں کی طرف اشارہ ہو گیا۔ اول بھری ہوئی  
کشتی کو جو بوجھل ہونے کی وجہ سے پانی میں غرق ہونے والی چیز ہے سطح آب پر رواں کرنا،  
دوسرے ان لوگوں کو اولاد عطا فرمانا، تیسرے رزق و سامان دینا جس سے خود گھر بیٹھے رہیں  
اور اولاد کو کارندہ بنا کر بھیجیں) اور (سفر خشکی کے لئے) ہم نے ان کے لئے کشتی ہی جیسی ایسی  
چیزیں پیدا کیں جن پر یہ لوگ سوار ہوتے ہیں (مراد اس سے اونٹ وغیرہ ہیں اور تشبیہ کشتی  
کے ساتھ اس خاص وصف کے اعتبار سے ہے کہ اس پر بھی سواری اور بار برداری اور  
قطع مسافت کی جاتی ہے اور اس تشبیہ کا حسن اس سے بڑھ گیا کہ عرب میں اونٹ کو سفینۃ البر  
یعنی خشکی کی کشتی کہنے کا محاورہ شائع تھا۔ آگے کشتی کے ذکر کی مناسبت سے کفار کے لئے  
ایک وعید عذاب کی بیان فرمائی کہ) اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ تو (جن چیزوں  
کو وہ پوجتے ہیں ان میں سے) ان کا کوئی فریاد رس ہو (جو غرق سے بچالے) اور نہ یہ (بعد  
غرق کے موت سے) خلاصی دیتے جائیں (یعنی نہ کوئی موت سے چھڑا سکے) مگر یہ ہماری ہی  
ہربانی ہے اور ان کو ایک وقت معین تک (دنیاوی زندگی سے) فائدہ دینا (منظور) ہے  
(اس لئے ہمت دے رکھی ہے)۔

## معارف و مسائل

سورۃ یس میں زیادہ تر مضامین آیات قدرت اور اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات  
بیان کر کے آخرت پر استدلال اور حشر و نشر کے عقیدے پر نچتہ کرنے سے متعلق ہیں۔  
مذکورہ صدر آیات میں قدرت الہیہ کی ایسی ہی نشانیاں بیان فرمائی ہیں جو ایک طرف



اس کی قدرت کاملہ کے دلائل واضح ہیں، دوسری طرف انسان اور عام مخلوقات پر حق تعالیٰ کے خاص انعامات و احسانات اور ان میں عجیب و غریب حکمتوں کا اثبات ہے۔

پہلی آیت میں زمین کی ایک مثال پیش فرمائی ہے جو ہر وقت ہر انسان کے سامنے ہے کہ خشک زمین پر آسمان سے پانی برستا ہے تو زمین میں ایک قسم کی زندگی پیدا ہوتی ہے جس کے آثار اس میں پیدا ہونے والی نباتات اور اشجار اور ان کے ثمرات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ان درختوں کے بڑھانے اور باقی رکھنے کے لئے زیر زمین اور سطح زمین پر چشموں کا جاری کرنا ذکر فرمایا: **لِيَأْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ** یعنی ہواؤں یا دلوں اور زمین کی ساری قوتوں کو کام میں لگانے کا منشاء یہ ہے کہ لوگ ان کے پھل کھائیں۔ یہ سب چیزیں تو آنکھوں سے مشاہدہ کی ہیں، جو ہر انسان دیکھنا جانتا ہے، آگے انسان کو اس چیز پر متنبہ کیا گیا جس کے لئے یہ سارا کارخانہ قائم کیا گیا۔ فرمایا

نباتات کی پیداوار میں انسان کے عمل کا دخل نہیں **وَمَا عَلَيْكُمْ أَلَّا يَأْكُلُوا**، جہور مفسرین نے اس میں حرف مآ کو نفی کے لئے قرار دے کر یہ ترجمہ کیا ہے کہ نہیں بنایا ان پھلوں کو ان

لوگوں کے ہاتھوں نے۔ اس جملے نے غافل انسان کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ ذرا اپنے کام اور محنت میں غور کر کہ تیرا کام اس باغ و بہار میں اس کے سوا کیا ہے کہ تو نے زمین میں بیج ڈال دیا، اس پر پانی ڈال دیا، زمین کو نرم کر دیا، کہ نازک کو نپل نکلتے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو، مگر اس بیج میں سے درخت اُگنا، درخت پر پتے اور شاخیں نکالنا پھر اس پر طرح طرح کے پھل پیدا کرنا ان سب چیزوں میں تیرا کیا دخل ہے۔

یہ تو خالص قادر مطلق حکم و دانا ہی کا فعل ہو سکتا ہے۔ اس لئے تیرا فرض ہے کہ ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے وقت اس کے خالق و مالک کو فراموش نہ کرے۔ اسی کی نظیر سورۃ واقعہ کی آیت **أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ** **أَنْتُمْ تَزْرَعُونَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُزَارِعُونَ** یعنی دیکھو تو جو چیز تم بوتے ہو اس کو نشوونما دے کر درخت تم نے بنایا ہے یا ہم نے؟ خلاصہ یہ ہوا کہ اگرچہ ان پھلوں کے بنانے میں انسان کا کوئی دخل نہیں، مگر ہم نے اپنے فضل سے ان کو پیدا بھی کیا اور انسان کو ان کا مالک بھی بنادیا اور اس کو اس کے کھانے اور فائدہ اٹھانے کا سلیقہ بھی سکھادیا۔

انسانی غذا اور حیوانات اور ابن جریر وغیرہ بعض مفسرین نے **وَمَا عَمَلَتْهُ** میں لفظ مآ کو نفی کے لئے نہیں بلکہ اسم موصول بمعنی **الَّذِي** قرار دے کر یہ ترجمہ کیا ہے

کہ یہ سب چیزیں اس لئے پیدا کی ہیں کہ لوگ ان کے پھل کھاویں، اور ان چیزوں کو بھی کھاویں جو ان نباتات اور پھلوں سے خود انسان اپنے ہاتھوں کے کسب و عمل سے تیار کرتا ہے مثلاً

پھلوں سے طرح طرح کے حلوے، اجار، چٹنی، تیار کرنا اور بعض پھلوں سے تیل وغیرہ نکالنا جو انسانی کسب و عمل کا نتیجہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوگا کہ یہ پھل جو قدرت نے بنائے ہیں بغیر کسی عمل اور انسانی تصرف کے بھی کھانے کے قابل بنائے گئے ہیں، اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ سلیقہ بھی دیا ہے کہ ایک ایک پھل سے طرح طرح کی خوش ذائقہ اور مفید چیزیں تیار کر لے۔

اس صورت میں پھلوں کا پیدا کرنا اور انسان کو اس کا سلیقہ دینا کہ ایک پھل کو دوسری چیزوں سے مرکب کر کے طرح طرح کی اشیاء خوردنی خوش ذائقہ اور مفید تیار کر لے، یہ دوسری نعمت ہے۔ ابن کثیر نے ابن جریر کی اس تفسیر کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ اس تفسیر کی تائید حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی قرأت سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ ان کی قرأت میں لفظ مآ کے بجائے مآ آیا ہے یعنی مآ عَمِلْتُمْ اَبْدُرْہُمْ۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ دنیا کے تمام حیوانات بھی نباتات اور پھل کھاتے ہیں، کچھ جانور گوشت کھاتے ہیں کچھ مٹی کھاتے ہیں، لیکن ان سب جانوروں کی خوراک مفردات ہی سے ہے۔ گھاس کھانے والا خالص گھاس، گوشت کھانے والا خالص گوشت کھاتا ہے، ان چیزوں کو دوسری چیزوں سے مرکب کر کے طرح طرح کے کھانے تیار کرنا، نمک، مرچ، شکر، ترشی وغیرہ سے مرکب ہو کر ایک کھانے کی دس قسمیں بن جاتی ہیں۔ یہ مرکب خوراک صرف انسان ہی کی ہے، اسی کو مختلف چیزوں سے ایک مرکب غذا تیار کرنے کا سلیقہ دیا گیا ہے۔ یہ گوشت کے ساتھ نمک، مرچ، مسالے اور پھلوں کے ساتھ شکر وغیرہ کا امتزاج انسان کی صنعت کاری ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس کو سکھا دی ہے۔ قدرت کی ان عظیم الشان نعمتوں اور ان میں قدرت کی صنعت کاری کی بے مثال آیتوں کو ذکر فرمانے کے بعد آخر میں فرمایا اَفَلَا يَشْكُرُونَ، کیا یہ عاقل لوگ ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد شکر گزار نہیں ہوتے؟ آگے اس زمینی پیداوار اور آب و ہوا کے ذکر کے بعد انسان اور حیوانات کو بھی شامل کر کے قدرت مطلقہ کی ایک اور نشانی سے آگاہ کیا جاتا ہے، سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَسْمٰوٰجَ کُلَّہَا مِثْمٰثًا اَلَا مِثْمٰثًا جوڑے کے معنی میں آتا ہے۔ جوڑے میں دو متقابل چیزیں ہوتی ہیں، ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کا زوج کہا جاتا ہے۔ جیسے مرد و عورت ہیں مرد کو عورت کا اور عورت کو مرد کا زوج کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حیوانات کے نر و مادہ باہم زوج ہیں، نباتات کے بہت سے درختوں میں بھی نر اور مادہ کا ادراک کیا گیا ہے۔ کھجور اور پیپتہ کے درختوں میں تو معروف و مشہور ہی ہے، اور ان میں بھی ہو تو کچھ بعید نہیں۔ جیسا کہ سائنس کی جدید تحقیقات میں تمام پھلدار اور پھلدار



درختوں میں نروادہ ہوتے ہیں، ان میں توالد و تناسل ہونا بتلایا گیا ہے۔ اسی طرح اگر یہی محفی سلسلہ جمادات اور دوسری مخلوقات میں بھی ہو تو کیا بعید ہے جس کی طرف دُرِّمَالًا یَعْلَمُونَ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور عام طور پر حضرات مفسرین نے ازواج کو بمعنی انواع و اقسام لکھا ہے، کیونکہ جس طرح نروادہ کو باہم زوجین کہا جاتا ہے اسی طرح دو متقابل چیزوں کو بھی زوجین کہتے ہیں جیسے سردی گرمی، خشکی تری، بچ خوشی، بیماری تندرستی، پھر ان میں ہر ایک کے اندر اعلیٰ ادنیٰ، متوسط کے اعتبار سے بہت درجات اور انواع و اقسام بن جاتی ہیں، اسی طرح انسانوں اور جانوروں میں رنگ و ہیئت اور زبان اور طرز معیشت کے اعتبار سے بہت سی انواع و اقسام ہیں۔ لفظ ازواج ان تمام انواع و اقسام کو شامل ہے۔ آیت مذکورہ میں پہلے تو مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ یعنی نباتات کی انواع و اقسام کا بیان فرمایا ہے، اس کے بعد مِنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی خود انسانی نفوس کے انواع و اقسام کا ذکر ہے، اور اس کے بعد مِمَّا لَا یَعْلَمُونَ میں ہزاروں مخلوقات شامل ہیں جن کا آج تک بھی لوگوں کو انکشاف نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ زمین کی تہہ میں اور دریاؤں اور پہاڑوں میں کتنی انواع و اقسام حیوانات، نباتات اور جمادات کی ہیں۔

وَاٰیۃٌ لِّہُمْ الْیَّسَّرُ لَیْسَ لَہُمْ مِّنۡہٗ الْیَّسَّرُ، زمین پر مخلوقات میں قدرت خداوندی کی نشانیاں بیان فرمانے کے بعد آسمانی اور آفاقی مخلوقات کا ذکر ہے۔ یَسَّرُ کے لفظی معنی کھال اتارنے کے ہیں، کسی جانور کے اوپر سے کھال یا دوسری چیزوں پر سے غلاف اتار دیا جائے تو اندر کی چیز ظاہر ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مثال میں اشارہ فرمایا ہے کہ اس جہان میں اصل تو ظلمت اور اندھیرا ہے، روشنی عارضی ہے جو سیارات اور ستاروں کے ذریعہ زمین پر چھا جاتی ہے، تقدیری نظام میں مقررہ وقت پر یہ روشنی جو دنیا کی اندھیری پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اس کو اوپر سے ہٹا لیا جاتا ہے تو ظلمت و اندھیری رہ جاتی ہے، اسی کو عرف میں رات کہا جاتا ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّہَا ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ، آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آفتاب چلتا رہتا ہے، اپنے مستقر کی طرف مستقر جائے قرار کو بھی کہا جاتا ہے، اور وقت قرار کو بھی یعنی مستقر زمانی بھی ہو سکتا ہے مکانی بھی۔ اور لفظ مستقر منہائے سیر و سفر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی بلا کسی وقفہ اور سکون کے دوسرا دورہ سفر شروع ہو جائے (ذکرہ ابن کثیر)

بعض حضرات مفسرین نے تو اس جگہ مستقر سے مستقر زمانی مراد لیا ہے، یعنی وہ وقت جبکہ آفتاب اپنی حرکت مقررہ پوری کر کے ختم کر دے گا، اور وہ وقت قیامت کا دن ہے۔

اس تفسیر پر معنی آیت کے یہ ہیں کہ آفتاب اپنے مدار پر ایسے محکم اور مضبوط نظام کے ساتھ حرکت کر رہا ہے جس میں کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا۔ ہزار ہا سال اس روش پر گزر چکے ہیں مگر یہ سب دائمی نہیں، اس کا ایک خاص مستقر ہے، جہاں پہنچ کر یہ نظام شمسی اور حرکت بند اور ختم ہو جائے گی، اور وہ قیامت کا دن ہے۔ یہ تفسیر حضرت قتادہؓ سے منقول ہے (ابن کثیر) اور قرآن کریم کی سورۃ زمر کی ایک آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ مستقر سے مراد مستقر زمانی یعنی روز قیامت ہے۔ آیت سورۃ زمر کی یہ ہے: خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِأَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ۖ يَكُونُ الْيَوْمُ عَلَى النَّهَارِ وَمِثْلَهُ عَلَى الْلَيْلِ ۖ وَسَعَى السَّمْسُ وَالْقَمَرُ كُلٌّ بِأَجَلٍ مُّسَمًّى ط اس آیت میں بھی تقریباً وہی بیان ہے جو سورۃ یس کی آیت مذکورہ کا ہے کہ اول لیل و نہار کے انقلاب کو عوامی نظر کے مطابق ایک تمثیل سے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے، اور دن کو رات پر، گویا رات اور دن کو دو غلافوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ رات کا غلاف دن پر چڑھا دیا جاتا ہے تو رات ہو جاتی ہے اور دن کا غلاف رات پر چڑھا دیا جاتا ہے تو دن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ شمس و قمر دونوں اللہ تعالیٰ کے محض اور تابع فرمان ہیں، ان میں سے ہر ایک ایک خاص میعاد کے لئے چل رہا ہے۔ یہاں آجَل مُّسَمًّى کے الفاظ ہیں جن کے معنی میعاد معین کے ہیں، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ شمس و قمر دونوں کی حرکت دائمی نہیں، ایک میعاد معین یعنی روز قیامت پر پہنچ کر ختم اور منقطع ہو جائے گی سورۃ یس کی آیت مذکورہ میں بھی ظاہر یہی ہے کہ لفظ مستقر سے یہی میعاد معین یعنی مستقر زمانی مراد ہے۔ اس تفسیر میں نہ آیت کے مفہوم و مراد میں کوئی اشکال ہے، نہ قواعد ہیئت و ریاضی کا کوئی اعتراض۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس سے مراد مستقر مکانی لیا، جس کی بناءً ایک حدیث پر ہے جو صحیحین بخاری و مسلم وغیرہ میں متعدد صحابہ سے متعدد اسانید کے ساتھ منقول ہے۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ کی روایت ہے کہ وہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غروب آفتاب کے وقت مسجد میں حاضر تھے، آپؐ نے ان کو خطاب کر کے سوال کیا کہ ابو ذر! تم جانتے ہو کہ آفتاب کہاں غروب ہوتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ آفتاب چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے پہنچ کر سجدہ کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اس آیت میں مستقر سے یہی مراد ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا

حضرت ابو ذرؓ ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا کی تفسیر دریافت کی تو آپؐ نے فرمایا



مُسْتَقَرُّهَا تَحْتَ الْعَرْشِ، بخاری نے اس روایت کو متعدد مقامات پر نقل کیا ہے اور ابن ماجہ کے علاوہ تمام کتب ستہ میں یہ روایت موجود ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی اسی مضمون کی حدیث منقول ہے، اس میں کچھ زیادتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ روزانہ آفتاب تحت العرش پہنچ کر سجدہ کرتا ہے اور نئے دورے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ اجازت پا کر نیا دورہ شروع کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن ایسا آئے گا جب اس کو نیا دورہ کرنے کی اجازت نہیں ملے گی، بلکہ یہ حکم ہوگا کہ جس طرف سے آیا ہے اسی طرف لوٹ جا۔ یعنی مغرب کی طرف سے زمین کے نیچے جا پھر مغرب ہی کی طرف سے لوٹ کر مغرب سے طلوع ہو جا۔ جس روز ایسا ہوگا تو یہ قیامت کے بالکل قریب ہونے کی علامت ہوگی، اور اس وقت توبہ کرنے اور ایمان لانے کا دروازہ بند کر دیا جائے گا، اس وقت کسی مبتلا گناہ کی گناہ سے اور مبتلائے شرک و کفر کی کفر سے توبہ قبول نہ ہوگی (ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق)۔

سجود شمس یعنی آفتاب کے | ان روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقر سے مراد مکانی مستقر ہی زیر عرش سجود کرنے کی تحقیق | یعنی وہ جگہ جہاں آفتاب کی حرکت کا ایک دورہ پورا ہو جائے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جگہ تحت العرش ہی۔ اس صورت میں مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہر روز آفتاب ایک خاص مستقر کی طرف چلتا ہے، پھر وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کر کے اگلے دورے کی اجازت مانگتا ہے، اجازت ملنے پر دوسرا دورہ شروع کرتا ہے۔

لیکن واقعات و مشاہدات اور ہیئت و فلکیات کے بیان کردہ اصول کی بناء پر اس میں متعدد قوی اشکالات ہیں۔

اول یہ کہ عرشِ رحمن کی جو کیفیت قرآن و سنت سے سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام زمینوں اور آسمانوں کے اوپر محیط ہے۔ یہ زمین اور سب آسمان مع سیارات و انجم کے سب کے سب عرش کے اندر محصور ہیں، اور عرشِ رحمن ان تمام کائناتِ سماویہ کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اس لحاظ سے آفتاب تو ہمیشہ ہر حال اور ہر وقت ہی زیر عرش ہے، پھر غروب کے بعد زیر عرش جانے کا کیا مطلب ہوگا؟

دوسرے یہ کہ مشاہدہ عام ہے کہ آفتاب جب کسی ایک جگہ سے غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع ہوتا ہے، اس لئے طلوع و غروب اس کا ہر وقت ہر حال میں جاری ہے، پھر بعد الغروب تحت العرش جانے اور سجدہ کرنے کے کیا معنی ہیں؟

تیسرے یہ کہ اس حدیث کے ظاہر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب اپنے مستقر پر پہنچ کر وقفہ کرتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کر کے اگلے دورے کی اجازت لیتا ہے، حالانکہ

آفتاب کی حرکت میں کسی وقت بھی انقطاع نہ ہونا کھلا ہوا مشاہدہ ہے۔ اور پھر چونکہ طلوع و غروب آفتاب کا مختلف مقامات کے اعتبار سے ہر وقت ہی ہوتا رہتا ہے، تو یہ وقفہ اور سکون بھی ہر وقت ہونا چاہئے، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ آفتاب کو کسی وقت بھی حرکت نہ ہو۔

یہ اشکالات صرف فنون ریاضی اور فلکیات ہی کے نہیں، مشاہدات اور واقعات کے ہیں جن سے صرف نظر نہیں ہو سکتا، اور فنی اعتبار سے فلک الافلاک کے تابع آفتاب کی یہ یہ حرکت اور آفتاب کا چوتھے آسمان میں مرکوز ہونا جو بطلمیوسی نظریہ ہے، جس کے خلاف اس سے پہلے بھی فیثاغورث نے اس نظریہ کی مخالفت کی تھی، اور آجکل کی نئی تحقیقات بطلمیوسی نظریہ کی غلطی اور فیثاغورث کے نظریہ کی صحت کو قریب بہ یقین کر دیا ہے، اور حالیہ خلائی سفروں اور چاند تک انسان کی رسائی کے واقعات نے اتنی بات تو یقینی کر ہی دی ہے کہ تمام سیارات آسمان سے نیچے کی فضا میں ہیں، آسمانوں کے اندر مرکوز نہیں۔ قرآن کریم کی آیت جو عنقریب آرہی ہے **وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ**، اس سے بھی اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے، اس نظریہ میں یہ بھی ہو کہ یہ روزانہ کا طلوع و غروب آفتاب کی حرکت سے نہیں بلکہ زمین کی حرکت سے ہے۔ اس فنی نظریہ کے اعتبار سے حدیث مذکور میں ایک اور اشکال بڑھ جاتا ہے۔

اس کا جواب سمجھنے سے پہلے یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ جہاں تک آیت مذکورہ کی تصریح ہے اس پر مذکورہ شبہات و اشکالات میں سے قرآن پر کوئی بھی اشکال نہیں ہوتا۔ اس کا مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ آفتاب کو حق تعالیٰ نے ایک ایسی منظم اور مستحکم حرکت پر لگایا ہوا ہے کہ وہ اپنے مستقر کی طرف برابر ایک حالت پر چلتا رہتا ہے۔ اگر اس مستقر سے مراد تفسیر قتادہ کے مطابق مستقر زمینی لیا جائے یعنی روز قیامت، تو معنی اس کے یہ ہیں کہ آفتاب کی یہ حرکت قیامت تک دائمی ایک حال پر چلتی رہے گی پھر اس روز ختم ہو جائے گی۔ اور اگر مستقر مکانی مراد لیں تو بھی اس کا مستقر مدار شمسی کے اس نقطہ کو کہا جاسکتا ہے جہاں سے اول تخلیق کے وقت آفتاب نے حرکت شروع کی اسی نقطہ پر پہنچ کر اس کا شبانہ روز کا ایک دورہ مکمل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی نقطہ اس کا انتہائی سفر ہے، اس پر پہنچ کر نئے دورہ کی ابتداء ہوتی ہے۔ رہا یہ کہ اس عظیم الشان دائرہ کا وہ نقطہ کہاں اور کونسا ہے جہاں سے آفتاب کی حرکت ابتداء آفرینش میں شروع ہوئی، قرآن کریم اس قسم کی فضول بحثوں میں انسان کو نہیں الجھاتا جس کا تعلق اس کے کسی دینی یا دنیوی فائدے سے نہ ہو۔ یہ اسی قسم کی بحث ہے، اس لئے اس کو چھوڑ کر قرآن کریم نے اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی۔ اور وہ مقصد حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا ملکہ کے خاص مظاہر کا بیان ہے، کہ اس جہان میں سب سے بڑا اور سب سے روشن ترین کرہ آفتاب کا ہے۔



وہ بھی نہ خود بخود بن گیا ہے اور نہ خود بخود اس کی کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے نہ باقی رہ سکتی ہے، وہ اپنی اس شبانہ روز کی حرکت میں ہر وقت حق تعالیٰ کی اجازت و مشیت کے تابع چلتا ہے۔

جتنے اشکالات اوپر لکھے گئے ہیں آیات مذکورہ کے بیان پر ان میں سے کوئی بھی شبہ اور اشکال نہیں، البتہ احادیث مذکورہ جن میں یہ آیا ہے کہ وہ غروب کے بعد زیر عرش پہنچ کر سجدہ کرتا ہے اور اگلے دورے کی اجازت مانگتا ہے یہ سب اشکالات اس سے متعلق ہیں۔ اور اس آیت کے ذیل میں یہ بحث اسی لئے چھڑی کہ حدیث کے بعض الفاظ میں اس آیت کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ اس کے جوابات محدثین و مفسرین حضرات نے مختلف دیئے ہیں، اظہار الفاظ کے اعتبار سے جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ آفتاب کا یہ سجدہ دن رات میں صرف ایک مرتبہ بعد از غروب ہوتا ہے، جن حضرات نے حدیث کو اسی ظاہری مفہوم پر محمول کیا ہے انھوں نے غروب کے متعلق تین احتمال بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ معظم معمرہ کا غروب مراد ہو، یعنی اس مقام کا جہاں کے غروب پر اکثر دنیا کی آبادی میں غروب ہو جاتا ہے، یا خط استواء کا غروب، یا افق مدینہ کا غروب۔ اس طرح یہ اشکال نہیں رہتا کہ آفتاب کا غروب و طلوع تو ہر وقت ہر آن ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں ایک خاص افق کے غروب پر کلام کیا گیا ہے، لیکن صاف بے غبار جواب وہ معلوم ہوتا ہے جو حضرت استاذ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مقالے ”سجود شمس میں خستیاں فرمایا ہے“ اور متعدد ائمہ تفسیر کے کلام سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے سمجھنے سے پہلے پیغمبرانہ تعلیمات و تعبیرات کے متعلق یہ اصولی بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ آسمانی کتابیں اور ان کے لانے والے انبیاء علیہم السلام خلق خدا کو آسمان و زمین کی مخلوقات میں غور و فکر اور تدبیر کی طرف مسلسل دعوت دیتے ہیں، اور ان سے اللہ تعالیٰ کے وجود و توحید و علم و قدرت پر استدلال کرتے ہیں، مگر ان چیزوں میں تدبیر اسی حد تک مطلوب شرعی ہے جس حد تک اس کا تعلق انسان کی دنیوی اور معاشرتی ضرورت سے یا دینی اور اخروی ضرورت سے ہو۔ اس سے زائد نرمی فلسفیانہ تدقیق اور حقائق اشیاء کے کھوج لگانے کی فکر میں عام خلق اللہ کو نہیں ڈالا جاتا۔ کیونکہ اول تو حقائق اشیاء کا مکمل حقیقی علم خود حکماء و فلاسفہ کو بھی باوجود عمریں صرف کرنے کے نہیں ہو سکا، بیچارے عوام تو کس شمار میں ہیں، پھر اگر وہ حاصل بھی ہو جائے اور اس سے نہ ان کی کوئی دینی ضرورت پوری ہو اور نہ کوئی صحیح مقصد دنیوی اس سے حاصل ہو تو اس لا یعنی اور فضول بحث میں دخل دینا اصاحتِ عمر اور اصاحتِ مال کے سوا کیا ہے۔

قرآن اور انبیاء کا استدلال آسمان و زمین کی مخلوقات اور ان کے تغیرات و انقلابات

سے صرف اس حد تک ہوتا ہے جو ہر انسان کو مشاہدہ اور ادنیٰ غور و فکر سے حاصل ہو سکے۔ فلسفہ اور ریاضی کی فنی تحقیقات جو صرف حکماء و علماء ہی کر سکتے ہیں نہ ان پر استدلال کا مدار رکھا جاتا ہو نہ ان میں غور و خوض کی ترغیب دی جاتی ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ پر ایمان اور اس کے پیغام پر عمل ہر انسان کا فرض ہے۔ عالم ہو یا جاہل، مرد ہو یا عورت، شہری ہو یا دیہاتی، کسی پہاڑ اور جزیرہ میں رہتا ہو یا کسی متمدن شہر میں، اس لئے پیغمبرانہ تعلیمات عوام کی نظر اور ان کی عقل و فہم کے مطابق ہوتی ہیں جن میں کسی فنی مہارت کی ضرورت نہ ہو۔

نماز کے اوقات کی پہچان، سمت قبلہ کا متعین کرنا، مہینوں اور سالوں اور تاریخوں کا کادراک، ان سب چیزوں کا علم ریاضی کے حسابات کے ذریعہ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر شریعت اسلام نے ان میں سے کسی چیز کا مدار ریاضی کی فنی تحقیقات پر رکھنے کے بجائے عام مشاہدات پر رکھا ہے۔ مہینے اور سال اور ان کی تاریخیں قمری حساب رکھیں اور چاند کے ہونے نہ ہونے کا مدار صرف رویت ہلال اور مشاہدہ پر رکھا۔ روزے اور حج کے ایام اسی بنیاد سے متعین کئے گئے۔ چاند کے گھٹنے بڑھنے چھپنے اور پھر طلوع ہونے کا راز بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس کا جواب قرآن نے یہ دیا کہ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ النَّاسِ وَالْحَجِّ، یعنی آپ کہہ دیں کہ چاند کے یہ سب تغیرات اس مقصد کے لئے ہیں کہ تم ان سے مہینے کا شروع اور ختم اور اس کی تاریخیں معلوم کر کے حج وغیرہ کے دن متعین کر سکو۔ اس جواب نے ان کو اس پر تنبیہ فرمادی کہ تمہارا سوال لایعنی اور فضول ہے، اس کی حقیقت معلوم کرنے پر تمہارا کوئی کام دین یا دنیا کا اٹکا ہوا نہیں، اس لئے سوال اس چیز کا کرو جس کا تعلق تمہاری دینی یا دنیوی ضرورت سے ہو۔

اس تمہید کے بعد اصل معاملہ پر غور کیجئے، کہ آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے چند مظاہر کا ذکر کر کے انسان کو اللہ کی توحید اور علم و قدرت کاملہ پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اس میں سب سے پہلے زمین کا ذکر کیا، جو ہر وقت ہمارے سامنے ہے وَآيَةٌ لَهُمُ اللَّائِيَةُ، پھر اس پر پانی برسا کر درخت اور نباتات اگانے کا ذکر کیا، جو ہر انسان دیکھتا اور جانتا ہے، آخِيتُنَّهَا الْآيَةُ، اس کے بعد آسمان اور فضا سے آسانی سے متعلق چیزوں کا ذکر شروع کر کے پہلے لیل و نہار کے روزانہ انقلاب کا ذکر فرمایا وَآيَةٌ لَهُمُ الْكُلُّ الْآيَةُ، اس کے بعد سورج اور چاند جو سیارات و انجم میں سب سے بڑے ستارے ہیں ان کا ذکر فرمایا۔ ان میں پہلے آفتاب کے متعلق فرمایا وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ اس میں غور کیجئے کہ مقصد اس کا یہ بتلانا ہے کہ آفتاب



خود بخود اپنے ارادے اور اپنی قدرت سے نہیں چل رہا بلکہ یہ ایک عزیز و علیم یعنی قدرت والے اور جاننے والے کے مقرر کردہ نظم کے تابع چل رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غروب آفتاب کے قریب حضرت ابوذر ثقفاریؓ کو ایک سوال و جواب کے ذریعہ اسی حقیقت پر متنبہ ہونے کی ہدایت فرمائی، جس میں بتلایا کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد عرش کے نیچے اللہ کو سجدہ کرتا ہے اور پھر اگلا دورہ شروع کرنے کی اجازت مانگتا ہے، جب اجازت مل جاتی ہے تو حسب دستور آگے چلتا ہے، اور صبح کو جانب مشرق سے طلوع ہو جاتا ہے۔ اس کا حاصل اس سے زائد نہیں کہ آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت عالم دنیا میں ایک نیا انقلاب آتا ہے، جس کا مدار آفتاب پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انقلابی وقت کو انسانی تنبیہ کے لئے موزوں سمجھ کر یہ تلقین فرمائی کہ آفتاب کو خود مختار اپنی قدرت سے چلنے والا نہ سمجھو، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت کے تابع چل رہا ہے۔ اس کا ہر طلوع و غروب اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوتا ہے، یہ اس کی اجازت کے تابع ہے، اس کے تابع فرمان حرکت کرنے ہی کو اس کا سجدہ قرار دیا گیا۔ کیونکہ سجدہ ہر چیز کا اس کے مناسب حال ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن نے خود تصریح فرمادی ہے کُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِحَسْبِ قَدَرٍ (تیسرے باب کی آیت ۱۷)۔ مگر ہر ایک کی عبارت و تسبیح کا طریقہ الگ الگ ہے، اور ہر مخلوق کو اس کی عبارت و تسبیح کا طریقہ سکھلا دیا جاتا ہے۔ جیسے انسان کو اس کی نماز و تسبیح کا طریقہ بتلا دیا گیا ہے، اس لئے آفتاب کے سجدہ کے یہ معنی سمجھنا کہ وہ انسان کے سجدہ کی طرح زمین پر ماتھا ٹیکنے ہی سے ہو گا صحیح نہیں۔

اور جبکہ قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق عرش خداوندی تمام آسمانوں، سیاروں، زمینوں پر محیط ہے، تو یہ ظاہر ہے کہ آفتاب ہر وقت ہر جگہ زیر عرش ہی ہے۔ اور جبکہ تجربہ شاہد ہے کہ آفتاب جس وقت ایک جگہ غروب ہو رہا ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع بھی ہو رہا ہوتا ہے، اس لئے اس کا ہر لمحہ طلوع و غروب سے خالی نہیں، تو آفتاب کا زیر عرش رہنا بھی دائمی ہر حال میں ہے، اور غروب و طلوع ہونا بھی ہر حال میں ہے۔ اس لئے حاصل مضمون حدیث کا یہ ہوا کہ آفتاب اپنے پورے دورے میں زیر عرش اللہ کے سامنے سجدہ ریز رہتا ہے، یعنی اس کی اجازت اور فرمان کے تابع حرکت کرتا ہے، اور یہ سلسلہ اسی طرح قیامت تک چلتا رہے گا، یہاں تک کہ قیامت کی باکھل قریبی علامت ظاہر کرنے کا وقت آجائے گا، تو آفتاب کو اپنے مدار پر اگلا دورہ شروع کرنے کے بجائے پیچھے لوٹ جانے کا حکم ہو جائیگا، اور وہ پھر مغرب کی طرف سے طلوع ہو جائے گا۔ اس وقت دروازہ توبہ کا بند ہو جائے گا، کسی کا ایمان و توبہ اس وقت مقبول نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ ہو کہ غروب آفتاب کی تخصیص اور اس کے بعد زیر عرش جانے اور وہاں سجدہ کرنے اور اگلے دورے کی اجازت مانگنے کے جو واقعات اس روایت میں بتلائے گئے ہیں پیغمبر ارشدؐ کو شریعت تعلیم کے مناسب بالکل عوامی نظر کے اعتبار سے ایک تمثیل ہو۔ نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ انسان کی طرح زمین پر سجدہ کرے، اور نہ سجدہ کرنے کے وقت آفتاب کی حرکت میں کچھ وقفہ ہونا لازم آتا ہے۔ اور نہ یہ مراد ہے کہ وہ دن رات میں صرف ایک ہی سجدہ کسی خاص جگہ جا کر کرتا ہے، اور نہ یہ کہ وہ صرف غروب کے بعد تحت العرش جاتا ہے۔ مگر اس انقلابی وقت میں جبکہ سب عوام یہ دیکھ رہے ہیں کہ آفتاب ہم سے غائب ہو رہا ہے اس وقت بطور تمثیل ان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ درحقیقت آفتاب کے زیر عرش تابع فرمان چلتے رہنے سے ہو رہا ہے، آفتاب خود کوئی قدرت و طاقت نہیں رکھتا، تو جس طرح اس وقت اہل مدینہ اپنی جگہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اب آفتاب سجدہ کر کے اگلے دورے کی اجازت لیگا اس طرح جہاں جہاں وہ غروب ہوتا جائے گا سب کے لئے ہی سبق حاصل کرنے کی تلقین ہوگی اور حقیقت معاملہ یہ نکلی کہ آفتاب اپنے مدار پر حرکت کے درمیان ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ بھی کرتا ہے اور آگے چلنے کی اجازت بھی مانگتا رہتا ہے، اور اس سجدہ اور اجازت کے لئے اس کو کسی سکون اور وقفہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس تقریر پر حدیث مذکورہ میں نہ مشاہدات کی رو سے کوئی شبہ ہوتا ہو نہ قواعد ہیئت و ریاضی کے اعتبار سے اور نظام شمسی اور حرکت سیارات میں بطلیموسی تحقیق صحیح ہو یا فیثاغورث والی تحقیق جو آجکل نئی تحقیقات سے مؤید ہو گئی ہے، دونوں صورتوں میں حدیث مذکورہ پر کوئی شبہ اور اشکال باقی نہیں رہتا۔

رہا یہ سوال کہ حدیث مذکور میں جو آفتاب کا سجدہ کرنا اور اگلے دورے کی اجازت طلب کرنا مذکور ہے، یہ کام تو حیات اور علم و عقل کا ہے، آفتاب و ماہتاب بے جان بے شعور مخلوقات ہیں، ان سے یہ افعال کیسے صادر ہوئے؟ تو اس کا جواب قرآن کی آیت **وَلَا يَسْبِقُ إِلَّا يَسْبِقُ بِحَدِيثِهِ** کے تحت میں آچکا ہے کہ ہم جن چیزوں کو بے جان اور بے عقل و بے شعور سمجھتے ہیں، وہ بھی درحقیقت رُوح اور جان اور عقل و شعور کا ایک خاص حصہ رکھتے ہیں۔ البتہ ان کی حیات اور عقل و شعور انسان و حیوان کے مقابلہ میں کم اور اتنی کم ہے کہ عام احساسات اس کا ادراک نہیں کر سکتے، مگر اس کی نفی پر بھی کوئی شرعی یا عقلی دلیل موجود نہیں اور قرآن کریم نے آیت مذکورہ میں ان کا ذی حیات اور ذی عقل و شعور ہونا ثابت کر دیا ہے، اور نئی تحقیقات نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم



فائدہ۔ قرآن وحدیث کی مذکورہ تصریحات سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوئی کہ شمس و قمر دونوں متحرک ہیں، ایک میعاد کے لئے چل رہے ہیں اس سے اس نئے نظریہ کی نفی ہوتی ہے جو آفتاب کی حرکت کو تسلیم نہیں کرتا، اور جدید ترین تحقیقات نے خود بھی اس کو غلط ثابت کر دیا۔  
وَالْقَمَرَ قَدْ رَزَاہُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ کَالْعُرْجُونِ الْقَدِیْمِ، عرجون، کھجور کے درخت کی خشک شاخ کو کہا جاتا ہے جو مڑ کر کمان جیسی ہو جاتی ہے۔

منازل قمر | مَنَازِل، منزل کی جمع ہے، جائے نزول کو منزل کہا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے چاند اور سورج دونوں کی رفتار کے لئے خاص حدود مقرر فرمائی ہیں جن

میں سے ہر ایک کو منزل کہا جاتا ہے۔ چاند چونکہ اپنا دورہ ایک مہینہ میں پورا کر لیتا ہے اس لئے اس کی منزلیں تیس یا اسی تیس ہوتی ہیں، مگر چونکہ ہر مہینہ میں چاند کم از کم ایک دن غائب رہتا ہے، اس لئے عموماً اس کی منزلیں اسی تیس کہی جاتی ہیں۔ اہل ہیئت و ریاضی نے ان منزلوں کے خاص نام اُن ستاروں کی مناسبت سے رکھ دیئے ہیں جو اُن منازل کی محاذات میں پائے جاتے ہیں۔ جاہلیت عرب میں بھی انہی ناموں سے منزلوں کی تعیین کی جاتی تھی۔ قرآن کریم ان اصطلاحی ناموں سے بالاتر ہے، اس کی مراد صرف وہ فاصلے ہیں جن کو چاند خاص خاص دنوں میں طو کرتا ہے۔ سورۃ یونس میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے، جو معارف القرآن جلد چہارم کے صفحہ ۵۰۵

۵۰۶ میں بیان ہوئی ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔ سورۃ یونس کی آیت میں شمس و قمر دونوں کی منزلوں کا ذکر ہے۔ جَعَلَ الشَّمْسُ صِنْفًا وَّ الْقَمَرُ نُورًا وَقَدْ رَزَاہُ مَنَازِلَ الَّیۡۃِ فَرَقَ اَتَنَاہِ کہ چاند کی منزلیں مشاہدہ سے پہچانی جاتی ہیں اور آفتاب کی منزلیں ریاضی کے حسابات سے۔  
حَتَّىٰ عَادَ کَالْعُرْجُونِ الْقَدِیْمِ میں چاند کی کیفیت آخر مہینہ کی بتلائی ہے جب وہ مکمل بد ہونے کے بعد گھٹا گھٹا ایک قوس کی صورت اختیار کر لیتا ہے، عربوں کے ماحول کے مناسب اس کی مثال کھجور کی خشک شاخ سے دی گئی ہے، جو ہلالی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

وَكُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ، یعنی آفتاب و ماہتاب دونوں اپنے اپنے مدار میں تیرتے رہتے ہیں۔ فلک کے لفظی معنی آسمان کے نہیں، بلکہ اس دائرہ کے ہیں جس میں کوئی سیارہ حرکت کرتا ہے۔ یہ آیت سورۃ انبیاء میں بھی گزر چکی ہے، جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ چاند کسی آسمان کے اندر مرکوز نہیں، جیسا کہ بطلموسی نظریہ ہیئت میں ہے، بلکہ وہ آسمان کے نیچے ایک خاص مدار میں حرکت کرتا ہے، اور آجکل کی نئی تحقیقات اور چاند تک انسان کی رسائی کے واقعات نے اس کو بالکل یقینی بنا دیا ہے۔

وَآیۡۃٌ لَّہُمْ اَنَّا حَمَلْنَاہُمْ فِی الْفَلَکِ الْمَشْجُونِ وَخَلَقْنَا لَہُمْ

مِنْ مِّثْلِهِ مَا يُرَكَّبُونَ ۵ پہلے زمینی مخلوقات کا پھر آسمانی کا بیان اور ان میں اللہ تعالیٰ شانہ کی حکمت و قدرت کے مظاہر کا بیان آچکا ہے۔ اس آیت میں بحر اور اس سے متعلقہ اشیاء میں مظاہر قدرت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کشتیوں کو خود وزنی بوجھ سے بھری ہوئی ہونے کے باوجود پانی کی سطح پر چلنے کے قابل بنادیا کہ پانی ان کو غرق کرنے کے بجائے دور ملکوں تک پہنچاتا ہے۔ اور آیت میں ارشاد یہ ہے کہ ہم نے ان کی ذریت کو کشتیوں میں سوار کیا، حالانکہ سوار ہونے والے خود یہ لوگ تھے۔ ذریت کا ذکر شاید اس لئے کیا کہ انسان کا بڑا بوجھ اس کی اولاد و ذریت ہوتی ہے، خصوصاً جبکہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ صرف یہی نہیں کہ تم خود ان کشتیوں میں سوار ہو سکو بلکہ چھوٹے بچے اور ضعیف آدمی اور ان کے سب سامان یہ کشتیاں اٹھاتی ہیں۔ اور خَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی سواری اور بار برداری کے لئے صرف کشتی ہی نہیں بلکہ کشتی کی مثل اور بھی سواری بنائی ہے۔ اس سے اہل عرب نے اپنی عادت کے مطابق اونٹ کی سواری مراد لی ہے، کیونکہ اونٹ بار برداری میں سب جانوروں سے زیادہ ہے، بڑے بڑے بوجھ کے ابار لے کر ملکوں کا سفر کرتا ہے، اسی لئے عرب اونٹ کو سفینۃ البر یعنی خشکی کی کشتی کہا کرتے تھے۔

قرآن میں ہوائی جہاز کا ذکر | مگر یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے اس جگہ اونٹ یا کسی خاص سواری کا نام نہیں لیا، بلکہ مبہم چھوڑا ہے، جس میں ہر ایسی سواری داخل ہے جو انسان اور اس کے اسباب و سامان کو زیادہ زیادہ اٹھا کر منزل مقصود پر پہنچا دے۔ اس زمانے کی نئی ایجاد و ہوائی جہازوں نے یہ واضح کر دیا کہ مِنْ مِّثْلِهِ کا سب سے بڑا مصداق ہوائی جہاز ہیں، اور کشتی کے ساتھ اس کی تمثیل بھی اس کی زیادہ مؤید ہے، کہ جس طرح پانی کا جہاز پانی پر تیرتا ہے پانی اس کو غرق نہیں کرتا، ہوائی جہاز ہوا پر تیرتا ہے ہوا اس کو نیچے نہیں گرائی، اور عجب نہیں کہ قرآن حکیم نے اسی لئے مِنْ مِّثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ کو مبہم رکھا ہو تا کہ قیامت تک ایجاد ہونے والی سب سواریاں اس میں شامل ہو جائیں۔ واللہ اعلم

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ

اور جب کہتے ان کو بچو اس سے جو تمہارے سامنے آتا ہو اور جو پیچھے چھوڑتے ہو شاید کہ تم پر

تُرْحَمُونَ ۴۵ وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا

رحم ہو۔ اور کوئی حکم نہیں پہنچتا ان کو اپنے رب کے حکموں سے جس کو



كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿۳۶﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ

وہ ٹلاتے نہ ہوں - اور جب کہتے ان کو خرچ کرو کچھ اللہ کا

اللَّهُ لَا قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تُطِيعُ مَنْ تَوَلَّيْنَا

دیا، کہتے ہیں منکر ایمان والوں کو ہم کیوں کھلائیں ایسوں کو کہ اللہ

اللَّهُ أَطَعَهُ تِلْكَ أَنْ تَمُوتُوا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿۳۷﴾

چاہتا تو اس کو کھلا دیتا، تم لوگ تو بالکل بہک رہی ہو صریح -

## خلاصہ تفسیر

اور جب ان لوگوں سے (دلائل توحید اور اس کے نہ ماننے پر عذاب کی وعید سنا کر) کہا جاتا ہے کہ تم لوگ اس عذاب سے ڈرو جو تمھارے سامنے (یعنی دنیا میں آسکتا) ہے (جیسے اوپر کی آیت) وَإِنْ تَشَاءْ نُخِصِرْ قَوْمٌ میں بیان فرمایا کہ کشتی کا صحیح سالم منزل پر پہنچانا اللہ کی قدرت و مشیت سے ہے، وہ چاہے تو غرق کر سکتا ہے۔ غرض دنیا میں غرق کا عذاب بھی آسکتا ہے اور دوسرے عذاب بھی، اور جو تمھارے (مرے) پیچھے (یعنی آخرت میں یقینی آنے والا) ہے، (مطلب یہ ہے کہ انکار توحید کی وجہ سے جو عذاب تم پر آنے والا ہے، خواہ صرف آخرت میں یا دنیا میں بھی، تم اس عذاب سے ڈرو اور ایمان لے آؤ) تاکہ تم پر رحمت کی جائے (تو وہ اس ترہیب اور عذاب سے ڈرانے کی ذرا پرواہ نہیں کرتے) اور (اسی بات کے نہ ماننے کی کیا تخصیص ہو وہ تو ایسے سنگدل ہو گئے ہیں کہ) ان کے رب کی آیتوں میں سے کوئی آیت بھی ان کے پاس ایسی نہیں آتی جس سے یہ سرتابی نہ کرتے ہوں اور جس طرح وعید عذاب سے وہ متاثر نہیں ہوتے اسی طرح ثواب اور جنت کی ترغیب بھی ان کو نافع نہیں ہوتی چنانچہ جب ان کو نعم الہیہ یاد دلا کر، اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں فقیروں مسکینوں پر) خرچ کرو تو (شرارت اور استہزاء کے طور پر) یہ کفار ان مسلمانوں سے (جنہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کہا تھا) یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے لوگوں کو کھانے کو دیں جن کو اگر خدا چاہے تو (بہت کچھ) کھانے کو دیدے، تم صریح غلطی میں (پڑے) ہو۔

## معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کے مظاہر قدرت و حکمت، زمین، آسمان وغیرہ میں بیان کر کے خدا شناسی اور توحید کی دعوت دی گئی تھی، اور اس کے قبول کرنے پر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کا وعدہ تھا، اور نہ ماننے پر عذاب شدید کی وعید۔ آیات مذکورہ اور ان کے بعد آنے والی آیات میں کفار اہل مکہ جو اس کے بلا واسطہ مخاطب تھے اُن کی کج روی کا بیان ہے، کہ نہ اُن پر ترغیبِ ثواب کا اثر ہوتا ہے، نہ ترہیبِ عذاب کا۔

اس سلسلے میں کفار کے ساتھ مسلمانوں کے دو مکالمے ذکر کئے گئے ہیں کہ جب مسلمان ان سے یہ کہتے ہیں کہ تم اللہ کے عذاب سے ڈرو جو تمہارے سامنے دنیا میں بھی آ سکتا ہے، اور تمہارے مرنے کے بعد آخرت میں تو آنا ہی ہے، اگر تم نے اس عذاب سے ڈر کر ایمان قبول کر لیا، تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ مگر یہ سن کر بھی اعراض کرتے ہیں۔ الفاظِ قرآن میں اس جگہ ان کے اعراض کا ذکر صراحتہً اس آیت میں نہیں کیا، کیونکہ اگلی آیت میں جو اعراض کا ذکر ہے اس سے خود بخود یہاں بھی اعراض کرنا ثابت ہو جاتا ہے۔ اور نحوی قاعدہ سے اِذَا قِيلَ لَهُمْ کی شرط کی جزاء اَعْرِضُوا محذوف ہے، جس کے محذوف ہونے پر اگلی آیت کے الفاظ شاہد ہیں، کہ اُن کے پاس اُن کے رب کی جو بھی آیت آتی ہے وہ اس سے اعراض ہی کرتے ہیں۔

اللہ کا رزق بعض کو | دوسرا مکالمہ یہ ہے کہ جب مسلمان کفار کو غریبوں فقیروں کی امداد کرنے بالواسطہ ملنے کی حکمت اور بھوکوں کو کھانا کھلانے کے لئے کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو تمہیں دیا ہے تم اس میں سے محتاجوں کو دیا کرو، تو یہ لوگ بطور استہزاء کے کہتے ہیں کہ جب تم یہ کہتے ہو کہ رازق سب مخلوق کا اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے ان کو نہیں دیا، تو ہم کیوں دیں تم جو ہمیں نصیحت کرتے ہو کہ ہم ان کو رزق دیا کریں یہ تو تمہاری گمراہی ہے کہ ہمیں رازق بنانا چاہتے ہو۔ یہ کفار بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کے رازق ہونے کا اقرار کرتے تھے جیسا کہ قرآن کریم میں ہُوَ الَّذِي سَأَلْتَهُمْ مَنْ ذَرَأَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْيَأَ بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لِيَقُولُوا لِلَّهِ عِزٌّ "یعنی اگر آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ آسمان سے پانی کس نے نازل کیا، جس سے زمین میں حیات نباتی پیدا ہوئی، اور طرح طرح کے پھل پھول نکلے، تو وہ اقرار کریں گے کہ یہ پانی اللہ ہی نے نازل کیا ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی رزاق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے، مگر مسلمانوں کے جواب میں بطور استہزاء کے یہ کہا کہ جب خدا تعالیٰ رازق ہے تو وہی غریبوں کو بھی دے گا



ہم کیوں دیں۔ گویا ان احمقوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور غریبوں کو دینے کو اللہ کی رزاقیت کے منافی سمجھا۔ اور یہ نہ سمجھا کہ رزاق مطلق کا قانون حکیمانہ یہ ہے کہ ایک انسان کو دے کر اس کو دوسروں کے لئے واسطہ بناتا ہے، اور بالواسطہ دوسروں کو دیتا ہے، اگرچہ وہ اس پر بھی یقیناً قادر ہے کہ سب کو خود ہی بلا واسطہ رزق پہنچا دے، جیسا کہ حیوانات میں عموماً اسی طرح ہر کڑے کھوڑے اور درندے پرندے کو بلا واسطہ رزق ملتا ہے۔ ان میں کوئی مالدار کوئی غریب نہیں، کوئی کسی کو نہیں دیتا سب کے سب قدرتی دسترخوان سے کھاتے ہیں۔ مگر انسانوں میں نظم معیشت اور باہمی تعاون و تناصر کی روح پیدا کرنے کے لئے رزق پہنچانے میں بعض کو بعض کے لئے واسطہ بناتا ہے تاکہ خرچ کرنے والے کو ثواب ملے اور جس کو دیا جائے وہ اس کا احسان مند ہو۔ کیونکہ انسانوں کا باہمی تعاون و تناصر جس پر سارا نظام عالم قائم ہے، یہ بھی باقی رہ سکتا ہے جبکہ ہر ایک کو دوسرے کی حاجت ہو، غریب کو مالدار کے پیسے کی حاجت ہے اور مالدار کو غریب کی محنت کی ضرورت، ان میں سے کوئی کسی سے بے نیاز نہیں۔ اور غور کریں تو کسی کا کسی پر احسان بھی نہیں ہر شخص جو کچھ کسی کو دیتا ہے وہ اپنے مطلب کے لئے دیتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ مسلمانوں نے کفار کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم کس بنا پر دیا جبکہ ان کا ایمان ہی اللہ پر نہیں اور بتصریح فقہاء وہ احکام فرعیہ کے مخاطب بھی نہیں۔ سو اس کا جواب واضح ہے کہ مسلمانوں کا یہ کہنا کسی شرعی حکم کی تعمیل کرانے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ انسانی بہمدردی اور شرافت کے مردِ سچہ اصول کی بناء پر تھا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٨﴾ مَا يَنْظُرُونَ

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو۔ یہ تو راہ دیکھتے ہیں

إِلَّا صَبَاحَةٌ وَآحِدَةٌ تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ ﴿٣٩﴾ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ

ایک چنگھاڑ کی جو اُن کو آپکڑے گی جب آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے، پھر نہ کر سکیں گے

تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤٠﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُمْ

کہ کچھ کہہ ہی میں اور نہ اپنے گھر کو پھر کر جاسکیں گے۔ اور پھونکی جائے۔ صور پھر تب ہی وہ

مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ ﴿٤١﴾ قَالُوا لَوْلَا نَأْمُنَ بِعَثْنَا

قبروں سے اپنے رب کی طرف پھیل پڑیں گے۔ کہیں گے اور خرابی ہماری کس نے اٹھا دیا

وقف غفران

مِنْ مَّرْقَدٍ نَامَ هَذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۲﴾

ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے یہ وہی جو وعدہ کیا تھا رحمن نے اور سچ کہا تھا پیغمبروں نے

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صِيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿۵۳﴾

بس ایک چنگھاڑ ہوگی پھر اسی دم وہ سارے ہمارے پاس پکڑے چلے آئیں۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۵۴﴾

پھر آج کے دن ظلم نہ ہوگا کسی جی پر ذرا اور وہی بدلہ پاؤ گے جو کرتے تھے۔

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغْلٍ فَاكِهُونَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ

تحقیق بہشت کے لوگ آج ایک مشغلہ میں ہیں باتیں کرتے، وہ اور ان کی عورتیں

فِي ظِلٍّ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَكِعُونَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مِمَّا

سایوں میں تختوں پر بیٹھے ہیں تکیہ لگائے۔ ان کے لئے وہاں ہر میوہ اور ان کے لئے

يَدَّعُونَ ﴿۵۷﴾ سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبِّ رَحِيمٍ ﴿۵۸﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ

ہر جو کچھ مانگیں۔ سلام بولنا ہے رب ہر بان سے، اور تم الگ ہو جاؤ آج

أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿۵۹﴾ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَبْنَىٰ آدَمَ أَنْ لَا

اے گنہگارو۔ میں نے نہ کہہ رکھا تھا تم کو اے آدم کی اولاد کہ

تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۶۰﴾ وَأَنْ أَعْبُدُونِي قُلْ

نہ پوجیو شیطان کو وہ کھلا دشمن ہے تمہارا۔ اور یہ کہ پوجو مجھ کو،

هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا أَفَلَمْ

یہ راہ ہے سیدھی۔ اور وہ بہکائے گیا تم میں سے بہت خلقت کو، پھر کیا

تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴿۶۲﴾ هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۶۳﴾

تم کو سمجھ نہ تھی۔ یہ دوزخ ہے جس کا تم کو وعدہ تھا۔

إِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۶۴﴾ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ

جاڑو اس میں آج کے دن بدلہ اپنے کفر کا۔ آج ہم ہر لگادیں گے اُن کے

وقف غفران



أَفَوَاهِهِمْ وَتَكَلَّمْنَا بِأَيْدِيهِمْ وَتَشْرَهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٦٥﴾

منہ پر اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور بتلائیں گے اُن کے پاؤں جو کچھ وہ کماتے تھے۔

وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَى أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَأَنَّى

اور اگر ہم چاہیں مٹادیں ان کی آنکھیں پھر دوڑیں رستہ پانے کو پھر کہاں سے

يَبْصِرُونَ ﴿٦٦﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَمَمَسْنَاهُمْ عَلَى مَكَانَتِهِمْ فَمَا

سوچے۔ اور اگر ہم چاہیں صورت مٹخ کر دیں ان کی جہاں کی تہاں پھر نہ آگے

اسْتَطَاعُوا مُضِيًّا وَلَا يَرْجِعُونَ ﴿٦٧﴾ وَمَنْ نَعْبُدُهُ نُنِكِّسُهُ

جل سکیں اور نہ وہ اُلٹے پھر سکیں۔ اور جس کو ہم بڑھا کریں اونڈھا کریں

فِي الْخَلْقِ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٨﴾

اس کی پیدائش میں پھر کیا ان کو سمجھ نہیں۔

## خُلاصۂ تفسیر

اور یہ (کافر) لوگ (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین سے بطور انکار) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ (قیامت کا جو اوپر آیت میں مذکور ہے اور ویسے بھی اکثر اس کی خبر دیا کرتے ہو وہ) کب ہوگا اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو تو بتلاؤ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ جو بار بار پوچھ رہے ہیں تو گویا یہ لوگ بس ایک آواز سخت (یعنی نفخہ اولیٰ) کے منتظر ہیں جو اُن کو (یعنی مطلق کفار کو) آپکڑے گی اور وہ سب (اُس وقت) باہم (عام معمول کے مطابق اپنے معاملات میں) لڑ جھگڑ رہے ہوں گے سو اس آواز کے ساتھ معاً اس طرح فنا ہو جائیں گے کہ نہ تو وصیت کرنے کی فرصت ہوگی، اور نہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر جاسکیں گے (بلکہ جو جس حال میں ہوگا مر کر رہ جائے گا) اور (پھر دوبارہ) صُور پھونکا جائے گا تو وہ سب یکایک قبروں سے (نکل نکل کر) اپنے رب کی طرف (یعنی جہاں حساب ہوگا) جلدی جلدی چلنے لگیں گے (اور وہاں کی ہول و ہیبت دیکھ کر) کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی ہم کو ہماری قبروں سے کس نے اٹھا دیا، (کہ یہاں کی نسبت سے تو وہاں ہی راحت میں تھے، فرشتے جواب دیں گے کہ) یہ وہی (قیامت) ہے جس کا رحمان نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبر سچ کہتے تھے (مگر تم نے نہ مانا تھا، آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) وہ (نفخہ ثانیہ صُور کا) بس ایک زور کی آواز ہوگی (جیسے نفخہ اولیٰ بھی صیحہ واحدہ تھا، لہذا قال تعالیٰ

مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً، اسی طرح یہ بھی ایک آواز ہوگی جس سے یکایک سب جمع ہو کر ہمارے پاس حاضر کر دیئے جائیں گے۔ پہلے موقف کی طرف چلنا مذکور تھا اور یہاں پہنچ جانا اور یہ چلنا اور پہنچنا جبراً و قہراً ہوگا۔ قرآن کریم کے الفاظ مُحْضَرُونَ اور جَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مِّنْهَا سَابِقٌ سے معلوم ہوتا ہے، پھر اُس دن کسی شخص پر ذرا ظلم نہ ہوگا اور تم کو بس انہی کاموں کا بدلہ ملے گا جو تم (دنیا میں کفر وغیرہ) کیا کرتے تھے (یہ تو اہل جہنم کا حال ہوا اور) اہل جنت کا حال یہ ہے کہ وہ) بیشک اس روز اپنے مشغلوں میں خوش دل ہوں گے وہ اور ان کی بیبیاں سایوں میں مسہریوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے (اور) ان کے لئے وہاں (ہر طرح کے) میوے ہوں گے اور جو کچھ مانگیں گے ان کو ملے گا (اور) ان کو پروردگار مہربان کی طرف سے سلام فرمایا جائے گا (یعنی حق تعالیٰ فرمائیں گے، اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ، رواہ ابن ماجہ) اور آگے پھر تہہ ہے قصۃ اصحاب جہنم کا کہ ان کو موقف میں حکم ہوگا کہ اے (کفر کے ارتکاب کرنے والے) حجرِ مِوَاج (اہل ایمان سے) الگ ہو جاؤ (کیونکہ اُن کو جنت میں بھیجنا ہے اور تم کو دوزخ میں اور اُس وقت اُن سے ملامت کے طور پر یہ فرمایا جائے گا کہ) اے اولادِ آدم (اور اسی طرح جنت سے بھی خطاب ہوگا، دَلَّ عَلَيْهِ قَوْلُهُ تَعَالَى نِمَحْشَرُ الْجَنَّةَ وَالْإِنْسِ الْخِ) کیا میں نے تم کو تاکید نہیں کر دی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا صریح دشمن ہے اور یہ کہ میری (ہی) عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے (مراد عبادت سے اطاعت مطلقہ ہے و ہذا کقولہ تعالیٰ لَا تَشْبَعُوا خُطُوبَاتِ الشَّيْطَانِ وَلَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ) اور (نیز تم کو شیطان کی نسبت یہ بات بھی معلوم کرانی تھی کہ) وہ تم میں (یعنی تمہاری بنی نوع میں) ایک کثیر مخلوق کو گمراہ کر چکا ہے جن کی گمراہی کا وبال بھی پھیلی کا فرقہوں کے واقعات عذاب کے سلسلے میں بتلا دیا گیا تھا) سو کیا تم (اتنا) نہیں سمجھتے تھے کہ اگر ہم اس کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہو جاویں گے تو ہم بھی اسی طرح مستحق عذاب ہوں گے (واب) یہ جہنم ہے جس کا تم سے (کفر کی تقدیر پر) وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔ آج اپنے کفر کے بدلے اس میں داخل ہو آج ہم اُن کے مومنوں پر مہر لگا دیں گے (جس سے یہ جھوٹے عذر پیش نہ کر سکیں، جیسا شروع شروع میں کہیں گے وَاللَّهِ رَبَّنَا مَا كُنَّا مَشْرِكِينَ) اور ان کے ہاتھ ہم سے کھلام کریں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ یہ لوگ کیا کرتے تھے، (یہ عذاب تو آخرت میں ہوگا) اور اگر ہم چاہتے تو دنیا ہی میں ان کے کفر کی سزائیں، ان کی آنکھوں کو ملیا میٹ کر دیتے (خواہ آنکھ کی بنیائی کو یا خود آنکھ کے عضو ہی کو) پھر یہ راستے کی طرف (چلنے کے لئے) دوڑتے پھرتے سو اُن کو کہاں نظر آتا (جیسا قومِ لوط پر ایسا ہی عذاب آیا تھا، کَمَا قَالَ تَعَالَى فَطَمْنَا) اور اس سے بڑھ کر، اگر ہم چاہتے تو ان کی سزائے کفر میں



ان کی صورتیں بدل ڈالتے، (جیسے پہلے بعض لوگ بندرا درخت زیر ہو گئے) اس حالت سے کہ یہ چھل  
ہیں وہیں رہ جاتے (یعنی مسخ کے ساتھ یہ بھی ہوتا کہ ان کو جانور بنا دیتے اور جانور بھی اپنا جج جو اپنی  
جگہ سے نہ ہل سکیں) جس سے یہ لوگ نہ آگے کو چل سکتے ہیں اور نہ پیچھے کو لوٹ سکتے ہیں اور اس کا  
کچھ تعجب نہ کرنا چاہئے کہ آنکھوں کا طمس اور صورتوں کا مسخ کیسے ہو جاتا ہے دیکھو اس کی ایک نظیر  
ہماری قدرت شاہد ہے کہ ہم جس کی زیادہ عمر کر دیتے ہیں (یعنی بہت بوڑھا کر دیتے ہیں) تو اس  
کو طبعی حالت میں الٹا کر دیتے ہیں (طبعی حالت سے مراد عقل و شعور اور سننے دیکھنے وغیرہ کی  
قوتیں اور قوت ہاضمہ، نامیہ، وغیرہ اور رنگ و ردغن و حسن و جمال ہیں) اور اُلٹا کرنے سے مراد  
ہے ان کا انقلاب اور تغیر حالات اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف (اچھے سے بُرے کی طرف) پس طمس و  
مسخ بھی ایک قسم کا تغیر ہے کامل سے ناقص کی طرف) سو کیا (اس حالت کو دیکھ کر بھی) وہ لوگ  
نہیں سمجھتے کہ جب ایک تغیر پر قدرت ہے تو دوسری پر بھی ہے، بلکہ قدرت کی نسبت تو جمیع  
ممکنات کے ساتھ مساوی ہے گو ان میں تناظر و تماثل بھی نہ ہو سو ان لوگوں کو اس پر نظر کر کے  
ڈرنا اور کفر کو ترک کر دینا چاہئے)

## معارف و مسائل

مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً، یہ اُن کفار کا جواب ہے جو استہزاء و انکار کے  
طور پر مسلمانوں سے پوچھا کرتے تھے کہ تم جس قیامت کے آنے کے قائل ہو وہ کب کہیں سال اور  
کس تاریخ میں آئیگی۔ يَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ، ان لوگوں کا یہ سوال درحقیقت کسی تحقیق  
واقعہ کے لئے نہیں بلکہ بطور تمسخر و استہزاء کے تھا اور بالفرض تحقیق کے لئے بھی ہوتا تو رب العلیں  
کی حکمت کا مقتضی یہ ہے کہ قیامت کے سال اور تاریخ کا پورا یقینی علم کسی کو نہ دیں، یہاں تک کہ اپنے  
انبیاء و رسل کو بھی نہیں دیا۔ ان احمقوں کا یہ سوال بالفرض تحقیق طلبی ہی کے لئے ہوتا  
بھی لغو و مہمل تھا۔ اس لئے اس کے جواب میں قیامت کی تاریخ بتانے کے بجائے ان لوگوں  
کو اس پر تنبیہ فرمائی کہ جو چیز یقینی طور پر آنے والی ہے عقلمند کا کام یہ ہے کہ اس کی تیاری میں  
لگے، نہ یہ کہ اس کے وقت اور تاریخ کی تحقیق میں وقت ضائع کرے۔ مقتضی عقل کا یہ تھا کہ  
قیامت کی خبر سن کر ایمان لاتے اور وہ کام کرتے جس سے اُس عالم میں فلاح حاصل ہو، مگر  
یہ لوگ اپنی غفلت میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں گویا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ جب قیامت آئے  
تو کچھ سوچیں۔ اس لئے فرمایا کہ یہ قیامت کے منتظر ہیں۔ اور قیامت کا حال یہ ہوگا کہ وہ ایک  
ہی زور کی آواز صور کی ہوگی جو سب کو اچانک اس طرح پکڑے گی کہ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں

اور باہمی معاملات کے جھگڑوں میں لگے ہوئے ہوں گے سب کے سب اسی حال میں مگر رہ جائیں گے حدیث میں ہے کہ دو آدمی ایک کپڑے کی خرید و فروخت میں لگے ہوئے ہوں گے، کپڑا پھیلا یا ہوا ہوگا، کہ اچانک قیامت آجائے گی، اور وہ کپڑا لٹے نہ کر پائیں گے، کوئی آدمی اپنے حوض کو مٹی سے لپ کر درست کر رہا ہوگا، کہ اسی حال میں مر رہ جائے گا (رواہ ابو نعیم عن ابی ہریرۃ قرطبی)

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ۝ یعنی اس وقت جو لوگ مجتمع ہوں گے وہ آپس میں کسی کو کسی کام کی وصیت کرنے کی ہمت نہیں پائیں گے اور جو گھروں سے باہر ہوں گے وہ اپنے گھروں میں واپس آنے کی بھی ہمت نہیں پائیں گے، اسی جگہ مرے کے مرے رہ جائیں گے۔ یہ بیان قیامت کے لفظ اولیٰ کا ہے، جس سے سارا عالم زمین و آسمان تباہ ہو جائیگا اس کے بعد فرمایا: ۝ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا أَهْمَمُ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ، اجدات جدت کی جمع ہے بمعنی قبر اور نسلون نسلان سے مشتق ہے جس کے معنی تیز چلنے کے ہیں، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں یَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَّاعًا، آیا ہے کہ یہ لوگ اپنی قبروں سے جلدی کرتے ہوئے نکلیں گے۔ اور ایک آیت میں جو ارشاد ہے فَإِذَا أَهْمُ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ ۝ یعنی حشر کے وقت لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر کھڑے دیکھتے رہیں گے، یہ اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ ابتداء حیرت سے کھڑے ہو کر دیکھنے کا واقعہ ہو اور بعد میں تیزی سے محشر کی طرف دوڑنا، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اور جیسا کہ آیات قرآن سے ثابت ہے کہ فرشتے ان سب کو پکار کر میدان حشر میں لائیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی حاضری محشر اپنی خوشی سے نہیں بلکہ جبری طور پر ہوگی اور فرشتوں کے پکارنے کی وجہ سے دوڑتے ہوئے محشر میں آجائیں گے۔

قَالُوا يَا وَيْلَتَنَا مَنِ الْبَغِيءُ ۝ کفار اگرچہ قبروں میں بھی عذاب قبر میں مبتلا تھے، وہاں کچھ آرام نہ تھا، مگر قیامت کے عذاب کے مقابلہ میں وہ پہلا عذاب کا عدم معلوم ہوگا اس لئے پکاریں گے کہ ہمیں کس نے قبروں سے نکال لیا، وہیں رہتے تو اچھا ہوتا۔ اس پر فرشتے یا عام مومنین جواب دیں گے:-

هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ۝ یعنی یہ وہی قیامت ہے جس کا رحمن نے وعدہ کیا تھا، اور اس کے رسولوں نے اس کی سچی خبر تم کو سنائی تھی، تم نے توجہ نہ دی۔ اس مقام پر اللہ کی صفات میں سے لفظ رحمن اختیار کرنے میں اشارہ ہے کہ اس نے تو اپنی رحمت سے تمہارے لئے اس عذاب سے بچنے کے بہت سامان کئے تھے، اور قبل از وقت اس کا



دعہ اور اپنی کتابوں اور انبیاء کے ذریعہ اس کی خبر تم تک پہنچانا بھی صفت رحمت ہی کا اقتضا تھا،  
 إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغْلٍ ذَاكِرُونَ ۝ اصحاب جہنم کی پریشانیوں کا ذکر کرنے  
 کے بعد قیامت میں اصحاب جنت کا حال ذکر فرمایا کہ وہ اپنی تفریحات میں مشغول ہونگے۔ فَاكِرُونَ، فاکرہ کی  
 جمع ہے، خوش دل خوش حال کو کہا جاتا ہے، اور اس سے پہلے فِي شُغْلٍ کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے  
 کہ وہ اصحاب جہنم کو پیش آنے والی پریشانیوں سے بالکل بے غم ہوں گے۔ (کمالہ بعض المفسرین)  
 اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ یہ لفظ فِي شُغْلٍ اس خیال کے دفع کرنے کے لئے بڑھایا ہو  
 کہ جنت میں جبکہ نہ کوئی عبادت ہوگی نہ کوئی قرض و واجب اور نہ کسب معاش کا کوئی کام ہو کیا اس  
 بیکاری میں آدمی کا جی نہ گھبرائے گا؟ اس لئے فرمایا کہ ان کو اپنی تفریحات ہی کا بڑا شغل ہوگا، جی گھبرانے  
 کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

هُنَّ وَأَزْوَاجُهُمْ ۝ اَزْوَاج میں جنت کی عورتیں بھی داخل ہیں اور دنیا کی بیبیاں بھی۔  
 وَلَهُنَّ مَا يَدَّعُونَ ۝ يَدَّعُونَ دعوت سے مشتق ہے، جس کے معنی بلانے کے ہیں۔ یعنی اہل  
 جنت جس چیز کو بلا دیں گے وہ ان کو مل جائے گی۔ قرآن کریم نے اس جگہ يَسْأَلُونَ کا لفظ نہیں  
 فرمایا، کیونکہ کسی چیز کا سوال کر کے حاصل کرنا بھی ایک محنت مشقت ہے، جس سے جنت پاک ہی  
 بلکہ وہاں ہر ضرورت کی چیز حاضر و موجود ہوگی۔

وَأَمَّا تِلْكَ الْأَمْثَلُ الْمُجْرِمُونَ ۝ میدانِ حشر میں اذل جب لوگ اپنی قبروں کے  
 اٹھیں گے تو سب گڈ گڈ منتشر ہوں گے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا اَتَتْهُمْ جَزَاءُ مَنَاسِكِهِمْ ۝ یعنی  
 وہ منتشر ٹڈیوں کے ڈل کی طرح ہوں گے۔ مگر بعد میں ان کے گروہ گروہ اپنے اعمال کے اعتبار سے  
 الگ کر دیئے جائیں گے، کفار ایک جگہ، مؤمن دوسری جگہ، فجار فساق الگ، صلحاء اور معتبول  
 بندے الگ۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۝ یعنی جبکہ نفوس جوڑ جوڑ کر دی  
 جائیں گے۔ آیت مذکورہ میں بھی اسی امتیاز کا بیان ہے۔

أَلَمْ آغْضًا إِلَيْكُمْ يٰبَنِي آدَمَ ۝ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۝ یعنی تمام بنی آدم کو  
 (بلکہ جنات کو بھی) مخاطب کر کے قیامت میں کہا جائے گا کہ کیا میں نے دنیا میں تم کو یہ ہدایت  
 نہ کی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا۔ یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ کفار عموماً شیطان کی تو عبادت  
 نہ کرتے بنوں کو یا دوسری چیزوں کو پوجتے تھے، اس لئے اُن پر عبادتِ شیطان کا الزام کیسے عائد  
 ہوا؟ جواب یہ ہے کہ کسی کی اطاعت مطلقہ کرنا کہ ہر کام ہر حال میں اس کا کہنا مانے اسی کا نام عبادت  
 ہے چونکہ ان لوگوں نے ہمیشہ شیطانی تعلیم ہی کی پیروی کی، اس لئے ان کو عابدِ شیطان کہا گیا۔ جیسا  
 کہ حدیث میں اس شخص کو جو مال یا بیوی کی محبت میں آکر ہر وہ کام کرنے لگے جس سے مال بڑھے

یا بی بی راضی ہو اگرچہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہو ایسے شخص کو حدیث میں عید الدرم اور عبد الزوجہ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بعض صوفیائے کرام کے کلمات میں جو اپنے نفس کے لئے بت پرستی کے الفاظ آئے ہیں، اس سے مراد نفس کی خواہشات کا اتباع کرنا ہے، کفر و شرک مراد نہیں۔ جیسا کہ بعض نے فرمایا  
 مودہ گشت از سجدہ راہ بیتاں پیشانیم  
 چند برخود تہمت دین مسلمانانیم

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰٓ اَفْوَاهِهِمْ، محشر میں حساب کتاب کے لئے پیشی میں اول تو ہر شخص کو آزادی ہوگی جو چاہے عذر پیش کرے، مگر مشرکین وہاں قہیں کھا کر اپنے شرک و کفر سے منکر جائیں گے وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ۔

اور بعض یہ بھی کہیں گے کہ فرشتوں نے ہمارے نامہ اعمال میں جو کچھ لکھ دیا ہے ہم تو اس سے بری ہیں اس وقت اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے کہ بول نہ سکیں، اور ان کے مقابلہ میں خود راہنی کے ہاتھ پاؤں اور اعضاء کو سرکاری گواہ بنا کر ان کو بولنے کی صلاحیت دیدیگی وہ ان کے تمام اعمال کی گواہی دیں گے۔ آیت مذکورہ میں تو ہاتھ پاؤں کا بولنا ذکر کیا گیا ہے دوسری آیت میں انسان کے کان، آنکھ، اور کھال کا بولنا مذکور ہے، شَہِدَ عَلَیْہِمْ سَمْعُہُمْ وَاَبْصَارُہُمْ وَجُلُودُہُمْ، اور ایک جگہ جَوَّشَہُمْ عَلَیْہِمْ اَلْسِنَتُہُمْ آیا ہے، یعنی خود ان کی زبانیں گواہی دیں گی۔ یہ اس کے منافی نہیں کہ ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی، کیونکہ مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار سے کچھ نہ بول سکیں گے، اُن کی زبان ان کی مرضی کے خلاف چلے گی، اور شہادت دے گی۔

رہا یہ اشکال کہ ان اعضاء میں گویائی کیسے پیدا ہوگی تو اس کا جواب خود قرآن نے دیدیا، اَنْطَقْنَا اللّٰہُ الَّذِیْ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ، یعنی یہ اعضاء کہیں گے جس اللہ نے ہر گویائی دالے کو گویا کیا ہے، اس نے ہمیں بھی گویائی دیدی۔

وَمَنْ نُّعِثِرْہُمْ نُنْکِسْہُمْ فِی الْخَلْقِ اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ، نُعِثِرْ، تعمیر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں عمر دراز دینے کے، اور نُنْکِسْہُمْ، تنکیس سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں آوندھا اُلٹا کر دینے کے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے ایک اور منظر کا بیان فرمایا ہے کہ ہر انسان و حیوان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے زیر تصرف ہی، قدرت کا عمل اس میں مسلسل جاری ہے، ایک گندے اور بے جان قطرہ سے اس کا وجود شروع ہوا، بطن مادر کی تین اندھیریوں میں اس خلاصہ کائنات اور عالم اصغر کی تخلیق ہوئی، کیسی کیسی نازک



مشینیں اس کے وجود میں پیوست کی گئیں پھر روح ڈال کر زندہ کیا گیا، نوہینے بطن مادر کے اندر اس کی تربیت اور نشوونما ہو کر ایک مکمل انسان بنا اور اس دنیا میں آیا۔ تو مکمل ہونے کے باوجود اس کی ہر چیز ضعیف و کمزور ہے۔ قدرت نے اس کے مزاج کے مناسب غذا مائیں کی چھاتیوں میں پیدا کر دی جس سے اس کو تدریجی توانائی ملی، اور اس وقت سے جوانی تک کتنے مراحل سے گذر کر اس کے سب قوی مضبوط ہوئے، قوت و شوکت کے دعوے ہونے لگے، ہر مقابل کو شکست دینے کے حوصلے پیدا ہوئے۔

پھر جب خالق و مالک کو منظور ہوا تو اب ان سب طاقتوں قوتوں میں کمی شروع ہوئی، کمی بھی بے شمار مراحل سے گذرتے ہوئے بالآخر بڑھاپے کی آخری عمر تک پہنچی۔ جہاں پہنچ کر غور کیا جائے تو پھر وہ اس منزل میں پہنچ گیا جس سے بچپن میں گذرا تھا۔ ساری عادتیں خصلتیں بدلنے لگیں، جو چیزیں سب سے زیادہ محبوب تھیں وہ مبغوض نظر آنے لگیں، جن سے راحت ملتی تھی اب وہ موجب کلفت بن گئی ہیں۔ اسی کو قرآن کریم نے تنکيس یعنی اوندھا کر دینے سے تعبیر فرمایا ہے، ونعم قال ۵

مَنْ عَاشَ اخْلَقَ الْاَيَّامَ حَذَّاتِهِ ۖ وَخَانَهُ ثِقَاتُهُ السَّمْعُ وَالْبَصَرُ  
یعنی جو شخص زندہ رہوگا تو زمانہ اس کی حدت و شدت کو بوسیدہ اور پُرانا کر دے گا،  
اور اس کے سب بڑے دو ثقہ دوست یعنی شنوائی اور بینائی کی طاقتیں بھی اس سے  
خیانت کر کے الگ ہو جائیں گی ۵

یعنی انسان کو دنیا میں سب سے زیادہ اعتماد اپنی آنکھ سے دیکھی یا کان سے سنی ہوئی چیز پر ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی آخر عمر میں یہ بھی قابل اعتماد نہیں، گراں گوشتی کے سبب بات پوری سمجھنا مشکل، ضعف بینائی کے سبب صحیح صحیح دیکھنا مشکل۔ منتہی نے اسی مضمون کو کہا ہے ۵  
وَمَنْ صَحَّبَ الدُّنْيَا طَوِيلًا تَغْلِبَتْ ۖ عَلَىٰ عَيْنِهِ حِشْيٌ يَرَىٰ صَدَقَهَا كَذِبًا  
یعنی جو شخص دنیا میں زیادہ زندہ رہوگا دنیا اس کی آنکھوں کے سامنے ہی پلٹ جائیگی  
یہاں تک کہ جس چیز کو پہلے سچ جانتا تھا وہ بھوٹ معلوم ہونے لگے گی ۵

انسان کے وجود میں یہ انقلابات قدرت حق تعالیٰ شانہ کا عجیب و غریب منظر تو ہے ہی،  
اس میں انسان پر ایک عظیم احسان بھی ہے کہ خالق کائنات نے جتنی طاقتیں انسان کے وجود  
میں ودیعت فرمائی ہیں، وہ درحقیقت سرکاری مشینیں ہیں، جو اس کو دیدی گئی ہیں، اور یہ  
بھی بتلادیا گیا ہے کہ یہ تیری ملک نہیں اور دائمی بھی نہیں، بالآخر تجھ سے واپس لی جائیں گی۔  
اس کا تقاضا ظاہری یہ تھا کہ جب وقت مقدر آجاتا سب طاقتیں بیک وقت واپس لی جائیں

مگر مولائے کریم نے ان کی واپسی کی بھی بڑی طویل قسطیں کر دی ہیں اور تدریجی طور پر واپس لیا ہے تاکہ انسان متنبہ ہو کر سفر آخرت کا سامان کرے۔ واللہ اعلم

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ

اور ہم نے نہیں سکھایا اس کو شعر کہنا اور یہ اس کے لائق نہیں یہ تو خاص نصیحت ہی اور قرآن ہی

مُبِينٌ ۞ لِّسِنْدٍ رَمَنٍ كَانَ حَيًّا وَيَحِقُّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ۞

صاف۔ تاکہ ڈر سنائے اس کو جس میں جان ہو اور ثابت ہو الزام منکروں پر۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ آيِدِينَا أُنْعَامًا فَهُمْ

کیا اور نہیں دیکھتے وہ کہ ہم نے بنادیئے ان کے واسطے اپنی ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے چوپائے

لَهُمَا مَلِكُونٌ ۞ وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ ۞

پھر وہ ان کے مالک ہیں۔ اور عاجز کر دیا انکو ان کے آگے پھر انہیں کوئی ہوائی سواری اور کسی کو کھاتے ہیں۔

وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ۞ وَاتَّخَذُوا

اور ان کے واسطے چارپایوں میں فائدہ ہیں اور پینے کے گھاٹ پھر کیوں شکر نہیں کرتے۔ اور پکڑتے ہیں

مِنْ دُونِ اللَّهِ إِلَهَةً لَّعَلَّهُمْ يَنْصَرُونَ ۞ لَا يَسْتَطِيعُونَ

اللہ کے سوائے اور حاکم کہ شاید ان کی مدد کریں۔ نہ کر سکیں گے

نَصْرَهُمْ ۞ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُونَ ۞

ان کی مدد اور یہ اُن کی فوج ہو کر پھرے آئیں گے۔

## خلاصہ تفسیر

اور یہ کفار جو نبوت کی نفی کرنے کے لئے آپ کو شاعر کہتے ہیں یہ محض باطل ہے کیونکہ

ہم نے آپ کو شاعری (یعنی خیالی مضامین مرتب کرنے کا) کا علم نہیں دیا اور وہ (شاعری)

آپ کے شایانِ شان بھی نہیں وہ (یعنی آپ کو عطا کیا ہوا علم جس کو یہ لوگ شاعری کہتے ہیں)

تو محض نصیحت (کا مضمون) اور ایک آسمانی کتاب ہے جو احکام کی ظاہر کرنے والی ہے تاکہ (بیان

احکام کے اثر سے) ایسے شخص کو (نافع ڈرانا) ڈرا دے جو (حیاتِ قلبیہ کے اعتبار سے) زندہ ہو



اور تاکہ کافروں پر (عذاب کی) حجت ثابت ہو جاوے۔ کیا ان (مشرک) لوگوں نے اس پر نظر نہیں کیا کہ ہم نے ان کے (نفع کے) لئے اپنے ہاتھ کی ساختہ چیزوں میں سے مویشی پیدا کئے اور (ہمارے مالک بنانے سے) یہ لوگ ان کے مالک بن رہے ہیں اور آگے اس نفع کی کچھ تفصیل ہے کہ ہم نے ان مویشی کو ان کا تالچ بنا دیا سو وہ ان کے کام میں لانے سے کام دیتے ہیں چنانچہ ان میں بعض تو ان کی سواریاں ہیں اور بعض کو وہ کھاتے ہیں اور ان میں ان لوگوں کے لئے اور بھی نفع ہیں جیسے بال، کھال، ہڈی وغیرہ مختلف طریقوں سے استعمال میں آتے ہیں، اور ان میں ان لوگوں کے (پینے کی چیزیں بھی ہیں یعنی دودھ) سو کیا اس پر بھی یہ لوگ شکر نہیں کرتے (اور شکر کا سب سے مقدم اور اہم درجہ توحید پر ایمان ہے) اور انھوں نے (بجائے شکر اور توحید کے کفر اور شرک اختیار کر رکھا ہے چنانچہ) خدا کے سوا اور معبود قرار دے رکھے ہیں اس امید پر کہ ان کو (ان معبودین کی طرف سے) مدد ملے (لیکن) وہ ان کی کچھ مدد کر ہی نہیں سکتے اور (مدد تو کیا کرتے اور اُٹے) وہ (معبودین) ان لوگوں کے حق میں ایک فریق (مخالفت) ہو جاویں گے جو (موقف حساب میں بالاطلاق) حاضر کئے جائیں گے (اور وہاں حاضر ہو کر ان کی مخالفت کا اظہار کریں گے کما قال تعالیٰ فی سورۃ مریم وَ یَکُونُونَ عَلَیْہُمْ ضِدًّا وَقَالَ تَعَالٰی فِی سُوْرَةِ یُوْنُسَ قَالَ مُرَّاۗؤُھُمْ مَّا کُنْتُمْ اِیَّآنَا تَعْبُدُوْنَ وَ غَیْرُ ذٰلِکَ مِنْ اٰلٰتِہِ)۔

## معارف مسائل

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَہٗ، چونکہ منکرین نبوت و رسالت قرآن کی تاثیرات عجیبہ اور دلوں پر اثر انداز ہونے کی کیفیت جو عام مشاہدہ میں تھی — انکار نہیں کر سکتے تھے، اس لئے کبھی تو اس کلام الہی کو سحر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر کہتے تھے اور کبھی اس کلام کو شعر اور آپ کو شاعر کہہ کر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ یہ تاثرات عجیبہ کلام الہی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ یا تو یہ جادو کے کلمات ہیں جو دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں یا شاعرانہ کلام ہے وہ بھی عام دلوں پر اثر انداز ہوا کرتا ہے۔

حق تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں فرمایا کہ ہم نے نبی کو شعر و شاعری نہیں سکھلائی اور نہ ان کی شان کے مناسب تھی، آپ کو شاعر کہنا باطل اور غلط ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرب تو وہ قوم ہے جس کی فطرت میں شعر و شاعری پڑی ہوئی ہے، عورتیں بچے بے ساختہ شعر کہتے ہیں، وہ شعر کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں، انھوں نے قرآن کو شعر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کس اعتبار سے کہا؟ کیونکہ نہ تو قرآن

وزن شعری کا پابند ہے نہ کہیں ردیف قافیہ کا، اس کو تو جاہل شعر و شاعری سے ناواقف بھی شعر نہیں کہہ سکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شعر دراصل خیالی خود ساختہ مضامین کو کہا جاتا ہے خواہ نظم میں ہو یا نثر میں ان کا مقصد قرآن کو شعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہنے سے یہ تھا کہ آپ جو کلام لائے ہیں وہ محض خیالی افسانے ہیں یا پھر شعر کے معنی معروف کے اعتبار سے شاعر کہا تو اس مناسبت سے کہ جس طرح نظم اور شعر خاص اثر رکھتا ہے اس کا اثر بھی ایسا ہی ہے۔

امام جصاصؒ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے کسی نے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کوئی شعر پڑھتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں، البتہ ایک شعر ابن طرفہ کا آپ نے پڑھا تھا۔

سندبسی لك الايام ما كنت جاهلاً و یا تیک بالاخبار من لم تزود

اس کو آپ نے وزن شعری کو توڑ کر من لم تزود بالاخبار پڑھا۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ شعر اس طرح نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ میں شاعر نہیں، اور نہ میرے لئے شعر شاعری مناسب ہے۔

یہ روایت ابن کثیرؒ نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کی ہے، اور ترمذی، نسائی، امام احمد نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود کوئی شعر تصنیف کرنا تو کیا آپؐ و سرور کے اشعار بھی پڑھنے کو اپنے لئے مناسب نہ سمجھتے تھے۔ اور بعض روایات میں جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وزن شعری کے مطابق کچھ کلمات منقول ہیں وہ بقصد شعر نہیں، اتفاقاً ہیں اور ایسے اتفاقاً کوئی ایک دو شعر موزوں ہو جانے سے کوئی آدمی شاعر نہیں کہلاتا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فطری حال سے جو بڑی حکمتوں پر مبنی تھا یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً شعر کوئی مذموم ہے جیسا کہ شعر و شاعری کے احکام کی تفصیل سورۃ شعراء کے آخری رکوع میں گذر چکی ہو وہاں دیکھ لیا جائے۔

أَدَلَّمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِنَّا غَيْرًا لِّئَلَّا يَقُولُوا لِمَ كُنَّا كُفَرًا

اس آیت میں چوپائے جانوروں کی تخلیق میں انسانی منافع اور ان میں قدرت کی عجیب و غریب صنعتکاری کا ذکر فرمانے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ایک اور احسان عظیم کو بتلایا گیا ہے کہ یہ چوپائے جانور جن کی تخلیق میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں، خالص دست قدرت کے بنائے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کیا کہ انسان کو ان چوپاؤں سے نفع اٹھانے کا موقع ملا اور اجازت دیدی بلکہ اس کو ان کا مالک بنا دیا کہ وہ ان میں ہر طرح کے مالکانہ تصرفات کر سکتے ہیں، خود نفع اٹھائیں



یا ان کو فروخت کر کے ان کی قیمت سے فائدہ اٹھائیں۔

ملکیتِ اشیاء کی اصل علت | آجکل نئے نئے معاشی ازموں اور نظریات میں یہ بحث چھڑی ہوئی ہے  
عطا بحق ہے نہ سرمایہ نہ محنت | کہ تخلیقِ اشیاء اور ان کی ملکیت میں سرمایہ اور دولت اصل ہے  
یا محنت؟ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے قائل دولت سرمایہ کو اصل قرار دیتے ہیں اور سوشلزم  
اور کمیونزم والے محنت کو اصل علت تخلیق و ملکیت کی قرار دیتے ہیں۔ قرآن مجید کے اس فیصلے نے  
بتلا دیا کہ تخلیقِ اشیاء اور ان کی ملکیت میں دونوں کا کوئی دخل نہیں، تخلیق کسی چیز کی انسان کے  
قبضہ میں نہیں، وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہے۔ اور عقل کا تقاضا ہے کہ جو کسی چیز کو پیدا کرے  
وہی اس کا مالک بھی ہو۔ اس طرح اصل اور حقیقی ملکیت اشیاء عالم میں حق تعالیٰ کی ہے، انسان  
کی ملکیت کسی بھی چیز میں صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی  
اثبات ملکیت اور انتقال ملکیت کا قانون اپنے پیغمبروں کے ذریعہ نازل فرما دیا ہے۔ اس قانون  
کے خلاف کوئی کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔

وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ اس میں ایک اور احسان و انعام کی طرف اشارہ فرمایا کہ اکثر جانور  
اونٹ، گھوڑا، ہاتھی، بیل وغیرہ اگر دیکھو تو طاقت میں انسان سے بہت زیادہ ہیں، انسان ان کے  
مقابلہ میں کمزور ہے۔ اس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ ان جانوروں پر قابو نہ پاسکتا، مگر حق تعالیٰ نے  
جیسا ان جانوروں کی تخلیق کا انعام انسان کو بخشا اسی طرح یہ بھی فطرت بنادی کہ ان مست  
جانوروں کو انسان کے سامنے مسخر اور تابع بنا دیا۔ ایک لڑکا ایک قوسی گھوڑے کے منہ میں  
نگام ڈال دیتا ہے، اور پھر اس کی پشت پر سوار ہو کر جہاں چاہے لے پھرتا ہے۔ یہ بات بھی  
انسان کا کوئی اپنا کمال نہیں، صرف حق تعالیٰ کی عطاء اور بخشش ہے۔

وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحَضَّرُونَ اس آیت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو اد پر خلاصہ تفسیر  
میں بیان ہوا ہے کہ جُنْد سے مراد فریقِ مخالف لیا جائے، اور مطلب آیت کا یہ ہو کہ جن چیزوں  
کو انھوں نے دنیا میں معبود بنا رکھا ہے، یہی قیامت کے روز ان کے مخالف ہو کر ان کے  
خلاف گواہی دیں گے۔

اور حضرت حسن و قتادہؓ سے اس کی تفسیر یہ منقول ہے کہ ان لوگوں نے بتوں کو خدا تو  
اس لئے بنایا تھا کہ یہ ان کی مدد کریں گے، اور ہو یہ رہا ہے کہ وہ تو ان کی مدد کرنے کے قابل نہیں  
خود یہی لوگ جو ان کی عبادت کرتے ہیں ان کے خدام اور ان کے سپاہی بنے ہوئے ہیں انکی حفاظت  
کرتے ہیں کوئی ان کے خلاف کام کرے تو یہ ان کی طرف سے لڑتے ہیں (قرطبی)

قَلَّا يَحْزَنُكَ قَوْلُهُمْ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٤٦﴾

اب تو غمگین مت ہو ان کی بات سے ہم جانتے ہیں جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔

أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ

کیا دیکھتا نہیں انسان کہ ہم نے اس کو بنایا ایک قطرہ سے پھر تب ہی وہ ہو گیا جھگڑنے

مُبِينٌ ﴿٤٧﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي

بولنے والا۔ اور بھلاتا ہی ہم پر ایک مثل اور بھول گیا اپنی پیدائش کہنے لگا کون زندہ کرے گا

الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿٤٨﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ط

ہڈیوں کو جب کھوکھری ہو گئیں؟ تو کہہ ان کو زندہ کر گیا جس نے بنایا ان کو پہلی بار

وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿٤٩﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ

اور وہ سب بنانا جانتا ہے۔ جس نے بنادی تم کو سبز درخت سے

نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ﴿٥٠﴾ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ

آگ پھر اب تم اس سے ملگاتے ہو۔ کیا جس نے بنائے آسمان اور

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِقَدِيرٍ عَلٌّ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ ط بَلَىٰ ق

زمین نہیں بنا سکتا ان جیسے؟ کیوں نہیں،

وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ﴿٥١﴾ إِنشَاءً أَمْرًا إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَن

اور وہی ہواصل بنانے والا سب کچھ جانتا والا۔ اس کا حکم یہی ہو کہ جب کرنا چاہے کسی چیز کو تو

يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٥٢﴾ فَسُبْحَنَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ

کے اس کو ہو وہ اسی وقت ہو جائے۔ سو پاک ہو وہ ذات جس کے ہاتھ ہے حکومت

كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٥٣﴾

ہر چیز کی اور اسی کی طرف پھر کر چلے جاؤ گے۔

## خلاصہ تفسیر

(جب یہ لوگ ایسے واضح اور کھلے ہوئے امور میں بھی خلاف ہی کرتے ہیں) تو ان لوگوں



کی باتیں انکار توحید و رسالت سے متعلق آپ کے لئے آزر دگی کا باعث نہ ہونا چاہئے کیونکہ آزر دگی ہوتی ہو امید، اور امید ہوتی ہے مخاطب کے عقل و انصاف سے اور ان لوگوں میں نہ عقل ہو نہ انصاف تو ان سے کسی چیز کی امید ہی نہیں ہو سکتی، پھر غم کیوں ہو۔ آگے دوسرے طریقہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہے، بیشک ہم سب جانتے ہیں جو کچھ یہ دل میں رکھتے ہیں اور جو کچھ زبان سے ظاہر کرتے ہیں (اس لئے وقت معتر پر ان کو ان کے عمل کی سزا ملے گی) کیا (اس) آدمی کو (جو قیامت کا انکار کرتا ہے) یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو (ایک حقیر) لطفہ سے پیدا کیا (جس کا تقاضا یہ تھا کہ اپنی ابتدائی حالت کو یاد کر کے اپنی حقارت اور خالق کی عظمت کو دیکھ کر خود شرماتا کہ گستاخی کی جرأت نہ کرتا دوسرے خود اپنے حالات سے اس پر استدلال کرتا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا اس کی قدرت سے کیا بعید ہے) سو (اس نے ایسا نہ کیا بلکہ اقتضائے مذکور کے خلاف) وہ علامت اعتراض کرنے لگا (اور وہ اعتراض یہ کہ) اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا (عجیب اس لئے کہ اس سے انکار قدرت لازم آتا ہے) اور اپنی اصل کو بھول گیا (کہ ہم نے اس کو لطفہ حقیر سے ایک کامل انسان بنایا) کہتا ہے کہ بڑیوں کو جبکہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں کون زندہ کر دے گا۔ آپ جواب دیدیجئے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی مرتبہ ان کو پیدا کیا ہے۔ (کہ پہلی تخلیق کے وقت ان بڑیوں کا زندگی سے کوئی تعلق ہی نہ تھا اور اب تو ایک مرتبہ ان میں حیات پیدا ہو کر ایک قسم کا تعلق حیات سے ہو چکا ہے اب ان میں حیات پیدا کرنا کیا مشکل ہے) اور وہ ہر طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے (یعنی ابتداء کسی چیز کو پیدا کر دینا یا پیدا شدہ کو فنا کر کے دوبارہ پیدا کر دینا) وہ ایسا قادر مطلق ہے کہ (بعض) ہرے درخت سے تمھارے لئے آگ پیدا کر دیتا ہے، پھر تم اس سے اور آگ سلگالیتے ہو (جیسا کہ عرب میں ایک درخت تھا، مَرخ دوسرا عقار، ان دونوں درختوں سے چھماق کا کام لیتے تھے، دونوں کے ملانے سے آگ پیدا ہو جاتی تھی، تو جس قادر نے ہرے درخت کے پانی میں آگ پیدا فرمادی تو دوسرے جمادات میں حیات پیدا کر دینا اس کے لئے کیا مشکل ہے) اور جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے ہیں کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے آدمیوں کو (دوبارہ) پیدا کر دے، ضرور قادر ہے اور وہ بڑا پیدا کرنے والا خوب جاننے والا ہے (اور اس کی قدرت ایسی ہے کہ) جب وہ کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہو تو بس اس کا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے تو ان سب مقدمات سے ثابت ہو گیا کہ اس کی پاک ذات ہو جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہو اور (یہ بات) سب شبہات سے سالم رہ گئی کہ تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے (یعنی قیامت کے روز)

## معارف و مسائل

أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْقَةٍ ۖ سُوْرَةُ يَسِّ کی یہ آخری پانچ آیتیں ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہیں، جو بعض روایات میں ابی بن خلف کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور بعض میں عاص بن وائل کی طرف۔ اور اس میں بھی کوئی بُعد نہیں کہ دونوں سے ایسا واقعہ پیش آیا ہو پہلی روایت بیہقی نے شعب الایمان میں اور دوسری روایت ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ عاص بن وائل نے بطحارہ کے ایک بوسیدہ ہڈی اٹھائی، اور اس کو اپنے ہاتھ سے توڑ کر ریزہ ریزہ کیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کیا اللہ اس ہڈی کو زندہ کرے گا، جس کا حال یہ دیکھ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں اللہ تعالیٰ تجھے موت دے گا، پھر زندہ کرے گا پھر تجھ کو جہنم میں داخل کرے گا (ابن کثیر) **خَصِيْمٌ مُبِيْنٌ** یعنی یہ لطفہ حقیر سے پیدا کیا ہوا انسان کیسا کھل کر مقابلہ پر آنے لگا کہ اللہ کی قدرت کا انکار کر رہا ہے۔

**ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا** یہاں ضرب مثل سے مراد اس کا یہ واقعہ ہے کہ بوسیدہ ہڈی کو ہاتھ سے ریزہ ریزہ کرتے ہوئے اس کے دوبارہ زندہ ہونے کو محال یا مستبعد سمجھا۔ اس کے بعد فرمایا **وَلَيْسَىٰ خَلْقَهُ** یعنی اس مثال کے بیان کرنے کے وقت وہ خود اپنی پیدائش کو بھول گیا کہ ایک حقیر اور ناپاک قطرۃ بے جان میں جان ڈال کر اس کو پیدا کیا ہے۔ اگر وہ اپنی اس اصل کو نہ بھولتا تو ایسی مثالیں پیش کر کے قدرت الہیہ کے انکار کی جرأت نہ کرتا۔

**جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا** عرب میں دو درخت معروف تھے۔ ایک مَرْخ دوسرا عَفَار۔ عرب لوگ ان دونوں درختوں کی دو شاخیں مثل مسواک کے کاٹ لیتے تھے جو بالکل ہری تازہ پانی سے بھری ہوتی تھی، ایک کو دوسری پر گر گرنے سے آگ پیدا ہو جاتی تھی۔ ہرے درخت سے آگ پیدا کرنے میں اسی طرف اشارہ ہے۔ (قرطبی) اور اگر درختوں کے آخری انجام کو دیکھا جائے تو ہر درخت شروع میں ہر ابھرا ہونے کے بعد آخر میں خشک ہو کر آگ کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح ہر درخت بھی اس کا مصداق ہو سکتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں بظاہر یہی مراد ہے **أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۖ أَن تَقُولُونَ ۚ إِنَّمَا أُنشَأَ شَجَرًا تَهْتَآءُ ۖ ثُمَّ نَحْنُ الْمُنِشِقُونَ**، یعنی کیا تم اس آگ کو نہیں دیکھتے جس کو تم سلگا کر اپنے کام میں لیتے ہو کیا اس آگ سے شعلہ بننے والے درخت کو تم نے پیدا کیا یا ہم نے؟

لیکن آیت مذکورہ میں چونکہ شجر کے ساتھ اخضر کی صفت بھی ذکر کی گئی ہے اس لئے



یہاں ظاہر ہی ہے کہ وہ خاص درخت مراد ہیں جن سے ہرے بھرے ہونے کے باوجود آگ پیدا ہوتی ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ مراد آیت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہیں تو انسانی مصنوعات کی طرح ان کو اس کی ضرورت نہیں پڑتی کہ پہلے مواد جمع فرمائیں پھر اس کے لئے کاریگر بلائیں، پھر ایک مدت تک کام کر کے وہ چیز تیار ہو بلکہ وہ جب اور جس وقت جس چیز کو پیدا فرمانا چاہیں ان کو صرف حکم دیدینا کافی ہوتا ہے کہ ”پیدا ہو جا“ تو جس چیز کو یہ حکم ملتا ہے وہ فوراً اس کے حکم کے مطابق وجود میں آجاتی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کی تخلیق دفعی اور فوری ہی ہو۔ بلکہ حکمت خالق کے تالیف جس چیز کا فوری طور پر پیدا ہو جانا مصلحت ہو وہ فوری طور پر بلا تدریج و مہلت پیدا ہو جاتی ہے، اور جس چیز کا پیدا ہونا کسی حکمت و مصلحت کی بناء پر تدریج مناسب سمجھا گیا وہ اسی تدریج کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ اس کو پہلے ہی حکم میں خاص تدریج کے ساتھ پیدا ہونا بتلایا گیا ہو یا ہر مرحلہ پر اس کو جداگانہ حکم کُن کا خطاب ہوتا ہو۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

قد قمت سورۃ یس بحمد اللہ وعونه لثمانی وعشرين

من شهر صفر ۱۳۹۲ ھ یوم الخمیس وبتمامہ

تم الحمد لله الحزب الخامس من

الاحزاب السبعة القرآنیۃ فالحمد

لله اولا واخرا وظاهرا

وباطنا

ۛ

# سُورَةُ الصَّفِّ

سُورَةُ الصَّفِّ بِمِائَةٍ وَاثْنَتَيْنِ آيَةً وَخَمْسٍ رُكُوعَاتٍ

سورۃ صافات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو بیاسی آیتیں ہیں اور پانچ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

وَالصَّفِّ صَفًّا ۱) فَالزُّجَرِ زَجْرًا ۲) فَالتِّلِيَتِ ذِكْرًا ۳)

قسم ہر صف باندھنے والوں کی قطار ہو کر، پھر ڈانٹنے والوں کی جھڑک کر، پھر پڑھنے والوں کی یاد کر کر،

إِنَّ إِلَهُكُمْ لَوَاحِدٌ ۴) رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

بیشک حاکم تم سب کا ایک ہے ۔ رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے نیچے میں ہے

وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۵) إِنَّا زَيْنَا السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ ۶)

اور رب مشرقوں کا ۔ ہم نے رونق دی درلے آسمان کو ایک رونق جو تالے ہیں ۔

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ۷) لَا يَسْمَعُونَ إِلَى الْمَلَا

اور بچاؤ بنایا ہر شیطان سرکش سے ۔ سُن نہیں سکتے اوپر کی مجلس

إِلَّا عَلَىٰ وَفْقٍ مِّنْ كُلِّ جَانِبٍ ۸) دُحُورًا وَلَهُمْ عَذَابٌ

تک اور پھینکے جاتے ہیں اُن پر ہر طرف سے بھگانے کو اور اُن پر مار ہے

وَاصِبٌ ۹) إِلَّا مَن خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۱۰)

ہمیشہ کو ، مگر جو کوئی اُچک لایا جھپ سے پھر بھیچے لگا اس کے انگارا چمکتا ۔



## خلاصہ تفسیر

قسم ہواں فرشتوں کی جو عبادت میں یا حق تعالیٰ کا حکم سننے کے وقت صفت باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں جیسا اسی سورت میں آگے آئے گا **وَإِنَّا لَخُنُومٌ** (پھر قسم ہے ان فرشتوں کی جو شہاب ثاقب کے ذریعہ آسمانی خبریں لانے سے شیاطین کی بندش کرنے والے ہیں جیسا کہ اسی سورت میں عنقریب آرہا ہے) پھر (قسم ہے) ان فرشتوں کی جو ذکر الہی تسبیح و تقدیس کی تلاوت کرنے والے ہیں جیسا کہ اسی سورت میں آئے گا، **وَإِنَّا لَخُنُومٌ** (مُسَجِّدُونَ، غرض ان سب کی قسم کھا کر کہتے ہیں) کہ تمہارا معبود (برحق) ایک ہے (اور اس توحید کی دلیل یہ ہے کہ) وہ پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے (یعنی ان کا مالک اور متصرف) اور پروردگار ہے (سب ستاروں کے) طلوع کرنے کے مواقع کا (اور) ہم ہی نے رقی دی ہے اس طرف والے آسمان کو ایک عجیب آرائش یعنی ستاروں کے ساتھ اور راہی ستاروں کے ساتھ اس آسمان کی یعنی اس کی خبروں کی حفاظت بھی کی ہے ہر شریر شیطان سے (جس کا طریقہ آگے بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی حفاظت کے انتظام کی وجہ سے) وہ شیاطین عالم بالا (یعنی ملائکہ) کی باتوں کی طرف کان بھی نہیں لگا سکتے (یعنی اکثر تو مار کھانے کے ڈر سے دور ہی دور رہتے ہیں) اور (اگر کبھی اتفاقاً اس کی کوشش کرتے بھی ہیں تو) وہ ہر طرف سے (یعنی جس طرف بھی جو شیطان جائے) مار کر دھکے دیدیو جاتے ہیں (یہ عذاب اور ذلت تو انہیں فی الحال ملتی ہے) اور (پھر آخرت میں) ان کے لئے جہنم کا دائمی عذاب ہوگا (غرض کوئی آسمانی خبر سننے سے پہلے ہی انہیں مار بجھا دیا جاتا ہے، وہ سننے کا ارادہ لے کر آتے ہیں مگر ناکام رہتے ہیں) مگر جو شیطان کچھ خبر لے ہی بھاگے تو ایک دھکتا ہوا شعلہ اس کے پیچھے لگ لیتا ہے کہ اس کو جلا کر ہونک دیتا ہے، لہذا جو کچھ سنا ہے اسے دوسروں تک پہنچانے میں ناکام رہتا ہے۔ یہ تمام انتظامات و تصرفات توحید خداوندی پر دلالت کرتے ہیں)۔

## معارف و مسائل

سورت کے مضامین | یہ سورت مکی ہے، اور دوسری مکی سورتوں کی طرح اس کا بنیادی موضوع بھی ایمانیات ہیں اور اس میں توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد کو مختلف طریقوں سے مدلل کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں مشرکین کے عقائد کی تردید بھی ہے، اور آخرت میں جنت و دوزخ کے حالات کی منظر کشی بھی جو عقائد تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں شامل رہے ان کو مدلل کرنے اور کفار کے شبہات و اعتراض کو دور کرنے کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے کہ ماضی میں

جن لوگوں نے ان عقائد کو تسلیم کیا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ کیا رہا؟ اور جنہوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کی ان کا کیا انجام ہوا؟ چنانچہ اس ضمن میں حضرت نوح، حضرت ابراہیم، اور ان کے صاحبزادگان، حضرت موسیٰ و ہارون، حضرت الیاس، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کے واقعات کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں۔

مشرکین مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے، آخر میں اس عقیدے کی مفصل تردید کی گئی ہے۔ اور سورت کے مجموعی طرز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت میں شرک کی اس خاص قسم (یعنی فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینے) کی تردید بطور خاص پیش نظر رہی ہے۔ اسی لئے سورت کو فرشتوں کی قسم کھا کر اور ان کے اوصافِ بندگی کو ذکر کر کے شروع کیا گیا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم پہلا مضمون توحید | سورت کو عقیدہ توحید کے بیان سے شروع کیا گیا ہے، اور پہلی چار آیتوں کا اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ اِنَّ الْهٰکُمْ تَوَاحِدٌ (بلاشبہ تمہارا معبود ایک ہی) لیکن اس بات کو بیان کرنے سے پہلے تین قسمیں کھائی گئی ہیں۔ ان قسموں کا ٹھیکہ لفظی ترجمہ یہ ہے:

”قسم صفت باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی، پھر قسم بندش کرنے والوں کی،

پھر قسم ذکر کی تلاوت کرنے والوں کی“

یہ ”صفت باندھ کر کھڑے ہونے والے“، ”بندش کرنے والے“ اور ”ذکر کی تلاوت کرنے والے“ کون ہیں؟ قرآن کریم کے الفاظ میں اس کی صراحت نہیں ہے، اس لئے اس کی تفسیر میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان سے مراد اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے وہ غازی ہیں جو صفت باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں تاکہ باطل کی قوتوں پر ”بندش“ لگائیں، اور صفت آرا ہوتے وقت ”ذکر“ و تسبیح اور تلاوتِ قرآن میں بھی مشغول رہتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ ان سے مراد وہ نمازی ہیں جو مسجد میں صفت باندھ کر شیطانی افکار و اعمال پر ”بندش“ عائد کرتے ہیں، اور اپنا پورا دھیان ”ذکر و تلاوت“ پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ (تفسیر کبیر) و قرطبی) اور اس کے علاوہ بھی بعض تفسیریں بیان کی گئی ہیں، جو الفاظِ قرآن کے ساتھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتیں۔

لیکن جمہور مفسرین کے یہاں جن تفسیر کو سب سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا، وہ یہ ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں، اور یہاں ان کی تین صفات بیان کی گئی ہیں:-

پہلی صفت الصَّفَاتِ صَفًّا ہے۔ یہ لفظ ”صفت“ سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہیں ”کسی جمعیت کو ایک خط پر استوار کرنا“ (قرطبی) لہذا اس کے معنی ہوتے ”صفت باندھ کر کھڑے ہونے والے“



فرشتوں کی صف بندی کا ذکر اسی سورت میں آگے چل کر بھی آیا ہے۔ فرشتے خود اپنی بارے میں کہتے ہیں قَدْ أَتَيْنَاهُ خُفًّیًّا یعنی بلاشبہ ہم سب صف باندھے کھڑے رہتے ہیں؟ یہ صف بندی کب ہوتی ہے؟ اس کے جواب میں بعض حضرات مفسرین مثلاً حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے یہ فرمایا کہ فرشتے ہمیشہ فضا میں صف باندھے اللہ کے حکم کے لئے گوش برآواز رہتے ہیں، اور جب کوئی حکم ملتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ (منہجی) اور بعض حضرات نے اُسے عبادت کے وقت کے ساتھ مخصوص کیا ہے، یعنی جب فرشتے عبادت اور ذکر و تسبیح میں مشغول ہوتے ہیں تو صف باندھے لیتے ہیں (تفسیر کبیر) نظم و ضبط دین | اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر کام میں نظم و ضبط اور ترتیب و سلیقہ کا لحاظ رکھنا دین میں مطلوب ہے۔ یا اس کے احکام کی تعمیل، یہ دونوں مقصد اس طرح بھی حاصل ہو سکتے تھے کہ فرشتے صف باندھنے کے بجائے ایک غیر منظم بھیڑ کی شکل میں جمع ہو جایا کریں، لیکن اس بد نظمی کے بجائے انھیں صف بندی کی توفیق دی گئی، اور اس آیت میں اُن کے اچھے اوصاف میں سب سے پہلے اسی وصف کو ذکر کر کے بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند ہے۔

نماز میں صفوں کی درستی | چنانچہ انسانوں کو بھی عبادت کے دوران اس صف بندی کی ترغیب اور اس کی اہمیت تاکید کی گئی ہے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا: ”تم نماز میں، اس طرح صف بندی کیوں نہیں کرتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے حضور کرتے ہیں؟“ صحابہؓ نے پوچھا: ”فرشتے اپنے رب کے حضور کس طرح صف بندی کرتے ہیں؟“ آپؐ نے جواب دیا: ”وہ صفوں کو پورا کرتے ہیں، اور صف میں پیوست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں (یعنی بیچ میں خالی جگہ نہیں چھوڑتے)۔“ (تفسیر منہجی) نماز میں صفوں کو پورا کرنے اور سیدھا رکھنے کی تاکید میں اتنی احادیث وارد ہوئی ہیں کہ ان سے ایک پورا رسالہ بن سکتا ہے۔ حضرت ابو مسعود بدریؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہمارے کندھوں کو ہاتھ لگا کر فرمایا کرتے تھے: ”سیدھے رہو، آگے پیچھے مت ہو، ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔“ (جمع الفوائد بحوالہ مسلم و نسائی ص ۹۲) فرشتوں کی دوسری صفت قَالُوا جِئْنَا بِكَ بِأَمْرٍ بیان کی گئی ہے۔ یہ لفظ ”زجر“ سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں ”روکنا“، ”ڈانٹنا“، ”پھٹکارنا“۔ حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ ”بندش کرنے والے“ سے کیا ہے، جو لفظ کے ہر ممکن مفہوم کو جامع ہے۔ فرشتے کس چیز پر بندش عائد کرتے ہیں؟ قرآن کریم کے سیاق کے پیش نظر زیادہ تر مفسرین نے اس کا

یہ جواب دیا ہے کہ یہاں "بندش عائد کرنے سے" مراد فرشتوں کا وہ عمل ہے جس کے ذریعہ وہ شیاطین کو عالم بالا تک پہنچنے سے روکتے ہیں اور جس کا تفصیلی ذکر خود قرآن کریم میں آگے آ رہا ہے۔ تیسری صفت قَالَتِ لَیْلَتٍ ذِکْرُ اَیِّہِ یعنی یہ فرشتے "ذکر" کی تلاوت کرنے والے ہیں "ذکر" کا مفہوم نصیحت کی بات "بھی ہو اور یاد خدا" بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں کے ذریعہ جو نصیحت کی باتیں نازل کی ہیں یہ ان کی تلاوت کرنے والے ہیں۔ اور یہ تلاوت حصول برکت اور عبادت کے طور پر بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے وحی لانے والے فرشتے مراد ہوں کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے سامنے ان کتب نصیحت کی تلاوت کر کے انھیں اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں جبکہ "ذکر" سے مراد یاد خدا ہی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہر دم ان کلمات کی تلاوت میں مصروف رہتے ہیں، جو اللہ کی تسبیح و تقدیس پر دلالت کرتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے فرشتوں کی یہ تین صفات ذکر کر کے بندگی کے تمام اوصاف کو جمع کر دیا ہے۔ یعنی عبادت کے لئے صفت بستہ رہنا، طاعتی طاقتوں کو اللہ کی نافرمانی سے روکنا، اور اللہ کے احکام و مواعظ کو خود پڑھنا، اور دوسروں تک پہنچانا۔ اور ظاہر ہے کہ بندگی کا کوئی عمل ان تین شعبوں سے خالی نہیں ہو سکتا، لہذا چاروں آیتوں کا مفہوم یہ ہو گیا کہ جو فرشتہ تمام اوصاف بندگی کے حامل ہیں ان کی قسم، تمھارا معبود برحق ایک ہی ہے۔

فرشتوں کی قسم | اس سورت میں خاص طور پر فرشتوں کی قسم کھانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کیوں کھائی گئی؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا۔ اس سورت کا مرکزی موضوع شرک کی اس خاص قسم کی تردید ہے جس کے تحت اہل مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ چنانچہ سورت کی ابتدا ہی میں فرشتوں کی قسم کھا کر ان کے وہ اوصاف بیان کر دیئے گئے جن سے ان کی محمل بندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کے ان اوصاف بندگی پر غور کرو گے تو وہ خود تمھارے سامنے اس بات کی گواہی دیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رشتہ باپ بیٹی کا نہیں، بلکہ بندہ و آقا کا ہے۔

حق تعالیٰ کا قسم کھانا اور اس کے | قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے ایمان و عقائد کے بہت سے اصولی متعلق احکام اور سوال و جواب | مسائل کی تاکید کے لئے مختلف طرح کی قسم کھائی ہے، کبھی

اپنی ذات کی، کبھی اپنی مخلوقات میں سے خاص خاص اشیاء کی۔ اس کے متعلق بہت سے سوالات ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن شریف کی تفسیر میں یہ ایک مستقل اصولی مسئلہ بن گیا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے اس پر ایک مستقل کتاب "التبیان فی اقسام القرآن" لکھی ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اپنی



اصول تفسیر کی کتاب "اتقان" میں مباحث کی سرسٹھویں نوع اس کو قرار دے کر مفصل کلام کیا ہے۔ یہاں کچھ ضروری اجزاء لکھے جاتے ہیں۔

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ کی قسم کھانے میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اغنی الاغنیاء ہیں، ان کو کیا ضرورت ہے کہ کسی کو یقین دلانے کے لئے قسم کھائیں؟

اتقان میں ابوالقاسم قشیریؒ سے اس سوال کے جواب میں یہ مذکور ہے کہ حق تعالیٰ کو تو کوئی ضرورت قسم کھانے کی نہ تھی، مگر اس کو جو شفقت و رحمت اپنی مخلوق پر ہے وہ اس کی داعی ہوتی کہ کسی طرح یہ لوگ حق کو قبول کریں اور عذاب سے بچ جائیں۔ ایک اعرابی نے جب آیت **وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ سِئْتُو** کہنے لگا کہ اللہ جیسی عظیم الشان ہستی کو کس نے ناراض کیا ہے کہ اس کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ شفقت علی الخلق اس کی داعی ہے کہ جس طرح دنیا کے جھگڑے چھکانے اور اختلافات مٹانے کا معروف طریقہ یہ ہے کہ دعوے پر شہادت پیش کی جائے شہادت نہ ہو تو قسم کھائی جائے، اسی طرح حق تعالیٰ نے انسان کے اس مانوس طریقہ کو اختیار فرمایا کہ کہیں تو شہادت کے الفاظ سے مضمون کی تاکید فرمائی جیسے **شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ - الْآيَةُ**، اور کہیں قسم کے الفاظ سے جیسے **إِنِّي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ** وغیرہ

دوسرا سوال یہ ہے کہ قسم اپنے سے بہت بڑے کی کھائی جاتی ہے، حق تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی قسم کھائی جو ہر حیثیت سے کمتر ہیں؟

جواب یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ سے بڑی کوئی ذات نہ ہو نہ ہو سکتی ہے، تو یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی قسم عام مخلوق کی قسم کی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حق سبحانہ و تعالیٰ نے کہیں اپنی ذات پاک کی قسم کھائی ہے جیسے **(إِنِّي وَرَبِّي)** اور اس طرح ذات حق کی قسمیں قرآن میں سات جگہ آئی ہیں۔ اور کہیں اپنے افعال و صفات کی اور قرآن کی قسم کھائی ہے، جیسے **وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا** وغیرہ، اور بیشتر قسمیں اپنے مفعول و مخلوق کی استعمال ہوتی ہیں، جو معرفت کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے اسی کی ذات کی طرف راجع ہو جاتی ہیں۔ (کذا ذکرہ ابن قیم)

مخلوقات میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، کہیں تو اس سے اس چیز کو عظمت و فضیلت کا بیان کرنا مقصود ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی قسم آئی ہے **لَعَمْرُكَ إِنَّكُمْ كَفَىٰ سَكْرَتِيمَ يَعْبَهُوْنَ** ابن مردودہ نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق اور کوئی چیز دنیا میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے زیادہ معزز اور مکرم نہیں پیدا کی یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں کسی نبی و رسول کی ذات کی قسم نہیں آئی، صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی قسم آیت مذکورہ میں آئی ہے۔ اسی طرح رَوَّالْطُّورِ وَكِتَابِ مُسْطَوِّرٍ کی قسم بھی طور اور کتاب کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے آئی ہے۔

اور بعض اوقات کسی مخلوق کی قسم اس لئے کھائی گئی ہے کہ وہ کثیر المنافع ہے، جیسے وَاللَّيْتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ۔ اور بعض جگہ کسی مخلوق کی قسم اس لئے کھائی ہے کہ اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا مظہر اور معرفتِ صانعِ عالم کا اہم ذریعہ ہے۔ اور عموماً جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس کو اس مضمون کے ثبوت میں کچھ دخل ضرور ہوتا ہے جس مضمون کے لئے قسم کھائی ہے، جو ہر جگہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ شریعت کا مشہور حکم عام انسانوں کے لئے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قسم کھانا جائز نہیں، حق تعالیٰ کی طرف سے خود مخلوقات کی قسم کھانا کیا اس کی دلیل نہیں کہ دوسروں کے لئے بھی غیر اللہ کی قسم جائز ہے، اس کے جواب میں حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا ہے:-

”اللہ تعالیٰ کو اختیار ہو وہ اپنی مخلوقات میں سے جس چیز کی چاہے قسم کھائے، مگر کسی دوسرے کے لئے اللہ کے سوا کسی کی قسم کھانا جائز نہیں۔“

إِنَّ اللَّهَ يَقْسِمُ بِمَا شَاءَ مِنْ خَلْقِهِ وَلَيْسَ لِأَحَدٍ أَنْ يَقْسِمَ إِلَّا بِاللَّهِ رَوَاهُ ابْنُ أَبِي حَاتِمٍ (ازمظہری)

مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ جل شانہ پر قیاس کرنا غلط اور باطل ہے، جب شریعت الہیہ میں عام انسانوں کے لئے غیر اللہ کی قسم ممنوع کر دی گئی تو اللہ تعالیٰ کے اپنے ذاتی فعل سے اس کے خلاف استدلال کرنا باطل ہے۔

اس کے بعد آیات مذکورہ کی تفسیر پر غور فرمائیے۔

پہلی چار آیتوں میں فرشتوں کی قسم کھا کر یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم رب کا معبود برحق ایک ہے۔ اگرچہ قسم کے دوران فرشتوں کی صفات بھی وہ ذکر کی گئی ہیں جن پر تھوڑا سا بھی غور کر لیا جائے تو وہ عقیدہ توحید ہی کی دلیل معلوم ہوتی ہیں، لیکن آگے کی چھ آیات میں توحید کی دلیل مستقلاً بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا رَبُّ الْمَشَارِقِ (وہ پروردگار آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جتنی مخلوقات ہیں ان کا اور پروردگار ہر مشرقوں کا) تو



جو ذات اتنی عظیم مخلوقات کی خالق و پروردگار ہو، عبادت کی مستحق بھی وہی ہے، اور یہ ساری کائنات اس کے وجود اور وحدانیت کی دلیل ہے۔۔۔۔۔ یہاں المشارق، مشرق کی جمع ہے، اور چونکہ سورج سال کے ہر دن میں ایک نئی جگہ سے طلوع ہوتا ہے، اس لئے اس کی مشرقیں بہت ساری ہیں، اسی بناء پر یہاں جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔

إِنَّا نَرَى السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزُيْنَةٍ إِنَّكَ وَآيَاتِ اسْمِ السَّمَاءِ الدُّنْيَا سے مراد نزدیک ترین آسمان ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس نزدیک والے آسمان کو ستاروں کے ذریعے زینت بخشی ہے، اب یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ ستارے ٹھیک آسمان کے اندر ہوں، بلکہ اگر اس سے جدا ہوں تب بھی زمین سے دیکھا جائے تو وہ آسمان ہی پر معلوم ہوتے ہیں، اور ان کی وجہ سے آسمان جگمگاتا نظر آتا ہے۔ بتلانا صرف اس قدر ہو کہ یہ تاروں بھر آسمان اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود بخود وجود میں نہیں آگیا، بلکہ اسے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے، اور جو ذات اتنی عظیم الشان چیزوں کو وجود میں لاسکتی ہے اُسے کسی شریک اور ساجھی کی کیا ضرورت ہو؟ نیز جب یہ بات مشرکین کے نزدیک بھی طے شدہ ہے کہ ان تمام فلکی اجسام کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو یہ بڑے ظلم کی بات ہے کہ خالق و مالک تو وہ ہو اور عبادت کسی اور کی کی جائے؟

رہا یہ مسئلہ کہ ستارے قرآن کی رو سے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں یا اس سے الگ ہیں؟ نیز قرآن کریم کا علم ہیئت کے ساتھ کیا ربط ہے؟ اس موضوع پر مفصل بحث سورۃ حجر میں گذر چکی ہے۔

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ (الہی قولہ تعالیٰ) فَاتَّبَعَهُ مِنْهَا نُفُوسٌ فَاقْتَبَتْ، ان آیات میں زینت و آرائش کے علاوہ ستاروں کا ایک فائدہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کے ذریعہ شریک کے شیاطین کو عالم بالا کی باتیں سننے سے روکا جاتا ہے۔ وہ غیبی خبروں کی سُن گن لینے کے لئے آسمان کے قریب جاتے ہیں، لیکن انھیں فرشتوں کی باتیں سننے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ کوئی شیطان اگر کوئی آدمی ہتائی بات سُن بھاگتا ہے تو اُسے ایک دھکے ہوئے شعلہ کے ذریعے مار لگائی جاتی ہے، تاکہ وہ دنیا میں پہنچ کر اپنے معتقد کاہنوں اور بخومیوں کو کچھ بتانہ سکے، اسی دھکے ہوئے شعلے کو ”شہاب ثاقب“ کہا گیا ہے۔

”شہاب ثاقب“ کی کچھ تفصیل سورۃ حجر میں گذر چکی ہے، یہاں اتنی تنبیہ ضروری ہو کہ قدیم یونانی فلاسفہ اس بات کے قائل تھے کہ ”شہاب ثاقب“ دراصل کوئی زمینی مادہ ہوتا ہے، جو بخارات کے ساتھ اوپر چلا جاتا ہے، اور کرۃ نار کے قریب پہنچ کر جل اٹھتا ہے، لیکن قرآن کریم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے ”شہاب ثاقب“ کوئی زمینی مادہ نہیں،

بلکہ علم بالاہی میں پیدا ہونے والی کوئی چیز ہے۔ قدیم مفسرین اس موقع پر یہ کہتے آئے ہیں کہ یونانی فلاسفہ کا یہ خیال ”کہ شہاب ثاقب کوئی زمینی مادہ ہے محض قیاس اور تخمینہ پر مبنی ہے، اس لئے اس سے قرآن پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ اگر کوئی زمینی مادہ اوپر جا کر مشتعل ہو جاتا ہو تو قرآن کریم سے اس کی بھی کوئی منافات نہیں۔

لیکن آج کی جدید سائنسی تحقیقات نے یہ سوال ہی ختم کر دیا ہے۔ موجودہ سائنسدانوں کا خیال یہ ہے کہ ”شہاب ثاقب“ ان گنت ستاروں ہی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں اور عموماً بڑی بڑی اینٹوں کے برابر اور یہ ان گنت ٹکڑے فضا میں رہتے ہیں۔ اپنی کا ایک مجموعہ ”اسدیہ“ کہلاتا ہے، جو سورج کے گرد دھیلہ کی شکل میں گردش کرتا رہتا ہے، اور اس کا ایک دورہ ۳۳ سال میں پورا ہوتا ہے۔ ان ٹکڑوں میں روشنی کی تیز رفتاری اور خلائی اجرام کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ٹکڑے ۱۰ اگست اور ۲ نومبر کی راتوں میں زیادہ گرتے ہیں، اور ۲ اپریل، ۲۸ نومبر، ۱۸ اکتوبر اور ۹، ۱۳ دسمبر کی راتوں میں کم ہو جاتے ہیں۔

(از تفسیر الجواہر للطنطاوی، ص ۱۵، ج ۸)

جدید سائنس کی یہ تحقیق قرآنی اسلوب بیان کے زیادہ مطابق ہے، البتہ جو لوگ ”شہاب ثاقب“ کے ذریعہ شیطانوں کے مارے جانے کو بعید از قیاس سمجھتے ہیں ان کے بارے میں طنطاوی مرحوم نے الجواہر میں بڑی اچھی بات لکھی ہے:

”ہمارے آباء واجداد اور حکماء کو بھی یہ بات گراں محسوس ہوتی تھی کہ قرآن کریم ان کے زمانہ کے علم فلکیات کے خلاف کوئی بات کہے، لیکن مفسرین اس بات پر راہنی نہیں ہوئے کہ ان کے فلسفیانہ نظریات کو قبول کر کے قرآن کو چھوڑ دیں، اس کے بجائے انھوں نے ان فلسفیانہ نظریات کو چھوڑا اور قرآن کے ساتھ رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد خود بخود ثابت ہو گیا کہ قدیم یونانی فلاسفہ کا خیال بالکل باطل اور غلط تھا، اب بتائیے کہ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہ ستارے شیطانوں کو جلاتے، مارتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں تو اس میں کوئی رکاوٹ ہے؟ ہم قرآن کریم کے اس بیان کو تسلیم کرتے ہوئے مستقبل کے انتظار میں ہیں، (جب سائنس بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لے گی)۔ (جواہر ص ۱۴ ج ۸)

مقصد اصلی یہاں آسمانوں، ستاروں، اور شہاب ثاقب کا تذکرہ کرنے سے ایک مقصد تو توحید کا اثبات ہو کہ جس ذات نے یکہ و تنہا اتنے زبردست آفاقی انتظامات کئے ہوئے ہیں، وہی لائق عبادت بھی ہے۔ دوسرے اسی دلیل میں ان لوگوں کے خیال



کی تردید بھی کر دی گئی ہے جو شیطانوں کو دیتا یا معبود قرار دیتے ہیں، اور جادو یا گیا ہے کہ یہ تو ایک مردود و مقہور مخلوق ہیں، ان کو خدائی سے کیا واسطہ؟

اس کے علاوہ اسی مضمون میں اُن لوگوں کی بھی بھرپور تردید موجود ہے جو قرآن کریم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی کو کافروں کی کہانت سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ ان آیتوں میں اشارہ کر دیا گیا کہ قرآن کریم تو کافروں کی تردید کرتا ہے، لے لے کر ان کی معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ شیاطین ہیں، اور قرآن یہ کہتا ہے کہ شیاطین کی عالم بالاتک رسائی ممکن نہیں، وہ غیب کی سچی خبریں نہیں لاسکتے۔ جب کہانت کے بارے میں قرآن کریم کا بیان کیا ہوا عقیدہ یہ ہے تو وہ خود کہانت کیسے ہو سکتا ہے؟ اس طرح یہ آیتیں توحید اور رسالت دونوں مضامین کی طرف اشاروں پر مشتمل ہیں، اور آگے اپنی آسمانی مخلوقات کے ذریعہ آخرت کے عقیدے کو ثابت کیا گیا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدَّ خَلْقًا أَمْ مَنِ خَلَقْنَا ط إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ

اب پوچھ ان سے کیا یہ بنانے میں مشکل ہیں یا جتنی خلقت کہ ہم نے بنائی؟ ہم نے ہی ان کو بنایا ہے

مَنْ طِينٍ لَا رَيْبَ ۝۱۱ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ۝۱۲ وَإِذَا ذُكِّرُوا

ایک چمکے گارے سے۔ بلکہ تو کرتا ہو تعجب اور وہ کرتے ہیں ٹھٹھے۔ اور جب انکو سمجھائیے

لَا يَذْكُرُونَ ۝۱۳ وَإِذَا سَأُوا آيَةً يَسْتَسْخَرُونَ ۝۱۴ وَقَالُوا

نہیں سوچتے۔ اور جب دیکھیں کچھ نشانی مہنسی میں ڈال دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝۱۵ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ

کچھ نہیں یہ تو کھلا جادو ہے۔ کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور

عِظًا مَاءَ إِنَّا لَسَبْعٌ مُّثْتُونَ ۝۱۶ أَوَابَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ۝۱۷ قُلْ

ہڈیاں تو کیا ہم کو پھراٹھا ہیں گے، کیا اور ہمارے اگلے باپ دادوں کو بھی؟ تو کہہ کہ

نَعَمْ وَأَنْتُمْ دَاخِرُونَ ۝۱۸

ہاں اور تم ذلیل ہو گے۔

## خلاصہ تفسیر

رجب دلائل توحید سے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ان عظیم الشان مخلوقات میں سے ہے

عظیم تصرفات پر قادر ہیں اور یہ ساری عظیم مخلوقات اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، تو آپ ان (آخرت کا انکار کرنے والوں) سے پوچھئے کہ یہ لوگ بناوٹ میں زیادہ سخت ہیں، یا ہماری پیدا کی ہوئی یہ چیزیں (جن کا ابھی ذکر ہوا)؟ حقیقت یہی ہے کہ یہی چیزیں زیادہ سخت ہیں، کیونکہ ہم نے ان لوگوں کو رتو آدم کی تخلیق کے وقت اسی معمولی، چمکتی مٹی سے پیدا کیا ہے، جس میں نہ کچھ قوت ہو نہ سختی، اور انسان جو اس سے بنا ہے وہ بھی زیادہ قوی اور سخت نہیں ہے اب سوچنے کی بات ہے کہ جب ہم ایسی قوی اور سخت مخلوقات کو عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہیں تو انسان جیسی ضعیف مخلوق کو ایک بار موت دے کر دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قدرت نہ ہوگی؟ مگر ایسی واضح دلیل کے باوجود یہ لوگ آخرت کے امکان کے قائل نہیں ہوئے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ آپ تو ان کے انکار سے تعجب کرتے ہیں اور یہ لوگ (انکار سے بڑھ کر آخرت کے عقیدے سے) تمسخر کرتے ہیں اور جب ان کو (دلائل عقلیہ سے) سمجھایا جاتا ہے تو یہ سمجھتے نہیں اور جب یہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں (جو آپ کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ان کو دکھایا جاتا ہے جس سے عقیدہ آخرت ثابت کیا جائے) تو (خود) اس کی ہنسی اڑاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ (کیونکہ اگر یہ معجزہ ہو تو اس سے آپ کی نبوت ثابت ہو جائیگی اور آپ کو نہی ماننے کے بعد آپ کا بیان کردہ عقیدہ آخرت بھی مانتا پڑے گا، حالانکہ ہم آخرت کا عقیدہ نہیں مان سکتے، کیونکہ بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے، تو کیا ہم (پھر) زندہ کئے جائیں گے، اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (زندہ ہوں گے) آپ کہہ دیجئے کہ ہاں (ضرور زندہ ہوں گے) اور تم ذلیل بھی ہو گے۔

## معارف و مسائل

عقیدہ توحید کو ثابت کرنے کے بعد ان آٹھ آیتوں میں عقیدہ آخرت کا بیان ہے، اور اس سے متعلق مشرکین کے شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ سب سے پہلی آیت میں انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے امکان پر عقلی دلیل پیش کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہو کہ کائنات کے جن عظیم اجسام کا ذکر پچھلی آیتوں میں کیا گیا ہے، انسان تو ان کے مقابلہ میں بہت کمزور مخلوق ہے جب تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے، چاند، ستارے، سورج اور شہاب ثاقب جیسی مخلوقات اپنی قدرت سے پیدا فرمائی ہیں، تو اس کے لئے انسان جیسی کمزور مخلوق کو موت دے کر دوبارہ زندہ کر دینا کیا مشکل ہے؟ جس طرح تمہیں ابتداء میں چمکتی ہوئی مٹی سے بنا کر تم میں روح پھونک دی تھی، اسی طرح جب تم مر کر دوبارہ خاک ہو جاؤ گے اُس وقت پھر اللہ تعالیٰ



تمہیں زندگی عطا کر دے گا۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ”ہم نے انہیں چکپتی مٹی سے پیدا کیا“ اس سے مطلب یا تو یہ ہے کہ ان کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد ہر انسان ہو۔ اس لئے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر انسان کی اصل پانی ملی ہوئی مٹی ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ انسان لطفہ سے پیدا ہوتا ہے، لطفہ خون سے بنتا ہے، خون غذا سے پیدا ہوتا ہے اور غذا خواہ کسی شکل میں ہو اس کی اصل نباتات ہیں، اور نباتات مٹی اور پانی سے پیدا ہوتے ہیں۔

بہر صورت پہلی آیت عقیدہ آخرت کی عقلی دلیل پر مشتمل ہے، اور اسے خود اپنی سے یہ سوال کر کے شروع کیا گیا ہے کہ تم زیادہ سخت مخلوق ہو یا جن مخلوقات کا ذکر ہم نے کیا ہے، وہ زیادہ سخت ہیں؟ جواب ظاہر تھا کہ وہی مخلوقات زیادہ سخت ہیں، اس لئے اس کی تصریح کرنے کے بجائے اس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ”ہم نے تو انہیں چکپتی مٹی سے پیدا کیا ہے“

اس کے بعد کی پانچ آیتوں میں اس رد عمل کا بیان کیا گیا ہے جو آخرت کے دلائل منکر مشرکین ظاہر کرتے ہیں۔ مشرکین کے سامنے عقیدہ آخرت کے جو دلائل بیان کئے جاتے تھے وہ دو قسم کے تھے۔ ایک تو عقلی دلائل جیسے پہلی آیت میں بیان کیا گیا، دوسرے نقلی دلائل یعنی ان کو معجزے دکھا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا بیان کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، نبی کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا، اس کے پاس آسمانی خبریں آتی ہیں، جب آپ یہ خبر دے رہے ہیں کہ قیامت آئے گی، حشر و نشر ہوگا، انسانوں سے حساب کتاب لیا جائے گا تو یہ خبر یقیناً سچی ہے، اسے مان لینا چاہیے۔ جہاں تک عقلی دلائل پر مشرکین کے رد عمل کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ارشاد ہے:

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ۚ وَإِذَا دُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ ۚ

یہ تعجب ہوتا ہے کہ کیسے واضح دلائل سامنے آنے کے باوجود یہ لوگ نہیں مان رہے، لیکن یہ اٹا آپ کے دلائل و عقائد کا مذاق اڑاتے ہیں، اور انہیں کتنا ہی سمجھاؤ، سمجھ کر نہیں دیتے۔ رہے نقلی دلائل، سو اس کے بارے میں ان کا رد عمل یہ ہے کہ:

وَإِذَا رَأَوْا آيَاتِنَا يَسْتَخَرُونَ ۚ

بالآخر عقیدہ آخرت پر دلالت کرتا ہے، تو یہ اُسے بھی ٹٹھوں میں اڑا کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ اور اس سارے تمسخر و استہزار کی ان کے پاس ایک ہی دلیل ہے اور وہ یہ کہ:





تردید کر رہا ہے۔ آیات قرآنی کو دیکھا نہیں، سنا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں کہیں آیات قرآنی کا ذکر ہو وہاں اس کے ساتھ سننے کے الفاظ آتے ہیں دیکھنے کے نہیں، اور قرآن کریم میں جگہ جگہ ”آیت“ کا لفظ معجزہ کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کا مطالبہ نقل کرتے ہوئے ارشاد ہے:

”إِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ“

”اگر تم کوئی معجزہ لے کر آتے ہو تو لاؤ، اگر سچے ہو“

اسی کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لاکھٹی کو سانپ بنانے کا معجزہ

دکھلایا تھا۔

رہیں قرآن کریم کی وہ آیات جن میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزہ دکھانے کے مطالبہ کو نہیں مانا۔ سو درحقیقت وہاں بار بار معجزات دکھائے جا چکے تھے لیکن وہ ہر روز اپنی مرضی کا ایک نیا معجزہ طلب کرتے تھے، اس کے جواب میں معجزہ دکھانے سے انکار کیا گیا۔ اس لئے کہ اللہ کا نبی اللہ کے حکم سے معجزات دکھاتا ہے، اگر کوئی پھر بھی اس کی بات نہ مانے تو ہر روز ایک نیا معجزہ ظاہر کرنا نبی کے وقار کے بھی خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بھی۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا دستور یہ رہا ہے کہ جب کسی قوم کو اس کا مطلوبہ معجزہ عطا کر دیا گیا اور اس کے بعد بھی وہ ایمان نہیں لائی، تو عذاب عام کے ذریعہ اس کو ہلاک کیا گیا امت محمدیہ کو چونکہ باقی رکھنا اور عذاب عام سے بچانا پیش نظر تھا اس لئے اسے مطلوبہ معجزہ نہیں دکھایا گیا۔

فَانْسَاهِیْ زَجْرَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۱۹ وَقَالُوا

سو وہ اٹھانا تو یہی ہے ایک جھڑکی پھر اسی وقت یہ گلیں گے دیکھنے۔ اور کہیں گے

يَوْمَئِذٍ نَّآهَذَا اَيُّوْمَ الدِّیْنِ ۲۰ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِیْ

اے خدائی ہماری یہ آگیا دن جزا کا۔ یہ ہر دن فیصلہ کا جس کو

كُنْتُمْ بِہٖ تُكْذِبُوْنَ ۲۱ اَحْشَرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوا وَاَزَوْا جُحُمُ

تم جھٹلاتے تھے۔ حج کرد گنہگاروں کو اور ان کے جوڑوں کو

وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَاهْدُ وَهُمْ إِلَى

اور جو کچھ پوجتے تھے ، اللہ کے سوائے پھر چلاؤ ان کو

صِرَاطِ الْجَحِيمِ ﴿۲۳﴾ وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُورُونَ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمْ

دورخ کی راہ پر ، اور کھڑا رکھو ان کو ، ان سے پوچھنا ہے ، کیا ہوا تم کو

لَا تَنَاصَرُونَ ﴿۲۵﴾ بَلْ لَهُمُ الْيَوْمَ مَسْئَلُونَ ﴿۲۶﴾

ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے ؟ کوئی نہیں وہ آج اپنی آپ کو پکڑواتے ہیں ۔

## خلاصہ تفسیر

پس قیامت تو بس ایک للکار ہوگی (یعنی دوسرا صور) سو اس سے سب بیکار یک  
 (زندہ ہو کر) دیکھنے بھالنے لگیں گے اور (حسرت سے) کہیں گے ہمارے ہماری کم بختی یہ تو وہی  
 روز جزا (معلوم ہوتا) ہے (ارشاد ہو گا کہ ہاں) یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے  
 آگے قیامت ہی کے بعض واقعات کی تفصیل ہے کہ فرشتوں کو حکم ہو گا (جمع کر لو ظالموں کو  
 (یعنی جو کفر و شرک کے بانی اور مقتدر تھے) اور ان کے ہم مشربوں کو (یعنی جو ان کے ساتھ تاج  
 تھے) اور ان معبودوں کو جن کی وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتے تھے (یعنی شیاطین اور  
 بت) پھر ان سب کو دورخ کا راستہ بتلاؤ (یعنی ادھر لے جاؤ) اور پھر یہ حکم ہو گا کہ اچھا  
 ان کو (ذرا) ٹھہراؤ ان سے کچھ پوچھا جائے گا (چنانچہ ان سے یہ سوال ہو گا) کہ اب تم کو کیا ہوا  
 کہ (عذاب کا حکم سن کر) ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے (یعنی کافروں کے بڑے بڑے رہنما  
 انسان ہوں یا شیاطین اپنے تابعین کی مدد نہیں کرتے، جس طرح دنیا میں ان کو بہکایا کرتے  
 تھے ؟ مگر اس سوال کے بعد بھی وہ مدد نہ کر سکیں گے) بلکہ وہ سب کے سب اس روز سرفراز  
 (کھڑے) ہوں گے ۔

## معارف و مسائل

آخرت کے امکان و ثبوت کے بعد باری تعالیٰ نے ان آیتوں میں حشر و نشر کے  
 کچھ واقعات بیان فرمائے ہیں، اور دوبارہ زندہ ہونے کے بعد کافروں اور مسلمانوں کو جو  
 حالات پیش آئیں گے ان کا تذکرہ فرمایا ہے ۔



سب سے پہلی آیت میں مردوں کے زندہ ہونے کا طریقہ بیان فرمایا ہے کہ قَالَمَّا هِيَ زَجْرًا وَاحِدًا یعنی قیامت تو بس ایک للکار ہوگی، زَجْرًا کا لفظ زَجْر کا اسم مرہ ہے اور اس کے عربی زبان میں کئی معنی آتے ہیں۔ ان میں سے ایک معنی ہیں ”موشیوں کو چلنے پر آمادہ کرنے کے لئے ایسی آوازیں نکالنا جنہیں سن کر وہ اٹھ کھڑے ہوں“ یہاں اس سے مراد وہ دوسرا صورت ہے جو حضرت اسرافیل علیہ السلام مردوں کو زندہ کرنے کے لئے پھونکیں گے، اور اسے ”زَجْرًا“ سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس طرح موشیوں کو اٹھا کر چلانے کے لئے کچھ آوازیں نکالی جاتی ہیں اسی طرح مردوں کو زندہ کرنے کے لئے یہ صورت پھونکا جائے گا۔ (تفسیر قرطبی)

اگرچہ باری تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ صورت پھونکنے بغیر مردوں کو زندہ کر دے، لیکن یہ صورتِ حشر و نشر کے منظر کو پُر ہیبت بنانے کے لئے پھونکا جائے گا (تفسیر کبیر) — اس صورت پھونکنے کا اثر کافروں پر یہ ہوگا کہ يٰۤاَہْمُکُمْ يَنْظُرُوْنَ رہیں اچانک وہ دیکھنے بھالنے لگیں گے، یعنی جس طرح دنیا میں وہ دیکھنے پر قادر تھے اسی طرح وہاں بھی دیکھ سکیں گے، اور بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ حیرانی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں گے۔ (قرطبی)

اَلْحٰشِرُ وَالَّذِيْنَ تَخٰلَفُوْا وَاَزٰوْا جَهَنَّمَ یعنی ان ظالموں کو جنہوں نے شرک کے ظلمِ عظیم کا ارتکاب کیا اور ان کے ہم مشربوں کو جمع کر لو، یہاں ہم مشربوں کے لئے ازواج کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی ہیں ”جوڑ“ اور یہ لفظ شوہر اور بیوی کے معنی میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض مفسرین نے اس کے معنی بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس سے مشرکین کی وہ بیویاں مراد ہیں جو خود بھی مشرک تھیں۔ لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں ”ازواج“ سے مراد ہم مشرب ہی ہے، اور اس کی تائید حضرت عمرؓ کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ امام بیہقیؒ اور عبدالرزاقؒ وغیرہ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہاں اَزٰوْا جَهَنَّمَ سے مراد ہیں ان جیسے دوسرے لوگ، چنانچہ سود خور دوسرے سود خوروں کے ساتھ، زنا کار دوسرے زانیوں کے ساتھ، اور شراب پینے والے دوسرے شراب پینے والوں کے ساتھ جمع کئے جائیں گے۔ (روح المعانی و مظهری)

اس کے علاوہ وَمَا کَاوَا يَعْبُدُوْنَ کے الفاظ سے بتا دیا گیا کہ مشرکین کے ساتھ ان کے وہ باطل معبود یعنی بت اور شیاطین بھی جمع کئے جائیں گے، جنہیں یہ لوگ دنیا میں اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے، تاکہ اُس وقت اُن باطل معبودوں کی بے بسی کا اچھی طرح نظارہ کرایا جائے۔

اس کے بعد فرشتوں کو حکم ہوگا کہ فَاَهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ۝ یعنی ان لوگوں کو جہنم کا راستہ دکھلاؤ، اور جب فرشتے ان لوگوں کو لے چلیں گے تو پل صراط کے قریب پہنچنے کے بعد حکم ہوگا کہ يَقْوَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ مَسْئُورُونَ ۖ ان کو ٹھہراؤ، ان سے سوال ہوگا۔ چنانچہ اس مقام پر ان کے ان کے عقائد و اعمال کے بارے میں وہ سوالات کئے جائیں گے جن کا ذکر قرآن و حدیث میں بہت مقامات پر آیا ہے۔

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۖ (۳۷) قَالُوا إِنَّا كُنَّا كُفَّٰرًا

اور منہ کیا بعضوں نے بعضوں کی طرف لگے پوچھنے، بولے تم ہی تھے کہ آتے تھے ہم پر داہنی

تَاوَنَّا عَنْ الْيَمِينِ ۖ (۳۸) قَالُوا بَلْ لَّمْ تَكُونُوا مَوْمِنِينَ ۖ (۳۹) وَمَا

طرف سے ۔ وہ بولے کوئی نہیں پر تم ہی نہ تھے یقین والے ۔ اور ہمارا

كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۖ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِينَ ۖ (۴۰) فَحَقَّ عَلَيْنَا

تم پر کچھ زور نہ تھا، پر تم ہی تھے لوگ حد سے نکل چلنے والے ۔ سو ثابت ہو گئی ہم پر

قَوْلُ رَبِّنَا ۖ إِنَّا لَذٰلِكَ أَقْوٰنٌ ۖ (۴۱) فَأَخَوَيْنَا كُفْرًا ۖ (۴۲)

بات ہمارے رب کی بیشک ہم کو مزہ چکھنا ہی، ہم نے تم کو گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ تھے ۔

فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ۖ (۴۳) إِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ

سو وہ سب اس دن تکلیف میں شریک ہیں ۔ ہم ایسا ہی کرتے ہیں گنہگاروں

بِالْمُجْرِمِينَ ۖ (۴۴) إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللَّهُ

کے حق میں ۔ وہ تھے کہ اُن سے جب کوئی کہتا کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے،

يَسْتَكْبِرُونَ ۖ (۴۵) وَيَقُولُونَ إِنَّمَا نَتَارِكُ الْإِلٰهِنَا لِلشَّاعِرِ مَجْنُونٍ ۖ (۴۶)

تو غرور کرتے، اور کہتے کیا ہم چھوڑ دیں گے اپنے معبودوں کو کہنے سے ایک شاعر دیوانے کے؟

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ۖ (۴۷) إِنَّا كُنَّا لَنَقُولُ الْعَذَابَ

کوئی نہیں، وہ لیکر آیا جو سچا دین اور سچا ماننا ہے سب سولوں کو، بیشک تم کو چکھنا ہی عذاب

الَّذِينَ ۖ (۴۸) وَمَا يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۖ (۴۹) إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۖ (۵۰)

در دناک ۔ اور وہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کرتے تھے، مگر جو بندے اللہ کے ہیں چنے ہوئے ۔



## خلاصہ تفسیر

دجائے اس کے کہ مشرکین ایک دوسرے کی مدد کر سکیں ان میں اُس وقت اُلٹا جھگڑا ہوگا، اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر جواب سوال (یعنی اختلافات) کرنے لگیں گے (چنانچہ) تابعین (اپنے سرداروں سے) کہیں گے کہ ہم کو تو تم نے گمراہ کیا، کیونکہ ہم پر تمہاری آمد بڑے زور کی ہو کرتی تھی (یعنی تم ہم پر خوب زور ڈال کر ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے) متبوعین یہ کہیں گے کہ نہیں بلکہ تم خود ہی ایمان نہیں لائے تھے، اور ہم پر ناحق الزام لگاتے ہو، کیونکہ ہمارا تم پر کوئی زور تو تھا ہی نہیں، بلکہ تم خود ہی سرکشی کیا کرتے تھے سو جب کفر کے مرتکب ہم بھی تھے اور تم بھی، تو معلوم ہوا کہ ہم سب ہی پر ہمارے رب کی یہ (ازلی) بات محقق ہو چکی تھی کہ ہم سب کو (عذاب کا) مزہ چکھنا ہے، تو اس کا سامان یہ ہو گیا کہ ہم نے تم کو بہکایا (جس سے تم ہمارے جبر و اکراہ کے بغیر خود اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے اور ادھر) ہم خود بھی (اپنا اختیار سے) گمراہ تھے (پس دونوں کی گمراہی کے اسباب جمع ہو گئے، جن میں تمہارا اپنا اختیار بھی اپنی گمراہی کا بڑا سبب ہے، پھر اپنے آپ کو بری کیسے کرنا چاہتے ہو؟ آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب دونوں فریق کافر میں مشترک ہونا ثابت ہے، تو وہ سب کے سب اس روز عذاب میں (بھی) شریک رہیں گے (اور) ہم ایسے مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں (آگے ان کے کفر و جرم کا بیان ہے کہ) وہ لوگ ایسے تھے کہ (توحید کے بھی منکر تھے اور رسالت کے بھی چنانچہ) جب ان سے (بواسطہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود برحق نہیں تو (اس کے ماننے سے) ہنکھریا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعر دیوانہ (کے کہنے) کی وجہ سے چھوڑ دیں گے؟ (پس اس میں توحید اور رسالت دونوں کا انکار ہو گیا حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ پیغمبر نہ شاعر ہیں نہ مجنون) بلکہ (پیغمبر ہیں کہ) ایک سچا دین لے کر آئے ہیں اور (اصول توحید وغیرہ میں) دوسرے پیغمبروں کی تصدیق (اور موافقت) کرتے ہیں (یعنی ایسے اصول بتلاتے ہیں جس میں سب رسول متفق ہیں۔ پس وہ اصول بے شمار دلائل کی روشنی میں حق ہیں، خیال بندی نہیں، اور حق بات کا کہنا جئون نہیں۔ دوسری امتوں نے بھی اپنے انبیاء کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا۔ یہاں چونکہ براہ راست کفار عرب مخاطب ہیں، اس لئے صرف اسی اُمت کے کافروں کا ذکر کیا گیا ہے، آگے اس بات کا بیان ہے کہ انہیں مشافہۃً اس مشترک عذاب کی وعید سنائی جائے گی کہ تم سب (تابع اور متبوع) کو دردناک عذاب چکھنا پڑے گا اور اس حکم میں تم پر کوئی ظلم نہیں ہو (کیونکہ) تم کو اسی کا بدلہ ملے گا جو کچھ تم

رکفر وغیرہ) کیا کرتے تھے، ہاں مگر جو اللہ کے خاص کئے ہوئے بندے ہیں (اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جنہوں نے حق کا اتباع کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مقبول اور مخصوص فرمایا ایسے لوگ عذاب سے محفوظ رہیں گے)۔

## معارف و مسائل

میدانِ حشر میں جمع ہونے کے بعد کافروں کے بڑے بڑے سردار جنہوں نے اپنی چھوٹوں کو بہکایا تھا، اپنے پیروں کے سامنے آئیں گے تو بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کی کوئی مدد کر سکیں، آپس میں بحث و تکرار شروع کر دیں گے۔ ان آیات میں اسی بحث و تکرار کا کچھ نقشہ کھینچ کر فریقین کا انجام بد بیان کیا گیا ہے۔ آیات کا مفہوم خلاصہ تفسیر سے واضح ہے، صرف چند مختصر باتیں قابل ذکر ہیں:-

(۱) اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَانُوْنَ نَاعِنِ الْمِيْمِيْنَ میں "میں" کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک معنی قوت و طاقت بھی ہیں۔ اوپر اسی معنی کے لحاظ سے تفسیر یہ کی گئی ہے کہ "ہم پر تمہاری آمد بڑے زور کی ہو ا کرتی تھی" یعنی تم ہم پر خوب زور ڈال کر ہمیں گمراہ کیا کرتے تھے اور یہی تفسیر زیادہ صاف اور بے غبار ہے۔ اس کے علاوہ "میں" کے معنی "قسم" کے بھی آتے ہیں اس لئے بعض حضرات نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ "تم ہمارے پاس قسمیں لے کر آیا کرتے تھے" یعنی قسم کھا کر ہم پر یہ باور کراتے تھے کہ ہمارا مذہب درست ہے، اور رسولؐ کی تعلیم (معاذ اللہ) باطل ہے۔ الفاظِ قرآنی کے لحاظ سے یہ دونوں تفسیریں بے تکلف ممکن ہیں۔

(۲) قَالَهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو ناجائز کام کی دعوت دے اور اسے گناہ پر آمادہ کرنے کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے تو اسے دعوتِ گناہ کا عذاب تو بے شک ہوگا، لیکن جس شخص نے اس کی دعوت کو اپنے اختیار سے قبول کر لیا، وہ بھی اپنے عمل کے گناہ سے بری نہیں ہو سکتا۔ وہ آخرت میں یہ کہہ کر چھٹکارا نہیں پاسکتا کہ مجھے تو فلاں شخص نے گمراہ کیا تھا، ہاں اگر اس نے گناہ کا ارتکاب اپنے اختیار سے نہ کیا ہو بلکہ جبر و اکراہ کی حالت میں اپنی جان بچانے کے لئے کر لیا ہو تو انشاء اللہ اس کی معافی کی امید ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿۴۱﴾ فَاُولٰٓئِكَ وَهُمْ مُّكَرَّمُونَ ﴿۴۲﴾ فِي جَنَّةٍ

وہ لوگ جو ہیں اُن کے واسطے روزی ہو مقرر میوے اور ان کی عزت ہو نعمت کے



التَّعِيمِ ۝۴۳ عَلَى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ۝۴۴ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ

باغوں میں، تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے، لوگ لئے پھرتے ہیں ان کے پاس پیالہ

مِّنْ مَّعِينٍ ۝۴۵ بَيِّضَاءَ كَذَّةٍ لِّلشَّرِبِ ۝۴۶ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا

شراب صاف کا، سفید رنگ مزہ دینے والی پینے والوں کو، نہ اس میں سر پھرتا ہو اور نہ وہ

هَمٌّ عَنْهَا يُزْفُونَ ۝۴۷ وَعِنْدَهُمْ قُصِرَتُ الطَّرِيقِ عَيْنٌ ۝۴۸

اس کو پی کر بہکیں، اور ان کے پاس ہیں عورتیں نبی نگاہ رکھنے والیاں بڑی آنکھوں والیاں،

كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مُّكُونٌ ۝۴۹ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝۵۰

گویا وہ اندھے ہیں چھپے دھرے۔ پھر مٹہ کیا ایک نے دوسرے کی طرف نگے پوچھنے،

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۝۵۱ يَقُولُ أَإِنَّكَ لَمِنَ

بولا ایک بولنے والا ان میں میرا تھا ایک ساتھی، کہا کرتا کیا تو یقین

الْمُصَدِّقِينَ ۝۵۲ إِذَا امْتَنَّا وَكُنَّا تُرَايَا وَعِظَاءُ إِنَّا

کرتا ہے، کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم کو

لَمَدَّيْنُونَ ۝۵۳ قَالَ هَلْ آنَسَ مِمَّنْ مَّطْلُوعُونَ ۝۵۴ فَاطْلَعَ فَرَاهُ فِي

جزا ملے گی؟ کہنے لگا بھلا تم جھانک کر دیکھو گے؟ پھر جھانکا تو اس کو دیکھا

سَوَاءَ الْجَحِيمِ ۝۵۵ قَالَ تَاللَّهِ إِنْ كِدَتْ لَتُرْدِينَ ۝۵۶ وَلَوْلَا

بچوں بیچ دوزخ کے۔ بولا قسم اللہ کی تو تو مجھ کو ڈالنے لگا تھا گرٹھے میں، اور اگر نہ ہوتا

نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنْتَ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ۝۵۷ أَفَسَاخُنٌ بِمَقِيتِينَ ۝۵۸

میرے رب کا فضل تو میں بھی ہوتا انہی میں جو پکڑے ہوئے آئے۔ کیا اب ہم کو مرنا نہیں،

إِلَّا مَوْتَنَا أَوْ لِي وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ ۝۵۹ إِنَّ هَذَا لَهُوَ

مگر جو پہلی بار مر چکے اور ہم کو تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بیشک یہی ہے

الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝۶۰ لِمِثْلِ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ ۝۶۱

بڑی مراد ملنی۔ ایسی چیزوں کے واسطے چاہئے محنت کریں محنت کرنے والے۔

## خلاصہ تفسیر

ان اللہ کے مقبول بندوں کے واسطے ایسی غذائیں ہیں جن کا حال (دوسری سورتوں میں) معلوم (ہو چکا) ہے یعنی میوے (جن کا ملنا سورۃ یس آیت کہم فیہا فاکہتہ میں اور جن کی صفات سورۃ واقعہ آیت وقارکہ کثیرۃ لا مقطوعۃ ولا ممنوعۃ میں اس کے قبل نازل ہو چکی ہیں، کیونکہ لیس اور واقعہ سورۃ صافات سے نزل میں مقدم ہیں۔ کذا فی الاتقان) اور وہ لوگ بڑی عزت سے آرام کے باغوں میں تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہونگے (اور) ان کے پاس ایسا جام شراب لایا جائے گا (یعنی غلمان لائیں گے) جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جائے گا (اس سے شراب کی کثرت اور لطافت معلوم ہوئی اور دیکھنے میں) سفید ہوگی (اور پینے میں) پینے والوں کو لذیذ معلوم ہوگی (اور) نہ اس میں دردِ سر ہوگا (جیسے دنیا کی شراب میں ہوتا ہے جس کو خمار کہتے ہیں) اور نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا، اور ان کے پاس نیچی نگاہ والی بڑی بڑی آنکھوں والی (حوریں) ہوں گی (جن کی رنگت ایسی صاف ہوگی کہ) گویا بیضے ہیں جو (پروں کے نیچے) چھپے ہوئے ہیں (کہ گرد و غبار اور داغ سے بالکل محفوظ ہوتے ہیں) تشبیہ محض صفائی میں ہے) پھر جب سب لوگ ایک جلسہ میں جمع ہوں گے تو ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے (اس بات چیت کے دوران میں) ان (اہل جنت) میں سے ایک کہنے والا (اہل مجلس سے) کہے گا کہ (دنیا میں) میرا ایک ملاقاتی تھا وہ (مجھ سے بطور تعجب) کہا کرتا تھا کہ کیا تو بعث کے معتقدین میں سے ہے کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم (دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور زندہ کر کے) جزاء سزا دیئے جائیں گے؟ (یعنی وہ آخرت کا منکر تھا، اس لئے ضرور وہ دوزخ میں گیا ہوگا۔ حق تعالیٰ کا) ارشاد ہوگا کہ (اے اہل جنت) کیا تم جھانک کر (اس کو) دیکھنا چاہتے ہو؟ (اگر چاہو تو تم کو اجازت ہے) سو وہ شخص (جس نے قصہ بیان کیا تھا) جھانکے گا تو اس کو وسطِ جہنم میں (پڑا ہوا) دیکھے گا (اس کو وہاں دیکھ کر اس کے) کہے گا کہ خدا کی قسم تو تو مجھ کو تباہ ہی کرنے کو تھا (یعنی مجھ کو بھی منکرِ آخرت بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا، اور اگر میرے رب کا (مجھ پر) فضل نہ ہوتا کہ مجھ کو اس نے صحیح عقیدے پر قائم رکھا، تو میں بھی (تیری طرح) مانوڈ لوگوں میں ہوتا اور اس کے بعد جنتی اہل مجلس سے کہے گا کہ) کیا ہم بجز پہلی بار مر چکنے کے (کہ دنیا میں مر چکے ہیں) اب نہیں مریں گے اور نہ ہم کو عذاب ہوگا؟ (یہ ساری باتیں اس جو شِ مسرت میں کہی جائیں گی کہ اللہ تعالیٰ نے سب آفات اور کلفتوں سے بچا لیا اور ہمیشہ کے لئے بے فکر کر دیا۔ آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جنت کی جتنی جسمانی اور روحانی نعمتیں اوپر بیان کی گئیں) یہ بیشک بڑی کامیابی ہے، ایسی ہی کامیابی



(حاصل کرنے) کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے (یعنی ایمان لانا اور اطاعت کرنا چاہئے)۔

## معارف و مسائل

اہلِ دوزخ کے حالات بیان کرنے کے بعد ان آیات میں اہلِ جنت کے احوال کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ تذکرہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دس آیتوں میں عام اہلِ جنت کو جو عیش و آرام حاصل ہوگا، اس کا بیان ہے اور اس کے بعد کی آیات میں ایک خاص جنتی کا عبرت آموز واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ابتدائی دس آیتوں میں چند باتیں بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) اُولَئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ کا لفظی ترجمہ یہ ہے ”انہی لوگوں کے لئے ایسا رزق ہے جس کا حال معلوم ہے“ مفسرین نے اس کے مختلف مطلب بتائے ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس سے جنتی غذاؤں کی ان تفصیلی صفات کی طرف اشارہ ہے جو مختلف سو رقوں میں بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ خلاصہ تفسیر میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اسی تفسیر کو اختیار فرمایا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ ”رزق معلوم“ سے مراد یہ ہے کہ اس کے اوقات متعین اور معلوم ہیں، یعنی وہ صبح و شام یا بندی کے ساتھ عطا کیا جائے گا، جیسا کہ دوسری آیت میں مَبْكُورَةٌ وَعَشِيًّا (صبح و شام) کے الفاظ صراحت آئے ہیں۔ ایک تیسری تفسیر اور ہے، اور وہ یہ کہ ”رزق معلوم“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ یقینی اور دائمی رزق ہوگا، دنیا کی طرح نہیں کہ کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ کل مجھے کیا اور کتنا رزق ملنے والا ہے؟ اور نہ کسی کو یہ علم ہے کہ جتنا رزق مجھے حاصل ہے وہ کب تک میرے پاس رہے گا؟ ہر انسان کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ جو نعمتیں مجھے اس وقت حاصل ہیں وہ شاید کل میرے پاس نہ رہیں، جنت میں یہ خطرہ نہیں ہوگا، بلکہ وہاں کا رزق یقینی بھی ہوگا اور دائمی بھی (تفسیر قرطبی وغیرہ)

(۲) فَوَاكِهُ، اس لفظ کے ذریعہ قرآن نے جنت کے رزق کی خود تفسیر فرمادی ہے کہ وہ رزق میوؤں پر مشتمل ہوگا۔ فَوَاكِهُ کی جمع ہے، اور عربی میں فَاكِہَہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو بھوک کی ضرورت رفع کرنے کے لئے نہیں، بلکہ لذت حاصل کرنے کے لئے کھائی جائے اور دو میں اس کا ترجمہ ”میوہ“ اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ میوہ بھی لذت حاصل کرنے کے کھایا جاتا ہے، ورنہ درحقیقت فَاكِہَہ کا مفہوم میوے کے مفہوم سے زیادہ عام ہے۔ امام رازیؒ نے اسی ”فواکہ“ کے لفظ سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جنت میں جتنی غذا دی جائیں گی وہ سب لذت بخشے کے لئے دی جائیں گی، بھوک کی حاجت رفع کرنے کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ جنت میں انسان کو حاجت کسی چیز کی نہیں ہوگی، وہاں اسے اپنی زندگی برقرار رکھنے یا حفظانِ صحت

کے لئے بھی کسی غذا کی ضرورت نہیں ہوگی، ہاں خواہش ہوگی، اس خواہش کے پورے ہونے سے لذت حاصل ہوگی، اور جنت کی تمام نعمتوں کا مقصد لذت عطا کرنا ہوگا (تفسیر کبیر، ص ۹۸ ج ۴) (۳) وَهُمْ مُكْرَمُونَ، کہہ کر بتا دیا گیا کہ اہل جنت کو یہ رزق پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ دیا جائے گا۔ کیونکہ اعزاز و اکرام نہ ہو تو لذت سے لذیذ غذا بھی بے حلاوت ہو جاتی ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہان کا حق صرف کھانا کھلانے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا اعزاز و اکرام بھی اس کے حقوق میں داخل ہے۔

(۴) عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ، یہ اہل جنت کی مجلس کا نقشہ ہے کہ وہ تختوں پر آٹھنے سامنے بیٹھے ہوں گے، کسی کی کسی کی طرف پشت نہیں ہوگی، اس کی عملی صورت کیا ہوگی؟ اس کا صحیح علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ مجلس کا دائرہ اتنا وسیع ہوگا کہ کسی کو کسی کی طرف پشت کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، اور اللہ تعالیٰ اہل جنت کو ایسی قوت بینائی، سماعت اور گویائی عطا فرمائے گا کہ وہ دور بیٹھے ہوئے لوگوں سے بڑے آرام کے ساتھ باتیں کر سکیں۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ تخت گھومنے والے ہوں گے، اور جن سے بات کرنی ہو اسی کی طرف گھوم جائیں گے۔ واللہ سبحانہ اعلم

(۵) لَذَّةٌ لِّلْشَّارِبِیْنَ، ”لذۃ“ اصل میں مصدر ہے، جس کے معنی ہیں لذت ہونا۔ اسی لئے بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے، اصل میں ”ذات لذۃ“ تھا، یعنی ”لذت والی“ لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ اول تو اگر ”لذۃ“ کو مصدر ہی سمجھا جائے تو مصدر اسم فاعل کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ وہ شراب پینے والوں کے لئے ”مجتہم لذت“ ہوگی۔ اس کے علاوہ ”لذۃ“ کا صیغہ صفت لذیذ کے علاوہ لذہ بھی آتا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہاں لذۃ اسی لذہ کا مونث ہو (تفسیر قرطبی) اس صورت میں معنی ہوں گے ”پینے والوں کے لئے لذیذ“

(۶) لَا فِیْہَا غَوْلٌ، ”غول“ کے معنی کسی نے ”درد سر“ بیان کئے ہیں، کسی نے پیٹ کا درد کسی نے ”بدبو اور گندگی“ اور کسی نے ”عقل کا بہک جانا“ درحقیقت لفظ ”غول“ ان سبھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں ”غول“ آفت کے معنی میں ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جنت کی شراب میں ایسی کوئی آفت نہیں ہوگی جیسی دنیا کی شرابوں میں پائی جاتی ہیں، نہ درد سر ہوگا، نہ درد شکم، نہ بدبو کا بھیکارہ، نہ عقل کا بہک جانا (تفسیر ابن جریرؒ)

(۷) قِیَاصَاتِ الطُّرُقِیْنَ، یہ جنت کی حوروں کی صفت ہے کہ وہ ”نگاہیں نیچی رکھنے والی ہوں گی“ مطلب یہ ہے کہ جن شوہروں کے ساتھ ان کا ازدواجی رشتہ اللہ تعالیٰ نے قائم کر دیا، وہ



اُن کے علاوہ کسی بھی مرد کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھیں گی۔ علامہ ابن جوزیؒ نے نقل کیا ہے کہ یہ عورتیں اپنے شوہروں سے کہیں گی: ”میرے پروردگار کی عزت کی قسم! جنت میں مجھے تم سے بہتر کوئی نظر نہیں آتا جس اللہ نے مجھے تمھاری بیوی اور تمھیں میرا شوہر بنایا تمام تعریفیں اسی کی ہیں!“

”نگاہیں نیچی رکھنے والی“ کا ایک اور مطلب علامہ ابن جوزیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی نگاہیں نیچی رکھیں گی۔ یعنی وہ خود اتنی خوب صورت اور وقار شعار ہوں گی کہ ان کے شوہروں کو کسی اور کی طرف نظر اٹھانے کی خواہش ہی نہ ہوگی (تفسیر زاد المسیر لابن جوزیؒ ص ۵۵ و ۵۶ ج ۱) (۸) كَا تَحْنُ بَيِّنٌ مِّمَّنْ كُنَّ، اس آیت میں جنت کی عورتوں کو ”چھپے ہوئے اندوں“ سے

تشبیہ دی گئی ہے۔ اہل عرب کے یہاں یہ تشبیہ مشہور و معروف تھی، جو انڈاپروں میں چھپا ہوا ہو اس پر بیرونی گرد و غبار کا اثر نہیں پہنچتا۔ اس لئے وہ نہایت صاف ستھرا ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس کا رنگ زردی مائل سفید ہوتا ہے جو اہل عرب کے یہاں عورتوں کے لئے دلکش ترین رنگ شمار ہوتا تھا، اس لئے اس سے تشبیہ دی گئی۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہاں اندوں سے تشبیہ نہیں ہے، بلکہ اندوں کی اس جھلی سے ہے جو چھلکے کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ عورتیں اس جھلی کی طرح نرم و نازک اور گداز ہوں گی (روح المعانی)

واللہ سبحانہ اعلم

ایک جنتی اور اس کا ابتدائی دس آیتوں میں اہل جنت کے عمومی حالات بیان فرمانے کے بعد ایک جنتی کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے، کہ وہ جنت کی مجلس میں پہنچنے کے بعد

اپنے ایک کافر دوست کو یاد کرے گا جو دنیا میں آخرت کا منکر تھا اور پھر اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اسے جہنم کے اندر جھانک کر اس سے باتیں کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ قرآن کریم میں اس شخص کا کچھ نام دیا نہیں بتایا گیا۔ اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کون ہوگا؟ تاہم بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس مومن شخص کا نام یہوداہ اور اس کے کافر ملاقاتی کا نام مطروس ہے۔ اور یہ وہی دو ساتھی ہیں جن کا ذکر سورۃ کہف کی آیت وَاضْرِبْ لَهُم مِّثْلًا مِّثْلَ الَّذَيْنِ الْخٰی میں گزر چکا ہے (تفسیر مظہری)

اور علامہ سیوطیؒ نے متعدد تابعین سے اس شخص کی تعیین کے لئے ایک اور واقعہ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دو آدمی کاروبار میں شریک تھے، ان کو آٹھ ہزار دینار کی آمدنی ہوئی، اور دونوں نے چار چار ہزار دینار آپس میں بانٹ لئے۔ ایک شریک نے اپنی رقم میں سے ایک ہزار دینار خرچ کر کے ایک زمین خریدی۔ دوسرا ساتھی بہت نیک تھا، اس نے یہ دعا کی کہ ”یا اللہ فلاں شخص نے ایک ہزار دینار میں ایک زمین خریدی ہے، میں آپ سے ایک

ہزار دینار کے عوض جنت میں زمین خریدتا ہوں۔ اور ایک ہزار دینار کا صدقہ کر دیا۔ پھر اس کے ساتھی نے ایک ہزار دینار خرچ کر کے ایک گھر بنوایا، تو اس شخص نے کہا "یا اللہ فلاں شخص نے ایک ہزار دینار میں ایک گھر تعمیر کیا ہے، میں ایک ہزار دینار میں آپ سے جنت کا ایک گھر خریدا ہوں" یہ کہہ کر اس نے مزید ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے۔ اس کے بعد اس کے ساتھی نے ایک عورت سے شادی کی اور اس پر ایک ہزار دینار خرچ کر دیئے، تو اس نے کہا "یا اللہ فلاں نے ایک عورت سے شادی کر کے اس پر ایک ہزار دینار خرچ کر دیئے ہیں، اور میں جنت کی عورتوں میں سے کسی کو پیغام دیتا ہوں اور یہ ایک ہزار دینار نذر کرتا ہوں" یہ کہہ کر وہ ایک ہزار بھی صدقہ کر دیئے۔ پھر اس کے ساتھی نے ایک ہزار دینار میں کچھ غلام اور سامان خریدا تو اس نے پھر ایک ہزار صدقہ کر کے اللہ تعالیٰ سے اس کے عوض جنت کے غلام اور جنت کا سامان طلب کیا۔

اس کے بعد اتفاق سے اس مؤمن بندے کو کوئی شدید حاجت پیش آئی، اسے خیال ہوا کہ میں اپنے سابق شریک کے پاس جاؤں تو شاید وہ نیکی کا ادا دہ کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھی سے اپنی ضرورت کا ذکر کیا، ساتھی نے پوچھا، تمہارا مال کیا ہوا؟ اس کے جواب میں اس نے پورا قصہ سنا دیا۔ اس پر اس نے حیران ہو کر کہا کہ "کیا واقعی تم اس بات کو سچا سمجھتے ہو کہ ہم جب مر کر خاک ہو جائیں گے تو ہمیں دوسری زندگی ملے گی، اور وہاں ہم کو ہمارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، جاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں دوں گا، اس کے بعد دونوں کا انتقال ہو گیا۔ مذکورہ آیات میں جنتی سے مراد وہ بندہ ہے جس نے آخرت کی خاطر اپنا سارا مال صدقہ کر دیا تھا، اور اس کا جہنمی ملاقاتی وہی شریک کار و بار ہے جس نے آخرت کی تصدیق کرنے پر اس کا مذاق اڑایا تھا (تفسیر الدر المنثور بحوالہ ابن جریر وغیرہ، ص ۱۶۵ ج ۱۵)۔

بہر کیف! اس سے مراد خواہ کوئی ہو یہاں اس واقعہ کو ذکر کرنے سے قرآن کریم بچنے کی تعلیم کا اصل منشاء لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ وہ اپنے حلقہ احباب کا پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لے کر یہ دیکھیں کہ اس میں کوئی ایسا شخص تو نہیں ہے جو انھیں کشاکش دوزخ کے انجام کی طرف لے جا رہا ہو۔ بری صحبت سے جو تباہی آسکتی ہے اس کا صحیح اندازہ آخرت ہی میں ہوگا، اور اس وقت اس تباہی سے بچنے کا کوئی رستہ نہ ہوگا، اس لئے دنیا ہی میں دوستیاں اور تعلقات بہت دیکھ بھال کر قائم کرنے چاہئیں۔ بسا اوقات کسی کافر یا نافرمان شخص سے تعلقات قائم کرنے کے بعد انسان غیر محسوس طریقے پر اس کے انکار و نظریات اور طرز زندگی سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے، اور یہ چیز آخرت کے انجام



کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

موت کے خاتمہ پر تعجب | یہاں جس شخص کا یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنے کافر ساتھی کو دیکھنے کے لئے جہنم میں جھانکے گا، اسی کے بارے میں آگے یہ مذکور ہے کہ وہ جنت کی نعمتوں کو حاصل کر کے فرط مسرت سے یہ کہے گا کہ ”کیا اب ہم کبھی نہیں مریں گے؟“ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جنت کی جاودانی زندگی کا یقین نہیں ہوگا، بلکہ جس شخص کو مسرتوں کا انتہائی درجہ حاصل ہو جائے وہ بسا اوقات ایسی باتیں کرتا ہے جیسے اسے یقین نہیں ہے کہ یہ مسرتیں اسے حاصل ہو گئی ہیں، یہ جملے بھی اسی نوعیت کے ہیں۔

آخر میں قرآن کریم اس واقعہ کے اصل سبق کی طرف متوجہ کر کے فرماتا ہے،  
لِيَسْتَلْ هَذَا أَقْلِيَعْمَلٍ لِّتَعْلَمُونَ (ایسی ہی کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے)۔

أَذْلِكَ خَيْرٌ نَزْلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ۖ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً

بمحلایہ بہتر ہر ہمائی یاد رخت سیہند کا ۶۲ ہم نے اس کو رکھا ہر ایک بلا ظالموں

لِلظَّالِمِينَ ۖ إِنَّمَا شَجَرَةُ زُقْرٍ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ۖ طَلْعُهَا

کے واسطے - وہ ایک درخت ہے کہ نکلتا ہر دوزخ کی جڑ میں، اس کا خوشہ

كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيْطَانِ ۖ فَإِنَّهُمْ لَا يَكُونُونَ مِنْهَا قٰسِيُونَ

جیسے سر شیطان کے - سو وہ کھاتیں گے اس میں سے پھر بھریں گے

مِنْهَا الْبُطُونَ ۖ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ ۖ ثُمَّ إِنَّ

اس سے پیٹ، پھر اُن کے واسطے اس کے اوپر ملونی ہر جلتے پانی کی، پھر اُن کو

مَرْجِعَهُمْ لَا إِلَى الْجَحِيمِ ۖ إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِِّينَ

لے جانا ہر آگ کے ڈھیر میں - انھوں نے پایا اپنے باپ دادوں کو بھکے ہوئے،

فَهُمْ عَلَىٰ أَثَرِهِمْ يَمْرَعُونَ ۖ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ

سو وہ انہی کے قدموں پر دوڑتے ہیں - اور بھک چکے ہیں ان سے پہلے بہت لوگ

الْأَوَّلِينَ ۖ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُّنْذِرِينَ ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ

اگلے - اور ہم نے بھیجے ہیں ان میں ڈر سنانے والے - اب دیکھ کیسا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُتَكِبِرِينَ ﴿٤٣﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٤﴾

انجام ڈرائے ہوؤں کا، مگر جو بندے اللہ کے ہیں چنے ہوئے۔

## خلاصہ تفسیر

(عذاب اور ثواب دونوں کا موازنہ کر کے اب اہل ایمان کو ترغیب اور کفار کو ترہیب فرماتے ہیں کہ تبتلاؤ) بھلائیے دعوت (جنت کی نعمتوں کی) بہتر ہے (جو اہل ایمان کے لئے ہے) یا زقوم کا درخت (جو کفار کے لئے ہے) ہم نے اس درخت کو (آخرت کی سزا بنانے کے علاوہ دنیا میں بھی ان) ظالموں کے لئے موجب امتحان بنایا ہے (کہ اس کو سن کر تصدیق کرتے ہیں یا تکذیب و استہزاء کرتے ہیں چنانچہ کفار تکذیب و استہزاء سے پیش آئے، کہنے لگے کہ زقوم تو مسکہ اور خرما کو کہتے ہیں، وہ تو خوب لذیذ چیز ہے۔ اور کہنے لگے کہ زقوم اگر درخت ہے تو دوزخ میں جو آگ ہی آگ ہے درخت کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ وہ ایک درخت ہے جو قعر دوزخ میں سے نکلتا ہے (یعنی مسکہ اور خرما نہیں ہے، اور چونکہ وہ خود آگ ہی میں پیدا ہوتا ہے اس لئے وہاں رہنا بعید نہیں، جیسے سمندر نامی جانور آگ میں پیدا ہوتا ہے، اور آگ ہی میں رہتا ہے، اس سے دونوں باتوں کا جواب ہو گیا۔ آگے زقوم کی ایک کیفیت مذکور ہے، کہ اس کے پھل ایسے (کر سیہ المنظر) ہیں جیسے سانپ کے پھن (پس ایسے درخت سے ظالموں کی دعوت ہوگی) تو وہ لوگ (بھوک کی شدت میں جب اور کچھ نہ ملیگا تو) اس سے کھاویں گے اور (چونکہ بھوک سے بے چین ہوں گے) اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر جب پیاس سے بے قرار ہو کر پانی مانگیں گے تو ان کو کھولتا ہوا پانی (غشاق یعنی پیپ میں) ملا کر دیا جائے گا اور (یہ نہیں کہ اس مصیبت کا خاتمہ ہو جائے بلکہ اس کے بعد) پھر اخیر ٹھکانا ان کا دوزخ ہی کی طرف ہوگا (یعنی اس کے بعد بھی وہیں ہمیشہ کے لئے رہنا ہوگا، اور انھیں یہ سزا اس لئے دی گئی کہ) انھوں نے ہدایت الہیہ کا اتباع نہیں کیا تھا بلکہ اپنے بڑوں کو مگر اسی کی حالت میں پایا تھا، پھر یہ بھی اپنی کے قدم بقدم تیزی کے ساتھ چلتے تھے (یعنی شوق اور رغبت ان کی بے راہی پر چلتے تھے) اور ان (موجودہ کفار) سے پہلے بھی اگلے لوگوں میں اکثر گمراہ ہو چکے ہیں اور ہم نے ان میں بھی ڈرائیوالے (پیغمبر) بھیجے تھے سو دیکھ لیجئے ان لوگوں کو کیسا (برا) انجام ہوا جن کو ڈرایا گیا تھا اور انھوں نے نہ مانا تھا کہ ان پر دنیا ہی میں کیا عذاب نازل ہوا، ہاں مگر جو اللہ کے خاص کئے ہوئے (یعنی ایمان والے) بندے تھے (وہ اس نبوی عذاب سے بھی محفوظ رہے)۔



## معارف و مسائل

دوزخ اور جنت دونوں کے تھوڑے تھوڑے حالات بیان فرمانے کے بعد باری تعالیٰ نے ہر انسان کو موازنہ کرنے کی دعوت دی ہے کہ غور کرو ان میں سے کونسی حالت بہتر ہے؟ چنانچہ فرمایا اَذِلَّةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَمَامٍ شَجَرَةٍ اِلْزَقُوْمٍ؟ جنت کی جن نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا وہ بہتر ہیں یا زقوم کا درخت جو دوزخیوں کو کھلایا جائے گا؟

زقوم کی حقیقت | زقوم نام کا ایک درخت جزیرہ عرب کے علاقہ اُتھامہ میں پایا جاتا ہے، اور علامہ آکوسی نے لکھا ہے کہ یہ دوسرے بنجر صحراؤں میں بھی ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے یہ وہی درخت ہے جسے اردو میں ”تھوہڑ“ کہتے ہیں، اسی کے قریب قریب ایک اور درخت ہندوستان میں ”ناگ بھن“ کے نام سے معروف ہے۔ بعض حضرات نے اس کو زقوم قرار دیا ہے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ اب حضرات مفسرین کی رائیں اس میں مختلف ہیں، کہ جنہیں کو جو درخت کھلایا جائے گا وہ یہی دنیا کا زقوم ہے، یا کوئی اور درخت ہے؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہی دنیا کا زقوم مراد ہے، اور بعض نے کہا کہ دوزخ کا زقوم بالکل الگ چیز ہے، دنیا کے زقوم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سانپ بھو و غیرہ دنیا میں بھی ہوتے ہیں اسی طرح دوزخ میں بھی ہوتے ہیں، لیکن دوزخ کے سانپ بھو و کے سانپ بھو ووں سے کہیں زیادہ خوفناک ہوں گے، اسی طرح دوزخ کا زقوم بھی اپنی جنس کے لحاظ سے تو دنیا ہی کے زقوم کی طرح ہوگا، لیکن یہاں کے زقوم سے کہیں زیادہ کریمہ المنظر اور کھانے میں کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

اِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِلظَّالِمِيْنَ، یعنی ”ہم نے اس زقوم کے درخت کو ان ظالموں کے لئے فتنہ بنایا ہے“ اس میں فتنہ سے بعض مفسرین کے نزدیک عذاب مراد ہے، یعنی اس درخت کو عذاب کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ لیکن اکثر حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہاں ”فتنہ“ کا ترجمہ ”آزمائش“ اور ”امتحان“ کرنا زیادہ موزوں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس درخت کا تذکرہ کر کے ہم یہ امتحان لینا چاہتے ہیں کہ کون اس پر ایمان لاتا ہے؟ اور کون اس کا مذاق اڑاتا ہے؟ چنانچہ کفار عرب اس امتحان میں ناکام رہے، انھوں نے بجائے اس کے کہ اس عذاب سے ڈر کر ایمان لاتے تمسخر و استہزاء کا طریقہ اختیار کیا۔ روایات میں ہے کہ جب قرآن کریم کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں کافروں کو زقوم کھلانے کا تذکرہ ہے، تو ابو جہل نے اپنی ساتھیوں سے کہا: ”تمہارا دوست (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہتا ہے کہ آگ میں ایک درخت ہے“

حالانکہ آگ تو درخت کو کھاتی ہے، اور خدا کی قسم! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ زقوم کھجور اور مکھن کو کہتے ہیں، تو آؤ اور یہ کھجور مکھن کھاؤ! (درمنثور، ص ۲۷، ج ۵) دراصل زقوم بربری زبان میں کھجور اور مکھن کو کہتے تھے، اس لئے اس نے سہتر ایک یہ طریقہ اختیار کیا۔ باری تعالیٰ نے ایک ہی جملے میں اس کی دونوں باتوں کا جواب دیدیا کہ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْ اَصْلِ الْجَحِيْمِ، یعنی زقوم تو جہنم کی تہ میں اُگنے والا ایک درخت ہے، لہذا نہ تو اس سے مراد کھجور اور مکھن ہے اور نہ یہ اعتراض معقول ہو کہ آگ میں درخت کیسے ہو سکتا ہے؟ جب وہ درخت پیدا ہی آگ میں ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی خصوصیات رکھ دی ہیں کہ وہ آگ سے جلنے کے بجائے اس سے نشوونما پاتا ہے، نمونے کے طور پر ایسے کئی حیوانات موجود ہیں جو آگ ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں آگ انھیں جلانے کے بجائے اور نشوونما عطا کرتی ہے۔

طَلْعَهَا كَاَنَّ رُءُوسَ الشَّيَاطِيْنِ، اس آیت میں زقوم کے پھل کو ”شیاطین کے سروں“ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے تو یہاں ”شیاطین“ کا ترجمہ ”سایہوں“ سے کیا ہے، یعنی زقوم کا پھل ایسی شکل کا ہوتا ہے جیسے سانپ کا پھن، اردو میں بھی اُسے ”ناگ پھن“ اسی لئے کہتے ہیں۔ لیکن اکثر مفسرین نے فرمایا کہ یہاں ”شیاطین“ سے اس کے معروف معنی ہی مراد ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ زقوم کا پھل اپنی بد صورتی میں شیطانوں کے سر کی طرح ہوتا ہے۔ اب یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ شیطان کو تو کسی نے دیکھا نہیں، پھر اس کے ساتھ تشبیہ کیوں دی گئی؟ اس لئے کہ یہ ایک تخیلی تشبیہ ہے، محاورہ میں بد صورت اور بد ہیئت اشیاء کو شیطان اور جن بھوت سے تشبیہ دیدی جاتی ہے، اس کا منشاء محض انتہاء درجے کی بد صورتی بیان کرنا ہوتا ہے، یہاں بھی تشبیہ اسی نوعیت کی ہے۔ (روح المعانی وغیرہ) باقی آیات کا مفہوم خلاصہ تفسیر سے واضح ہے۔

وَلَقَدْ نَادَيْنَا نُوْحًا فَلْيَعْمَلِ الْمَجِيْبُوْنَ ۝۵۰ وَنَجِّنْهُ وَاَهْلًا مِّنْ

اور ہم کو پکارا تھا نوح نے سو کیا خوب پہنچنے والے ہیں ہم پکار پر، اور بچا دیا اس کو اور اس کے گھر کو

الْكُرْبِ الْعَظِيْمِ ۝۵۱ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ ۝۵۲ وَتَرَكْنَا

اُس بڑی گہرا ہٹ سے، اور رکھا اس کی اولاد کو وہی باقی رہنے والے۔ اور باقی رکھا

عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝۵۳ سَلَّمَ عَلٰی نُوْحٍ فِي الْعَالَمِيْنَ ۝۵۴ اِنَّا كُنَّا لَفِي

اس پر پچھلے لوگوں میں، کہ سلام ہو نوح پر ساری جہان والوں میں۔ ہم یوں



نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۱۰ اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۱۱ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِينَ ۱۲

بدلہ دیتے ہیں نیکی والوں کو، وہ ہمارے ایماندار بندوں میں، پھر ڈبا دیا ہم نے دوسروں کو۔

## خُلاصۂ تفسیر

اور ہم کو نوح (علیہ السلام) نے نصرت کے لئے پکارا (یعنی دعا کی) سو رہم نے ان کی فریاد رسی کی اور ہم خوب فریاد سننے والے ہیں اور ہم نے ان کو اور ان کے تابعین کو بڑے بھاری غم سے (جو کفار کی تکذیب اور ایذا رسانی سے پیش آیا تھا) نجات دی کہ طوفان سے کفار کو غرق کر دیا اور ان کے تابعین کو بچا لیا، اور ہم نے باقی انہی کی اولاد کو رہنے دیا (اور کسی کی نسل نہیں چلی) اور ہم نے ان کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات (مدت دراز کے لئے) رہنمائی کی کہ نوح پر سلام ہو عالم والوں میں (یعنی خدا کو پورا پر تمام اہل عالم جن وانس و ملائکہ سلام بھیجا کریں) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں بیشک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں تھے، پھر ہم نے دوسرے (طریق کے) لوگوں کو (یعنی کافروں کو) غرق کر دیا۔

## معارف و مسائل

پچھلی آیت میں تذکرہ کیا گیا تھا کہ ہم نے پہلی امتوں کے پاس بھی ڈرانے والے پیغمبر بھیجے تھے، لیکن اکثر لوگوں نے ان کی بات نہیں مانی، اس لئے ان کا انجام بہت بُرا ہوا۔ اب یہاں سے اسی اجمال کی کچھ تفصیل بیان کی جا رہی ہے، اور اس ضمن میں کئی انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے ان آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا گیا ہے، حضرت نوح کا واقعہ تفصیل کے ساتھ سورۃ ہود میں گزر چکا ہے، یہاں چند باتیں جو خاص طور سے انہی آیات کی تفسیر سے متعلق ہیں درج ذیل کی جاتی ہیں:-

وَقَدْ نَادَانَا نُوحٌ میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ہمیں آواز دی تھی۔ اکثر مفسرین کے قول کے مطابق اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی وہ دعا ہے جو سورۃ نوح میں مذکور ہے، یعنی رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ اَعْلٰی الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا ط (اے میرے پروردگار! زمین پر کافروں میں سے ایک باشندہ بھی مت چھوڑ، یا جو سورۃ قمر میں مذکور ہے یعنی اِنِّیْ مُغْلُوْبٌ فَاَنْتَ صَرٌّ میں مغلوب ہوں، میری مدد کیجے)۔ یہ دعا حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی مسلسل سرکشی اور نافرمانی کے بعد اس وقت کی تھی

جبکہ آپ کی قوم نے آپ کو جھٹلانے پر اکتفاء کرنے کے بجائے اُلٹا آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔  
 وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْكَافِرِينَ (اور ہم نے باقی اپنی کی اولاد کو رہنے دیا)۔ اکثر  
 حضرات مفسرین کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے  
 میں جو طوفان آیا تھا اس میں دنیا کی اکثر آبادی ہلاک ہو گئی تھی، اور اس کے بعد ساری دنیا کی نسل  
 حضرت نوح علیہ السلام ہی کے تین بیٹوں سے چلی۔ ایک بیٹے کا نام سام تھا، اور ان کی اولاد سے  
 اہل عرب اور اہل فارس وغیرہ کی نسل چلی۔ دوسرے بیٹے حام تھے، اور ان سے افریقی ممالک کی  
 آبادیاں دنیا میں پھیلیں، بعض حضرات نے ہندوستان کے باشندوں کو بھی اسی نسل میں شامل کیا  
 ہے۔ اور تیسرے بیٹے یافت تھے، ان سے ترک، منگول اور یاجوج و ماجوج کی نسلیں نکلی ہیں۔ جو  
 لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار ہو کر طوفان سے بچ گئے تھے ان میں سے حضرت  
 نوح کے ان تین بیٹوں کے سوا کسی اور سے کوئی نسل نہیں چلی۔

البتہ بعض علماء جن کی تعداد بہت کم ہے اس بات کے قائل رہے ہیں کہ طوفان نوح ؑ  
 پوری دنیا میں نہیں، بلکہ صرف ارض عرب میں آیا تھا۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے  
 کہ ارض عرب میں صرف حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد باقی رہی، اور اپنی سے اہل عرب کی نسل  
 چلی، دنیا کے دوسرے خطوں میں دوسروں کی نسل چلنے کی اس آیت سے نفی نہیں ہوتی (سید القرآن)  
 مفسرین کا ایک تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ طوفان نوح ؑ تو پوری دنیا میں آیا تھا، لیکن دنیا کی  
 نسل صرف حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں سے نہیں، بلکہ ان تمام لوگوں سے چلی ہے جو کشتی میں  
 حضرت نوح کے ساتھ سوار تھے۔ یہ گروہ آیت میں حصر کو حصر اضافی قرار دے کر یہ کہتا ہے کہ یہاں  
 اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ ڈوبنے والوں کی نسل نہیں چلی (قرطبی)

قرآن کریم کے سیاق کے لحاظ سے تیسرا قول بہت کم زور ہے اور پہلا قول سب سے بہتر  
 ہے، اس لئے کہ اس کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے، جو امام ترمذی وغیرہ نے اس آیت  
 کی تفسیر میں براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ  
 سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "سام اہل عرب کا باپ ہے، حام اہل حبشہ کا باپ ہے،  
 اور یافت اہل روم کا" امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا،  
 (روح المعانی، ص ۹۸ ج ۲۳)

وَدَّرَكْنَاهُ عَلَىٰ نُجُومٍ سَلَامٌ عَلَىٰ الْكَافِرِينَ (اور ہم نے اُن کے  
 لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات رہنے دی کہ نوح پر سلام ہو عالم والوں میں) اس کا  
 مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے اُن کی نظر میں حضرت نوح



کو ایسا معزز و مکرم بنا دیا کہ وہ قیامت تک حضرت نوح علیہ السلام کے لئے سلامتی کی دعا کرتے رہیں گے چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ تمام وہ مذاہب جو اپنے آپ کو آسمانی کتابوں سے منسوب کرتے ہیں سب کے سب حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت اور تقدس کے قائل ہیں، مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور نصرانی بھی آپ کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔

وَأَنَّ مِنْ شَيْعَتِهِ لَابْرَاهِيمَ ۝۸۳ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝۸۴

اور اسی کی راہ والوں میں ہے ابراہیم - جب آیا اپنے رب کے پاس لیکر دل نرودگا

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ ۝۸۵ أَتَعْبُدُونَ

جب کہا اپنے باپ کو اور اس کی قوم کو تم کیا پوجتے ہو، کیا جھوٹ بنائے ہوئے حاکموں کو اللہ کے

اللَّهِ تُرِيدُونَ ۝۸۶ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۸۷ فَنَظَرَ نَظْرَةً

سوا چاہتے ہو، پھر کیا خیال کیا ہر تم نے ہر درگاہ عالم کو؟ پھر نگاہ کی ایک بار

فِي النُّجُومِ ۝۸۸ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ۝۸۹ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِينَ ۝۹۰

تاروں میں، پھر کہا میں بیمار ہونے والا ہوں - پھر پھر گئے وہ اس سے پیٹھ دے کر

فَرَاغَ إِلَىٰ آلِهِمْ فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ۝۹۱ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُونَ ۝۹۲

پھر جا گھسا ان کے بتوں میں پھر بولا تم کیوں نہیں کھاتے، تم کو کیا ہے کہ نہیں بولتے؟

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ ۝۹۳ فَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ يَزْفَرُونَ ۝۹۴ قَالَ

پھر گھسا ان پر مارتا ہوا دائیں ہاتھ سے - پھر لوگ آئے اُس پر دوڑ کر گھبراتے ہوئے۔ بولا

أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْجِيُونَ ۝۹۵ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ۝۹۶

کیوں پوجتے ہو جو آپ ترائے ہو؟ اور اللہ نے بنایا تم کو اور جو تم بناتے ہو۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝۹۷ فَأَرَادُوا بِهِ

بولے بناؤ اس کے واسطے ایک عمارت پھر ڈالو اس کو آگ کے ڈبیر میں - پھر چاہنے لگے اس پر

كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمْ إِلَّا سَفِيلِينَ ۝۹۸

بڑا داؤ کرنا پھر ہم نے ڈالا انہی کو نیچے۔

## خلاصہ تفسیر

اور نوح (علیہ السلام) کے طریقہ والوں میں سے یعنی ان لوگوں میں سے جو اصولی عقائد میں نوح (علیہ السلام) کے ساتھ متفق تھے، ابراہیم بھی تھے (ان کا وہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے) جب کہ وہ اپنے رب کی طرف صاف دل سے متوجہ ہوئے (صاف دل کا مطلب یہ کہ ان کا دل بعقیدگی اور دکھلاوے کے جذبہ سے پاک تھا) جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے (جو بت بہت تھی) فرمایا کہ تم کس (واہیات) چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ کیا جھوٹ موٹ کے معبودوں کو اللہ کے سوا (معبود بنانا) چاہتے ہو تو تمھارا رب العالمین کے ساتھ کیا خیال ہے، (یعنی تم نے جو اس کی عبادت ترک کر رکھی ہے تو کیا اس کے معبود ہونے میں کوئی شبہ ہو؟ یعنی اول تو ایسا نہ ہونا چاہیے اور اگر کوئی شبہ ہے تو اسے رفع کر لو۔ غرض یوں ہی بحث و مباحثہ ہوتا رہتا تھا، ایک بار کا واقعہ ہے کہ ان کا کوئی ہتھیار آیا، قوم نے اُن سے بھی درخواست کی کہ ہمارے میلہ میں چلو) سو ابراہیم (علیہ السلام) نے ستاروں کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا اور کہہ دیا کہ میں بیمار ہونے کو ہوں (اس لئے میلہ میں نہیں جاسکتا) غرض وہ لوگ (ان کا یہ عذر سن کر) اُن کو چھوڑ کر چلے گئے (کہ ناحق بیمار می میں ان کو اور ان کی وجہ سے اوروں کو تکلیف ہوگی) تو یہ (یعنی ابراہیم علیہ السلام) اُن کے بتوں میں جاگھسے اور دستہ زاء کے طور پر ان سے کہنے لگے کیا تم (یہ چڑھاؤ جو تمھارے سامنے رکھے ہیں) کھاتے نہیں ہو (اور) تم کو کیا ہوا تم بولتے بھی نہیں؟ پھر اُن پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے (اور کھلاڑی وغیرہ سے ان کو توڑ پھوڑ دیا) سو ان لوگوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ لوگ اُن کے پاس دوڑتے ہوئے (گھبرائے ہوئے غصہ میں) آئے اور گفتگو شروع ہوئی، ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم ان چیزوں کو پوجتے ہو جن کو خود اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو (تو جو تمھارا محتاج ہو وہ خدا کیا ہوگا؟) حالانکہ تم کو اور تمھاری بنائی ہوئی ان چیزوں کو (سب کو) اللہ ہی نے پیدا کیا ہے (سو عبادت اسی کی کرنا چاہئے) وہ لوگ (جب مناظرہ میں مغلوب ہوئے تو جھلا کر باہم) کہنے لگے کہ ابراہیم کے لئے ایک آتش خانہ تعمیر کرو (اور اس میں آگ دہکا کر) ان کو اس دہکتی آگ میں ڈال دو، غرض ان لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ بُرائی کرنی چاہی تھی (کہ یہ ہلاک ہو جائیں گے) سو ہم نے انہی کو نچا دکھایا (جس کا قصہ سورہ انبیاء میں گزر چکا ہے)۔



## معارف و مسائل

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کے بعد قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ کے دو واقعے ذکر کئے ہیں، دونوں واقعے ایسے ہیں جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض اللہ کے واسطے عظیم قربانیاں پیش کیں۔ ان میں سے پہلا واقعہ جو مذکورہ آیات میں بیان کیا گیا ہے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کا واقعہ ہے، اور اس کی تفصیلات سورۃ انبیاء میں گزر چکی ہیں، البتہ یہاں جس انداز میں اس کو بیان کیا گیا ہے اس میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

اِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَا جَبْرَ هِیْمَ، شِیعۃ عربی زبان میں اس گروہ یا جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد بنیادی نظریات اور طور طریق میں یکساں ہوں۔ اور یہاں ظاہر یہی ہے کہ شیعۃ کی ضمیر حضرت نوح علیہ السلام کی طرف راجع ہے، لہذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پیش رو نبی حضرت نوح علیہ السلام کے طریقے پر تھے، اور بنیادی اصول دین میں دونوں کا مکمل اتفاق تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کی شریعتیں بھی یکساں یا ملتی جلتی ہوں۔ واضح رہے کہ بعض تاریخی روایات کے مطابق حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان دو ہزار چھ سو پچیس سال کا وقفہ ہے، اور دونوں کے درمیان حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کے سوا کوئی اور نبی نہیں ہوا (اکشاف، ص ۳۸ ج ۲)۔

اِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ، اس کے ٹھیک لفظی معنی یہ ہیں: ”جبکہ وہ آئے اپنے پروردگار کے پاس صاف دل لے کر“ اور پروردگار کے پاس آنے سے مراد ہے، اللہ کی طرف رجوع کرنا، اس کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا۔ اس کے ساتھ ”صاف دل“ کی قید لگا کر اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اللہ کی کوئی عبادت اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک کہ عبادت کرنے والے کا دل غلط عقیدوں اور بُرے جذبات سے پاک نہ ہو، اگر غلط عقیدے کے ساتھ کوئی عبادت کی جائے تو خواہ عبادت گزار نے اس میں کتنی محنت اٹھائی ہو وہ قابل قبول نہیں۔ ابھی طرح اگر عبادت کرنے والے کا اصل مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے دکھلاوا ہو یا کوئی مادی منفعت ہو تو وہ عبادت قابل تعریف نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رجوع الی اللہ ان تمام ملاوٹوں سے پاک تھا۔

فَنَظَرَ نَظْرًا فِی السُّجُومِ فَقَالَ اِنِّیْ مُسْلِمٌ، ان آیتوں کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم ایک خاص دن میں تہوار منایا کرتی تھی، جب وہ دن آیا تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دعوت دی کہ آپ بھی ہمارے ساتھ جشن میں شرکت کے لئے چلیں

مقصود یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس جشن میں ہمارے ساتھ رہیں گے تو شاید ہمارے دین سے متاثر ہو جائیں، اور اپنے دین کی دعوت چھوڑ دیں۔ (درمنثور و ابن جریر وغیرہ) لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس موقع سے دوسرا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، آپ کا ارادہ یہ تھا کہ جب ساری قوم جشن منانے چلی جائے گی تو میں ان کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے بتوں کو توڑ ڈالوں گا، تاکہ یہ لوگ واپس آکر اپنے جھوٹے معبودوں کی بے بسی کا عملی نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، ہو سکتا ہے کہ اپنے بتوں کو بے بس دیکھ کر کسی کے دل میں ایمان پیدا ہو اور وہ شرک سے توبہ کر لے۔ اس غرض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے ساتھ جانے سے انکار فرما دیا، لیکن انکار کا طریقہ یا اختیار فرمایا کہ پہلے نگاہ بھر کر ستاروں کو دیکھا اور پھر کہا کہ ”میں بیمار ہوں“ قوم والوں نے آپ کو معذور سمجھ کر چھوڑ دیا اور جشن منانے چلے گئے۔

اس واقعے سے متعدد تفسیری اور فقہی مباحث متعلق ہیں، یہاں ان کا خلاصہ پیش خدمت ہو رہا ہے۔ سب سے پہلی بحث تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب ستاروں پر نگاہ ڈالنے کا مقصد دینے سے پہلے جو ستاروں پر نظر ڈالی، اس کا مقصد کیا تھا؟ بعض حضرات نے تو یہ فرمایا ہے کہ یہ محض ایک اتفاقی عمل تھا، کسی اہم بات کو سوچتے ہوئے انسان بعض اوقات بے اختیار آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے، جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تو آپ اس سوچ میں پڑ گئے کہ اس دعوت کو کس طرح ٹلاؤں؟ اسی سوچ کے عالم میں آپ نے بے اختیار ستاروں کی طرف دیکھا اور اس کے بعد جواب دیا۔ ستاروں پر نظر ڈالنے کی یہ تشریح بظاہر بے غبار معلوم ہوتی ہے، لیکن قرآن کریم کے اسلوب کے پیش نظر اسے درست کہنا مشکل ہے۔ اول تو اس لئے کہ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ واقعات کے صرف اہم اور ضروری جزاء کو بیان فرماتا ہے، اور غیر ضروری تفصیلات کو چھوڑ دیتا ہے، خود بھی آیتوں میں واقعے کے کئی اجزاء محذوف ہیں، یہاں تک کہ اس کا پورا پس منظر بھی بیان نہیں کیا گیا، اس لئے یہ باور کرنا ممکن نہیں کہ قرآن کریم نے واقعے کے پس منظر کو تو تطویل کے خیال سے چھوڑ دیا ہو اور ایک قطعی غیر خستہ کاری عمل جس کا واقعے سے دور دراز کا بھی تعلق نہ تھا اسے پوری ایک آیت میں بیان فرمایا ہو۔ دوسرے اگر ستاروں کو دیکھنے میں کوئی خاص حکمت پیش نظر نہیں تھی، بلکہ یہ ایک غیر خستہ کاری عمل تھا تو عربی زبان کے قواعد کی رو سے فَتَنَظَرَ لِنَظَرَةٍ اِلَى النُّجُومِ کہنا چاہئے تھا، نہ النُّجُومِ نہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ستاروں کو دیکھنے میں کوئی خاص مصلحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیش نظر تھی، اسی لئے قرآن کریم نے اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اب وہ



مصلحت کیا تھی؟ اس کے جواب میں اکثر مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم علم نجوم کی بڑی شیدائی تھی، اور ستاروں کو دیکھ دیکھ کر اپنے کاموں کا تعین کیا کرتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف دیکھ کر جو جواب دیا اس کا مقصد یہ تھا کہ قوم والے یہ سمجھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام — اپنی بیماری کے بارے میں جو کچھ فرما رہے ہیں وہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے، بلکہ ستاروں کے چلن پر غور کر کے کہہ رہے ہیں، اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بذات خود علم نجوم کے قائل نہ ہوں، لیکن جشن کی شرکت سے اپنی گلو خدائی کے لئے آپ نے طریقہ اختیار فرمایا جو ان کی نظر میں زیادہ قابل اعتماد ہو، اور چونکہ آپ نے زبان سے علم نجوم کا کوئی حوالہ نہیں دیا، نہ یہ بتایا کہ ستاروں کو دیکھنے سے میرا مقصد علم نجوم سے مدد لینا ہے، بلکہ صرف نظر بھر کر ستاروں کو دیکھا، اس لئے اس میں جھوٹ کا بھی کوئی پہلو نہیں ہوا۔ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل سے ان کافروں کی ہمت افزائی ہوتی ہوگی جو نہ صرف علم نجوم کے قائل تھے، بلکہ ستاروں کو دنیا کے واقعات میں مؤثر حقیقی مانتے تھے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ہمت افزائی تو تب ہوتی جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بعد میں انھیں صراحت کے ساتھ ان کی گمراہیوں پر متنبہ نہ فرماتے، یہاں تو یہ ساری تدبیر کی ہی اس لئے جاری تھی کہ انھیں توحید کی دعوت زیادہ سے زیادہ مؤثر بنا کر دی جائے، چنانچہ تھوڑے ہی وقفہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کی ایک ایک گمراہی کو کھول کھول کر بیان فرمادیا، اس لئے محض اس مبہم عمل سے کافروں کی ہمت افزائی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں اصل مقصد جشن کی شرکت سے اپنی جان چھڑانا تھا، تاکہ دعوت حق کے لئے زیادہ مؤثر فضا پیدا کی جاسکے، اس مقصد کے لئے ایہام کا یہ طریقہ عین حکمت پر مبنی ہے، اور اس پر کوئی معقول اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

ستاروں کی طرف دیکھنے کی یہ تشریح اکثر مفسرین سے منقول ہے، اور حکیم الامت حضرت محمد نوریؒ نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

علم نجوم کی شرعی حیثیت | اس آیت کے تحت دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ علم نجوم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہاں اختصار کے ساتھ اس سوال کا جواب عرض کیا جاتا ہے۔

یہ تو ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاند، سورج اور ستاروں میں کچھ ایسی خاصیتیں رکھی ہیں جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں، ان میں سے بعض خاصیتیں ایسی ہیں جن کا ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے، مثلاً سورج کے قریب و بعد سے گرمی اور سردی کا پیدا ہونا، چاند کے آثار چڑھاؤ سے سمندر میں مد و جزر وغیرہ، اب بعض حضرات کا

کہنا تو یہ ہے کہ ان ستاروں کی خصوصیات صرف اتنی ہی ہیں جتنی عام مشاہدہ سے معلوم ہوتی ہیں اور بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ان کے علاوہ بھی ستاروں کی گردش کے کچھ ایسے خواص ہوتے ہیں جو انسان کی زندگی کے اکثر معاملات پر اثر ڈالتے ہیں۔ ایک انسان کے لئے کسی ستارے کا کسی خاص برج میں چلے جانا مسرتوں اور کامیابیوں کا سبب بنتا ہے اور کسی کے لئے غموں اور ناکامیوں کا، پھر بعض لوگ تو ان ستاروں ہی کو کامیابیوں اور ناکامیوں کے معاملہ میں مؤثر حقیقی مانتے ہیں، اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مؤثر حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر اس نے ستاروں کو ایسے خواص عطا کر دیئے ہیں، اس لئے دنیا کے دوسرے اسباب کی طرح وہ بھی انسان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ایک سبب ہوتے ہیں۔

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو ستاروں کو مؤثر حقیقی مانتے ہیں، یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے انقلابات اور واقعات ستاروں ہی کے رہیں منت ہیں، ستارے ہی دنیا کے تمام واقعات کے فیصلے کرتے ہیں، تو بلاشبہ ان کا خیال غلط اور باطل ہے، اور یہ عقیدہ انسان کو شرک کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ اہل عرب بارش کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک خاص ستارہ (جسے "نور" کہا جاتا تھا) بارش لے کر آتا ہے، اور وہ بارش کے لئے مؤثر حقیقی کی حیثیت رکھتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عقیدے کی سخت تردید فرمائی ہے، جن کی تصریح احادیث میں موجود ہے۔ رہے وہ لوگ جو دنیوی واقعات میں مؤثر حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ اللہ نے ستاروں کو ایسے خواص عطا فرمائے ہیں جو سبب کے درجہ میں انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، جس طرح بارش برسائے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن اس کا ظاہری سبب بادل ہیں، اسی طرح تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کا اصل سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی ہے، لیکن یہ ستارے ان کامیابیوں اور ناکامیوں کا سبب بن جاتے ہیں، سو یہ خیال شرک نہیں ہے، اور قرآن و حدیث سے اس خیال کی نہ تصدیق ہوتی ہے نہ تردید۔ لہذا یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کی گردش اور ان کے طلوع و غروب میں کچھ ایسے اثرات رکھے ہوں، لیکن ان اثرات کی جستجو کرنے کے لئے علم نجوم کی تحصیل، اس علم پر اعتماد اور اس کی بنا پر مستقبل کے بارے میں فیصلے کرنا بہر حال ممنوع اور ناجائز ہے، اور احادیث میں اس کی ممانعت آتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

جَبْ تَقْدِيرَ كَاذِرٍ جَهْرًا تَوْرِكَ جَاءَ، لَعْنِي  
اس میں زیادہ غور و خوض اور بحث مباحثہ  
نہ کرو، اور جب ستاروں کا ذکر چھڑے تو

إِذَا ذُكِرَ الْقَدَرُ فَأَمْسِكُوا وَإِذَا  
ذُكِرَتِ النُّجُومُ فَأَمْسِكُوا وَإِذَا  
ذُكِرَ أَصْحَابِي فَأَمْسِكُوا اخْتِجِمِ



رُک جاؤ اور جب میرے صحابہؓ کا دلچسپی  
اُن کے باہمی اختلافات وغیرہ کا ذکر چھڑا  
تو رُک جاؤ۔

احیاء العلوم للعراقی بحوالہ طبوبانی  
وہوحن بیت حسنہ العراقی

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:  
تَعْلَمُوا مِنْ النُّجُومِ مَا تَقْدِرُونَ  
بِهِ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَعْلَمُوا  
داہیاء علوم الدین للنضالی

ستاروں کے علم سے اتنا علم حاصل کرو  
جس کے ذریعہ تم خشکی اور سمندر میں راستے  
جان سکو اس کے بعد رُک جاؤ۔

اس ممانعت سے ستاروں کے خواص و آثار کا انکار لازم نہیں آتا، لیکن ان خواص و آثار  
کے پیچھے پڑنے۔ اور ان کی جستجو میں قیمتی اوقات برباد کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ امام غزالیؒ نے  
احیاء العلوم میں اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس ممانعت کی متعدد حکمتیں بتائی ہیں۔  
علم نجوم کے ممنوع و مذموم ہونے کی پہلی حکمت تو یہ ہے کہ جب اس علم میں انسان کا  
اہتمام بڑھتا ہے تو تجربہ یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ستاروں ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے، اذریہ چیز  
اسے کشاں کشاں ستاروں کے موثر حقیقی ہونے کے مشرکانہ عقیدے کی طرف لے جاتی ہے۔  
دوسری حکمت یہ ہے کہ اگر ستاروں میں اللہ تعالیٰ نے کچھ خواص و آثار رکھے بھی ہوں  
تو ان کے یقینی علم کا ہمارے پاس سوائے وحی کے کوئی راستہ نہیں ہے، حضرت ادریس  
علیہ السلام کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے اس قسم کا کوئی علم عطا فرمایا تھا  
لیکن اب وہ علم جس کی بنیاد وحی الہی پر تھی، دنیا سے مٹ چکا ہے، اب علم نجوم کے ماہرین کے  
پاس جو کچھ ہے وہ محض قیاسات، اندازے اور تخمینے ہیں، جن سے کوئی یقینی علم حاصل نہیں کیا جاسکتا  
یہی وجہ ہے کہ نجومیوں کی بے شمار پیشینگوئیاں آسے دن غلط ثابت ہوتی رہتی ہیں، کسی نے اس علم  
کے بارے میں بہترین تبصرہ کیا ہے کہ:

”یعنی اس علم کا جتنا حصہ مفید ہو سکتا ہو  
وہ کسی کو معلوم نہیں اور جتنا لوگوں کو  
معلوم ہو وہ فائدہ مند نہیں۔“

مفید کا غیر معلوم و معلومہ  
غیر مفید

علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں تاریخی واقعات کی ایسی متعدد مثالیں پیش کی ہیں جن میں  
علم نجوم کے مسلمہ قواعد کے تحت ایک واقعہ جس طرح پیش آنا چاہئے تھا حقیقت میں اس کے بالکل  
برعکس پیش آیا، چنانچہ جن بڑے بڑے لوگوں نے اس علم کی تحصیل میں اپنی عمریں کھپائی ہیں وہ آخر  
میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اس علم کا انجام قیاس و تخمین سے آگے کچھ نہیں۔ ایک مشہور منتخب

کو شیار دہلی نے علم نجوم پر اپنی کتاب المجل فی الاحکام میں لکھا ہے :

”علم نجوم ایک غیر مدلل علم ہے، اور اس میں انسان کے دوسوسوں اور گناؤں کے لئے بڑی گنجائش ہے“ (روح المعانی، ص ۱۱۶ ج ۲۳)

علامہ آلوسیؒ نے اور بھی متعدد علماء نجوم کے اسی قسم کے اقوال نقل فرمائے ہیں، بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ علم نجوم کوئی یقینی علم نہیں ہے، اور اس میں غلطیوں کے بے حساب احتمالات ہوتے ہیں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس علم کی تحصیل میں لگتے ہیں وہ اسے بالکل قطعی اور یقینی علم کا درجہ دے بیٹھتے ہیں، اسی کی بناء پر مستقبل کے فیصلے کرتے ہیں، اسی کی وجہ سے دوسروں کے بارے میں اچھی بُری رائیں قائم کر لیتے ہیں، اور سب بڑھ کر یہ کہ اس علم کا جھوٹا پندار بعض اوقات انسان کو علم غیب کے دعووں تک پہنچا دیتا ہے، اور ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر چیز بے شمار مفسد پیدا کرنے والی ہے۔

علم نجوم کی ممانعت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ عمر و غیر عمر کو ایک بے فائدہ کام میں صرف کرنے کے مرادف ہے، جب اس سے کوئی نتیجہ یقینی طور پر حاصل نہیں کیا جاسکتا تو ظاہر ہے کہ دنیا کے کاموں میں یہ علم چنداں مددگار نہیں ہو سکتا۔ اب خواہ خواہ ایک بے فائدہ چیز کے پیچھے پڑنا اسلامی شریعت کی روح اور مزاج کے بالکل خلاف ہے، اس لئے اس کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام | اس آیت سے متعلق تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیماری کا مطلب نے اپنی قوم کی دعوت کے جواب میں جو اپنی ”سقیم“ (میں بیمار ہوں) فرمایا تو کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت واقعی بیمار تھے؟ قرآن کریم میں اس سے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے، لیکن صحیح بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس وقت ایسے بیمار نہیں تھے کہ قوم کے ساتھ نہ جاسکیں، اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات کیسے ارشاد فرمائی؟

اس کا جواب جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ”تور یہ کیا تھا“ ”تور یہ“ کا مطلب ہے ”کوئی ایسی بات کہنا جو بظاہر واقعہ کے خلاف ہو، لیکن کہنے والے نے اس سے کوئی ایسے دُور کے معنی مراد لئے ہوں جو واقعہ کے مطابق ہوں“ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو جملہ ارشاد فرمایا اس کا ظاہر ہی مفہوم تو یہی ہے کہ ”میں اس وقت بیمار ہوں“ لیکن آپ کی اصل مراد یہ نہیں تھی۔ اب اصل مراد کیا تھی؟ اس کے بارے میں مفسرین نے مختلف رائیں ظاہر کی ہیں، بعض نے فرمایا کہ اس سے آپ کا مقصد وہ طبعی انقباض تھا جو آپ کو اپنی قوم کی مشرکانہ حرکات دیکھ کر پیدا



ہو رہا تھا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہاں ”سقیم“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو ”مریض“ کے مقابلہ میں بہت ہلکا لفظ ہے، اور اس کا مفہوم اردو میں اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ ”میری طبیعت ناساز ہے“ ظاہر ہے کہ اس جملہ میں طبعی انقباض کے مفہوم کی بھی پوری گنجائش پائی جاتی ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ”إِنِّي سَقِيمٌ“ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ میں بیمار ہونے والا ہوں“ اس لئے کہ عربی زبان میں اسم فاعل کا صیغہ بکثرت زمانہ مستقبل کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا: ”إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ“ اس کے ظاہری الفاظ کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ”تم بھی مُردہ ہو اور وہ بھی مُردہ ہیں“ لیکن ظاہر ہے کہ یہاں مراد یہ معنی ہیں کہ ”تم بھی مرنے والے ہو اور وہ بھی مرنے والے ہیں“ اسی طرح ”إِنِّي سَقِيمٌ“ کے معنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ مراد لئے تھے کہ میں بیمار ہونے والا ہوں“ اور یہ اس لئے فرمایا کہ موت سے پہلے پہلے ہر انسان کا بیمار ہونا یا نہ امر ہے، اگر کسی کو ظاہری بیماری نہ ہو تب بھی موت سے ذرا پہلے انسان کے مزاج میں خلل کا واقع ہونا ناگزیر ہے۔

اور اگر کسی کا دل ان تاویلات پر مطمئن نہ ہو تو سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طبیعت اُس وقت واقعہً تھوڑی بہت ناساز تھی، لیکن بیماری ایسی نہ تھی جو جشن میں شرکت سے مانع ہوتی، آپ نے اپنی معمولی ناسازی طبع کا ذکر ایسے ماحول میں کیا جس سے سننے والے یہ سمجھے کہ آپ کو کوئی بڑی بیماری لاحق ہے، جس کی وجہ سے آپ واقعی ہمارے ساتھ نہیں جاسکتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توریہ کی یہ تشریح سب سے زیادہ معقول اور اطمینان بخش ہے۔

اس تشریح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد ”إِنِّي سَقِيمٌ“ کے لئے جو ”کذبہ“ (جھوٹ) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے مراد ”توریہ“ ہے جس کی ظاہری شکل جھوٹ ہوتی ہے، لیکن متکلم کی مراد کے لحاظ سے وہ جھوٹ نہیں ہوتا، خود اسی حدیث کی بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

”أَنْ يَمُوتَ مِنْ سَقَمٍ أَوْ مِنْ جُوعٍ“

جو اللہ کے دین کی مدافعت اور حمایت

میں نہ بولا گیا ہو“

مَا مِنْهَا كَذِبٌ إِلَّا مَا حَلَّ بِهَا

عَنْ رِئِيسِ الدِّينِ

ان الفاظ نے خود یہ واضح کر دیا ہے کہ یہاں ”کذب“ اپنے عام معنی سے جدا مفہوم رکھتا ہے، اس حدیث سے متعلق قدرے تفصیلی بحث سورۃ انبیاء میں آیت قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ کے تحت

گزر چکی ہے۔

تَوْرِيۃ کا شرعی حکم | انہی آیات سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ ضرورت کے مواقع پر تَوْرِيۃ کرنا جائز ہے تَوْرِيۃ ایک تو قوی ہوتا ہے، یعنی ایسی بات کہنا جس کا ظاہری مفہوم خلاف واقعہ ہو، اور باطنی مراد مطابق واقعہ۔ اور ایک تَوْرِيۃ عملی ہوتا ہے، یعنی ایسا عمل کرنا جس کا مقصد دیکھنے والا کچھ سمجھے اور درحقیقت اس کا مقصد کچھ اور ہو، اسے اِیہَام بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کو دیکھنا (اکثر مفسرین کے قول کے مطابق) اِیہَام تھا، اور اپنے آپ کو بیچارہ کہنا تَوْرِيۃ۔

ضرورت کے مواقع پر تَوْرِيۃ کی یہ دونوں قسمیں خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، جس وقت آپ ہجرت کے لئے تشریف لیجائے تھے، اور مشرکین آپ کی تلاش میں لگے ہوئے تھے، تو راستے میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا، کہ ”یہ کون ہیں؟“ حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا، ”هُوَ هَٰذَا يَحْيٰى بَنِي“ (وہ میرے رہنما ہیں، مجھے رستہ دکھاتے ہیں، سننے والا یہ سمجھا کہ عام رستہ بتانے والے رہنما مراد ہیں، اس کو چھوڑ کر چل دیا، حالانکہ حضرت ابوبکرؓ کا مقصد یہ تھا کہ آپ دینی اور روحانی رہنما ہیں (روح المعانی) اسی طرح حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کے لئے جس سمت میں جانا ہوتا مدینہ طیبہ سے نکلتے وقت اس سمت میں روانہ ہونے کے بجائے کسی دوسری سمت میں چلنا شروع فرماتے تھے، تاکہ دیکھنے والوں کو صحیح منزل معلوم نہ ہو سکے (صحیح مسلم وغیرہ) یہ عملی تَوْرِيۃ اور اِیہَام تھا۔

مزاح اور خوش طبعی کے مواقع پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تَوْرِيۃ ثابت ہے؛ شامی ترمذیؒ میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھی عورت سے مزاحاً فرمایا ”کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہیں جاتے گی“ وہ عورت یہ سن کر بہت پریشان ہوئی تو آپؐ نے تشریح فرمائی کہ بوڑھیوں کے جنت میں نہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں نہ جائیں گی ہاں جوان ہو کر جائیں گی۔

اس کے بعد کی آیات کا مفہوم خلاصہ تفسیر سے واضح ہے، اور واقعہ کی تفصیلات سورۃ انبیاء میں گزر چکی ہیں۔

وَقَالَ اِنِّیْ ذٰہِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَرْہِدُنِیْ ۙ (۹۹) رَبِّ هَبْ لِّیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝

اور بولا میں جاتا ہوں اپنے رب کی طرف وہ مجھ کو راہ دے گا۔ اے رب بخش مجھ کو کوئی نیک بیٹا۔



فَبَشِّرْنَاهُ بِخَلْمٍ حَلِيمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَبْنَئُ إِنِّي أَرَىٰ

پھر خوشخبری دی ہم نے اس کو ایک لڑکے کی جو ہوگا تحمل والا۔ پھر جب بچپن اس کے ساتھ ڈرنے کو کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں

فِي السَّانِمِ إِنِّي أَذْهَبُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۝ قَالَ يَاقَبْتُ أَفْعَلَ مَا

خواب میں کہ تجھ کو ذبح کرتا ہوں پھر دیکھ تو تو کیا دیکھتا ہے بولا اے باپ کر ڈال جو تجھ کو حکم ہوتا ہے

تَوَعَّدُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ۝ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ

تو مجھ کو پائے گا اگر اللہ نے چاہا ہمارے والا۔ پھر جب دونوں نے حکم مانا اور پھیلا ڈالا

لِلْجَبِينِ ۝ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّعْيَا ۝ إِنَّا

اس کو ماتھے کے بل۔ اور ہم نے اس کو پکارا یوں کہ اے ابراہیم، تو نے سچ کر دکھایا خواب ہم یوں

كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ۝

دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو، بیشک یہی ہے صریح جانچنا۔

وَفَدَيْنَاهُ بِذَبْحٍ عَظِيمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝

اور اس کا بدلہ دیا ہم نے ایک جانور ذبح کرنے کے واسطے بڑا، اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں،

سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝ كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ

کہ سلام ہے ابراہیم پر۔ ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو، وہ ہی ہمارے

مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَبَشِّرْنَاهُ بِأَسْحَاقَ نَبِيًّا مِنْ الصَّالِحِينَ ۝

ایمان دار بندوں میں، اور خوشخبری دی ہم نے اس کو اسحق کی جو نبی ہوگا نیک بختوں میں۔

وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ ۝ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ

اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحق پر اور دونوں کی اولاد میں نیکی دے دیں اور بدکار بھی اپنی حق میں

مُيَسِّرٌ ۝

صریح

## خلاصہ تفسیر

اور ابراہیم رعلیہ السلام جب ان لوگوں کے ایمان سے مایوس ہو گئے تو کہنے لگے کہ میں تو

(تم سے ہجرت کر کے) اپنے رب کی (راہ میں کسی) طرف چلا جاتا ہوں، وہ مجھ کو (اچھی جگہ) پہنچا ہی دینگا، (چنانچہ ملک شام میں جا پہنچے، اور یہ دعا کی کہ) اے میرے رب مجھ کو ایک نیک فرزند دے، سو ہم نے ان کو ایک حلیم المزاج فرزند کی بشارت دی (اور وہ فرزند پیدا ہوا اور ہمشیار ہوا) سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ چلنے پھرنے لگا، تو ابراہیم (علیہ السلام) نے (ایک خواب دیکھا کہ میں اس فرزند کو خدا کے حکم سے ذبح کر رہا ہوں، اور یہ ثابت نہیں کہ حلقوم کٹا ہوا بھی دیکھا یا نہیں، غرض آنکھ کھلی تو اسے اللہ کا حکم سمجھ، کیونکہ انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے اور اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے۔ پھر یہ سوچ کر کہ خدا جانے میرے فرزند کی اس بارے میں کیا رائے ہو، اس کو اطلاع کرنا ضروری سمجھا، اس لئے اس سے) فرمایا کہ بر خوردار میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو (بامرا کی) ذبح کر رہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو تمھاری کیا رائے ہے؟ وہ بولے ابا جان (اس میں مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے، جب آپ کو خدا کی طرف سے حکم کیا گیا ہے تو) آپ کو جو حکم ہوا ہو آپ (بلاتامل) سمجھئے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو سہارا کرنے والوں میں سے دیکھیں گے، غرض جب دونوں نے (خدا کے حکم کو) تسلیم کر لیا، اور باپ نے بیٹے کو (ذبح کرنے کے لئے) گردن پر لٹایا اور (چاہتے تھے کہ گلا کاٹ ڈالیں اور اس وقت) ہم نے ان کو آواز دی کہ ابراہیم (شباباش ہو) تم نے خواب کو خوب سچ کر دکھایا (یعنی خواب میں جو حکم ہوا تھا اپنی طرف سے اس پر پورا عمل کیا اب ہم اس حکم کو منسوخ کرتے ہیں بس ان کو چھوڑ دو، غرض ان کو چھوڑ دیا، جان کی جان بچ گئی، اور بلند درجات (زید برآں عطا ہوئے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں کہ دونوں جہاں کی راحت انھیں عطا کرتے ہیں) حقیقت میں یہ تھا بھی بڑا امتحان (جس کو بجز مخلص کامل کے دوسرا برداشت نہیں کر سکتا تو ہم نے ایسے امتحان میں پورا اترنے پر صلہ بھی بڑا بھاری دیا، اور اس میں جیسا امتحان ابراہیم علیہ السلام کا تھا، اسی طرح اسمعیل علیہ السلام کا بھی تھا، تو وہ صلہ میں شریک ہوں گے) اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا، (کہ ابراہیم علیہ السلام سے وہ ذبح کرایا گیا) اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لئے رہنے دی کہ ابراہیم پر سلام ہو (چنانچہ ان کے نام کے ساتھ اب تک "علیہ السلام" کہا جا رہا ہے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، (کہ انہیں لوگوں کی دعاؤں اور سلامتی کی بشارتوں کا مرکز بنا دیتے ہیں) بیشک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھے اور ہم نے (ایک انعام اُن پر یہ کیا کہ) ان کو اسحاقؑ کی بشارت دی کہ نبی اور نیک بختوں میں ہوں گے اور ہم نے ابراہیمؑ پر اور اسحقؑ پر برکتیں نازل کیں (ان برکتوں میں سے ایک یہ کہ انکی نسل بہت پھیلی اور اس نسل میں کثرت سے انبیاء پیدا ہوئے) اور (پھر آگے) ان دونوں کی نسل میں بعض اچھے بھی ہیں اور بعض ایسے بھی جو بدیاں کر کے، صریح اپنا نقصان کر رہے ہیں۔





میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تین روز متواتر دکھایا گیا قرطبی، اور یہ بات طے شدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے، اس لئے اس خواب کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا ہے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر دو۔ یوں یہ حکم براہ راست کسی فرشتے وغیرہ کے ذریعہ بھی نازل کیا جاسکتا تھا، لیکن خواب میں دکھانے کی حکمت بظاہر یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت شعاری اپنے کمال کے ساتھ ظاہر ہو، خواب کے ذریعہ دیتے ہوئے حکم میں انسانی نفس کے لئے تادیلات کی بڑی گنجائش تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تادیلات کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اللہ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا (تفسیر کبیر)

اس کے علاوہ یہاں باری تعالیٰ کا اصل مقصد نہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کو ذبح کرنا تھا، نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دینا کہ انھیں ذبح کر ہی ڈالو، بلکہ منشاء یہ حکم دینا تھا کہ اپنی طرف سے انھیں ذبح کرنے کے سارے سامان کر کے ان کے ذبح کا اقدام کر گزرو۔ اب یہ حکم اگر زبانی دیا جاتا تو اس میں آزمائش نہ ہوتی، اس لئے انہیں خواب میں دکھلایا کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں، اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھے کہ ذبح کا حکم ہوا ہے، اور وہ پوری طرح ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے، اس طرح آزمائش بھی پوری ہو گئی، اور خواب بھی سچا ہو گیا، یہ بات زبانی حکم کے ذریعہ آتی تو یا آزمائش نہ ہوتی، یا حکم کو بعد میں منسوخ کرنا پڑتا۔ یہ امتحان کس قدر سخت تھا؟ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہاں اللہ تعالیٰ نے فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ کے الفاظ پڑھائے ہیں، یعنی ارمانوں سے مانگے ہوئے اس بیٹے کو قربان کرنے کا حکم اس وقت دیا گیا تھا جب یہ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا، اور پرورش کی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد اب وقت آیا تھا کہ وہ قوت بازو بن کر باپ کا سہارا ثابت ہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت اسمعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ بالغ ہو چکے تھے (تفسیر مظہری)

فَانْظُرْ مَاذَا تَأْتِي (سو تم بھی سوچ لو کہ تمھاری کیا رائے ہے؟) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات حضرت اسمعیل علیہ السلام سے اس لئے نہیں پوچھی کہ آپ کو حکم الہی کی تعمیل میں کوئی تردد تھا، بلکہ ایک تو وہ اپنے بیٹے کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ وہ اس آزمائش میں کس حد تک پورا اترتا ہے؟ دوسرے انبیاء علیہم السلام کا طرز ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ احکام الہی کی اطاعت کے لئے تو ہر وقت تیار رہتے ہیں، لیکن اطاعت کے لئے ہمیشہ رستہ وہ اختیار کرتے ہیں جو حکمت اور وحی المقدور سے ہولست پر مبنی ہو۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے سے کچھ کہے بغیر



بیٹے کو ذبح کرنے لگتے، تو یہ دونوں کے لئے مشکل کا سبب ہوتا، اب یہ بات آپ نے مشورہ کے انداز میں بیٹے سے اس لئے ذکر کی کہ بیٹے کو پہلے سے اللہ کا یہ حکم معلوم ہو جائے گا تو وہ ذبح ہونے کی اذیت سہنے کے لئے پہلے سے تیار ہو سکے گا، نیز اگر بیٹے کے دل میں کچھ تذبذب ہوا بھی تو اسے سمجھایا جاسکے گا۔ (روح المعانی و بیان القرآن) لیکن وہ بیٹا بھی اللہ کے خلیل کا بیٹا تھا اور اسے خود منصب رسالت پر فائز ہونا تھا، اس نے جواب میں کہا:

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (ابا جان جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اُسے کر گزریے)۔ اس سے حضرت اسمعیل علیہ السلام کے بے مثال جذبہ جاں سپاری کی تو شہادت ملتی ہی ہے اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم سنی ہی میں اللہ نے انہیں کیسی دہانت اور کیسا علم عطا فرمایا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن کے سامنے اللہ کے کسی حکم کا حوالہ نہیں دیا تھا، بلکہ محض ایک خواب کا تذکرہ فرمایا تھا، لیکن حضرت اسمعیل علیہ السلام سمجھ گئے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے، اور یہ خواب بھی درحقیقت حکم الہی کی ہی ایک شکل ہے، چنانچہ انھوں نے جواب میں خواب کے بجائے حکم الہی کا تذکرہ فرمایا۔

وحی غیر متلو کا ثبوت | یہیں سے ان منکرین حدیث کی واضح تردید ہو جاتی ہے جو وحی غیر متلو کے وجود کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ وحی صرف وہ ہے جو آسمانی کتاب میں نازل ہو گئی، اس کے علاوہ وحی کی کوئی دوسری قسم موجود نہیں ہو۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم خواب کے ذریعہ دیا گیا، اور حضرت اسمعیل علیہ السلام نے صریح الفاظ میں اسے اللہ کا حکم قرار دیا، اگر وحی غیر متلو کوئی چیز نہیں ہے تو یہ حکم کونسی آسمانی کتاب میں اُترا تھا؟ حضرت اسمعیل علیہ السلام نے اپنی طرف سے اپنے والد بزرگوار کو یہ یقین بھی دلایا کہ:-

سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ، (انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے) اس جملے میں حضرت اسمعیل علیہ السلام کی غایت ادب اور غایت تواضع کو دیکھئے۔ ایک تو اِنْ شَاءَ اللَّهُ کہہ کر معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا اور اس وعدے میں دعوے کی جو ظاہری صورت پیدا ہو سکتی تھی اسے ختم فرما دیا۔ دوسرے آپ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ ”آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے“ لیکن اس کے بجائے آپ نے فرمایا کہ ”آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے“ جس سے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ صبر و ضبط تنہا میرا کمال نہیں ہے بلکہ دنیا میں اور بھی بہت سے صبر کرنے والے ہوتے ہیں، انشاء اللہ میں بھی اُن میں شامل ہو جاؤں گا۔ اس طرح آپ نے اس جملے میں فخر و تکبر، خود پسندی اور پندار کے ہر ادنیٰ شاہے کو ختم کر کے اس میں انتہا درجے کی تواضع اور انکسار کا اظہار فرما دیا (روح المعانی) اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو

کسی معاملے میں اپنے اوپر خواہ کتنا ہی اعتماد ہو، لیکن اُسے ایسے بلند بانگ دعوے نہیں کرنے چاہئیں جن سے غرور و تکبر ٹپکتا ہو، اگر کہیں ایسی کوئی بات کہنے کی ضرورت ہو تو الفاظ میں اس کی رعایت ہونی چاہئے کہ ان میں اپنے بجائے اللہ پر بھروسہ کا اظہار ہو، اور جس حد تک ممکن ہو تواضع کے دامن کو نہ چھوڑا جائے۔

فَلَمَّا أَتَيْنَا رُلْسَ جَبَّ وَهُوَ دُونَ جُحْكَ گئے، اَسْلَمَ کے معنی ہیں جھک جانا، مطیع ہو جانا، رام ہو جانا۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ اللہ کے حکم کے آگے جھک گئے، یعنی باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کا اور بیٹے نے ذبح ہو جانے کا ارادہ کر لیا، یہاں کَمَّا (جب) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن اس کا جواب مذکور نہیں ہے، یعنی آگے یہ نہیں بتایا گیا کہ جب یہ واقعات پیش آچکے تو کیا ہوا؟ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باپ بیٹے کا یہ اقدام فداکاری اس قدر عجیب و غریب تھا کہ الفاظ اس کی پوری کیفیت کو بیان کر ہی نہیں سکتے۔

بعض تاریخی اور تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے تین مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہکانی کوشش کی، ہر بار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے سات کنکریاں مار کر بھگا دیا۔ آج تک منی کے تین حجرات پر اسی محبوب عمل کی یاد کنکریاں مار کر منائی جاتی ہے، بالآخر جب دونوں باپ بیٹے یہ انوکھی عبادت انجام دینے کے لئے قربان گاہ پر پہنچے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان مجھے خوب اچھی طرح باندھ دیجئے تاکہ میں زیادہ تڑپ نہ سکوں، اور اپنے کپڑوں کو بھی مجھ سے بچائے، ایسا نہ ہو کہ ان پر میرے خون کی چھینٹیں پڑیں، تو میرا ثواب گھٹ جائے، اس کے علاوہ میری والدہ خون دیکھیں گی تو انھیں غم زیادہ ہوگا، اور اپنی چھری بھی تیز کر لیجئے، اور اسے میرے حلق پر ذرا جلدی جلدی پھیرے گا، تاکہ آسانی سے میرا دم نکل سکے، کیونکہ موت بڑی سخت چیز ہے، اور جب آپ میری والدہ کے پاس جائیں تو ان سے میرا سلام کہہ دیجئے گا، اور اگر آپ میرا قیص والدہ کے پاس لے جانا چاہیں تو لے جائیں، شاید اس سے انہیں کچھ تسلی ہو۔ اکلوتے بیٹے کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ایک باپ کے دل پر کیا گزر سکتی ہے؟ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام استقامت کے پہاڑ بن کر جواب یہ دیتے ہیں کہ بیٹے! تم اللہ کا حکم پورا کرنے کے لئے میرے کتنے اچھے مددگار ہو، یہ کہہ کر انھوں نے بیٹے کو بوسہ دیا، پر خنم آنکھوں سے انھیں باندھا۔ (منظری) اور ۱۔

وَلَمَّا لَبِثَ لَيْلَتَيْنِ (انھیں پیشانی کے بل خاک پر ٹٹا دیا) حضرت ابن عباسؓ سے اس کا مطلب یہ منقول ہے کہ انھیں اس طرح کر دٹ پر ٹٹا دیا کہ پیشانی کا ایک کنارہ زمین چھونے لگا (منظری) لغت کے اعتبار سے یہ تفسیر راجح ہے۔ اس لئے کہ جَبَّ عَنِ زَبَانِ میں پیشانی کی



دو دنوں کر دلوں کو کہتے ہیں، اور پیشانی کا درمیانی حصہ جبّہ کہلاتا ہے۔ اسی لئے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ کر دٹ پر لٹانے سے کیا ہی، لیکن بعض دوسرے حضرات مفسرین نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اوندھے منہ زمین پر لٹا دیا۔ بہر صورت تاریخی روایات میں اس طرح لٹانے کی جو یہ بیان کی گئی ہے کہ شروع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں سیدھا لٹایا تھا، لیکن جب چھری چلانے لگے تو بار بار چلانے کے باوجود گلا کٹتا نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے پتل کا ایک ٹکڑا بچ میں حائل کر دیا تھا، اس موقع پر بیٹے نے خود یہ فرمائش کی کہ ابا جان! مجھے چہرے کے بل کر دٹ سے لٹا دیجئے، اس لئے کہ جب آپ کو میرا چہرہ نظر آتا ہے تو شفقتِ پدری جوش مارنے لگتی ہے، اور گلا پوری طرح کٹ نہیں پاتا، اس کے علاوہ چھری مجھے نظر آتی ہے تو مجھے بھی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اسی طرح لٹا کر چھری چلانی شروع کی (تفسیر منطری وغیرہ) واللہ اعلم

وَقَالَ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءُوسَا، (ابراہیم نے انھیں آواز دی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا) یعنی اللہ کے حکم کی تعمیل میں جو کام تمھارے کرنے کا تھا اس میں تم نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ (خواب میں بھی غالباً صرف یہی دکھایا گیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انھیں ذبح کرنے کے لئے چھری چلا رہے ہیں) اب یہ آزمائش پوری ہو چکی اس لئے اب انہیں چھوڑ دو۔

اِنَّا كُنَّا لَكَ ذٰلِكَ جَزٰى الْمُحْسِنِيْنَ، (ابراہیم کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں) یعنی جب کوئی اللہ کا بندہ اللہ کے حکم کے آگے تسلیمِ خم کر کے اپنے تمام جذبات کو قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تو ہم بالآخر اسے دنیوی تکلیف سے بھی بچا لیتے ہیں، اور آخرت کا اجر و ثواب بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھ دیتے ہیں۔

وَقَدْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ بَيْنَ يَدَيْكَ عَظِيْمٌ، (ابراہیم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا) روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ آسمانی آواز سن کر اُدپر کی طرف دیکھا تو حضرت جبریل علیہ السلام ایک مینڈھا لے کھڑے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی مینڈھا تھا جس کی قربانی حضرت آدم علیہ السلام کے صاحبزادے ہابیلؑ نے پیش کی تھی۔ واللہ اعلم بہر حال یہ حقیقی مینڈھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوا، اور انھوں نے اللہ کے حکم سے اپنے بیٹے کے بجائے اس کو قربان کیا۔ اس ذبیحہ کو عظیم اس لئے کہا گیا کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا تھا اور اس کی قربانی کے مقبول ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر منطری وغیرہ)

ذبح حضرت اسماعیلؑ اور آیات کی تفسیر تسلیم کرتے ہوئے کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو  
تھی یا حضرت اسحقؑ جس بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے،

لیکن درحقیقت اس معاملہ میں مفسرین اور مؤرخین کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔  
حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عباسؓ، حضرت ابن عباسؓ، اکعب  
الاجبارؓ، سعید بن جبیرؓ، قتادہؓ، مسروقؓ، عکرمہؓ، عطاءؓ، مقاتلؓ، زہریؓ اور سدیؓ سے منقول ہے  
کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحق علیہ السلام تھے، اس کے برخلاف حضرت علیؓ حضرت ابن عباسؓ  
حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوالطفیلؓ، سعید بن المسیبؓ، سعید بن جبیرؓ  
حسن بصریؓ، مجاہدؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ، شعبیؓ، محمد بن کعب قرظیؓ اور دوسرے بہت  
تابعین سے منقول ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔

بعد کے مفسرین میں سے حافظ ابن جریر طبریؒ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، اور حافظ  
ابن کثیرؒ وغیرہ نے دوسرے قول کو اختیار کر کے پہلے قول کی سختی کے ساتھ تردید فرمائی ہے یہاں  
فریقین کے دلائل پر مکمل تبصرہ ممکن نہیں، تاہم قرآن کریم کے اسلوب بیان اور روایات کی  
قوت کے لحاظ سے راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن صاحبزادے  
کے ذبح کا حکم دیا گیا وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں :-  
(۱) قرآن کریم نے بیٹے کی قربانی کا پورا واقعہ نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ وَبَشِّرْهُ

بِاسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ (اور ہم نے ان کو اسحقؑ کی بشارت دی کہ نبی اور نیک لوگوں  
میں سے ہوں گے)، اس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا وہ  
حضرت اسحق علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور تھے، اور حضرت اسحق علیہ السلام کی بشارت انکی  
قربانی کے واقعہ کے بعد دی گئی۔

(۲) حضرت اسحق علیہ السلام کی اسی بشارت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت اسحقؑ  
علیہ السلام نبی ہوں گے، اس کے علاوہ ایک دوسری آیت میں مذکور ہے، کہ حضرت اسحقؑ کی  
پیدائش کے ساتھ یہ بشارت بھی دیدی گئی تھی کہ ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام پیدا  
ہوں گے، (فَبَشِّرْهُنَّ بِاسْحَاقَ وَبِاسْحَاقَ يَعْقُوبُ) اس کا صاف مطلب یہ  
تھا کہ وہ بڑی عمر تک زندہ رہیں گے، یہاں تک کہ صاحب اولاد ہوں گے، پھر انہی کو بچپن میں  
ذبح کرنے کا حکم کیونکر دیا جاسکتا تھا، اور اگر انہی کو بچپن میں نبوت سے قبل ذبح کرنے کا حکم  
دیا جاتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ جاتے کہ انہیں تو ابھی نبوت کے منصب پر فائز ہونا تو  
اور ان کی صلب سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش مقدر ہے، اس لئے ذبح کرنے



سے انھیں موت نہیں آسکتی ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ یہ کوئی بڑا امتحان ہوتا، اور نہ حضرت ابراہیمؑ اس کی انجام دہی میں کسی تعریف کے مستحق ہوتے، امتحان تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پوری طرح یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ میرا یہ بیٹا ذبح کرنے سے ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد وہ ذبح کرنے کا اقدام کریں۔ حضرت اسمعیل علیہ السلام کے معاملہ میں یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے زندہ رہنے اور نبی بننے کی کوئی پیشینگوئی نہیں فرمائی تھی۔

(۳) قرآن کریم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلا بچہ تھا، اس لئے کہ انھوں نے اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت ایک بیٹے کی دعا کی تھی، اسی دعا کے جواب میں انھیں یہ بشارت دی گئی کہ ان کے یہاں ایک حلیم لڑکا پیدا ہوگا، اور پھر اسی لڑکے کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ جب وہ باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو اسے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ سارا سلسلہ واقعات بتا رہا ہے کہ وہ لڑکا حضرت ابراہیمؑ کا پہلا بیٹا تھا، ادھر یہ بات متفق علیہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے صاحبزادے حضرت اسمعیل علیہ السلام ہیں، اور حضرت اسحق علیہ السلام ان کے دوسرے صاحبزادے ہیں، اس کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ ذبح حضرت اسمعیل علیہ السلام ہی تھے۔

(۴) یہ بات بھی تقریباً طے شدہ ہے کہ بیٹے کی قربانی کا یہ واقعہ مکہ مکرمہ کے آس پاس پیش آیا ہے، اسی لئے اہل عرب میں برابر حج کے دوران قربانی کا طریقہ رائج رہا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے کے قدیم میں جو مینڈھا جنت سے بھیجا گیا اس کے سینک سالہا سال تک کعبہ شریف کے اندر لٹکے رہے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس کی تائید میں کئی روایتیں نقل کی ہیں، اور حضرت عامر شعبیؒ کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ: ”میں نے اس مینڈھے کے سینک کعبہ میں خود دیکھے ہیں“ (ابن کثیر، ص ۸۱ ج ۲) اور حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں کہ ”اس مینڈھے کے سینک مسلسل کعبہ میں لٹکے رہے، یہاں تک کہ جب (حجاج بن یوسف کے زمانہ میں) کعبۃ اللہ میں آتش زدگی ہوئی تو یہ سینک بھی جل گئے“ (ایضاً، ص ۸۱ ج ۲) اب ظاہر ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضرت اسمعیل علیہ السلام تشریف فرما رہے ہیں، نہ کہ حضرت اسحق علیہ السلام اس لئے صاف ظاہر ہے کہ ذبح کا حکم حضرت اسمعیل علیہ السلام ہی سے متعلق تھا، نہ کہ حضرت اسحق علیہ السلام سے۔

رہیں وہ روایات جن میں مختلف صحابہؓ و تابعینؓ کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے ذبح حضرت اسحق علیہ السلام کو قرار دیا، سو ان کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے

لکھا ہے کہ ۱۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن بظاہر یہ سارے اقوال کعب الاحبار سے ماخوذ ہیں، اس لئے کہ جب وہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسلام لائے تو حضرت عمرؓ کو اپنی پرانی کتابوں کی باتیں سننے لگے، بعض اوقات حضرت عمرؓ ان کی باتیں سن لیتے تھے، اس سے اور لوگوں کو بھی گنجائش ملی، اور انھوں نے بھی ان کی روایات سن کر انھیں نقل کرنا شروع کر دیا، ان روایات میں ہر طرح کی رطب و یابس باتیں جمع تھیں، اور اس امت کو ان باتوں میں سے ایک حرف کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

(تفسیر ابن کثیر، ص ۱۷ ج ۴)

حافظ ابن کثیرؒ کی یہ بات بہت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ حضرت اسحق علیہ السلام کو ذبیح قرار دینے کی بنیاد اسرائیلی روایات ہی پر ہے، اسی لئے یہود و نصاریٰ حضرت اسمعیل علیہ السلام کے بجائے حضرت اسحق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیتے ہیں، موجودہ بائبل میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

”ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابراہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابراہام: اس نے کہا میں حاضر ہوں، تب اُس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اسحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اُسے پہاڑ میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔“

(پیدائش ۲۲: ۱۷)

اس میں ذبیح کا واقعہ حضرت اسحق علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن اگر انصاف سے اور تحقیق سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں یہودیوں نے اپنے روایتی تعصب سے کام لے کر تورات کی عبارت میں تحریف کا ارتکاب کیا ہے، اس لئے کہ کتاب پیدائش کی مذکورہ عبارت ہی میں ”جو تیرا اکلوتا ہے“ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو جس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا، اسی باب میں آگے چل کر پھر لکھا ہے کہ:-

”تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا۔“ (پیدائش ۲۲: ۱۲)

اس جملے میں بھی یہ تصریح موجود ہے کہ وہ بیٹا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا تھا، ادھر یہ بات طے شدہ ہے کہ حضرت اسحق علیہ السلام ان کے اکلوتے بیٹے نہ تھے، اگر ”اکلوتے“ کا اطلاق کسی پر ہو سکتا ہے تو وہ صرف حضرت اسمعیل علیہ السلام ہیں، خود کتاب پیدائش ہی کی دوسری کسی عبارت میں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کی پیدائش حضرت اسحق علیہ السلام



سے بہت پہلے ہو چکی تھی، ملاحظہ فرمائیے :-

”اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی، اس کی ایک مصری لونڈی تھی، جس کا نام ہاجرہ تھا، اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی... اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا، اس کا نام اسمعیل رکھنا۔ اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسمعیل پیدا ہوا تب ابرام چھپاسی برس کا تھا“  
(پیدائش باب ۱۶ آیات ۱۰ و ۱۱ و ۱۲)

نیز اگلے باب میں لکھا ہے:

”اور خدا نے ابرام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے۔ اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا... تب ابرام سرنگوں ہوا اور ہنس کر دل میں کہنے لگا کہ کیا توبرس کے بڑھے سے کوئی بچہ ہوگا، اور کیا سارہ کے چوتھے برس کی ہے اولاد ہوگی؟ اور ابرام نے خدا سے کہا کہ کاش! اسمعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے، تب خدا نے فرمایا کہ بیشک تیری بیوی سارہ کے تجھ سے بیٹا ہوگا، تو اس کا نام اضحاق رکھنا، (پیدائش ۱۷: ۱۵ تا ۲۰)  
اس کے بعد حضرت اسحق علیہ السلام کی پیدائش کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے:

”اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرام توبرس کا تھا“ (پیدائش ۲۱)

ان عبارتوں سے صاف واضح ہے کہ حضرت اسحق علیہ السلام حضرت اسمعیل علیہ السلام سے چودہ سال چھوٹے تھے، اور اس چودہ سال کے عرصہ میں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے بیٹے تھے، اس کے برعکس حضرت اسحق علیہ السلام پر ایسا کوئی وقت نہیں گذرا جس میں وہ اپنے والد کے اکلوتے ہوں، اب اس کے بعد جب کتاب پیدائش کے بائیسویں باب میں بیٹے کی قربانی کا ذکر آتا ہے، تو اس میں ”اکھوتا“ کا لفظ صاف شہادت دے رہا ہے کہ اس سے مراد اسمعیل علیہ السلام ہیں اور کسی یہودی نے اس کے ساتھ ”اضحاق“ کا لفظ محض اس لئے بڑھا دیا کہ تاکہ یہ فضیلت بنو اسمعیل کے بجائے بنو اسحق کو حاصل ہو۔

اس کے علاوہ بائبل کی اسی کتاب پیدائش میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحق علیہ السلام کی پیدائش کی خوش خبری دی گئی ہے وہاں یہ بھی مذکور ہے کہ :-  
”یقیناً میں اسے (یعنی حضرت اسحق علیہ السلام کو) برکت دوں گا کہ قومیں اس کی نسل سے ہوں گی“ (پیدائش ۱۸: ۱۰)

اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کے بارے میں اس کی پیدائش سے پہلے ہی یہ خبر دی جا چکی ہو کہ وہ صاحب اولاد ہوگا، اور ”قومیں اس کی نسل سے ہوں گی“ اس کو قربان کرنے کا حکم

کیسے دیا جاسکتا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم حضرت اسحق علیہ السلام سے متعلق نہیں تھا، بلکہ حضرت اسمعیل علیہ السلام سے متعلق تھا۔

یامیل کی ان عبارتوں کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ کا یہ خیال کس قدر صحیح ہے کہ:-

”یہودیوں کی کتب مقدسہ میں تصریح ہے کہ جب اسمعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیالیس سال تھی، اور جب اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی عمر تیس سال تھی، اور انہی کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے اکلوتے بیٹے کے ذبح کا حکم دیا تھا، اور ایک اور نسخہ میں ”اکلوتے“ کے بجائے ”پہلوٹھے“ کا لفظ ہے، پس یہودیوں نے یہاں ”اسحق“ کا لفظ اپنی طرف سے بہتاناً بڑھا دیا، اور اس کو درست قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے، کیونکہ یہ خود ان کی کتابوں کی تصریحات کے خلاف، اور یہ لفظ انھوں نے اس لئے بڑھایا کہ حضرت اسحق علیہ السلام اُن کے جدا محب ہیں، اور حضرت اسمعیل علیہ السلام عربوں کے، پس یہودیوں نے حسد کی وجہ سے یہ لفظ بڑھا دیا، اور اب ”اکلوتے“ کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ وہ بیٹا جس کے سوا اس وقت کوئی اور تمھارے پاس موجود نہیں ہے، کیونکہ حضرت اسمعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ اس وقت وہاں نہیں تھیں اس لئے حضرت اسحقؑ کو اس معنی میں اکلوتا کہا جاسکتا ہے، لیکن یہ بالکل غلط تاویل ہے اور باطل تحریف ہے، اس لئے کہ اکلوتا اس بیٹے کو کہتے ہیں جس کے باپ کا اُس کے سوا کوئی بیٹا

نہ ہو“ (تفسیر ابن کثیر، ص ۱۱۳، ج ۱۲)

حافظ ابن کثیرؒ ہی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ علماء یہودیوں سے ایک شخص حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانے میں مسلمان ہو گیا تھا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس سے پوچھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں میں سے کون سے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا، تو اس نے کہا کہ ”خدا کی قسم! امیر المؤمنین! وہ اسمعیل علیہ السلام تھے، یہودی اس بات کو خوب جانتے ہیں، لیکن وہ آپ عرب لوگوں سے حسد کی وجہ سے ایسا کہتے ہیں“ (ص ۱۸، ج ۱۲)

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ ذبح حضرت اسمعیل علیہ السلام

ہی تھے۔ واللہ سبحانہ اعلم

ذَمِّ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ (ان دونوں کی نسل میں بعض اچھے



بھی ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو صریح اپنا نقصان کر رہے ہیں، اس آیت کے ذریعہ یہودیوں کے اس زعم باطل کی تردید کر دی گئی ہے کہ ان حضرات انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے ہونا ہی انسان کی فضیلت اور نجات کے لئے کافی ہے۔ اس آیت نے وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ کسی نیک انسان کے نسب تعلق نجات کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کا اصل مدار انسان کے اپنے عقائد اور اعمال پر ہے۔

وَلَقَدْ مَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۖ وَنَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ

اور ہم نے احسان کیا موسیٰ اور ہارون پر، اور بچا دیا ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو

الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۚ وَنَصَرْنَاهُمْ فَمَا كَانُوا أَهْلَ الْغَلَبِ ۖ وَآتَيْنَاهُمَا

اس بڑی گھبراہٹ سے، اور ان کی ہم نے مدد کی تو رہے وہی غالب۔ اور ہم نے دی انکو

الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ۖ وَهَدَّيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۚ وَتَرَكْنَا

کتاب واضح، اور سمجھائی ان کو سیدھی راہ، اور باقی رکھا

عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِينَ ۚ سَلَّمَ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۖ إِنَّا كَذَلِكَ

ان پر پچھلے لوگوں میں، کہ سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر۔ ہم یوں دیتے ہیں

نَجْرًا لِّلْمُحْسِنِينَ ۚ إِنَّهُمْ مِمَّا مِنَّا الْغَافِلِينَ ۚ

بدلہ نیک کرنے والوں کو۔ تحقیق وہ دونوں ہیں ہمارے ایماندار بندوں میں۔

## خُلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) پر بھی احسان کیا کہ ان کو نبوت اور دیگر کمالات عطا فرمائے اور ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) کو بڑے غم سے (یعنی فرعون کی جانب سے پہنچائی جانے والی تکالیف سے) نجات دی اور ہم نے ان سب کی (فرعون کے مقابلے میں) مدد کی، سو آخر میں، یہی لوگ غالب آ گئے کہ فرعون کو غرق کر دیا گیا، اور یہ صاحب حکومت ہو گئے اور ہم نے (فرعون کے غرق ہونے کے بعد) ان دونوں (صاحبوں) کو (یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اصالۃ اور ہارون علیہ السلام کو تبعاً) واضح کتاب دی (مراد تورات ہے) کہ اس میں احکام واضح طور پر مذکور تھے اور ہم نے ان کو سیدھے رستہ پر قائم رکھا، (جس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انھیں نبی معصوم بنایا) اور ہم نے ان دونوں کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں

رمدت ہائے دراز کے لئے) یہ بات رہنے دی کہ موسیٰ اور ہارون پر سلام (چنانچہ دونوں حضرات کے ناموں کے ساتھ آج تک علیہ السلام کہا جاتا ہے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، (کہ ان کو ثناء اور دعا کا مستحق بنا دیتے ہیں) بیشک وہ دونوں ہمارے (کامل) ایمان دار بندوں میں سے تھے (اس لئے صلہ بھی کامل عطا ہوا)۔

## معارف و مسائل

ان آیتوں میں تیسرا واقعہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا بیان کیا گیا ہے یہ واقعہ متعدد مقامات پر تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے، یہاں اس کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے، اور اسے ذکر کرنے سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخلص اور اطاعت شعار بندوں کی کس طرح مدد فرماتے ہیں، اور انہیں کیسے کیسے انعامات سے نوازتے ہیں چنانچہ یہاں حضرت موسیٰ و ہارون پر اپنے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے، انعامات کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک مثبت انعامات، یعنی فائدے پہنچانا، وَتَقْدَرُ مَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ میں اسی قسم کے انعامات کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے منفی انعامات، یعنی نقصان سے بچانا، اگلی آیات میں اسی قسم کی تفصیل ہے۔ آیات کا مفہوم خلاصہ تفسیر سے واضح ہو جاتا ہے۔

وَأَنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٢٣﴾ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَالَتَقُونَ ﴿١٢٤﴾

اور تحقیق الیاس ہے رسولوں میں۔ جب اس نے کہا اپنی قوم کو کیا تم کو ڈر نہیں،

أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ﴿١٢٥﴾ اللَّهُ رَبُّكُمْ

کیا تم پکارتے ہو بعل کو اور چھوڑتے ہو بہتر بنانے والے کو۔ جو اللہ ہے رب تمہارا

وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٢٦﴾ فَكَذَّبُوهُ فَاتَّهَمُوا لِمُحْضِرُونِ ﴿١٢٧﴾

اور رب تمہارے اگلے باپ دادوں کا، پھر اس کو جھٹلایا سو وہ آنے والے ہیں پکڑے ہوئے،

الْأَعْبَادَ لِلَّهِ الْمُخْلِصِينَ ﴿١٢٨﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿١٢٩﴾

مگر جو بندے ہیں اللہ کے چنے ہوئے۔ اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں کہ

سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿١٣٠﴾ إِنَّا كَذَّبْنَاكَ وَكَذَّبْنَاهُ وَلَوْ أَنَّكَ لَمِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣١﴾

سلام ہے ابراہیم پر۔ ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو۔



إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۲﴾

وہ ہی ہمارے ایمان دار بندوں میں۔

## خلاصہ تفسیر

اور الیاس علیہ السلام، بھی ربی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے تھے۔ ان کا اس وقت کا واقعہ ذکر کیجئے، جبکہ انھوں نے اپنی قوم ربی اسرائیل سے کہ وہ بت پرستی میں مبتلا تھی، فرمایا کہ کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ کیا تم بعل کو (جو ایک بت کا نام تھا، پوجتے ہو اور اس کی عبادت) کو چھوڑ بیٹھے ہو جو سب سے بڑھ کر بنانے والا ہے، کیونکہ اور لوگ تو صرف بعض اشیاء کی تحلیل و ترکیب پر قدرت رکھتے ہیں اور وہ بھی عارضی، اور وہ تمام اشیاء کو عدم سے وجود میں لانے پر قدرت ذاتی رکھتا ہے، پھر کوئی دوسرا جان نہیں ڈال سکتا اور وہ جان ڈالتا ہے اور وہ (معبود برحق ہے) اور (تمہارا بھی رب ہے اور تمہاری اگلے باپ دادوں کا بھی رب ہے، سو ان لوگوں نے اس توحید کے دعوے میں، اُن کو جھٹلایا، سو اس جھٹلانے کی شامت میں، وہ لوگ عذابِ آخرت میں، پکڑے جاویں گے، مگر جو اللہ کے خاص بندے (یعنی ایمان والے) تھے، وہ ثواب و اجر میں ہوں گے) اور ہم نے الیاس کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں (مددگارے و راز کے لئے) یہ بات رہنے دی کہ الیاسین پر کہ یہ بھی الیاس علیہ السلام کا نام ہے، سلام ہو، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں کہ ان کو ثناء اور دعا کا مستحق بناتے ہیں، بیشک وہ ہمارے رکاب میں، ایمان دار بندوں میں سے تھے۔

## معارف و مسائل

حضرت الیاس | ان آیات میں چوتھا واقعہ حضرت الیاس علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ آیات کی علیہ السلام | تفسیر سے قبل حضرت الیاس علیہ السلام سے متعلق چند معلومات درج ذیل ہیں:-  
قرآن کریم میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر صرف دو مقامات پر آیا ہے، ایک سورۃ انعام میں اور دوسرے سورۃ صافات کی انہی آیتوں میں۔ سورۃ انعام میں تو صرف انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں آپ کا اسم گرامی شمار کر دیا گیا ہے اور کوئی واقعہ مذکور نہیں، البتہ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ آپ کی دعوت و تبلیغ کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے۔  
چونکہ قرآن کریم میں حضرت الیاس علیہ السلام کے حالات تفصیل سے مذکور نہیں ہیں،

اور نہ مستند احادیث میں آپ کے حالات آئے ہیں، اس لئے آپ کے بارے میں کتب تفسیر کے اندر مختلف اقوال اور متفرق روایات ملتی ہیں، جن میں سے بیشتر بنی اسرائیل کی روایات کا خود ہیں۔

مفسرین میں سے ایک مختصر گروہ کا کہنا یہ ہے کہ "الیاس" حضرت ادریس علیہ السلام ہی کا دوسرا نام ہے، اور ان دونوں شخصیتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ (دورنشا ص ۲۸۵، ۲۸۶ ج ۵) لیکن محققین نے ان اقوال کی تردید کی ہے۔ قرآن کریم نے بھی حضرت ادریس اور حضرت الیاس علیہما السلام کا اس طرح جدا جدا تذکرہ فرمایا ہے، کہ دونوں کو ایک قرار دینے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، اس لئے حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں صحیح اسی کو قرار دیا ہے کہ دونوں الگ الگ رسول ہیں (البدایہ والنہایہ، ص ۳۹ ج ۱)

بہشت کا زمانہ | قرآن وحدیث سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ حضرت الیاس علیہ السلام کب اور کہاں اور مقام | مبعوث ہوئے تھے؟ لیکن تاریخی اور اسرائیلی روایات اس بات پر تقریباً متفق ہیں کہ آپ حضرت حزقیل علیہ السلام کے بعد اور حضرت الیسع علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے جانشینوں کی بدکاری کی وجہ سے بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی تھی، ایک حصہ یہوداہ یا یہودیہ کہلاتا تھا، اور اس کا مرکز بیت المقدس تھا، اور دوسرا حصہ اسرائیل کہلاتا تھا اور اس کا پایہ تخت سامرہ (موجودہ نابلس) تھا۔ حضرت الیاس علیہ السلام اردن کے علاقہ جلعاد میں پیدا ہوئے تھے، اُس وقت اسرائیل کے ملک میں جو بادشاہ حکمران تھا اس کا نام بائبل میں اخیا اب اور عربی تواریخ و تفاسیر میں اجب یا اخب مذکور ہے۔ اس کی بیوی ایزبل، بعل نامی ایک بت کی پرستار تھی، اور اسی نے اسرائیل میں بعل کے نام پر ایک بڑی قربان گاہ تعمیر کر کے تمام بنو اسرائیل کو بت پرستی کے رستہ پر لگا دیا تھا۔ حضرت الیاس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ اس خطے میں جا کر توحید کی تعلیم دیں، اور اسرائیلیوں کو بت پرستی سے روکیں (ملاحظہ ہو تفسیر ابن جریر ص ۵۳، ج ۲۳ وابن کثیر ص ۱۹ ج ۴ و تفسیر مظہری ص ۱۳۴ ج ۸ اور بائبل کی کتاب سلاطین اول ۱: ۱۶ تا ۳۳ و ۱: ۱۷)

قوم کے ساتھ کشمکش | دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت الیاس علیہ السلام کو بھی اپنی قوم کے ساتھ شدید کشمکش دوچار ہونا پڑا۔ قرآن کریم چونکہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، اس لئے اس نے اس کشمکش کا مفصل حال بیان کرنے کے بجائے صرف اتنی بات بیان فرمائی ہے جو عبرت و موعظت حاصل کرنے کے لئے ضروری تھی، یعنی یہ کہ ان کی قوم نے اُن کو جھٹلایا اور چند مخلص بندوں کے سوا کسی نے حضرت الیاس



علیہ السلام کی بات نہ مانی، اس لئے آخرت میں انہیں ہولناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔  
 بعض مفسرین نے یہاں اس کشمکش کے مفصل حالات بیان فرمائے ہیں، مروجہ تفاسیر میں  
 حضرت الیاس علیہ السلام کا سب سے مبسوط تذکرہ تفسیر مظہری میں علامہ بغویؒ کے حوالہ سے کیا گیا ہے، اس  
 میں جو واقعات مذکور ہیں وہ تقریباً تمام تر بائبل سے ماخوذ ہیں، دوسری تفسیروں میں بھی ان واقعات  
 کے بعض اجزاء حضرت وہاب بن منبہؒ اور کعب الاحبارؒ وغیرہ کے حوالہ سے بیان ہوئے ہیں جو اکثر  
 اسرائیلی روایات نقل کرتے ہیں۔

ان تمام روایات سے خلاصہ کے طور پر جو قدر مشترک نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام  
 نے اسرائیل کے بادشاہ اخی اب اور اس کی رعایا کو بعل نامی بت کی پرستش سے روک کر توحید کی دعوت  
 دی، مگر وہ ایک حق پسند افراد کے سوا کسی نے آپ کی بات نہیں مانی، بلکہ آپ کو طرح طرح پریشان  
 کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ اخی اب اور اس کی بیوی ایزبل نے آپ کو شہید کرنے کے منصوبے  
 بنائے۔ آپ نے ایک درختادہ غار میں پناہ لی، اور عرصہ دراز تک وہیں مقیم رہے، اس کے بعد  
 آپ نے دعا فرمائی، کہ اسرائیل کے لوگ قحط سالی کا شکار ہو جائیں، تاکہ اس قحط سالی کو دور کرنے  
 کے لئے آپ ان کو معجزات دکھائیں تو شاید وہ ایمان لے آئیں، چنانچہ انھیں شدید قحط میں  
 مبتلا کر دیا گیا۔

اس کے بعد حضرت الیاس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اخی اب سے ملے، اور اس سے  
 کہا کہ یہ عذاب اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے ہے، اور اگر تم اب بھی باز آ جاؤ تو یہ عذاب دور ہو سکتا  
 ہے۔ میری سچائی کے امتحان کا بھی یہ بہترین موقع ہے، تم کہتے ہو کہ اسرائیل میں تمھارے معبود بعل  
 کے ساڑھے چار سو نبی ہیں، تم ایک دن ان سب کو میرے سامنے جمع کرو، وہ بعل کے نام پر قربانی  
 پیش کریں، اور میں اللہ کے نام پر قربانی کروں گا، جس کی قربانی کو آسمانی آگ آ کر بھسم کر دے گی،  
 اس کا دین سچا ہوگا، سب نے اس تجویز کو خوشی سے مان لیا۔

چنانچہ کوہ کرمل کے مقام پر یہ اجتماع ہوا، بعل کے جھوٹے نبیوں نے اپنی قربانی پیش کی،  
 اور صبح سے دوپہر تک بعل سے التجائیں کرتے رہے، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس کے بعد حضرت  
 الیاس علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی، اس پر آسمان سے آگ نازل ہوئی، اور اس نے حضرت  
 الیاس علیہ السلام کی قربانی کو بھسم کر دیا، یہ دیکھ کر بہت سے لوگ سجدے میں گر گئے، اور ان پر  
 حق واضح ہو گیا، لیکن بعل کے جھوٹے نبی اب بھی نہ مانے، اس لئے حضرت الیاس علیہ السلام نے  
 ان کو دائمی قیثون میں قتل کرادیا۔

اس واقعہ کے بعد موسیٰؑ اور ہارونؑ بارش بھی ہوئی، اور پورا خطہ پانی سے ہمال ہو گیا، لیکن

اخی آب کی بیوی ایزبل کی اب بھی آنکھ نہ کھلی، وہ حضرت الیاس علیہ السلام پر ایمان لانے کے بجائے اُلٹی ان کی دشمن ہو گئی، اور اس نے آپ کو قتل کرانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام یہ سنکر پھر سامریہ سے روپوش ہو گئے، اور کچھ عرصہ کے بعد بنی اسرائیل کے دوسرے ملک یہود میں تبلیغ شروع کر دی، کیونکہ رفتہ رفتہ بعل پرستی کی دبا دہاں بھی پھیل چکی تھی۔ وہاں کے بادشاہ بہورام نے بھی آپ کی بات نہ سنی، یہاں تک کہ وہ حضرت الیاس علیہ السلام کی پیشینگوئی کے متعلق تباہ و برباد ہوا چند سال بعد آپ دوبارہ اسرائیل تشریف لائے اور یہاں پھر اخی آب اور اس کے بیٹے اخزیابہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی، مگر وہ بدستور اپنی بد اعمالیوں میں مبتلا رہے، یہاں تک کہ انھیں بیرونی حملوں اور مہلک بیماریوں کا شکار بنا دیا گیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو واپس بلا لیا۔

کیا حضرت الیاس علیہ السلام مورخین اور مفتقرین کے درمیان یہاں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہے کہ حیات ہیں؟

میں علامہ بغویؒ کے حوالہ سے جو طویل روایت بیان کی گئی ہے اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کو ایک آتشیں گھوڑے پر سوار کر کے آسمان کی طرف اٹھالیا گیا تھا، اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح زندہ ہیں (منظری ص ۲۱ ج ۸) علامہ سیوطیؒ نے بھی ابن عساکرؒ اور حاکمؒ وغیرہ کے حوالہ سے کئی روایات ایسی نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ کعب الاحبارؒ سے منقول ہے کہ چار انبیاء علیہم السلام اب تک زندہ ہیں، دوزین میں، حضرت خضرؒ اور حضرت الیاسؒ اور دو آسمان میں، حضرت عیسیٰؒ اور حضرت ادریس علیہم السلام، (در منثور، ص ۲۸۵، ۲۸۶ ج ۲) یہاں تک کہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت خضر اور حضرت الیاس علیہما السلام ہر سال رمضان کے مہینہ میں بیت المقدس میں جمع ہوتے ہیں، اور روزے رکھتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی، ص ۱۶ ج ۱۵)

لیکن حافظ ابن کثیرؒ جیسے محقق علماء نے ان روایات کو صحیح قرار نہیں دیا، وہ ان جیسی روایتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:-

”یہ ان اسرائیلی روایتوں میں سے ہے جن کی نہ تصدیق کی جاتی ہے نہ تکذیب، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کی صحت بعید ہے“

وهومن الاسرائیلیات التي لا تصدق ولا تكذب بل الظاهر أن صحتها بعيدة، (البدایة والہنایة، ص ۳۳۸ ج ۱)

نیز فرماتے ہیں:-

”ابن عساکر نے کئی روایتیں ان لوگوں کی نقل کی ہیں جو حضرت الیاس علیہ السلام سے ملے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی قابل اطمینان نہیں، یا تو اس لئے کہ ان کی



سند ضعیف ہی، یا اس لئے کہ جن اشخاص کی طرف یہ واقعات منسوب کئے گئے ہیں وہ

بمحول ہیں۔ (البدایۃ والہایۃ، ص ۲۳۹ ج ۱)

ظاہر یہی ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کے رفیع آسمانی کا نظریہ اسرائیلی روایات ہی سے ماخوذ ہے، بائبل میں لکھا ہے کہ:-

”اور وہ آگے چلتے اور باتیں کرتے جاتے تھے کہ دیکھو ایک آتشیں رتھ اور آتشیں گھوڑوں نے

ان دونوں کو جدا کر دیا اور ایلیاہ بگولے میں آسمان پر چلا گیا۔“ (۲۔ سلاطین ۱۱:۲)

اسی وجہ سے یہودیوں میں یہ عقیدہ پیدا ہوا تھا کہ حضرت الیاس علیہ السلام دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے، چنانچہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو انھوں نے اُن پر الیاس علیہ السلام ہونے کا شبہ ظاہر کیا۔ انجیل یوحنا میں ہے:

”انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اُس نے کہا میں نہیں ہوں۔“

(یوحنا ۱: ۲۱)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کعب الاحبار اور وہب بن منبہ رحمہ اللہ جیسے علماء نے جو اہل کتاب کے علوم کے ماہر تھے، یہی روایتیں مسلمانوں کے سامنے بیان کی ہوں گی، جن سے حضرت الیاس علیہ السلام کی زندگی کا نظریہ بعض مسلمانوں میں بھی پھیل گیا، ورنہ قرآن یا حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے، جس سے حضرت الیاس علیہ السلام کی زندگی یا آپ کا آسمان پر اٹھایا جانا ثابت ہوتا ہو، صرف ایک روایت مستدرک حاکم میں ملتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ تبوک کے راستے میں آنحضرت صلی علیہ وسلم کی ملاقات حضرت الیاس علیہ السلام سے ہوئی۔ لیکن یہ روایت بتصریح محدثین موضوع ہے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں:-

بل هو موضوع قبح الله من

وضعه وما كنت احب ولا

أجوز أن الجھل يبلغ بالحكم

أني ان يصح هذا

(درغوث، ص ۲۸۶ ج ۵)

بلکہ یہ حدیث موضوع ہے، خدا برآ کرے

اس شخص کا جس نے یہ حدیث وضع کی،

اس سے پہلے میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ

امام حاکم کی بخیری اس حد تک پہنچ سکتی ہو

کہ وہ اس حدیث کو صحیح قرار دیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت الیاس علیہ السلام کا زندہ ہونا کسی معتبر اسلامی روایت سے ثابت نہیں ہے۔ لہذا اس معاملے میں سلامتی کی راہ یہ ہے کہ اس میں سکوت اختیار کیا جائے اور

۱۔ واضح رہے کہ بائبل میں حضرت الیاس علیہ السلام کا نام ایلیاہ مذکور ہے۔

اسرائیلی روایات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کیا جائے کہ ”اُن کی تصدیق کرو نہ تکذیب“ کیونکہ قرآن کریم کی تفسیر اور عبرت و موعظت کا مقصد اس کے بغیر بھی پوری طرح حاصل ہو جاتا ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم، اب آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے:-

اِنَّ عَوْنَ بَعْلًا، دیکھا تم بعل کو پوجتے ہو (بعل کے لغوی معنی شوہر اور مالک وغیرہ ہیں) لیکن یہ اُس بت کا نام تھا جسے حضرت ایسا علیہ السلام کی قوم نے اپنا معبود بنایا ہوا تھا۔ بعل کی پرستش کی تاریخ بہت قدیم ہے، شام کے علاقہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس کی پرستش ہوتی تھی، اور یہ اُن کا سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ شام کا مشہور شہر بعلبک بھی اسی کے نام سے موسوم ہوا، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اہل حجاز کا مشہور بت ہبل بھی یہی بعل ہے۔

(قصص القرآن، ص ۲۸ ج ۲)

دَدَّرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ (اور اس کو چھوڑ بیٹھے ہو جو سب سے بڑھ کر بنانے والا) اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور ”احسن الخالقین“ (سب سے اچھا خالق) کا مطلب یہ نہیں ہو کہ معاذ اللہ کوئی دوسرا بھی خالق ہو سکتا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جن جھوٹے معبودوں کو تم نے خالق قرار دیا ہوا ہے وہ ان سب سے اونچی شان والا ہے۔ (قرطبی) اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں ”صانع“ ”بنانے والا“ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی وہ تمام صنائعوں سے بڑھ کر ہو، اس لئے کہ دوسرے صنائع صرف اتنا ہی تو کرتے ہیں کہ مختلف اجزاء کو جوڑ کر کوئی چیز تیار کر لیتے ہیں کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا ان کے بس سے باہر ہے، اور اللہ تعالیٰ معدوم اشیاء کو وجود بخشنے پر قدرت ذاتی رکھتا ہے (بیان لہرکان)

غیر اللہ کی طرف تخلیق کی یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ”خلق“ کے معنی پیدا کرنے کے ہیں، جس کا مطلب صفت منسوب کرنا جائز نہیں ہو کسی شے کو عدم محض سے قدرت ذاتی کے بل پر وجود میں لانا۔ اس لئے یہ صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، کسی اور کی طرف اس کی نسبت جائز نہیں، لہذا ہمارے زمانے میں جو رواج چل پڑا ہے کہ اہل قلم کے مضامین، شاعروں کے شعرا اور مصوروں کی تصویروں کو اُن کی ”تخلیقات“ کہہ دیا جاتا ہے وہ بالکل جائز نہیں، اور نہ اہل قلم کو ان مضامین کا خالق کہنا درست ہے۔ خالق اللہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے اُن کے رشتہات قلم کو ”کادش“ یا ”مضمون“ وغیرہ کہنا چاہئے ”تخلیق“ نہیں۔

فَكَذَّبُوهُ فَاَقْبَحَتْكُمْ تِلْكَ اَمْثَلُكُمْ لَمْ تُحْضِرُوْا (سو اُن لوگوں نے اُن کو جھٹلایا سو وہ پکڑے جائیں گے)

مطلب یہ ہے کہ انھیں اللہ کے سچے رسول کو جھٹلانے کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ اس سے آخرت کا عذاب بھی مراد ہو سکتا ہے اور دنیا کا انجام بد بھی۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ حضرت ایسا علیہ السلام کی



تکذیب کے نتیجے میں یہود واد اور اسرائیل دونوں ملکوں کے حکمرانوں کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا، اس تباہی کی تفصیل تفسیر مظہری میں اور بائبل کی کتاب سلاطین اول باب ۲۲ سلاطین دوم باب اول اور تواریخ دوم باب ۲۱ میں موجود ہے۔

إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ، یہاں ”مخلصین“ (لام پر زبر ہے) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں ”خالص کئے ہوئے لوگ“ یعنی وہ لوگ جنہیں اللہ نے اپنی اطاعت اور اجر و ثواب کے لئے خالص کر لیا ہو، لہذا اس کا ترجمہ ”مخلص“ کے بجائے ”برگزیدہ“ زیادہ مناسب ہے۔  
سَلَامٌ عَلَىٰ آلِ يَاسِينَ، ”ایاسین“ بھی ایاس علیہ السلام ہی کا ایک نام ہے، اہل عرب اکثر عجمی ناموں کے ساتھ یا اور فون بڑھا دیتے ہیں، جیسے ”سینا“ ہے ”سینین“ اسی طرح یہاں بھی دو حرف بڑھا دیے گئے ہیں۔

وَأَن لُّوطًا لِّمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۳۳﴾ إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَتَجَعِّلُ ﴿۳۴﴾

اور تحقیق لوط ہے رسولوں میں سے۔ جب بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے سارے گھر والوں کو،

إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَيْرِينَ ﴿۳۵﴾ ثُمَّ دَمَرْنَا الْأَخْرِينَ ﴿۳۶﴾ وَآتَيْنَاكُمْ

مگر ایک بڑھیا کہ رہ گئی رہ جانے والوں میں۔ پھر جڑے اکھاڑ پھینکا ہم نے دوسروں کو، اور تم گذرتے ہو

لَتَسْمُرُونَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِينَ ﴿۳۷﴾ وَبِالْأَيْلِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۳۸﴾

اُن پر صبح کے وقت، اور رات کو بھی۔ پھر کیا نہیں سمجھتے؟

## خلاصہ تفسیر

اور بیشک لوط (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے تھے ان کا اُس وقت کا قصہ قابلِ ذکر ہے، جب کہ ہم نے ان کو اور ان کے متعلقین کو سب کو نجات دی بجز اس بڑھیا (یعنی ان کی بیوی) کے کہ وہ (عذاب کے اندر) رہ جانے والوں میں رہ گئی، پھر ہم نے اور سب کو (جو لوط اور ان کے اہل کے ہوا تھے) ہلاک کر دیا (جن کا قصہ کئی جگہ آچکا ہے) اور (اے اہل مکہ) تم تو اُن کے ردیار و مساکن پر سفرِ شام میں بھی صبح ہوتے اور (کبھی) رات میں گزرا کرتے ہو (اور آثارِ بربادی دیکھتے ہو) تو کیا (اس کو دیکھ کر) پھر بھی نہیں سمجھتے ہو (کہ کفر کا کیا انجام ہوا، اور جو آئندہ کفر کرے گا اس کے لئے بھی یہی اندیشہ ہے)۔

## معارف و مسائل

ان آیات میں پانچواں واقعہ حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ یہ واقعہ پیچھے کئی مقامات پر گزر چکا ہے، اس لئے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہاں اہل مکہ کو خاص طور پر یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ تم شام کے تجارتی سفر میں سدوم کے اس علاقہ سے دن رات گزرتے ہو، جہاں یہ عبرتناک واقعہ پیش آیا، لیکن اس سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ صبح اور رات کا ذکر خاص طور سے اس لئے فرمایا گیا کہ اہل عرب عموماً انہی اوقات میں یہاں سے گزرا کرتے تھے، اور قاضی ابوالسعود فرماتے ہیں کہ غالباً سدوم کا یہ علاقہ راستے کی ایسی منزل پر واقع تھا کہ یہاں سے کوچ کرنے والے صبح کے وقت روانہ ہوتے تھے اور آنے والے شام کے وقت آتے تھے (تفسیر ابی السعود)

وَلَمَّا يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٣٩﴾ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلِ الْمَشْحُونِ ﴿١٤٠﴾

اور تحقیق یونس ہے رسولوں میں سے۔ جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی پر

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ ﴿١٤١﴾ فَالْقَمَمَةُ الْخَوْتُ وَهُوَ

پھر قرعہ ڈلویا تو نکلا خطاوار۔ پھر لقمہ کیا اس کو مچھلی نے اور وہ

مُيْلِمٌ ﴿١٤٢﴾ فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ﴿١٤٣﴾ لَلِیْثِ فِي بَطْنِهِ

الزما اکھایا ہوا تھا۔ پھر اگر نہ ہوتی یہ بات کہ وہ یاد کرتا تھا پاک ذات کو، تو رہتا اسی کے پیٹ میں جس

إِلَى يَوْمٍ يَبْعَثُونَ ﴿١٤٤﴾ فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ ﴿١٤٥﴾ وَأَنْبَتْنَا

دن تک کہ مڑے زندہ ہوں۔ پھر ڈال دیا ہم نے اس کو چٹیل میدان میں اور وہ بیمار تھا۔ اور اُگایا ہم نے

عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَقْطِیْنِ ﴿١٤٦﴾ وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَى مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ

اس پر ایک درخت بیل والا، اور بھیجا اس کو لاکھ آدمیوں پر یا

يَزِيدُونَ ﴿١٤٧﴾ فَأَمَنُوا فَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿١٤٨﴾

اس سے زیادہ۔ پھر وہ یقین لائے پھر ہم نے فائدہ اٹھانے دیا انکو ایک وقت تک

## خلاصہ تفسیر

اور بیشک یونس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اُس وقت کا قصہ



یاد کیجئے) جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے ایمان نہ لانے پر بحکم الہی عذاب کی پیشنگوئی کی، اور خود وہاں سے چلے گئے اور جب متعین وقت پر عذاب کے آثار نمودار ہونے لگے تو قوم کو ایمان لانے کی غرض سے یونس علیہ السلام کی تلاش ہوئی، جب وہ نہ ملے تو سب نے متفق ہو کر حق تعالیٰ کے سامنے گریہ زاری کی اور اجمالی طور پر ایمان لے آئے، اور وہ عذاب ٹل گیا، یونس علیہ السلام کو کسی ذریعہ سے یہ خبر معلوم ہوئی تو شرمندگی کی وجہ سے اپنے اجتہاد سے اللہ تعالیٰ کی صریح اجازت کے بغیر کہیں دور چلے جانے کا ارادہ کر کے اپنی جگہ سے بھاگ کر چلے راہ میں دریا تھا، اس میں مسافروں سے بھری ہوئی کشتی تھی، اس بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے کشتی چلی تو طوفان آیا، کشتی والے کہنے لگے کہ ہم میں کوئی نیا قصور وار ہے، اس کو کشتی سے علیحدہ کرنا چاہئے، اس شخص کو متعین کرنے کے لئے سب کا اتفاق اس پر ہوا کہ قرعہ ڈالا جائے، سو یونس (علیہ السلام) بھی شریک قرعہ ہوئے تو (قرعہ میں) یہی ملزم ٹھہرے (یعنی اپنی کانام نکلا، پس انھوں نے اپنے کو دریا میں ڈال دیا۔ شاید کنارہ قریب ہوگا، شناسداری کر کے کنارہ پر جا پہنچنے کا ارادہ ہوگا، پس مشبہ خود کشتی کا لازم نہیں آتا) پھر (جب دریا میں گرے تو ہمارے حکم سے) ان کو مچھلی نے ثابت نگل لیا اور یہ (اس وقت) اپنے کو (اس اجتہادی غلطی پر) ملامت کر رہے تھے (یہ تو دل سے توبہ ہوئی اور زبان سے بھی توحید و تسبیح کے ساتھ استغفار کر رہے تھے، جیسا دوسری آیت میں ہے لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ) سو اگر وہ (اس وقت) تسبیح (و استغفار) کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی کے پیٹ میں رہتے (مطلب یہ کہ پیٹ سے نکلنا میسر نہ ہوتا، بلکہ اس کی غذا بنا دیے جاتے) سو چونکہ انھوں نے تسبیح اور توبہ کی اس لئے، ہم نے (ان کو اس سے محفوظ رکھا اور مچھلی کے پیٹ نکال کر) ان کو ایک میدان میں ڈال دیا (یعنی مچھلی کو حکم دیا کہ کنارے پر اگل دے) اور وہ اس وقت مضحک تھے (کیونکہ مچھلی کے پیٹ میں کافی ہوا اور غذا نہ پہنچتی تھی) اور ہم نے (دھوپ سے بچانے کے لئے) اُن پر ایک بیلدار درخت بھی اگادیا تھا اور کوئی پہاڑی بکری انھیں دودھ پلا جاتی تھی) اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی طرف (شہرینو) میں موصل کے قریب (پیغمبر بنا کر بھیجا تھا، پھر وہ لوگ ایمان لے آئے تھے) آثار عذاب دیکھ کر اجمالا اور مچھلی کے واقعہ کے بعد حضرت یونس علیہ السلام وہاں دوبارہ تشریف لے گئے اس وقت تفصیلاً (تو ایمان کی برکت سے) ہم نے اُن کو ایک زمانہ تک (یعنی مدت عمر تک خیر و خوبی سے) عیش دیا۔

## معارف مسائل

اس سورۃ میں آخری واقعہ حضرت یونس علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ اور

اس کی متعلقہ تفصیلات سورۃ یونس کے آخر میں گذر چکی ہیں (دیکھئے معارف القرآن ص ۵۷۵، ج ۱) اور ان کا خلاصہ اوپر خلاصہ تفسیر میں بھی آ گیا ہے، اس لئے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، البتہ خاص ان آیتوں کے بارے میں چند ضروری باتیں درج ذیل ہیں:-

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ، بعض مفسرین اور مؤرخین نے اس پر بحث کی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے واقعہ سے پہلے ہی رسول بنا دیے گئے تھے یا بعد میں بنا گئے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ مچھلی کے واقعہ کے بعد انھیں رسول بنایا گیا، لیکن مترآن کریم کے ظاہری اسلوب اور بیشتر روایات سے یہی راجح ہے کہ آپ کو پہلے ہی منصب رسالت پر فائز کر دیا گیا تھا، مچھلی کا واقعہ بعد میں پیش آیا۔

إِذْ أَتَىٰ الْفُلَ الْيَهُودَیْنِ (جب کہ وہ بھاگے بھری ہوئی کشتی کی طرف) لفظ اَبَقَ سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں کسی غلام کا اپنے آقا کے پاس سے بھاگ جانا۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کے لئے اس وجہ سے استعمال فرمایا کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف سے وحی کا انتظار کرتے بغیر روانہ ہو گئے تھے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہوتے ہیں اور انکی معمولی سی لغزش بھی بڑی گرفت کا سبب بن جاتی ہے، اس لئے یہ سخت لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

فَسَاهَوْا (پس وہ شریک قرعہ اندازی ہوئے) یہ قرعہ اندازی اُس وقت کی گئی جبکہ کشتی بیچ دریا کے پہنچ کر طوفان میں گھر گئی، اور وزن کی زیادتی سے اس کے ڈوبنے کا اندیشہ ہو گیا، اور طے یہ پایا کہ ایک شخص کو دریا میں پھینک دیا جائے، قرعہ یہ متعین کرنے کے لئے ڈالا گیا کہ وہ شخص کون ہے؟

قرعہ اندازی کا حکم یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ نہ کسی کا حق ثابت کیا جاسکتا ہے نہ کسی کو مجرم قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً قرعہ کے ذریعہ کسی کو چور ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اگر دو آدمیوں میں یہ اختلاف ہو کہ فلاں جائیداد کس کی ملکیت ہے تو قرعہ کے ذریعہ اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، ہاں قرعہ اندازی اس موقع پر جائز بلکہ بہتر ہے جہاں ایک شخص کو شرعاً مکمل اختیار حاصل ہو کہ وہ چند جائز راستوں میں سے کسی بھی راستے کو اختیار کر لے۔ اب وہ اپنی مرضی سے کوئی راستہ متعین کرنے کے بجائے قرعہ ڈال کر فیصلہ کرے، مثلاً جس شخص کی ایک سے زائد بیویاں ہوں، اُسے سفر میں جاتے وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس بیوی کو چاہے ساتھ لے جائے، اب وہ اپنی مرضی سے ایسا کرنے کے بجائے قرعہ اندازی کر لے تو بہتر ہے، تاکہ کسی کی دل نہیں نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا۔

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں بھی قرعہ اندازی سے کسی کو مجرم ثابت کرنا مقصود نہیں تھا، بلکہ پوری کشتی کو بچانے کے لئے کسی کو بھی دریا میں ڈالا جاسکتا تھا، قرعہ کے



کے ذریعہ اس کی تعین کی گئی۔

فَكَانَ مِنَ الْمُسْتَضِیِّیْنَ (پس وہ مغلوب ہو گئے) اِدْحَاضٌ کے لغوی معنی ہیں کسی کو ناکام بنانا، مطلب یہ ہے کہ قرعہ اندازی میں اپنی کا نام نکل آیا، اور انھوں نے اپنے آپ کو دریائے ڈال دیا۔ اس پر خود کشی کا شبہ نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کنارہ قریب ہو اور وہ تیراکی ذریعے وہاں تک پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

فَلَوْلَا اَنْتَ كَانَتْ مِنَ الْمُسْتَضِیِّیْنَ الخ، اس آیت سے یہ سمجھنا غلط ہے کہ اگر حضرت یونس علیہ السلام تسبیح نہ کرتے تو وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس مچھلی کے پیٹ ہی کو حضرت یونس علیہ السلام کی قبر بنا دیا جاتا۔

تسبیح و استغفار سے | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مصائب اور آفتوں کو دور کرنے میں تسبیح اور مصائب دور ہوتے ہیں | استغفار خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ سورۃ انبیاء میں گذر چکا ہے کہ جب حضرت

یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تھے تو یہ کلمہ خاص طور سے پڑھتے تھے لَا اِلَهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ، اللہ تعالیٰ نے اسی کلمہ کی برکت سے انھیں اس آزمائش سے نجات عطا فرمائی، اور وہ مچھلی کے پیٹ سے صحیح سالم نکل آئے۔ اسی لئے بزرگوں سے یہ منقول چلا آتا ہے کہ وہ انفرادی یا اجتماعی مصیبت کے وقت یہ کلمہ سو لاکھ مرتبہ پڑھتے ہیں، اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مصیبت کو دور فرما دیتا ہے۔

ابوداؤد میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت یونس علیہ السلام نے جو دعاء مچھلی کے پیٹ میں کی تھی یعنی لَا اِلَهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ، اسے جو مسلمان بھی کسی مقصد کے لئے پڑھے گا اس کی دعاء قبول ہوگی (تفسیر قرطبی)

فَنَبَذْنَاهُ بِأَعْرَآءٍ وَهُوَ سَقِیْمٌ، (پس ہم نے اُن کو میدان میں ڈال دیا اور وہ اس وقت مضطرب تھا) العرار کے معنی ہیں کھلا میدان جس میں کوئی درخت نہ ہو۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ انتہائی کمزور ہو گئے تھے، اور جسم پر بال بھی باقی نہ رہے تھے۔

وَأَنْبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقِطِیْنٍ، (اور ہم نے ان پر ایک بیل دار درخت بھی اُگھا دیا تھا) یَقِطِیْنٌ ہر اُس درخت کو کہتے ہیں جس کا تنہ نہ ہو۔ روایات میں ہے کہ یہ کدو کی بیل تھی۔ اس درخت کو اُگھانے کا منشا یہ تھا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو سایہ حاصل ہو۔ یہاں شَجَرَةٍ کا لفظ بتا رہا ہے کہ یا تو اسی کدو کی بیل کو اللہ نے معجزہ کے طور پر تنہ دار بنا دیا تھا،

یا کوئی اور درخت تھا جس پر وہ بیل چڑھا دی تھی تاکہ اس سے گھٹا سایہ مل سکے، ورنہ بیل سے سایہ ملنا مشکل تھا۔

وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ آلَافٍ أَوْ يُزِيدُ وَنَادَىٰ أَنْ كُفَّ يَدَافِعُ عَنْ أَهْلِ الْبَيْتِ لِيَأْخُذَ الْفِيلَ  
 زیادہ آدمیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا تھا، یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علیم وخبیر ہیں، ان کو اس شک کے اظہار کی کیا ضرورت ہے کہ ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آدمی تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملہ عام لوگوں کی مناسبت سے کہا گیا ہے، یعنی ایک عام آدمی انھیں دیکھتا تو یہ کہتا کہ اُن کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے کچھ اوپر ہے (منظری) اور حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ یہاں شک کا اظہار مقصود ہی نہیں ہے، انھیں ایک لاکھ بھی کہا جاسکتا ہے، اور اس سے زیادہ بھی، اور اس طرح کہ اگر کسر کا لحاظ نہ کیا جائے تو ان کی تعداد ایک لاکھ تھی، اور اگر کسر کو بھی شمار کیا جائے تو ایک لاکھ سے زیادہ (بیان ہشران)

یہ جملہ چونکہ مچھلی کے واقعہ کے بعد آیا ہے اس لئے اس سے بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی بعثت اس واقعہ کے بعد ہوئی تھی۔ اور علامہ بغویؒ نے یہاں تک فرمادیا کہ اس آیت میں نینو کی طرف بعثت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ مچھلی کے واقعہ کے بعد انھیں ایک دوسری امت کی طرف بھیجا گیا، جس کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی، لیکن قرآن کریم اور روایات سے ان کے اس قول کی تائید نہیں ہوتی۔ یہاں حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کے شروع ہی میں آپ کی رسالت کا تذکرہ صاف بتا رہا ہے کہ مچھلی کا واقعہ رسول بننے کے بعد پیش آیا ہے، اس کے بعد یہاں اس جملے کو دوبارہ اس لئے لایا گیا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی تندرستی کے بعد انھیں دوبارہ وہیں بھیجا گیا تھا، یہاں یہ واضح کر دیا کہ وہ لوگ معدودے چند افراد نہیں تھے بلکہ ان کی تعداد لاکھ سے بھی اوپر تھی۔

فَاٰمَنُوْا فَمَنْعْنٰهُمْ اِلٰی حَبِيْنٍ، (پس وہ ایمان لے آئے، سو ہم نے ان کو ایک زمانہ تک عیش دیا) "ایک زمانہ تک" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ دوبارہ کفر و شرک میں مبتلا نہیں ہوئے ان پر کوئی عذاب نہیں آیا۔

مرزا قادیانی کی | یہ بات سورہ یونس کی تفسیر میں بھی واضح کی جا چکی ہے، اور اس آیت سے بھی واضح تلبیس کا جواب | ہوتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر سے جو عذاب ٹپکایا گیا وہ اس لئے کہ آپ کی قوم بروقت ایمان لے آئی تھی۔ اس سے پنجاب کے جھوٹے نبی مرزا غلام احمد قادیانی کی اس تلبیس کا خاتمہ ہو جاتا ہے کہ جب اس نے اپنے مخالفوں کو یہ چیلنج کیا کہ اگر وہ اسی طرح محنت کرتے رہے تو خدا کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ فلاں وقت تک عذاب الہی آجائے گا، لیکن مخالفین کی



جدوجہد اور تیز ہو گئی پھر بھی عذاب نہ آیا، تب ناکامی کی ذلت سے بچنے کے لئے قادیانی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ چونکہ مخالفین دل میں ڈر گئے ہیں اس لئے اُن پر سے عذاب اُٹل گیا، جس طرح یونس علیہ السلام کی قوم پر سے اُٹل گیا تھا، لیکن قرآن کریم کی یہ آیت اس تاویل باطل کو مردود قرار دیتی ہے۔ اس لئے کہ قوم یونس علیہ السلام تو ایمان کی وجہ سے عذاب سے بچی تھی، اس کے برعکس مرزا قادیانی کے مخالفین نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں لائے بلکہ ان کی مخالفانہ جدوجہد اور تیز رفتاری۔

فَاسْتَفْتِهِمُ الرَّبُّ ۖ لَئِنْ لَّمْ يَكْفُرُوا بِالْبَنَاتِ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ﴿۱۶۹﴾ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ

اب اُن سے پوچھ کیا تیرے رب کے یہاں بیٹیاں ہیں اور ان کے یہاں بیٹے، یا ہم نے بنایا فرشتوں کو

إِنَّا نَاوَاهُمْ شُهَدَاؤُنَ ۚ ﴿۱۷۰﴾ أَلَا إِنَّهُمْ مِّنْ أَفْكِهَمَ ۖ لَيَقُولُونَ ﴿۱۷۱﴾

عورت اور وہ دیکھتے تھے ؟ سننا ہے، وہ اپنا جھوٹ کہتے ہیں کہ

وَلَدَ اللَّهُ ۖ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۱۷۲﴾ أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ ﴿۱۷۳﴾

اللہ کے اولاد ہوئی، اور وہ بیشک جھوٹے ہیں۔ کیا اُس نے پسند کیس بیٹیاں بیٹوں سے

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿۱۷۴﴾ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۷۵﴾ أَمْ لَكُمْ

کیا ہو گیا ہو تم کو کیا انصاف کرتے ہو ؟ کیا تم دھیان نہیں کرتے ہو، یا سمجھائے پاس کوئی

مُسْلَطٌ مُّبِينٌ ﴿۱۷۶﴾ فَأَنذَرْتُكُمْ لَئِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۷۷﴾ وَ

سند ہے کھلی ؟ تو لاؤ اپنی کتاب اگر ہو تم سچے اور

جَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ نِجَاطًا ۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ

ٹھہرایا ہوا انھوں نے خدا میں اور جہنم میں ناتوا، اور جہنم کو تو معلوم ہے کہ تحقیق

لَمُحْضَرُونَ ﴿۱۷۸﴾ سُبْحَنَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ ﴿۱۷۹﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ

وہ پکڑے ہوئے آئیں گے۔ اللہ پاک ہر ان باتوں سے جو یہ بتاتے ہیں، مگر جو بندے ہیں اللہ

الْمُخْلِصِينَ ﴿۱۸۰﴾ فَإِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ ﴿۱۸۱﴾ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ

کے بچنے ہوئے۔ سو تم اور جن کو تم پوجتے ہو، کسی کو اس کے ہاتھ سے بہکا کر

يَفْتِنِينَ ﴿۱۸۲﴾ إِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيمِ ﴿۱۸۳﴾ وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ

نہیں لے سکتے، مگر اسی کو جو پہنچنے والا ہے دوزخ میں۔ اور ہم میں جو ہے اس کا

مَقَامٌ مَّعْلُومٌ ﴿۱۶۳﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُونَ ﴿۱۶۴﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ ﴿۱۶۵﴾

ایک ٹھکانا ہر مقرر، اور ہم ہی ہیں صفت باندھنے والے، اور ہم ہی ہیں پاکی بیان کرنے والے۔

## خلاصہ تفسیر

(توحید کے دلائل تو اوپر بیان ہو چکے) سو اب اس کے بعد ان لوگوں سے (جو ملائکہ اور جنات کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں، اس طرح کہ ملائکہ کو نعوذ باللہ خدا کی بیٹیاں اور جنات کے سرداروں کی بیٹیوں کو ان فرشتوں کی مائیں قرار دیتے ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے نسب شتم ہے، اور جنات سے زوجیت کا تعلق ہے، سو ان سب) پوچھئے کہ کیا خدا کے لئے تو بیٹیاں (ہوں) اور تمھارے لئے بیٹے (ہوں) یعنی جب اپنے لئے بیٹے پسند کرتے ہو تو عقیدہ مذکور میں خدا کے لئے بیٹیاں کیسے تجویز کرتے ہو۔ پس اس عقیدے میں ایک خرابی تو یہ ہے اور (ہاں) (دوسری بات سنو کہ) کیا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا ہے اور وہ (ان کے بننے کے وقت) دیکھ رہے تھے (یعنی ایک دوسری بُرائی یہ ہے کہ فرشتوں پر بلا دلیل مؤنث ہونے کی ہمت رکھتے ہیں) خوب سن لو کہ وہ لوگ (دلیل کچھ نہیں رکھتے، بلکہ محض) سخن تراشی سے کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ صاحب اولاد ہے اور وہ یقیناً (بالکل) جھوٹے ہیں (پس اس عقیدے میں تیسری بُرائی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت لازم آتی ہے، ان میں سے پہلی بُرائی کا قبح عرف سے، دوسری کا نقل سے اور تیسری کا عقل سے ثابت ہے۔ اور چونکہ جاہلوں کے لئے عرفی بُرائی کا اثبات زیادہ مؤثر ہوتا ہے، اس لئے پہلی بُرائی کو دوسرے عنوان سے مکرر فرماتے ہیں کہ ہاں، کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیاں زیادہ پسند کیں؟ تم کو کیا ہو گیا تم کیسا (بیہودہ) حکم لگاتے ہو؟ (جس کو عرفاً خود بھی بُرا سمجھتے ہو) پھر (علاوہ عرف کے) کیا تم (عقل اور) سوچ سے کام نہیں لیتے ہو (کہ یہ عقیدہ عقل کے بھی خلاف ہے) ہاں (اگر دلیل عقلی نہیں تو) کیا تمھارے پاس (اس پر) کوئی واضح دلیل موجود ہے (اس سے مراد نقلی دلیل ہے) سو تم اگر (اس میں) سچے ہو تو اپنی وہ کتاب پیش کرو اور (عقیدہ مذکورہ میں ملائکہ کو اولاد قرار دینے کے علاوہ) ان لوگوں نے اللہ میں اور جنات میں (بھی) رشتہ داری قرار دی ہے (جس کا بطلان اور بھی زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ بیوی جس کام کے لئے ہوتی ہے اس سے حق تعالیٰ پاک ہے، اور جب زوجیت محال ہے تو سسرالی رشتے جو اُسی سے نکلتے ہیں وہ بھی محال ہوں گے) اور (جس کو یہ لوگ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں ان کی تو یہ کیفیت ہے کہ ان میں جو جنات



دیں خود ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ان میں جو کافر ہیں، وہ (عذاب میں) گرفتار ہوں گے (اور عذاب میں کیوں گرفتار نہ ہوں کہ حق تعالیٰ کی نسبت بُری بُری باتیں بیان کرتے ہیں، حالانکہ اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو جو یہ بیان کرتے ہیں) پس ان کا فرمانہ بیانات سے وہ گرفتار عذاب ہوں گے، مگر جو اللہ کے خاص (یعنی ایمان والے) بندے ہیں (وہ اس عذاب سے بچیں گے) سو تم اور تمہارے سارے معبود (سب مل کر بھی) خدا سے کسی کو پھیر نہیں سکتے (جیسی تم کو شش سہا کرتے ہو، مگر اسی کو جو کہ (علم الہی میں) جہنم رسید ہونے والا ہے اور آگے ملائکہ کا ذکر فرماتے ہیں کہ ان میں جو ملائکہ ہیں ان کا یہ مقولہ ہے کہ ہم تو بندہ محض ہیں، چنانچہ جو خدمت ہمارے سپرد ہے اس میں ہم سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے کہ اسی کی بجا آوری میں لگے رہتے ہیں اپنی رائے سے کچھ نہیں کر سکتے) اور ہم (خدا کے حضور میں حکم سننے کے وقت یا عبادت کے وقت ادب سے صاف بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور ہم (خدا کی) پاکی بیان کرنے میں بھی لگے رہتے ہیں (غرض ہر طرح محکوم اور بندے ہیں۔ سو جب فرشتے خود اپنی بندگی کا اعتراف کر رہے ہیں تو پھر ان پر معبود ہونے کا شبہ کرنا بڑی بیوقوفی ہے، پس جنات اور ملائکہ کے حق میں خدائی کا اعتقاد باحسن جو باطل ہو گیا)

## معارف و مسائل

انبیاء علیہم السلام کے واقعات نصیحت و عبرت کے لئے بیان کئے گئے تھے، اب پھر توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کا اصل مضمون بیان کیا جا رہا ہے، اور یہاں شرک کی ایک خاص قسم کا بیان ہے۔ کفار عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اور جنات کی سردارزادیاں فرشتوں کی مائیں ہیں۔ بقول علامہ واحدیؒ یہ عقیدہ قریش کے علاوہ جہینہ، بنو سلمہ، بنو خزاعہ اور بنو ملیح کے یہاں بھی رائج تھا (تفسیر کبیر، ص ۱۱۲ ج ۷)۔

فَاَسْتَفْتِيَهُمْ (الی قولہ تعالیٰ) اِنْ كُنْتُمْ حَصِيَّةً قِيَّتْ، ان آیتوں میں کفار عرب کے اسی عقیدے کی تردید کے لئے دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تو تمہارا یہ عقیدہ خود تمہارے عرف اور رسم و رواج کے لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ تم بیٹیوں کو باپ سے ننگ سمجھتے ہو، اب جو چیز تمہارے اپنے لئے ننگ و عار ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ پھر تم نے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا ہے، اس کی تمہارے پاس دلیل کیا ہے؟ کسی دعوے کو ثابت کرنے کے لئے تین قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں۔ ایک مشاہدہ، دوسرے نقلی دلیل، یعنی کسی ایسی ذات کا قول جس کی سچائی مسلم ہو، اور تیسرے عقلی دلیل۔ جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو فرشتوں کی تخلیق کرتے ہوئے دیکھا،

نہیں جس سے فرشتوں کا مونث ہونا معلوم ہو سکتا، لہذا مشاہدہ کی کوئی دلیل تو تھا اے پاس ہی نہیں  
 رَامُ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ ابھی مطلب ہی، اب رہی نقلی دلیل سودہ بھی تھا کہ  
 پاس نہیں، اس لئے کہ قول ان لوگوں کا معتبر ہوتا ہے جن کی سچائی مسلم ہو، اس کے برخلاف جو لوگ  
 اس عقیدے کے قائل ہیں وہ چھوٹے لوگ ہیں، ان کی بات کوئی حجت نہیں ہو سکتی رَاٰآءِ يَهُودُ  
 وَمَنْ اَفْكِهِمْ لَيَقُولَنَّ اِنْ كَانَتْ اِلٰهٌ كَمَا يَسْبِيْطُ ابھی مطلب ہی، رہی عقلی دلیل، سودہ بھی تھا رہی تائید نہیں کرتی،  
 اس لئے کہ خود تھا اے خیال کے مطابق بیٹیاں بیٹوں کے مقابلے میں کم رتبہ رکھتی ہیں، اب جو ذات  
 تمام کائنات سے افضل ہے وہ اپنے لئے کم رتبہ والی چیز کو کیسے پسند کر سکتی ہے؟ رَاَصْطَفٰى  
 الْبَنَاتِ عَلٰى الْبَنِيْنَ کا یہی مطلب ہے، اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ تھا اے  
 پاس کوئی آسمانی کتاب آئی ہو اور اس میں بذریعہ وحی تمہیں اس عقیدے کی تعلیم دی گئی ہو،  
 سو اگر ایسا ہے تو دکھاؤ وہ وحی اور وہ کتاب کہاں ہے؟ رَامُ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ، فَاَنْتُمْ  
 يَكْسِبُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کا یہی مفہوم ہے۔

ہٹ دھرمی کرنے والوں کے لئے | ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ہٹ دھرمی پر تیلے ہوئے ہوں  
 الزامی جواب زیادہ مناسب ہے | ان کو الزامی جواب دینا زیادہ مناسب ہے۔ الزامی جواب کا  
 مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے دعوے کو خود انہی کے کسی دوسرے نظریہ کے ذریعہ باطل کیا جائے  
 اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسرا نظریہ ہمیں بھی تسلیم ہے، بلکہ بسا اوقات وہ دوسرا نظریہ  
 بھی غلط ہوتا ہے، لیکن مخالف کو سمجھانے کے لئے اس سے کام لے لیا جاتا ہے۔ یہاں ہاں تعالیٰ  
 نے ان کے عقیدہ کی تردید کے لئے خود انہی کے اس نظریہ کو استعمال فرمایا ہے کہ بیٹیوں کا وجود  
 باعثِ ننگ و عار ہے، ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بیٹیوں کا وجود باعثِ ننگ ہو، نہ  
 یہ مطلب ہی کہ اگر وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کے بجائے خدا کے بیٹے کہتے تو یہ درست ہوتا  
 بلکہ یہ ایک الزامی جواب ہے جس کا مقصد خود انہی کے مزعومات سے ان کے عقیدے کی تردید  
 کرنا ہے، ورنہ اس قسم کے عقائد کا حقیقی جواب وہی ہے جو قرآن کریم ہی میں کسی جگہ مذکور ہے  
 کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، اور اُسے کسی اولاد کی نہ ضرورت ہے، اور نہ اس کی رفعتِ شان کے  
 یہ مناسب ہے کہ اس کی اولاد ہو۔

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ نَسَبًا، اور انھوں نے اللہ تعالیٰ اور جنات  
 کے درمیان نسی تعلق قرار دیا ہے) اس جملے کی ایک تفسیر تو یہ ہو کہ یہ مشرکین عرب کے اس فاسد  
 عقیدے کا بیان ہے کہ جنات کی سردارزادیاں فرشتوں کی مائیں ہیں۔ گویا معاذ اللہ جنات کی  
 سردارزادیوں سے اللہ تعالیٰ کا زوجیت کا تعلق ہے، اور اسی تعلق کے نتیجے میں فرشتے



وجود میں آئے ہیں۔ چنانچہ ایک تفسیری روایت میں ہے کہ جب مشرکین عرب نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا تو حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ ان کی ماں کون ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ جنات کی سرارزادیاں۔ (تفسیر ابن کثیر، ص ۲۳ ج ۱۲)۔ لیکن اس تفسیر پر یہ اشکال رہتا ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ اور جنات کے درمیان نسب تعلق کا ذکر ہے اور زوجیت کا تعلق نسب نہیں ہوتا۔

اس لئے ایک دوسری تفسیر یہاں زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے جو حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور ضحاکؒ سے منقول ہے، اور وہ یہ کہ بعض اہل عرب کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ معاذ اللہ ابلیس اللہ تعالیٰ کا بھائی ہے، اللہ تعالیٰ خالق خیر ہے اور وہ خالق شر، یہاں اسی باطل عقیدے کی تردید کی گئی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیرؒ و قرطبیؒ و تفسیر کبیر)۔

وَلَقَدْ عَلِمَتْ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ (اور جنات کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ گرفتار ہوں گے) "وہ" سے مراد اہل مشرکین بھی ہو سکتے ہیں جو جنات اور شیاطین کو خدا کا ہمسر قرار دیتے تھے اور خود جنات بھی۔ دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ جن شیاطین اور جنات کو تم نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا رکھا ہے وہ خود اچھی طرح جانتے ہیں کہ آخرت میں ان کا برا حشر ہونے والا ہے، مثلاً ابلیس، کہ وہ اپنے انجام بد سے خوب واقف ہے، اب جو خود یہ یقین رکھتا ہو کہ مجھے مبتلائے عذاب ہونا ہے اُسے خدا کا ہمسر قرار دینا کتنی بڑی حماقت ہے۔

وَإِنْ كَانُوا لَيَقُولُنَّ ۖ لَوْ أَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۖ لَكُنَّا

اور یہ تو کہا کرتے تھے۔ اگر ہمارے پاس کچھ احوال ہوتا پہلے لوگوں کا تو ہم

عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۖ فَكُفِّرُوا بِيهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۖ (۱۶۹)

ہوتے بندے اللہ کے چنے ہوئے۔ سو اس سے منکر ہو گئے اب آگے جان لیں گے اور

لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْرُسُلِينَ ۖ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمُتَوَرُّونَ ۖ (۱۷۰)

پہلے ہو چکا ہمارا حکم اپنے بندوں کے حق میں جو کہ رسول ہیں۔ بیشک انہی کو مدد دی جاتی ہے۔

وَإِنْ جُنَدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ۖ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ۖ وَأَبْصُرْهُمْ

اور ہمارا لشکر جو ہی غالب ہو۔ سو تو ان سے پھر ایک وقت تک، اور ان کو دیکھتا رہ

فَسَوْفَ يَبْصُرُونَ ۖ أَفَبِعَدْنِآ يَسْتَعْجِلُونَ ۖ فَإِذَا نَزَلَ

کہ وہ آگے دیکھ لیں گے۔ کیا ہماری آفت کو جلد مانگتے ہیں، پھر جب اترے گی

يَسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ ۝ ۱۴۸ ۝ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ۝ ۱۴۹ ۝

ان کے میدان میں تو بُری صبح ہوگی ڈرائے ہوؤں کی، اور پھر اُن سے ایک وقت تک

وَأَبْصَرَ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ۝ ۱۴۹ ۝

اور دیکھتا رہے اب آگے دیکھ لیں گے۔

## خلاصہ تفسیر

اور یہ لوگ یعنی کفار عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت کی کتاب، پہلے لوگوں کی کتابوں کے طور پر آتی (یعنی جیسے یہود و نصاریٰ کے پاس رسول اور کتابیں آتیں، اگر ہمارے لئے ایسا ہوتا) تو ہم اللہ کے خاص بندے ہوتے (یعنی اس کتاب کی تصدیق اور اس پر عمل کرتے، ان کی طرح تکذیب اور مخالفت نہ کرتے) پھر جب وہ نصیحت کی کتاب رسول کے ذریعہ سے اُن کو پہنچی تو یہ لوگ اس کا انکار کرنے لگے (اور اپنا وہ عہد توڑ دیا) سو (خیر) اب ان کو اس کا انجام معلوم ہوا جاتا ہے (چنانچہ مرتے ہی کفر کا انجام سامنے آگیا، اور بعض ہمزائیں موت سے پہلے بھی مل گئیں) اور آگے حضور کو تسلی ہے کہ گو اس وقت ان مخالفین کو کسی قدر شوکت حاصل ہے لیکن یہ چند روزہ ہے (کیونکہ) ہمارے

خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے ہمارا یہ قول پہلے ہی سے (یعنی لوح محفوظ ہی میں) مقرر ہو چکا ہے کہ بیشک وہی غالب کئے جاویں گے اور (ہمارا تو عام قاعدہ ہے کہ) ہمارا لشکر غالب رہتا ہے (جو رسولوں کے متبعین کو بھی شامل ہے، سو جب یہ بات ہے کہ آپ غالب گئے والے ہیں ہی) تو آپ (تسلی رکھئے اور) تھوڑے زمانہ تک (صبر کیجئے اور) ان (کی مخالفت اور ایذا رسانی) کا خیال نہ کیجئے اور (ذرا) اُن کو دیکھتے رہئے (یعنی ان کی حالت کا قدرے انتظار کیجئے) سو عنقریب

یہ بھی دیکھ لیں گے (اس کا بھی وہی مطلب ہے جو فسوف یعلمون کا تھا کہ اُن کو مرنے کے بعد بھی اور مرنے سے پہلے بھی اللہ کی طرف سے سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس دھکی پر وہ کہہ سکتے تھے اور اکثر وہ کہا بھی کرتے تھے کہ ایسا کب ہوگا؟ تو اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارے عذاب کا تقاضا کر رہے ہیں، سو وہ (عذاب) جب اُن کے رُودِ رُودِ آنازل ہوگا، سو وہ دن

ان لوگوں کا جن کو (پہلے سے) ڈرایا جا چکا تھا بہت ہی بُرا ہوگا کہ وہ عذاب ٹل نہ سکے گا، اور جب یہ بات ہے کہ ان لوگوں پر عذاب واقع ہونے والا ہے تو آپ (تسلی رکھئے اور) تھوڑے زمانہ تک (صبر کیجئے اور) ان (کی مخالفت اور ایذا رسانی) کا خیال نہ کیجئے اور (ذرا) ان کی حالت کو



دیکھتے رہتے (یعنی منتظر رہتے) سو عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے (یعنی آپ کو تو ہمارے کہنے سے یقین ہے ہی، آنکھوں سے دیکھ کر انھیں بھی یقین آجائے گا)۔

## معارف و مسائل

اسلام کے بنیادی عقائد کو دلائل و شواہد سے ثابت کرنے کے بعد ان آیتوں میں کفار کی ہرٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل تمنا کیا کرتے تھے کہ اللہ کا کوئی پیغمبر آئے تو یہ اس کی پیروی کریں، لیکن جب آپ تشریف لے آئے تو انھوں نے صناد و رعد کا دھمکاؤں سے رنجیدہ نہ ہوں، عنقریب وہ وقت کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ان لوگوں کی ایذا رسانیوں سے رنجیدہ نہ ہوں، عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ آپ غالب اور فتح یاب ہوں گے اور یہ مغلوب اور نشانہ عذاب۔ آخرت میں تو اس کا مکمل مظاہرہ ہوگا ہی، دنیا میں بھی اللہ نے دکھا دیا کہ غزوہ بدر سے لے کر فتح مکہ تک ہر جہاد میں اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ظفر مند کیا، اور آپ کے مخالفین ذلیل و خوار ہوئے۔

اللہ والوں کے غلبہ کا مطلب ان آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے یہ بات پہلے سے طے کر رکھی ہے کہ ہمارے خاص بندے یعنی پیغمبر ہی غالب ہوتے ہیں۔ اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کو دنیا میں غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معلوم پیغمبروں میں اکثریت تو ایسے ہی حضرات کی ہی جن کی قومیں انھیں جھٹلا کر عذاب میں مبتلا ہوئیں، اور ان حضرات کو عذاب سے محفوظ رکھا صرف چند انبیاء علیہم السلام ایسے ہیں جنہیں دنیا میں آخر وقت تک بظاہر مادی طور پر غلبہ نہ مل سکا، لیکن دلیل و حجت کے میدان میں ہمیشہ وہی سر بلند ہے، اور نظریاتی فتح ہمیشہ انہی کو حاصل ہوتی، ہاں اس سر بلندی کے مادی آثار کسی خاص حکمت مثلاً آزمائش وغیرہ کی وجہ سے آخرت تک موخر کر دیئے گئے۔ لہذا بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ذلیل رہزن کسی بڑے حاکم افسر کے ساتھ سفر کی حالت میں لوٹ مار کرنے لگے، مگر وہ حاکم اپنی خداداد عالی دماغی کی وجہ سے ہرگز اس ذلیل رہزن کی خوشامد نہیں کرے گا، حتیٰ کہ جب وہ حاکم اپنے دار الحکومت میں پہنچے گا اس رہزن کو گرفتار کر کے سزا دے گا۔ لہذا اس عارضی غلبہ کی وجہ سے نہ اس رہزن کو حاکم کہہ سکتے ہیں اور نہ اس افسر کو محکوم، بلکہ اصلی حالت کے اعتبار سے وہ رہزن اس غلبہ میں بھی محکوم ہے، اور وہ افسر اس مغلوبیت میں بھی

حاکم ہے۔ اسی بات کو حضرت ابن عباسؓ نے ایک مختصر اور سلیس عنوان سے تعبیر فرمایا ہے: اِنَّ لَمْ يُنْصَرْ وَ اِنِّی الْمَدُّ نِیَا یُنْصَرُ وَ اِنِّی الْاُخْرَی (بیان القرآن تفسیر سورۃ مائدہ)

لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ غلبہ خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں کسی قوم کو محض خصوصیات نسلی یا دین کے ساتھ محض نام کے تعلق سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے آپ کو "اللہ کے شکر" کا ایک فرد بنالے جس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ ہر شعبہ زندگی میں اللہ کی اطاعت کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہو۔ یہاں "بُحْنُنا" (ہمارا شکر) کا لفظ بتا رہا ہے کہ جو شخص سلام قبول کرے اُسے اپنی ساری زندگی نفس اور شیطان کی طاقتوں سے جنگ کرنے میں خرچ کرنے کا معاہدہ کرنا ہوگا اور اس کا غلبہ خواہ مادی ہو یا اخلاقی، دنیا میں ہو یا آخرت میں، اسی شرط پر موقوف ہے۔

قَاذَا نَزَلَ یَسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِینَ، (پس جب وہ عذاب اُن کے صحن میں آنازل ہوگا تو جن لوگوں کو پہلے ڈرایا جا چکا تھا اُن کی وہ صبح بہت بُری ہوگی) سَاحَہ کے لفظی معنی صحن کے ہیں اور نَزَلَ یَسَاحَتِہ (اس کے صحن میں اُترنا) عربی محاورہ ہے جس کا مفہوم کسی آفت کا سامنا آجانا اور صبح کے وقت کی تخصیص یہ ہے کہ اہل عرب میں دشمن کا حملہ عموماً اُسی وقت ہوا کرتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی یہی تھا کہ اگر کسی دشمن کے خطے میں رات کے وقت پہنچتے تو حملے کے لئے صبح تک انتظار فرماتے تھے (مظہری) روایات میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلعہ خیبر پر صبح کے وقت حملہ کیا تو ارشاد فرمایا "اللہ اکبر، خربت خیبر، اِنَّا اِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِینَ" (اللہ اکبر! خیبر ویران ہو گیا، بلاشبہ جب ہم کسی قوم کے صحن میں اترتے ہیں تو جن لوگوں کو پہلے ڈرایا جا چکا تھا اُن کی وہ صبح بہت بُری ہوتی ہے)۔

سُبْحَنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلَامٌ عَلَى

پاک ذات ہر تیرے رب کی وہ پروردگار عزت والا پاک ہو اُن باتوں کو جو وہ بیان کرتے ہیں، اور سلام ہے

الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۸۲﴾

رسولوں پر، اور سب خوبی ہے اللہ تعالیٰ کو جو رب ہے سارے جہان کا۔

## خُلاصۃ تفسیر

آپ کا رب جو بڑی عظمت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ (کافر) بیان کرتے ہیں



رہیں خدا کو ان باتوں سے پاک ہی قرار دو) اور پیغمبروں کو واجب الاتباع سمجھو، کیونکہ ہم انکی شان میں یہ کہتے ہیں کہ (سلام ہو پیغمبروں پر اور (خدا کو شرک وغیرہ سے پاک سمجھنے کے ساتھ ساتھ تمام کمالات کا جامع بھی سمجھو، کیونکہ) تمام تر خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام عالم کا پروردگار (اور مالک) ہے ۛ

## معارف و مسائل

ان آیتوں پر سورۃ صافات کو ختم کیا گیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس حسین خاتمے کی تشریح کے لئے دفتر چاہئیں۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان تین مختصر آیتوں میں سورت کے جملہ مضامین کو سمیٹ دیا ہے۔ سورت کی ابتداء توحید کے بیان سے ہوئی تھی، جس کا حاصل یہ تھا کہ مشرکین جو جو باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں باری تعالیٰ ان سب سے پاک ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں اسی طویل مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد سورت میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کئے گئے تھے، چنانچہ دوسری آیت میں ان کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد کھول کھول کر کفار کے عقائد اور شبہات و اعتراضات کی عقلی و نقلی تردید کر کے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ غلبہ بالآخر اہل حق کو حاصل ہوگا، ان باتوں کو جو شخص بھی عقل و بصیرت کی نگاہ سے پڑھے گا وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء پر مجبور ہوگا، چنانچہ اسی حمد و ثناء پر سورت کو ختم کیا گیا ہے۔

نیز ان آیتوں میں اسلام کے بنیادی عقائد توحید اور رسالت کا صراحتہ اور آخرت کا ضمنی ذکر بھی آگیا ہے۔ جن کا اثبات سورت کا اصل مقصد تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی دیدی گئی کہ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مضمون ہر خطبے اور ہر مجلس کا اختتام باری تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے اور اس کی حمد و ثناء پر کرے۔ چنانچہ علامہ قرطبی نے یہاں اپنی سند سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بار سنا کہ آپ نماز ختم ہونیکے بعد یہ آیات تلاوت فرماتے تھے: سُبْحَنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ۔ نیز متعدد تفاسیر میں امام بغوی کے حوالہ سے حضرت علیؑ کا یہ قول منقول ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ قیامت کے دن اسے بھرپور پیمانے سے اجر ملے اسے چاہئے کہ وہ اپنی ہر مجلس کے آخر میں یہ پڑھا کرے سُبْحَنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ اٰلِیْ اٰخِرِ السَّوۃِ۔ یہی قول ابن ابی عامر نے حضرت شعبیؒ کی روایت مرفوعاً بھی نقل کیا ہے (تفسیر ابن کثیر)

سُبْحَنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ  
بحمد اللہ تعالیٰ آج بتاریخ، المحرم الحرام ۱۴۲۸ھ شب یکشنبہ بوقت عشاء سورۃ صافات

کی تفسیر مکمل ہوئی





بَلْ لَّمَّا يَدْرُفُوا عَذَابِ ۝۵ أَمْ عِندَهُمْ خَزَائِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ  
 کوئی نہیں، ابھی انہوں نے جھکی نہیں میری بارگاہ کیا ان کے پاس میں خزانے میرے رب کی ہر بات  
 رَبِّكَ الْغَنِيُّ الْوَسَّابُ ۝۶ أَمْ لَهُمْ مَلَائِكَةُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ  
 کے جو زبردست ہے بے شک والا یا ان کی حکومت ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور  
 وَمَا بَيْنَهُمَا قَلِيلٌ تَقْتَرِبُونَ فِي الْأَسْيَابِ ۝۷ مُجِدِّ مَا هَذَا  
 جو کہ ان کے نزدیک میں ہے ۹ تو ان کو چاہیے کہ پڑھ جائیں رساں ان کو ایک نکتہ یہ بھی دہاں تیار ہوا  
 مَهْزُومٌ مِنَ الْأَحْزَابِ ۝۱۱ كَذَبْتَ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ  
 ان سب لشکروں میں جھٹلا کر ہیں ان سے پہلے نوح کی قوم  
 وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ ذُرِّيَّتُهُ ابْنُ زُلَيْكَةَ ۝۱۲ وَتَمُودُ وَفِرْعَوْنُ  
 اور عاد اور فرعون مینوں والا اور تمود اور لوط کی قوم اور  
 أَصْحَابِ لُؤْلُؤٍ أُولَئِكَ الْأَحْزَابُ ۝۱۴ إِنْ كُلَّ إِلَّا  
 ایک کے ایک وہ پہلی دہائی میں تھے تھے تھے  
 كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ۝۱۵ وَمَا يَنْظُرُ هُوَ إِلَّا  
 سب نے جھٹلایا رسولوں کو پھر نجات ہوئی میری طرف سے سزا اور راہ نہیں دیکھتے یہ لوگ  
 صَيْحَةً وَاحِدَةً مَّا لَهُمْ مِنْ فِرَاقٍ ۝۱۶ وَقَالُوا إِنَّا عَجِلُّ  
 مگر ایک چٹھاؤں کی جو پہنچ میں دم نہ لے گی اور کہتے ہیں اے رب جلد دے

لَتَأْتِيَ قَطَنًا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ۝۱۷

اے کہ تم بھی ہماری پہلے حساب کے دن سے

## خلاصہ تفسیر

تفسیر (اس کے معنی تو اللہ کو معلوم ہیں) قسم ہے قرآن کی جو نصیحت سے گریز ہے اگر کفار آپ کی رسالت  
 کا انکار کرتے ہوئے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ٹھیک نہیں بلکہ (خوف) یہ کفار (جنا) تعصب اور دشمنی کی بات  
 میں (اڑتے) ہیں اور اس تعصب و مخالفت کو بال بال ایک روز ان پر پڑنے والا ہے جیسا ان سے پہلے بہت  
 سی امتوں کو ہم (عذاب سے) لڑا کر چکے ہیں سو انہوں نے (برکت کے وقت) بڑی (سے) بھاگ کر (اور بہت  
 شور و غل مچایا) اور اس وقت شور و غل سے کیا ہوتا ہے کیونکہ وہ وقت غلامی کا دھماکا اس لئے کہ  
 عذاب جب آچکے تو تو یہی قبول نہیں ہوتی اور ان کفار (فریض) کے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے  
 پاس ان (دشمن) سے (یعنی جو کہ ان کی طرح بشر ہے) ایک (پیشروں والا) آگیا (تعجب کی وجہ

یہ تھی کہ وہ اپنی جہالت سے بشریت کو نبوت کے منافی سمجھتے تھے اور اس انکار رسالت میں یہاں تک پہنچ گئے، کہ آپ کے معجزات اور دعویٰ نبوت کے بارے میں، کہنے لگے کہ (نعم ذالقدر) یہ شخص (خوارقِ عادت کے معاملہ میں) ساحر اور (دعویٰ نبوت کے معاملہ میں) کذاب ہے (اور) کیا یہ شخص سچا ہو سکتا ہے جبکہ اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا (اور سب کے معبود ہونے کی نفی کر دی) واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ (جس کی وجہ عنقریب آتی ہے) اور (توحید کا مضمون سن کر) ان کفار میں کے رئیس (مجلس سے اٹھ کر لوگوں سے) یہ کہتے ہوئے چلے کہ (یہاں سے) چلو اور اپنے معبودوں (کی عبادت) پر قائم رہو (کیونکہ اول تو) یہ (توحید کی دعوت) کوئی مطلب کی بات (معلوم ہوتی) ہے یعنی اس بہانہ سے آپ معاذ اللہ ریاست کے خواہاں ہیں۔ دوسرے توحید کا دعویٰ بھی باطل اور عجیب ہے کیونکہ ہم نے تو یہ بات (اپنے) کچھلے مذہب میں نہیں سنی، ہونہ ہو یہ (اس شخص کی) من گھڑت ہے (کچھلے مذہب کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے طریقہ کے لوگ ہوئے ہیں، سب سے پیچھے ہم آئے ہیں اور حق پر ہیں، سو ہم نے اس طریقہ کے بزرگوں سے کبھی یہ بات نہیں سنی۔ اور یہ شخص جو نبوت کا مدعی ہے اور توحید کو تعلیم الہی بتاتا ہے، سوا اول تو نبوت بشریت کے منافی ہے۔ دوسرے اگر اس سے قطع نظر کی جائے تو کیا ہم سب میں اسی شخص (کو کوئی) فوقیت و فضیلت تھی کہ اسی کو نبوت ملی اور اسی پر کلام الہی نازل کیا گیا (بلکہ کسی رئیس پر ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ ان پر کیوں نزول ہوا؟ کسی رئیس پر کیوں نہ ہوا؟ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کا اتباع کرتے) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ لوگ (خود) میری رحمت کی طرف سے شک (یعنی انکار) میں ہیں۔ (یعنی مسئلہ نبوت ہی کے منکر ہیں، خصوصاً بشر کو نبی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اور یہ انکار بھی کچھ اس لئے نہیں کہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ) انھوں نے ابھی تک میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا (اور نہ سب عقل ٹھکانے آجانی۔ آگے دوسرے طرز پر جواب ہے کہ) کیا ان لوگوں کے پاس آپ کے پروردگار زبردست فیاض کی رحمت کے خزانے ہیں (جس میں نبوت بھی داخل ہے، کہ جس کو چاہیں دیں، جس کو چاہیں نہ دیں۔ یعنی اگر رحمت کے سارے خزانے ان کے قبضہ میں ہوتے تب تو ان کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ ہم نے بشر کو نبوت نہیں دی، پھر وہ نبی کیسے ہو گیا؟) یا (اگر سارے خزانے قبضہ میں نہیں ہیں تو) کیا ان کو آسمان اور زمین اور جو چیزیں ان کے درمیان میں ہیں ان (سب) کا اختیار حاصل ہے (کہ اگر اتنا ہی اختیار ہوتا تب بھی یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ یہ آسمان و زمین کے مصالح سے باخبر ہیں، اس لئے جسے چاہیں اُسے نبوت ملنی چاہئے۔ اور آگے تعجیر کے طور پر ارشاد ہے کہ اگر ان کو اس پر اختیار ہے) تو ان کو چاہئے کہ سترھیاں لگا کر (آسمان پر) چڑھ جاویں (اور ظاہر ہے کہ یہ اس پر قادر نہیں۔ پس جب انھیں اتنی بھی قدرت نہیں تو آسمان و زمین کی معلومات اور ان پر کیا اختیار ہوگا؟ پھر ان کو ایسی بے سرو پا باتیں



کہنے کا کیا حق ہے؟ مگر اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کی مخالفت سے فکر نہ کریں۔ کیونکہ اس مقام پر (یعنی مکہ میں) ان لوگوں کی پونہی ایک بیٹری ہے، منجملہ (مخالفتین انبیاء کے) گروہوں کے جو (عنقریب) شکست دیئے جاویں گے (چنانچہ عروہ بدر میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور) ان سے پہلے بھی قوم نوحؑ نے اور عاد نے اور فرعون نے جس (کی سلطنت) کے کھوٹے گڑھے رہتے اور ٹوٹنے اور قوم لوطؑ نے اور اصحاب ایکہ نے (جن کے قصے کئی جگہ آچکے ہیں، ان سب نے) تکذیب کی تھی (اور) وہ گروہ (جس کا اور پر من الاغزاب میں ذکر آیا ہے) یہی لوگ ہیں، ان سب نے صرف رسولوں کو جھٹلایا تھا (جیسے یہ کفار قریش آپ کو جھٹلا رہے ہیں) سو میرا عذاب (ان پر) واقع ہو گیا (پس جب جرم مشترک ہے تو عذاب کے اشتراک سے یہ کیوں مطمئن ہیں؟) اور یہ لوگ (جو تکذیب پر مہصر ہیں تو) بس ایک زور کی چیخ (یعنی نفخہ ثانیہ) کے منتظر ہیں جس میں دم لینے کی گنجائش نہ ہوگی (اس سے مراد قیامت ہے) اور یہ لوگ (قیامت کی وعید سن کر تکذیب رسولؐ اور استغناء کے طور پر) کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب (آخرت میں جو کافروں کو عذاب ہوگا، اس میں سے) ہمارا حصہ ہم کو روز حساب سے پہلے ہی دیدے (مطلب یہ کہ قیامت نہیں ہے، اور اگر ہے تو ہم کو ابھی عذاب مطلوب ہے، جب عذاب نہیں ہوتا تو معلوم ہوا قیامت نہ آوے گی۔ نفوذ باللہ!)

## معارف و مسائل

اس سورت کی ابتدائی آیات کا پس منظر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب شان نزول مسلمان نہ ہونے کے باوجود آپ کی پوری نگہداشت کر رہے تھے، جب وہ ایک بیماری میں مبتلا ہوئے تو قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ جس میں ابو جہل، عاص ابن وائل، اسود بن مطلب، اسود بن عبید لغوث اور دوسرے رؤساء شریک ہوئے۔ مشورہ یہ ہوا کہ ابوطالب بیمار ہیں، اگر وہ اس دنیا سے گزر گئے اور اس کے بعد ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نئے دین سے باز رکھنے کے لئے کوئی سخت اقدام کیا تو عرب کے لوگ ہمیں یہ طعن دیں گے کہ جب تک ابوطالب زندہ تھے، اس وقت تک تو یہ لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کچھ نہ بگاڑ سکے، اور جب ان کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے آپ کو حدوت بنالیا۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم ابوطالب کی زندگی ہی میں ان سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ کا تصفیہ کر لیں تاکہ وہ ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دیں۔

چنانچہ یہ لوگ ابوطالب کے پاس پہنچے، اور جا کر ان سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے آپ انصاف سے کام لے کر ان سے کہیے کہ وہ جس خدا کی چاہیں عبادت کریں، لیکن ہمارے معبودوں کو کچھ نہ کہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ان کے بتوں کو اس کے سوا کچھ نہ کہتے تھے کہ بے حس

اور بے جان ہیں۔ نہ تمہارے خالق ہیں نہ رازق ہیں۔ نہ تمہارا کوئی نفع نقصان ان کے قبضہ میں ہے۔ ابو طاہر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجلس میں بلوایا، اور آپ سے کہا کہ بھتیجے! یہ لوگ تمہاری شہادت کہہ رہے ہیں کہ تم ان کے معبودوں کو بُرا کہتے ہو۔ انھیں اپنے مذہب پر چھوڑ دو، اور تم اپنے خدا کی عبادت کرتے رہو، اس پر قریش کے لوگ بھی بولتے رہے۔

بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ”چچا جان! کیا میں انھیں اس چیز کی دعوت نہ دوں جس میں ان کی بہتری ہے؟“ ابو طالب نے کہا: ”وہ کیا چیز ہے؟“ آپ نے فرمایا ”میں ان سے ایک ایسا کلمہ کہلاانا چاہتا ہوں جس کے ذریعہ سارا عرب ان کے آگے سرنگوں ہو جائے اور یہ پورے عجم کے مالک ہو جائیں“ اس پر ابو جہل نے کہا: ”تباؤ وہ کلمہ کیا ہے؟ تمہارے باپ کی قسم! ہم ایک کلمہ نہیں دے سکتے کہ تمہاری بات سچ ہو“ اس پر آپ نے فرمایا ”بس لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہو“ یہ سن کر تمام لوگ کھڑے جھاڑ کھڑے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ”کیا ہم سارے معبودوں کو چھوڑ کر صرف ایک کو اختیار کر لیں؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے“ اس موقع پر سورۃ ص کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۷، ۲۸ ج ۴)۔

وَأَنطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ عَجَلًا۔ (اور ان کفار میں کے رئیس یہ کہتے ہوئے چل دیئے کہ انج، اس سے مذکورہ واقعہ ہی کی طرف اشارہ ہے کہ توحید کی دعوت سن کر وہ مجلس سے چل کھڑے ہوئے۔

ذُرِّيْعَتَيْنِ ذُو الْأَوْتَارِ اس کے لفظی معنی ہیں ”میموں والا فرعون“ اور اس کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے اس کی سلطنت کے استحکام کی طرف اشارہ ہے، اسی لئے حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ”جس کے کھونٹے گڑ گئے تھے“ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ وہ لوگوں کو اس طرح سزا دیا کرتا تھا کہ اسے چیت لٹا کر اس کے چاروں ہاتھ پاؤں میں میخیں گاڑ دیتا اور اس پر سمانپ، پچھو چھوڑ دیتا تھا۔ اور بعض نے کہا کہ وہ رستی اور میخوں سے کوئی خاص کھیل کھیلا کرتا تھا۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ”میموں“ سے مراد عمارتیں ہیں، اور اس نے بڑی مضبوط عمارتیں بنائی تھیں۔ (تفسیر قرطبی) واللہ سبحانہ اعلم

أُولَئِكَ الْأَحْزَابُ اس کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ یہ جملہ مٹھنؤ و مڑھنؤ الْأَحْزَابِ کا بیان ہے۔ یعنی جن گروہوں کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے اسی کے مطابق تفسیر کی ہے۔ لیکن دوسرے مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ ”گروہ وہ تھے“ یعنی اصل طاقت و توت کی مالک قوم نوح ۱۲ اور عاد و ثمود وغیرہ کی قومیں تھیں۔ مشرکین مکہ کی ان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں، جب وہ لوگ عذاب الہی سے نہ بچ سکے تو ان کی ہستی کیا ہے؟ (قرطبی)

مَا لَهُمْ مِنْ فَوَاقٍ۔ فَوَاقِ کے عربی میں کوئی معنی آتے ہیں۔ ایک تو ”فَوَاقِ“ اس درمیانی وقف کو کہتے



ہیں جس میں ایک مرتبہ دودھ دوسرے کے بعد دوبارہ اس کے تھنوں میں دودھ آجائے۔ نیز اس کے معنی "راحت و آرام" کے بھی ہیں۔ بہر صورت! مطلب یہ ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کا پھونکا ہوا صُور اس قدر مسلسل ہوگا کہ اس میں کوئی ردِ تفع نہ ہوگا۔ (قرطبی)

عَجَلْنَا لَكَ أَقْطَنًا۔ "قَطَّ" اصل میں اُس دستاویز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی کو انعام دینے کا وعدہ کیا گیا ہو۔ پھر یہ لفظ مطلق "حصہ" کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں، کہ "آخرت کی جزا و سزا سے جو کچھ ہمیں حصہ ملنا ہے وہ یہاں دلواد کیجئے۔"

اصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدًا نَّادًا ذَا الْأَيْدِ ۚ إِنَّكَ

تو تحمل کرتا رہ اس پر جو وہ کہتے ہیں اور یاد کر ہمارے بندے داؤد قوت والے کو۔ وہ تھا رجوع

أَوَّابٌ ۚ إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعِشِيِّ ۚ وَ

رہنے والا ہم نے تابع کئے پہاڑ اس کے ساتھ پاکی بولتے تھے شام کو اور

الْوَشَّاقِ ۚ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً ۚ كُلُّ لَّهُ أَوَّابٌ ۚ وَشَدَدْنَا

صبح کو اور اڑتے جانور جمع ہو کر سب تھے اس کے آگے رجوع رہتے اور قوت دی

مُلْكَهُ ۚ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ الْخِطَابِ ۚ

ہم نے اس کی سلطنت کو اور دی اس کو تدبیر اور فیصلہ کرنا بات کا

## خلاصہ تفسیر

آپ ان لوگوں کے اقوال پر صبر کیجئے اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کیجئے جو عبادت میں جس میں صبر بھی داخل ہے، بڑی قوت (اور بہت) دالے تھے (اور) وہ (خدا کی طرف) بہت رجوع ہونے والے تھے (اور ہم نے ان کو یہ نعمتیں عطا فرمائی تھیں :- ایک یہ کہ ہم نے پہاڑوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ان کے ساتھ (شریک ہو کر) شام اور صبح (کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیح کے یہی اوقات تھے) تسبیح کیا کریں اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی (یہی حکم دے رکھا تھا) جو کہ (تسبیح کے وقت ان کے پاس) جمع ہو جاتے تھے (اور یہ پہاڑ اور پرندے وغیرہ سب ان کی تسبیح کی وجہ سے مشغول ذکر رہتے اور دوسری نعمت یہ کہ ہم نے انکی سلطنت کو نہایت قوت دی تھی اور تیسری نعمت یہ کہ ہم نے ان کو حکمت (یعنی نبوت) اور فیصلہ کرنے والی تقریر (جو نہایت واضح اور جامع ہو) عطا فرمائی تھی۔

## معارف و مسائل

کفار کی تکذیب و استہزاء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو صدمہ ہوتا تھا، اُسے دور کر کے تسلی دینے کے لئے عموماً اللہ تعالیٰ نے پچھلے انبیاء علیہم السلام کے واقعات سنائے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی آپ کو صبر کی تلقین فرما کر بعض انبیاء علیہم السلام کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں جن میں سے پہلا واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ہے۔

وَإِذْ كَرَّ عَبْدًا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ - (اور یاد کیجئے ہمارے بندے داؤد کو جو قوت والے تھے) تقریباً تمام مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ عبادت میں بڑی قوت و سمیت کا ثبوت دیتے تھے اسی لئے اس کے بعد یہ جملہ ہوا: - إِنَّهُ آدَابٌ (بلاشبہ وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے) چنانچہ صحیحین کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: - ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نماز داؤد علیہ السلام کی ہے، اور سب سے زیادہ پسندیدہ روزہ داؤد علیہ السلام کے ہیں وہ آدھی رات سوتے، ایک تہائی رات عبادت کرتے اور پھر رات کے چھٹے حصہ میں سو جاتے تھے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار فرماتے تھے، اور جب دشمن سے ان کا مقابلہ ہو جاتا تو فرار اختیار نہ فرماتے تھے۔ اور بلاشبہ وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے“ (تفسیر ابن کثیر) عبادت کے اس طریقہ کو سب سے زیادہ پسندیدہ اس لئے قرار دیا گیا کہ ایک تو اس میں مشقت زیادہ ہے، ساری عمر روزہ رکھنے سے آدمی روزے کا عادی ہو جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد اس میں زیادہ مشقت نہیں رہتی، لیکن ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھنے میں تکلیف مسلسل رہتی ہے، دوسرے اس طریقہ سے انسان عبادت کے ساتھ ساتھ اپنے نفس، اہل و عیال اور متعلقین کے حقوق بھی پوری طرح ادا کر سکتا ہے۔

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ، الخ - اس آیت میں پہاڑوں اور پرندوں کے حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ شریک تسلیم ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کی تشریح سورۃ انبیاء اور سورۃ سباء میں گزر چکی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کو باری تعالیٰ نے یہاں اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام پر ایک خاص انعام تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے نعمت کیسے ہوئی؟ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح سے کیا خاص فائدہ پہنچا؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک معجزہ ظاہر ہوا، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا انعام ہے۔ اس کے علاوہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ایک لطیف توجہ یہ فرمائی ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح سے ذکر و شغل کا ایک خاص کیفیت پیدا ہو گیا تھا جس سے عبادت میں نشاط اور تازگی



وَهَلْ أَتَاكَ نَبَوُّ الْخَضِرِ إِذْ تَسَوَّرُوا بِالْحَرَابِ ۚ (۲۱) إِذْ دَخَلُوا

اور پہنچی ہے تجھ کو خبر دے والوں کی جب دیوار کو دکر آئے عبادت خانے میں جب گھس آئے

عَلَى دَاوُدَ قَفْرٍ مِّنْهُمْ قَالُوا لَا تَخَفْ خَضِرُ بَغْيِ

داؤد کے پاس تو ان سے گھبرایا - وہ بولے مت گھبرا ہم دو جھگڑاتے ہیں -

بَعْضُنَا عَلَى بَعْضٍ فَأَحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تَشْطِطْ وَاهْدِنَا

زیادتی کی ہے ایک نے دوسرے پر سو فیصلہ کر دے ہم میں انصاف کا اور دور نہ ڈال بات کو اور

إِلَى سَوَاءٍ الصِّرَاطِ ۚ (۲۲) إِنَّ هَذَا أَرْخَىٰ تَفْلَهُ تَسْعُ وَتَسْعُونَ

بتلا دے ہم کو سیدھی راہ - یہ جو ہے بھائی میرا اس کے یہاں ہیں نہ تانے

نَعْمَةً وَلِي نَعْمَةً وَاحِدَةً فَقَالَ أَكْفَلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي

دُنْیَاں اور میرے یہاں ایک دُنْیَا پھر کہتا ہے حوالے کر دے میرے وہ بھی اور زبردستی کرتا ہے

الْخِطَابِ ۚ (۲۳) قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُوءِ آلٍ نَّعَجْتِكَ إِلَىٰ

مجھ سے بات میں بولادہ بے انصافی کرتا ہے تجھ پر کہ مانگتا ہے میری دُنْیَا ملانے کو اپنی

نِعَاجِهِ ۚ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ

دُنْیَاؤِہُمْ اور اکثر شریک زیادتی کرتے ہیں ایک دوسرے پر

بَعْضِ الْآلِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ

مگر جو یقین لائے ہیں اور کام کئے نیک اور ٹھوڑے

مَّا هُمْ وَخَطْبٌ دَاوُدَ أَنْتُمْ فَاسْتَغْفِرَ رَبَّهُ وَخَسَرَ

لوگ ہیں ایسے - اور خیال میں آیا داؤد کے کہ ہم نے اس کو جانچا پھر گناہ بخشوانے لگا اچھڑب سے

رَاكِعًا وَأَنَابَ ۚ (۲۴) فَغَفَرْنَا لَهُ ذَلِكَ ۚ وَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا

اور گھڑا جھک کر اور رجوع ہوا پھر ہم نے معاف کر دیا اس کو وہ کام اور اس کے لئے ہمارے پاس

لَزُلْفَىٰ وَحُسْنِ مَّآبٍ ۚ (۲۵)

مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا -

## خلاصہ تفسیر

اور بھلا آپ کو ان اہل مقدمہ کی خبر بھی پہنچی ہے (جو داؤد علیہ السلام کے پاس مقدمہ لائے تھے جبکہ وہ لوگ داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ کی دیوار بچاند کر داؤد علیہ السلام کے پاس آئے) کیونکہ دروائے سے پہرہ داروں نے اس لئے نہیں آنے دیا کہ وہ وقت آپ کی عبادت کا تھا، مقدمات کے فیصلے کا نہیں،

ہمت پیدا ہوتی ہے۔ اجتماعی ذکر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ذکر کی برکتوں کا ایک دوسرے پر انعکاس ہوتا رہتا ہے۔ صوفیائے کرام کے یہاں ذکر و شغل کا ایک خاص طریقہ معروف ہے جس میں ذکر کرتے ہوئے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ پوری کائنات ذکر کر رہی ہے، اصلاح باطن اور شوق عبادت میں اس طریقہ کی عجیب تاثیر ہے۔ اس آیت سے اس طریقہ ذکر کی بنیاد بھی مستنبط ہوتی ہے (مسائل السلوک)

**صلوۃ الضحیٰ** | بِالْعِشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ - عِشِيٌّ کے معنی ہیں ظہر کے بعد سے اگلے دن صبح تک کا وقت اور اِشْرَاق کے معنی صبح کا وہ وقت جس میں دھوپ زمین پر پھیل گئی ہو۔ اس آیت سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے صلوۃ الضحیٰ کے مشروع ہونے پر استدلال فرمایا ہے۔ صلوۃ الضحیٰ کو صلوۃ الاوابین اور بعض حضرات صلوۃ الاشراق بھی کہتے ہیں۔ اگرچہ بعد میں صلوۃ الاوابین کا نام مغرب کے بعد کی چھ نفلوں کے لئے اور صلوۃ الاشراق طلوع آفتاب کے متصل والی دو یا چار نفلوں کے لئے زیادہ مشہور ہو گیا۔

صلوۃ الضحیٰ میں دو سے لیکر بارہ تک جتنی رکعتیں چاہیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ حدیث میں اس کے بہت سے فوائد وارد ہوئے ہیں۔ جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جو شخص صلوۃ الضحیٰ کی دو رکعتوں کی پابندی کر لے اُس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، خواہ وہ سمندری جھاگ جتنے ہوں“ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جو شخص صلوۃ الضحیٰ کی بارہ رکعتیں پڑھے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں سونے کا محل بنادے گا“ (قرطبی)

علمائے فرمایا ہے کہ یوں تو دو سے لیکر بارہ تک جتنی رکعتیں پڑھی جاسکیں وہ ٹھیک ہیں، لیکن تعداد کے لئے کوئی خاص معمول بنالیا جائے تو بہتر ہے، اور یہ معمول کم از کم چار رکعت ہو تو زیادہ اچھا ہے کیونکہ آپ کا عام معمول چار رکعتیں ہی پڑھنے کا تھا۔

وَإِنَّكَ لَكَمُعِزٌّ مُّصَلِّطٌ (اور ہم نے ان کو حکمت اور فیصلہ کر دینے والی تشریف عطا فرمائی) حکمت سے مراد تو دانائی ہے، یعنی ہم نے انہیں عقل و فہم کی دولت بخشی تھی۔ اور بعض حضرات چنانچہ فرمایا کہ نبوت مراد ہے۔ اور ”نَصْلُ الْخِطَابِ“ کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد زور بیان اور قوت خطابت ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام اور نوحؑ کے خطیب تھے، اور خطیبوں میں حمد و صلوٰۃ کے بعد لفظ ”أَمَّا بَعْدُ“ سب سے پہلے انہوں نے ہی کہنا شروع کیا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے بہترین قوت فیصلہ مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو جھگڑے چکانے اور تنازعات کا فیصلہ کرنے کی قوت عطا فرمائی تھی۔ درحقیقت ان الفاظ میں بیک وقت دونوں معنی کی پوری گنجائش ہے اور یہ دونوں باتیں ہی مراد ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ نے جو اس کا ترجمہ فرمایا ہے اس میں بھی دونوں معنی سما سکتے ہیں۔



تو وہ ان کے اس بے قاعدہ آنے سے گھبرا گئے کہ کہیں یہ لوگ دشمن نہ ہوں جو قتل کے ارادے سے اس طرح تنہائی میں آگھسے ہوں، وہ لوگ ان سے کہنے لگے کہ آپ ڈریں نہیں، ہم دواہل معاملہ ہیں کہ ایک نے دوسرے پر (کچھ) نہ یاد دہائی کی ہے (اس کے فیصلے کے لئے ہم آئے ہیں، چونکہ پہرہ داروں نے دروازہ سے نہیں آنے دیا۔ اس لئے اس طرح آنے کے مرتکب ہوئے) سو آپ ہم میں انصاف سے فیصلہ کر دیجئے، اور بے انصافی نہ کیجئے اور ہم کو (معاملہ) سیدھی راہ بتلا دیجئے (اور پھر ایک شخص بولا کہ صورت مقدمہ یہ ہے کہ) یہ شخص میرا بھائی ہے (یعنی دینی بھائی جیسا کہ درمنثور میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور) اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس (کل) ایک دنبی ہے۔ سو یہ کہتا ہے کہ وہ بھی مجھ کو دے ڈال اور بات چیت میں مجھ کو دیتا ہے (اور میری بات کو منہ زوری سے چلنے نہیں دیتا) داؤد (علیہ السلام) نے کہا کہ یہ جو میری دنبی اپنی دنبیوں میں ملانے کی درخواست کرتا ہے تو واقعی تجھ پر ظلم کرتا ہے اور اکثر شرکار (کی عادت ہے کہ) ایک دوسرے پر (یوں ہی) زیادتی کیا کرتے ہیں، مگر ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں، اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں (یہ بات آپ نے مظلوم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمائی) اور داؤد (علیہ السلام) کو خیال آیا کہ اس مقدمہ کو اس طرح پیش کر کے، ہم نے ان کا امتحان کیا ہے، سو انھوں نے اپنے رب کے سامنے توبہ کی اور سجدہ میں گر پڑے اور (خاص طور پر خدا کی طرف) رجوع ہوئے، سو ہم نے ان کو وہ (امر) معاف کر دیا، اور ہمارے یہاں ان کے لئے (خاص) قرب اور (اعلیٰ) درجہ کی، نیک انجامی (یعنی جنت کا درجہ علیا) ہے۔

## معارف و مسائل

ان آیات میں باری تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ ذکر فرمایا ہے۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت گاہ میں دو فریقوں کو جھگڑتے ہوئے بھیج کر ان کا کوئی امتحان کیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس امتحان پر متنبہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا اور سجدے میں گر پڑے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرمادی۔ قرآن کریم کا اصل مقصد چونکہ یہاں یہ بیان کرنا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور کبھی ذرا سی لغزش بھی ہو جائے تو فوراً استغفار کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں یہ تفصیل بیان نہیں کی گئی کہ وہ امتحان کیا تھا؟ حضرت داؤد علیہ السلام سے وہ کونسی لغزش ہوئی تھی جس سے انھوں نے استغفار کیا؟ اور جسے اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا۔ اسی لئے بعض محقق اور محتاط مفسرین نے ان آیات کی تشریح میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص حکمت و مصلحت سے اپنے جلیل القدر پیغمبر کی اس لغزش اور امتحان کی تفصیل کو کھول کر بیان

نہیں فرمایا، اس لئے ہمیں بھی اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔ اور جتنی بات قرآن کریم میں مذکور ہے، صرف اسی بات پر ایمان رکھنا چاہیے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ جیسے محقق مفسر نے اپنی تفسیر میں اسی پر عمل کرتے ہوئے واقعہ کی تفصیلات سے خاموشی اختیار کی ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ یہ سب سے زیادہ محتاط اور سلامتی کا راستہ ہے۔ اسی لئے علماء سلف سے منقول ہے کہ ابھموا ما ابھموا اللہ، یعنی جس چیز کو اللہ نے مبہم چھوڑا ہے تم بھی اس کو مبہم رہنے دو۔ اسی میں حکمت و مصلحت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد ایسے معاملات کا ابہام ہے جن سے ہمارے عمل اور حلال و حرام کا تعلق نہ ہو اور جن معاملات سے مسلمانوں کے عمل کا تعلق ہو اس ابہام کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے رفع کر دیا ہے۔

البتہ دوسرے مفسرین نے روایات و آثار کی روشنی میں اس امتحان اور آزمائش کو مستقیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک عامیانہ روایت تو یہ مشہور ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر ایک مرتبہ اپنے ایک فوجی انسر اور یا کی بیوی پر پڑ گئی تھی جس سے ان کے دل میں اس کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش پیدا ہوئی، اور انھوں نے اور یا کو قتل کرانے کی غرض سے اُسے خطرناک ترین مشن سونپ دیا جس میں وہ شہید ہو گیا، اور بعد میں آپ نے اس کی بیوی سے شادی کر لی۔ اس عمل پر تنبیہ کرنے کے لئے یہ دو فرشتے انسانی شکل میں بھیجے گئے۔

لیکن یہ روایت بلاشبہ ان خرافات میں سے ہے جو یہودیوں کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی پھیل گئی تھیں۔ یہ روایت دراصل بائبل کی کتاب سموئیل دوم باب ۱۱ سے ماخوذ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بائبل میں کھلم کھلا حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے معاذ اللہ اور یا کی بیوی سے نکاح سے قبل ہی زنا کا ارتکاب کیا تھا۔ اور ان تفسیری روایتوں میں زنا کے جُزر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اس اسرائیلی روایت کو دیکھا اور اس میں سے زنا کے قصے کو نکال کر اسے قرآن کریم کی مذکورہ آیتوں پر چسپاں کر دیا۔ حالانکہ یہ کتاب سموئیل ہی سرے سے بے اصل ہے اور یہ روایت قطعی کذب و افتراء کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے تمام محقق مفسرین نے اس کی سخت تردید کی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے علاوہ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ، قاضی ابوالسعود رحمہ اللہ، قاضی بیضاوی رحمہ اللہ، قاضی عیاض رحمہ اللہ، علامہ ابو حنیان اندلسی رحمہ اللہ، خازن رحمہ اللہ، محشری رحمہ اللہ، ابن حزم رحمہ اللہ، علامہ خفاجی رحمہ اللہ، احمد بن نضر رحمہ اللہ، ابوتام رحمہ اللہ، علامہ آلوسی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اسے کذب و افتراء قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:-

”بعض مفسرین نے یہاں ایک قصہ ذکر کیا ہے جس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بارے میں کوئی ایسی بات ثابت نہیں جس کا اتبارع واجب ہو صرف ابن ابی حاتم رحم نے یہاں ایک حدیث روایت کی ہے۔ مگر اس کی سند صحیح نہیں ہے۔  
غرض بہت سے دلائل کی روشنی میں جن کی کچھ تفصیل امام رازی رحم کی تفسیر کبیر اور ابن جوزی رحم کی زاد المسیر وغیرہ میں موجود ہے، یہ روایت تو اس آیت کی تفسیر میں قطعاً خارج از بحث ہو جاتی ہے۔  
حکیم الامت حضرت تھانوی رحم نے اس آزمائش اور لغزش کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ مقدمہ کے یہ دو فرق دیوار بھانڈ کر داخل ہوئے، اور طرز مخاطبت بھی انتہائی گستاخانہ اختیار کیا کہ شروع ہی میں حضرت داؤد علیہ السلام کو انصاف کرنے اور ظلم نہ کرنے کی نصیحتیں شروع کر دیں، اس انداز کی گستاخی کی بنا پر کوئی عام آدمی ہوتا تو انھیں جواب دینے کے بجائے اکیٹ سزا دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ امتحان فرمایا کہ وہ بھی عقدہ میں آکر انھیں سزا دیتے ہیں یا پیغمبرانہ عفو و تحمل سے کام لے کر ان کی بات سنتے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام اس امتحان میں پورے اترے، لیکن اتنی سی فرد گزاشت ہو گئی کہ فیصلہ سناتے وقت ظالم کو خطاب کرنے کے بجائے مظلوم کو مخاطب فرمایا جس سے ایک گونہ جانبداری مترشح ہوتی تھی مگر اس پر فوراً متنبہ ہوا اور سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف فرمادیا۔ (بیان القرآن)  
بعض مفسرین نے لغزش کی یہ تشریح کی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعا علیہ کو خاموش دیکھا تو اس کا بیان سننے بغیر صرف مدعی کی بات سن کر اپنی نصیحت میں ایسی باتیں فرمائیں جن سے فی الجملہ مدعی کی تائید ہوتی تھی، حالانکہ پہلے مدعا علیہ سے پوچھنا چاہیے تھا کہ اس کا موقف کیا ہے؟ حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ ارشاد اگرچہ صرف ناصحانہ انداز میں تھا اور ابھی تک مقدمہ کے فیصلے کی نوبت نہیں آئی تھی، تاہم ان جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایان شان نہیں تھا۔ اسی بات پر آپ بعد میں متنبہ ہو کر سجدہ ریز ہوئے۔

(روح المعانی)

بعض حضرات نے فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا نظم اوقات ایسا بنایا ہوا تھا کہ جو بس گھنٹے میں ہر وقت گھر کا کوئی نہ کوئی فرد عبادت، ذکر اور تسبیح میں مشغول رہتا تھا، ایک روز انھوں نے باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ پروردگار! دن اور رات کی کوئی گھڑی ایسی نہیں گزرتی جس میں داؤد کے گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی آپ کی عبادت نماز اور تسبیح و ذکر میں مشغول نہ ہو، باری تعالیٰ نے فرمایا کہ داؤد! یہ سب کچھ میری توفیق سے ہے، اگر میری مدد شامل حال نہ ہو تو یہ بات تمہارے بس کی نہیں ہے، اور ایک دن میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ وقت حضرت داؤد علیہ السلام کے مشغول عبادت ہونے کا تھا۔ اس ناگہانی تقصیر سے ان کے اوقات کا نظم مختل ہو گیا حضرت داؤد علیہ السلام جب گھڑا چکانے میں مشغول ہو گئے، آل داؤد علیہ السلام کا کوئی اور فرد بھی اس وقت

عبادت اور ذکر الہی میں مصروف نہ تھا۔ اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو تنبیہ ہو کہ وہ فخر یہ کلمہ جو زبان سے نکل گیا تھا، یہ مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ اس لئے آپ نے استغفار فرمایا اور سجدہ ہو گئے۔ اس توجہ کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہے جو مستدرک حاکم میں صحیح سند کے ساتھ منقول ہے۔ (احکام القرآن)

ان تمام تشریحات میں یہ بات مشترک طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ مقدمہ فرضی نہیں بلکہ حقیقی تھا، اول صورت مقدمہ کا حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش یا لغزش سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے برخلاف بہت سے مفسرین نے اس کی ایسی تشریح فرمائی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مقدمہ کے یہ فریقین انسان نہیں، بلکہ فرشتے تھے، اور انھیں اللہ تعالیٰ نے اس لئے بھیجا تھا کہ وہ ایسی فرضی صورت مقدمہ پیش کریں جس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی لغزش پر تنبیہ ہو جائے۔

چنانچہ ان حضرات کا یہ کہنا ہے کہ داؤد یا کو قتل کرانے اور اس کی بیوی سے نکاح کر لینے کا وہ قصہ تو غلط ہے، لیکن حقیقت حال یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں کسی شخص سے یہ فرمائش کی گئی کہ یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس کا نکاح مجھ سے کر دو۔ اس زمانے میں اس فرمائش کا عام رواج بھی تھا۔ اور یہ بات خلاف مروت بھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسی بنا پر اور یا سے یہی فرمائش کی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ دو فرشتے بھیج کر آپ کو تنبیہ فرمائی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ بات صرف اتنی تھی کہ داؤد یا نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا ہوا تھا، حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی اسی عورت کو اپنا پیغام دیدیا، اس سے داؤد یا کو بہت رنج ہوا اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ کے لئے یہ دو فرشتے بھیجے اور ایک لطیف پیرایہ میں اس لغزش پر تنبیہ فرمائی۔ قاضی ابویعلیٰ رحمہ اللہ نے اس توجہ پر قرآن کریم الفاظ وَعَزَّیْ فِی الْخِطَابِ سے استدلال فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ معاملہ محض خطبہ (منگنی) کے سلسلہ میں پیش آیا تھا۔ اور ابھی حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سے نکاح نہیں فرمایا تھا۔

(زاد المسیر لابن الجوزی ص ۱۱۶ - ج ۷)

اکثر مفسرین نے ان آخری دو تشریحات کو ترجیح دی ہے اور ان کی تائید بعض آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو روح المعانی، تفسیر ابی السموٰ زاد المسیر، تفسیر کبیر وغیرہ) لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس آزمائش اور لغزش کی تفصیل نہ قرآن کریم سے ثابت ہے، نہ کسی صحیح حدیث سے۔ اس لئے اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ داؤد یا کو قتل کر دینے کا جو قصہ مشہور ہے وہ غلط ہے، لیکن اصل واقعہ کے بارے میں مذکورہ بالا تمام احتمالات موجود ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو قطعی اور یقینی نہیں کہا جاسکتا۔ لہذا سلامتی کی راہ وہی ہے جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اختیار کی کہ جس بات کو اللہ تعالیٰ نے مبہم چھوڑا ہے،



ہم اپنے قیاسات اور اندازوں کے ذریعہ اس کی تفصیل کی کوشش نہ کریں۔ جبکہ اس سے ہمارے کسی عمل کا تعلق نہیں۔ اس ابہام میں بھی یقیناً کوئی حکمت ہے۔ لہذا صحت اتنے واقعہ پر ایمان رکھا جائے جو قرآن کریم میں مذکور ہے، باقی تفصیلات کو اللہ کے حوالے کیا جائے۔ البتہ اس واقعہ سے متعدد عملی فوائد حاصل ہوتے ہیں زیادہ توجہ ان کی طرف دینی چاہیے۔ اسلئے اب آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے جس میں انشاء اللہ ان فوائد کا ذکر آجائے گا۔

اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ (جب وہ محراب کی دیوار پھاڑ کر داخل ہوئے) مِحْرَابٌ دراصل بالا خانے یا کسی مکان کے سامنے کے حصّہ کو کہتے ہیں۔ پھر خاص طور سے مسجد یا عبادت خانے کے سامنے کے حصّہ کو کہا جانے لگا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ عبادت گاہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مسجد کے دائرہ نما محرابیں جیسی آجکل معروف ہیں، یہ عہد نبویؐ میں موجود نہیں تھیں (روح المعانی)۔ فَفَزِعَ مِنْهُمْ د۔ (پس حضرت داؤدؑ ان سے گھبرا گئے) گھبرانے کی وجہ صاف ظاہر تھی کہ داؤدؑ کا بے وقت پہرہ توڑ کر اس طرح گھس آنا عموماً کسی بُری نیت ہی سے ہوتا ہے۔

طبعی خوفِ نبوت یا ولایت اس سے معلوم ہوا کہ کسی خوفناک چیز سے طبعی طور پر گھبرا جانا نبوت اور ولایت کے منافی نہیں ہے۔ ہاں اس خوف کو دل و دماغ پر طاری کر کے اپنے فرائض کو چھوڑ دینا ضرور بُرا ہے۔ اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم میں انبیاء کی شان یہ بیان کی گئی ہے لَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ۔ (وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے) پھر ہاں حضرت داؤد علیہ السلام کو خوف کیوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ڈرنے کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک ڈر تو موزی اشیا کے تکلیف پہنچانے سے ہوتا ہے، اُسے عربی میں خَوْفٌ کہتے ہیں۔ دوسرا ڈر کسی بڑے کی عظمت جلالت شان اور رعب کی وجہ سے ہوتا ہے، اُسے خَشْيَةٌ کہا جاتا ہے۔ (مفردات، راغب) خشیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہونی چاہیے، اور انبیاء علیہم السلام کی شان یہی ہوتی ہے کہ اللہ کے سوا ان پر کسی کی خشیت طاری نہیں ہوتی۔ ہاں خوفِ طبعی موزی اشیا سے ہو سکتا ہے۔

بے قاعدگی پر حقیقتِ حال کے منکشف ہونے تک صبر کرنا چاہیے

قَالُوا لَا تَخَفْ (انہوں نے کہا ڈرئیے نہیں) آنے والوں نے یہ کہہ کر اپنی بات بیان کرنی شروع کر دی، اور حضرت داؤد علیہ السلام خاموشی سے ان کی بات سُنتے رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اچانک کسی بے قاعدگی کا ترکیب ہو تو اُسے فوراً ملا مت اور زجر و توبیخ شروع نہیں کر دینی چاہیے، بلکہ پہلے اس کی بات سُن لی جانی چاہیے۔ تاکہ اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس اس بے قاعدگی کا جواز تھا یا نہیں۔ کوئی اور ہوتا تو آنے والوں پر فوراً برس پڑتا، لیکن حضرت داؤد علیہ السلام نے انکشافِ حقیقت کا انتظار فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ معذور ہوں۔

وَلَا تَشْطِطْ (اور بے قضائی نہ کیجئے)، آئے والے کا یہ اندازِ خطاب بظاہر بڑے اگستاخانہ تھا، اول تو دیوارِ پھاند کر بے وقت آنا، پھر اگر حضرت داؤد علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو انصاف کرنے اور ظلم سے بچنے کا درس دینا، یہ سب اکھڑپن کی باتیں تھیں، لیکن حضرت داؤد علیہ السلام نے ان سب باتوں پر صبر فرمایا اور انہیں کچھ برا بھلا نہیں کہا۔

مرتبہ کا تقاضا ہے۔ خاص طور سے حاکم، قاضی اور مفتی کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ (رُوح المعانی)

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعَجْتِكَ إِلَىٰ إِلَٰهِكَ - (داؤد علیہ السلام نے کہا کہ اُس نے جو تیری دُنئی اپنی دُنئیوں میں ملانے کی درخواست کی ہے تو واقعی تجھ پر ظلم کیا ہے) یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ فقرہ صرف مدعی کی بات سُن کر ارشاد فرمادیا، مدعا علیہ کا بیان نہیں سُنا۔ اس پر بعض حضرات نے تو یہ کہا ہے کہ وہ لغزش جس پر آپ نے استغفار فرمایا، یہی لغزش تھی۔ لیکن دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ درحقیقت یہاں مقدمہ کی پوری تفصیلات بیان نہیں ہو رہی ہیں، صرف ضروری باتیں بیان کی گئی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام یقیناً مدعا علیہ سے اس کا موقف سُنا ہو گا۔ لیکن اُسے یہاں اس لئے بیان نہیں کیا گیا کہ فیصلوں کا معروف طریقہ یہی ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہاں مدعا علیہ سے پوچھنے کا جزم و مخدوم ہے۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اگرچہ آنے والوں نے حضرت داؤد علیہ السلام سے عدالتی فیصلہ طلب کیا تھا، لیکن نہ وہ وقت عدالت کا تھا، نہ مجلس قضا کی تھی، نہ وہاں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اپنے فیصلہ کو نافذ کرنے کے وسائل جمع تھے۔ اس لئے حضرت داؤد علیہ السلام نے قاضی کی حیثیت میں نہیں بلکہ مفتی کی حیثیت میں فتویٰ دیا۔ اور مفتی کا کام واقعہ کی تحقیق کرنا نہیں ہوتا، بلکہ جیسا سوال ہو، اسی کے مطابق جواب دینا ہوتا ہے۔

کسی قسم کے دباؤ کے ساتھ چندہ یا ہدیہ بھی طلب کرنا غضب ہے

اس سے معلوم یہ ہوا کہ اگر کوئی آدمی کسی سے اس طرح کوئی چیز مانگے کہ مخاطب راہنی ہو یا ناراہنی



لیکن اس کے پاس دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو اس طرح ہدیہ طلب کرنا بھی غصب میں داخل ہے لہذا اگر مانگنے والا کوئی صاحب اقتدار یا ذی وجاہت شخص ہو اور نہ مخاطب اس کی شخصیت کے دباؤ کی وجہ سے انکار نہ کر سکتا ہو، تو وہاں صورت چاہے ہدیہ طلب کرنے کی ہو، لیکن حقیقت میں وہ غصب ہی ہوتا ہے اور مانگنے والے کے لئے اس طرح حاصل کی ہوئی چیز کا استعمال جائز نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ خاص طور پر ان لوگوں کے لئے بہت توجہ کرنے کا ہے، جو مدارس و مکاتب، مسجد یا انجمنوں اور جماعتوں کے لئے چندے وصول کرتے ہیں۔ صرف وہ چندہ حلال طیب ہے جو دیے والے نے اپنے مکمل اختیار اور خوش دلی کے ساتھ دیا ہو۔ اور اگر چندہ کرنے والوں نے اپنی شخصیت کا دباؤ ڈال کر یا بیک وقت آٹھ دس آدمیوں نے کسی ایک شخص کو زچ کر کے چندہ وصول کر لیا تو یہ صریح ناجائز فعل ہے۔

حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ :-  
 لَا يَحِلُّ مَالٌ أَمْدِيٍّ سَلِمَ إِلَّا بِطَيِّبِ نَفْسٍ مِنْهُ  
 کسی مسلمان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں

وَأَنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ -  
 (اور بہت سے شرکار ایک دوسرے پر زیادتی کیا کرتے ہیں، اس سے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔)  
 اس بات پر تنبیہ کر دی ہے کہ جب دو انسانوں میں شرکت کا کوئی معاملہ ہو تو اس میں اکثر ایک دوسرے کی حق تلفیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات ایک آدمی ایک کام کو معمولی سمجھ کر گزر رہا ہے، لیکن درحقیقت وہ گناہ کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

وَلَقَدْ دَاوُدُ أَنْتَاهُ - (اور داؤد علیہ السلام، کو خیال آیا کہ ہم نے ان کا امتحان کیا ہے) اگر مقدمہ کی صورت کو حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش کی تمثیل قرار دیا جائے تب تو یہ خیال آنا ظاہر ہی ہے۔ اور اگر صورت مقدمہ کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو، تب بھی فریقین کی مجموعی حالت یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی تھی کہ یہ امتحان بھیجے گئے ہیں۔ ایک طرف تو ان فریقوں نے مقدمہ کے فیصلے کے لئے اتنی جلد بازی اور جرات سے کام لیا کہ دیوار بچھانڈ کر چلے آئے۔ دوسری طرف جب مقدمہ پیش ہوا، تو مدعا علیہ خاموش بیٹھا رہا، اور قولی یا عملی طور سے مدعی کی بات کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا۔

اگر مدعی کے بیان کردہ واقعہ کو مدعا علیہ تسلیم کر لیا جاتا تو جھگڑے کا فیصلہ کرا لے کے لئے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آنے کی ضرورت ہی نہ تھی، ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اس صورت میں مدعی کے حق میں ہی فیصلہ کریں گے۔ فریقین کا یہ پراسرار طریقہ عمل بتا رہا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھانپ لیا کہ یہ اللہ کے بھیجے ہوئے

آئے ہیں اور میرا امتحان مقصود ہے۔ اور بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ فیصلہ سننے کے بعد وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر چلے گئے۔ واللہ اعلم

فَاسْتَغْفِرْ رَبَّكَ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ۔ (پس انہوں نے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کی، اور سجدے میں گہرے اور جوع ہوئے) یہاں دراصل رکوع کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں۔ اور اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد سجدہ ہے۔ احناف کے نزدیک اس آیت کی تلاوت سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔

اور امام ابو حنیفہ رحمہ نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اگر نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کی گئی ہے تو رکوع میں سجدہ کی نیت کر لینے سے سجدہ ادا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں باری تعالیٰ نے سجدہ کے لئے رکوع کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ رکوع بھی سجدہ کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں چند ضروری مسائل یاد رکھنے چاہئیں۔

**مسئلہ نماز کے فرض رکوع کے ذریعہ سجدہ صرف اس صورت میں ادا ہو سکتا ہے جبکہ سجدے کی آیت نماز میں پڑھی گئی ہو، نماز سے یا ہر تلاوت کرنے میں رکوع سے سجدہ ادا نہیں ہوتا۔** اس لئے کہ رکوع صرف نماز میں عبادت ہے، نماز سے باہر مشروع نہیں (بدائع)۔ **مسئلہ رکوع میں سجدہ صرف اس وقت ادا ہوگا جبکہ آیت سجدہ تلاوت کرنے کے فوراً بعد یا زیادہ سے دو تین آیتیں مزید تلاوت کر کے رکوع کر لیا ہو۔** اور اگر آیت سجدہ کے بعد کھڑے کھڑے طویل قرارت کی ہو تو سجدہ رکوع میں ادا نہیں ہوگا۔ **مسئلہ اگر سجدہ تلاوت رکوع میں ادا کرنے کا خیال ہو تو رکوع میں جاتے وقت سجدہ تلاوت کی نیت کر لینی چاہیے، ورنہ اس رکوع سے سجدہ ادا نہیں ہوگا۔** ہاں جب سجدہ میں جانے لگا تو بلا نیت بھی سجدہ ادا ہو جائے گا۔ **مسئلہ افضل بہر حال یہی ہے کہ سجدہ تلاوت کو نماز کے فرض رکوع میں ادا کرنے کے بجائے مستقل سجدہ کیا جائے۔** اور سجدہ سے اٹھ کر ایک دو آیتیں تلاوت کر کے پھر رکوع میں جائیں۔ (بدائع)

وَإِنَّ لَكَ لَعِندَنَا نَافِعًا وَكَسْبًا مَّا حِبَّ۔ (اور بلاشبہ ان کے لئے ہمارے یہاں خاص تقرب اور نیک انجامی ہے، اس آیت پر واقعہ کو ختم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش جو کچھ بھی رہی ہو، ان کے استغفار اور انابت کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے تعلق میں اور اضافہ ہو گیا۔

اس واقعہ سے متعلق ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش غلطی پر تنبیہ میں حکمت کی رعایت خواہ کچھ بھی ہو، اللہ تعالیٰ براہ راست وحی کے ذریعہ بھی آپ کو



اس پر متنبہ فرما سکتے تھے۔ لیکن اس کے بجائے ایک مقدمہ بھیج کر تنبیہ کے لئے یہ خاص طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟  
درحقیقت اس طریقہ پر غور کر لے اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں کو یہ ہدایت  
کی گئی ہے کہ کسی شخص کو اس کی غلطی پر تنبیہ کے لئے حکمت سے کام لینے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایسا  
طریقہ اختیار کرنا زیادہ اچھا ہے جس سے متعلقہ شخص خود بخود اپنی غلطی کو محسوس کر لے اور اسے زبانی تنبیہ  
کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اور اس کے لئے ایسی تمثیلات سے کام لینا زیادہ مؤثر ہوتا ہے جس سے کسی  
کی دلازاری بھی نہ ہو اور ضروری بات بھی واضح ہو جائے۔

يٰۤاٰدُۤاۤءُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ

اے داؤد ہم نے کیا تجھ کو نائب ملک میں سو تو حکومت کر لوگوں میں

بِاِحْقٰۤقٍ وَّ اِلٰہٍ تَتَّبِعِ الْهٰوٰی فِیْضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰہِ اِنَّ

انصاف سے اور نہ چل جی کی خواہش پر پھر وہ تجھ کو بھلاوے اللہ کی راہ سے مقرر

الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰہِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا

جو لوگ بھٹکتے ہیں اللہ کی راہ سے ان کو سخت عذاب ہے اس بات پر

تَسُوۤاۤیُوۡمَ الْحِسَابِ ۝۳۹

کہ بھلا دیا انہوں نے دن حساب کا -

## خلاصہ تفسیر

اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے، سو (جس طرح اب تک کرتے رہے ہو، اسی طرح آئندہ بھی)  
لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور (جس طرح اب تک کبھی نفسانی خواہش کی پیروی نہیں کی)  
اسی طرح آئندہ بھی، نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا کہ (اگر ایسا کر دگے تو) وہ خدا کے رستہ سے تم کو  
بھٹکا دے گی (اور) جو لوگ خدا کے رستہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہوگا اس وجہ سے کہ وہ  
روزِ حساب کو بھٹولے رہے۔

## معارف و مسائل

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ حکومت و سلطنت بھی عطا فرمائی تھی،  
چنانچہ اس آیت میں حکومت و سیاست کے لئے آپ کو ایک بنیادی ہدایت نامہ عطا کر دیا گیا ہے۔ اس  
ہدایت نامہ میں تین بنیادی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:-

(۱) ہم نے آپ کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

(۲) اس حیثیت سے آپ بنیادی کام حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔

(۳) اور اس کام کے لئے خواہشات نفسانی کی پیروی سے بچنا ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

جہاں تک زمین میں خلیفہ بنانے کا تعلق ہے، اس کا مفہوم سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے (دیکھئے

معارف القرآن جلد اول ص ۱۱۱) اور اسی سے اسلامی سیاست کا یہ اصل الاصول واضح ہوتا ہے کہ

”اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے“ زمین کے حکمران اسی کے احکام کے مطابق چلنے کے مجاز ہیں

اس سے باہر نہیں جاسکتے۔ لہذا مسلمانوں کا حاکم، شہر سی یا اسمبلی اسلامی قانون کی تشریح یا

تدوین تو کر سکتی ہے، لیکن درحقیقت وہ واضع قانون نہیں بلکہ اللہ کے قانون کو پیش کرنا ہے۔

دوسری بات یہاں واضح کر دی گئی ہے کہ اسلامی ریاست کا بنیادی کام

اقامت حق ہے۔ حکومت پر لازم ہے کہ وہ اپنے انتظامی معاملات اور تنازعات

بنیادی کام اقامت حق ہے اسلامی ریاست کا

کے تصفیہ میں حق و انصاف قائم کرے۔

اسلام چونکہ ایک ابدی دین ہے، اس لئے اس نے سیاست و حکمرانی کے لئے ایسے انتظامی

جزئیات کی تعیین نہیں فرمائی، جو حالات اور زمانے کے بدلنے سے قابل تبدیل ہو جائیں۔ بلکہ کچھ ایسی

بنیادی ہدایات عطا فرمادی ہیں۔ جن کی روشنی میں ہر زمانے کے مطابق انتظامی جزئیات خود طے کی جاسکتی

ہیں۔ اسی لئے یہاں یہ بات تو بتادی گئی ہے کہ حکومت کا اصل کام اقامت حق ہے، لیکن اس کی انتظامی

تفصیلات ہر دور کے اہل رائے مسلمانوں پر چھوڑی گئی ہیں۔

چنانچہ یہ بات کہ عدلیہ انتظامیہ سے بالکل الگ رہے یا اس کے ساتھ وابستہ؟

اس مسئلہ میں کوئی ایسا متعین حکم نہیں دیا گیا، جو ہر دور میں ناقابل تبدیل

ہو۔ اگر کسی زمانہ میں حکمرانوں کی امانت و دیانت پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہو تو عدلیہ اور انتظامیہ کی

دوئی کو مٹایا جاسکتا ہے۔ اور اگر کسی دور میں حکمرانوں کی امانت و دیانت پر پورا بھروسہ نہ ہو تو عدلیہ

کو انتظامیہ سے بالکل آزاد بھی رکھا جاسکتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ ان سے زیادہ امانت و دیانت کا

کون دعویٰ کر سکتا تھا؟ اس لئے انھیں بیک وقت انتظامیہ اور عدلیہ دونوں کا سربراہ بننا کہ

تنازعات کے فیصلے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ خلفاء راشدین میں

بھی یہی طرز رہا کہ امیر المؤمنین خود ہی قاضی بھی ہوتا تھا۔ بعد کی اسلامی حکومتوں میں اس طریقے

کو بدلا گیا اور امیر المؤمنین کو انتظامیہ کا اور قاضی القضاۃ کو عدلیہ کا سربراہ بنایا گیا۔

تیسری ہدایت جس پر اس آیت میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ خواہشات



انسانی کی پُروری ممت کر دے اور روزِ حساب کو ہر وقت پیشِ نظر رکھو۔ اس ہدایت پر سب سے زیادہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ چیز اقامتِ حق کی بنیاد ہے۔ جس حاکم یا قاضی کے دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہے وہی صحیح معنی میں حق و انصاف قائم کر سکتا ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو آپ اچھے سے اچھا قانون بنا لیجیے۔ نفسِ انسانی کی دسیسہ کاریاں ہر جگہ اپنا راستہ خود بنا لیتی ہیں اور ان کی موجودگی میں کوئی بہتر سے بہتر نظام قانون بھی حق و انصاف قائم نہیں کر سکتا۔ دنیا کی تاریخ اور موجودہ زمانے کے حالات اس پر گواہ ہیں۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی شخص کو حاکم، قاضی یا کسی محکمے کا ذمہ داری کے عہدوں میں سب سے پہلے دیکھنے کی چیز انسان کا کردار ہے خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہے یا نہیں اور اس کے اخلاق و کردار کی کیا حالت ہے؟ اگر یہ محسوس ہو کہ اس کے دل پر خوفِ خدا کے بجائے خواہشاتِ نفسانی کی حکمرانی ہے تو خواہ وہ کسی اعلیٰ ڈگریاں رکھتا ہو اپنے من میں کتنا مہر اور پختہ کار ہو، اسلام کی نظر میں وہ کسی اونچے منصب کا مستحق نہیں ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذَٰلِكَ ظَنُّ

اور ہم نے نہیں بنایا آسمان اور زمین کو اور ان کے بیچ میں ہے نکمّا یہ خیال ہے ان کا

الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ ۚ أَمْ تَجْعَلُ

جو منکر ہیں سو خرابی ہے منکروں کے لئے آگ سے کیا ہم

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ

کر دیں گے ایمان والوں کو جو کرتے ہیں نیکیاں برابر ان کے جو خرابی ڈالیں ملک میں

أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ۚ ۞ كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ

کیا ہم کر دیں گے ڈرنے والوں کو برابر ڈھیٹ لوگوں کے؟ ایک کتاب ہے جو اتاری ہم نے

مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرُوا ۚ أُولَٰئِكَ أَلْبَابُ ۚ ۞

تیری طرف برکت کی تادھیان کریں لوگ اس کی باتیں اور تا سمجھیں عقل والے۔

## خلاصہ تفسیر

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو چیزیں ان کے درمیان موجود ہیں ان کو خالی از حکمت پیدا نہیں کیا۔ بلکہ بہت سی حکمتیں ہیں جن میں سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ ان سے توحید اور آخرت ثابت ہوتی





خود اس کائنات میں عدل و انصاف قائم نہیں کرے گی؟ یقیناً اُس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اچھے اور بُرے تمام لوگوں کو ایک لاکھٹی سے ہانکنے کے بجائے بدکاروں کو سزا دے، اور نیکو کاروں کو انعام عطا فرمائے، یہی اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے اور اس کے رویہ کار آنے کے لئے قیامت و آخرت کا وجود اس کی حکمت کے عین مطابق ہے۔ جو لوگ آخرت کا انکار کرتے ہیں وہ گویا زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ یہ کائنات بے مقصد اور خالی از حکمت پیدا کر دی گئی ہے۔ اور اس میں اچھے بُرے تمام لوگ زندگی گزار کر مر جائیں گے اور پھر ان سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر ایمان رکھنے والا اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

اَمْ يَجْعَلُ الَّذِي يَتَوَكَّلُ عَلَىٰ تَوَكُّلِ الْاٰلِیٰ تَوَكَّلُ تَعَالٰی (تو کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیکو کاروں کو زمین میں فساد پھیلانے والوں کے برابر کر دیں گے یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کے برابر کر دیں؟) یعنی ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، بلکہ دونوں کا انجام بالکل مختلف ہوگا۔ اسی سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ مومن اور کافر کا یہ فرق آخرت کے احکام کے اعتبار سے ہے۔ دنیا میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافر کو مومن سے بڑھ کر مادی راحتیں مل جائیں۔ نیز اس سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکالا جاسکتا کہ کافر کے دنیوی حقوق مومن کی برابر نہیں ہو سکتے۔ بلکہ کافر کو مسلمان کے برابر انسانی حقوق دیئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی مملکت میں جو غیر مسلم اقلیتیں عہد و پیمان کے ساتھ بستی ہوں، انھیں تمام انسانی حقوق مسلمانوں کے برابر ہی دیئے جائیں گے۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ ۖ نِعْمَ الْعَبْدُ ۚ إِنَّهُٓ أَوَّابٌ ۝۳۱

اور دیا ہم نے داؤد کو سلیمان بہت خوب بندہ وہ ہے رجوع ہونے والا جب

عَرَضَ عَلَيْهِ بِالْعَاشِي الصَّفِينَةُ الْجَيَادُ ۝۳۲ فَقَالَ اِنِّیْ

دکھانے کو لائے اس کے سامنے شام کو گھوڑے بہت خاصے تو بولا میں نے

اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ ۚ حَتّٰی تَوَارَتْ

دوست رکھا مال کی محبت کو اپنے رب کی یاد سے یہاں تک کہ سورج چھپ گیا

بِالْحِجَابِ ۝۳۳ رَدُّوْهَا عَلٰی ۖ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ

اوٹ میں پھیر لائے ان کو میرے پاس پھر لگا جھاڑنے ان کی پنڈلیاں

وَالْاَعْنَاقِ ۝۳۴

اور گردنیں -

## خلاصہ تفسیر

اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو سلیمان (علیہ السلام) فرزند عطا کیا بہت اچھے بندے تھے کہ خدا کی طرف بہت رجوع ہونے والے تھے (چنانچہ ان کا وہ قصہ یاد رکھنے کے لائق ہے) جبکہ تمام کے وقت ان کے روپر و اھیل (اور) عمدہ گھوڑے (جو بغرض جہاد وغیرہ رکھے جاتے تھے) پیش کئے گئے (اور ان کے ملاحظہ کرنے میں اس قدر دیر ہو گئی کہ دن چھپ گیا اور کوئی معمول از تسبیح نماز فوت ہو گیا اور بوجہ معیبت و جلالت کے کسی خادم کی جرأت نہ ہوئی کہ مطلع و مستنبہ کرے، پھر جب خود ہی تنبیہ ہوا، تو کہنے لگے کہ (افسوس) میں اس مال کی محبت کی خاطر (لگ کر) اپنے رب کی یاد سے (یعنی نماز سے) غافل ہو گیا، یہاں تک کہ آفتاب پردہ (مغرب) میں چھپ گیا (پھر خادموں کو حکم دیا کہ) ان گھوڑوں کو ذرا پھر تو میرے سامنے لاؤ (چنانچہ لائے گئے) سوا کھنوں نے ان (گھوڑوں) کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلواریں) ہاتھ صاف کرنا شروع کیا (یعنی ان کو ذبح کر ڈالا)۔

## معارف و مسائل

ان آیتوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کی مشہور تفسیر یہی ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر میں ذکر کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کے معائنہ میں ایسے مشغول ہوئے کہ عصر کا وقت جو نماز پڑھنے کا معمول تھا وہ چھوٹ گیا، بعد میں تنبیہ ہو کر آپ نے ان تمام گھوڑوں کو ذبح کر ڈالا کہ ان کی وجہ سے یاد الہی میں خلل واقع ہوا تھا۔ یہ نماز نفلی بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس صورت میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اتنی غفلت کی بھی تلافی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرض نماز ہو، اور معائنہ میں لگ کر بھول طاری ہو گئی ہو، بھول جانے کی صورت میں فرض نماز کے قضاء ہونے سے گناہ تو نہیں ہوتا۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بلند منصب کے پیش نظر اس کا بھی تذکرہ فرمایا۔

ان آیات کی یہ تفسیر مستند دائرہ تفسیر سے منقول ہے، اور حافظ ابن کثیرؒ جیسے محقق عالم نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے، اور اس کی تائید ایک مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے جو علامہ سیوطیؒ نے معجم طبرانیؒ اسماعیلیؒ اور ابن مردودہؒ کے حوالے سے نقل کی ہے:-

(عن ابی بن کعب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قولہ فطفق مسحاً بالسوق والاعناق قال قطع سوقھا وأهنا قھا بالسیف)۔

علامہ سیوطیؒ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ (ورمنثور ج ۳۰۹ ص ۵) اور علامہ ہشتمیؒ مجمع الرواۃ



میں یہ حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں۔

”اسے طبرانی رحمہ اللہ نے اوسط میں روایت کیا ہے، اس میں ایک راوی سعید بن بشر ہیں جنہیں شعبہ وغیرہ نے ثقہ کہا ہے، اور ابن معین رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے، اور اس کے باقی رجال ثقہ ہیں“ (مجمع الزوائد ص ۹۹ ج ۴۔ کتاب التفسیر)

اس حدیث مرفوعہ کی وجہ سے یہ تفسیر کافی مضبوط ہو جاتی ہے لیکن اس پر عموماً یہ شبہ ہوتا ہے کہ گھوڑے اللہ کا عطا کیا ہوا ایک انعام تھا، اور اپنے مال کو اس طرح ضائع کر دینا ایک بنی کے شایانِ شان معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ گھوڑے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ذاتی ملکیت میں تھے۔ اور ان کی شریعت میں گائے، بکری، اور نٹ کی طرح گھوڑوں کی قربانی بھی جائز تھی، لہذا انھوں نے گھوڑوں کو ضائع نہیں کیا، بلکہ انھیں اللہ تعالیٰ کے نام پر قربان کر دیا۔ جس طرح گائے، بکری کی قربانی سے ان کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا، بلکہ یہ عبادت ہی کا ایک شعبہ ہے، اسی طرح یہاں بھی عبادت ہی کے طور پر ان کی قربانی پیش کی گئی۔ (روح المعانی)

اکثر حضرات مفسرین نے آیت کی یہی تفسیر کی ہے، لیکن ان آیات کی ایک تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے جس میں واقعہ بالکل مختلف طریقے سے بیان کیا گیا ہے اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے وہ گھوڑے معاند کے لئے پیش کئے گئے جو جہاد کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام انھیں دیکھ کر مسرور ہوئے۔ اور ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے ان گھوڑوں سے جو محبت اور تعلق خاطر ہے وہ دنیا کی محبت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنے پروردگار ہی کی یاد کی وجہ سے ہے، کیونکہ یہ جہاد کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ اور جہاد ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ اتنے میں گھوڑوں کی وہ جماعت آپ کی نگاہوں سے روپوش ہو گئی۔ آپ نے حکم دیا کہ انھیں دوبارہ سامنے لایا جائے۔ چنانچہ جب وہ دوبارہ سامنے آئے تو آپ ان کی گردنوں اور پنڈلیوں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگے۔

اس تفسیر کے مطابق عن ذکر سہابی میں عن سببیہ ہے۔ اور تواتر کی ضمیمہ گھوڑوں ہی کی طرف راجع ہے، اور مسیح سے مراد کاٹنا نہیں، بلکہ محبت سے ہاتھ پھیرنا ہے۔

قدیم مفسرین میں سے حافظ ابن جریر طبری رحمہ اللہ اور امام رازی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے، کیوں کہ اس پر مال ضائع کرنے کا شبہ نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کے الفاظ کے لحاظ سے دونوں تفسیروں کی گنجائش ہے، لیکن پہلی تفسیر کے حق میں چونکہ ایک مرفوعہ حدیث آگئی ہے جو مسند کے اعتبار سے حسن ہے، اس لئے اس کی قوت بڑھ جاتی ہے۔

بعض حضرات نے پہلی تفسیر کو اختیار کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ نماز عصر کے سورج کی واپسی کا قصہ قضا ہو جانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یا فرشتوں سے یہ درخواست کی کہ سورج کو دوبارہ لوٹا دیا جائے، چنانچہ سورج لوٹا دیا گیا، اور آپ نے اپنا معمول پورا کر لیا۔ اس کے بعد دوبارہ سورج غروب ہوا، یہ حضرت زکوةؑ کی منیر کو سورج کی طرف راجع مانتے ہیں۔

لیکن محقق مفسرین مثلاً علامہ آلوسی رحمہ وغیرہ نے اس قصے کی تردید کی ہے۔ اور کہا ہے کہ، زکوةؑ کی منیر گھوڑوں کی طرف راجع ہے نہ کہ سورج کی طرف۔ اس لئے نہیں کہ معاذ اللہ سورج کو دوبارہ لوٹا دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں نہیں، بلکہ اس لئے کہ یہ قصہ قرآن و حدیث کی کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ (روح المعانی)

بہر کیف! اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت اللہ کی یاد سے غفلت ہو تو اپنے اوپر سزا اللہ کی یاد سے غفلت ہو جائے تو نفس کو سزا دینے کے لئے اُسے کسی فعلِ مباح سے محروم کر دینا جائز ہے۔ اور حضرات صوفیائے

کرام کی اصطلاح میں اُسے ”غیرت“ کہا جاتا ہے۔ (بیان القرآن)

کبھی تنگی کی عادت ڈالنے کے لئے اپنے نفس پر ایسی سزائیں مقرر کرنا اصلاحِ نفس کا ایک نسخہ ہے اور اس واقعہ سے اس کا جواز بلکہ استحباب معلوم ہوتا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو جہم رضی اللہ عنہ نے ایک شامی چادر ہدیہ پیش کی جس پر کچھ نقش و نگار بنے ہوئے تھے آپ نے اس چادر میں نماز پڑھی اور واپس آکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ یہ چادر ابو جہم رضی اللہ عنہ کو واپس کر دو، کیونکہ نماز میں میری نگاہ اس کے نقش و نگار پر پڑ گئی، تو قریب تھا کہ یہ نقش و نگار مجھے فتنہ میں ڈال دیں۔ (احکام القرآن بحوالہ موطا و مالک رحمہما)

اسی طرح حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ اپنے باغ میں نماز پڑھتے ہوئے ایک پرندے کو دیکھنے میں مشغول ہو گئے جس سے نماز کی طرف دھیان نہ رہا، تو بعد میں آپ نے پورا باغ صدقہ کر دیا۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس مقصد کے لئے سزا ایسی ہی ہونی چاہیے جو بذاتِ خود جائز ہو، کسی مال کو بلا وجہ ضائع کر دینا جائز نہیں۔ لہذا ایسا کوئی کام درست نہیں جس سے اضافتِ مال لازم آتی ہو صوفیاء میں سے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اسی سزا کے طور پر اپنے کپڑے جلادینے بچھے، لیکن محقق صوفیاء مثلاً شیخ عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کے اس عمل کو صحیح قرار نہیں دیا۔

(روح المعانی)

امیر کو بذاتِ خود ریاست کے کاموں کی نگرانی کرنی چاہیے۔ اس واقعہ سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ



مملکت کے ذمہ دار یا اونچے درجہ کے افسر کو چاہیے کہ وہ اپنے ماتحت شعبوں پر بذات خود نگرانی رکھے، اور انھیں اپنے ماتحتوں پر چھوڑ کر فارغ نہ ہو بیٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ماتحتوں کی کثرت کے باوجود یہ نفس نفیس گھوڑوں کا معائنہ فرمایا۔ خلفائے راشدین اور خاص طور سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

ایک عبادت کے وقت دوسری عبادت میں مشغول ہونا غلطی ہے۔

تیسری بات اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ ایک وقت عبادت کے وقت کسی دوسری عبادت میں بھی صرف نہ کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جہاد کے گھوڑوں کا معائنہ ایک عظیم عبادت تھی۔ لیکن چونکہ وہ وقت اس عبادت کے بجائے نماز کا تھا، اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو بھی غلطی میں شمار کر کے اس کا تذکرہ فرمایا۔ اسی لئے ہمارے فقہار نے لکھا ہے کہ جمعہ کی اذان کے بعد جس طرح خرید و فروخت میں مشغولیت جائز نہیں، اسی طرح نماز جمعہ کی تیاری کے علاوہ کسی اور کام میں مشغول ہونا بھی درست نہیں، خواہ وہ تلاوت قرآن یا نقل پڑھنے کی عبادت ہی کیوں نہ ہو۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَى كُرْسِيِّهِ جَسَداً ثُمَّ أَنَابَ ﴿۳۴﴾

اور ہم نے جانچا سلیمان کو اور ڈال دیا اُس کے تخت پر ایک دھڑ پھر وہ رجوع ہوا۔

## خلاصہ تفسیر

اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کو (ایک اور طرح سے بھی) امتحان ڈالا اور ہم نے اُن کے تخت پر ایک دھڑ لا ڈالا۔ پھر انھوں نے خدا کی طرف رجوع کیا۔

## معارف و مسائل

اس آیت میں باری تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک اور آزمائش کا تذکرہ فرمایا ہے اور اس سلسلے میں صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ اس آزمائش کے دوران کوئی دھڑ حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی پر ڈال دیا گیا تھا۔ اب وہ دھڑ کیا تھا؟ اس کے کرسی پر ڈالنے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس سے آزمائش کیونکر ہوئی؟ یہ تفصیلات نہ قرآن کریم میں موجود ہیں اور نہ کسی صحیح حدیث سے ثابت ہیں۔ اس لئے بعض محقق مفسرین مثلاً حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ حجاز یہاں بھی اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے جس بات کو مجمل چھوڑا ہے اُس کی تفصیلات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، بس اتنی بات پر ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کوئی آزمائش کی تھی، جس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام

نے اللہ کی طرف پہلے سے زیادہ رجوع فرمایا، اور قرآن کریم کا اصل مقصد اتنے بیان سے پورا ہو جاتا ہے۔ اور بعض مفسرین نے اس آزمائش کی تفصیلات کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں متعدد احتمالات بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے بعض احتمالات تو خالص اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں مثلاً یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا راز ان کی انگوتھی میں تھا، ایک دن ایک شیطان نے اس انگوتھی کو قبضہ میں کر لیا، اور اس کی وجہ سے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر آپ ہی کی شکل میں حکمراں بن بیٹھا۔ چالیس دن کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کو وہ انگوتھی ایک پھلی کے پیٹ میں سے ملی، اس کے بعد آپ نے دوبارہ حکومت پر قبضہ کیا۔ یہ روایت متعدد مزید قصوں کے ساتھ کئی تفسیر کی کتابوں میں آئی ہے، لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس قسم کی تمام روایات کو اسرائیلیات میں شمار کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

”اہل کتاب میں ایک جماعت ایسی ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی نہیں مانتی۔ بس ظاہر یہ ہے کہ یہ جھوٹے قصے انہی لوگوں نے گھڑے ہیں“ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۷۳ ج ۲)

لہذا اس قسم کی روایات کو اس قرآنی آیت کی تفسیر کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک اور واقعہ صحیح بخاری رحمہ اللہ میں مذکور ہے، بعض حضرات مفسرین نے اس واقعہ کے بعض حصوں کو قرآن کریم کی اس آیت سے ملتا جلتا دیکھ کر اسے اس آیت کی تفسیر قرار دیا ہے اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ آج رات میں ازواج کے ساتھ وظیفہ روز جمیت ادا کروں گا۔ اور ان میں سے ہر بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو اللہ کے راستے میں جہاد کرے گا۔ لیکن یہ خیال ظاہر فرماتے وقت آپ ”انشاء اللہ“ کہنا بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے جلیل القدر پیغمبر کی یہ فروگزاشت پسند نہ آئی اور اس نے آپ کے دعوے کو اس طرح غلط ثابت کر دیا کہ تمام ازواج مطہرات میں سے صرف ایک بیوی کے یہاں ایک مردہ بچہ پیدا ہوا۔ جس کا ایک پہلو نڈار دھکا۔

بعض مفسرین نے اس واقعہ کو آیت پر منطبق کر کے یہ فرمایا کہ تخت پر دھڑکے لاڈالنے سے مراد یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے کسی خادم نے یہ بچہ آپ کے تخت پر لا کر رکھ دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس پر تنبیہ ہو کہ یہ انجام میرے ”انشاء اللہ“ نہ کہنے کا ہے۔ چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع فرمایا اور اپنی اس فروگزاشت پر استغفار کیا۔

اس تفسیر کو متعدد محقق مفسرین مثلاً قاضی ابوالسعود اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں بھی اسی کے مطابق تفسیر کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کو بھی آیت کی قطعی تفسیر نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ یہ واقعہ جتنی روایتوں میں آیا ہے ان میں



کہیں اس بات کی کوئی علامت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زیر بحث آیت کی تفسیر میں ذکر فرمایا ہو۔ امام بخاری رحم نے بھی یہ حدیث کتاب الجہاد، کتاب الانبیاء اور کتاب الایمان والذکر وغیرہ میں تو مستعد و طریقوں سے نقل کی ہے۔ لیکن کتاب التفسیر میں سورہ ص کی تفسیر کے تحت اسے کہیں ذکر نہیں کیا، بلکہ آیت وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَمُوتَ کے تحت ایک دوسری روایت نقل کی ہے اور اس حدیث کا کوئی حوالہ تک نہیں دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحم کے نزدیک بھی یہ واقعہ آیت زیر بحث کی تفسیر نہیں، بلکہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے دوسرے متعدد واقعات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں اُسی طرح یہ بھی ایک جداگانہ واقعہ ہے جس کا کسی آیت کی تفسیر ہونا کوئی ضروری نہیں۔

ایک تیسری تفسیر امام رازی رحم نے بیان کی ہے، اور وہ یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک مرتبہ سخت بیمار ہو گئے، اور اس کی وجہ سے نقاہت اس درجہ بڑھ گئی کہ جب تخت پر لا کر بٹھائے گئے تو ایک بے روح جسم معلوم ہوتا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطا فرمائی۔ اس وقت انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے شکر بھی ادا کیا اور مغفرت بھی طلب فرمائی، اور آئندہ کے لئے بے نظیر حکومت کی دعا بھی کی۔

لیکن یہ تفسیر بھی محض قیاسی ہے، قرآن کریم کے الفاظ سے بھی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی اور کسی روایت سے بھی اس کا ثبوت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی یقینی تفصیلات معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، اور نہ ہم اس کے مکلف ہیں۔ لہذا اتنی بات پر ایمان رکھنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کوئی آزمائش کی تھی جس کے بعد ان میں انابت الی اللہ کا جذبہ پہلے سے زیادہ پیدا ہوا اور اس واقعہ کو ذکر کرنے سے قرآن کریم کا اصل مقصد تمام انسانوں کو اس بات کو دعوت دینا ہے کہ وہ کسی صیبت یا آزمائش میں مبتلا ہوں تو انھیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح پہلے سے زیادہ رجوع الی اللہ کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ رہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کی تفصیلات سوانہ کو اللہ کے حوالے کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَمُوتَ لِأَحَدٍ مِّنْ

بولالے رب میرے معاف کر مجھ کو اور بخش مجھ کو وہ بادشاہی کہ مناسب نہ ہو کسی کو میرے

بَعْدِي ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ

تیرے بے شک تو ہے سب کچھ بخشنے والا پھر ہم نے سب کچھ کو اس کے ہوا کو

تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُحَاةٌ حَيْثُ أَصَابَ ۖ وَالشَّيْطَانُ كُلُّ بَنَاءٍ

چلتی تھتی اس کے حکم سے نرم نرم جہاں پہنچنا چاہتا اور تابع کئے شیطان سارے عمارت کرنے والے

وَعَوَاصٍ ۖ وَآخِرِينَ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۖ هَذَا

اور عوطے لگانے والے اور بہت سے اور جو باہم جکڑے ہوئے ہیں بیڑیوں میں - یہ ہے

عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۖ وَإِنَّ لَكَ

بخشش ہماری اب تو احسان کر یا رکھ چھوڑ کچھ حساب نہ ہوگا - اور اس کو

عِنْدَنَا لَفِي وَحْشٍ مَّالٍ ۖ

ہمارے یہاں مرتبہ ہے اور اچھا بٹھکانا

## خلاصہ تفسیر

(حضرت سلیمانؑ نے اللہ سے دعا مانگی کہ اے میرے رب میرا (پچھلا) تصور معاف کر اور (آئندہ کے لئے) مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے سوا (میرے زمانہ میں) کسی کو میسر نہ ہو (خواہ کوئی غیبی دھبی سامان عطا کر دیجئے خواہ سلاطین زمانہ کو ویسے ہی وباد کر دیجئے تاکہ مقابلہ ہی نہ کر سکیں اور) آپ بڑے دینے والے ہیں) آپ کو اس دعا کا قبول کر لینا کچھ دشوار نہیں) سو (ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کی خطا بھی معاف کر دی اور نیز) ہم نے ہوا کو ان کے تابع کر دیا کہ وہ ان کے حکم سے جہاں وہ (جانا) چاہتے نرمی سے چلتی (کہ اس سے گھوڑوں کی ضرورت نہ رہی) اور جنات کو بھی ان کے تابع کر دیا یعنی تعمیر بنانے والوں کو بھی اور ہوتی وغیرہ کے لئے غوطہ خوروں کو بھی اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے (غالباً جو مفوضہ خدمات سے گریز یا اس میں کوتاہی کرتا ہوتا) اس کو قید کی سزا ہوتی ہوگی، اور ہم نے یہ سامان دیکر ارشاد فرمایا کہ) یہ ہمارا عطیہ ہے، سو خواہ (کسی کو) دریائے دو دم سے کچھ دارہ و گیر نہیں (یعنی جتنا سامان ہم نے تم کو دیا ہے، اس میں تم کو دوسرے بادشاہوں کی طرح محض خازن اور منتظم ہی نہیں بنایا، بلکہ تم کو مالک بھی بنادیا ہے) اور علاوہ اس سامان کے جو دنیا میں ان کو عطا ہوا تھا، ان کے لئے ہمارے یہاں (خاص) قرب اور (اعلیٰ درجہ) کی نیک انجامی ہے (جس کا ثمرہ پورے طور پر آخرت میں ظاہر ہوگا)۔

## معارف و مسائل

هَبْ لِي مَلِكًا ۖ وَيُنَبِّئْنِي بِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي - (مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے بعد کسی کو



میسر نہ ہو، اس دعا کا مطلب بعض مفسرین نے تو یہ بتایا ہے کہ میرے زمانے میں میری جیسی عظیم الشان سلطنت کسی اور کو میسر نہ ہو۔ گویا ان کے نزدیک ”میرے بعد“ کا مطلب ”میرے سوا“ ہے۔ حضرت تھانویؒ نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ لیکن بیشتر مفسرین کے نزدیک دعا کا مفہوم یہ ہے کہ میرے بعد بھی کسی کو ایسی عظیم الشان حکومت حاصل نہ ہو، چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جیسی حکومت عطا فرمائی، ویسی بعد میں بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ کیونکہ ہواؤں کا مسخر ہونا اور جنات کا ایسا تابع ہونا بعد میں کسی کو میسر نہ آسکا۔ بعض لوگ عملیات وغیرہ کے ذریعہ بعض جنات کو جو مسخر کر لیتے ہیں وہ اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تسخیر جنات سے اس کو کوئی نسبت نہیں، عملیات کے ماہرین دو ایک یا چند جنات کو تابع بنا لیتے ہیں۔ لیکن جس طرح کی ہمہ گیر حکومت حضرت سلیمان علیہ السلام کو حاصل تھی ویسی کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کی کوئی دعا اللہ تعالیٰ کی حکومت اور اقتدار کی دعا اجازت کے بغیر نہیں ہوتی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ دعا بھی باری تعالیٰ کی اجازت ہی سے مانگی تھی۔ اور چونکہ اس کا منشاء محض طلب اقتدار نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے اور کلمہ حق کو سر بلند کرنے کا جذبہ کار فرما تھا، اور باری تعالیٰ کو معلوم تھا کہ حکومت ملنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام انہی مقاصد عالیہ کے لئے کام کریں گے۔ اور حسب جاہ کے جذبات ان کے دل میں جگہ نہیں پائیں گے۔ اس لئے انھیں اس دعا کی اجازت بھی دیدی گئی اور اسے قبول بھی کر لیا گیا۔ لیکن عام لوگوں کے لئے از خود اقتدار کے طلب کرنے کو حدیث میں اس لئے منع کیا گیا ہے کہ اس میں حسب جاہ و مال کے جذبات شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جہاں انسان کو اس قسم کے جذبات نفسانی سے خالی ہونے کا یقین ہو اور وہ واقعہٴ اعلا و کلمۃ الحق کے سوا کسی اور مقصد سے اقتدار حاصل نہ کرنا چاہتا ہو، تو اس کے لئے حکومت کی دعا مانگنا جائز ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

مَقَرَّبِينَ فِي الْأَصْفَادِ۔ (زنجیروں میں جکڑے ہوئے) جنات کی تسخیر اور جو خدمات وہ انجام دیتے تھے، ان کی تفصیل سورہ سبا میں گزر چکی ہے، یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ سرکش جنات کو حضرت سلیمانؑ نے زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اب ان زنجیروں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ یہی نظر آنے والی لوہے کی زنجیریں ہوں، ہو سکتا ہے کہ جنات کو جکڑنے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا ہو۔ جسے آسانی سے سمجھانے کے لئے یہاں زنجیروں سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

وَإِذْ كُنَّا عَبْدًا لَّيُوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسْنِي

اور یاد کر ہمارے بندے ایوب کو جب اُس نے پکارا اپنے رب کو کہ مجھ کو لگا دی

الشَّيْطَانُ يَنْصُبُ وَعْدًا ۖ ابِ ۴۱ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هَذَا مُغْتَسَلٌ

شیطان نے ایذا اور تکلیف - لات مارا اپنے پاؤں سے یہ چشمہ نکلا نہانے کو

بِأَسَدٍ وَشَرَابٌ ۴۲ وَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ

ٹھنڈا اور پیسے کو اور بخشے ہم نے اس کو اس کے گھر والے اور ان کے برابر ان کے ساتھ

سَرَحْمَةً مِّمَّا وَذِكْرَى لِرَأُولِي الْأَلْبَابِ ۴۳ وَخَذَ بِيَدِهِ

اپنی طرف کی مہربانی سے اور یاد رکھنے کو عقل والوں کے اور پکڑا اپنے ہاتھ میں

ضِعْفًا فَأَضْرَبَ بِهِ وَلَا تَحْنُطُ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَبْرًا ط

سینکوں کا ٹھٹھا پھر اس سے مارے اور اپنی قسم میں جھوٹا نہ ہو ہم نے اس کو پایا بھیلے والا

نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۴۴

بہت خوب بندہ تحقیق وہ ہے رجوع کرنے والا -

## خلاصہ تفسیر

اور آپ ہمارے بندہ ایوب (علیہ السلام) کو یاد کیجئے جبکہ انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھ کو رنج اور آزار پہنچایا ہے۔ اور یہ رنج و آزار بعض مفسرین کے قول کے مطابق وہ ہے جو امام احمد رحمہ اللہ نے کتاب الزہد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کے زمانے میں ایک بار شیطان ایک طبیب کی شکل میں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی کو ملا تھا۔ اسے انہوں نے طبیب سمجھ کر علاج کی درخواست کی اس نے کہا اس مشرط سے کہ اگر ان کو شفا ہو جاوے تو یوں کہہ دینا کہ تو نے ان کو شفا دی، میں اور کچھ نذرانے نہیں چاہتا۔ انہوں نے ایوب علیہ السلام سے ذکر کیا، انہوں نے فرمایا کہ بھائی مانس وہ تو شیطان تھا۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو شفا دیدے تو میں تجھ کو سو تمچیاں مار دوں گا۔ پس آپ کو سخت رنج پہنچا اس سے کہ میری بیماری کی بدولت شیطان کا یہاں تک حوصلہ بڑھا کہ خاص میری بیوی سے ایسے کلمات کہلوانا چاہتا ہے جو ظاہراً موجب شرک ہیں۔ گو تاویل سے شرک نہ ہوں اگرچہ حضرت ایوب علیہ السلام انزالہ مرض کے لئے پہلے بھی دعا کر چکے تھے۔ مگر اس واقعہ سے اور زیادہ ابہتال اور تضرع سے دعا کی، پس ہم نے ان کی دعا قبول کر لی اور حکم دیا کہ اپنا پاؤں (زمین پر) مارو۔ (چنانچہ انہوں نے زمین پر پاؤں مارا تو وہاں سے ایک چشمہ پیدا ہو گیا۔ (رواہ احمد))

پس ہم نے ان سے کہا کہ - یہ (تمہارے لئے) نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے اور پیئے گا۔ (یعنی اس میں غسل کرو اور پیو بھی۔ چنانچہ نہانے اور پینے کا حکم دیا، اور بالکل اچھے ہو گئے) اور ہم نے ان کو ان کا کتبہ عطا فرمایا



اور ان کے ساتھ (گنتی میں) ان کے برابر اور بھی (دیئے) اپنی رحمت خاصہ کے سبب سے اور اہل عقل کے لئے یادگار رہنے کے سبب سے (یعنی اہل عقل یا درکھیں کہ اللہ تعالیٰ صابروں کو کیسی جزا دیتے ہیں اور اب ایوب علیہ السلام نے اپنی قسم پوری کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر چونکہ ان کی بیوی نے ایوب علیہ السلام کی خدمت بہت کی تھی۔ اور ان سے کوئی گناہ بھی صادر نہ ہوا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کے لئے ایک تخفیف فرمائی) اور (ارشاد فرمایا کہ اے ایوب) تم اپنے ہر گناہ میں ایک مٹھا سینکوں کا لو (جس میں تلو سینکیں ہوں) اور (اپنی بیوی کو) اس سے مار لو اور (اپنی) قسم توڑو (چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آگے ایوب علیہ السلام کی تعریف کی ہے کہ) بے شک ہم نے ان کو (بڑا) صابر پایا، اچھے بندے تھے کہ (خدا کی طرف) بہت رجوع ہوتے تھے۔

## معارف و مسائل

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کرنے کے لئے لایا گیا ہے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ سورہ انبیاء میں گزر چکا ہے، یہاں چند باتیں قابل ذکر ہیں۔

مَسْتَبِيحَ الشَّيْطَانِ بِمُصِيبٍ وَعَذَابٍ - شیطان نے مجھ کو رنج اور آزار پہنچایا ہے، بعض حضرات نے شیطان کے رنج و آزار پہنچانے کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام جس بیماری میں مبتلا ہوئے وہ شیطان کے تسلط کی وجہ سے آئی تھی۔ اور ہوا یہ تھا کہ ایک مرتبہ فرشتوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بہت تعریف کی جس پر شیطان کو سخت حسد ہوا اور اُس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے ان کے جسم اور مال و اولاد پر ایسا تسلط عطا کر دیا جائے جس سے میں ان کے ساتھ جو چاہوں سو کروں، اللہ تعالیٰ کو بھی حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش مقصود تھی، اس لئے شیطان کو یہ حق دیدیا گیا اور اس نے آپ کو اس بیماری میں مبتلا کر دیا۔

لیکن محقق مفسرین نے اس قصے کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق انبیاء علیہ السلام پر شیطان کو تسلط حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اُس نے آپ کو بیمار ڈال دیا ہو۔

بعض حضرات نے شیطان کے رنج و آزار پہنچانے کی یہ تشریح کی ہے کہ بیماری کی حالت میں شیطان حضرت ایوب علیہ السلام کے دل میں طرح طرح کے دوسو سے ڈالا کرتا تھا، اس سے آپ کو اور زیادہ تکلیف ہوتی تھی، یہاں آپ نے اسی کا ذکر فرمایا ہے۔ لیکن اس آیت کی سب سے بہتر تشریح وہ ہے جو حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں اختیار کی ہے اور جو خلاصہ تفسیر میں اوپر لکھی گئی ہے۔

حضرت ایوبؑ کے مرض کی نوعیت

قرآن کریم میں اتنا تو بتایا گیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک شدید قسم کا مرض لاحق ہو گیا تھا، لیکن اس مرض کی نوعیت نہیں بتائی گئی۔ احادیث میں

بھی اس کی کوئی تفصیل آنحضرت ﷺ سے منقول نہیں ہے۔ البتہ بعض آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے جسم کے ہر حصے پر پھوڑے نکل آئے تھے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے گھن کی وجہ سے آپ کو ایک کوڑی پر ڈال دیا تھا۔ لیکن بعض محقق مفسرین رح نے ان آثار کو درست تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بیماریاں تو آسکتی ہیں، لیکن انھیں ایسی بیماریوں میں مبتلا نہیں کیا جاتا، جن سے لوگ گھن کرنے لگیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری بھی ایسی نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ کوئی عام قسم کی بیماری تھی، لہذا وہ آثار جن میں حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف پھوڑے پھنسیوں کی نسبت کی گئی ہے یا جن میں کہا گیا ہے کہ آپ کو کوڑی پر ڈال دیا گیا تھا، روایت و درایت قابل اعتماد نہیں ہیں۔

(ملخص از روح المعانی واحکام القرآن)

خُذْ بِيَدِكَ ضِغْتًا - (تم اپنے ہاتھ میں ایک گٹھنا سینکوں کا لو) اس واقعہ کا پس منظر اوپر خلاصہ تفسیر میں آچکا ہے۔ یہاں اس واقعہ سے متعلق چند مسائل درج کئے جاتے ہیں:-

پہلا مسئلہ تو ہے کہ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کو تنویمچیاں مارنے کی قسم کھالے اور بعد میں تنویمچیاں الگ الگ مارنے کے بجائے تمام نمچیوں کا ایک گٹھنا بنا کر ایک ہی مرتبہ مار دے تو اس سے قسم پوری ہو جاتی ہے۔ اسی لئے حضرت ایوب علیہ السلام کو ایسا کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہی امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔ لیکن جیسا کہ علامہ ابن ہمام رح نے لکھا ہے کہ اس کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس شخص کے بدن پر ہر قسم کی طویل یا عرضاً ضرور لگ جائے۔ دوسرے یہ کہ اس سے کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور ہو۔ اگر اتنے ہلکے سے نمچیاں بدن کو لگائی گئیں کہ بالکل تکلیف نہ ہوئی تو قسم پوری نہیں ہوگی۔ حضرت تھانوی رح نے بیان القرآن میں جو لکھا ہے کہ قسم پوری نہیں ہوگی، تو غالباً اس کی مراد یہی ہے کہ تکلیف بالکل نہ ہو یا کوئی لمبی بدن کو لگ جائے سے رہ جائے، ورنہ فقہائے حنفیہ رح نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر مذکورہ دو شرطوں کے ساتھ مارا جائے تو قسم پوری ہو جاتی ہے۔

(ملاحظہ ہو فتح القدیر - ص ۱۳۷، ج ۴)

جیلوں کی شرعی حیثیت

اس آیت سے دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کسی نامناسب یا مکروہ بات سے بچنے کیلئے کوئی شرعی جیلہ اختیار کیا جائے تو وہ جائز ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت ایوب

علیہ السلام کے واقعہ میں قسم کا اصلی تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی زوجہ و مطہرہ کو پوری سو نمچیاں ماریں، لیکن چونکہ ان کی زوجہ و مطہرہ بگناہ تھیں اور انھوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بہت سی خدمت کی تھی، اسلئے



اللہ تعالیٰ نے خود حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک حیلہ کی تلقین فرمائی اور یہ تصریح کر دی کہ اس طرح ان کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ اس لئے یہ واقعہ حیلہ کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے حیلے اسی وقت جائز ہوتے ہیں جبکہ انھیں شرعی مقاصد کے ابطال کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اور اگر حیلہ کا مقصد یہ ہو کہ کسی حقدار کا حق باطل کیا جائے، یا کسی صریح فعل حرام اس کی رُوح برقرار رکھتے ہوئے اپنے لئے حلال کر لیا جائے تو ایسا حیلہ بالکل ناجائز ہے۔ مثلاً زکوٰۃ سے بچنے کے لئے بعض لوگ یہ حیلہ کرتے ہیں کہ سال کے ختم ہونے سے ذرا پہلے اپنا مال بیوی کی ملکیت میں دیدیا، پھر کچھ عرصہ کے بعد بیوی نے شوہر کی ملکیت میں دیدیا اور جب اگلا سال ختم ہونے کے قریب ہوا تو پھر شوہر نے بیوی کو ہبہ کر دیا۔ اس طرح کسی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، ایسا کرنا چونکہ مقاصد شرعیہ کو باطل کرنے کی ایک کوشش ہے، اس لئے حرام ہے اور شاید اس کا وبال ترک زکوٰۃ کے وبال سے زیادہ بڑا ہو۔ (رُوح المعانی از مبسوط مسخسی)۔

نامناسب کام پر قسم کھانا | تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی نامناسب، غلط یا ناجائز فعل پر قسم کھالے تو قسم منقذ ہو جاتی ہے، اور اس کے ٹوٹنے پر بھی کفارہ آتا ہے ظاہر ہے کہ اگر اس صورت میں کفارہ نہ آتا تو حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ حیلہ تلقین نہ فرمایا جاتا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کسی نامناسب کام پر قسم کھالی جائے تو شرعی حکم یہ ہے کہ اُسے توڑ کر کفارہ ادا کر دیا جائے۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:-

”جو شخص ایک قسم کھالے، پھر بعد میں اس کی رائے یہ ہو کہ اس قسم کے خلاف عمل کرنا زیادہ بہتر ہے تو اُسے چاہیے کہ وہ وہی کام کرے جو بہتر ہو، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے۔“

وَ اذْكُرْ عَبْدًا نَّا اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولٰٓئِ

اور یاد کر ہمارے بندوں کو ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب ہاتھوں

الْاَيْدِي وَالْاَبْصَارِ ۝۴۵ اِنَّا اَخْلَصْنٰهُمْ بَحَا لَصَدٰٓئِ

دالے اور آنکھوں والے ہم نے امتیاز دیا ان کو ایک چنی ہوئی بات کا وہ

ذِكْرٰى الدّٰ اٰرَ ۝۴۶ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِّنَ الْمُصْطَفٰٓئِ

یاد اچس گھر کی اور وہ سب ہمارے نزدیک میں چنے ہوئے نیک

الْاٰخِيَارِ ۝۴۷ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ط

لوگوں میں اور یاد کر اسماعیل کو اور الیسع اور ذوالکفل کو

وَكُلٌّ مِّنَ الْاٰخِيَارِ ۝۴۸ هٰذَا ذِكْرُ ط وَاِنَّ لِّلْمُتَّقِيْنَ لِحُسْنِ

اور ہر ایک تھا خوبی والا یہ ایک مذکور ہو چکا اور متقیوں کے لئے ہے اچھا

مَاۤی ۞۴۸ جَدَّتْ عَدْنٍ مَّفْتَحَةً لَّهُمُ الْبُۤوَابُ ۞۴۹ مُتَّكِئِينَ

ٹھکانا باغ میں سدائے کھول رکھے ہیں ان کے واسطے دروازے تکیہ لگائے ہوئے

فِيۤهَآ يَدْعُونَ فِيهَا بِقَاۤكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَشَرَابٍ ۞۵۰ وَ

بمٹھے ان میں منگوائیں گے ان میں میوے بہت اور شراب اور

عِنۡدَہُمْ قِصْرٰتُ الطَّرَافِ اَثَرَابٍ ۞۵۱ هٰذَا مِمَّا

ان کے پاس عورتیں ہیں نیچی نگاہ والیاں ایک عمر کی یہ وہ ہے جو تم

تَوَعَدُوْنَ لِیَوْمِ الْحِسَابِ ۞۵۲ اِنَّ هٰذَا لَلسَّرۡقَتَا

سے وعدہ کیا گیا حساب کے دن پر یہ ہے روزی ہماری دی

مَالِہٖ مِنْ نِّقَآدٍ ۞۵۳ هٰذَا طَرَفٌ اِنْ لِّلطَّغِیۡنِ لَشَرٌّ مَّاۤی ۞۵۴

ہوئی اس کو نہیں بڑھنا یہ مٹن چکے اور تحقیق شریدوں کے واسطے ہے برا ٹھکانا

جَہَنَّمَ یَصۡلَوْنَہَا فَبِئْسَ الْمِهَادُ ۞۵۵ هٰذَا اَفَلَیۡنَ وَقُوۡلُہٗ

دوزخ ہے جس میں ان کو ڈالیں گے سو کیا بڑی آرام کرنے کی جگہ ہے یہ ہے اب اس کو چکیں

حَمِیۡمٌ وَغَسَاقٌ ۞۵۶ وَآخِرُ مِنْ شَکَلِہٖۤ اَزْوَاجٌ ۞۵۷ هٰذَا فَوْجٌ

گرم پانی اور پیپ اور کچھ اور اسی شکل کی طرح طرح کی چیزیں یہ ایک فوج ہے

مَّقۡحَمٌ مَّعَکُمۡ لَا مَرۡحَبَآ لَہُمۡ اِنَّہُمْ صَالُوۡا النَّارَ ۞۵۸ قَالُوۡا

دھنستی آ رہی ہے تمہارے ساتھ جگہ نہ ملے ان کو یہ ہیں کھسے والے آگ میں وہ بولے

بَلْ اَنْتُمْ قُلُوبٌ لَا مَرۡحَبَآ بِکُمۡ اَنْتُمْ قَدْ مَاتُوۡۤا فَبِئْسَ

بلکہ تم ہی ہو جگہ نہ ملیو تم کو تم ہی پیش لائے ہمارے یہ بلا سو کیا بڑی ٹھہرنے کی

الْقَرَارُ ۞۵۹ قَالُوۡا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فِرۡدَۃً عَدَاۤیَا

جگہ ہے وہ بولے اے رب ہمارے جو کوئی لایا ہمارے پیش یہ اسو بڑھادے اس کو

ضَعُفًا فِی النَّارِ ۞۶۰ قَالُوۡا مَا لَنَا لَا نَرٰی رَاجَاۤیَا لَا کُنَّا

دونا مذاب آگ میں اور کہیں گے کیا ہوا کہ ہم نہیں دیکھتے ان مردوں کو کہ ہم

نَعُدُّہُمْ مِّنَ الْاَشۡرَارِ ۞۶۱ اَتُخَذَ خُفۡیَاۤیَا مَرۡاَعَتٌ عَنْہُمۡ

ان کو شمار کرتے تھے بڑے لوگوں میں کیا ہم نے ان کو ٹھٹھے میں پکڑا تھا یا چوک گئیں ان سے

الْاَبۡصَارُ ۞۶۲ اِنَّ ذٰلِکَ لَحَقُّ تَخَاصُّمِ اَہْلِ النَّارِ ۞۶۳

ہماری آنکھیں - یہ بات ٹھیک ہوئی ہے جھگڑا کرنا آپس میں دوزخیوں کا -



## خلاصہ تفسیر

اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) کو یاد کیجئے جو پاکہتوں (سے کام کرنے والے) اور آنکھوں (سے دیکھنے) والے تھے (یعنی ان میں توبہ عملیہ بھی تھی اور قوت علمیہ بھی اور) ہم نے ان کو ایک خاص بات کے ساتھ مخصوص کیا تھا کہ وہ یاد آخرت کی ہے (چنانچہ یہ ظاہر ہے کہ انبیاء میں یہ صفت سب سے زیادہ تام اور کامل ہوتی ہے، اور شاید یہ جملہ اس لئے بڑھا دیا ہے کہ اہل غفلت کے کان ہوں کہ جب انبیاء اس فکر سے خالی نہ تھے تو ہم کس شمار میں ہیں) اور وہ (حضرات) ہمارے یہاں منتخب اور سب سے اچھے لوگوں میں سے ہیں (یعنی منتخب لوگوں میں بھی سب سے بڑھ کر، چنانچہ ظاہر ہے کہ انبیاء، دوسرے اولیاء اور صالحی سے افضل ہوتے ہیں۔) اور اسمعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو بھی یاد کیجئے اور یہ سب بھی سب سے اچھے لوگوں میں سے ہیں (آگے توحید اور آخرت اور رسالت کا کسی قدر مفصل بیان ہے) ایک نصیحت کا مضمون تو یہ ہو چکا (اس سے مراد انبیاء علیہم السلام کے واقعات ہیں کہ ان واقعات میں کافروں کے لئے عقیدہ رسالت کی تبلیغ ہے، اور مومنوں کیلئے اخلاق جمیلہ اور اعمال ناصحہ کی تعلیم ہے) اور (دوسرا مضمون آخرت کی جزا و سزا کے متعلق اب شروع ہوتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ) پرہیزگاروں کے لئے آخرت میں، اچھا ٹھکانا ہے، یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات جن کے دروازے ان کے واسطے کھلے ہوئے ہوں گے (ظاہر مراد یہ ہے کہ پہلے سے کھلے ہوں گے) وہ ان باغوں میں تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے (اور) وہ وہاں (جنت کے خادموں سے) بہت سے میوے اور پیے کی چیزیں منگوائیں گے اور ان کے پاس سچی نگاہ والیاں ہم عمر ہوں گی (مراد جوڑیں ہیں اے مسلمانو!) یہ (جس کا اوپر ذکر ہوا) وہ (نعمت) ہے جس کا تم سے روز حساب آنے پر وعدہ کیا جاتا ہے، بے شک یہ ہماری عطا ہے، اس کا کہیں ختم ہی نہیں (یعنی دائمی اور ابدی نعمت ہے) یہ بات تو ہو چکی (جو نیک بخت پرہیزگاروں کے متعلق تھی) اور (آگے کافروں کے متعلق مضمون ہے) وہ (یہ کہ) سرکشوں کے لئے (یعنی جو کفر میں دوسروں کے رہنما تھے ان کے لئے) بُرا ٹھکانا ہے، یعنی دوزخ اس میں وہ داخل ہوں گے، سو بہت ہی بُری جگہ ہے، یہ کھولتا ہوا پانی اور پیپ (موجود) ہے سو یہ لوگ اس کو چکھیں اور (اس کے علاوہ) اور بھی اس قسم کی (ناگوار اور موجب آزار) طرح طرح کی چیزیں (موجود) ہیں (اس کو بھی چکھیں) اور جو تابع تھے ان کے لئے بھی یہی چیزیں ہیں، گو تقدیم و تاخرا و شدت اور شدت کا تفاوت ہو، باقی نفس عذاب میں سب شریک ہیں۔ چنانچہ جب کافروں کے رہنما اول داخل جہنم ہو چکیں گے، پھر ان کے پیروائیں گے تو رہنما آپس میں کہیں گے کہ لو، یہ ایک جماعت اور آئی جو تمہارے ساتھ (عذاب میں شریک ہونے کے لئے جہنم میں) گھس رہے ہیں ان پر خدا کی ماریہ بھی دوزخ ہی میں آ رہے ہیں (یعنی کوئی ایسا تابو عذاب کا مستحق نہ ہوتا تو اس کے آنے کی خوشی بھی ہوتی اور اس کی

آؤ بھگت بھی کہتے یہ تو خود ہی جہنمی ہیں۔ ان سے کیا امیلا اور ان کے آنے کی کیا خوشی اور کیا آؤ بھگت؟ (وہ) پیر و اپنے رہنماؤں سے کہیں گے، بلکہ تمہارے ہی اوپر خدا کی مار (کیونکہ) تم ہی تو یہ (مصلبت) ہمارے آگے لائے (کیونکہ تم ہی نے ہم کو بہکایا تھا) سو (جہنم) بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے (جو تمہاری بدولت ہمارے آگے آیا۔ اس کے بعد جب ان میں ہر شخص دوسرے پر الزام کھنے لگے گا تو اس وقت یہ متبعین ان سے خطاب چھوڑ کر حق تعالیٰ سے) دعا کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار جو شخص اس (مصلبت) کو ہمارے آگے لایا ہو اس کو دوزخ میں دونا عذاب دیجیو، اور وہ لوگ (یعنی متبعین) یا سب دوزخی آپس میں) کہیں گے کہ کیا بات ہے ہم ان لوگوں کو (دوزخ میں) نہیں دیکھتے جنکو ہم بڑے لوگوں میں شمار کیا کرتے تھے (یعنی مسلمانوں کو بدراہ اور حقیر سمجھا کرتے تھے، وہ کیوں نظر نہیں آتے) کیا ہم نے (ناحق) ان کی منسی کر رکھی تھی (اور وہ اس قابل نہ تھے اور جہنم میں نہیں آتے) یا (یہ کہ جہنم میں موجود ہیں مگر) ان (کے دیکھنے) سے بچا ہیں چکرار ہی ہیں (کہ ان پر نظر نہیں جمی۔ مطلب یہ کہ عذاب کے ساتھ یہ ایک اور حسرت ہوگی کہ جن لوگوں کو ہم برا سمجھتے تھے وہ عذاب سے بچ گئے، اور) یہ بات یعنی دوزخیوں کا آپس میں لڑنا جھگڑنا بالکل سچی بات ہے (کہ ضرور ہو کر رہے گی)۔

## معارف و مسائل

اُولٰٓئِیْنَ الذِّیْنَ دَاۤءَبُّۡنَا بِۡہِمْ۔ اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ”وہ ہاتھوں اور نگاہوں والے تھے“ مطلب یہ ہے کہ اپنی فکری اور عملی توانائیاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں صرف کرتے تھے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ اعضاء انسانی کا اصل مصروف یہ ہے کہ وہ اطاعت الہی میں خرچ ہوں، اور جو اعضاء اس میں خرچ نہ ہوں ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

فکر آخرت انبیاء کا ذکر فی الذار۔ اس کے لفظی معنی ہیں ”گھر کی یاد“ اور ”گھر“ سے مراد آخرت ہے۔ آخرت کے بجائے امتیازی وصف ہے یہ لفظ استعمال کر کے تنبیہ کر دی گئی ہے کہ انسان کو اپنا اصلی گھر آخرت ہی کو سمجھنا چاہیے اور اسی کی فکر کو اپنے افکار و اعمال کی بنیاد بنانا چاہیے۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فکر آخرت انسان کی فکری اور عملی قوت کو اور زیادہ جلا بخشتی ہے۔ بعض ملحدین کا خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ فکر آخرت انسان کی قوتوں کو کند کر دیتی ہے۔

وَالۡیَسَّعَ (اور الیسع علیہ السلام کو یاد کرو) حضرت الیسع علیہ السلام بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام میں سے ہیں اور قرآن کریم میں ان کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورہ النعام میں اور دوسرے یہاں۔ دونوں میں سے کسی جگہ آپ کے تفصیلی حالات





لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ كَثِيرًا ۖ مِنْ طِينٍ ۝۴۱ ۖ فَإِذَا سُوِّيَتْهُ وَ

فرشتوں کو میں بناتا ہوں ایک انسان مٹی کا پھر جب ٹھیک بناچکوں اور

نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۝۴۲ ۖ فَسَجَدَ

پھونکیوں اس میں ایک اپنی جان تو تم گر پڑو اُس کے آگے سجدے میں پھر سجدہ کیا

الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ۝۴۳ ۖ إِلَّا ابْلِيسَ ط اسْتَكْبَرَ

فرشتوں نے سب نے اکٹھے ہو کر مگر ابلیس نے غرور کیا

وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝۴۴ ۖ قَالَ يَا ابْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ

اور تھا وہ منکروں میں فرمایا ابلیس کس چیز نے روک دیا تجھ کو

تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِإِيْدِي ط اسْتَكْبَرْتَ أَهْمُ كُنْتَ مِنَ

کے سجدہ کرے اُس کو جس کو میں نے بنایا اپنے دونوں ہاتھ سے یہ تو نے غرور کیا یا تو بڑا تھا

الْعَالِيَيْنِ ۝۴۵ ۖ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ط خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَ

درجہ میں بولا میں بہتر ہوں اُس سے مجھ کو بنایا تو نے آگ سے اور

خَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۝۴۶ ۖ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ

اس کو بنایا مٹی سے فرمایا تو تو نکل یہاں سے کہ تو

رَجِيمٌ ۝۴۷ ۖ وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ۝۴۸ ۖ قَالَ

مردود ہوا اور تجھ پر میری لعنت کا ہے اس جزا کے دن تک بولا

رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝۴۹ ۖ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ

اے رب مجھ کو ڈھیل دے جس دن تک مرے گی اٹھیں فرمایا تو مجھ کو

الْمُنْظَرِينَ ۝۵۰ ۖ إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ۝۵۱ ۖ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ

ڈھیل ہے اسی وقت کے دن تک جو معلوم ہے بولا تو قسم ہے تیری

لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝۵۲ ۖ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْخَالِصِينَ ۝۵۳

عزت کی میں گمراہ کرونگا اُن سب کو مگر جو بندے ہیں اُن میں تیرے چنے ہوئے

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقُّ أَقُولُ ۝۵۴ ۖ لَا مَلَكَتْ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ

فرمایا تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں مجھ کو بھڑنا ہے دوزخ مجھ سے اور

مَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ۝۵۵ ۖ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ

جو اُن میں تیری راہ چلے اُن سب تو کہہ میں مانگتا نہیں تم سے

مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ۝۵۶ ۖ إِنَّ هُوَ إِلَّا

اس پر کچھ بدلا اور میں نہیں اپنے آپ کو بنانے والا یہ تو ایک ہمارا شے ہے



## ذِكْرُ الْعَالَمِينَ ۸۷ وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ۸۸

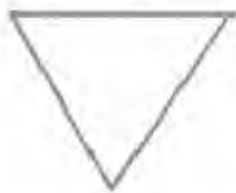
سارے جہان والوں کو اور معلوم کر لو گے اس کا احوال تھوڑی دیر کے پیچھے

## مُخَلَّصَةٌ تَفْسِير

آپ کہہ دیجئے کہ (تم جو رسالت اور توحید کے مسئلہ میں تکذیب و انکار کرتے ہو تو تمہارا ہی نقصان ہے میرا کچھ ضرر نہیں، کیونکہ) میں تو (تم کو صرف عذابِ خداوندی سے) ڈرانے والا (پیغمبر) ہوں، اور (جیسے میرا رسول اور مندر ہونا واقعی ہے اسی طرح توحید بھی برحق ہے، یعنی) بجز اللہ واحد غالب کے کوئی لائقِ عبادت کے نہیں ہے، وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان کے درمیان میں ہیں (اور وہ) زبردست (اور گناہوں کا) بڑا جتنے والا ہے۔ (اور چونکہ توحید کو تو کسی درجہ میں وہ لوگ مانتے بھی تھے اور رسالت کے بالکل ہی منکر تھے، اس لئے رسالت کی مزید تحقیق کے لئے ارشاد ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ یہ (یعنی اللہ تعالیٰ کا مجھ کو توحید اور احکامِ شریعت کی تعلیم کے لئے رسول بنانا) ایک عظیم الشان مضمون ہے جس کا تم کو بڑا اہتمام چاہیے تھا، مگر افسوس کہ اُس سے تم (بالکل ہی) بے پروا ہو رہے ہو اور اس کے عظیم الشان مضمون ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اعتقاد رکھے بغیر حقیقی سعادت کا حصول ناممکن ہے۔ آگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت کرنے کی ایک دلیل ہے۔ وہ یہ کہ مجھ کو عالمِ بالا (کی بحث و گفتگو) کی (کسی ذریعہ سے) کچھ بھی خبر نہ تھی جبکہ وہ (تخلیقِ آدم کے بارے میں جسکی تفصیل آگے آتی ہے، اللہ تعالیٰ سے) گفتگو کر رہے تھے (اب میں جو اس گفتگو کا دائرہ تبادلاً ہوں تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ مجھے یہ واقعہ کہاں سے معلوم ہوا؟ میں نے بچپن خود تو اسے دیکھا نہیں، اہل کتاب سے بھی میرا ایسا میل جول نہیں کہ اُن سے معلوم کر لیتا، یقیناً مجھے یہ علم وحی کے ذریعہ ہی حاصل ہوا ہے، لہذا ثابت ہو گیا کہ) میرے پاس (جو) وحی (آتی ہے جس سے عالمِ بالا کے احوال بھی معلوم ہوتے ہیں) تو محض اس سبب سے آتی ہے کہ میں (مخائب اللہ) صاف صاف ڈرانے والا (کر کے بھیجا گیا ہوں) (یعنی چونکہ مجھے پیغمبری ملی ہے) اس لئے وحی نازل ہوتی ہے۔ پس واجب ہے کہ تم میری رسالت کی تصدیق کرو۔ اور عالمِ بالا کی اللہ تعالیٰ گفتگو جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے اُس وقت ہوئی تھی) جبکہ آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں گارے سے ایک انسان کو (یعنی اُس کے پتلے کو بنانے والا ہوں، سو میں جب اس کو (یعنی اس کے جسمانی اعضاء کو) پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرت سے) جان ڈالوں تو تم سب اس کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا، سو) جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بنالیا تو) سارے سے سارے فرشتوں نے (آدم علیہ السلام کو) سجدہ کیا، مگر ابلیس نے کہ وہ غرور میں آگیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابلیس

جس چیز کو میں نے اپنے ہاتھوں بنایا (یعنی جس چیز کو وجود میں لانے کے لئے خاص عنایت ربانی متوجہ ہوئی) پھر اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس کو سجدہ کرنے سے تجھ کو کون چیز مانع ہوئی، کیا تو غرور میں آگیا؟ (اور واقع میں بڑا نہیں ہے) یا یہ کہ تو (واقع میں ایسے) بڑے درجہ والوں میں سے ہے جس کو سجدہ کا حکم کرنا ہی زیبا نہیں) کہنے لگا کہ (دوسری بات صحیح ہے، یعنی میں آدم سے بہتر ہوں) (کیونکہ) آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے۔ اور اس (آدم) کو خاک سے پیدا کیا ہے (پس مجھ کو حکم دینا کہ اسکے سامنے سجدہ کروں حکمت کے خلاف ہے) ارشاد ہوا تو (اچھا پھر) آسمان سے نکل کیونکہ بیشک تو (اس حرکت سے) مردود ہو گیا اور بیشک تجھ پر میری لعنت رہے گی قیامت کے دن تک (اور اس کے بعد مورد رحمت ہونے کا احتمال نہیں ہے) کہنے لگا کہ اگر مجھ کو آدم کی وجہ سے مردود کیا ہے تو پھر مجھ کو (مرنے سے) مہلت دیجئے قیامت کے دن تک (تاکہ ان سے اور ان کی اولاد سے خوب بدلہ لوں) ارشاد ہوا (جب تو مہلت مانگتا ہے) تو (جا) تجھ کو معین وقت کی تاریخ تک مہلت دی گئی، کہنے لگا (جب مجھ کو مہلت مل گئی) تو (مجھ کو بھی) تیری (ہی) عزت کی قسم ہے) کہ میں ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کئے گئے ہیں (یعنی آپ نے ان کو میرے اثر سے محفوظ رکھا ہے) ارشاد ہوا کہ میں سچ کہتا ہوں اور میں تو (ہمیشہ) سچ ہی کہا کرتا ہوں کہ میں تجھ سے اور جو ان میں سے تیرا ساتھ دے ان سب سے دوزخ بھر دوں گا۔

(سورت کی ابتدائی آیات سے واضح ہے کہ اس سورت کا بنیادی مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات ہے۔ اس موضوع پر دلائل تو دیئے جا چکے، اب ناصحانہ طریقہ پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے) آپ (بطور اتمام حجت کے) کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس (قرآن کی تبلیغ) پر نہ کچھ معاوضہ چاہتا ہوں اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں ہوں (کہ بناوٹ کی راہ سے نبوت کا دعویٰ کیا ہو) اور غیر قرآن کو قرآن کہہ دیا ہو۔ یعنی اگر جھوٹ بولتا تو اس کا منشاء یا تو کوئی مادی نفع ہوتا جیسے معاوضہ، یا کوئی طبعی عادت ہوتی جیسے تکلف، سو یہ دونوں باتیں نہیں، بلکہ فی الواقع، یہ قرآن تو (اللہ کا کلام اور) دنیا جہاں والوں کے لئے بس ایک نصیحت ہے (جس کی تبلیغ کے لئے مجھ کو نبوت ملی ہے اور جس میں سراسر تمہارا ہی نفع ہے) اور (اگر حق کے واضح ہونے کے باوجود بھی تم نہیں مانتے تو) تھوڑے دنوں بیچ تم کو اس کا حال معلوم ہو جاوے گا (یعنی مرنے کے ساتھ ہی حقیقت کھل جائے گی کہ یہ حق تھا اور اس کا انکار باطل تھا، مگر اس وقت معلوم ہونے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا)





## معارف و مسائل

خلاصہ مضامین سورت

قُلْ إِنَّمَا أَنَا مَذْمُورٌ۔ سورت کے شروع میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس سورت کا اصل مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات اور کفار کی تردید ہے، اسی ضمن میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات دو وجہ سے ذکر کئے گئے تھے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہو اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کی طرح آپ بھی کفار کی بے ہودہ باتوں پر صبر فرمائیں۔ دوسرے یہ کہ ان واقعات سے خود وہ لوگ غیرت حاصل کریں جو ایک نبی برحق کی رسالت کا انکار کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور طریقے سے کفار کو دعوت اسلام دی گئی اور وہ اس طرح کہ مؤمنوں کی نیک انجامی اور کافروں کے عذاب شدیدی نقشہ کھینچا گیا۔ اور اس بات پر تنبیہ کی گئی کہ جن لوگوں کی اتباع میں تم آج افضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم کر رہے ہو آخرت کے دن وہی لوگ تمہاری مدد سے دستبردار ہو جائیں گے، وہ تمہیں برا بھلا کہیں گے اور تم ان پر لعنت بھیجو گے۔

ان تمام مضامین کے بعد آخر میں پھر اصل مدعا یعنی اثبات رسالت کا بیان کیا گیا ہے، اور دلائل پیش کرنے کے ساتھ ناصحانہ انداز میں دعوت بھی دی گئی ہے۔

مَا كَانَتْ لِي مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلِكِ إِلَّا عَلَىٰ إِذِ يَخْتَصِمُونَ۔ (مجھ کو عالم بالا کی کچھ بھی خبر نہ تھی جبکہ وہ گفتگو کر رہے تھے) یعنی یہ میری رسالت کی واضح دلیل ہے کہ میں تم سے عالم بالا کی ایسی باتیں بیان کرتا ہوں جو وحی کے سوا کسی بھی ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ ان باتوں سے مراد ایک تو وہ گفتگو ہے جو تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان ہوئی تھی، اور جس کا تذکرہ سورہ بقرہ میں آچکا ہے۔ فرشتوں نے کہا تھا كَمْ جَعَلْ فِيْهَا مِنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔ (کیا آپ زمین میں ایسے انسان کو پیدا کر رہے ہیں جو وہاں فساد پھیلانے اور خونریزی کرنے؟) اس گفتگو کو یہاں ”اختصام“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی ہیں ”جھگڑا“، ”یا“ ”بحث و مباحثہ“، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ فرشتوں کا یہ سوال کوئی اعتراض یا بحث و مباحثہ کے نقطہ نظر سے نہ تھا بلکہ وہ محض تخلیق آدم کی حکمت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سوال و جواب کا ظاہری رُو کار چونکہ بحث کا سا ہو گیا تھا اس لئے اسے ”اختصام“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے جب کوئی چھوٹا کسی بڑے سے کوئی سوال کرتا ہے تو بعض اوقات بڑا آدمی اس کا ذکر کرتے ہوئے ازراہ تفسیر اس کے سوال و جواب کو ”جھگڑے“ سے تعبیر کر دیتا ہے۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ۔ (جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا الخ) یہاں تخلیق آدم کا جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے اس سے اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی مذکورہ بالا گفتگو کی طرف اشارہ کے ساتھ ساتھ اس

بات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح ابلیس نے محض حسد اور تکبر کی وجہ سے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا، اسی طرح مشرکین عرب بھی حسد اور تکبر کی وجہ سے آپؐ کی بات نہیں مان رہے، اور جو انجام ابلیس کا ہوا وہی ان کا بھی ہونا ہے۔ (تفسیر کبیر)

لَمَّا خَلَقْتُ بَيْدًا مَّيِّ - یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے انھیں پیدا کیا۔ جمہور اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ ”ہاتھوں“ سے مراد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ایسے ہی ہاتھ ہیں جیسے انسانوں کے ہوتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اعضاء و جوارح کی احتیاج سے منزہ ہے۔ لہذا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے، اور عربی زبان میں لفظ ”بید“ بکثرت قدرت کے معنی میں مستعمل ہے، مثلاً ارشاد ہے: بِبَيْدِهِ عَمَلُ الْكَوَاكِبِ - لہذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آدم کو اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ اوریوں تو کائنات کی ساری چیزیں قدرت خداوندی ہی سے پیدا ہوئی ہیں، لیکن جب باری تعالیٰ کسی چیز کا خصوصی شرف ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو اسے خاص طور سے اپنی طرف منسوب فرمادیتے ہیں۔ جیسے کعبہ کو بیت اللہ۔ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ناقة اللہ، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ یا روح اللہ کہا گیا ہے۔ یہاں بھی یہ نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے کی گئی ہے (قرطبی)

وَمَا آتَانَا مِنَ الْمُنْتَكِفِينَ - (اور میں بناوٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں) تکلف اور تصنع کی مذمت

مطلب یہ ہے کہ میں تکلف اور تصنع کر کے اپنی نبوت و رسالت اور علم و حکمت کا اظہار نہیں کر رہا، بلکہ اللہ کے احکام کو ٹھیک ٹھیک پہنچا رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تکلف اور تصنع شرعاً مذموم ہے۔ چنانچہ اس کی مذمت میں بعض احادیث وارد ہوئی ہیں صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد منقول ہے کہ ”اے لوگو! تم میں سے جس شخص کو کسی بات کا علم ہو وہ تو لوگوں سے کہدے، لیکن جس کا علم نہ ہو تو وہ ”اللہ اعلم“ کہنے پر اکتفا کر لے، (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے۔ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ“ (روح المعانی)





# سُورَةُ الزُّمَرِ

سُورَةُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُ وَسَبْعُونَ آيَةً وَثَمَانُونَ كُتُوبًا

سورة زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پچھتر آیتیں ہیں اور آٹھ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ① اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ

اتارنا ہے کتاب کا اللہ سے جو زبردست ہے حکمتوں والا ۱ ہم نے اتاری ہے

إِلَيْكَ الْكِتَابُ بِالْحَقِّ فَأَعْبُدِ اللَّهَ فَخُلِّصْ اللَّهُ الَّذِينَ ②

تیری طرف کتاب ٹھیک ٹھیک سو بندگی کر اللہ کی خالص کر کہ اس کے واسطے بندگی

أَلِلَّهِ الَّذِينَ الْخَالِصُونَ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ

سنتا ہے اللہ ہی کے لئے ہے بندگی خالص اور جنہوں نے پکڑ رکھے ہیں اُس سے ورے

أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى ③

حمایتی کہ ہم تو پوجتے ہیں اُن کو اس واسطے کہ ہم کو قریب چاہیں اللہ کی طرف قریب کے درجہ میں

اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ④ إِنَّ اللَّهَ

بیشک اللہ فیصلہ کر دے گا اُن میں جس چیز میں وہ جھگڑ رہے ہیں البتہ اللہ

لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَذِبٌ كَفَّارٌ ⑤ لَوْ أَرَادَ اللَّهُ أَنْ يَتَّخِذَ

راہ نہیں دیتا اُس کو جو بڑا جھوٹا حق نہ ماننے والا اگر اللہ چاہتا کہ اولاد

وَلَدًا إِلَّا صُطْفًى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ لَاسْبُحْنَهُ ط هُوَ

کر لے تو چن لیتا اپنی مخلوق میں سے جو کچھ چاہتا وہ پاک ہے وہی ہے

اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ⑥ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ⑦

اللہ اکلا دبا و والا بنائے آسمان اور زمین ٹھیک

يَكُونُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيَكُونُ النَّهَارُ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ

پہنچتا ہے رات کو دن پر اور پہنچتا ہے دن کو رات پر اور کام میں

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ إِلَّا هُوَ

لگا دیا سورج اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے ایک ٹھہری ہوئی مدت پر سنا ہے بھی؟

الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ۝ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ

بہر دست گناہ بخشہ والا بنایا تم کو ایک ہی سے پھر بنایا اسی سے

مِنْهَا زَوْجَهَا وَانْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَنِهٖ أَرْوَاحَ ۖ

اس کا جوڑا اور انار سے تمہارے واسطے چوپاؤں سے آٹھ نر مادہ

يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ

بناتا ہے تم کو ماں کے پیٹ میں ایک طرح پر دوسری طرح کے پیچھے

فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ۖ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ لَا إِلَٰهَ

تین اندھیروں کے بیچ وہ اللہ ہے رب تمہارا اسی کا راج ہے کسی کی بندگی

إِلَّا هُوَ ۚ فَاَنۢى تَصْرَفُونَ ۙ

ہیں اس کے سوائے پھر کہاں سے پھرے جاتے ہو۔

## خلاصہ تفسیر

یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے (کہ غالب ہونا اس کا مقتضی تھا کہ جو اسکی تکذیب کرے اس کو سزا دیدی جاوے) مگر چونکہ حکیم بھی ہے اور مہلت میں مصلحت بھی، اس لئے سزا میں مہلت دے رکھی ہے، ہم نے ٹھیک طور پر اس کتاب کو آپ کی طرف نازل کیا ہے سو آپ (قرآن کی تعلیم کے موافق) خالص اعتقاد کہہ کے اللہ کی عبادت کرتے رہیے۔ (جیسا اب تک کرتے رہے ہیں اور جب آپ پر بھی یہ واجب ہے تو آدمیوں پر تو کیوں واجب نہیں ہوگا، اے لوگو! یاد رکھو عبادت جو کہ (شرک و ریائے) خالص ہو اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے اور جن لوگوں نے (عبادت خالص چھوڑ کر) خدا کے سوا اور شرکاء و تجویز کر رکھے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرر بنادیں (یعنی ہمارے حوائج یا عبادت کو خدا کے حضور پیش کر دیں جیسا دنیا میں دُور و دربار سلاطین میں اس کام کے ہوتے ہیں) تو ان کے (اور ان کے مقابل اہل ایمان کے) باہمی اختلافات کا (قیامت کے روز) اللہ تعالیٰ (عملی) فیصلہ کر دے گا کہ اہل توحید کو جنت میں اور اہل مشرک کو دوزخ میں داخل کر دے گا



یعنی ان لوگوں کے ماننے پر آپ غم نہ کریں ان کا فیصلہ وہاں ہو گا اور اس کا بھی تعجب نہ کریں کہ باوجود قیام دلائل کے یہ حق پر نہیں آتے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو راہ پر نہیں لاتا جو (قولا، جھوٹا اور اعتقاداً) کافر ہو (یعنی منہ سے اقوال کفریہ اور دل سے عقائد کفریہ پر مضمحل ہو اور اس سے باز نہ آنے کا اور طلب حق کا قصد ہی نہ کرتا ہو تو اس کے اس عناد سے اللہ تعالیٰ بھی اس کو توفیق ہدایت کی نہیں دیتا اور چونکہ مشرکین میں بعض خدا کی طرف اولاد کی نسبت کرتے تھے جیسے ملائکہ کو بنات اللہ کہتے تھے، آگے ان کا رد ہے کہ) اگر (بالفرض) اللہ تعالیٰ (کسی کو اولاد بناتا تو بوجہ اس کے کہ بدون ارادہ خداوندی کوئی فعل واقع نہیں ہوتا، اول اولاد بنانے کا ارادہ کرتا اور اگر کسی کو اولاد بنانے کا ارادہ کرتا تو) چونکہ ماسوائے اللہ سب مخلوق ہیں اس لئے (خود را اپنی مخلوق) یہی ہیں جس کو چاہتا (اس امر کے لئے) منتخب فرماتا (اور لازم باطل ہے کیونکہ) وہ (عیوب سے پاک ہے) (اور غیر جنتس ہونا عیب ہے اس لئے کسی مخلوق کو اولاد بنانے کے لئے منتخب کرنا محال ہوا اور محال کا ارادہ کرنا بھی محال ہے اس طرح ثابت ہو گیا کہ) وہ ایسا اللہ ہے جو واحد ہے (کہ اس کا کوئی شریک بالفعل نہیں اور) زبردست ہے (اس کا کوئی شریک بالقوہ بھی نہیں کیونکہ صلاحیت جب ہوئی کوئی ویسا ہی زبردست ہوتا اور وہ ہے نہیں۔ آگے دلائل توحید ارشاد فرماتے ہیں کہ) اس نے زمین اور آسمان کو خلقت سے پیدا کیا، وہ رات (کی ظلمت) کو دن (کی روشنی) کے محل (یعنی ہوا) پر لپیٹتا ہے (جس سے دن غائب اور رات آمو جو رہوتی ہے) اور دن (کی روشنی) کو رات (کی ظلمت) کے محل (یعنی ہوا) پر لپیٹتا ہے (جس سے رات غائب اور دن آمو جو ہو جاتا ہے) اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے (ان میں) ہر ایک وقت مقررہ تک چلتا رہے گا یاد رکھو کہ (ان دلائل کے بعد انکار تو جیسے اندیشہ غدا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پروردگار بھی ہے کیونکہ) وہ زبردست ہے (لیکن اگر بعد انکار کے بھی کوئی تسلیم کر لے تو انکار گزشتہ پر عذاب دیگا، کیونکہ وہ ٹرانسجشن والا بھی) ہے۔ (اس سے توحید کی ترغیب اور شرک سے ترہیب ہو گئی اور اوپر استدلال تھا دلائل آفاقیہ سے آگے استدلال ہے دلائل النفسیہ سے جس میں ضمنی طور پر کچھ آفاقی حالات بھی آگئے ہیں، یعنی) اس نے تم لوگوں کو تین واحد (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا (کہ اول وہ تین واحد پیدا ہوا) پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا (مراد اس سے حوا ہیں آگے پھر ان سے تمام آدمی پھیلا دئے) اور (بعد حدوث کے) تمہارے (نفع بقا کیلئے) آٹھ نژاد مادہ چار پایوں کے پیدا کئے (جن کا ذکر پارہ ہشتم کے ربع پر رکوع وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ میں آیا ہے اور ان کی تفصیص اس لئے کہ یہ زیادہ کام میں آتے ہیں۔ یہی ہے وہ جزو جو آفاقیات میں سے تبعاً مذکور ہو گیا اور تبعاً اس لئے کہا گیا کہ مقصود بیان کرنا ہے بقا نفس کا اور یہ اسباب بقا میں سے ہے آگے کیفیت خلقت نسل انسانی کی بیان فرماتے ہیں کہ) وہ تم کو ماؤں کے پیٹ میں ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت پر (اور دوسری کیفیت کے بعد تیسری کیفیت پر) علیٰ ہذا مختلف کیفیات پر (بناتا ہے) (کہ اول نطفہ ہوتا ہے پھر علقہ پھر مضغہ الی آخرہ اور یہ بنانا) تین تاریکیوں میں (ہوتا ہے)

ایک تاریخی شکم کی، دوسری رحم کی، تیسری اس جھلی کی جس میں بچی لپٹا ہوتا ہے۔ ان مختلف کیفیات، متعدد اندازوں میں تخلیق کمال قدرت کی دلیل ہے اور ظلماتِ شمش میں پیدا کرنا کمالِ علم کی دلیل ہے) یہ ہے اللہ تمہارا رب (جس کی صفات ابھی تم نے سنیں) اسی کی سلطنت ہے، اُس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں سوا (ان لائل کے بعد) تم کہاں (حق سے) پھرے چلے جا رہے ہو (بلکہ واجب ہے کہ توحید کو قبول کرو اور شرک کو چھوڑ دو)۔

## معارف و مسائل

فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۚ اِلَّا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ - لفظ دین کے معنی اس جگہ عبادت کے ہیں یا طاعت کے، جو تمام احکام دینیہ کی پابندی کو عام اور شامل ہے۔ اس کے پہلے جملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت و طاعت کو خالص اسی کے لئے کریں جس میں کسی غیر اللہ کے شریک یا ریاورد و خود کا شائبہ نہ ہو۔ دوسرا جملہ اُسی کی تاکید کے لئے ہے کہ اخلاص دین صرف اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے۔ اُس کے سوا اور کوئی مستحق نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں بعض اوقات کوئی صدقہ و خیرات کرتا ہوں یا کسی پر احسان کرتا ہوں جس میں میری نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی بھی ہوتی ہے اور یہ بھی کہ لوگ میری تعریف و ثناء کریں گے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں فرمائے، جس میں کسی غیر کو شریک کیا گیا ہو۔ پھر آپ نے آیت مذکورہ بطور استدلال کے تلاوت فرمائی۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّينُ الْخَالِصُ - (قرطبی)

اعمال کی مقبولیت عند اللہ بمقدار احسان ہے۔

تقدیر اور وزن بقدر اخلاص ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کمال اخلاص بدون کمال ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اخلاص کامل یہ ہے کہ اللہ کے سوا نہ کسی کو نفع و ضرر کا مالک سمجھے نہ اپنے کاموں میں کسی غیر اللہ کو متصرف خیال کرے، نہ کسی طاعت و عبادت میں غیر اللہ کا اپنے تصور سے دھیان آنے دے۔ غیر اختیاری نہ اس کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتا ہے۔

صحیحہ کرامت جو مسلمانوں کی صفاتِ اول ہیں ان کے اعمال و ریاضات کی تعداد کچھ زیادہ نظر نہ آئے گی۔ مگر اس کے باوجود ان کا ایک ادنیٰ عمل باقی امت کے بڑے بڑے اعمال سے نائق ہونے کی وجہ ان کا



کمال ایمان اور کمال اخلاص ہی تو ہے۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُوا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ ط  
یہ مشرکین عرب کا حال ہے اور اس زمانے کے عام مشرکین بھی تقریباً یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ خالق و مالک  
اور تمام کاموں میں مختص اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ شیطان نے ان کو بہکایا تو اپنے خیال کے مطابق فرشتوں  
کی شکلوں پر بت تراشے اور یہ جاننے ہوئے کہ یہ بت ہمارے بنائے ہوئے ہیں انھیں کوئی عقل و شعور اور  
قدرت و قوت نہیں۔ انھیں عقیدہ یہ تھا کہ ان بتوں کی تعظیم و تکریم سے وہ فرشتے ہم سے خوش ہوں گے جنکی  
شکلوں پر بت بنائے گئے ہیں اور فرشتے اللہ کے نزدیک بہتر ہیں۔ انھوں نے بارگاہِ خداوندی کو دنیا کے  
بادشاہوں پر قیاس کیا کہ جیسے شاہی مقرب کسی سے خوش ہوں تو وہ بادشاہ کے پاس ان کی سفارش کر کے  
ان کو بھی بادشاہ کا مقرب بنا دیتے ہیں۔ یہ سمجھتے تھے کہ فرشتے بھی بادشاہی درباریوں کی طرح جس کی چاہیں سفارش کر سکتے ہیں  
مگر ان کے سارے خیالات شیطانی تلبیس اور باطل ہی باطل تھے۔ اول تو یہ بت فرشتوں کی شکل پر واقع میں ہیں نہیں اور  
ہوں بھی تو اللہ کے مقرب فرشتے اپنی پرستش سے کب خوش ہونے والے ہیں۔ ان کو تو ہر اس چیز سے طبعی نفرت ہے جو اللہ  
کے نزدیک ناپسند ہو۔ اس کے علاوہ بارگاہِ خداوندی میں وہ از خود کسی کی سفارش نہیں کر سکتے جب تک ان کو  
کسی خاص شخص کے بارے میں سفارش کی اجازت نہ مل جائے۔

وَكَمْ مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْعًا اِلَّا مِّنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ۔ کا یہی مطلب ہے ۔

آج کے مادہ پرست کفار تو خود اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ اُس زمانے کے مشرکین بھی  
آج کے کفار سے بہتر تھے۔ اُس کے رنگ مختلف ہوں، کوئی سرمایہ پرست ہو، کوئی کیونترزم کا قائل۔ یہ  
بات سب میں مشترک ہے کہ معاذ اللہ خدا کوئی چیز نہیں، ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ہم سے ہمارے  
اعمال کی باز پرس کرنے والا کوئی نہیں۔ اسی بدترین کفر اور ناشکری کا نتیجہ ہے کہ پوری دنیا سے امن و  
اطمینان، سکون و راحت مفقود ہو چکا ہے، راحت کے نئے نئے سامان بہت مگر راحت مفقود علاج معالجے کے  
جدید آلات اور تحقیقات کی بہتات مگر امراض کی اتنی کثرت جو پہلے کسی زمانے میں نہیں مٹنی گئی۔ پہرے چوکیا  
پولیس، خفیہ پولیس قدم قدم پر، مگر جرائم کی رفتار ہر روز بڑھ رہی ہے۔ یہ نئے آلات اور راحت و آرام  
کے نئے نئے طریقے جب غور کریں تو یہی خالق خدا کے لئے وبال جان بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کفر کی سزا تو آخرت  
میں سب ہی کفار کے لئے دامنِ جہنم ہے۔ مگر اس اندھی ناشکری کی سزا کچھ دنیا میں بھگتنی پڑتی ہے۔  
کہ جس کی دی ہوئی نعمتوں میں تصرفات کر کے آسمان پر چڑھنے کے حوصلے پیدا ہوئے، اسی کا انکار ہے۔

ۛ درمیان خانہ گم کہ دیم صاحب خانہ را

۵ در میان خانه گم کردیم صاحب خانه را

لَوْ أَسَاءَ اللَّهُ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا - یہ ان لوگوں پر رد ہے جو فرشتوں کو اللہ کی اولاد کہتے تھے ان کے اس خیال باطل اور محال کو بطور فرض محال کے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے معاذ اللہ کوئی اولاد ہوتی تو وہ بغیر اس کے ارادہ اور مشیت کے ہونا محال ہے کہ زبردستی اولاد اس پر مسلط نہیں ہو سکتی پھر اگر بالفرض اس کا ارادہ ہوتا تو اس کی ذات کے سوا سب کی مخلوقات ہی ہیں انہیں میں سے کسی کو اولاد بناتے۔ اور اولاد کا اپنے والد کی ہم جنس ہونا لازم ہے، اور مخلوق غامق کی ہم جنس ہو نہیں سکتی۔ اس لئے مخلوق کو اولاد بنانے کا ارادہ کرنا محال ہو گیا۔

يَكُونُ الدَّيْلُ عَلَى النَّهَارِ - تکویر کے معنی ایک چیز کو دوسری پر ڈال کر اس کو چھپا دینے کے ہیں۔ قرآن کریم نے دن رات کے انقلاب کو یہاں عام نظروں کے اعتبار سے بلفظ تکویر تعبیر کیا ہے کہ رات آتی ہے تو گویا دن کی روشنی پر ایک پردہ ڈال دیا گیا، اور دن آتا ہے تو رات کی اندھیری پردہ میں چلی جاتی ہے۔

چاند۔ سورج دونوں متحرک ہیں۔ مَنْ يَجْعَلِ مَسْجِدًا اس سے معلوم ہوا کہ شمس و قمر دونوں حرکت کرتے ہیں۔ فلکیات اور طبقات الارض کی مادی تحقیقات قرآن پاک یا کسی آسمانی کتاب کا موضوع بحث نہیں ہوتا۔ مگر اس معاملہ میں جتنی بات کہیں ضمناً آجاتی ہے اس پر یقین رکھنا فرض ہے۔ فلاسفہ کی قدیم و جدید تحقیقات تو موم کی ناک میں روز بدلتی رہتی ہیں۔ قرآنی حقائق غیر متبدل ہیں۔ آیت مذکورہ نے جتنی بات بتلائی کہ چاند اور سورج دونوں حرکت کر رہے ہیں اس پر یقین رکھنا فرض ہے۔ اب رہا یہ معاملہ کہ ہمارے سامنے آفتاب کا طلوع و غروب زمین کی حرکت سے ہے یا خود ان سیاروں کی حرکت سے، قرآن پاک نہ اس کا اثبات کرتا ہے نہ نفی۔ تجربہ سے جو کچھ معلوم ہوا اس کے ماننے میں حرج نہیں۔

وَأَنْزَلْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ حَمِيئَةً أَنْزَلْنَاهُ - چوپایوں کی تخلیق کو اس آیت میں انزال یعنی آسمان سے اتارنے کے ساتھ تعبیر فرمایا کہ اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ان کی تخلیق میں بڑا دخل اس پانی کا ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی گویا آسمان سے نازل ہوئے، قرآن کریم نے انسانی لباس کے لئے بھی یہی لفظ استعمال فرمایا ہے۔

أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ لِبَاسًا - اور بعض معدنی چیزوں مثلاً لوہے کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ - ان سب کا حاصل ان چیزوں کا اپنی قدرت سے پیدا کرنا اور انسان کو عطا کرنا ہے۔ (قرطبی)

خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثَ - اس میں قدرت خداوندی کے ان رموز و اسرار کی کچھ نشاندہی کی گئی ہے جو انسان کی تخلیق میں کل فرما ہیں۔ اول تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ بچے کو شکم میں بیک وقت مکمل پیدا کر دیتے۔ مگر بہ تقاضائے حکمت و مصلحت ایسا نہیں بلکہ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ تدریج اختیار کی کہ عورت جس کے پیٹ میں عالم اصغر بن رہا ہے وہ آہستہ آہستہ اس کا بوجھ



برداشت کرنے کی عادی ہوتی چلی جائے۔ دوسرے اس بے نظیر حسین ترین مخلوق کو جس میں سینکڑوں نازک مشینیں اور بال کی برابر رگیں خون اور روح پہنچانے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ یہ عام صنعت کاروں کی طرح کسی کھلی جگہ روشنیوں کی مدد سے نہیں بلکہ تین اندھروں میں ایسی جگہ پیدا کی گئی ہے جہاں کسی کی نظر تو کیا نہ کہ کی بھی رسائی نہیں۔ فَبَارِكُ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔

إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ

اگر تم منکر ہو گے تو اللہ بے پرواہ نہیں رکھتا تمہاری اور پسند نہیں کرتا اپنے بندوں کا منکر ہونا

وَإِنْ تَشْكُرُوا وَآيْرُضَهُ لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ

اور اگر اس کا حق مانو گے تو اس کو تمہارے لئے پسند کرے گا اور نہ اٹھائے گا کوئی اٹھائے والا بوجھ دوسرے کا

ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ إِنَّهُ

پھر اپنے رب کی طرف تم کو بھرجانا ہے تو وہ جملائے گا تم کو جو تم کرتے تھے مقرر

عَلَيْهِمْ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا

اس کو خبر ہے دلوں کی بات کی اور جب آئے انسان کو سختی پکارے

رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ

اپنے رب کو رجوع ہو کر اس کی طرف پھر جب بخشے اس کو نعمت اپنی طرف سے بھول جائے اس کو کہ جس

يَدْعُوَ إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَنْدَادًا لِّبُضْلٍ عَنْ

کے لئے پکار رہا تھا پہلے سے اور ٹھہرائے اللہ کی برابر اوروں کو تاکہ بیکارے اس کی

سَبِيلِهِ ۚ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ

راہ سے تو کہہ بڑے ساعق اپنے کفر کے ٹھوڑے دنوں تو ہے دوزخ والوں

النَّارِ ۝ آمَنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا

میں بھلا ایک جو بندگی میں لگا ہوا ہے رات کی گھڑیوں میں سجدے کرتا ہوا اور کھڑا ہوا

يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةً مِّنْ رَبِّهِ ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي

خطرہ رکھتا ہے آخرت کا اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی مہربانی کی تو کہہ کوئی برابر ہوتے ہیں

الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ

سمجھ والے اور بے سمجھ سمجھتے رہے ہیں

أُولَٰئِكَ الْأَكْبَابُ ۚ قُلْ يُعْبَادُ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ

جن کو عقل ہے تو کہہ اے بندو میرے جو یقین لائے ہو ڈرو اپنے رب سے

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۖ وَأَرْضُ اللَّهِ

جنتوں نے نیکی کی اس دنیا میں ان کے لئے ہے بھلائی اور زمین اللہ کی

وَاسِعَةٌ ۖ إِنَّمَا يُوفِي الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰

کشادہ ہے صبر کرنے والوں ہی کو ملتا ہے ان کا ثواب بے شمار

## خلاصہ تفسیر

اے لوگو تم نے کفر و شرک کا بطلان مٹا لیا، اس کے بعد اگر تم کفر کر دو گے (جس میں شرک بھی داخل ہے) تو خدا تعالیٰ کا کوئی ضرر نہیں کیونکہ وہ تمہارا (اور تمہاری عبادت کا) حاجتمند نہیں (کہ تمہارے عبادت و توحید اختیار نہ کرنے سے کچھ اس کو ضرر پہنچے) اور (یہ بات ضرور ہے کہ) وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا (کیونکہ کفر سے بندوں کو ضرر پہنچتا ہے) اور اگر تم شکر کر دو گے (جس کی فردا عظم ایمان ہے) تو اس کو کوئی نفع نہیں مگر چونکہ تمہارا نفع ہے اس لئے وہ، اس کو تمہارے لئے پسند کرتا ہے اور (چونکہ ہمارے یہاں قاعدہ مقرر ہے کہ) کوئی کسی کا بوجھ (گناہ کا) نہیں اٹھاتا (اس لئے کفر کر کے یوں بھی نہ سمجھنا کہ ہمارا کفر دوسرے کے نامہ اعمال میں کسی وجہ سے درج ہو جاوے گا اور ہم بری ہو جاویں گے خواہ اس وجہ سے کہ ہم دوسروں کے متبع ہیں معاصرین کے یا آباء و اجداد کے خواہ اس وجہ سے کہ دوسرے وعدہ اس بوجھ کے اٹھالینے کا کرتے ہیں۔ جیسا بعض کفار کہہ کرتے تھے۔ وَكُنْ حِمْلٌ خَطِيئَتِكُمْ غرض یہ نہ ہو گا بلکہ تمہارا کفر تمہارے جرائم میں لکھ جاوے گا) پھر اپنے پروردگار کے پاس تم کو کوٹ کر جاتا ہو گا۔ سو وہ تمہارے سب اعمال تم کو جلا دے گا (اور سزا دے گا پس یہ گمان بھی غلط ہے کہ ان کے اعمال کی پیشی کا وقت نہ آوے گا۔ اور) وہ دلوں تک کی باتوں کو جاننے والا ہے پس یہ گمان بھی مست کرنا کہ ہمارے کفر کی شاید اس کو اطلاع نہ ہو جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ بعض لوگوں میں گفتگو ہوتی کہ معلوم اللہ تعالیٰ ہماری باتیں سنتا ہے یا نہیں کسی نے کچھ جواب دیا کسی نے کچھ جواب دیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَوُونَ ۚ إِنَّ لِّلَّهِ الْخَبْرَ اَوَّلُ (مشرک) آدمی (کی حالت یہ ہے کہ اس کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب (حقیقی) کو اسی کی طرف رجوع ہو کر پکارنے لگتا ہے۔ (اور سب معبودوں کو بھول جاتا ہے) پھر جب اللہ تعالیٰ اس کو اپنے پاس سے نعمت (امن و آسائش کی) عطا فرمادیتا ہے تو جس (تکلیف کے دفع کرنے) کے لئے پہلے سے (خدا کو) پکار رہا تھا اس کو بھول جاتا ہے (اور غافل ہو جاتا ہے) اور خدا کے شریک بنانے لگتا ہے جس کا اثر (علاوہ گمراہ ہونے کے) یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے دوسروں کو (بھی) گمراہ کرتا ہے (اور اگر اس مصیبت کو پیش نظر رکھتے تو توحید میں اخلاص کو قائم رکھتا۔ یہ مشرک کی مذمت ہو گئی، آگے عذاب سے ڈرنا ہے کہ) آپ (ایسے



شخص سے) کہہ دیجئے کہ اپنے کفر کی بہار تھوڑے دنوں اور لوٹ لے (پھر آخر کار) تو دوزخیوں میں سے ہو گیا۔  
 ہے (آگے اہل توحید کی مدح و بشارت ہے یعنی) بھلا جو شخص (برعکس حال مشرک مذکور کے) اوقات شب  
 میں (جو عموماً غفلت کا وقت ہوتا ہے) سجدہ و قیام (یعنی نماز) کی حالت میں عبادت کر رہا ہو (یہ تو اس کا  
 ظاہر ہے اور باطن یہ ہو کہ) آخرت سے ڈر رہا ہو اور اپنے پروردگار کی رحمت کی امید (بھی) کر رہا ہو۔ (کیا  
 ایسا شخص اور مشرک مذکور برابر ہو سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں بلکہ یہ قانت جو عبادت پر مداومت کرنے والا اور اللہ  
 سے ڈرنے والا بھی ہے اور اس سے امید غفورہ کرم رکھنے والا بھی یہ محمود ہے اور مشرک جو مطلب نکال لینے کے  
 بعد اخلاص کو چھوڑ دیتا ہے مذموم ہے اور چونکہ ان عبادات کے ترک کو کفار مذموم نہ سمجھتے تھے، اس لئے  
 اس تفاوت کی بنا پر محمودیت و مذمومیت کے حکم میں ان کو مشبہ ہو سکتا تھا، اس لئے آگے اس سے زیادہ  
 واضح اور مسلم عنوالذیل سے اس حکم کا اثبات فرماتے ہیں یعنی اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے بایں  
 عنوان) کہیے کہ علم والے اور جہل والے کہیں برابر ہوتے ہیں (چونکہ جہل کو ہر شخص برا سمجھتا ہے اس کے  
 جواب میں ان کی طرف سے بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ اہل جہل مذموم ہیں آگے یہ ثابت کرنا رہ جاوے گا، کہ  
 صاحب عمل صاحب علم ہے اور عمل سے اعراض کرنے والا صاحب جہل ہے سو یہ امر ذرا تامل سے ثابت ہے  
 اور ہر چند کہ اس بیان سے کفر و اہل کفر کا مذموم اور ایمان و اہل ایمان کا محمود ہونا ثابت ہو گیا لیکن پھر بھی  
 وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل (سلیم) ہیں اور (جباہل اطاعت کا عند اللہ محمود ہونا معلوم ہو گیا تو اطاعت  
 کی ترغیب دینے کے لئے) آپ (مؤمنین کو میری طرف سے) کہہ دیجئے کہ اے میرے ایمان والے بندو تم اپنے  
 پروردگار سے ڈرتے رہو (یعنی مداوم علی الطاعات و محترز عن المعاصی رہو کہ یہ سب فرع ہیں تقویٰ کے  
 آگے اس کا ثمرہ ہے کہ) جو لوگ اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لئے نیک جملہ ہے (آخرت میں تو ضرور اور  
 دنیا میں بھی باطنی راحت تو ضرور اور کبھی ظاہر بھی) اور (اگر وطن میں کوئی نیکی کرنے سے مانع ہو تو ہجرت  
 کر کے دوسری جگہ چلے جاؤ کیونکہ) اللہ کی زمین فراخ ہے (اور اگر ترک وطن میں کچھ تکلیف پہنچے تو استقلال  
 رکھو کیونکہ دین میں) مستقل رہنے والوں کو ان کا جملہ بے شمار ہی ملے گا (پس اس سے ترغیب اطاعت  
 کی ہو گئی)۔

## معارف و مسائل

اِنْ تَكْفُرُوا فَاِنَّ اللَّهَ عَنِيَّ عَنكُمْ۔ یعنی نہ تمہارے ایمان سے اللہ تعالیٰ کا اپنا کوئی

فائدہ نہ تمہارے کفر سے کوئی نقصان۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اے میرے بند

اگر تمہارے اولین اور آخرین اور تمہارے انسان اور جن سب کے سب انتہائی فسق و فجور میں مبتلا ہو جائیں تو میرے ملک و سلطنت میں ذرا بھی کمی نہیں آتی۔ (ابن کثیر)

وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ - یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے کفر سے راضی نہیں۔ رضا سے مراد محبت ہے یا کسی کام کا ارادہ کرنا بغیر اعتراض کے۔ اس کا مقابل لفظ سخط آتا ہے جس کے معنی کسی چیز کو مبغوض رکھنا یا کسی چیز کو قابل اعتراض قرار دینا اگرچہ اس کے ساتھ ارادہ بھی متعلق ہو۔

**مسئلہ ۱:** اہلسنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اچھا یا بُرا کام ایمان یا کفر اللہ تعالیٰ کی مشیت یا ارادہ کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ اس لئے ہر چیز کے وجود میں آنے کے لئے اللہ تعالیٰ شائد کا ارادہ شرط ہے۔ البتہ رضا اور پسندیدگی حق تعالیٰ کی صفت ایمان اور اچھے کاموں سے متعلق ہوتی ہے، کفر و شرک اور معاصی اس کو پسند نہیں۔ شیخ الاسلام نوویؒ نے اپنی کتاب الاصول والاصواب میں لکھا ہے:-

مذہب اہل الحق الايمان بالقدر  
واشباته وان جميع الكائنات خيراها  
ونشرها بقضاء الله وقدره وهن مويد  
لها كلها ويكسره المعاصي مع انه تعالى  
مويد لها لحكمته يعلمها جل وعلا  
(روح المعاني)

مذہب اہل حق کا تقدیر پر ایمان لانا ہے اور یہ کہ تمام کائنات اچھی ہوں یا بُری سب اللہ تعالیٰ کے حکم و تقدیر سے وجود میں آتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی تخلیق کا ارادہ بھی کرتا ہے مگر وہ معاصی کو مکروہ و ناپسند سمجھتا ہے۔ اگرچہ ان کی تخلیق کا ارادہ کسی حکمت و مصلحت سے ہوتا ہے جس کو وہ خود ہی جانتا ہے۔

آمَنَ هُوَ قَانِتٌ أَتَىٰ الْكَيْلِ - لفظ آمَنَ دو لفظوں سے مرکب ہے۔ آم حرف استفہام اور مَنَ اسم موصول اس جملے سے پہلے کفار کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں اپنے کفر اور فسق و فجور کے مزے اڑالو، آخر کار تم جہنم کے ایندھن ہو گے۔ اس کے بعد اس جملے میں مؤمن مطیع کا بیان ہے جس کو آمَنَ کے لفظ سوال سے شروع کیا گیا ہے۔ علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس سے پہلے ایک جملہ محذوف ہے کہ کافر سے کہا جائے گا کہ تو اچھا ہے یا وہ مؤمن مطیع جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ لفظ قانت کے کسی ترجمے کے لئے ہیں۔ سب کو جامع قول حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما ہے۔ اس کے معنی ہیں اطاعت گزار اور یہ لفظ جب خاص نماز کے لئے بولا جائے۔ جیسے قَوْمُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ - تو وہاں مرد و شخص ہوتا ہے جو نماز میں اپنی نگاہ کو پست رکھے، ادھر ادھر نہ دیکھے، نہ اپنے بدن یا کپڑوں سے کھیل کرے، نہ دنیا کی کسی چیز کو اپنے اختیار سے نماز میں یاد کرے۔ بھول اور غیر اختیاری وسوسہ اس کے منافی نہیں۔ (قرطبی)



اَنَاءَ الْيَلِّ کے معنی ساعات الیل کے ہیں جس سے مراد رات کا شروع حصہ اور درمیان اور آخر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ محشر کے موقف حساب میں اللہ تعالیٰ اس پر آسانی فرماویں، اس کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کو رات کی اندھیری میں سجدہ اور قیام کی حالت میں پائے۔ اس طرح کہ اس کو آخرت کی فکر بھی ہو اور رحمت کی امید بھی۔ بعض حضرات نے مغرب عشر کے درمیان کے وقت کو بھی انار الیل کہا ہے (قرطبی)۔

وَاَنۡتَ صُنَّ اللّٰہِ وَاَسَعَدَ۔ اس سے پہلے جملے میں اعمال صالحہ کا حکم ہے۔ اس میں کوئی یہ غدر کر سکتا تھا کہ میں جس شہر یا ملک میں رہتا ہوں یا جس ماحول میں پھنسا ہوا ہوں، اس کا ماحول مجھے اعمال صالحہ سے روکتا ہے۔ اس کا جواب اس جملے میں دیدیا گیا کہ اگر کسی خاص ملک و شہر یا خاص ماحول میں رہتے ہوئے احکام شرعیہ کی پابندی مشکل نظر آئے تو اس کو چھوڑ دو اللہ کی زمین بہت وسیع ہے کسی ایسی جگہ اور ایسے ماحول میں جا کر رہو جو اطاعت احکام الہیہ کے لئے سازگار ہو۔ اس میں ترغیب ہے ایسی جگہ سے ہجرت کی جس میں رہتے ہوئے انسان احکام دین کی پابندی نہ کر سکے۔ ہجرت کے مفصل احکام سورۃ نسا میں آچکے ہیں۔

لَا تَمَّا یُوۡفٰی الصَّابِرُوۡنَ اَجْرَہُمْ یَغٰیۡرُ حِسَابٍ۔ بغیر حساب سے مراد یہ ہے کہ صبر کرنے والوں کا ثواب کسی مقرر اندازے اور پیمانے سے نہیں، بلکہ بے اندازہ و بے حساب دیا جائے گا۔ جیسا کہ روایت حدیث میں آگے آتا ہے اور بعض حضرات نے بغیر حساب کے معنی درخواست و مطالبہ کے لئے ہیں یعنی جیسے دنیا میں کسی کا کوئی حق کسی کے ذمہ ہو تو اسے اپنے حق کا خود مطالبہ کرنا پڑتا ہے لیکن اللہ کے یہاں صابروں کو درخواست اور مطالبہ کے بغیر ہی ان کا ثواب عطا کیا جائے گا۔

حضرت قتادہ ؓ نے فرمایا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز میزان عدل قائم کی جائیگی۔ اہل صدقہ آئیں گے تو ان کے صدقات کو تول کر اس کے حساب سے پورا پورا اجر دیدیا جائے گا۔ اسی طرح نماز اور حج وغیرہ عبادات والوں کی عبادات کو تول کر حساب ان کا اجر پورا دیدیا جائے گا۔ پھر جب بلا اور مصیبت میں صبر کرنے والے آئیں گے تو ان کے لئے کوئی گنہ اور وزن نہیں ہوگا۔ بلکہ بغیر حساب و اندازہ کے ان کی طرف اجر و ثواب بہا دیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لَا تَمَّا یُوۡفٰی الصَّابِرُوۡنَ اَجْرَہُمْ یَغٰیۡرُ حِسَابٍ۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جنکی دنیاوی زندگی عاقبت میں گزری تمنا کرنے لگیں گے کہ کاش دنیا میں ان کے بدن قیچیوں کے ذریعہ کاٹے گئے ہوتے تو ہمیں بھی صبر کا ایسا ہی صلہ ملتا۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے اس آیت میں صابرین سے مراد وہ لوگ لئے ہیں جو دنیا کی مصائب و رنج و غم پر صبر کرنے والے ہیں اور بعض حضرات نے فرمایا کہ صابرین سے مراد وہ لوگ ہیں جن معاصی سے

اپنے نفس کو روکیں۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ لفظ صابر جب بغیر کسی دوسرے لفظ کے بولا جاتا ہے اس سے مراد یہی ہوتا ہے جو اپنے نفس کو گناہوں سے باز رکھنے کی مشقت پر صبر کرے اور مصیبت پر صبر کرنے والے کے لئے لفظ صابر بولا جاتا ہے تو صابر علی کذا کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ یعنی فلاں مصیبت پر صبر کرنے والا۔ واللہ اعلم

قُلْ إِنِّي أُهْرِتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۝۱۱

تو کہہ مجھ کو حکم ہے کہ بندگی کروں اللہ کی خالص کر کے اس کے لئے بندگی اور

أُهْرِتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ ۝۱۲ قُلْ إِنِّي أَخَافُ

حکم ہے کہ میں ہوں سب سے پہلے حکم بردار تو کہہ میں ڈرتا ہوں

إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابٌ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝۱۳ قُلِ اللَّهُ أَعْبُدُ

اگر حکم نہ مانوں اپنے رب کا ایک بڑے دن کے عذاب سے تو کہہ میں تو اللہ کو پوجتا

مُخْلِصًا لَهُ دِينِي ۝۱۴ فَأَعْبُدُ مَا شِئْتُمْ مِنْ دُونِهِ ۝۱۵ قُلْ

ہوں خالص کر کے اپنی بندگی اس کے واسطے اب تم پوجو جس کو چاہو اس کے سوائے تو کہہ

إِنَّ الْخُسْرَىٰ نَ الْذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَأَهْلِيَهُمْ

بڑے ہارنے والے وہ جو اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو

يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۝۱۶ إِلَّا ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَىٰ أَنْ الْمُبِينِ ۝۱۷ لَهُمْ

قیامت کے دن سنا ہے یہی ہے صریح ٹوٹا ان کے

مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلٌ مِنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلٌ ۝۱۸ ذَٰلِكَ

واسطے اوپر سے بادل ہیں آگ کے اور ان کے نیچے سے بادل اس چیز

يُخَوِّفُ اللَّهُ بِهِ عِبَادَهُ ۝۱۹ فَاَتَّقُوا ۝۲۰ وَالَّذِينَ

سے ڈراتا ہے اللہ اپنے بندوں کو لے بند میرے تو بچو سے ڈرو اور جو لوگ بچے

اجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ أَنْ يَعْبُدُوا ۝۲۱ وَأَنَا بَوِّأُ إِلَى اللَّهِ لَهُمْ

شیطانوں سے کہ ان کو پوجیں اور جو عبادت اللہ کی طرف ان کے لئے

الْبُشْرَىٰ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝۲۲ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ

چے خوشخبری سو خوشی سناتے میرے بندوں کو جو سنتے ہیں بات پھر چلتے ہیں

أَحْسَنَهُ ۝۲۳ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۝۲۴ وَأُولَٰئِكَ هُمُ

اس پر جو اس میں نیک ہے وہی ہیں جن کو درست دیا اللہ نے اور وہی ہیں



أُولَٰئِكَ لَا بُدَّ لَهُمْ ۖ أَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۖ أَفَأَنْتَ

عقل والے بھلا جس پر ٹھیک ہو چکا عذاب کا حکم بھلا تو

تَنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۚ لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرُوفٌ

خلاص کر سکے گا اس کو جو آگ میں پڑ چکا لیکن جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے ان کے واسطے ہیں چھروں کے

مِّنْ فَوْقِهَا غُرُوفٌ مَّبْنِيَّةٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ

ان کے اوپر اور چھروں کے چھنے ہوئے اُن کے نیچے بہتی ہیں ندیاں

وَعَدَ اللَّهُ ۖ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْوَعْدَ ۚ

وعدہ ہو چکا اللہ کا اللہ نہیں خلاف کرتا اپنا وعدہ

## خلاصہ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو (منجانب اللہ) حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھوں (یعنی اس میں شائبہ شرک کا نہ ہو) اور مجھ کو (یہ بھی) حکم ہوا ہے کہ (اس اُمت کے لوگوں میں) سب مسلمانوں میں اول (اسلام کو حق ماننے والا) میں ہوں (اور ظاہر ہے کہ قبول احکام میں نبی کا اول ہونا ضروری ہے اور) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ اگر (بفرض محال) میں اپنے رب کا کہنا نہ مانوں تو میں ایک بڑے دن (یعنی قیامت) کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں اور آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ مجھے جس بات کا حکم ہوا ہے میں تو اسی پر کاربند ہوں چنانچہ میں تو اللہ ہی کی عبادت اس طرح کرتا ہوں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھتا ہوں (جس میں شرک کا ذرا سا شائبہ نہیں) تو (اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم بھی ایسی ہی خالص عبادت کرو لیکن اگر تم نہیں مانتے تو تم جانو اور) خدا کو چھوڑ کر تمہارا دل جس چیز (کی عبادت) کو چاہے اس کی عبادت کرو (قیامت کے روز اس کا مزہ چکھو گے اور) آپ اُن سے (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ پورے زماں کا وہی لوگ ہیں جو اپنی جانوں سے اور اپنے متعلقین سے قیامت کے روز خسارے میں پڑے (یعنی نہ اپنی جان سے اس کو کوئی فائدہ پہنچا اور نہ اپنے متعلقین سے کیونکہ وہ متعلقین بھی اگر انھیں کی طرح گمراہ تھے تو وہ بھی گرفتار عذاب ہوں گے دوسروں کی فائدہ پہنچائیں گے اور اگر وہ مومن مخلص ہو کر جنت میں ہوں گے تو بھی وہ کافروں کی کوئی سفارش کر کے نفع نہیں پہنچا سکتے) یاد رکھو کہ کھلا ہوا خسارہ یہ ہے کہ اُن کے لئے اُن کے اوپر سے بھی آگ کے شعلے ہوں گے اور اُن کے نیچے سے بھی آگ کے محیط شعلے ہوں گے یہ وہی (عذاب) ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے (اور اس سے بچنے کی تدبیریں بتلاتا ہے جو دین حق پر عمل کرتا ہے سو) اے میرے بند و مجھ سے (یعنی میرے عذاب سے) ڈرو (یہ حال تو کفار مشرکین کا ہوا) اول

جو لوگ شیطان کی عبادت سے بچتے ہیں (شیطان کی عبادت سے مراد اسکی اطاعت ہے) اور (ہمہ تن) اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، وہ مستحقِ خوشخبری گنناے کے ہیں سو آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سننا دیجئے جو (اس صفت کے ساتھ بھی موصوف ہیں کہ) اس کلام (الہی) کو کان لگا کر سنتے ہیں۔ پھر اس کی اچھی باتوں پر اور اللہ کے احکام سب اچھے ہیں۔ جیسا کہ آگے آیت اَحْسَنَ الْيُسُفِیْنِ میں آتا ہے، چلتے ہیں یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی ہے اور یہی ہیں جو اہل عقل ہیں (سوان لوگوں کو بشارت دیدیجئے جس چیز کی بشارت دینا ہے اس کا بیان تو آگے آئے گا آیت لَکِنَ الَّذِیْنِ اتَّقَوْا میں اور میان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کافروں کا سو من بتا دینا آپ کے اختیار سے خارج ہے اس لئے اس پر کوئی غم نہ کریں کہ) بھلا جس شخص پر عذاب کی (ازلی تقدیر) بات محقق ہو چکی تو کیا آپ ایسے شخص کو جو کہ (علم الہی میں) دوزخ میں ہے (موجبات جہنم سے) چھڑا سکتے ہیں (یعنی جو دوزخ میں جانے والے ہیں وہ کوشش سے بھی گمراہی سے باز نہیں آویں گے، اس لئے اُن پر افسوس اور غم بے کار ہے) لیکن جو لوگ (ایسے ہیں کہ اُن کے حق میں کلمۃ العذاب محقق نہیں ہوا، اور اس وجہ سے وہ آپ سے احکام من کر) اپنے رب سے دُرتے رہے۔ ان کے لئے (جنت کے) بالا خانے ہیں جن کے اوپر اور بالا خانے ہیں جو بنے بنائے تیار ہیں (اور) اُن کے نیچے نہریں چل رہی ہیں۔ یہ اللہ نے وعدہ کیا ہے (اور) اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ (یہ مضمون اس بشارت کا ہے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے فَبَشِّرْ عِبَادَ -)

## مَعَارِفُ مَسَائِلِ

فَبَشِّرْ عِبَادَ الَّذِیْنَ یَسْمَعُونَ الْقَوْلَ فَبَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَٰئِكَ الَّذِیْنَ هَدَاهُمُ اللّٰهُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْوَالِدُونَ -

اس آیت کی تفسیر میں حضرات مفسرین کے اقوال متعدد ہیں۔ ایک قول وہ ہے جس کو ابن کثیر نے لیا اور غلامہ تفسیر مذکور میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قول سے مراد اللہ کا کلام قرآن یا قرآن مع تعلیمات رسول ہے اور وہ سب احسن ہی احسن ہے۔ اس لئے مقتضی مقام کا بظاہر یہ تھا کہ فَبَتَّبِعُونَ الْقَوْلَ فَبَتَّبِعُونَ کہاجاتا مگر اس کی جگہ لفظ احسن کا اضافہ کر کے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ان لوگوں نے قرآن و تعلیمات رسول کا اتباع بے بصیرتی کے ساتھ نہیں کیا جیسا بے وقوف لوگوں کا طریقہ ہے کہ جس کی بات سنی بغیر کسی تحقیق و بصیرت کے اس کا اتباع کرنے لگے بلکہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے کلام کو حق اور



احسن دیکھنے کے بعد اس کا اتباع کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں آخر آیت میں کو اولوالکتاب یعنی عقل والے ہونے کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس کی نظر قرآن ہی میں وہ اشارہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کے متعلق ہوا ہے۔ فَخَذْنَاهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَا أُخْلَاذُ بِأَحْسَنِهَا۔ یہاں بھی احسن سے مراد پوری تورات اور اس کے احکام ہیں۔ اسی طرح مذکورہ آیات میں استماع قول سے مراد استماع قرآن اور اتباع احسن سے مراد اتباع پورے قرآن کا ہے جس کو اگلی آیت میں احسن الحدیث فرمایا گیا ہے۔ اسی تفسیر میں کہ قول سے مراد خاص قرآن لیا جائے بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں بھی بہت احکام ہیں احسن اور احسن کے درجات رکھے ہیں۔ مثلاً انتقام اور عفو و دوزل جائز ہیں۔ مگر عفو احسن الفضل ہے، وَأَنَّ تَصْهِيرَ كُفْرًا كَبِيرًا۔ بہت سی چیزیں جس میں قرآن نے انسان کو اختیار دیا ہے کہ دونوں میں جس کو چاہے اختیار کرے کوئی گناہ نہیں۔ مگر ان میں سے کسی ایک کو احسن و افضل بھی فرمادیا، جیسے وَأَنَّ تَعْفُوًّا أَكْرَبَ لِلتَّقْوَىٰ میں ہے۔ بہت سی چیزوں میں رخصت دی گئی ہے مگر عزیمت پر عمل کو احسن و افضل فرمایا ہے تو مراد آیت کی یہ ہو گئی کہ یہ لوگ احکام قرآن رخصت کے بھی سنتے ہیں۔ عزیمت کے بھی مگر اتباع بجا رخصت کے عزیمت کا کرتے ہیں۔ اور جن دو چیزوں میں ایک احسن ہو دوسری احسن، یہ ان میں سے احسن ہی کو عمل کے لئے اختیار کرتے ہیں۔

اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس جگہ قول سے مراد عام لوگوں کے اقوال ہیں جن میں توحید و شرک، کفر و اسلام، حق باطل پھر حق میں حسن اور احسن اور رائج و مزجوج سب داخل ہیں۔ مطلب آیت کا اس تفسیر یہ ہے کہ یہ لوگ باتیں تو سب کی سنتے ہیں۔ کفار کی بھی مومنین کی بھی۔ حق بھی باطل بھی، اچھی بھی اور بُری بھی لیکن اتباع صرف اسی بات کا کرتے ہیں جو احسن ہے۔ توحید و شرک میں سے توحید کا حق و باطل میں سے حق کا اور حق کے مختلف درجات ہوں تو ان میں جو احسن اور رائج ہو اس کا اتباع کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کو دو صفتوں کے ساتھ موصوف کیا گیا۔ پہلی هٰذَا هُمْ اللَّهُ یعنی یہ لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں۔ اس لئے مختلف قسم کی باتیں سن کر بھٹکتے نہیں۔ دوسرے اُولَٰئِكَ هُمُ الْاُولَٰئِکَ۔ یعنی یہ لوگ عقل والے ہیں، عقل کا کام ہی یہ ہے کہ اچھے برے اور حق و باطل میں تمیز کرے۔ اور احسن و احسن کو پہچان کر احسن کو اختیار کرے۔

اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہ آیت زید بن عمرو بن نفیل، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی زید بن عمرو بن نفیل نماز جاہلیت میں بھی شرک و بت پرستی سے نفرت کرتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ اور سلمان فارسیؓ مختلف اہل مذاہب مشرکین پھر یہود و نصاریٰ کی باتیں سنتے اور ان کے طور و طریق دیکھنے کے بعد ایمان لائے اور قرآنی تعلیمات کو سب سے احسن پا کر ان کو ترجیح دی۔

(قرطبی)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی پھر چلایا وہ پانی چشموں میں

فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ

زمین کے پھر نکالتا ہے اُس سے کھیتی کئی کئی رنگ بدلتے اُس پر پھر آئے

مُصْفًى ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا

تیار ہی ہو تو تو دیکھے اس کا رنگ زرد، پھر کر ڈالتا ہے اس کو چورا چورا بے شک اس میں نصیحت ہے

لِلأُولَى الْأَلْيَابِ ۝۲۱ أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ

عقل مندوں کے واسطے بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ نے دین اسلام کے واسطے

فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّن رَّبِّهِ ۖ قَوْلٌ لِّلْقَسِيدِ قُلُوبُهُم مِّن

سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے سونہرا ہے ان کو جن کے دل سخت ہیں اللہ کی

ذِكْرِ اللَّهِ ۖ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝۲۲ اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ

یاد سے وہ بڑے پھرتے ہیں بھٹکتے صریح اللہ نے اتاری بہترین بات

الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِ ۖ تَفْشِيرُ مَنَّهُ جُلُودَ الذِّبْنِ

کتاب آپس میں ملتی دوہرائی ہوئی (بال کھڑے ہوتے ہیں اُس سے کھال پر

يَخْشَوْنَ رَأْيَهُمْ ثُمَّ تَلَيْنُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ

ان لوگوں کے جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے پھر نرم ہوتی ہیں اُن کی کھالیں اور اُن کے دل اللہ کی

ذِكْرِ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ هُدًى لِّلَّذِينَ يَشَاءُونَ

یاد پر یہ ہے راہ دینا اللہ کا اس طرح راہ دیتا ہے جس کو چاہے

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝۲۳

اور جس کو راہ بھلائے اللہ اس کو کوئی نہیں سمجھائے والا

## خلاصہ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تو نے اس (بات) پر نظر نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو زمین کے سوتلوں میں (یعنی ان قطعات میں جہاں سے پانی اُبل کر کنوؤں اور چشموں کے ذریعہ نکلتا ہے) داخل کر دیتا ہے پھر (جب وہ اُبلتا ہے تو) اُس کے ذریعہ سے کھیتیاں پیدا کرتا ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں، پھر وہ کھیتی بالکل خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے پھر (اللہ تعالیٰ) اس کو چورا چورا کر دیتا



ہے اس (منونہ) میں اہل عقل کے لئے بڑی عبرت ہے کہ یہی حالت بعینہ انسان کی دنیوی حیات کی ہے آخر فنا آخر فنا تو اس میں منہمک ہو کر ابدی راحت سے محروم رہتا اور ابدی مصیبت کو سر پر لے لیا نہایت حماقت ہے کہ ہمارا بیان نہایت بلیغ ہے مگر پھر بھی سب سننے والے باہم متفاد ت ہیں) سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام (کے قبول کرنے) کے لئے کھول دیا (یعنی اسلام کی حقیقت کا اُس کو یقین آ گیا) اور وہ اپنے پروردگار کے (عطا کئے ہوئے) نور (یعنی ہدایت کے مقتنا) پر (چل رہا) ہے (یعنی یقین لا کر اُس کے موافق عمل کرنے لگا) کیا وہ شخص اور اہل قسارت برابر ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے) سو جن لوگوں کے دل خدا کے ذکر سے (اس میں احکام و موعید سب آگئے) متاثر نہیں ہوتے (یعنی ایمان نہیں لاتے) اُن کے لئے (قیامت میں) بڑی خرابی ہے (اور دنیا میں) یہ لوگ کھلی گمراہی میں (گرفتار) ہیں (آگے اس نور اور ذکر کا بیان ہے یعنی) اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام (یعنی قرآن) نازل فرمایا ہے جو ایسی کتاب ہے کہ (باعتبار اعجاز و نظم و صحت معانی کے) باہم ملتی جلتی ہے (اور جس میں سمجھانے کے لئے بعض بعض بہت ضروری بات) بار بار دہرائی گئی (وہ کہ اللہ تعالیٰ وَقَدْ هَمَمْنَا الْخِمْسِ مِثْلًا لِّأُولَئِكَ فَمِنْهُمْ مَنْ يَعْتَدِلُ) فائدہ تاکید و تکرار کے قلب مخاطب میں ہر جگہ خاص خاص لطافت کا بھی لحاظ ہوتا ہے جس سے حالی تکرار نہیں رہتا اور متانی ہونا یعنی بار بار دہرایا جانا دلیل ہے ہدایت پر مشتمل ہونے کی) جس سے اُن لوگوں کے جو کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں بدن کانپ اٹھتے ہیں (یہ کنایہ ہے خوف سے گو قلب ہی میں رہے بدن پر اثر نہ آوے اور گو وہ خوف عقلی و ایمانی ہو، طبعی و حالی نہ ہو) پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر (یعنی کتاب اللہ پر عمل کرنے) کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں (یعنی ذکر و اعمال جو ارج و اعمال قلب کو انقیاد اور توجہ سے بجالاتے ہیں اور) یہ (قرآن) اللہ کی ہدایت ہے جس کو وہ چاہتا ہے اُس کے لئے ذریعہ ہدایت کرتا ہے (جیسا خائفین کا حال ابھی سنایا گیا) اور خدا جس کو گمراہ کرتا ہے اس کا کوئی بادی نہیں (جیسا قاسین یعنی سخت دل کافروں کا حال ابھی سنایا گیا)

## معارف و مسائل

فَسَلِّكُمَا يَنَابِيعَ فِي الْآفَاقِ - یَنَابِيعُ ینبوع کی جمع ہے جس کے معنی زمین سے پھوٹنے والے چشمے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان سے پانی نازل کر دینا ہی ایک عظیم الشان نعمت ہے مگر اس نعمت کو اگر زمین کے اندر محفوظ کر دینے کا انتظام نہ کیا جاتا تو انسان اُس سے صرف بارش کے وقت یا اس کے متصل چند دن تک فائدہ اٹھا سکتا۔ حالانکہ پانی اس کی زندگی کا مدار اور ایسی ضرورت ہے جس سے وہ ایک دن بھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے صرف اس نعمت کے نازل کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا

بلکہ اُس کے محفوظ کرنے کے عجیب عجیب سامان فرمادینے۔ کچھ تو زمین کے گڑھوں، حوضوں اور تالابوں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور بہت بڑا ذخیرہ برف بنا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لاد دیا جاتا ہے۔ جس سے اس کے مہلنے اور خراب ہونے کا امکان نہیں رہتا۔ پھر وہ برف آہستہ آہستہ پگھل کر پہاڑی رگوں کے ساتھ زمین میں اتر جاتا ہے اور جا بجا اُبلنے والے چشموں کی صورت میں خود بخود بغیر کسی ذی شعاع کے پھوٹ نکلتا ہے اور ندیوں کی شکل میں زمین میں بہنے لگتا ہے اور باقی پانی پوری زمین کی گہرائی میں چلتا رہتا ہے جس کو کنواں کھود کر ہر جگہ نکالا جاسکتا ہے۔

قرآن کریم میں اس نظام آبپاشی کی پوری تفصیل سورہ مؤمنون میں آیت فَاَسْكَنْهُ مِنْ  
الْأَرْضِ وَأَنَّا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِكُلِّ قَوْمٍ مُّتَوَدِّنٍ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔  
مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ۔ کھیتی کے اگنے کے وقت اور پکنے کے وقت اُس پر مختلف رنگ آتے جاتے رہتے ہیں اور چونکہ ان رنگوں میں انقلاب اور تبدل ہے۔ اس لئے مُخْتَلِفًا کو ترکیب نحوی میں حال بنا کر منصوب کیا گیا ہے جو توجہ و پردالت کرتا ہے۔

إِنَّا فِي ذَٰلِكِ لَآلِئٌ كَرِيمٍ۔ یعنی پانی اتارنے اور اس کو محفوظ کر کے انسان کے کام میں لگانے پھر اس سے قسم قسم کی نباتات اور درخت اگانے اور ان درختوں پر مختلف رنگ آنے کے بعد آخر میں زرد خشک ہو کر غلہ الگ اور بھوسہ الگ ہو جانے میں بڑی فصاحت ہے عقل والوں کے لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان قدرت و حکمت کے دلائل ہیں جن کو دیکھ کر انسان اپنی تخلیق کے معاملہ کی حقیقت بھی پہچان سکتا ہے جو ذریعہ ہو سکتی ہے اپنے خالق و مالک کے پہچاننے کا۔

أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن تَرَائِمٍ۔ شرح کے لفظی معنی کھولنے، پھیلانے اور وسیع کرنے کے ہیں۔ شرح صدر کے معنی وسعت قلب کے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قلب میں اسکی استعداد موجود ہو کہ وہ ملکوتی آیات الہیہ آسمان و زمین اور خود اپنی پیدائش وغیرہ میں غور کر کے عبرت اور فوائد حاصل کرے اسی طرح جو آیات الہیہ بصورت کتاب و احکام نازل کی جاتی ہیں اُن میں غور کر کے استفادہ کر سکے۔ اس کا بالقابل دل تنگی اور قسوت قلب ہے۔ قرآن کریم کی ایک آیت يَجْعَلُ صَدْرَهُ حَيِّقًا حَرِيًّا اور اس جگہ اگلی آیت يُلْقِي فِي قُلُوبِهِم مَّا يَشَاءُ اسی شرح صدر کے بالمقابل آیا ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ تلاوت فرمائی تو ہم نے آپے شرح صدر کا مطلب پوچھا آپ نے فرمایا کہ حبیب نور ایمان انسان کے قلب میں داخل ہوتا ہے تو اس کا قلب وسیع ہو جاتا ہے (جس سے احکام الہیہ کا سمجھنا اور عمل کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے)۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اس (شرح صدر) کی



علامت کیا ہے تو آپ نے فرمایا:-

الْإِنَابَةُ إِلَى دَارِ الْخُلُودِ وَالتَّجَافِي  
عَنِ دَارِ الْعُزْرِ وَالتَّأَهُبُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ  
نَزُولِهِ -

رواہ الحاکم فی المستدرک البیہقی فی شعب الایمان -

(روح المعانی)

ہمیشہ رہنے والے گھر کی طرف راغب اور مائل  
ہونا اور دھوکے کے گھر یعنی دنیا (کی لذائذ اور زینت)  
سے دور رہنا اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری  
کرنا -

آیت مذکورہ کو حرف استفہام آفصح سے شروع کیا گیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ کیا ایسا شخص جس کا  
دل اسلام کے لئے کھول دیا گیا ہو اور وہ اپنے رب کی طرف سے آئے ہوئے فوز پر ہے یعنی اس کی روشنی میں  
سب کام کرتا ہے - اور وہ آدمی جو دل تنگ اور سخت دل ہو کہیں برابر ہو سکتے ہیں - اس کے بالمقابل  
سخت دل کا ذکر اگلی آیت میں عذاب و عیل کے ساتھ کیا گیا ہے -

قَوْلِيلٍ لِلْقَيْسِيَّةِ قُلُوبُهُمْ - قاسیۃ قساوت سے مشتق ہے جس کے معنی سخت دل ہوتا جس کو کسی  
پر رحم نہ آئے اور جو اللہ کے ذکر اور اس کے احکام سے کوئی اثر قبول نہ کرے -

اللہ نَزَلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِي - اس سے پہلی آیت میں اللہ کے مقبول بندوں کا یہ  
حال ذکر کیا گیا تھا کہ یَسْتَرْعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ اس آیت میں بتلادیا کہ پورا قرآن ہی  
احسن الحدیث ہے - حدیث کے لفظی معنی اس کلام یا قیے کے ہیں جو بیان کیا جاتا ہے - قرآن کو احسن الحدیث  
فرمانے کا حامل یہ ہے کہ انسان جو کچھ کہتا بولتا ہے اس سب میں احسن الکلام قرآن ہے - آگے قرآن کی چند  
صفات ذکر فرمائی ہیں - ایک کِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِي سے مراد اس جگہ متماثل ہے - یعنی مضامین قرآنیہ  
ایک دوسرے سے مربوط اور مماثل ہیں کہ ایک آیت کی تشریح و تصدیق دوسری آیت سے ہو جاتی ہے - اس  
کلام میں تضاد و تعارض کا نام نہیں ہے - دوسری صفت مشائی ہے جو مشنی کی جمع ہے جس کے معنی مکرر کے  
ہیں مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں ایک مضمون کو ذہن نشین کرنے کے لئے بار بار دہرایا جاتا ہے تیسری صفت  
یہ بیان فرمائی کہ تَقَشَّعَتْ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ - یعنی اللہ کی عظمت سے متاثر ہو کر  
ڈرنے والوں کا قرآن پڑھ کر خشیت و ہیبت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے بدن پر بال کھڑے ہو جاتے ہیں -  
چوتھی صفت یہ ہے کہ تَتَرَدَّدُونَ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ - یعنی تلامذت قرآن کا اثر کبھی  
عذاب کی وعید سن کر یہ ہوتا ہے کہ بدن کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور کبھی رحمت و مغفرت کی آیات  
سن کر یہ حال ہوتا ہے کہ بدن اور قلب سب اللہ کی یاد میں نرم ہو جاتے ہیں - حضرت اسماعیل بنت ابی بکرؓ  
فرماتی ہیں کہ صحابہ کرام کا عام حال یہی تھا کہ جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تو ان کی آنکھوں میں آنسو  
آ جاتے اور بدن پر بال کھڑے ہو جاتے - (قرطبی) -

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بندے کے بدن پر اللہ کے خوف سے بال کھڑے ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اس کے بدن کو آگ پر حرام کر دیتے ہیں (قرطبی)

أَفَمَنْ يَتَّقِ بِوَجْهِهِ سُوءَ الْعَذَابِ ابَّيَوْمَ الْقِيَمَةِ

بھلا ایک وہ جو اپنی منہ پر برا عذاب دن قیامت کے

وَقِيلَ لِلظَّالِمِينَ ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿۳۲﴾ كَذَّبَ

اور کہے گا بے انصافوں کو چکھو جو تم کھاتے تھے بھٹلا چکے

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتَهُمُ الْعَذَابُ ابَّ مِنْ حَيْثُ

ہیں اُن سے اگلے پھر پہنچا ان پر عذاب ایسی جگہ سے کہ اُن کو

لَا يَشْعُرُونَ ﴿۳۵﴾ فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَاةِ

خیال بھی نہ تھا پھر چکھائی اُن کو اللہ نے رسوائی دُنیا کی

الدُّنْيَا وَلِعَذَابِ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ مَا كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۳۶﴾

زندگی میں اور عذاب آخرت کا تو بہت ہی بڑا ہے اگر اُن کو سمجھ نہ ہوتی

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ

اور ہم نے بیان کی لوگوں کے واسطے اس قرآن میں سب چیز کی مثل

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۳۷﴾ قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي

تاکہ وہ دھیان کریں قرآن ہے عربی زبان کا جس میں

عَوَجٍ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۳۸﴾

کجی نہیں تاکہ وہ بچ کر چلیں

## خلاصہ تفسیر

بھلا جو شخص اپنے منہ کو قیامت کے روز سخت عذاب کی برسرِ بنادے گا اور ایسے ظالموں کو محکم ہو گا کہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو تو کیا یہ (گرفتار عذاب) اور جو ایسا نہ ہو برابر ہو سکتے ہیں (اور کفار ان عذابوں کو سن کر انکار نہ کریں کیونکہ) جو لوگ اُن سے پہلے ہو چکے ہیں انہوں نے بھی (حق کو) بھٹلایا تھا سو اُن پر عذاب ایسے طور پر آیا کہ اُن کو خیال بھی نہ تھا سو اللہ تعالیٰ نے



ان کو اسی دنیوی زندگی میں بھی رسوائی کا مزہ چکھایا۔ (کہ زمین میں دھنس جانے اور چہرہ بگڑ جانے اور آسمان سے پتھر برسے وغیرہ کے عذاب سے دنیا میں بدنام ہوئے) اور آخرت کا عذاب اور بھی بڑا ہے کاش یہ لوگ سمجھ جاتے (اور پر کی ایک آیت اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَكَ میں یہ بیان ہوا تھا کہ قرآن سن کر بعض لوگ متاثر ہوتے ہیں بعض نہیں ہوتے۔ آگے آیت میں یہ بیان ہے کہ بعض لوگوں کا اس سے متاثر نہ ہونا انکی اپنی قابلیت و صلاحیت کی کمی کی وجہ سے ہے، ورنہ قرآن فی نفسہ سب کے لئے اثر برابر رکھتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تفادیت قابلیت کے اعتبار سے ہے۔ فاعل میں کوئی نقص اور کمی نہیں) اور ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کے (ضروری) عمدہ مضامین بیان کئے ہیں تاکہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ عربی قرآن ہے جس میں ذرا بھی کجی نہیں (اور یہ مضامین اسلئے لائے گئے) تاکہ یہ لوگ (ان سچے اور صاف مضامین کو سن کر) ڈریں (معلوم ہوا کہ قرآن پاک کے کتاب الہدایہ ہونے میں جن صفات کی ضرورت تھی وہ سب اس میں جمع ہیں کہ اس کے مضامین بھی سب سچے اور صاف واضح ہیں اور زبان بھی عربی ہے جس کو موجودہ مخاطب بلا واسطہ سمجھ سکتے ہیں، پھر ان کے ذریعہ سے دوسروں کا سمجھ لینا بھی آسان ہو سکتا ہے۔ غرض اس کتاب ہدایت میں تو کوئی کمی نہیں کسی میں قبول کرنے کی استعداد اور صلاحیت ہی نہ ہو تو کیا کیا جائے۔)

## معارف و مسائل

اَفَمَنْ يَتَّقِ بُوْجِهَهُ۔ اس میں جہنم کے سخت ہولناک ہونے کا بیان ہے کہ انسان کی عادت دنیا میں یہ ہے کہ کوئی تکلیف کی چیز سامنے آجائے تو اپنے ہاتھ پاؤں اور چہرہ بچانے کے لئے ڈھال بنا کر دفع کرتا ہے۔ مگر خدا کی پناہ اہل جہنم کو یہ ہاتھ پاؤں سے مدافعت بھی نصیب نہیں ہوگی، ان پر جو عذاب آئے گا وہ براہ راست ان کے چہروں پر پڑے گا۔ وہ مدافعت بھی کرنا چاہے تو چہرہ ہی کو ڈھال بنا سکے گا کیونکہ جہنم میں اس کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈالا جائے گا۔ نعوذ باللہ منہ۔  
 آئمہ تفسیر میں سے حضرت عطاء ابن زید نے فرمایا کہ جہنمی کو جہنم میں ہاتھ پاؤں باندھ کر گھسیٹ کر ڈالا جائے گا۔ (قرطبی)

صَرََبَ اللّٰهُ مَثَلًا شَرًّا جَلَّ فِيْهِ شَرُّ كَاۡءٍ مُّتَشَكِّسُوْنَ

اللہ نے تیلانی ایک مثل ایک مرد ہے کہ اُس میں شریک ہیں کئی ضدی

وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۖ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۖ

اور ایک مرد ہے۔ پورا ایک شخص کا کیا برابر ہوئی ہیں دونوں مثل

الْحَمْدُ لِلَّهِ ۖ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۹﴾ إِنَّكَ مَيِّتٌ

سب خیر فی اللہ کے لئے ہے۔ بروہ بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے بے شک تو بھی مرتا ہے

وَأَنَّهُمْ مَّيِّتُونَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ

اور وہ بھی مرے ہیں پھر مقرر تم قیامت کے دن اپنے رب کے آگے

تَخْتَصِمُونَ ﴿۳۱﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ

جھگڑو گے پھر اس سے زیادہ ظالم کون جس نے جھوٹ بولا اللہ پر

وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ إِذْ جَاءَهُ ۖ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ

اور جھٹلایا سچی بات کو جب پہنچی اس کے پاس کیا نہیں دوزخ میں

مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ

ٹھکانا مشرکوں کا اور جو لے کر آیا سچی بات اور سچ مانا

بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ

جس نے اس کو وہی لوگ ہیں ڈروالے ان کے لئے ہے جو وہ چاہیں اپنے

رَبِّهِمْ ۖ ذَٰلِكَ جَزَاُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۴﴾ لِيُكَفِّرَ اللَّهُ عَنْهُمْ

رب کے پاس یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا تاکہ اتار دے اللہ ان پر سے

أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا وَيَجْزِيَهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۵﴾

برے کام جو انھوں نے کئے تھے اور بدلے میں دے ان کو ثواب بہتر کاموں کا جو وہ کرتے تھے۔

## خُلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے (مومنین اور مشرک کے بارے میں) ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص (غلام) جس کی ساری چیزیں ہیں جن میں باہم خداوندی (بھی) ہے اور ایک اور شخص ہے کہ پورا ایک ہی شخص کا (غلام) ہے (تو) کیا ان دونوں کی مثال کیسا (ہو سکتی) ہے (اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں برابر نہیں، پہلا شخص تکلیف میں ہے کہ ہمیشہ متحیر رہتا ہے کہ کس کا کہنا مانوں کس کا نہ مانوں۔ دوسرا آرام میں ہے کہ ایک ہی شخص سے تعلق ہے۔ پس پہلی مثال مشرک کی ہے کہ ہمیشہ ڈانڈوں میں رہتا ہے۔ کبھی غیر اللہ کی طرف دڑتا ہے، کبھی خدا کی طرف پھر غیر اللہ میں بھی ایک پر اطمینان نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کی طرف رجوع کرتا ہے کبھی کسی کی طرف۔



اس سوال کا جواب کفار بھی اس کے سوا نہیں دے سکتے کہ غلام مشترک بڑی مصیبت میں رہتا ہے اس لئے ان پر حجت تمام ہو گئی۔ اس تمام حجت پر فرمایا الحمد للہ حق ثابت ہو گیا۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ قبول نہیں کرتے۔ بلکہ (قبول تو کیا) ان میں اکثر لوگ سمجھتے بھی نہیں (کیونکہ سمجھنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے۔ آگے فیصلہ قیامت کا ذکر ہے جو آخری فیصلہ ہو گا۔ جس سے کوئی بھاگ نہیں سکے گا اور فیصلہ قیامت سے پہلے موت کی خبر دیتے ہیں۔ کیونکہ موت ہی مقدمہ اور طریقہ ہے آخرت تک پہنچنے کا اس لئے فرمایا اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یہ لوگ اگر دنیا میں کسی عقلی اور نقلی فیصلہ کو نہیں مانتے تو آپ غم نہ کیجئے، کیونکہ دنیا سے آپ کو بھی مر جانا ہے اور ان کو بھی مر جانا ہے، پھر قیامت کے روز تم (دونوں فریق اپنے اپنے) مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے۔ (اُس وقت عملی فیصلہ ہو جاوے گا جس کے ظہور کا بیان آگے آتا ہے فَهَنَ أَظْلَمُ) سو اس مخالفت اور عدالت میں مقدمات پیش ہونے کے وقت فیصلہ یہ ہو گا کہ باطل پرستوں کو عذاب جہنم ہو گا اور حق پرستوں کو اجر عظیم ملے گا اور ظاہر ہے کہ اس شخص سے زیادہ بے انصاف (اور ناحق پرست) کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے (یعنی خدا تعالیٰ کے متعلق یہ کہے کہ اس کے ساتھ دوسرے بھی شریک ہیں) اور سچی بات کو (یعنی قرآن) کو جیکہ وہ اس کے پاس (رسول کے ذریعہ) پہنچی جھٹلاوے (تو ایسے شخص کا بڑا ظالم ہونا بھی ظاہر ہے اور ظالم کا مستحق ہونا بڑے عذاب کا بھی ظاہر ہے اور بڑا عذاب جہنم کا ہے تو) کیا (قیامت کے دن) جہنم میں ایسے کافروں کا ٹھکانہ نہ ہو گا (یہ فیصلہ تو باطل پرستوں کا ہوا) اور (برخلاف ان کے) جو لوگ سچی بات لے کر خدا کی طرف سے یا رسول کی طرف سے لوگوں کے پاس آئے اور (خود بھی) اس کو سچ جانا (یعنی یہ لوگ صادق بھی ہیں اور مصدق بھی جیسا کہ پہلے لوگ کاذب بھی تھے اور مکذب بھی) تو یہ لوگ پرہیزگار ہیں (ان کا فیصلہ یہ ہو گا کہ) وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے لئے پروردگار کے پاس سب کچھ ہے یہ صلہ ہے نیکو کاروں کا (اور یہ صلہ ان کے لئے اس واسطے تجویز کیا) تاکہ اللہ تعالیٰ ان سے برے عملوں کو دور کرے اور نیک کاموں کے عوض ان کو ان کا ثواب دے۔

## معارف و مسائل

إِنَّا كَاشِفُ الْعَذَابِ عَنْ قَوْمٍ إِنَّهُمْ قَدْ مَاتُوا - لفظ مَاتَ بتثنية الیاء اُس کو کہتے ہیں جو زمانہ مستقبل میں مرنے والا ہو اور مَاتَ بسكون الیاء اُس کو کہتے ہیں جو مر چکا ہو۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ بھی مرنے والے ہیں اور آپ کے

دشمن اور احباب بھی سب مرنے والے ہیں۔ مقصد اس کے بیان کرنے سے سب کو فکر آخرت کی طرف متوجہ کرنا اور عمل آخرت میں لگنے کی ترغیب دینا ہے اور ضمناً یہ بھی بتلادینا ہے کہ افضل الخلائق اور سید المرسلین ہونے کے باوجود موت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مستثنیٰ نہیں۔ تاکہ آپ کی وفات کے بعد لوگوں میں اس پر اختلاف پیدا نہ ہو۔ (از قرطبی)

ثُمَّ أَتَاكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِندَ مَا بَكُمُ تَخْتَصِمُونَ - حضرت محشر کی عدالت میں مظلوم کا حق ظالم سے وصول کرنے کی صورت

میں پیش کریں گے اور اللہ تعالیٰ ظالم سے مظلوم کا حق دلوائیں گے وہ کافر ہو یا مؤمن۔ اور صورت اس ادائیگی حقوق کی وہ ہوگی جو صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی کی روایت سے آئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کسی کا حق ہے اس کو چاہیے کہ دنیا ہی میں اس کو ادا یا معاف کرنا اگر حلال ہو جائے۔ کیونکہ آخرت میں درہم و دینار تو ہوں گے نہیں۔ اگر ظالم کے پاس کچھ اعمال صالحہ ہیں تو بمقدار ظلم یہ اعمال اس سے لیکر مظلوم کو دیدیئے جاویں گے۔ اور اگر اس کے پاس حسنات نہیں ہیں تو مظلوم کی سیئات اور گناہوں کو اس سے لیکر ظالم پر ڈال دیا جائے گا۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز صحابہ کرام سے سوال کیا کہ آپ جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم تو مفلس اس کو سمجھتے ہیں جس کے پاس نہ کوئی نقد رقم ہو نہ ضروریات کا سامان۔ آپ نے فرمایا کہ اصلی اور حقیقی مفلس میری امت میں وہ شخص ہے جو قیامت میں بہت سے نیک اعمال، نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ لیکر آئے گا مگر اس کا حال یہ ہوگا کہ اس نے دنیا میں کسی کو گالی دی، کسی پر تہمت باندھی، کسی کا مال ناجائز طور پر کھاکیا، کسی کو قتل کر دیا، کسی کو مار پیٹ سے متتایا تو یہ سب مظلوم اللہ کے سامنے اپنے مظالم کا مطالبہ کریں گے اور اس کی حسنات ان میں تقسیم کر دی جائیں گی پھر جب یہ حسنات ختم ہو جائیں گی اور مظلوموں کے حقوق ابھی باقی ہوں گے تو مظلوموں کے گناہ اس پر ڈال دیئے جاویں گے۔ اور اس کو جہنم میں ڈال دیا جاوے گا۔ (تو یہ شخص سب کچھ سامان ہونے کے باوجود قیامت میں مفلس رہ گیا، یہی اصلی مفلس ہے)

اور طبرانی نے ایک معتبر سند کے ساتھ حضرت ابو ایوب انصاری رضی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو مقدمہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوگا وہ مرد اور اس کی بیوی کا ہوگا اور بخدا کہ وہاں زبان نہیں بولے گی۔ بلکہ عورت کے ہاتھ پاؤں گواہی دینگے کہ وہ اپنے شوہر پر کیا کیا عیب لگایا کرتی تھی اور اسی طرح مرد کے ہاتھ پاؤں اس پر گواہی دیں گے کہ وہ کس طرح اپنی بیوی کو تکلیف دینا پہنچاتا تھا۔ اس کے بعد ہر آدمی کے سامنے اس کے نوکر چاکر لائے



جائیں گے ان کی شکایات کا فیصلہ کیا جائے گا۔ پھر عوام بازار کے لوگ جن سے اس کے معاملات رہتے تھے وہ پیش ہوں گے اگر اس نے ان میں سے کسی پر ظلم کیا ہے تو اس کا حق دلویا جائے گا۔

سارے اعمال مظالم اور حقوق کے بدلے میں دیدیئے جاویں گے مگر ایمان نہیں دیا جائے گا۔

تفسیر منظری میں مذکورہ سب روایات حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مظلوموں کے حقوق میں ظالم کے اعمال دیدیئے کا جو ذکر آیا ہے، اُس سے مراد ایمان کے

دوسرے اعمال ہیں، کیونکہ جتنے مظالم ہیں وہ سب عملی گناہ ہیں، کفر نہیں ہیں اور عملی گناہوں کی سزا محدود ہوگی بخلاف ایمان کے کہ وہ ایک غیر محدود عمل ہے۔ اس کی جزا بھی غیر محدود یعنی ہمیشہ جنت میں رہنا ہے اگرچہ وہ گناہوں کی سزا بھگتے اور کچھ عرصہ جہنم میں رہنے کے بعد اس کا حاصل یہ ہے کہ جب ظالم کے اعمال صالحہ علاوہ ایمان کے سب مظلوموں کو دے کر ختم ہو جائیں گے۔ صرف ایمان رہ جائے گا تو ایمان اس سے سلب نہیں کیا جائے گا بلکہ مظلوموں کے گناہ اس پر ڈال کر حقوق کی ادائیگی کی جائے گی جس کے نتیجہ میں یہ گناہوں کا عذاب بھگتنے کے بعد پھر بالآخر جنت میں داخل ہوگا اور پھر یہ حال اس کا دائمی ہوگا۔ صاحب تفسیر منظری نے فرمایا کہ امام بیہقی نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔

كَذَّبَ بِالْحَقِّ اَوْ اَلْكَى جَاغِرًا بِالصِّدْقِ مِیْنِ صِدْقٍ سِے مراد وہ تعلیمات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرائے ہیں۔ خواہ قرآن ہو یا قرآن کے علاوہ دوسری تعلیمات احادیث اور صدقہ میں سب مؤمنین داخل ہیں جو اس کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدًا وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُونِهِ

کیا اللہ بس نہیں اپنے بندہ کو اور تجھ کو ڈراتے ہیں ان سے جو اُس کے سوائے ہیں

وَمَنْ يُضِلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۖ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ

اور جس کو راہ بھلائے اللہ تو کوئی نہیں اس کو راہ دیئے والا اور جس کو راہ سمجھائے اللہ

فَمَا لَهُ مِنْ مُّضِلٍّ ۗ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيزٍ ذِيْ اَنْتِقَامٍ ۝۳۷

تو کوئی نہیں اس کو بھلائے والا کیا نہیں ہے اللہ زبردست بدلہ لینے والا

وَلٰكِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ

اور جو تو ان سے پوچھے کس نے بنائے آسمان اور زمین تو کہیں

اللّٰهُ ۗ قُلْ اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ

اللہ نے تو کہہ بھلا دیکھو تو جن کو بلا جنتے ہو اللہ کے سوائے اگر

أَرَادَنِي اللَّهُ بِبُصْرٍ هَلْ هُنَّ كُشِفَتْ صُرَاةً أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ

چاہے اللہ مجھ پر کچھ تکلیف تو وہ ایسے ہیں کہ کھول دیں تکلیف اس کی ڈالی ہوئی یا وہ چاہے مجھ پر

هَلْ هُنَّ مُسِكَتٌ رَحْمَتُهُ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ

مہربانی تو وہ ایسے ہیں کہ روک دیں اس کی مہربانی کو تو کہہ مجھ کو بس ہے اللہ اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں

يَتَوَكَّلْ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٣٨﴾ قُلْ يَقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ

بھروسہ رکھنے والے تو کہہ اے قوم کام کئے جاؤ اپنی جگہ پر

إِنِّي عَامِلٌ فَمَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ

میں بھی کام کرتا ہوں اب آگے جان لو گے کس پر آتی ہے آفت کہ اس کو

يُخْرِجُهُ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٤٠﴾ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ

اُتار کرے اور اُترتا ہے اُس پر عذاب سدا رہنے والا ہم نے اُتاری ہے

عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ

مجھ پر کتاب لوگوں کے واسطے سچے دین کے ساتھ پھر جو کوئی راہ پر آیا سو اپنے بھلے کو اور جو

ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ﴿٤١﴾

کوئی بہکا سو یہی بات ہے کہ بہکا اپنے بڑے کو اور تو اُن کا ذمہ دار نہیں -

۱۰۰

## خلاصہ تفسیر

کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندہ (خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت) کے لئے رکافی نہیں (یعنی وہ تو سب ہی کی حفاظت کے لئے کافی ہے تو اپنے محبوب خاص بندے کے لئے کیوں کافی نہ ہوگا) اور یہ لوگ (ایسے احمق ہیں کہ حفاظت خداوندی سے تجاہل کر کے) آپ کو اُن (جھوٹے معبودوں) سے ڈرتے ہیں جو خدا کے سوا (بجوزیرہ رکھے) ہیں (حالانکہ وہ خود بے جان عاجز ہیں اور قادر بھی ہوتے تو خدا کی حفاظت کے مقابلہ میں عاجز ہی ہوتے) اور (اصل بات یہ ہے کہ) جس کو خدا گمراہ کرے اُس کا کوئی ہدایت کرنے والا نہیں اور جس کو وہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں (اگے خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر کر کے اُنکی حماقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ) کیا خدا تعالیٰ (ان کے نزدیک) نہ بردست (اور) انتقام لینے (پر قدرت رکھنے) والا نہیں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت ناصریت بھی کامل اور بندہ کی صلاحیت منصوریت بھی کامل اور جھوٹے معبودوں کا قدرت و نصرت سے عاجز ہونا بھی ظاہر پھر آپ کو ان باتوں سے ڈرنا حماقت نہیں تو کیا ہے) اور (عجیب بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی



قدرت کاملہ اور نصرت کے مقدمات کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہی کہیں گے کہ اللہ نے (اس لئے) آپ (ان سے) کہتے کہ بھلا (جب تم اللہ کو تخلیق میں مفروضہ مانتے ہو تو) یہ بتلاؤ کہ خدا کے سوا جن معبودوں کو پوجتے ہو، اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہے، کیا یہ معبود اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں یا اللہ مجھ پر اپنی عنایت کرنا چاہے تو کیا یہ معبود اس کی عنایت کو رد کر سکتے ہیں (آگے ارشاد ہے کہ جب اس تقریر سے اللہ تعالیٰ کا کمال قدرت ثابت ہو جاوے تو) آپ کہہ دیجئے کہ (اس سے ثابت ہو گیا کہ) میرے لئے خدا کافی ہے توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں (اسی لئے میں بھی اسی پر توکل اور بھروسہ رکھتا ہوں اور تمھارے خلاف عناد کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ اور چونکہ یہ لوگ ان سب باتوں کو سن کر بھی اپنے خیال باطل پر جھبے ہوئے تھے اسلئے آپ کو آخری جواب کی تعلیم ہے کہ) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ (اگر اس پر بھی تم نہیں مانتے تو تم جانو) تم اپنی حالت پر عمل کئے جاؤ میں بھی (اپنے طرز پر) عمل کر رہا ہوں (یعنی جب تم اپنے طریقہ باطل کو نہیں چھوڑتے تو میں طریقہ حق کو کیسے چھوڑوں) (سوا اب جلد ہی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر (دنیا میں) ایسا عذاب آیا جاتا ہے جو اس کو گروا کر دے گا، اور (مرنے کے بعد) اس پر دائمی عذاب نازل ہوگا) (چنانچہ دنیا میں غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے ان کو سزا پہلی اس کے بعد آخرت کا دائمی عذاب ہے۔ یہاں تک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کے خوف سے تسلی دی گئی۔ آگے آپ کو جو کفار اور عام خلق خدا کے ساتھ شفقت کی بنا پر ان کے کفر و انکار سے غم ہوتا تھا اس پر تسلی دی گئی کہ) ہم نے یہ کتاب آپ پر لوگوں کے (نفع کے) لئے اتاری۔ جو حق کو لئے ہوئے ہے سو (آپ کا کام اس کا پہنچانا ہے پھر) جو شخص راہ راست پر آوے گا تو اپنے نفع کے واسطے اور جو شخص بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا اسی پر پڑے گا، اور آپ ان پر مستط (اس طرح) نہیں کئے گئے (کہ ان کی بے راہی کی آپ سے باز پرس ہو تو آپ ان کی گمراہی سے کیوں مغموم ہوتے ہیں)۔

## معارف و مسائل

الَّذِينَ اللَّهُ يَكُفِّرُ عَنْهُمْ - اس آیت کا شان نزول ایک واقعہ ہے کہ کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو اس سے ڈرایا تھا کہ اگر آپ نے ہمارے بتوں کی بے ادبی کی تو ان بتوں کا اثر بہت سخت ہے اس سے آپ بچ نہ سکیں گے۔ ان کے جواب میں کہا گیا کہ کیا اللہ اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں؟ اس لئے بعض مفسرین نے یہاں بندے سے مخصوص بندہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیا ہے۔ خلاصہ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ اور دوسرے مفسرین نے بندہ سے مراد عام لی ہے اور

آیت کی دوسری قرأت جو عبادۃ الہی ہے وہ اس کی مؤید ہے۔ اور مضمون بہر حال عام ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندے کے لئے کافی ہے۔

عبرت نصیحت  
وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ۔ یعنی کفار آپ کو ڈراتے ہیں اپنے جھوٹے

معبودوں کے غضب سے۔ اس آیت کو پڑھنے والے عموماً یہ خیال کر کے گذر جاتے ہیں کہ یہ

ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے، جس کا تعلق کفار کی دھمکیوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس

سے ہے، اس طرف دھیان نہیں دیتے کہ اس میں ہمارے لئے کیا ہدایت ہے۔ حالانکہ بات بالکل کھلی ہوئی ہے،

کہ جو شخص بھی کسی مسلمان کو اس لئے ڈرائے کہ تم نے فلاں حرام کام یا گناہ نہ کیا تو تمہارے حکام اور افسرین کے

تم محتاج سمجھے جاتے ہو تم سے خفا ہو جائیں گے اور تکلیف پہنچائیں گے۔ یہ بھی اسی میں داخل ہے اگرچہ ڈرائے والا

مسلمان ہی ہو اور جس سے ڈرایا جائے وہ بھی مسلمان ہی ہو۔ اور یہ ایسا عام ابتلا ہے کہ دنیا کی اکثر

ملازمتوں میں لوگوں کو پیش آتا ہے کہ احکام الہیہ کی خلاف ورزی پر آمادہ ہو جائیں یا پھر اپنے افسروں

کے عتاب و عقاب کے مورد بنیں۔ اس آیت نے ان سب کو یہ ہدایت دی کہ کیا اللہ تعالیٰ تمہاری

حفاظت کے لئے کافی نہیں، تم نے خالص اللہ کے لئے گناہوں کے ارتکاب سے بچنے کا عزم کر لیا اور احکام

خداوندی کے خلاف کسی حاکم و افسر کی پروا نہ کی تو خدا تعالیٰ کی امداد تمہارے ساتھ ہوگی۔ زائد سے زائد

یہ ملازمت چھوڑ بھی جائے گی تو اللہ تعالیٰ تمہارے رزق کا دوسرا انتظام کر دیں گے۔ اور مومن کا کام

تو یہ ہے کہ ایسی ملازمت کو چھوڑنے کی خود ہی کوشش کرتا رہے کہ کوئی دوسری مناسب جگہ مل جائے

تو اس کو فوراً چھوڑ دے۔

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي

اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب اوقت ہوا ان کے مرنے کا اور جو نہیں مریں ان کو کھینچ لیتا ہے

مَنَازِلَ هُنَّ فِي مَسْجِدِ الْكَافِرِ قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ

ان کی نیند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا ٹھہرا دیا ہے اور بھیج دیتا ہے

الْآخِرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ

اوروں کو ایک وعدہ مقرر تک اس بات میں پختہ ہیں ان لوگوں کو

يَتَفَكَّرُونَ ﴿۳۲﴾ أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ط ۚ قُلْ

جو دھیان کریں کیا انہوں نے پکڑے ہیں اللہ کے سوائے کوئی سفارش والے تو کہہ

أَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ﴿۳۳﴾ قُلْ لِلَّهِ

اگرچہ ان کو اختیار نہ ہو کسی چیز کا اور نہ سمجھ تو کہہ اللہ کے



الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط ثُمَّ

اختیار میں ہے ساری سفارش اسی کا راجح ہے آسمان اور زمین میں پھر

إِلَيْهِ تَرْجِعُونَ ﴿۳۹﴾ وَإِذَا ذَكَرَ اللَّهُ وَحْدًا شَازَتْ قُلُوبُ

اسی کی طرف پھرے جاؤ گے اور جب نام لیجے مخلص اللہ کا رک جاتے ہیں دل

الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذَكَرَ الَّذِينَ مِنْ

ان کے جو یقین نہیں رکھتے پچھلے گھر کا اور جب نام لیجے اس کے سوا

دُونِهِ إِذَا هُمْ كَيْتَبُشِرُونَ ﴿۴۰﴾

اوروں کا تب وہ لگیں خوشیاں کرنے

## خلاصہ تفسیر

اللہ ہی قبض (یعنی معطل) کرتا ہے اُن جانوں کو (جن کا وقت موت آگیا ہے) ان کی موت کے وقت (مکمل طور پر کہ زندگی بالکل ختم ہو جائے) اور اُن جانوں کو بھی جن کو موت نہیں آئی اُن کے سولے کے وقت (یہ تعطل بالکلیہ نہیں ہوتا ایک حیثیت حیات کی باقی رہ جاتی ہے مگر ادراک نہیں ہوتا اور موت کی صورت میں نہ ادراک رہتا ہے نہ حیات) پھر (اس معطل کرنے کے بعد) اُن جانوں کو تو (بدن کی طرف عمر د کرنے سے) روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو (جو نیند کی وجہ سے معطل ہو گئی تھیں اور ابھی ان کی موت کا وقت نہیں آیا) ایک سیعاد معین (یعنی مدت) تک کے لئے آزاد کر دیتا ہے (کہ پھر واپس جا کر بدن میں بدستور سابق تصرفات کر لے سکیں) اس (مجموعہ تصرفات الہیہ) میں اُن لوگوں کے لئے جو سوچنے کے عادی ہیں (خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور بلا مشرکت غیرے تمام عالم کے انتظامات کرنے پر) دلائل ہیں (جن سے اللہ کی توحید پر استدلال کرتے ہیں) ہاں کیا (توحید کے دلائل واضح قائم ہوتے ہوئے) ان لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو (معبود) قرار دے رکھا ہے جو (ان کی) سفارش کریں گے (جیسا کہ مشرکین اپنے بتوں کے متعلق کہا کرتے تھے هَؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ) آپ کہہ دیجئے کہ اگرچہ یہ (تمہارے گھرے ہوئے شفعاء) کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہوں اور کچھ بھی علم نہ رکھتے ہوں (کیا پھر بھی تم یہی سمجھتے چلے جاؤ گے کہ یہ تمہاری سفارش کریں گے۔ کیا اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ شفاعت کے لئے علم اور اس کے مناسب قدرت تو ضروری ہے جو ان میں مفقود ہے۔ یہاں بعض مشرک یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ پتھر کے تراشے ہوئے بت ہمارا مقصود نہیں بلکہ یہ مجسمے اور شکلیں فرشتوں کی یا جنات کی ہیں وہ تو ذی روح بھی ہیں قدرت اور علم بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے جواب کی یہ تعلیم دی گئی کہ) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ سفارش تو

تو متر خدا ہی کے اختیار میں ہے (بدون اس کی اجازت کے کسی فرشتے یا بشر کی مجال نہیں کہ کسی کلمہ فارش کر سکے اور اللہ تعالیٰ کی اجازت شفاعت کے لئے دو شرطیں ہیں ایک شفاعت کرنے والے کا عند اللہ مقبول ہونا، دوسرے جس کی شفاعت کی جائے اس کا قابل مغفرت ہونا۔ اب سمجھ لو کہ مشرکین نے بتوں کو جنکی شکلیں سمجھ کر اختیار کیا ہے اگر وہ جنات و شیاطین ہیں تو دونوں شرطیں مفقود ہیں، نہ شفاعت کرنے والے مقبول عند اللہ ہیں نہ یہ مشرک قابل مغفرت ہیں اور اگر ان شکلوں کو ملائکہ یا انبیاء کی شکلیں قرار دے رکھا ہے تو شفاعت کرنے والوں کے مقبول ہونے کی شرط تو موجود ہوئی، مگر دوسری شرط مفقود ہے کہ ان مشرکین میں صلاحیت مغفرت کی نہیں ہے۔ آگے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ تمام آسمان و زمین کی سلطنت اسی کی ہے۔ پھر تم اُسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔ (اسی لئے سب کو چھوڑ کر اسی سے ڈرو اسی کی عبادت کرو) اور (توحید کے دلائل و ائمہ قائم ہونے کے باوجود کفار و مشرکین کا حال یہ ہے کہ) جب فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (کہ وہ بلا شرکت غیرے تمام عالم کے سیاہ سفید کا مالک مختار اور متصرف ہے) تو ان لوگوں کے دل منقبض ہوتے ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر آتا ہے (خواہ صرف انھیں کا ذکر ہو یا اللہ کے ذکر کے ساتھ ان کا بھی ذکر ہو) تو اسی وقت وہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔

## معارف و مسائل

موت اور نفیہ کے وقت قبض روح اور دونوں میں فرق کی تفصیل

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي جَوْفِ مَتْنِهَا۔ تَوَفَّى کے لفظی معنی لے لینے اور قبض کر لینے کے ہیں۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ جانداروں کی ارواح ہر حال ہر وقت اللہ تعالیٰ کے زیر تصرف ہیں، وہ جب چاہے ان کو قبض کر سکتا ہے اور واپس لے سکتا ہے اور اس تصرف خداوندی کا ایک مظاہرہ تو ہر جاندار روزانہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ نیند کے وقت اسکی روح ایک حیثیت سے قبض ہو جاتی ہے، پھر بیداری کے بعد واپس مل جاتی ہے اور آخر کار ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ بالکل قبض ہو جائے گی پھر واپس نہ ملے گی۔

تفسیر منطہری میں ہے کہ قبض روح کے معنی اس کا تعلق بدن انسانی سے قطع کر دینے کے ہیں، کبھی یہ ظاہر اور باطناً بالکل منقطع کر دیا جاتا ہے۔ اسی کا نام موت ہے اور کبھی صرف ظاہراً منقطع کیا جاتا ہے باطناً باقی رہتا ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ صرف جس اور حرکت ارادیہ جو ظاہری علامت زندگی ہے وہ منقطع کر دی



جاتی ہے اور باطناً تعلق روح کا جسم کے ساتھ باقی رہتا ہے جس سے وہ سانس لیتا ہے اور زندہ رہتا ہے اور صورت اُس کی یہ ہوتی ہے کہ روح انسانی کو عالم مثال کے مطالعہ کی طرف متوجہ کر کے اس عالم سے غافل اور معطل کر دیا جاتا ہے تاکہ انسان مکمل آرام پاسکے۔ اور کبھی یہ باطنی تعلق بھی منقطع کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے جسم کی حیات بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

آیت مذکور میں لفظ "تَوَفَّی" بمعنی قبض بطور عموم مجاز کے دونوں معنی پر حاوی ہے۔ موت اور نیند دونوں میں قبض روح کا یہ فرق جو اوپر بیان کیا گیا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ سونے کے وقت انسان کی روح اس کے بدن سے نکل جاتی ہے مگر ایک شعاع روح کی بدن میں رہتی ہے جس سے وہ زندہ رہتا ہے اور اسی رابطہ شعاعی سے وہ خواب دیکھتا ہے۔ پھر یہ خواب اگر روح کے عالم مثال کی طرف متوجہ رہنے کی حالت میں دیکھا گیا تو وہ سچا خواب ہوتا ہے اور اگر اس طرف سے بدن کی طرف واپسی کی حالت میں دیکھا تو اُس میں شیطانی تصرفات ہو جاتے ہیں وہ رؤیاء صادقہ نہیں رہتا۔ اور فرمایا کہ نیند کی حالت میں جو روح انسانی اس کے بدن سے نکلتی ہے تو بیداری کے وقت آنکھ جھپکنے سے بھی کم مقدار وقت میں بدن میں واپس آ جاتی ہے۔

قُلِ اللَّهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَلِمَ الْغَيْبِ وَ

تو کہہ اے اللہ پیدا کرنے والے آسمانوں کے اور زمین کے جاننے والے چھپے اور

الشَّہَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

کھلنے کے تو ہی فیصلہ کرے اپنے بندوں میں جس چیز میں وہ جھگڑ رہے تھے

وَلَوْ اَنْ لِّدُنِّیْنَ ظَلَمُوْا مٰلِیْ الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَ مِثْلَهُ

اور اگر گنہگاروں کے پاس ہو جتنا کچھ کہ زمین میں ہے سارا اور اتنا ہی اور

مَعَهُ لَا فِتْنَةً وَّ اِیَّاهُ مِنْ سُوْءِ الْعَذَابِ اَبْ یُّوْمَ الْقٰیْمَةِ ط

اس کے ساتھ تو سب دسے ڈالیں اپنے چھڑولنے میں بڑی طرح کے عذاب سے دن قیامت کے

وَبَدَا لَهُمِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ یَكُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَ بَدَا لَهُمِّنَ

اور نظر آئے ان کو اللہ کی طرف سے جو خیال بھی نہ رکھتے تھے اور نظر آئیں انکو

سَیِّئَاتٍ مَا کَسَبُوْا وَ حَاقَ بِہُمْ مَّا کَانُوْا یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾

بڑے کام اپنے جو کھاتے تھے اور آگ پر سے ان پر وہ چیز جس پر ہنستا کرتے تھے۔

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِّنَّا لَا

سوجب آگئی ہے آدمی کو کچھ تکلیف ہم کو پکارنے لگتا ہے پھر جب ہم بخشیں اس کو اپنی طرف سے کوئی

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ

نہمت کہتا ہے یہ تو مجھ کو ملی کہ پہلے سے معلوم تھی کوئی نہیں۔ جانچ ہے پر وہ بہت سے لوگ

لَا يَعْلَمُونَ ﴿۴۹﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَا أَغْنَىٰ

نہیں سمجھتے کہہ چکے ہیں یہ بات ان سے اگلے پھر کچھ کام نہ آیا

عَنَّا هُمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۵۰﴾ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتٌ مَّا كَسَبُوا

ان کو جو کما لے تھے پھر برکتیں ان پر برائیاں جو کما لے تھیں

وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ هَؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتٌ مَّا

اور جو گنہگار ہیں ان میں سے ان پر بھی اب پڑتی ہیں برائیاں جو

كَسَبُوا ۖ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۵۱﴾ أَوْ لَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ

کما لے ہیں اور وہ نہیں تو کما لے والے اور کیا نہیں جان چکے کہ اللہ

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَايَةً

پھیلاتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اور مাপ کر دیتا ہے البتہ اس میں پتہ ہیں ان

لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۲﴾

لوگوں کے واسطے جو مانتے ہیں۔

## خلاصہ تفسیر

آپ (ان کی شدتِ عذاب سے محزون نہ ہو جائے اور اللہ سے دعا میں یہ کہہئے کہ اے اللہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے باطن اور ظاہر کے جاننے والے آپ ہی (قیامت کے روز) اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ فرمادیں گے جن میں باہم وہ اختلاف کرتے تھے۔ (یعنی آپ ان معاندین کی فکر میں نہ پڑیئے، بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کیجئے وہ خود عملی فیصلہ کر دیں گے) اور (اس فیصلہ کے وقت یہ حالت ہوگی کہ) اگر ظلم (یعنی شرک و کفر) کرنے والوں کے پاس دنیا بھر کی تمام چیزیں ہوں اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی چیزیں اور بھی ہوں تو وہ لوگ قیامت کے دن سخت عذاب سے چھوٹ جانے کے لئے (بے تأمل) ان کو دینے لگیں (گو مقبول نہ ہو کہ مافی المائدۃ مَا تُقْبَلُ مِنْهُمْ) اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آوے گا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا (کیونکہ اول تو آخرت کے منکر



تھے پھر اس میں بھی اس کے مدعی تھے کہ وہاں بھی ان کو عزت و دولت ملے گی) اور (اس وقت) ان کو تمام اپنے برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے اور جس (عذاب) کے ساتھ وہ استہزاء کیا کرتے تھے وہ ان کو آگھیرے گا (یوں تو مشرک غیر اللہ کے ذکر سے مسرور اور صرف اللہ کے ذکر سے نفور رہتا ہے) پھر جس وقت (اس مشرک) آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو (جن کے ذکر سے مسرور ہوا کرتا تھا ان سب کو چھوڑ کر صرف ہم کو بکارتا ہے جس سے پہلے نفور تھا) پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا فرمادیتے ہیں تو اس کو یہ یہ جس کا حق ہونا خود اس کے اقرار سے ثابت ہو چکا تھا قائم نہیں رہتا چنانچہ اس نعمت کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کرتا بلکہ یوں کہتا ہے کہ یہ تو مجھ کو (میری) تدبیر سے ملی ہے (اور چونکہ نسبت حق تعالیٰ کی طرف نہیں کرتا بلکہ اپنی تدبیر کا نتیجہ سمجھتا ہے اس لئے تو عید پر قائم نہیں ہوتا بلکہ اپنے قییم طریقہ شرک کی طرف عود کر کے غیر اللہ کی عبادت میں لگا جاتا ہے۔ اگے حق تعالیٰ کے قول **لَا تَتَّبِعُوا دُفْرَانَهُ** کو رد فرماتے ہیں کہ نعمت اسکی تدبیر کا نتیجہ نہیں ہے) بلکہ وہ (نعمت خدا کی دسی ہوئی اور اسکی طرف سے انسان کی) ایک آزمائش ہے (کہ دیکھیں اس کے ملنے پر ہم کو بھول جاتا ہے اور کفر کرتا ہے یا یاد رکھتا ہے اور شکر کرتا ہے اور اسی آزمائش کے لئے بعض نعمتوں میں اسباب و کسب کا واسطہ بھی رکھ دیا ہے۔ اس سے اور زیادہ آزمائش ہو گئی کہ دیکھیں اس ظاہری سبب پر نظر کرتا ہے یا علت حقیقیہ پر) لیکن اکثر لوگ (اس بات کو) سمجھتے نہیں (اس لئے اس کو اپنی تدبیر کا نتیجہ بتلاتے ہیں اور مبتلائے شرک رہتے ہیں آگے تفریع ہے کہ) یہ بات (بعض) ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (جیسے تارون نے کہا تھا **اِنَّهُمْ اَوْفَتْهُمْ عَلٰی عِلْمِ عَزْدٰی** یا جو لوگ منکر صانع کے ہو گزرے ہیں) جیسے غرور و فرعون۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی کسی نعمت کی نسبت خدا کی طرف نہ کرتے تھے بلکہ غیر مکتسب اور غیر اختیاری میں بخت و اتفاق کی طرف اور مکتسب و اختیاری میں ہنر اور تدبیر کی طرف نسبت کرتے تھے، سو ان کی کارروائی ان کے کچھ کام نہ آئی (اور مانع عن العذاب نہ ہوئی) پھر (مانع نہ ہو سکنے کے بعد وافع للعذاب بھی نہ ہوئی بلکہ) ان کی تمام بد اعمالیاں ان پر آپڑیں (اور سزا یاب ہوئے) اور (زمانہ محال کے لوگ یہ خیال نہ کریں کہ جو کچھ ہونا تھا اگلوں کے ساتھ ہو چکا بلکہ) ان میں بھی جو ظالم ہیں ان پر بھی ان کی بد اعمالیاں ابھی پڑنے والی ہیں اور یہ (خدا تعالیٰ کو) ہرا نہیں سکتے (چنانچہ بدر میں خوب سزا ہوئی) آگے اس کی دلیل بیان فرمائی کہ بعضے احمق جو نعمت و رزق کو اپنی تدبیر کی طرف منسوب کرتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو (احوال میں غور کرنے سے) یہ معلوم نہیں ہو کہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور وہی (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگی بھی کر دیتا ہے (اس بسط و قسٹ میں) (غور کرنے سے) ایمان والوں کے واسطے (کہ اہل فہم ہوتے ہیں اس بات پر) نشانیاں (یعنی دلائل قائم) ہیں (کہ باسط و قابض وہی ہے تدبیر و تدبیر اس میں علت حقیقیہ نہیں۔ پس ان دلائل کو جو شخص سمجھ لے گا وہ اپنی تدبیر کی طرف نسبت نہ کرے گا، بلکہ خدا کے منعم ہونے سے ذہول نہ کرے گا جو سبب ہو گیا تھا ابتلا بالشرک کا بلکہ وہ موحد رہے گا اور مصیبت

وراحت میں اس کا حال و قال متناقض و متعارض نہ ہوگا۔

## معارف و مسائل

قُلِ اللَّهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ اٰلِیْمًا - صحیح مسلم میں حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز (یعنی تہجد) کو کس چیز سے شروع فرماتے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ آپ جب تہجد کی نماز کو اٹھتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے:-

اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرِیْلَ وَ مِیْکَائِیْلَ وَ اِسْرَافِیْلَ، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ عَلِیْمَ الْغُیْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ، اِهْدِنِیْ لِمَا اخْتَلَفَ فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ کَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِیْمٍ۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے قرآن کریم کی ایک ایسی آیت معلوم ہے کہ اسکو قبولیت دعا

پڑھ کر آدمی جو دعا کرتا ہے قبول ہوتی ہے۔ پھر یہی آیت بتلائی:-

اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ اٰلِیْمًا۔ (قرطبی)

وَبَدَّلَ اَلْهٰفِیْنَ اِلَیْهِ مَا کَمُرٌ یَّکُوْنُوْنَ یَحْتَسِبُوْنَ - حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو پڑھ کر فرمایا کہ ہلاکت پر یا کاروں کے لئے، ہلاکت ہے ریاکاروں کے لئے۔ یہ آیت انھیں سے متعلق ہے جو دنیا میں نیک کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے تھے۔ اور لوگ بھی ان کو نیک سمجھتے تھے وہ خود بھی اس دھوکہ میں تھے کہ یہ اعمال ان کے لئے نجاتِ آخرت کا ذریعہ بنیں گے۔ مگر چونکہ ان میں اخلاص نہیں تھا اسلئے اللہ کے نزدیک ایسے نیک اعمال کا کوئی اجر و ثواب نہیں، اس لئے وہاں اچانک اُن کے گمان کے خلاف عذاب و عتاب ہونے لگے گا۔ (قرطبی)

حضرت ربیع ابن خثیمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے ایک آہ بھری اور اس آیت کی تلاوت فرمائی:-

قُلِ اللَّهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ عَلِیْمَ الْغُیْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ

مشاجرات صحابہ کے متعلق

ایک اہم روایت

بَیْنَ عِبَادِكَ اَلِیْمًا۔ اور فرمایا کہ صحابہ کرام کے باہمی اختلافات کے متعلق جب تمھارے دل میں کوئی کھٹک پیدا ہو تو یہ آیت پڑھ لیا کرو۔ روح المعانی میں اس کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ عظیم الشان تعلیم ادب ہے جسکو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔



قُلْ يٰعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا

کہو میرے بندو میرے جنہوں نے خود زیادتی کی ہے اپنی جان پر اس مت توڑو

مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذَّنُوْبَ جَمِيْعًا ط

اللہ کی مہربانی سے بے شک اللہ بخشتا ہے سب گناہ

اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنْذِرُوْا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْأَلُوْا

وہ جو ہے رہی ہے گناہ معاف کرنے والا مہربان اور جو غور ہو جائے اپنے رب کی طرف اور اس کی

لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِيَكُمْ الْعَذَابُ اَبْ ثُمَّ لَا تَنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾

حکم برداری کرو پہلے اس سے کہ آئے تم پر عذاب پھر کوئی تمہاری مدد کو نہ آئے گا

وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَا اَنْزَلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ

اور چلو بہتر بات پر جو اتری تمہاری طرف تمہارے رب سے پہلے اس سے کہ

اَنْ يَّاتِيَكُمْ الْعَذَابُ اَبْ غَنَّةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

پہنچے تم پر عذاب اچانک اور تم کو خبر نہ ہو

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسِىْ يُّحْسِرُنِىْ عَلٰى مَا قَرَّرْتُ فِىْ جَنۢبِ اللّٰهِ

کہیں کہنے لگے کوئی جحی اے انوس اس بات پر کہ میں کو تارہا اللہ کی طرف سے

وَ اِنْ كُنْتُ لِمِنَ السَّخِرٰىۙ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ

اور میں تو ہنستا ہی رہا یا کہنے لگے کہ اگر اللہ

هٰذَا بَنِىْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حٰیۤنَ تَرٰى

مجھ کو راہ دکھاتا تو میں ہوتا ڈرنے والوں میں یا کہنے لگے جب دیکھے

الْعَذَابُ اَبْ لَوْ اَنَّ لِىْ كَرْۢهًا فَاَكُوْنُ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

عذاب کو کسی طرح مجھ کو پھر جانا ملے تو میں ہو جاؤں نیکی والوں میں

بَلٰى قَدْ جَاۤءَتْكَ اٰیٰتِىْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاَسْتَكْبَرْتَ وَ

کیوں نہیں پہنچ چکے تھے میرے علم پر تو نے ان کو جھٹلایا اور غرور کیا اور

كُنْتُ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرٰى الَّذِيْنَ

تو تھا منکروں میں اور قیامت کے دن تو دیکھے ان کو جو

كَذَّبُوْا عَلٰى اللّٰهِ وَجُوْهُهُمْ مَّسْوُوۡۤةٌ اَلۡیَسٰۤى فِىْ جَهَنَّمَ

جھوٹ بولتے ہیں اللہ پر کہ ان کے منہ بول سیاہ کیا نہیں دوزخ میں ٹھکانا

مَنْۢتَوٰى لِّلۡمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَيُنۢجِی اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا مِمَّا زَيۡرُوۡۤہُمْ

عشر در والوں کا اور بچائے گا اللہ ان کو جو ڈرتے رہے ان کے بچاؤ کی جگہ

## لَا يَمَسُّهُمْ السُّوءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۱﴾

نہ لگے اُن کو بُرائی اور نہ وہ غمگین ہوں -

## خلاصہ تفسیر

آپ (ان سوال کرنے والوں کے جواب میں میری طرف سے) کہہ دیجئے کہ اے میرے بند و پیروں نے (کفر و شرک کر کے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو (اور یہ خیال نہ کرو کہ ایمان لانے کے بعد گزشتہ کفر و شرک پر مداخلہ ہوگا سو یہ بات نہیں بلکہ) بالیقین اللہ تعالیٰ (اسلام کی برکت سے) تمام (گزشتہ) گناہوں کو (گو کفر و شرک ہی کیوں نہ ہو) معاف فرما دیگا واقعی وہ بڑا بخشنے والا، بڑی رحمت کرنے والا ہے اور (چونکہ اس معافی کی شرط اور طریقہ کفر سے توبہ کرنا اور اسلام لانا ہے، اس لئے) تم (کفر سے توبہ کرنے کے لئے) اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور (اسلام قبول کرنے میں) اُس کی فرمانبرداری کرو قبل اس کے کہ (اسلام نہ لانے کی صورت میں) تم پر عذاب (الہی) واقع ہونے لگے (اور) پھر (اُس وقت کسی کی طرف سے) تمہاری کوئی مدد نہ کی جاوے۔ (یعنی جیسا اسلام لانے کی صورت میں سب کفر و شرک معاف ہو جاوے گا، اسی طرح اسلام نہ لانے کی صورت میں اس کفر و شرک پر عذاب ہوگا جس کا کوئی دفعیہ نہیں) اور (جب یہ بات ہے کہ اسلام نہ لانے کا یہ انجام ہے تو) تم (کو چاہیے کہ) اپنے رب کے پاس آئے ہوئے اچھے اچھے حکموں پر چلو۔ اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آپڑے اور تم کو (اس کا) خیال بھی نہ ہو (مراد اس سے عذاب آخرت ہے بقریۃ مابعدہ اور اچانک یا تو اس لئے کہ کیا کہ نفخہ اولیٰ میں سب ارواح مدہ ہوش ہو جاویں گی پھر نفخہ ثانیہ کے بعد ادراک عذاب اچانک ہونے لگے گا اور یا اس لئے کہ جیسا عذاب واقع ہوگا قبل وقوع اسکی حقیقت کا ادراک نہ تھا اور ویسا گمان نہ تھا، گمان کے خلاف واقعہ سامنے آنے کو اچانک سے تعبیر کیا گیا، اور یہ انابت و اسلام و اتباع کا حکم اس لئے دیا جاتا ہے کہ) کبھی (کل قیامت کے روز) کوئی شخص کہنے لگے کہ افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں نے خدا کی جناب میں کی (یعنی اس کی اطاعت میں جو مجھ سے تقصیر ہوئی) اور میں تو احکام خداوندی پر ہنستا ہی رہا یا کوئی یوں کہنے لگے کہ اگر اللہ تعالیٰ (دنیا میں) مجھ کو ہدایت کرتا تو میں بھی پرہیزگاروں میں سے ہوتا (مگر ہدایت ہی محروم رہا اس لئے یہ تمام تر تقصیر و کوتاہی ہوئی جس میں معذور ہوں) یا کوئی عذاب کو دیکھ کر یوں کہنے لگے کہ کاش میرا (دنیا میں) پھر جانا ہو ورنہ پھر میں نیک بندوں میں ہو جاؤں۔ (دوسرے قول میں جو یہ کہا گیا تھا کہ اگر مجھے ہدایت کی جاتی تو میں بھی متقی ہو جاتا۔ آگے اس کے جواب میں فرمایا ہے) ہاں بے شک تیرے پاس میری آیتیں پہنچی تھیں، سو تو نے اُن کو جھٹلایا اور (جھٹلانا کسی مشبہ سے نہ تھا بلکہ) تو نے تکبر کیا اور (یہ بھی نہ ہوا کہ دوسرے وقت



وساخ درست ہو جاتا بلکہ کافروں میں ہمیشہ شامل رہا اور اس لئے تیرا یہ کہنا غلط ہے کہ مجھے ہدایت نہیں پہنچی (اور آگے مصر علی الکفر و تائب عن الکفر کی سزا و جزا کا مختصر ذکر فرماتے ہیں کہ اے پیغمبر! آپ قیامت کے روز ان لوگوں کے چہرے سیاہ دیکھیں گے۔ جنہوں نے خدا پر جھوٹ بولا تھا۔) اس میں دو امر آگئے جو بات خدا نے نہیں کہی مثل شرک وغیرہ اس کو یہ کہنا کہ خدا نے کہی ہے اور جو بات خدا نے کہی ہے جیسے قرآن اس کو یہ کہنا کہ خدا نے نہیں کہی ہے، کیا ان متکبرین کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے۔ (جو کہ عناداً و استکباراً تکذیب کریں) اور جو لوگ (شرک و کفر سے) بچتے تھے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کامیابی کے ساتھ (جہنم سے) نجات دے گا ان کو (ذرا) تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ عملیں ہونگے (کیونکہ جنت میں عزم نہیں ہے)۔

## معارف و مسائل

قُلْ يُعْبَادِي الَّذِينَ آمَنُوا آلَیْہِ۔ سعید بن جبیر رحمہ حضرت ابن عباس رضی سے روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے قتل ناحق کئے اور بہت کئے اور زنا کا ارتکاب کیا اور بہت کیا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ جس دین کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں وہ ہے تو بہت اچھا لیکن نیک ہے کہ جب ہم اتنے بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کر چکے اب اگر مسلمان بھی ہو گئے تو کیا ہماری توبہ قبول ہو سکے گی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مذکورہ نازل فرمائی۔ (ذکرہ البخاری بمعناہ - قرطبی) اس لئے خلاصہ آیت کے مضمون کا یہ ہوا کہ مرنے سے پہلے پہلے ہر بڑے سے بڑے گناہ یہاں تک کہ کفر و شرک سے بھی جو توبہ کر لے قبول ہو جاتی ہے۔ اور سچی توبہ سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کسی کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی نے فرمایا کہ یہ آیت گناہگاروں کے لئے قرآن کی سب آیتوں سے زیادہ امید افزا ہے۔ مگر حضرت ابن عباس رضی نے فرمایا کہ سب سے زیادہ رجاء و امید کی یہ آیت ہے: اِنَّ سَابِقَ الَّذِیْذِ مَعْصِرَاتِ لِلنَّاسِ عَلٰی طُلُوْبِهِمْ۔

وَاتَّبَعُوا الْاَحْسَنَ مَّا اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ۔ اَحْسَنَ مَّا اُنْزِلَ سے مراد قرآن ہے اور پورا قرآن احسن ہی ہے اور قرآن کو احسن مَّا اُنْزِلَ اس اعتبار سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ جتنی کتابیں تورات انجیل، زبور، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں۔ ان سب میں احسن و اکمل قرآن ہے۔ (قرطبی) اَنْ تَقُولَ نَفْسٌ لِیَحْسَبَنَّ اَنْیَیْ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ تِلْکَ۔ کی تین آیتوں میں اُسی مضمون کی تشریح و تاکید ہے، جو اس سے پہلے کی تین آیتوں میں بیان فرمایا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے مجرم کافر

فاجر کو بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے اگر وہ توبہ کر لے گا تو اللہ اس کے سب پہلے گناہ معاف فرمادے گا۔ اَنْ تَقُولَ نَفْسُ سے تین آیتوں میں یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ یہاں تک کفر و شرک کو بھی توبہ سے معاف فرمادیتا ہے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ توبہ کا وقت مرنے سے پہلے پہلے ہے، مرنے کے بعد قیامت کے روز کوئی توبہ کرے یا اپنے کئے پر حسرت کرے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

جیسا کہ بعض کفار فجار قیامت کے روز مختلف تمنائیں کریں گے۔ کوئی تو اظہار حسرت کرے گا کہ افسوس میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کوتاہی کیوں کی تھی۔ کوئی سوہاں بھی اپنا الزام تقدیر پر ڈال کر بچنا چاہے گا وہ کہے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت کر دیتا تو میں بھی متقیوں میں داخل ہوتا، مگر خدا نے ہی ہدایت نہ کی تو میں کیا کروں۔ کوئی یہ تمنا کرے گا کہ کاش مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو میں سچا پکا مسلمان بنوں، اور اللہ کے احکام کی پوری اطاعت کروں۔ مگر اس وقت کی یہ حسرتیں اور تمنائیں کسی کے کام نہ آئیں گی۔

یہ تین قسم کی تمنائیں ہو سکتا ہے کہ مختلف لوگوں کی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تینوں تمنائیں یکے بعد دیگرے ایک ہی جماعت کے کفار کی طرف سے ہوں، کیونکہ آخری قول جس میں دوبارہ دنیا میں آنے کی تمنا ہے اس کے ساتھ آیت میں مذکور ہے کہ وہ عذاب کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہوگا۔ اس سے لفظ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دونوں قول مشاہدہ عذاب سے پہلے کے ہیں کہ قیامت کے روز اول ہی اپنے عمل کی تقصیرات کو یاد کر کے کہیں گے، یَحْسَرُ عَلَى مَا فَرَّطَ فِي غَيْبٍ اللہ پھر عذر اور بہانے کے طور پر کہیں گے کہ ہم تو معذور تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہدایت کر دیتا تو ہم بھی مطیع و فرمانبردار اور متقی بن جاتے۔ مگر جب اس نے ہدایت ہی نہ کی تو ہمارا کیا قصور ہے، پھر جب عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو یہ تمنا ہوگی کہ کاش دنیا میں دوبارہ بھیج دیے جاویں۔ حق تعالیٰ نے ان تینوں آیتوں میں بتلادیا کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت بہت وسیع ہے، مگر وہ جمعی ہائل ہو سکتی ہے کہ مرنے سے پہلے توبہ کر لو۔ اس لئے ہم ابھی بتلائے دیتے ہیں ایسا نہ ہو کہ تم مرنے کے بعد پھپھو اور آخرت میں اس طرح کی فحشول حسرت و تمنائیں مبتلا ہو۔

بَلَىٰ قَدْ جَاءَكَ ذٰلِكَ اٰیٰتِیْ فَکَذَّبْتٰ بِهَا۔ اس آیت میں کفار کی اس بات کا جواب ہے کہ اگر اللہ ہدایت کر دیتا تو ہم متقی ہو جاتے۔ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ نے پوری ہدایت کر دی تھی اپنی کتاب میں اور آیتیں بھی تھیں۔ اس لئے ان کا یہ کہنا غلط اور لغو ہے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت نہیں کی۔ ہاں ہدایت کرنے کے بعد نیکی اور اطاعت پر اللہ نے کسی کو مجبور نہیں کیا۔ بلکہ بندہ کو یہ اختیار دیدیا کہ وہ جس راستے حق یا باطل کو اختیار کرنا چاہے کسی بھی بندہ کا امتحان تھا، اس پر اس کی کامیابی یا ناکامی موقوف تھی جس نے اپنے اختیار سے مگر اسی کا راستہ اختیار کر لیا وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔



اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۝۶۲ لَهُ مَقَالِيدُ

اللہ بنانے والا ہے ہر چیز کا اور وہ ہر چیز کا ذمہ لیتا ہے اس کے پاس ہیں

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا آيَاتِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ

کنجیاں آسمانوں کی اور زمین کی اور جو منکر ہوئے ہیں اللہ کی باتوں سے وہ لوگ جو ہیں

هُمْ الْخَسِرُونَ ۝۶۳ قُلْ أَغْيَرُ اللَّهُ تَأْمُرُونِي أَعْبُدُ أَيُّهَا

وہی ہیں ٹوٹے میں پرے تو کہہ اب اللہ کے سوائے کس کو بتلاتے ہو کہ پوجوں اے

الْجَاهِلُونَ ۝۶۴ وَلَقَدْ أَوْحَىٰ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ

نادانو اور حکم ہو چکا ہے تجھ کو اور تجھ سے انہوں کو

لَيْسَ أَشْرَاكَتَ لِيَحْبِطَنَّ عَمَلُكَ وَلِتَكُونَنَّ مِنَ الْخَيْرِينَ ۝۶۵

کہ اگر تو نے شریک مان لیا تو اکارت جائیں گے تیرے عمل اور تو ہوگا ٹوٹے میں بڑا

بَلِ اللَّهُ فَاَعْبُدْ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝۶۶ وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ

نہیں بلکہ اللہ ہی کو پوج اور رہ حق ماننے والوں میں اور نہیں سمجھے اللہ کو

حَقَّ قَدْرًا قَدَرُوا قَدْرَهُ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ

جتنا کچھ وہ ہے اور زمین ساری ایک مٹھی ہے اسکی دن قیامت کے

وَالسَّمَوَاتُ مَطْوِيَّتٌ بِيَمِينِهِ ط سُبْحَنَهُ وَتَعَالَىٰ

اور آسمان پئے ہوئے ہوں اسکے داہنے ہاتھ میں وہ پاک ہے اور بہت ادا ہے

عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝۶۷

اُس سے کہ شریک بتلاتے ہیں -

## خلاصہ تفسیر

اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے، اُسی کے اختیار میں کنجیاں ہیں آسمان و زمین کی۔ یعنی ان سب چیزوں کا موجد و خالق بھی وہی ہے اور ان کو باقی رکھنے والا، حفاظت کرنے والا بھی وہی ہے، جو مفہوم ہے لفظ وکیل کا۔ اور ان سب مخلوقات میں تصرفات و انقلابات بھی اسی کا کام ہے یہ مفہوم ہے کہ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ کا۔ کیونکہ جس کے ہاتھ میں خزانوں کی کنجیاں ہوتی ہیں، وہ ہی عادتاً ان میں تصرفات کا مالک ہوتا ہے۔ اور جب ساری کائنات کا خالق بھی بلا شرکتِ غیرے وہی ہے، محافظ بھی وہی ہے، مالک تصرفات کا بھی وہی ہے تو عبادت بھی صرف اسی کی

ہونا چاہیے اور ستر اور جزا کا مالک بھی وہی ہونا چاہیے جو خلاصہ ہے توحید کا۔ اور چونکہ ان سب مقدمات کو یہ مشرکین بھی تسلیم کرتے تھے تو ان پر لازم تھا کہ عقیدہ توحید کو بھی تسلیم کریں، اس لئے فرمایا (جو لوگ اس پر بھی) اللہ کی آیتوں کو (جو توحید اور جزا و سزا کے مضمون پر مشتمل ہیں) نہیں مانتے وہ بڑے خسارے میں رہیں گے (اور یہ لوگ خود تو کفر و شرک میں ملوث تھے ہی اب ان کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ آپ کو کبھی اپنے طریقہ پر لانے کے لئے فرمائش کرتے ہیں سو) آپ کہہ دیجئے کہ اے جاہلو، (مذکورہ دلائل سے توحید کا مکمل ثبوت اور کفر و شرک کا ابطال ہو جانے کے بعد) پھر بھی تم مجھ کو غیر اللہ کی عبادت کرنے کے لئے کہتے ہو (اور آپ سے کفر و شرک کا صادر ہونا کیسے ممکن ہے جبکہ) آپ کی طرف بھی اور جو پیغمبر آپ سے پہلے ہو گئے رہے ہیں ان کی طرف بھی یہ وحی بھیجا جا چکی ہے کہ (ہر امتی کو پہنچا دیں) کہ اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کیا کرایا کام سب غارت ہو جاوے گا۔ اور تو خسارہ میں پڑے گا۔ (اس لئے تو کبھی شرک کے پاس نہ جانا، بلکہ اللہ ہی کی عبادت کرنا اور (اُسی کا) شکر گزار رہنا) اور جب انبیاء علیہم السلام کو جن میں آپ بھی داخل ہیں توحید کا حق ہونا اور کفر و شرک کا باطل ہونا بذریعہ وحی ثابت ہو چکا اور وہ اس پر مامور کئے گئے کہ دوسروں کو بھی اس عقیدے کی ہدایت کریں تو ان مشرکین کا آپ سے کفر و شرک کی توقع رکھنا بجز حماقت کے اور کیا ہو سکتا ہے (اور (انسوس ہے کہ) ان لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی عظمت و قدر نہ پہچانی جیسا کہ پہچانا چاہیے تھا، حالانکہ ساری زمین اُسی کی مٹھی میں ہو گئی تھی اُس کے دن اور تمام آسمان لیے ہوئے ہوں گے اُس کے داہنے ہاتھ میں، وہ پاک اور برتر ہے ان کے شرک سے۔

## معارف و مسائل

لَهُ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ - مَقَالِيدُ جمع مقلد یا مقلید کی ہے جو قفل کی کنجی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا در اہل یہ لفظ فارسی زبان سے معرب کیا گیا ہے۔ فارسی میں کنجی کو کلید کہتے ہیں۔ معرب کر کے اس کو اقلید بنایا گیا پھر اس کی جمع مقالید لانی گئی (روح) کنجیوں کا کسی کے ہاتھ ہونا اس کے مالک و متصرف ہونے کی علامت ہے، اس لئے مراد آیت کی یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو خزانے نعمتوں کے مستور ہیں، ان سب کی کنجیاں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں وہی ان کا محافظ اور وہی متصرف ہے کہ جب چاہے جس کو چاہے جس قدر چاہے اور جس کو چاہے نہ دے۔

اور بعض روایات حدیث میں کلمہ سوم یعنی سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ کو مقالید السموات والارض فرمایا ہے۔



اس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص صبح و شام یہ کلمہ پڑھتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کے خزانوں کی نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ ان روایات کو ابن جوزی نے موضوع کہہ دیا ہے، مگر دوسرے محدثین نے احادیث ضعیفہ قرار دیا ہے جن کا فضائل اعمال میں اختیار کیا جاسکتا ہے۔ (روح المعانی)

وَالْأَرْضُ مِنْ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَالسَّمَاوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِلَيْمٍ يَوْمَ ذَلِكَ قِيَامَتُكَ رُوزِ  
زمین کا اللہ تعالیٰ کی سمٹھی میں ہونا اور آسمانوں کا لپیٹ کر اس کے واسطے ہاتھ میں ہونا اسلاف متقدمین  
کے نزدیک اپنے حقیقی معنوں میں ہیں۔ مگر مضمون آیت متشابہات میں سے ہے جس کی حقیقت بحسب  
خدائے تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔ عام لوگوں کو اس کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش بھی ممنوع ہے  
بس اس پر ایمان لانا ہے کہ جو کچھ اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق اور صحیح ہے۔ اور چونکہ اس  
آیت کے ظاہری الفاظ سے اللہ تعالیٰ کے لئے سمٹھی اور واسطے ہاتھ کا ہونا معلوم ہوتا ہے جو اعضاء  
جو ارج جسمانی ہیں اور اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانیات سے پاک ہے، اس کی طرف آیت کے خاتمہ میں اشارہ کر دیا کہ ان  
الفاظ کو اپنے اعضاء پر قیاس مت کر، اللہ تعالیٰ ان سے پاک ہے سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ۔

اور علماء متاخرین نے اس آیت کو ایک تمثیل و مجاز قرار دے کر یہ معنی بیان کئے کہ کسی چیز کا سمٹھی میں ہونا  
اور واسطے ہاتھ میں لکنا یہ ہوتا ہے اس پر پوری طرح قبضہ و قدرت سے یہی مکمل قبضہ و قدرت مراد ہے۔  
واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ

اور پھونکا جائے صور میں پھر ہوش چو جائے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور زمین میں

إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ

مگر جس کو اللہ چاہے پھر بھونکی جائے دوسری بار تو فوراً وہ کھڑے ہو جائیں

يَنْظُرُونَ ۝ ٦٨ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ

ہر طرف دیکھتے اور چمکے زمین اپنے رب کے نور سے اور لادھریں

الْكِتَابُ وَجَاءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءُ وَقُضِيَ بَيْنَهُمُ

دستور اور حاضر آئیں پیغمبر اور گواہ اور فیصلہ ہو ان میں

بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ ٦٩ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ

انصاف سے اور ان پر ظلم نہ ہوگا اور پورا ملے ہر جی کو جو اس نے کیا

وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَا فَعَلُوا ۝ ٧٠ وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ

اور اس کو خوب خبر ہے جو کچھ کرتے ہیں۔ اور ان کے جائیں جو منکر تھے دوزخ کی

جَهَنَّمَ زُرَّاءً ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَجَاءُوهَا فَتَحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ

طرف گردہ گردہ یہاں تک کہ جب پہنچ جائیں اس پر کھولے جائیں اُسکے دروازے اور کہنے لگیں اُنکو

خُزِّنَتْهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمُ

اس کے داروے کیا نہ پہنچتے تمہارے پاس رسول تم میں کے پڑھتے تھے تم پر باتیں تمہارے رب کی

وَيُنذِرُوكُم لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِن حَقَّتْ

اور ڈراتے تم کو اس تمہارے دن کی ملاقات سے بولیں کیوں نہیں پتر ثابت ہوا

كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ ۖ ۚ قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ

حکم عذاب کا منکروں پر حکم ہووے کہ داخل ہو جاؤ دروازوں میں

جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فِي شَأْنِ الْمُتَكَبِّرِينَ ۚ ۛ

دوزخ کے سدا رہنے کو اُس میں سو کیا بُری جگہ رہنے کی غرور والوں کو

وَسَيُقَالُ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا اِرْجِعْهُم إِلَى الْجَنَّةِ زُرَّاءً حَتَّىٰ

اور ہانکے جائیں وہ لوگ جو ڈرتے رہے تھے اپنے رب سے جنت کو گردہ گردہ یہاں تک کہ جب

إِذَا أَجَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خُزِّنَتْهَا

پہنچ جائیں اس پر اور کھولے جائیں اُسکے دروازے اور کہنے لگیں ان کو داروے اُس کے

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طَبَّئْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ۚ ۛ وَقَالُوا

سلام پہنچے تم پر تم لوگ پاکیزہ ہو سو داخل ہو جاؤ اس میں سدا رہنے کو اور وہ بولیں

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقْنَا وَعَدَهُ ۖ وَأَوْثَقَانَا الْأَرْضِ ۖ

شکر ہے اللہ کا جس نے سچا کیا ہم سے اپنا وعدہ اور دارث کیا ہم کو اس زمین کا

نَتَّبِعُ أُمِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۖ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَمِلِينَ ۚ ۛ

گھر لے یوں بہشت میں سے جہاں چاہیں سو کیا خوب بدلہ ہے محنت کرنے والوں کا

وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِئِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ

اور تو دیکھے فرشتوں کو گھر رہے ہیں عرش کے گرد پاکی بولتے ہیں اپنے

بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ

رب کی خوبیاں اور فیصلہ ہوتا ہے ان میں انصاف کا اور یہی بات کہتے ہیں کہ سب خوبی ہے

لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۚ ۛ

اللہ کو جو رب ہے سارے جہان کا -

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ



## خلاصہ تفسیر

اور (قیامت کے روز جس کا اوپر ذکر آیا ہے) صور میں پھونک ماری جاوے گی جس سے تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش ارجاویں گے (پھر زندہ تو مری جاویں گے اور مردوں کی رُوہیں بھوش ہو جاویں گی) مگر جس کو خدا چاہے (وہ اس بے ہوشی اور موت سے محفوظ رہے گا) پھر اُس (صور) میں دوبارہ پھونک ماری جاوے گی تو دفعۃً سب کے سب (ہوش میں آکر اُدراج کا تعلق ابدان سے ہو کر قبروں سے نکل) کھڑے ہو جائیں گے۔ (اور چاروں طرف دیکھنے لگیں گے) (جیسا کہ حادثہ غریبہ کے وقوع کے وقت عادت طبعی ہے) اور (پھر حق تعالیٰ حساب کے لئے زمین پر اپنی شان کے مناسب نزول و تجلی فرما دیں گے اور) زمین اپنے رب کے نور (بے کیف) سے روشن ہو جاوے گی اور (سب کا) نامہ اعمال (ہر ایک کے سامنے) رکھ دیا جاوے گا۔ اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جاویں گے (گواہ کا مفہوم عام ہے جس میں پیغمبر بھی داخل ہیں اور فرشتے بھی اور اُمتِ محمدیہ بھی اور اعضاء و جوارح بھی، جس کی تفصیل آگے معارف کے ضمن میں آتی ہے) اور سب (مکلفین) میں (حسب اعمال) ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جاوے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا (کہ کوئی نیک عمل جو بشرائط واقع ہوا ہو چھپا لیا جائے یا کوئی بد عمل بڑھا دیا جاوے) اور ہر شخص کو اُس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جاوے گا (اعمال نیک میں بدلہ کے پورا ہونے سے مقصود کمی کی نفی ہے اور اعمال بد میں پورا ہونے سے مقصود زیادتی کی نفی ہے) اور وہ سب کے کاموں کو خوب جانتا ہے (پس اُس کو ہر ایک کے موافق جزا دیدینا کچھ مشکل نہیں) اور (بیان اُس بدلہ کا جو نتیجہ فیصلہ کا ہے یہ ہے کہ) جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گمراہ ہو کر رہیں گے (دھکے دے کر ذلت و خواری کے ساتھ) ہانکے جاویں گے (گمراہ گمراہ اس لئے کہ اقسام و مراتب کفر کے جدا جدا ہیں۔ پس ایک ایک طرح کے کفار کا ایک ایک گمراہ ہوگا) یہاں تک کہ جب دوزخ کے پاس پہنچیں گے تو (اُس وقت) اُس کے دروازے کھول دیئے جاویں گے اور ان سے دوزخ کے محافظ (فرشتے بطور ملامت کے) کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی لوگوں سے (جن سے استفادہ تمہارے لئے مشکل نہ تھا) پیغمبر نہ آئے تھے جو تم کو تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سنا کر تے تھے اور تم کو تمہارے اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے وہ کافر کہیں گے کہ ہاں (رسول بھی آئے تھے اور انھوں نے ڈرایا بھی) لیکن عذاب کا وعدہ کافروں پر (جن میں ہم بھی داخل ہیں) پورا ہو کر رہا (یہ اعتذار نہیں بلکہ اعتراف ہے کہ باوجود ابلاغ کے ہم نے کفر کیا اور کافروں کے لئے جو عذاب موعود تھا وہ ہمارے سامنے آیا واقعی ہم مجرم ہیں، پھر ان سے کہا جاوے گا (یعنی وہ فرشتے کہیں گے) کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو (اور) ہمیشہ اس میں رہا کرو غرض (خدا کے احکام)

کبر کرنے والوں کا ہر اٹھکانہ ہے (پھر اس کے بعد وہ جہنم میں داخل کئے جاویں گے اور دروازے بند کر دئے جاویں گے۔ کما قال تعالیٰ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤَقَّتٌ لِّذَٰلِكَ كَفَّارًا لِّمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ اور جو لوگ کعبہ سے ڈرتے تھے۔ جس کا ابتدائی مرتبہ ایمان ہے پھر آگے اس کے مختلف درجات ہیں) وہ گروہ گروہ ہو کر (کہ جس مرتبہ کا تقدس ہوگا اس مرتبہ کے متقی ایک جگہ کر دئے جاویں گے اور) جنت کی طرف (شوق دلا کر جلدی) روانہ کئے جاویں گے یہاں تک کہ جب اُس (جنت) کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے (پہلے سے) کھلے ہوئے ہوں گے (تاکہ ذرا بھی دیر نہ لگے اور نیز اہل اکرام کے لئے ایسا ہی ہوتا ہے جیسا مہمان کے لئے عادت ہے کہ پہلے سے دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ کما قال تعالیٰ مُّفْتَحُهَا لَهُمْ وَالْجَوَابُ) اور دروازوں کے محافظ (فرشتے) ان سے (بطور اکرام و تہنیک) کہیں گے کہ السلام علیکم تم مرزہ میں رہو سو اس (جنت) میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ (اس وقت اس میں داخل ہو جاویں گے) اور داخل ہو کر (کہیں گے کہ اللہ کا) لاکھ لاکھ (شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں) (یعنی ہر شخص کو خوب فراغت کی جگہ ملی ہے خوب کھل کھیل کر چلیں پھریں بیٹھیں اٹھیں قیام کے طور پر تو ابی ہی جگہ میں اور سیر کے طور پر دوسرے جنتی کے درجہ میں بھی) غرض (تیک) عمل کرنے والوں کا اچھا بدلہ ہے (یہ حمید خود اہل جنت کا ہو یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو دونوں امکان ہیں) اور آگے اجلاسِ اخیر فیصلہ تک اسی مضمون کو مختصر اور پر شوکت الفاظ میں بطور تلخیص کے فرماتے ہیں کہ) آپ فرشتوں کو دیکھیں گے کہ (نزول اجلاسِ الحساب کے وقت عرش کے گرد اگر حلقہ باندھے ہوں گے) (اور) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہوں گے اور تمام بندوں میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جاوے گا اور (اس فیصلہ کے ٹھیک ہونے پر ہر طرف سے جوش کے ساتھ یہی خروش ہوگا اور) کہا جاوے گا کہ ساری خوبیاں خدا کو زیبا ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے (جس نے ایسا عمدہ فیصلہ کیا پھر اس نعرہ تحسین پر دریا برخواست ہو جاوے گا)۔

## معارف و مسائل

فَصَبِّحْ مَوْجِ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَوْجِ فِي الْاَرْضِ اِيَّاكَ شَاءَ اللّٰهُ۔ صَبِّحْ کے لفظی معنی سپہوش

ہونے کے ہیں اور مراد یہ ہے کہ اول سپہوش ہو جائیں گے پھر سب مرجائیں گے اور جو پہلے مرجھے ہیں انکی روئیں سپہوش ہو جائیں گی۔ (کما فی بیان القرآن من سورۃ النمل و عند ابن کثیر مشملہ)

اِيَّاكَ شَاءَ اللّٰهُ۔ میں در منشور کی روایات کے مطابق چار فرشتے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل



اور ملک الموت ہیں اور بعض روایات میں حملہ العرش بھی اس میں داخل ہیں۔ ان کے استثناء کا مطلب یہ ہے کہ نفعِ صورت کے اثر سے ان کو موت نہیں آئے گی مگر اس کے بعد ان کو بھی موت آجائے گی اور سوائے ایک ذات حق سبحانہ تعالیٰ کے کوئی اس وقت زندہ نہیں رہے گا۔ ابن کثیر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ ان سب میں بھی سب سے آخر میں ملک الموت کو موت آوریگی۔ سورہ تہ میں بھی ایک آیت اسی کی مثل گذری ہے اُس میں صَبَحَ کے بجائے فَرَجَ کا لفظ آیا ہے وہاں بھی اس کی کچھ تفصیل گذری ہے۔

وَجَاءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ - مراد یہ ہے کہ میدانِ حشر میں حساب و کتاب کے وقت سب انبیاء بھی موجود ہوں گے اور دوسرے سب گواہ بھی حاضر ہوں گے۔ ان گواہوں میں خود انبیاء علیہم السلام بھی ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ - اور فرشتے بھی گواہوں میں ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ۔ کہ اس میں سَائِقٌ اور شہید سے مراد فرشتے ہوتا (تفسیر درمنثور) سورہ ق میں مذکور ہے اور ان گواہوں میں اُمتِ محمدیہ بھی ہوگی جیسا کہ قرآن کریم میں ہے لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ اور ان گواہوں میں خود انسان کے اعضاء و جوارح بھی ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے تَكَلِّمُنَا يَدِيَهُمْ وَكَشَفْنَا عَنْهُ غُلُوفَهُمْ۔

فَتَبَوَّأُوا مِنَ الْجَنَّةِ مَهْدًا نَّشَاءُ - مطلب یہ ہے کہ اہل جنت کے لئے اپنے اپنے مکانات محللات اور باغات تو ہونگے ہی، ان کو یہ اختیار بھی دیا جائے گا کہ دوسرے اہل جنت کے پاس ملاقات و تفریح کے لئے جایا کریں بطرانی۔ ابونعیم اور ضیاء نے سند حسن کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک حدیث نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ مجھے آپ اتنی محبت ہے کہ اپنے گھر بھی جاتا ہوں تو آپ بھی یاد کرتا رہتا ہوں اور جب تک پھر حاضر خدمت نہ ہو جاؤں مجھے صبر نہیں آتا مگر جب میں اپنی موت کو یاد کرتا ہوں اور آپ کی وفات کو یاد کرتا ہوں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ تو جنت میں انبیاء کے مقامات عالیہ میں ہوں گے اور میں اگر جنت میں پہنچ بھی گیا تو کسی نیچے کے درجے میں ہونگا مجھے فکر یہ ہے کہ میں آپ کو کیسے دیکھوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات سن کر کچھ جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ جبریل امین یہ آیت لیکر نازل ہوئے۔ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا اس آیت میں بتلادیا کہ اللہ و رسول کی اطاعت کرنے والے مسلمان انبیاء و صدیقین وغیرہ کے ساتھ ہی ہوں گے۔ اور آیت مذکورہ میں اسکی تشریح ہوگئی کہ ان کو مقامات عالیہ میں بھی جانے کی اجازت ہوگی۔ المحضنا اللہ تعالیٰ اہم بمنہ و کریمہ۔

# سُورَةُ الْمُؤْمِنِ

سُورَةُ الْمُؤْمِنِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسٌ وَثَمَانُونَ آيَةً وَتَسْعُ رُكُوعَاتٍ

سورۃ مؤمن مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پچاسی آیتیں ہیں اور نو رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مشروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

أَحْمَدُ ① تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ② غَافِرٌ

آمارنا کتاب کا اللہ سے ہے جو بے حد رحمت ہے خبردار گناہ

الذَّنْبِ وَقَابِلُ التَّوْبِ شَدِيدُ الْعِقَابِ ③ ذِي الطَّلُوفِ ④

بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا سخت عذاب دینے والا مقتدر و والا

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ⑤ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ ⑥ مَا يُجَادِلُ فِي آيَاتِ اللَّهِ

کسی کی بتدقی نہیں سوائے اس کے اسی کی طرف پھر جانا ہے وہی جھگڑاتے ہیں اللہ کی باتوں میں

إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا أَفَلَا يَغْدِرُونَ ⑦ تَقْلِبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ⑧

جو مستکبر ہیں سر جھک کر دھوکانہ دے یہ بات کہ وہ چلتے پھرتے ہیں شہروں میں

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ ⑨

جھٹلا چکے ہیں ان سے پہلے قوم نوح کی اور کتنے فرقے ان سے پہلے

وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوا وَجْهَهُمْ ⑩

اور ارادہ کیا ہر امت نے اپنے رسول پر کہ اس کو پکڑ لیں اور لالچ لے

بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتَهُمْ ⑪ فَكَيْفَ

جھوٹے جھگڑے کہ اس سے دھکا دیں سچے دین کو پھر میں نے ان کو پکڑ لیا (کہو) پھر کیسا ہوا



كَانَ عِقَابٍ ۝ وَكَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ

میرا سزا دینا اور اسی طرح ٹھیک ہوئی بات تیرے رب کی مستکروں پر

كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ

کہ یہ ہیں دوزخ والے جو لوگ اٹھا رہے ہیں عرش کو

وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ

اور جو اس کے گرد ہیں پاکی بولتے ہیں اپنے رب کی خوبیاں اور اس پر یقین رکھتے ہیں

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ

اور گناہ بخشواتے ہیں ایمان والوں کے اے پروردگار ہمارے ہر چیز سمائی ہوئی ہے

رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا

تیری بخشش اور حشر میں سوغات کر ان کو جو توبہ کریں اور چلیں تیری

سَبِيلِكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۖ رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ

راہ پر اور بچا ان کو آگ کے عذاب سے اے رب ہمارے اور داخل کر ان کو

جَنَّاتٍ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدُ تُهُمْ وَمِنْ صَلَاحٍ مِنْ آبَائِهِمْ

سوائے کے باغوں میں جن کا وعدہ کیا تو نے ان سے اور جو کوئی نیک ہو ان کے باپوں میں

وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

اور عورتوں میں اور اولاد میں بے شک تو ہی ہے زبردست حکمت والا

وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ ۖ وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ

اور بچا ان کو برائیوں سے اور جس کو تو بچائے برائیوں سے اُس دن اُس پر

رَّاحِمَتَهُ ۚ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۙ

مہربانی کی تو نے اور جو ہے یہی ہے بڑی مراد پائی

## خلاصہ تفسیر

احمر (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ کتاب اتاری گئی ہے اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے

ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ گناہ بخشے والا ہے اور توبہ کا قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا ہے، قدرت والا ہے اُس کے

سوا کوئی لائق عبادت نہیں اسی کے پاس (سب کو) جانا ہے (پس قرآن مجید اور توحید کی حقیقت کا مقتضایہ ہے

کہ اس میں انکار و جدال نہ کیا جاوے مگر پھر بھی) اللہ تعالیٰ کی ان آیتوں میں (یعنی قرآن میں جو توحید پر

بھی مشتمل ہے) وہی لوگ (ناحق کے) جھگڑے نکالتے ہیں جو (اس کے) منکر ہیں (اور اس انکار کا مقتضایہ ہے کہ ان کو سزا دی جائے، لیکن عاجلا سزا نہ ہونا استدراج یعنی چند روزہ مہلت دینا ہے) سو ان لوگوں کا شہروں میں (امن و امان سے دنیوی کاروبار کے لئے) چلنا پھرنا آپ کو اشتباہ میں نہ ڈالے (کہ اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ اسی طرح سزا و عذاب سے بچے رہیں گے اور آرام سے رہیں گے اور آپ کے اس خطاب سے دوسروں کو سنا تا معقود ہے، غرض ان پر دار و گیر ضرور ہوگی خواہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی یا صرف آخرت میں چنانچہ) ان سے پہلے نوح (علیہ السلام) کی قوم نے اور دوسرے گروہوں نے بھی جو ان کے بعد ہوئے (جیسے عاد و ثمود وغیرہم دین حق کو) جھٹلایا تھا اور ہر اہانت (میں سے جو لوگ ایمان نہ لائے تھے انھوں) نے اپنے پیغمبر کے گرفتار کرنے کا ارادہ کیا (کہ پکڑ کر قتل کر دیں) اور ناحق کے جھگڑے نکالے تاکہ اُس ناحق سے حق کو باطل کر دیں سو میں نے (آخر) اُن پر دار و گیر کی سو (دیکھو) میری طرف سے (ان کو) کیسی سزا ہوئی اور (جس طرح اُن کو دنیا میں سزا ہوئی) اسی طرح تمام کافروں پر آپ کے پروردگار کا یہ قول ثابت ہو چکا ہے کہ وہ لوگ (آخرت میں) دوزخی ہوں گے (یعنی یہاں بھی سزا ہوئی اور وہاں بھی ہوگی) اسی طرح کفر کے سبب ان کفار حاضرین کو بھی دار و گیر اور سزا ہونے والی ہے خواہ دو نازل عالم میں یا آخرت میں۔ یہ تو حال ہے منکرین کا کہ مستحق اہانت و عقوبت ہیں اور جو لوگ موحد اور مؤمن ہیں وہ ایسے مکرم ہیں کہ ملائکہ مقربین ان کے لئے دعا و استغفار کرنے میں مشغول رہتے ہیں جو کہ حسب قاعدہ یَفْعَلُونَ مَا يُؤْمِرُونَ اس کی علامت ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے اس پر مامور ہیں کہ مؤمنین کے لئے استغفار کیا کریں۔ اس سے مؤمنین کا محبوب عند اللہ ہونا ثابت ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ) جو فرشتے کہ عرش (الہی) کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو فرشتے اس کے گرد گرد ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لئے (اس طرح دعاؤں) استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ کی رحمت — (عامہ) اور علم ہر چیز کو شامل ہے (پس اہل ایمان پر بدرجہ اولیٰ رحمت ہوگی اور ان کے ایمان کا آپ کو علم بھی ہے) سو ان لوگوں کو بخشد کیجئے جہنموں نے (شُرک و کفر سے) توبہ کر لی ہے اور آپ کے رستہ پر چلتے ہیں اور اُن کو جہنم کے عذاب سے بچا لیجئے۔ اے ہمارے پروردگار اور (دوزخ سے بچا کر) ان کو ہمیشہ رہنے کی بہشتوں میں جس کا آپ نے اُن سے وعدہ کیا ہے داخل کر دیجئے اور اُن کے ماں باپ اور بیویوں اور اولاد میں جو (جنت کے) لائق (یعنی مؤمن) ہوں (کہ ان مؤمنین کے درجے کے نہ ہوں) ان کو بھی داخل کر دیجئے، بلا شک آپ زبردست حکمت والے ہیں (کہ مغفرت پر قادر ہیں اور ہر ایک کے مناسب اس کو درجہ عطا فرماتے ہیں) اور بخشیاں ان کو دوزخ سے جو کہ عذاب اعظم ہے بچانے کے لئے آپ سے دعا ہے اسی طرح یہ بھی دعا ہے کہ ان کو (قیامت کے دن ہر طرح کی) تکالیف سے بچائیے (گو وہ جہنم



سے خفیف ہوں جیسے میدان قیامت کی پریشانیوں اور آپ جس کو اس دن تکلیف سے بچالیں تو اس پر آپ نے بہت مہربانی فرمائی۔ اور یہ (جو مذکور ہوا مغفرت و حفاظت عذاب اکبر و اصغر سے اور دخول جنت) بڑی کامیابی ہے (پس اپنے مؤمن بندوں کو اس سے محروم نہ رکھیے)۔

## معارف و مسائل

یہاں سے سورۃ احقاف تک سات سورتیں — حکم سے شروع ہوتی ہیں ان کو سورۃ مؤمن کی خصوصیات اور فضائل وغیرہ

آل حکم یا حوامیم کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آل حکم دیباچہ القرآن ہے (دیباچہ ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے زینت ہے)۔ اور مسعر بن کدام فرماتے ہیں کہ ان کو عمرانس کہا جاتا ہے یعنی دلہنیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہر چیز کا ایک مغز اور خلاصہ ہوتا ہے۔ قرآن کا خلاصہ آل حکم ہیں یا فرمایا کہ حوامیم ہیں۔ یہ سب روایتیں امام عالم ابو عبیدہ قاسم بن سلام رحمہ اللہ نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں لکھی ہیں۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اپنے اہل و عیال کی رہائش کے لئے جگہ کی تلاش میں نکلا۔ تو کسی ہرے بھرے میدان کو دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔ اچانک آگے بڑھا تو رؤف و منات یعنی ایسے باغات جن کی زمین میں کھانے کا مادہ سب سے زیادہ ہے ان کو دیکھ کر کہنے لگا میں تو بارش کی پہلی ہی ہرمانی کو دیکھ کر تعجب کر رہا تھا۔ یہ تو اُس سے بھی عجیب تر ہیں تو اُس سے یہ کہا جائے گا کہ پہلی ہرمانی اور سرسبزی کی مثال عام قرآن کی مثال ہے اور رؤف و منات کی مثال قرآن میں سے آل حکم کی مثال ہے۔ اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب میں تلاوت قرآن کرتے ہوئے آل حکم پر آجاتا ہوں تو گویا ان میں میری بڑی تفریح ہوتی ہے۔

اور مسند بزار میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے شروع دن میں آیۃ الکرسی اور سورۃ مؤمن (کی پہلی تین آیتیں حم سے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ الصّٰلِحِیْنَ) پڑھ لیں۔ وہ اس دن ہر برائی اور تکلیف سے محفوظ رہے گا۔ اس کو ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ جس کی سند میں ایک راوی متکلم فیہ ہے۔

(ابن کثیر ص ۶۹ ج ۴)

دشمن سے حفاظت | ابو داؤد ترمذی میں باسناد صحیح حضرت مہلب بن ابی صفرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا کہ مجھ سے ایسے شخص نے روایت کی کہ جس نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علیہ وسلم سے ملنا ہے کہ آپ (کسی جہاد کے موقع پر رات میں حفاظت کے لئے) فرما رہے تھے کہ اگر رات میں تم پر چھاپہ مارا جائے تو تم حِلْمَ لَا تُنْصَوُّوْنَ پڑھ لینا جس کا حامل لفظ حِلْم کے ساتھ یہ دُعا کرنا ہے کہ ہمارا دشمن کامیاب نہ ہو۔ اور بعض روایات میں حِلْمَ لَا تُنْصَوُّوْا بغیر تَوْن کے آیا ہے جس کا حامل یہ ہے کہ جب تم حِلْم کہو گے تو دشمن کامیاب نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حِلْم دشمن سے حفاظت کا قلعہ ہے۔ (ابن کثیر)

حضرت ثابت بنانی رحمہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت مصعب بن زبیر رحمہ کے ساتھ کوفہ میں ایک عجیب واقعہ کے علاقہ میں تھا۔ میں ایک باغ کے اندر چلا گیا کہ دو رکعت پڑھ لوں۔ میں نے نماز سے پہلے لَحْفَ الْمُؤْمِنِ کی آیتیں اَللّٰہِ الْمَہِیْمِ تک پڑھیں، اچانک نے دیکھا کہ ایک شخص میرے پیچھے ایک سفید خچر پر سوار کھڑا ہے جس کے بدن پر مینے کپڑے ہیں۔ اس شخص نے مجھ سے کہا کہ جب تم عَنَّا فِرَی الدَّٰثِمِ کہو تو اس کے ساتھ یہ دُعا کرو، یَا غَافِرُ الدَّٰثِمِ اَعِظْرٰی یعنی اے گناہوں کے معاف کرنے والے مجھے معاف کر دے اور جب تم پڑھو قَابِلِ التَّوْبِ تو یہ دُعا کرو یَا قَابِلِ التَّوْبِ اَقْبَلْ تَوْبَتِی یعنی اے توبہ کے قبول کرنے والے میری توبہ قبول فرما پھر جب پڑھو شَدِیدُ الْعِقَابِ تو یہ دُعا کرو یَا شَدِیدُ الْعِقَابِ لَا اَقْدَحْ یعنی اے سخت عقاب والے مجھے عذاب نہ دیجئے۔ اور جب ذِی الطَّوْلِ پڑھو تو یہ دُعا کرو یَا ذِی الطَّوْلِ مَطْلٍ عَلٰی بَحَائِدٍ یعنی اے انعام و احسان کرنے والے مجھ پر انعام فرما۔

ثابت بنانی رحمہ کہتے ہیں یہ نصیحت اس سے سننے کے بعد جو آدمی دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں اسکی تلاش میں باغ کے دروازے پر آیا۔ لوگوں سے پوچھا کہ ایک ایسا شخص مینے لباس میں یہاں سے گزرا ہے، سب نے کہا کہ ہم نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا۔ ثابت بنانی رحمہ کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لباس علیہ السلام تھے، دوسری روایت میں اس کا ذکر نہیں۔ (ابن کثیر)

ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کی سند سے نقل کیا ہے کہ ایک ان آیات کی تاثیر اصلاحِ خلق میں اور اہل شام میں سے بڑا بارعب قوی آدمی تھا اور فاروق اعظم رحمہ کے پاس آیا کرتا تھا کچھ عرصہ تک وہ نہ آیا تو فاروق اعظم رحمہ نے لوگوں سے اس کا حال پوچھا۔ لوگوں نے کہا کہ امیر المؤمنین اس کا حال نہ پوچھے وہ تو شراب میں بدست رہنے لگا۔ فاروق اعظم رحمہ نے اپنے منشی کو بلایا اور کہا کہ یہ خط لکھو۔

من جانب عمر بن خطاب بنام فلاں بن فلاں - سلام علیک، اس کے بعد میں تمہارے لئے اُمس اللہ کی حمد پیش کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ گناہوں کو معاف کرنے والا، توبہ کو قبول

من عمر بن الخطاب الى فلان بن فلان - سلام عليك فاني احمد الله الذي لا اله الا هو غافر الذنب وقابل التوب شديد العقاب ذي الطول



لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِلَهُ الْمَصِيرُونَ

کہنے والا، سخت عذاب والا، بڑی قدرت والا ہے،  
اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اُسی کی طرف لوٹ کر  
جانا ہے۔

پھر حاضرین مجلس سے کہا کہ سب مل کر اس کے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو پھیر دے  
اور اس کی توبہ قبول فرمائے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جس قاصد کے ہاتھ یہ خط بھیجا تھا اس کو ہدایت کر دی تھی  
کہ یہ خط اس کو اس وقت تک نہ دے جب تک کہ وہ نشہ سے ہوش میں نہ آئے اور کسی دوسرے کے حوالے  
نہ کرے۔ جب اس کے پاس حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ خط پہنچا اور اس نے پڑھا تو بار بار ان کلمات کو پڑھتا  
اور غور کرتا رہا اس میں مجھے سزا سے ڈرایا بھی گیا ہے اور معاف کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ پھر رونے لگا  
اور شراب خوری سے باز آگیا، تو ایسی توبہ کی کہ پھر اس کے پاس نہ گیا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب اس اثر کی خبر ملی تو لوگوں سے فرمایا کہ ایسے معاملات میں تم سب کو ایسا  
ہی کرنا چاہیے کہ جب کوئی بھائی کسی لغزش میں مبتلا ہو جائے تو اس کو درستی پر لانے کی فکر کرو اور اس کو  
اللہ کی رحمت کا بھروسہ دلاؤ اور اللہ سے اس کے لئے دعا کرو کہ وہ توبہ کر لے۔ اور تم اس کے مقابلہ پر شیطان  
کے مددگار نہ بنو۔ یعنی اس کو برا بھلا کہہ کر یا عصبہ دلا کر اور دین سے دور کر دو گے تو یہ شیطان کی مدد ہوگی۔  
(ابن کثیر رحمہ اللہ)

جو لوگ اصلاح خلق اور تبلیغ و دعوت کی خدمت انجام دینے والے ہیں ان کے لئے اس حکایت میں  
تنبیہ ایک عظیم الشان ہدایت ہے کہ جس شخص کی اصلاح مقصود ہو اس کے لئے خود بھی دعا کرو پھر نرم دلی  
سے اس کو درستی کی طرف لاؤ۔ اشتعال انگیزی نہ کرو کہ اس سے اس کو نفع نہیں پہنچے گا بلکہ شیطان کی امداد ہوگی  
اور وہ اس کو اور زیادہ گمراہی میں مبتلا کر دے گا۔ (آگے آیت کی تفسیر دیکھئے)۔

حاصل۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے مگر ائمہ متقدمین کے نزدیک  
یہ حروف مقطعات سب متشابہات میں سے ہیں جن کے معنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے یا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک لازم ہے۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ - غَافِرِ الذَّنْبِ کے لفظی معنی ہیں گناہ پر پردہ ڈالنے والا، اور  
قَابِلِ التَّوْبِ کے معنی توبہ قبول کرنے والا، یہ دو لفظ الگ الگ لئے گئے اگرچہ مفہوم دونوں کا تقریباً ایک  
معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ غَافِرِ الذَّنْبِ میں اشارہ اس طرف کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس پر بھی  
قدرت ہے کہ کسی بندے کا گناہ بغیر توبہ کے بھی معاف کر دے اور توبہ کرنے والوں کو معافی دینا دوسرا  
وصف ہے۔ (مظہری)

ذِي الطَّوْلِ - طَوَّل کے لفظی معنی وسعت و غنا کے ہیں اور قدرت کے معنی میں بھی آتا ہے، فضل

و احسان کے معنی میں بھی۔ (منظہری)

مَا يَجَادِلُ فِي آيَاتِ اللَّهِ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا - اس آیت نے جدال فی القرآن کو کفر قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ جِدَالَ الْفُقَرَاءِ كُفْرٌ یعنی بعض جدال قرآن میں کفر ہوتے ہیں۔ (رواہ البغوی و البیہقی فی الشعب عن ابی ہریرۃ و رواہ ابو داؤد و الحاکم و صحیحہ و مظہری) اور حدیث میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں کی آواز سنی جو کسی آیت قرآن کے متعلق جھگڑا رہے تھے، آپ غضبناک ہو کر یا ہر تشریف لائے کہ آپ کے چہرہ مبارک سے غصہ کے آثار محسوس ہو رہے تھے اور فرمایا کہ تم سے پہلی امتیں اسی سے ہلاک ہوئیں کہ وہ اللہ کی کتاب میں جدال کرنے لگی تھیں (رواہ مسلم عن عبداللہ بن عمرو بن شعیب - مظہری)

یہ جدال جس کو قرآن و حدیث نے کفر قرار دیا اس سے مراد قرآنی آیات پر طعن کرنا اور فضول قسم کے شبہات نکال کر اس میں جھگڑا ڈالنا ہے یا کسی آیت قرآن کے ایسے معنی بیان کرنا جو دوسری آیات قرآن اور نصوص سنت کے خلاف ہوں جو تخریف قرآن کے درجہ میں ہے نہ کہ کسی مبہم یا مجمل کلام کی تحقیق یا مشکل کلام کا حل تلاش کرنا یا کسی آیت سے احکام و مسائل کے استنباط میں باہم بحث و تحقیق کرنا اس میں داخل نہیں بلکہ وہ تو بڑا ثواب ہے۔ (قاضی بیضاوی - قرطبی، مظہری)

وَلَا يَغْرُرُ فِي تَزَكِّيهِمْ فِي الْبِلَادِ - کفار قریش سرحدی میں یمن کا اور گرمی میں ملک شام کا تجارتی سفر کرتے تھے اور حرم بیت اللہ کی خدمت کی وجہ سے ان کا سارے عرب میں احترام تھا۔ اس لئے اپنے سفروں میں محتوظ رہتے اور تجارتی منافع حاصل کرتے تھے۔ اسی سے ان کی مال داری اور ریاست قائم تھی اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے باوجود ان کی یہ صورت قائم رہنا ان کے لئے فخر و غرور کا سبب تھا کہ اگر ہم اللہ کے نزدیک مجرم ہوتے تو یہ نعمتیں سلب ہو جاتیں۔ اس سے کچھ مسلمانوں کو بھی شبہات پیدا ہونے کا امکان تھا، اس لئے اس آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و مصلحت سے ان کو چند روزہ مہلت دے رکھی ہے، اس سے آپ یا مسلمان کسی دھوکہ میں نہ پڑیں۔ چند روزہ مہلت کے بعد ان پر عذاب آنے والا ہے اور یہ ریاست فنا ہوئی ہے جس کی ابتدا غزوہ بدر سے ہوئی اور فتح مکہ تک چھ سال کے اندر اس کا پوری طرح ظہور ہوا۔

الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ - حاملان عرش فرشتے اب چار ہیں اور قیامت کے روز آٹھ ہو جائیں گے اور عرش کے گرد کتنے فرشتے ہیں ان کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے۔ بعض روایات میں ان کی صفوں کی تعداد بتلائی ہے جو لاکھوں تک پہنچتی ہے، ان کو کہہ دینی کہا جاتا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں۔ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ یہ سب مقرب فرشتے مومنین کے لئے خصماً جو گناہوں سے تائب اور شریعت کے متبع ہو جائیں ان کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ یا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کام پر مامور فرمایا ہے یا ان کی فطرت و طبیعت ہی ایسی ہے کہ وہ اللہ کے نیک بندوں کیلئے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی لئے حضرت مطرف بن عبداللہ بن شعیب نے فرمایا کہ اللہ کے بندوں میں مومنین کے خیر خواہ سب زیادہ اللہ کے فرشتے



ہیں۔ انکی دُعاؤں میں کے لئے ایک یہ ہوتی ہو کہ ان کی مغفرت فرما اور عذاب جہنم سے بچا۔ اور ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں داخل فرما۔ اس کے ساتھ یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ وَصْنٌ صَلَاحٌ مِّنْ آبَائِهِمْ وَآَنَافِ جِهَنَّمَ ذُرِّيَّاتِهِمْ۔ یعنی ان کے باپ دادوں اور ان کی بیویوں اور ان کی اولادوں میں سے جن میں صلاحیت مغفرت کی ہو یعنی جن کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے ان کو بھی انہیں لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل فرما۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان تو شرط نجات ہے ایمان کے بعد دوسرے اعمال صالحہ ہیں۔ مسلمان کے متعلقین باپ دادے یا بیوی اور اولاد اگر اس کے درجہ سے نیچے بھی تو اللہ تعالیٰ ان کے اکرام میں کم درجہ کے متعلقین کو بھی جنت میں انہیں کے ساتھ کر دیں گے تاکہ ان کی غرضی و مسرت مکمل ہو جائے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ اَلْحَقُّنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔

حضرت سعید بن جبیرؓ نے فرمایا کہ مومن جب جنت میں جائے گا تو اپنے باپ، بیٹے، بھائی وغیرہ کو بوجھ لگا کر وہ کہاں ہیں اس کو بتلایا جائے گا کہ انہوں نے تمہارے جیسا عمل نہیں کیا (اس لئے وہ یہاں نہیں پہنچ سکے)۔ یہ کہے گا کہ میں نے جو عمل کیا تھا (وہ صرف اپنے لئے نہیں) بلکہ اپنے اور ان کے لئے کیا تھا تو حکم ہو گا ان کو بھی جنت میں داخل کر دو۔ (ابن کثیر)۔

تفسیر مظہری میں اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ موقوف بحکم مرفوع ہے اور اس بارے میں صریح ہے کہ صلاحیت جو اس آیت میں شرط قرار دی گئی ہے اس سے مراد نفس ایمان ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَيُّنَادُوْنَ لَمَقَاتِ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ

جو لوگ منکر ہیں ان کو پکار کر کہیں گے اللہ بیزار ہو تا تھا زیادہ اُس سے۔ جو

مَقَاتِكُمْ اَنْفُسُكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ⑩

تم بیزار ہوئے ہو اپنے جی سے جس وقت تم کو بلا تے تھے یقین لاپنے کو بھرتہ منکر ہو تے تھے

قَالُوْا رَبَّنَا اَمْتَنَّا اِثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اِثْنَتَيْنِ فَاَعْتَرَفْنَا

بولیں گے اے رب ہمارے تو موت دے چکا ہم کو دوبار اور زندہ کی دے چکا دوبار اب ہم قائل ہوئے

بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلَى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ⑪ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهُ

ایسے گناہوں کے پھر اب بھی ہے نکلنے کو کوئی راہ یہ تم پر اس واسطے ہے کہ

اِذَا دَعٰى اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا كُفْرَتُمْ ۚ وَاِنْ يُشْرَكَ بِهِ تَوْعَمُوْا

جب پکارا کسی نے اللہ کو اکیلا تو تم منکر ہوتے اور جب پکارتے اس کے ساتھ شریک کو تو

فَاَلْحَكُمُ اللّٰهُ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ ⑫

تم یقین لائے لگتے اب حکم دہی جو کرے اللہ سب سے اور بڑا

## خلاصہ تفسیر

جو لوگ کافر ہوئے (وہ جب دوزخ میں جا کر اپنے شرک و کفر اختیار کرنے پر حسرت و افسوس کہیں گے اور خود ان کو اپنے سے سخت نفرت ہوگی یہاں تک غصہ کے مارے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھا دیں گے۔ جیسا کہ درمنثور میں حضرت حسن سے روایت ہے۔ اس وقت) ان کو پکارا جاوے گا کہ جیسی تم کو (اس وقت) اپنے سے نفرت ہے، اس سے بڑھ کر خدا کو تم سے نفرت تھی جبکہ تم (دنیا میں) ایمان کی طرف بلائے جاتے تھے پھر (بلائے کے بعد) تم نہیں مانا کرتے تھے (مقصود اس سے ان کی حسرت و ندامت میں اور زیادتی کرنا ہے) وہ لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم جو دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کیا کرتے تھے اب ہم کو اپنی غلطی معلوم ہوگئی۔ چنانچہ دیکھ لیا کہ آپ نے ہم کو دو مرتبہ مردہ رکھا (ایک مرتبہ پیدائش سے پہلے کہ ہم بے جان مادہ کی صورت میں تھے اور دوسری مرتبہ اس عالم میں آنے اور زندہ ہونے کے بعد متعارف موت سے مردہ ہوئے) اور دو مرتبہ زندگی دی (ایک دنیا کی زندگی اور دوسری آخرت کی زندگی۔ یہ چار حالتیں ہیں جن میں سے انکار تو صرف ایک یعنی آخرت کی زندگی کا تھا مگر باقی تین حالتوں کا ذکر اس لئے کر دیا کہ وہ یقینی تھیں اور اس اقرار کا مقصد یہ تھا کہ اب چوتھی قسم بھی پہلی تین کی طرح یقینی ہوگئی) سو ہم اپنی خطاؤں کا (جن میں اصل مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا انکار تھا، باقی سب اسی کی فروع تھیں) اقرار کرتے ہیں تو کیا (یہاں سے) نکلنے کی کوئی صورت ہے (کہ دنیا میں پھر جا کر ان خطاؤں کا تدارک کر لیں۔ جواب میں ارشاد ہوگا کہ تمہارے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی بلکہ ہمیشہ یہیں رہنا ہوگا۔ اور) وہ اس کی یہ ہے کہ جب صرف اللہ کا نام لیا جاتا تھا (یعنی توحید کا ذکر ہوتا تھا) تو تم انکار کیا کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے اس لئے فیصلہ اللہ کا (کیا ہوا) ہے جو عالیشان (اور) بڑے مرتبے والا ہے (یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ کے علو و کبریا کے اعتبار سے یہ جرم عظیم تھا اس لئے فیصلہ میں سزا بھی عظیم ہوئی یعنی دائمی جہنم)۔



هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا

وہی ہے تم کو دکھلاتا اپنی نشانیاں اور اتارتا ہے تمہارے واسطے آسمان سے روزی

وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَنْ يُنِيبُ ۝۱۳ فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ

اور سوج رہی کرے جو رجوع رہتا ہو سر پکارو اللہ کو خالص کر کے اس کے واسطے

الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝۱۴ رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو

بندگی اور بہتر سے برامائیں منکر وہی ہے اونچے درجوں والا مالک

الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

عرش کا اتارتا ہے بھید کی بات اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے

لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝۱۵ يَوْمَ هُمْ بِلِزْوَنٍ لَا يَخْفَى

تاکہ وہ ڈرائے ملاقات کے دن سے جس دن وہ لوگ بھل کھڑے ہونگے چھپی نہ رہے گی

عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ط لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ

اللہ پر ان کی کوئی چیز کس کا راج ہے آس دن اللہ کا ہے جو اکیلا ہے

الْقَهَّارِ ۝۱۶ الْيَوْمَ تُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ط لَا ظَلَمَ

دباؤ والا آج بدل ملے گا ہر جی کو جیسا اس نے کیا بالکل ظلم

الْيَوْمَ ط إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝۱۷ وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ

نہیں آج بیشک اللہ جلد لینے والا ہے حساب اور خبر سنا دے ان کو اس نزدیک

الْأُزْفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَظِيمٍ ط مَا لِلظَّالِمِينَ

آنے والے دن کی جس وقت دل پہنچیں گے گلوں کو تو وہ دبا رہے ہوں گے کوئی نہیں گناہ نگاروں کا

مِنْ حَسَبٍ وَلَا شَفِيعٌ يُطَاعُ ۝۱۸ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ

دوست اور نہ سفارشی کہ جسکی بات مانی جائے وہ جانتا ہے جو رسی کی نگاہ

وَمَا تَخْفَى الصُّدُورُ ۝۱۹ وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ط وَالَّذِينَ

اور جو کچھ چھپا ہوا ہے سینوں میں اور اللہ فیصلہ کرتا ہے انصاف سے اور جن کو

يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ ط إِنَّ اللَّهَ هُوَ

پکارتے ہیں اس کے سوائے نہیں فیصلہ کرتے کچھ بھی بیشک اللہ جو ہے

السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝۲۰ أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا

وہی ہے سنے والا دیکھنے والا کیا وہ پھرے نہیں ملک میں کہ دیکھتے

کَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِنْ قَبْلِهِمْ ط كَانُوا

انجام کیسا ہوا ان کا جو تھے ان سے پہلے وہ تھے

هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَاخَذَهُمُ اللَّهُ

ان سے سخت زور میں اور نشانیوں میں جو چھوڑ گئے زمین میں پھر ان کو پکڑا اللہ نے

بِذُنُوبِهِمْ ط وَمَا كَانَ لَهُمُ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ۝۱۱ ذٰلِكَ

اُن کے گناہوں پر اور نہ ہوا ان کو اللہ سے کوئی بچانے والا یہ اس لئے کہ

بِأَنَّهُمْ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا

ان کے پاس آتے تھے ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر پھر منکر ہو گئے

فَاخَذَهُمُ اللَّهُ ط إِنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝۱۲

تو ان کو پکڑا اللہ نے بیشک وہ زور آور ہے سخت عذاب دینے والا

## خلاصہ تفسیر

وہی ہے جو ہم کو اپنی نشانیاں (قدرت کی) دکھاتا ہے (تاکہ تم ان سے توحید پر استدلال کرو) اور وہی ہے جو آسمان سے تمہارے لئے رزق بھیجتا ہے (یعنی بارش بھیجتا ہے جس سے رزق پیدا ہوتا ہے) یہ بھی نچملہ مذکورہ نشانیوں کے ہے، اور (ان نشانیوں سے) صرف وہی شخص نصیحت قبول کرتا ہے، جو (خدا کی) طرف رجوع (کرنے کا ارادہ) کرتا ہے (کیونکہ ارادہ رجوع سے غور و تامل نصیب ہوتا ہے، اس سے حق تک رسائی ہو جاتی ہے) تو (جب توحید پر دلائل قائم ہیں تو) تم لوگ خدا کو خالص اعتقاد کر کے (یعنی توحید کے ساتھ) پکارو (اور مسلمان ہو جاؤ) گو کافروں کو ناگوار ہو (اس کی پروا نہ کرو کیونکہ) وہ رفیع الدرجات ہے، وہ عرش کا مالک ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے وحی یعنی اپنا حکم بھیجتا ہے تاکہ وہ (صاحب وحی لوگوں کو) اجتماع کے دن (یعنی قیامت کے دن) سے ڈرائے جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے آمو جو دیوں گے (کہ) اُن کی بات خدا سے مخفی نہ رہے گی آج کے روز کس کی حکومت ہوگی، بس اللہ ہی کی ہوگی جو مکیا (اور) غالب ہے آج ہر شخص کو اُس کے کئے (ہوئے کاموں) کا بدلہ دیا جاوے گا، آج (کسی پر) کچھ ظلم نہ ہوگا اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے اور (اس لئے) آپ ایک قریب آنے والی مصیبت کے دن (یعنی روز قیامت) سے ڈرائیے جس وقت کیلئے منہ کو آجاویں گے (غم سے) گھٹ گھٹ جاوینگے (اس روز) ظالموں (یعنی کافروں) کا نہ کوئی مددگار اور نہ کوئی سفارشی ہوگا جس کا کہا مانا جائے (اور) وہ (ایسا ہے کہ) آنکھوں کی چوری کو جانتا ہے اور اُن (باتوں) کو بھی جو



سینوں میں پوشیدہ ہیں) جن کو دوسرا نہیں جانتا۔ مطلب یہ کہ وہ بندوں کے تمام کھلے اور چھپے اعمال سے باخبر ہے جن پر سزا اور جزا موقوف ہے، اور اللہ تعالیٰ ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارا کرتے ہیں وہ کسی طرح کا بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ (کیونکہ) اللہ ہی سب کچھ جاننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام صفات کمال سے موصوف اور چھوٹے معبود سب سے عاری ہیں اس لئے فیصلہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کے بس میں نہیں۔ اور یہ لوگ جو ان واضح دلائل کے بعد بھی انکار کرتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (اس کفر کی وجہ سے) ان کا کیسا انجام ہوا۔ وہ لوگ قوت اور ان نشانوں میں جو زمین پر چھوڑ گئے ہیں (مثل عمارات و باغات وغیرہ کے) ان (موجودین) سے بہت زیادہ تھے سو ان کے گناہوں کی وجہ سے خدا نے ان پر دار و گیر فرمائی (یعنی عذاب نازل کیا) اور ان کا کوئی خدا سے بچانے والا نہ ہوا (آگے ان کے گناہوں کی تفصیل ہے کہ) یہ مواخذہ اس سبب سے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں (یعنی معجزات جو دلائل نبوت ہوتے ہیں) لیکن آتے رہے پھر انھوں نے نہ مانا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر مواخذہ فرمایا بے شک وہ بڑی قوت والا سخت سزا دینے والا ہے (جب ان موجودہ کافروں میں بھی وہی موجبات عذاب جمع ہیں تو یہ مواخذہ سے کیسے بچ سکتے ہیں)۔

## معارف و مسائل

سَرَفِيعُ الدَّرَجَاتِ - درجات سے مراد بعض حضرات نے صفات قرار دیا ہے جس سے رفیع الدرجات کے معنی ہوئے، رفیع الصفات یعنی اس کی صفات کمال سب سے زیادہ رفیع الشان ہیں۔ ابن کثیر نے اسکو اپنے ظاہر پر رکھ کر یہ معنی بیان کیے کہ اس سے مراد رفعت عرش عظیم کا بیان ہے کہ وہ تمام زمینوں اور آسمانوں پر حاوی اور سب کے اوپر بمنزلہ چھت کے بلند ہے۔ جیسا کہ سورہ معارج کی آیت میں ہے مِثْنُ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ ۖ ابن کثیر کی تحقیق اس آیت کے متعلق یہ بھی ہے کہ یہ پچاس ہزار سال کی مقدار اس مسافت کا بیان ہے جو ساتویں زمین سے عرش تک ہے اور اسی کو سلف و خلف کی بڑی جماعت کے نزدیک راجع قرار دیا ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ بہت سے علماء کے نزدیک عرش رحمن ایک قوت مخرج سے بنا ہے جس کا قطر اتنا بڑا ہے کہ وہ پچاس ہزار سال کی مسافت ہے۔ اسی طرح اس کا ارتفاع ساتویں زمین سے پچاس ہزار سال کی مسافت تک ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ سَرَفِيعُ الدَّرَجَاتِ بمعنی سَرَّافٍ ۖ اللہ سَرَّافٌ ہے یعنی اللہ تعالیٰ مومنین متقین کے درجات کو بلند فرمانے والا ہے جیسا کہ قرآن کی آیات اس پر شاہد ہیں سَرَفِيعُ الدَّرَجَاتِ مَن تَشَاءُ ۚ اور هُوَ ذَا بَعَثَ عِندَ اللَّهِ ۖ

يَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ - یا ہر ذُو نَفْس سے مراد یہ ہے کہ میدانِ حشر کی زمین چونکہ ایک سطحِ مستوی بنادی جائے گی جس میں کوئی پہاڑ یا غار یا عمارت اور درخت نہ ہوگا، جسکی آڑ ہو سکے اس لئے سب کھلے میدان میں سامنے ہوں گے۔

لَمِنَ الْمَلَائِكَةِ الْيَوْمَ - یہ کلمہ آیات مذکورہ میں یَوْمَ التَّلَاقِ اور یَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ کے بعد آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یَوْمَ التَّلَاقِ ملاقات و اجتماع کا دن نفخہ ثانیہ کے بعد ہوگا اسی طرح یَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ کا واقعہ بھی اس وقت ہوگا جب نفخہ ثانیہ کے بعد نئی زمین ایک سطحِ مستوی کی صورت بنادی جائے گی، جس پر کوئی آڑ پہاڑ نہ ہوگا۔ اس کے بعد یہ کلمہ لَمِنَ الْمَلَائِكَةِ لائے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد نفخہ ثانیہ سے تمام خلایق کے دوبارہ پیدا ہونے کے بعد ہوگا۔ اس کی تائید قرطبی نے بحوالہ نحاس ایک حدیث پیش کی ہے جو ابوالوائل نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے، وہ یہ کہ تمام آدمی ایک صفات زمین پر جمع کئے جائیں گے جس پر کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا۔ اس وقت ایک منادی کو حکم ہوگا جو یہ ندا کرے گا لَمِنَ الْمَلَائِكَةِ الْيَوْمَ یعنی آج کے دن ملائک کس کا ہے۔ اس پر تمام مخلوقات مؤمنین و کافروں پر یہ جواب دیں گے کہ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ مؤمن تو اپنے اعتقاد کے مطابق خوشی و تملذذ کی صورت میں کہیں گے اور کافر مجبور و عاجز ہونے کی بنا پر رنج و غم کے ساتھ اس کا اقرار کریں گے۔

لیکن دوسری بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارشاد حق تعالیٰ خود ہی اس وقت فرمائیں گے جبکہ انجیل اولیٰ کے بعد ساری مخلوقات فنا ہو جائیں گی اور پھر مخصوص مقرب فرشتوں جبریلؑ میکائیلؑ اسرافیلؑ اور ملک الموت کو بھی موت آجاوے گی۔ اور سوائے ذات حق سبحانہ و تعالیٰ کے کوئی نہ ہوگا اس وقت حق تعالیٰ فرمائے گا لَمِنَ الْمَلَائِكَةِ الْيَوْمَ۔ اور چونکہ اس وقت جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا تو خود ہی جواب دیں گے لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس میں سوال کرنے والا اور جواب دینے والا صرف ایک اللہ ہی ہے۔ محمد بن کعب قرظیؒ کا بھی یہی قول ہے اور اس کی تائید حضرت ابوہریرہؓ اور ابن عمرؓ کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ساری زمینوں کو بائیں ہاتھ میں اور آسمانوں کو دایرے ہاتھ میں لپیٹ کر فرمائیں گے۔ اَنَا الْمَلِكُ اَيُّنَ الْجَبَابِرَةِ اَيُّنَ الْكَافِرَةِ۔ یعنی میں ہی ملک اور مالک ہوں آج جبارین اور متکبرین کہاں ہیں۔ تفسیر درمختور میں اس طرح کی دونوں روایتیں نقل کر کے کہا گیا ہے کہ یہ کلمہ دوم مرتبہ دہرایا جائے ایک نفخہ اولیٰ اور فناء عالم کے وقت دوسرا نفخہ ثانیہ اور تمام خلایق کے دوبارہ زندہ ہونے کے وقت۔ بیان القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم کی تفسیر اس پر موقوف نہیں کہ وہی مرتبہ قرار دیا جائے بلکہ ہو سکتا ہے کہ آیات مذکورہ میں اس واقعہ کا ذکر ہو جو نفخہ اولیٰ کے بعد ہوا تھا۔ اس کو اس وقت حاضر فرض کر کے یہ کلمہ فرمایا گیا ہو۔ واللہ اعلم



يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ - (یعنی الایمن الخائنة) خیانتِ نظر سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص لوگوں سے چرا کر ایسی چیز پر نظر ڈالے جو اس کے لئے حرام اور ناجائز ہو، جیسے کسی غیر محرم پر شہوت سے نظر کرے، اور جب کسی کو دیکھے تو نظر ہٹالے یا اس طرح نظر ڈالے کہ جس کو دیکھنے والے محسوس نہ کریں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ سب چیزیں ظاہر ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ۖ۲۳۱

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیاں دیکر اور کھلی سند

فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُونَ فَقَالُوا سِحْرٌ كَذَّابٌ ۖ۲۳۲

فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس پھر کہنے لگے یہ جادو گر ہے جھوٹا

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ

پھر جب پہنچا ان کے پاس لے کر سچی بات ہمارے پاس سے بولے مار ڈالو جیسے اپنے

الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ ط ۖ۲۳۳

جو یقین لائے ہیں اس کے ساتھ اور جیتی رکھو ان کی عورتیں اور جو داڑھے

الْكٰفِرِيْنَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ ۖ۲۳۴ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذُرُوْنِي

مستکروں کا سو غلطی میں اور بولا فرعون مجھ کو چھوڑو

أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ ۚ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ

کہ مار ڈالوں موسیٰ کو اور پڑا پکارے اپنے رب کو میں ڈرتا ہوں کہ بگاڑ دے تمہارا دین

أَوْ أَنْ يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ ۖ۲۳۵ وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي

یا پھیلاؤں ملک میں خرابی اور کہا موسیٰ نے میں

عَدْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ

پناہ لے چکا ہوں اپنے اور تمہارے رب کی ہر غرور والے سے جو یقین نہ کرے حساب

الْحِسَابِ ۖ۲۳۶ وَقَالَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ

کے دن کا اور بولا ایک مرد ایمان دار فرعون کے لوگوں میں جو چھپاتا تھا

إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ

اپنا ایمان کیا مائے ڈالتے ہو ایک مرد کو اس بات پر کہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور لایا تمہارے پاس کھلی

بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ وَإِنْ يَكْذِبَ فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِنْ

نشانیاں تمہارے رب کی اور اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس پر بڑے گناہ کا بھوٹ اور اگر

يَكْذِبَ صَادِقًا يُصِيبُكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ

وہ سچا ہوگا تو تم پر بڑے گناہ کوئی وعدہ جو تم سے کرتا ہے بے شک اللہ راہ

لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ يَقَوْمِ لَكُمْ الْمُلْكُ

نہیں دیتا اس کو جو ہر بے لحاظ جھوٹا اے میری قوم آج تمہارا

الْيَوْمَ ظَهَرْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ بَأْسِ

راج ہے چڑھ رہے ہو ملک میں پھر کون مدد کرے گا ہماری اللہ کی

اللَّهِ إِنَّ جَاءَنَا قَالِ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَسَرَى

آفت سے اگر آگئی ہم پر بولا فرعون میں تو وہی بات سمجھاتا ہوں تم کو

وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الَّذِي آمَنَ

جو سوچھی مجھ کو اور وہی راہ بتلاتا ہوں جس میں بھلائی ہے اور کہا اسی ایماندار نے

لَيَقَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ ﴿۳۰﴾

اے قوم میری میں ڈرتا ہوں کہ آئے تم پر دن اگلے سرتوں کا سا

مِثْلَ دَايٍ قَوْمِ نُوْحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ

جیسے حال ہوا قوم نوح کا اور عاد اور ثمود کا اور جو لوگ ان کے پیچھے ہوئے

وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَلَيَقَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ

اور اللہ بے انصافی نہیں چاہتا بندوں پر اور اے قوم میری میں ڈرتا ہوں کہ تم پر آنے

يَوْمَ النَّارِ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تَوَلَّوْنَ مُدْبِرِينَ ۚ مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ

دن ہلک پکار کا جس دن بھاگو گے پیٹھ پھیر کر کوئی نہیں تم کو اللہ سے

مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

سچا کرنے والا اور جس کو غلطی میں ڈالے اللہ تو کوئی نہیں اس کو سچھا کرنے والا

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي

اور تمہارے پاس آچکا ہے یوسف اس سے پہلے کھلی باتیں لے کر پھر تم رہے دھوکے ہی

شَاكٍ مِّمَّا جَاءَكُمْ بِهِ ۚ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَبْعَثَ

میں ان چیزوں سے جو وہ تمہارے پاس لے آیا یہاں تک کہ جب مر گیا لگے کہ نہ بھیجے گا



اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ

اللہ اس کے بعد کوئی رسول اسی طرح بھٹکاتا ہے اللہ اس کو جو بہت بے باک

مُرْتَابٌ ۳۳) وَالَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ

شک کر لے والا وہ جو کہ جھگڑاتے ہیں اللہ کی باتوں میں بغیر کسی سند کے

أَتَهُمْ كَبِيرُ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا كَذَلِكَ

جو پیچھے ہوا ان کو بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں اور ایمانداروں کے یہاں اسی طرح

يُطَبِّعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارًا ۳۵) وَقَالَ فِرْعَوْنُ

تہر کر دیتا ہے اللہ ہر دل پر افسردہ والے سرکش کے اور بولا فرعون

يَهَامِلُنِ ابْنِ لِي صِرَ حَالًا عَلَيَّ أَبْلَغُ الْأَسْيَابِ ۳۶) أَسْيَابٌ

کہ لے ہامان بنامیرے واسطے ایک اونچا محل شاید میں جا پہنچوں رستوں میں رستوں میں

السَّمَاوَاتِ فَأُطْلِعَ إِلَى إِلَهِ مُوسَى وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا وَ

آسمانوں کے پھر جھانک کر دیکھوں موسیٰ کے معبود کو اور میری آنکھ میں تو وہ جھوٹا ہے اور

كَذَلِكَ نُرِيكَ لِفِرْعَوْنَ سُوءَ عَذَابٍ وَصَدَّاكَ عَنِ السَّبِيلِ ط

اسی طرح بھلے دکھلا دیئے فرعون کو اس کے برے کام اور روک دیا گیا سیدھی راہ سے

وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ ۳۷) وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا يَقَوْمُ

اور جو داؤد تھا فرعون کا سوتہا ہونے کے واسطے اور کہا اسی ایماندار نے اے قوم

اتَّبِعُونِ أَهْدِيكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ ۳۸) يَقَوْمِ إِنَّمَا هِيَ

راہ چلو میری پہنچا دوں تم کو نیکی کی راہ پیر اے میری قوم یہ جو زندگی ہے

الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۳۹)

دنیا کی سو کچھ برت لینا ہے اور رہ گھر جو بچھلا ہے وہی ہے ہم کر رہنے کا گھر

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ

جس نے کیا ہے برائی تو وہی بدلہ پائے گا اسکی برابر اور جس نے کیا ہے

صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ

بھلائی مرد ہو یا عورت اور وہ یقین رکھتا ہو سورہ لوگ مایں گے

الْجَنَّةَ يُرْرُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۴۰) وَلَيَقَوْمُ مَا لِي

بہشت میں رومی پائیں گے وہاں بے شمار اور اے قوم مجھ کو

ادْعُوكُمْ إِلَى النَّجْوَى وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ ۖ تَدْعُونَنِي

کیا ہوا ہے بلاتاہوں تم کو نجات کی طرف اور تم بلااتے ہو مجھ کو آگ کی طرف تم بلااتے ہو مجھ کو

لَا كُفْرًا بِاللَّهِ وَأَشْرًا كَبِيرًا ۚ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَأَنَا أَدْعُوكُمْ

کہ منکر ہوں خدا سے اور شریک مقرر اول اس کا اس کو جس کی مجھ کو خبر نہیں اور میں بلاتاہوں تم کو

إِلَى الْعَزِيزِ الْغَفَّارِ ۖ لَا جَرَمَ أَنَا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ لَيْسَ لَهُ

اس زبردست گناہ بخشنے والے کی طرف آپ ہی ظاہر ہے کہ جس کی طرف تم مجھ کو بلااتے ہو اس کا بلاوا

دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَنْ مَرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ

کہیں نہیں دنیا میں اور نہ آخرت میں اور یہ کہ تم کو پھر جانا ہے اللہ کے پاس

وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ فَسْتَدْعُرُونَنَا

اور یہ کہ زیادتی والے وہی ہیں دوزخ کے لوگ سو آگے یاد کرو گے

مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأَقِضْ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ

جو میں کہتا ہوں تم کو اور میں سونپتا ہوں اپنا کام اللہ کو بے شک اللہ کی

يَصِيرُ بِالْعِبَادِ ۖ فَوَقَاهُ اللَّهُ سَيِّئَاتِ مَا مَكَرُوا وَخَاقَ

نگاہ میں ہیں سب بندے پھر بچا لیا موسیٰ کو اللہ نے بڑے داؤ سے جو وہ کرتے تھے اور الٹ پڑا

بِالْفِرْعَوْنَ سَوَّءَ الْعَذَابِ ۖ النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا

فرعون والوں پر برسی طرح کا عذاب وہ آگ ہے کہ دکھلا دیتے ہیں ان کو

غَدَاةً وَأَوْعِشِيَاءَ ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۖ أَدْخِلُوا آلَ

صبح اور شام اور جس دن قائم ہوگی قیامت حکم ہوگا داخل کرو

فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ۖ

فرعون والوں کو سخت سے سخت عذاب میں

## خُلاَصَةُ تَفْسِيرِ

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے احکام اور کھلی دلیل (یعنی معجزہ) دیکر فرعون اور ہامان  
قارون کے پاس بھیجا تو ان لوگوں (میں سے بعض نے یا کل) نے کہا کہ (معوذ باللہ) یہ جادوگر (اور) جھوٹا  
ہے (جادوگر معجزہ میں کہا اور کذاب دعویٰ نبوت و احکام میں کہا۔ یہ قول فرعون، ہامان اور قارون)



تین کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر قارون چونکہ بنی اسرائیل میں سے تھا اور لبطا ہر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا اس کا ان کو ساحر کہنا بظاہر مستبعد ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ اس وقت بھی منافق ہو موسیٰ علیہ السلام پر بظاہر میں ایمان کا دعویٰ کرتا ہو حقیقتہً نہ ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قول صرف فرعون و ہامان کا ہو۔ تغلیباً تینوں کی طرف نسبت کر دی گئی ہو، پھر اس کے بعد جب وہ (عام) لوگوں کے پاس دین حق جو ہماری طرف سے تھا لیکر آئے (جس پر بعض لوگ مسلمان بھی ہو گئے) تو ان (مذکورہ) لوگوں نے (بطور مشورہ کے) کہا کہ جو لوگ ان کے ساتھ (ہو کر) ایمان لے آئے ہیں ان کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو (تاکہ ان کی جمعیت اور قوت نہ بڑھ جائے جس سے اندیشہ زوال سلطنت کا ہے) اور (چونکہ فرعون سے ایسا اندیشہ نہیں دینا ہمارے گھروں میں خدمتگاری کے لئے ان کی ضرورت ہے اس لئے) ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دو (غرض انھوں نے موسیٰ کے غلیہ کا خطرہ محسوس کر کے انسداد کی یہ تدبیر کی) اور ان کافروں کی تدبیر محض بے اثر رہی (چنانچہ آخر میں موسیٰ علیہ السلام غالب آئے۔ بنی اسرائیل کے نو زائیدہ لڑکوں کے قتل کا حکم ایک تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے دیا گیا تھا جس کے نتیجے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈالنے کی نوبت آئی اور قدرت نے اس بچے کو خود فرعون کے گھر میں پلویا یا۔ یہ دوسرا فیصلہ ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کا موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور نبوت کے بعد اس وقت کا ہے جبکہ ان کے معجزات دیکھ کر آل فرعون نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اس کا جوتھا بڑھ گیا تو ہماری سلطنت کی خیر نہیں۔ پھر یہ کسی روایت میں نظر سے نہیں گزرا کہ اس وقت یہ قتل غلمان کا قانون نافذ ہوا یا نہیں۔ پھر اس کے بعد خود موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے بارے میں گفتگو ہوئی) اور فرعون نے (اہل دربار سے) کہا کہ مجھ کو چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کر ڈالوں اور اس کو چاہیے کہ اپنے رب کی (مدد کے لئے) پکارے۔ مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ (کہیں) تمہارا دین (نہ) بدل ڈالے یا ملک میں کوئی فساد (نہ) پھیلادے (کہ ایک ضرر دین کا ہے اور دوسرا ضرر دنیا کا۔ اور فرعون کا یہ کہنا کہ مجھ کو چھوڑ دو، یا تو اس وجہ سے ہے کہ اہل دربار نے شاید اس لئے قتل کی رائے نہ دی ہوگی کہ اس کو مصلحت ملے گی کہ خلاف سمجھا ہو گا کہ عام چرچا ہو گا کہ ایک بے سرو سامان شخص سے ڈر گئے اور یا یہ کہنا بطور تمویہ کے ہے کہ عام سننے والے یہ سمجھیں کہ اب تاکہ ان کے قتل میں تاخیر مشیروں کے رد کرنے کے سبب سے ہوئی ہو، گو واقع میں قتل پر خود اس کو جرأت نہ تھی۔ کیونکہ دل میں تو معجزات سے یقین ہو ہی گیا تھا۔ اس لئے اس کو خطرہ تھا کہ ان کو قتل کیا تو کسی آسمانی عذاب و بلا میں مبتلا ہو جاؤں گا مگر اپنے خوف کو درباریوں کے سر ڈالنے کے لئے ایسا کہا۔ اور اسی طرح وَلَبِیدُ عُرْیَہُ کہنا بھی لوگوں پر اپنی بہادری جتلانے کے لئے ہو گا، اگرچہ دل اندر سے تھرا رہا ہو) اور موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ بات مٹنی خواہ بالمشافہ سنی ہو یا بالواسطہ (تو انھوں نے کہا میں اپنے اور تمہارے (یعنی سب کے) پروردگار کی پناہ لیتا ہوں ہر خرد مانع شخص

(کے مشر) سے جو روزِ حساب پر یقین نہیں رکھتا اور اس لئے حق کا مقابلہ کرتا ہے، اور (اُمس مجلس مشورہ میں) ایک مؤمن شخص نے جو کہ فرعون کے خاندان میں سے تھے (اور اب تک) اپنا ایمان پوشیدہ رکھتے تھے (یہ مشورہ سن کر لوگوں سے) کہا کیا تم ایک شخص کو (محض) اس بات پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے، حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے اس دعوے پر (دلیلیں بھی) لیکر آیا ہے (یعنی معجزات بھی دکھلاتا ہے جو دلیل ہے صدق دعوی نبوت کی اور دلیل موجود ہونے ہوئے صاحب دلیل کی مخالفت کرنا اور مخالفت بھی اس درجہ کی کہ قتل کا قصد کیا جاوے نہایت نازیبا ہے) اور اگر (بالفرض) وہ جھوٹا ہی ہو تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا (اور آپ ہی اللہ کی طرف سے رسوا ہو جائے گا۔ قتل کرنے کی کیا ضرورت) اور اگر وہ سچا ہو تو وہ جو کچھ پیشین گوئی کر رہا ہے (کہ ایمان نہ لانے کی صورت میں ایسا ایسا عذاب ہوگا) اس میں کچھ تو کم پر (ضروری) پڑے گا (تو اس صورت میں قتل کرنے سے اور زیادہ بکرا اپنے سر پر لینا ہے۔ غرض اس کے کذب کی صورت میں قتل فضول اور صدق کی صورت میں مُضر ہے پھر ایسا فعل کیوں کیا جاوے اور قاعدہ کلیہ ہے کہ) بے شک اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو مقصود تک نہیں پہنچاتا جو (اپنی) حد سے گزر جائے والا (اور) بہت جھوٹ بولنے والا ہو (یعنی برائے چند سے اس کی بات چل جاوے تو ممکن ہے مگر انجام کا اس کی ناکامی یقینی ہے۔ پس اس قاعدہ کلیہ کے اعتبار سے اگر موسیٰ علیہ السلام یا فرض کا ذب ہوں تو وجہ اس کے کہ جھوٹا دعویٰ نبوت کا بہت بڑا گناہ ہے اور سخت جرأت ہے، ایسے کاذب مفری کو بھی اگر مقہور و ہلاک نہ کیا جاوے تو مخلوق کو خود شبہ اور التباس میں مبتلا کرنا لازم آتا ہے۔ اور یہ عقلاً حق تعالیٰ سے نہیں ہو سکتا اس لئے ضروری ہے کہ یہ مغلوب و رسوا ہوں گے، پھر حاجت قتل کیا ہے؟ اور اگر صادق ہیں تو تم لوگ بالیقین کاذب ہو اور کذب میں مُسرف بھی ہو کہ فرعون کی خدائی کے دعویدار ہو اور مُسرف کذاب کو کامیابی ہوئی نہیں۔ پس تم لوگ قتل میں کامیاب نہ ہو گے یا تو قدرت نہ ہوگی یا اس کا اخیر نتیجہ ہمارا ہوگا۔ بہر حال دونوں شقوں کا مقتضی یہی ہوا کہ ان کو قتل نہ کیا جاوے اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ کبھی کسی مفسد کو قتل نہ کیا جاوے۔ جواب یہ ہے کہ یہ تقریر اس صورت میں جہاں کاذب ہونے یا صادق ہونے میں شبہ اور معجزات سے اقل درجہ احتمال صدق ضرور تھا اور جہاں دلائل قطعہ سے کذب متیقن ہو وہاں ایسا نہیں ہوگا۔ اور گو اس مؤمن کو موسیٰ علیہ السلام کے صدق کا پورا یقین تھا مگر اس طرز سے گفتگو کرنا لوگوں کی طبیعت رعایت سے تھا کہ وہ کچھ غور کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ آگے بھی اسی قتل سے روکنے کے متعلق مضمون ہے کہ) اے میرے بھائیو! آج تو تمہاری سلطنت ہے کہ اس سرزمین میں تم حاکم ہو سو خدا کے عذاب میں ہماری کون مدد کرے گا اگر (ان کے قتل کرنے سے) وہ ہم پر آ پڑا (جیسا کہ ان کے سچے ہونے کی صورت میں



اس کا احتمال ہے، فرعون نے (یہ تقریر سن کر جواب میں) کہا کہ میں تو تم کو وہی رائے دوں گا جو خود سمجھ رہا ہوں (کہ ان کا قتل ہی مناسب ہے) اور میں تم کو عین طریق مصلحت بتلاتا ہوں اور اس مؤمن نے (جب دیکھا کہ نصیحت میں نرمی اور رعایت خیال مخاطب سے کام نہیں چلتا تو آب ہتھ دیر و تحریف سے کام لیا اور) کہا صاحبو مجھے تمہاری نسبت دوسری امتوں کے سے روزِ بد کا اندیشہ ہے، جیسا کہ قوم نوح اور عاد اور ثمود اور بعد والوں (یعنی قوم لوط وغیرہ) کا حال ہوا تھا اور خدا تعالیٰ تو بندوں پر کسی طرح کا ظلم کرنا نہیں چاہتا (لیکن جب تم حرکتیں ہی ایسی کر دے گے تو ضرور ہی اپنی سزا کو پہنچو گے) اور (یہ ڈرانا تھا عذابِ دنیا سے آگے تہدید ہے عذابِ آخرت سے کہ) صاحبو مجھ کو تمہاری نسبت اس دن کا اندیشہ ہے جس میں کثرت سے تدائیں ہوں گی (یعنی وہ دن مشتمل ہے، واقعاتِ عظیمہ پر کیونکہ نداؤں کی کثرت یعنی ایک دوسرے کو آواز دینا واقعات کے عظیم ہونے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ سب سے اول آواز صور بھونکنے کی ہوگی جس سے مردے زندہ ہوں گے۔ قال تعالیٰ یَوْمَ مُبْتَدِیَ الْاٰمَاتِ مِنْ مَّكَاتٍ قَرِیْبٍ یَّوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَةَ بِالْحَقِّ۔ ایک ندا حساب کے لئے ہوگی۔ قال تعالیٰ یَوْمَ تَدْعُوْا كُلَّ اُنْسٍ بِاٰمِہِمَّ اِیَّکَ تَنَادِیْ یعنی ایک دوسرے کو ندا کرنا باہم اہل جنت و اہل نار میں ہوگا۔ قال تعالیٰ فِی الْاٰخِرَةِ اِنْ دَعَاۤیِ اصْحَابِ الْجَنَّةِ اِلَیْہِ۔ وَنَادٰۤیِ اصْحَابِ الْاٰخِرَةِ اِلَیْہِ۔ وَنَادٰۤیِ اصْحَابِ النَّارِ اِلَیْہِ۔ ایک ندا راخیر میں موت کو بشکلِ دُنیہِ ذبح کرنے کے وقت ہوگی جیسا حدیث میں ہے۔ یا اہل الجنة خلود لا موت یا اہل النار خلود لا موت۔ اور آگے اس دن کی ایک حالت بیان کی گئی ہے کہ جس دن (موقف حساب سے) پشت پھیر کر (دوزخ کی طرف) لوٹو گے (کذا نسر البغوی اور اس وقت) تم کو خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا (اور اس مضمون کا تقاضا ہدایت قبول کرنے کا ہے لیکن) جس کو خدا ہی گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت کرنے والا نہیں اور (آگے تو بیخ و تنبیہ ہے اس پر کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ایک اور پیغمبر کی بھی تکذیب کر چکے ہیں یعنی) اس سے قبل تم لوگوں کے پاس یوسف (علیہ السلام) دلائل (توحید و نبوت کے) لیکر آچکے ہیں (یعنی اسی قوم قبط میں جن میں سے تم بھی ہو اور آباؤ سابقین سے تم تک بھی ان کی خبر متواتر پہنچی ہے) سو تم ان امور میں بھی برابر شک (و انکار) ہی میں رہے جو وہ تمہارے پاس لیکر آئے تھے، حتیٰ کہ جب ان کی وفات ہو گئی تو تم کہنے لگے کہ بس اب اللہ کسی رسول کو نہ بھیجے گا (یہ قول بطور شرارت کے تھا، مطلب یہ کہ اول تو یوسف بھی رسول نہ تھے اور اگر بالفرض تھے بھی تو جب ایک کو نہ مانا تو اللہ میاں کہیں گے کہ دوسرے کو بھیجے سے کیا فائدہ، تو ہمیشہ کے لئے یہ جھگڑا پاک ہو گیا مقصود اصلی اس سے نفیِ مسئلہ رسالت کی ہے جیسا کہ اگلے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس مسئلہ میں تم غلط کار ہو) اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ سے باہر ہو جانے والے (اور) شبہات میں گرفتار رہنے

دلوں کو غلطی میں ڈالے رکھتا ہے جو بلا کسی سند کے جو ان کے پاس موجود ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑنے کلا کرتے ہیں۔ اس (کج بحثی) سے خدا تعالیٰ کو بڑی نفرت ہے اور مؤمنین کو بھی اور (جس طرح تمہارے دلوں پر مہر لگا رکھی ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر مغرور جابر کے پورے قلب پر مہر کر دیتا ہے۔ (کہ اس میں اصلاً گنجائش حق نہیں کی نہیں رہتی۔ یہ تقریر تھی ان مؤمن بزرگ کی جو فرعون کے خاندان میں سے ہیں اور اب تک ایمان کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس تقریر سے اُن بزرگ کما تین ایمان جاتا رہا، خواہ اول تقریر سے خواہ بعد کی تقریر سے یعنی یَقْوِمُ اِنِّیْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ مِثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ اور ظاہر شق اول ہے لقولہ تعالیٰ وَقَدْ جَاءَکُمْ بِالْبَیِّنَاتِ الخ) اور فرعون نے یہ تقریر لاجواب سنی تو اُس مؤمن کو کچھ جواب دے نہ سکا۔ اپنی جہالت قدیمہ پر بزم خود حجت قائم کرنے کے لئے ہامان سے کہا اے ہامان میرے لئے ایک بلند عمارت بنواؤ (میں اس پر چڑھ کر دیکھوں گا) شاید میں آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں پھر وہاں جا کر) موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو موسیٰ کو اس کے دعویٰ میں جھوٹا سمجھتا ہوں (آگے فرعون کی مزید بدکرداری کا ذکر ہے) اور اسی طرح فرعون کی (اور) بدکرداریاں (بھی) اس کو مستحسن معلوم ہوئی تھیں اور (مسیدھے) رستہ سے رگ گیا اور (موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں بڑی بڑی تدبیریں کیں مگر) فرعون کی ہر تدبیر غارت ہی گئی (کسی میں کامیاب نہ ہوا) اور اس مؤمن نے (جب دیکھا کہ فرعون سے کوئی معقول جواب نہیں بن پڑا تو پھر مکرر) کہا کہ اے بھائیو تم میری راہ پر چلو میں تم کو ٹھیک ٹھیک راستہ بتلاتا ہوں (یعنی فرعون نے جو کہا تھا کہ میں تمہیں سبیل الرشاد کی طرف ہدایت کرتا ہوں اس کا بتایا ہوا راستہ ہرگز سبیل الرشاد یعنی ہدایت کا راستہ نہیں بلکہ سبیل الرشاد میرا بتلایا ہوا راستہ ہے) اے بھائیو یہ دنیوی زندگی محض چند روزہ ہے اور (اصل) تمہارے کامقام تو آخرت ہے (جہاں بدلہ دینے کا یہ قانون ہے کہ) جو شخص گناہ کرتا ہے تو اس کو برابر برابر ہی بدلہ ملتا ہے اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مؤمن ہو ایسے لوگ جنت میں جاویں گے (اور) وہاں ان کو بے حساب رزق ملے گا اور (اس تقریر کے وقت اس مؤمن آل فرعون کو یہ محسوس ہوا کہ یہ لوگ میری باتوں پر تعجب کر رہے ہیں اور بجائے میری بات ماننے کے مجھ کو ہی اپنے طریق کفر کی طرف بلاتا چاہتے ہیں، اس لئے یہ بھی کہا کہ) اے میرے بھائیو یہ کیا بات ہے کہ میں تو تم کو (طریق) نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھ کو (طریق) دوزخ کی طرف بلاتے ہو (یعنی) تم مجھ کو اس بات کی طرف بلاتے ہو کہ (معاذ اللہ) میں خدا کے ساتھ کفر کروں اور ایسی چیز کو اس کا سا جھٹی بناؤں جس کے (سا جھٹی) ہونے کی) میرے پاس کوئی دلیل بھی نہیں اور میں تم کو خدا کے زبردست خطاب بخش کی طرف بلاتا ہوں (یعنی) بات ہے کہ تم جس چیز (کی عبادت) کی طرف مجھ کو بلاتے ہو وہ نہ تو دنیا ہی میں (کسی نبوی



حاجت کے لئے) پکارے جانے کے لائق ہے اور نہ (دفع عذاب کے لئے) آخرت ہی میں اور (یقینی بات ہے کہ) ہم سب کو خدا کے پاس جانا ہے اور (یقینی بات ہے کہ) جو لوگ دائرہ (عبودیت) سے نکل رہے ہیں (جیسے غیر اللہ کی پرستش کرنے والے) وہ سب دوزخی ہوں گے سو اب تو میرا کہنا تمہارے جی کو نہیں لگتا مگر) آگے چل کر تم میری بات کو یاد کرو گے اور (چونکہ اس مؤمن کو یہ احتمال پہلے سے ہے کہ یہ لوگ اس نصیحت پر میرے خلاف ہو جائیں اور تکلیف پہنچائیں اور ممکن ہے کہ اس وقت کچھ آثار و علامت دھمکی کے بھی ان کی طرف سے سامنے آئے ہوں اس لئے یہ بھی کہا کہ) میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں ، خدا تعالیٰ سب بندوں کا (خود) نگران ہے (میں تم سے بالکل نہیں ڈرتا) پھر خدا تعالیٰ نے اس (مؤمن) کو ان کی مضرت دبیروں سے محفوظ رکھا (چنانچہ وہ ان کی ایذاؤں سے محفوظ رہا اور حضرت قتادہ کے قول کے مطابق اس کو بھی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ غرق سے نجات ہوئی (کذا فی الدر المنثور) اور فرعون والوں پر (مع فرعون کے) تکلیف دینے والا عذاب نازل ہوا (جس کا بیان یہ ہے کہ وہ لوگ (بمذبح میں) صبح شام آگ کے سامنے لائے جاتے ہیں) اور ان کو بتلایا جاتا ہے کہ تم قیامت کے روز اس میں داخل ہو گے) اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) کہ فرعون والوں کو (مع فرعون کے) نہایت سخت عذاب میں داخل کرو۔

## معارف و مسائل

اور پر جا بجا منکرین توحید و رسالت کی وعید و تہدید کے ضمن میں کفار کا خلاف و عناد مذکور ہوا ہے جس سے طبعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حزن و ملال ہوتا تھا۔ آپ کی تسلی کے لئے مذکور الصدر تقریباً دو رکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس قصہ میں ایک طویل مکالمہ فرعون اور قوم فرعون کے ساتھ اس بزرگ شخص کا ہے جو خود آل فرعون میں ہونے کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر ایمان لے آیا تھا۔ مگر بے مصلحت اپنے ایمان کو اس وقت تک چھپا رکھا تھا۔ اس مکالمہ کے وقت اس کے ایمان کا بھی حتمی اعلان ہو گیا۔

۱۔ تفسیر میں سے مقاتل اور سدی اور حضرت حسن نے فرمایا کہ یہ فرعون کا چچا زاد بھائی تھا، اور یہ وہی شخص تھا جس نے اس وقت جبکہ قبطی کے قتل کے واقعہ میں اس کے قصاص کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا مشورہ دربار فرعون میں ہو رہا تھا تو یہی شہر کے کنارے سے دوڑ کر آیا اور موسیٰ علیہ السلام کو خبر دیکر مشورہ دیا کہ مصر سے باہر چلے جائیں، جس کا واقعہ سورہ قصص میں حق تعالیٰ نے بیان

فرمایا ہے وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَى الْمَلِكِ يُنَادِيكَ .

اس مؤمن آل فرعون کا نام بعض نے حبیب بتلایا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ حبیب اس شخص کا نام ہے جس کا قصہ سورہ یونس میں آیا ہے اس کا نام شمعان ہے پہیلی نے اس نام کو اصح قرار دیا ہے اور دوسرے حضرات نے اس کا نام حزقیل بتلایا ہے۔ ثعلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی قول نقل کیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدق لیتین چند میں ایک حبیب شجاع جس کا قصہ سورہ یونس میں ہے۔ دوسرا مؤمن آل فرعون تیسرے ابو بکر اور وہ ان سب میں افضل ہیں۔ (قرطبی)

يَكْتُمُ إِيمَانَهُ - اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر لوگوں کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار نہ کرے دل سے اعتقاد پختہ رکھے تو وہ مؤمن ہے مگر لفظ صریح سے یہ ثابت ہے کہ ایمان کے مقبول ہونے کے لئے صرف دل کا یقین کافی نہیں بلکہ زبان سے اقرار کرنا شرط ہے جب تک زبان سے اقرار نہ کرے گا مؤمن نہ ہوگا۔ البتہ زبان کا اقرار لوگوں کے سامنے اعلان کے ساتھ کرنا ضروری نہیں۔ اس کی ضرورت صرف اسوجہ سے ہے کہ جب تک لوگوں کو اس کے ایمان کا علم نہیں ہوگا وہ اس کے ساتھ معاملہ مسلمانوں جیسا نہ کر سکیں گے۔ (قرطبی)

مُؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ - اس مکالمہ میں آل فرعون اور فرعون کو مختلف عنوانات سے حق اور ایمان کی طرف بلایا اور وہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے تھے ان کو اس سے باز رکھا۔ يَلْقَوْنِي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ - تناد بکسر دال مخفف ہے تنادحی کا جس کے معنی میں باہم ایک دوسرے کو نداء اور آواز دینے کے۔ قیامت کے روز کو یَوْمَ التَّنَادِ اس لئے کہا گیا کہ اس روز ہمارے اندیش اور آوازیں ہونگی۔ جن کا کچھ ذکر خلاصہ تفسیر میں آچکا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ کا ایک منادی ندا دے گا کہ اللہ کے مخالف لوگ کھڑے ہو جائیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو تقیہ کا انکار کرتے تھے۔ اور پھر اصحاب جنت دوزخ والوں کو اور دوزخ والے اصحاب جنت کو اور اصحاب اعراف دونوں کو ندا دیکر اپنی اپنی باتیں کریں گے۔ اور اس وقت ہر خوش نصیب اور بد نصیب کا نام مع ولایت لیکر ان کے نتیجہ کا اعلان کیا جائے گا کہ فلاں ابن فلاں سعید و کامیاب ہو گیا اس کے بعد شقاوت کا کوئی احتمال نہیں رہا اور فلاں بن فلاں شقی و بد بخت ہو گیا، اب اس کی نیک بختی کا کوئی احتمال نہیں رہا (رواہ ابن ابی حاتم فی السنۃ - منظر ہری) مستند بزار نے بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سعادت و شقاوت کا اعلان وزن اعمال کے بعد ہوگا۔

اور حضرت ابو حازم اعرج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ اپنے نفس کو مخاطب کر کے فرمایا



کرتے تھے کہ اے اعرج قیامت کے روز زندہ کیا جائے گی کہ فلاں قسم کے گناہ کرنے والے کھڑے ہو جاویں تو ان کے ساتھ کھڑا ہوگا کہ پھر زندہ رہے گا اور یہی کہ فلاں قسم کے گناہ کرنے والے کھڑے ہوں تو ان کے ساتھ کھڑا ہوگا، پھر زندہ رہے گا اور یہی کہ فلاں قسم کے گناہ کرنے والے کھڑے ہوں تو ان کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ اور میں سمجھتا ہوں ہر گناہ کے اعلان کے وقت تجھے ان کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا (کیونکہ تو نے ہر قسم کے گناہ جمع کر رکھے ہیں)۔ (آخر حبیب الرحمن - منظری)

یَوْمَ تَوَلَّوْنَ مَدَائِنَ یَیْنِ - یعنی جب تم پشت پھیر کر لوٹو گے۔ خلاصہ تفسیر میں بحوالہ امام بغوی اس کے معنی یہ بیان ہوئے ہیں کہ یہ اُس حالت کا بیان ہے جب مجرمین موقف حساب سے جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ پہلے یہ ندائیں اور اعلانات جن کا ذکر یَوْمَ التَّنَادِ کی تفسیر میں آ رہا ہے وہ سب ہو چکیں گے۔ اس کے بعد یہ لوگ موقف حساب سے مرکز جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے۔

اور بعض حضرات مفسرین کے نزدیک یہ حال دنیا میں نفخہ اولیٰ کے وقت کا بیان کیا گیا ہے، کہ جب پہلا صور بھونکا جائے گا اور زمین پھٹے گی تو یہ لوگ ادھر ادھر بھاگیں گے مگر ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوگا، کہیں نکلنے کا راستہ نہ ہوگا۔ ان حضرات کے نزدیک یَوْمَ التَّنَادِ سے مراد بھی نفخہ اولیٰ کا وقت ہے کہ اس میں ہر طرف سے چیخ پکار ہوگی۔ آیت کی دوسری قراءت سے اس کی تائید ہوتی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ یَوْمَ التَّنَادِ کو بدال مشدود پڑھتے تھے، جو نہ مصدر سے مشتق ہے جس کے معنی بھاگنے کے ہیں تو یَوْمَ التَّنَادِ کے معنی بھی اس تفسیر کی رو سے بھاگنے کا دن ہوئے اور تَوَلَّوْنَ مَدَائِنَ یَیْنِ اُسی کی تشریح ہوتی۔

تفسیر منظری میں ایک طویل حدیث بحوالہ ابن جریر اور مسند ابویعلیٰ اور سیہقی اور مسند عبد بن حمید وغیرہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے جس میں قیامت کے روز صور کے تین نفخوں کا ذکر ہے پہلا نفخہ فَرْعٌ دوسرا نفخہ صَمْعٌ تیسرا نفخہ نَشْرٌ نفخہ فَرْعٌ سے ساری مخلوق میں گھبراہٹ اور اضطراب پیدا ہوگا۔ یہی نفخہ اولیٰ اور طویل ہو کر نفخہ صَمْعٌ بن جائے گا، جس سے سب بے ہوش ہو جائیں گے پھر چابلیں گے عام طیر پران دونوں نفخوں کے مجموعہ کو نفخہ اولیٰ کہا گیا ہے جس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ ایک ہی نفخہ کے دو کیفیتیں ہوں گی، پہلی فَرْعٌ دوسری صَمْعٌ۔ اس حدیث میں بھی نفخہ فَرْعٌ کے وقت لوگوں کے ادھر ادھر بھاگنے کا ذکر کر کے یہ فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِیْ یَقُولُ اللّٰهُ یَوْمَ التَّنَادِ - جس سے معلوم ہوتا کہ آیت میں یَوْمَ التَّنَادِ سے مراد پہلے نفخہ کے وقت لوگوں کا مضطربانہ ادھر ادھر دوڑنا ہے۔

(واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم)

كَذٰلِکَ یُطِيعُ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ قَلْبٍ مُّتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ - یعنی جس طرح فرعون و ہامان کے قلوب

موسیٰ علیہ السلام اور مؤمن آل فرعون کی نصیحتوں سے کوئی اثر نہیں لیا اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر کر دیتے ہیں ہر ایسے شخص کے قلب پر جو متکبر اور جبار ہو (متکبر: تکبر کر نیوالا اور جبار کے معنی ظالم قاتل) جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس میں نور ایمان داخل نہیں ہوتا اور اس کو اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی۔ ایک قرارت میں متکبر اور جبار کو قلب کی صفت قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تمام اخلاق و اعمال کا منبع اور سرچشمہ قلب ہی ہے، ہر اچھا برا عمل قلب ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا ہے کہ انسان کے بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا (یعنی دل) ایسا ہے جس کے درست ہونے سے سارا بدن درست ہو جاتا ہے اور اس کے خراب ہونے سے سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ (قرطبی)۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا هَٰمِلُجْ ابْنِیْ حَصْرًا حَکَا۔ صرح کے معنی بلند تعمیر کے ہیں۔ ظاہر اس کا یہ ہے کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ ایسی بلند تعمیر بناؤ جو آسمان کے قریب تک چلی جائے جس پر جا کر میں خدا کو جھانک کر دیکھ لوں۔ یہ احمقانہ خیال جو کوئی ادنیٰ سمجھ کا آدمی بھی نہیں کر سکتا سلطنت مصر کے مالک فرعون کا یا تو واقعی ہے جو اس کی انتہائی بے وقوفی اور حماقت کی دلیل ہے اور وزیر نے اگر اس کی تعمیل کی تو وزیر سے چین شہر یا رے چین کا مصداق ہے۔ مگر کسی بھی والی ملک سے ایسے احمقانہ تصور کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے بعض حضرات مفسرین نے کہا کہ یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ کتنی ہی بلند تعمیر بنالے وہ آسمان تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر اپنے لوگوں کو بوقوت بنانے اور دکھانے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ پھر کسی صحیح اور قوی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ایسا کوئی محل عالیشان بلند تعمیر ہوا یا نہیں۔ قرطبی نے نقل کیا ہے کہ یہ بلند تعمیر کرائی گئی تھی جو بلندی پر پہنچنے ہی منہدم ہو گئی۔

ہمارے علوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ کے شاگرد خاص میرے والد ماجد مولانا محمد حسین صاحب نے اپنے استاد موصوف سے نقل کر کے فرمایا کہ اس قصر بلند کے منہدم ہونے کے لئے ضروری نہیں کہ کوئی آسمانی عذاب آیا ہو بلکہ ہر تعمیر کی بلندی اس کی بنیادوں کے تحمل پر موقوف ہوتی ہے اس نے کتنی بھی گہری بنیاد رکھی ہو مگر ایک حد تک ہی گہری ہوگی جب اس کے اوپر تعمیر چڑھاتا ہی چلا گیا تو لازم تھا کہ جب اس کی بنیادوں کے تحمل سے زیادہ ہو جائے تو منہدم ہو جائے۔ اس سے فرعون و ہامان کی دوسری بے وقوفی ثابت ہوئی۔ واللہ اعلم

فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأَفَوتُ إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ۔

یہ مؤمن آل فرعون کا آخری کلام ہے جو اپنی قوم کو حق کی طرف بلانے کے سلسلے میں کیا گیا جس میں اظہار ہے کہ آج تو تم میری بات نہیں مانتے مگر جب عذاب تمہیں آپکڑے گا تو اس وقت تم کو میری بات یاد آئے گی۔ مگر اس وقت کا یاد آنا بے کار ہوگا۔ اور اب جبکہ اس طویل مکالمہ اور نصیحت و



دعوت کے ذریعہ اس مؤمن آل فرعون کا ایمان ان لوگوں پر ظاہر ہو گیا تو فکر ہوئی کہ اب یہ لوگ ان کے درپے ہوں گے اس لئے فرمایا کہ میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کا نگران و محافظ ہے۔ امام تفسیر مقاتل نے فرمایا کہ ان کے گمان کے مطابق قوم فرعون ان کے درپے ہوئی تو یہ پہاڑ کی طرف بھاگ نکلے۔ اور ان کی گرفت میں نہ آ سکے جس کا ذکر اگلی آیت میں اس طرح آیا ہے۔

فَوَقَّعَ اللَّهُ سَيِّئَاتِ مَا كَسَبُوا وَخَوَّلَ بَالِ فِرْعَوْنَ سُوءَ الْعَذَابِ - یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون کی بری تدبیروں کے شر سے بچا لیا مگر خود قوم فرعون سخت عذاب پہنچائی گئی۔ مولائے کریم نے مؤمن آل فرعون کو دنیا میں اول تو آل فرعون کی ان کے حیل و تدبیروں سے بچایا جس کی تفصیل قرآن میں مذکور نہیں۔ مگر الفاظ قرآن سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو قتل کرنے اور تکلیف پہنچانے کے لئے قوم فرعون نے بہت سی تدبیریں کی تھیں اور جب پھر قوم فرعون غرق ہوئی تو اس بندہ مؤمن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نجات دی گئی، اور آخرت کی نجات تو ظاہر ہی ہے۔

النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ - حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ آل فرعون کی رُوہیں سیاہ پرندوں کی شکل میں ہر روز صبح اور شام دو مرتبہ جہنم کے سامنے لائی جاتی ہیں اور جہنم کو دکھلا کر ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا ٹھکانا یہ ہے۔

(اخرجہ عبدالرزاق وابن ابی حاتم۔ مظہری)

اور صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی مر جاتا ہے تو عالم برزخ میں صبح و شام اس کو وہ مقام دکھلایا جاتا ہے جہاں قیامت کے حساب کے بعد اس کو پہنچنا ہے اور یہ مقام دکھلا کر روزانہ اس سے کہا جاتا ہے کہ تجھے آخر کار یہاں پہنچنا ہے۔ اگر یہ شخص اہل جنت میں سے ہے تو اس کا مقام جنت اس کو دکھلایا جائے گا اور اہل جہنم میں سے ہے تو اس کا مقام جہنم اس کو دکھلایا جائے گا۔

عذاب قبر | آیت دلیل ہے عذاب قبر کی اور حدیث کی روایات متواترہ اور اجماع امت اس پر شاید ہیں، جن کو احقر نے ایک مستقل رسالہ بنام السبلو بعذاب القبور میں جمع کر دیا ہے مع آیات متعلقہ کے یہ رسالہ احکام القرآن حزب سادس کا جزر ہو کر بزبان عربی شائع ہو گیا۔

وَإِذْ يَتَحَايُّونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعَفَاءُ

اور جب آپس میں جھکڑیں گے آگ کے اندر پھر کہیں گے کمزور

لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ

غور کرتے والوں کو ہم تھے تمہارے تابع پھر کچھ تم

أَنْتُمْ مُّغْنُونَ عَنَّا نَصِيبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾

ہم یہ سے اٹھا لو گے حصہ آگ کا

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُلٌّ فِيهَا ﴿۴۸﴾

کہیں گے جو غور کرتے تھے ہم سب ہی بڑے ہوئے ہیں یہی

إِنَّ اللَّهَ فَدَّ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۹﴾

بیشک اللہ فیصلہ کر چکا بندوں میں

وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ

اور کہیں گے جو لوگ بڑے ہیں آگ میں دوزخ کے دارو عوں کو

ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا

مانگو اپنے رب سے کہ ہم پر ہلکا کر دے ایک دن

مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۵۰﴾ قَالُوا أَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيكُمُ

تھوڑا عذاب وہ بولے کیا نہ آتے تھے تمہارے پاس

رُسُلُكُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا بَلَىٰ قَالُوا أَفَادْعُوا

تمہارے رسول کھلی نشانیاں لے کر کہیں گے کیوں نہیں بولے پھر پکارو

وَمَا دُعَاؤُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿۵۱﴾

اور کچھ نہیں کافروں کا پکارنا مگر بھٹکنا



## خلاصہ تفسیر

اور (وہ وقت بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے) جبکہ کفار دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو ادنیٰ درجہ کے لوگ (یعنی تابعین) بڑے درجہ کے لوگوں سے (یعنی متبعین جن کا وہ دنیا میں اتباع کیا کرتے تھے) کہیں گے کہ ہم دنیا میں تمہارے تابع تھے کیا تم ہم سے آگ کا کوئی جزا بٹا سکتے ہو (یعنی جب دنیا میں تم نے ہمیں اپنا تابع اور پیرو بنا رکھا تھا تو آج تمہیں ہماری مدد کرنا چاہیے) وہ بڑے لوگ کہیں گے کہ ہم سب ہی دوزخ میں ہیں (یعنی ہم اپنا ہی عذاب کم نہیں کر سکتے تو تمہارا کیا کریں گے) اللہ تعالیٰ (اپنے) بندوں کے درمیان (قطعی) فیصلہ کر چکا (اب اس کے خلاف کرنے کی کس کو مجال ہے) اور (اس کے بعد) جتنے لوگ دوزخ میں ہوں گے (یعنی بڑے اور چھوٹے تابع اور متبع سب مل کر) جہنم کے موکل فرشتوں سے (درخواست کے طور پر) کہیں گے کہ تم ہی اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ کسی دن تو ہم سے عذاب ہلکا کر دے (یعنی عذاب کے بالکل ہٹ جانے یا ہمیشہ کے لئے کم ہو جانے کی امید تو نہیں، کم از کم ایک روز کی تو کچھ چھٹی مل جایا کرے) فرشتے کہیں گے کہ (یہ بتلاؤ) کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر معجزات لے کر نہیں آتے رہے (اور دوزخ سے بچنے کا طریقہ نہیں بتلاتے رہے) دوزخی کہیں گے ہاں آتے تو رہے تھے (مگر ہم نے ان کا کہنا نہ مانا بتلی قَدْ جَاءَنَا نَارُكَ كَذِبًا) فرشتے کہیں گے کہ تو پھر (ہم تمہارے لئے دعا نہیں کر سکتے کیونکہ کافروں کے لئے دعا کرنے کی ہم کو اجازت نہیں ہے) تم ہی (اگر جی چاہے تو خود دعا کر لو) اور (تمہاری دعا کا بھی کچھ نتیجہ نہ ہوگا کیونکہ) کافروں کی دعا (آخرت میں) محض بے اثر ہے (کیونکہ آخرت میں کوئی دعا بغیر ایمان کے قبول نہیں ہو سکتی اور ایمان کا موقع دنیا ہی تھا وہ تم کھو چکے اور یہ جو کہا کہ آخرت میں اس سے فائدہ یہ ہے کہ دنیا میں تو کافروں کی دعا بھی قبول ہو سکتی ہے، جیسا کہ سب سے بڑے کافر ابلیس کی سب سے بڑی دعا قیامت تک زندہ رہنے کی قبول کر لی گئی)۔

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ

ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں اور

يَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعَذَرَتُهُمْ

جب کھڑے ہوں گے گواہ جس دن کام نہ آئیں متکروں کو ان کے بہانے

وَلَهُمُ الْعَذَابُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۝ وَلَقَدْ آتَيْنَا

اور ان کو پھٹکار ہے اور ان کے واسطے بُرا گھر اور ہم نے دی

مُوسَى الْهُدَى وَأَوْثَرَ ثَنَاءَ بَنِي إِسْرَءِيلَ الْكِتَابَ ۝

موسیٰ کو راہ کی سوجھ اور وارث کیا بنی اسرائیل کو کتاب کا

هُدًى وَذِكْرَى لِأُولَى الْأَلْبَابِ ۝ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ

سمجھانے والی اور سمجھانے والی عقامتِ بدل کو سوتو ٹھہرا رہ بے شک

وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِدُنْيِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ

وعدہ اللہ کا ٹھیک ہے اور بخشوا اپنا گناہ اور پاکی بول اپنے

رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ

رب کی خوبیاں شام کو اور صبح کو جو لوگ جھگڑتے ہیں

فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَتْهُمْ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ

اللہ کی باتوں میں بغیر کسی سند کے جو پہنچی ہو ان کو اور کوئی بات نہیں

إِلَّا كِبَرُ مَا هُمْ بِبِالْغَيْهِ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ

ان کے دلوں میں غرور ہے کبھی نہ پہنچیں گے اس تک سوتو پناہ مانگ اللہ کی بے شک وہ

السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝ لَخَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ أَكْبَرَ

سننا دیکھتا ہے البتہ پیدا کرنا آسمانوں کا اور زمین کا بڑا ہے

مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝

لوگوں کے بنانے سے لیکن بہت لوگ نہیں سمجھتے

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا

اور برابر نہیں اندھا اور آنکھوں والا اور نہ

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۝ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝

جو بھلے کام کرتے ہیں اور نہ بدکار تم بہت کم سوچ کرتے ہو



إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ

تحقیق قیامت آنی ہے اس میں دھوکا نہیں لیکن بہت سے لوگ

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۵۹﴾ وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ

نہیں مانتے اور کہتا ہے تمہارا رب مجھ کو پکارو کہ پہنچوں تمہاری پکار کو بے شک

الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ ذَا خُرُوجٍ ﴿۶۰﴾

جو لوگ تکبر کرتے ہیں میری بندگی سے اب داخل ہوں گے دوزخ میں ذلیل ہو کر

## خلاصہ تفسیر

ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں (جیسا اوپر  
موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے معلوم ہوا) اور اس روز بھی جس میں گواہی دینے والے (فرشتے جو کہ نامہ  
اعمال لکھتے تھے اور قیامت کے روز اس بات کی گواہی دیں گے کہ رسولوں نے عمل تبلیغ کیا اور کفار نے  
عمل تکذیب بغرض وہ فرشتے گواہی کے لئے کھڑے ہوں گے (مراد اس سے قیامت کا دن ہے، وہاں کی  
مدد کا حال ابھی کفار کے معذرت بالتار ہونے سے معلوم ہو چکا ہے، آگے اس دن کا بیان ہے یعنی)  
جس دن کہ ظالموں (یعنی کافروں) کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دیگی (یعنی اول تو کوئی معذرت  
نہ ہوگی اور اگر کچھ حرکت مذبحی کی طرح ہوئی تو وہ نافع نہ ہوگی) اور ان کے لئے لعنت ہوگی اور ان  
کے لئے اس عالم میں خرابی ہوگی (پس اس طرح آپ اور آپ کے اتباع بھی منظور ہوں گے اور مخالفین  
ذلیل و مستہزور ہوں گے تو آپ تسلی رکھئے) اور (آپ کے قبل) ہم موسیٰ (علیہ السلام) کو ہدایت نامہ  
(یعنی توریت) دے چکے ہیں اور (پھر) ہم نے وہ کتاب بنی اسرائیل کو پہنچائی تھی کہ وہ ہدایت اور نصیحت  
(کی کتاب) تھی اہل عقل (سلیم) کے لئے (بخلاف بے عقلوں کے کہ وہ اس سے مستفیع نہ ہوئے) اسی طرح  
مثل موسیٰ علیہ السلام کے آپ بھی صاحب رسالت و صاحب وحی ہیں اور اسی طرح مثل بنی اسرائیل  
کے آپ کے متبعین آپ کی کتاب کی خدمت کریں گے اور جیسے ان میں اہل عقل تصدیق کرنے والے  
اور متبع تھے اور بے عقل لوگ منکر و مخالفت اسی طرح آپ کی امت میں بھی دونوں طرح کے لوگ ہیں)  
سو (اس سے بھی) آپ (تسلی حاصل کیجئے اور کفار کی ایذاؤں پر) صبر کیجئے بے شک اللہ کا وعدہ (جس  
کا اوپر لنڈھڑا الخ نہیں ذکر ہوا ہے بالکل) سچا ہے اور (اگر کبھی کمال صبر میں کچھ کمی ہو گئی ہو جو حسب  
قواعد شرعیہ واقع میں تو گناہ نہیں، مگر آپ کے رتبہ عالی کے اعتبار سے وجوب تدارک میں مثل  
گناہ ہی کے ہے، اس کا تدارک کیجئے وہ تدارک یہ ہے کہ) اپنے (اُس) گناہ کی (جس کو مجازاً آپ کی

شان عالی کے اعتبار سے گناہ کہہ دیا گیا ہے) معافی مانگیے اور (ایسے شغل میں لگے رہیے کہ غمگین و خیر  
 کرنے والی چیزوں کی طرف التفات ہی نہ ہو، وہ شغل یہ ہے کہ) شام اور صبح (یعنی علی الدوام) اپنے  
 رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہیے (یہ مضمون تو آپ کی تسلی کے متعلق ہو گیا، آگے منکرین و مجادلین پر  
 تو بیخ اور رد ہے یعنی) جو لوگ بلا کسی سند کے کہ ان کے پاس موجود ہو، خدا کی آیتوں میں جھگڑے  
 نکالا کرتے ہیں (ان کو کوئی وجہ اشتباہ کی نہیں ہے کہ وہ جدال کا سبب ہو سکیں) ان کے دلوں میں  
 نرمی بڑائی (یہی بڑائی) ہے کہ وہ اس تک کبھی پہنچنے والے نہیں (اور وہ بڑائی سبب جدال کا ہے  
 کیونکہ وہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں) اتباع سے عار آتا ہے وہ خود ادروں ہی کو اپنا تابع بنانے کی ہوس  
 رکھتے ہیں۔ لیکن ان کو یہ بڑائی نصیب نہ ہوگی بلکہ جلد ہی ذلیل و خوار ہوں گے۔ چنانچہ بدر وغیرہ  
 میں مسلمانوں سے مغلوب ہوئے) سو (جب یہ خود بڑائی چاہتے ہیں تو آپ سے حسد و عداوت  
 سب کچھ کریں گے لیکن) آپ (اندیشہ نہ کیجئے بلکہ ان کے شر سے) اللہ کی پناہ مانگیے رہیے، بے شک  
 وہی ہے سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا (تو وہ اپنی صفات کمال سے اپنی پناہ میں آئے  
 ہوئے لوگوں کو محفوظ رکھے گا یہ جدال تو آپ کو رسول ماننے میں تھا۔ آگے ان کا جدال قیامت کے  
 متعلق مع رد مذکور ہے یعنی وہ لوگ جو آدمیوں کے دوبارہ پیدا ہونے کے منکر ہیں بڑے کم عقل ہیں،  
 اس واسطے کہ) بالیقین آسمانوں اور زمین کا (ابتداء) پیدا کرنا آدمیوں کے (دوبارہ) پیدا کرنے کی  
 نسبت بڑا کام ہے (جب بڑے کام پر قدرت ثابت ہوگئی تو چھوٹے پر بدرجہ اولیٰ ثابت ہے اور یہ  
 دلیل ثبوت کے لئے کافی شافی ہے) لیکن اکثر آدمی (اتنی بات) نہیں سمجھتے (کیونکہ وہ غور ہی نہیں کرتے  
 اور بعینہ ایسے بھی ہیں جو غور بھی کرتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں اور مانتے بھی ہیں، اس طرح قرآن کو  
 سننے والوں کی دو قسم ہو گئیں، ایک اس کو سمجھنے اور ماننے والے یہ صاحب بصیرت اور صاحب ایمان  
 ہیں۔ دوسرے نہ سمجھنے اور نہ ماننے والے یہ مثل نابینا اور بدعمل کے ہیں) اور (ان دونوں قسموں  
 کے آدمی یعنی ایک) بینا (دوسرا) نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے  
 کام کئے اور (دوسرے) بدکار باہم برابر نہیں ہوتے (اس میں آپ کی تسلی بھی ہے کہ ہر قسم کے  
 لوگ ہوا کرتے ہیں، سب کیسے سمجھنے لگیں اور منکرین پر عذاب قیامت کی وعید بھی ہے کہ ہم  
 سب کو برابر نہ رکھیں گے۔ آگے منکرین کو یعنی ان لوگوں کو جو مثل نابینا کے اور بدعمل ہیں بطور التفات  
 کے زجر ہے فرماتے ہیں کہ) تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو (اور نہ اعلیٰ اور بدعمل نہ سمجھتے۔ اور قیامت کے  
 متعلق جدال کا جواب دیکر آگے اس کے واقع ہونے کی خبر دیتے ہیں کہ) قیامت تو ضرور ہی آکر رہیگی  
 اس (کے آنے) میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں مگر اکثر لوگ (بوجہ عدم تدبیر فی الدلائل کے  
 اس کو) نہیں مانتے اور (ایک جدال ان کا توحید میں تھا کہ خدا کے ساتھ شریک کرتے تھے



آگے اس کے متعلق کلام ہے یعنی، تمھارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ غیروں کو حوائج کے لئے رست پکارو بلکہ مجھ کو پکارو میں (یا مستثنائاً نامناسب معروض کے) تمھاری (ہر) درخواست قبول کر لوں گا (دعا کے متعلق آیت قرآنی فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ إِلَيْهِ إِنَّ شَاءَ كَآءِیْهِیْ مَطْلَبُ ہِیْ کہ نامناسب درخواست و دعا کو رد کر دیا جائے گا) جو لوگ (صرف) میری عبادت سے (جسمیں) مجھ سے دعا مانگتا بھی داخل ہے) سرِ بانی کرتے ہیں (اور غیروں کو پکارنے اور ان کی عبادت کرتے ہیں، حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ توحید سے اعراض کر کے شرک کرتے ہیں) وہ عنقریب (مئے ہی) ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

## معارف و مسائل

إِنَّا لَنَنْصُرُكُمْ وَنُكَفِّرُ عَنْكُمُ الذَّنْبَ — اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے رسولوں اور مومنین کی مدد کیا کرتے ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور ظاہر ہے کہ یہ مدد بمقابلہ مخالفین اور اعداء کے مقصود ہے۔ اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق تو اس کا وقوع ظاہر ہے مگر بعض انبیاء علیہم السلام جیسے یحییٰ و زکریا و عیسیٰ علیہم السلام جن کو دشمنوں نے شہید کر دیا یا بعض کو وطن چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کرنا پڑی۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق مشبہ ہو سکتا ہے۔

ابن کثیر نے بحوالہ ابن جریر اس کا جواب دیا ہے کہ آیت میں نصرت سے مراد انتصار اور دشمنوں سے انتقام لینا ہے۔ خواہ ان کی موجودگی میں ان کے ہاتھوں سے یا ان کی وفات کے بعد۔ یہ معنی تمام انبیاء و مومنین پر بلا کسی استثناء کے صادق ہیں جن لوگوں نے اپنے انبیاء کو قتل کیا پھر وہ کیسے کیسے عذابوں میں گرفتار کر کے رسوا کئے گئے، اس سے تاریخ لبریز ہے۔ حضرت یحییٰ، زکریا اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے قاتلوں پر ان کے دشمنوں کو مسلط کر دیا جنھوں نے ان کو ذلیل و خوار کر کے قتل کیا۔ مگر وہ اللہ نے کیسے عذاب میں پکڑا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں پر اللہ تعالیٰ نے روم کو مسلط کر دیا۔ جنھوں نے ان کو ذلیل و خوار کیا اور پھر قیامت سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ ان کو دشمنوں پر غالب فرمائیں گے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں زیر کیا ان کے سرکش سردار مارے گئے۔ کچھ قید کر کے لائے گئے، باقی ماندہ فتح مکہ میں گرفتار کر کے لائے گئے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر دیا۔ آپ کا کلمہ دنیا میں بلند ہوا اور وہی سب ادیان پر

غالب آیا، پورے جزیرۃ العرب پر آپ کے زمانے ہی میں اسلام کی حکومت قائم ہو گئی۔

يَوْمَ يَقُومُ آلُ شِهَادٍ۔ یعنی جس دن کھڑے ہوں گے گواہ، مراد یوم قیامت ہے، وہاں تو انبیاء و مؤمنین کے لئے نصرت الہیہ خصوصی ظہور ہوگا۔

إِنِّ فِي صُدُورِهِمْ حَمَلٌ لِّكِبْرٍ مَّا هُمْ بِبَالِغِيهِ۔ یعنی یہ لوگ جو اللہ کی آیات میں بغیر کسی حجت و دلیل کے جہال کرتے ہیں، اور مقصد و راصل اس دین سے انکار کرنا ہے جس کا سبب اسکے سوا کچھ نہیں کہ ان کے دلوں میں تکبر ہے۔ یہ اپنی برائی پہنچتے ہیں اور اپنی بے وقوفی سے یوں سمجھتے ہوئے ہیں کہ یہ بڑائی ہمیں اپنے مذہب پر قائم رہنے سے حاصل ہے، اس کو چھوڑ کر مسلمان ہو جائیں گے تو ہماری یہ ریاست و اقتدار نہ رہے گا۔ قرآن کریم نے فرمادیا کہ مَّا هُمْ بِبَالِغِيهِ یعنی یہ اپنی معیومہ بڑائی و عظمت اور ریاست کو اسلام لائے بغیر نہ پاسکیں گے۔ البتہ اسلام لے آئے تو عزت و عظمت ان کے ساتھ ہوتی۔ (قرطبی)

وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ۔

دُعا کے لفظی معنی پکارنے کے ہیں اور اکثر استعمال کسی حاجت و ضرورت کے لئے پکارنے میں ہوتا ہے۔ کبھی مطلق ذکر اللہ کو بھی دعا رکھا جاتا ہے۔ یہ آیت اُمت محمدیہ کا خاص اعزاز ہے کہ ان کو دعا مانگنے کا حکم دیا گیا۔ اور اسکی قبولیت کا وعدہ کیا گیا۔ اور جو دُعا مانگے اس کے لئے عذاب کی وعید آئی ہے۔

حضرت قتادہؓ نے کتب اجماع سے نقل کیا ہے کہ پہلے زمانے میں یہ خصوصیت انبیاء علیہم السلام کی تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوتا تھا کہ آپ دُعا کریں میں قبول کروں گا۔ اُمت محمدیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ حکم تمام اُمت کے لئے عام کر دیا گیا۔ (ابن کثیر)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث بیان فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ۔ یعنی دعا عبادت ہی ہے اور پھر آپ نے استدلال میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي۔

(رواہ الامام احمد و الترمذی و النسائی و ابوداؤد وغیرہ۔ ابن کثیر)

تفسیر منطہری میں ہے کہ جملہ إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ میں بقاعدہ عربیت (قصر المسند علی المسند الیہ) یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ دعا عبادت ہی کا نام ہے یعنی ہر دعا عبادت ہی ہے اور (قصر المسند الیہ علی المسند کے طور پر) یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ ہر عبادت ہی دعا ہے۔ یہاں دونوں احتمال ہیں۔ اور مراد یہاں یہ ہے کہ دعا اور عبادت اگرچہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے دونوں جدا جدا ہیں مگر مصداق



کے اعتبار سے دونوں مقدّم ہیں کہ ہر دعا عبادت ہے اور ہر عبادت دعا ہے۔ وہ یہ ہے کہ عبادت نام ہے کسی کے سامنے انتہائی تذلل اختیار کرنے کا اور ظاہر ہے کہ اپنے آپ کو کسی کا محتاج سمجھ کر اس کے سامنے سوال کے لئے یہ ہاتھ پھیلا کر تذلل ہے جو مفہوم عبادت کا ہے۔ اسی طرح ہر عبادت کا حاصل بھی اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور رحمت اور دنیا اور آخرت کی عافیت مانگنا ہے۔ اسی لئے ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص میری حمد و ثنا میں اتنا مشغول ہو کہ اپنی حاجت مانگنے کی بھی اسے فرصت نہ ملے ہیں اُس کو مانگنے والوں سے زیادہ دوں گا۔ (یعنی اُس کی حاجت پوری کر دوں گا)۔ (رواہ ابجزری فی النہایہ) اور ترمذی و مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: مَنْ شَغَلَ الْقُرْآنَ عَنْ ذِكْرِي وَشَغَلَتْهُ اعْطَيْتَهُ أَفْضَلَ مَا أُعْطِيَ السَّائِلِينَ۔ یعنی جو شخص تلاوت قرآن میں اتنا مشغول ہو کہ مجھ سے اپنی حاجات مانگنے کی بھی اسے فرصت نہ ملے تو میں اس کو آندوں گا کہ مانگنے والوں کو بھی اتنا نہیں ملتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت بھی وہی فائدہ دیتی ہے جو دعا کا فائدہ ہے۔

اور عرفات کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عرفات میں میری دعا اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی دعا (یہ کلمہ ہے) لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (رواہ ابن ابی شیبہ منظرہری) اس میں عبادت اور ذکر اللہ کو دعا فرمایا ہے، اور اس آیت میں عبادت بمعنی دعا کے ترک کرنے والوں کو جو جہنم کی وعید پائی گئی ہے وہ بصورت استکبار ہے یعنی جو شخص بطور استکبار کے اپنے آپ کو دعا سے مستغنی سمجھ کر دعا چھوڑے یہ علامت کفر کی ہے اس لئے وعید جہنم کا استحقاق ہوا۔ ورنہ فی نفسہ عام دعائیں فرض واجب نہیں، اُن کے ترک سے کوئی گناہ نہیں۔ البتہ باجماع علماء مستحب اور افضل ہے۔ (منظرہری) اور حسب تصریح احادیث موجب برکات ہے۔

**حَدِيثُ:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے فضائل دعا زیادہ کوئی چیز مکرم نہیں۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ حاکم عن ابی ہریرۃ)۔

**حَدِيثُ:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الدعاء طح العبادۃ یعنی دعا

عبادت کا مغز ہے۔ (ترمذی عن النسائی)

**حَدِيثُ:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگا کرو،

کیونکہ اللہ تعالیٰ سوال اور حاجت طلبی کو پسند فرماتا ہے اور سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ سمجھتی کے وقت آدمی فراخی کا انتظار کرے۔ (ترمذی عن ابن مسعود رضی)

**حَدِيثُ:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ سے اپنی حاجت کا سوال

نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کا اس پر غضب ہوتا ہے۔ (ترمذی۔ ابن حبان۔ حاکم)۔

ان سب روایات کو تفسیر مظہری میں نقل کر کے فرمایا کہ دعا نہ مانگنے والے پر غضب الہی کی وعید اس صورت میں ہے کہ نہ مانگنا تکبر اور اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے کی بنا پر ہو جیسا کہ آیت مذکورہ **لَا تَكُن مِّنَ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ** کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔

**حَدِيث:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دعا سے عاجز نہ ہو کیونکہ دعا کے ساتھ کوئی ہلاک نہیں ہوتا۔ (ابن حبان۔ حاکم عن انس رض)۔

**حَدِيث:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون اور آسمان و زمین کا نور ہے۔ (حاکم فی المستدرک عن ابی ہریرہ رض)۔

**حَدِيث:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کیلئے دعا کے دروازے کھول دیئے گئے اُس کے واسطے رحمت کے دروازے کھل گئے اور اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا اس سے زیادہ محبوب نہیں مانگی گئی کہ انسان اُس سے عافیت کا سوال کرے۔ (ترمذی۔ حاکم عن ابن عمر رض)۔ لفظ عافیت بڑا جامع لفظ ہے جس میں بلا سے حفاظت اور ہر ضرورت و حاجت کا پورا ہونا داخل ہے۔

**مسئلہ:** کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا مانگنا حرام ہے وہ دعا اللہ کے نزدیک قبول بھی نہیں ہوتی۔ (کافی الحدیث عن ابی سعید الخدری رض)۔

آیت مذکورہ میں اس کا وعدہ ہے کہ جو بندہ اللہ سے دعا مانگتا ہے وہ قبول ہوتی ہے قبولیت دعا کا وعدہ مگر بعض اوقات انسان یہ بھی دیکھتا ہے کہ دعا مانگی وہ قبول نہیں ہوتی۔ اس کا جواب ایک حدیث میں ہے جو حضرت ابو سعید خدریؓ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان جب بھی دعا اللہ سے کرتا ہے اللہ اس کو عطا فرماتا ہے۔ بشرطیکہ اُس میں کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو، اور قبول فرمانے کی تین صورتوں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے ایک یہ کہ جو مانگا دہری مل گیا، دوسرے یہ کہ اس کی مطلوب چیز کے بدلے اس کو آخرت کا کوئی اجر و ثواب دیدیا گیا۔ تیسرے یہ کہ مانگی ہوئی چیز تو نہ ملی مگر کوئی آفت و مصیبت اس پر آنے والی تھی وہ مل گئی۔ (مسند احمد۔ مظہری)۔

آیت مذکورہ میں تو بظاہر کوئی شرط نہیں۔ یہاں تک مسلمان ہونا بھی قبولیت دعا کی شرائط دعا کی شرط نہیں ہے۔ کافر کی دعا بھی اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ یہاں تک

کہ ابلیس کی دعا تا قیامت زندہ رہنے کی قبول ہو گئی۔ نہ دعا کے لئے کوئی وقت شرط نہ طہارت اور نہ با وضو ہونا شرط ہے۔ مگر احادیث معتبرہ میں بعض چیزوں کو موانع قبولیت فرمایا ہے۔ ان چیزوں سے اجتناب لازم ہے جیسا کہ حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض آدمی بہت سفر کرتے اور آسمان کی طرف دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور یا رب



یا رب کہہ کر اپنی حاجت مانگتے ہیں مگر ان کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام، ان کو حرام ہی غذا دی گئی تو ان کی دعا کہاں قبول ہوگی۔ (رواہ مسلم)۔

اسی طرح غفلت و بے پروائی کے ساتھ بغیر دھیان دئے دعا کے کلمات پڑھیں تو حدیث میں اس کے متعلق بھی آیا ہے کہ ایسی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ (ترمذی عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا

اللہ ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے رات کو کہ اس میں چلین پکڑو اور دن بنایا دیکھنے کو

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَالنَّاسِ

اللہ تو فضل والا ہے لوگوں پر اور لیکن بہت لوگ

لَا يَشْكُرُونَ ﴿٦١﴾ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ عَمَّ

حق نہیں مانتے وہ اللہ ہے رب تمہارا ہر چیز بنانے والا

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَآَنِي تَوَفَّكُونَ ﴿٦٢﴾ كَذٰلِكَ يُؤَفِّكُ الَّذِينَ

کسی کی بندگی نہیں اُسکے سوائے پھر کہاں سے پھرے جاتے ہو اسی طرح پھرے جاتے ہیں جو لوگ

كَانُوا بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٦٣﴾ اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ

کہ اللہ کی باتوں سے منکر ہو لے رہتے ہیں اللہ ہے جس نے بنایا تمہارے

لَكُمْ الْأَرْضَ قَرَارًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ

لئے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو عمارت اور صورت بنائی تمہاری تو اچھی

صَوَّرَكُمْ وَرَازِقُكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ۚ ذٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۚ

بنائیں صورتیں تمہاری اور روزی دے تم کو ستھری چیزوں سے وہ اللہ ہے رب تمہارا

فَتَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٤﴾ هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ

سو بڑی برکت ہے اللہ کی جو رب ہے سارے جہان کا وہ ہے زندہ رہنے والا کسی کی بندگی نہیں اُس کے

فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ

سوائے سو اس کو پکارو خالص کر کے اس کی بندگی سب حمدی اللہ کو جو رب ہے

الْعَالَمِينَ ﴿٦٥﴾ قُلْ إِنِّي نَهَيْتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ

سارے جہان کا تو کہہ کہ مجھ کو منع کر دیا کہ پوجوں ان کو جن کو تم پکارتے ہو

مِنْ دُونِ اللَّهِ لَمَّا جَاءَنِي الْيَقِينُ مِنْ رَبِّي وَأَمَرْتُ

سوائے اللہ کے جب پہنچ چکیں میرے پاس کھلی نشانیاں میرے رب سے اور مجھ کو حکم ہوا

أَنْ أَسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ

کہ تابع رہوں جہان کے پروردگار کا وہی ہے جس نے بنایا تم کو

تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نَظْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ

خاک سے پھر پانی کی بوند سے پھر خون کے ہوئے سے پھر تم کو نکالتا ہے

طِفْلًا ثُمَّ لِيَبْلُغُوا أَشَدَّكُمْ ثُمَّ لِيَکُونُوا شُيُوخًا

بچہ پھر جب تک کہ پہنچیں اپنے پورے زور کو پھر جب تک کہ ہو جاؤ بوڑھے

وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّى مِنْ قَبْلُ وَلِيَبْلُغُوا أَجَلَ مُّسَمًّى وَ

اور کوئی تم میں ایسا ہے کہ مر جاتا ہے پہلے اس سے اور جب تک کہ پہنچیں نیکے وعدے کو اور

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۶۸﴾ هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ فَإِذَا

تاکہ تم سوچو وہی ہے جو چلاتا ہے اور مارتا ہے پھر جب

قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۶۹﴾

حکم کرے کسی کام کا تو یہی کہے اُس کو کہ ہو جا وہ ہو جاتا ہے

## خلاصہ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے (نفع کے) لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور اسی نے دن کو (دیکھنے کے لئے) روشن بنایا تاکہ بے تکلف معاش حاصل کرو بے شک اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر بڑا ہی فضل ہے کہ ان کی مصالحتوں کی کسی کسی رعایت فرمائی لیکن اکثر آدمی (ان نعمتوں کا) شکر نہیں کرتے (بلکہ اللہ شکر کرتے ہیں) یہ اللہ ہے تمہارا رب (جس کا ذکر ہوا نہ وہ جن کو تم نے تراش رکھا ہے) وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو (بعد اثبات توحید کے) تم لوگ کہیں (شرک کر کے) الٹے چلے جا رہے ہو (اور مخاطبین کی کیا تخصیص ہے جس طرح تعصب و عناد سے یہ الٹے چلے جا رہے ہیں) اُسی طرح وہ (پہلے) لوگ بھی اُلتے چلا کرتے تھے جو اللہ کی (تکوینی و تنزیلی) نشانیوں کا انکار کیا کرتے تھے اللہ ہی ہے جس نے زمین کو مخلوق کا قرار گاہ بنایا اور آسمان کو (اوپر سے مثل) چھت (کے) بنایا اور تمہارا نقشہ بنایا سو عمدہ نقشہ بنایا (چنانچہ انسان کے اعضاء کی برابر کسی حیوان کے اعضاء میں تناسب



نہیں اور یہ مشاہدہ مسلم ہے) اور تم کو عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو دیں (پس) یہ اللہ ہے تمہارا رب سو بڑا  
 عالی شان ہے اللہ جو سارے جہان کا پروردگار ہے وہی (اُزلی ابدی) زندہ (رہنے والا) ہے اُس کے  
 سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو تم (سب) خالص اعتقاد کر کے اس کو پکارا کرو (اور مشرک نہ کیا کرو)  
 تمام خوبیاں اسی اللہ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا آپ (ان مشرکوں کو سنانے کے  
 لئے) کہہ دیجئے کہ مجھ کو اس سے ممانعت نہ دی گئی ہے کہ میں اُن (مشرکوں) کی عبادت کروں جن کو  
 خدا کے علاوہ تم پکارتے ہو جبکہ میرے پاس میرے رب کی نشانیاں آچکیں (مراد دلائل عقلیہ و نقلیہ ہیں  
 مطلب یہ کہ شرک سے مجھے ممانعت ہوئی ہے) اور مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ میں (صرف) رب العالمین کے  
 سامنے (عبادت میں) گروں جھکا لوں (مطلب یہ کہ مجھ کو توحید کا حکم ہوا ہے) وہی ہے جس نے تم کو (یعنی  
 تمہارے باپ کو) تمہی سے پیدا کیا پھر (آگے اُن کی نسل کو) نطفہ سے پھر خون کے لو تھڑے سے (جیسا کہ  
 سورہ حج میں بیان ہوا ہے) پھر تم کو بچہ کر کے (ماں کے پیٹ سے) نکالتا ہے پھر (تم کو زندہ رکھتا ہے)  
 تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو پھر (تم کو اور زندہ رکھتا ہے) تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ اور کوئی کوئی تم میں سے  
 (ان عمروں سے یعنی جوانی اور بڑھاپے سے) پہلے ہی مر جاتا ہے (یہ تو سب کا الگ الگ حال ہوا کہ کوئی  
 جوان ہوا کوئی نہ ہوا کوئی بوڑھا ہوا کوئی نہ ہوا) اور (یہ امر آئندہ سب میں مشترک ہے کہ تم میں سے  
 ہر ایک کو ایک خاص عمر دیتا ہے) تاکہ تم سب (اپنے اپنے) وقت مقرر (مقرر) تک پہنچ جاؤ (پس یہ  
 امر کلی ہے اور جزئیات مختلف سب اسی کلی کے جزئی ہیں) اور (یہ سب کچھ اس لئے کیا) تاکہ تم لوگ  
 (ان امور میں غور کر کے خدا تعالیٰ کی توحید کو) سمجھو وہی ہے جو چلاتا ہے اور مارتا ہے پھر جب وہ  
 کسی کام کو (دفعۃً) پورا کرنا چاہتا ہے سولس اس کی نسبت (اتنا) فرما دیتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جا  
 ہے۔

## معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ کے انعامات اور قدرت کاملہ کے چند مظاہر پیش کر کے توحید کی  
 دعوت دی گئی ہے۔

جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا - غور کیجئے کہ کتنی بڑی نعمت  
 ہے کہ قدرت نے تمام طبقات انسان بلکہ جانوروں تک کے لئے فطری طور پر نیند کا ایک وقت معین  
 کر دیا۔ اور اس وقت کو اندھیرا کر کے نیند کیلئے مناسب بنا دیا۔ اور سب کی طبیعت و فطرت میں  
 رکھ دیا کہ اسی وقت یعنی رات کو نیند آتی ہے ورنہ جس طرح انسان اپنے کاروبار کے لئے اپنی طبیعت  
 و سہولت کے لحاظ سے اوقات مقرر کرتا ہے۔ اگر نیند بھی اسی طرح اس کے اختیار میں ہوتی۔ اور ہر انسان

اپنی نیند کا پروگرام مختلف اوقات میں بنایا کرتا تو نہ سونے والوں کو نیند کی لذت و راحت ملتی نہ جاگنے والوں کے کام کا نظم درست ہوتا۔ کیونکہ انسانوں کی حاجتیں باہم ایک دوسرے سے متعلق ہوتی ہیں، اگر اوقات نیند کے مختلف ہوتے تو جاگنے والوں کے وہ کام مختل ہو جاتے جو سونے والوں سے متعلق ہیں اور سونے والوں کے وہ کام خراب ہو جاتے جن کا تعلق جاگنے والوں سے ہے اور صرف انسانوں کی نیند کا وقت متعین ہوتا۔ بہائم اور حیوانات کی نیند کے اوقات دوسرے ہوتے تو بھی انسانی کاموں کا نظام مختل ہو جاتا۔

وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ۔ انسان کی صورت کو اللہ تعالیٰ نے سب جانوروں سے ممتاز اعلیٰ اور بہتر حیثیت میں بنایا ہے۔ اس کو سوچنے سمجھنے کی عقل عطا فرمائی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ایسے بنائے کہ ان سے طرح طرح کی اشیاء و مصنوعات بنا کر اپنی راحت کے سامان پیدا کر لیتا ہے۔ اس کا کھانا پینا بھی عام جانوروں سے ممتاز ہے وہ اپنے منہ سے چرتے اور پیٹے ہیں یہ ہاتھوں سے کام لیتا ہے۔ عام جانوروں کی غذا مفردات سے ہے، کوئی گوشت کھاتا ہے کوئی گھاس اور پیٹے اور وہ بھی بالکل مفرد بخلاف انسان کے کہ یہ اپنے کھانے کو مختلف قسم کی چیزوں پھلوں ترکاریوں گوشت اور مصالحہ سے لذیذ و مرغوب بنا کر کھاتا ہے۔ ایک ایک پھل سے طرح طرح کے کھانے اور اجزاء مرتبے، چٹنی تیار کرتا ہے۔ فقبارک اللہ احسن الخالقین۔

الْمُتَرِّ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ ط أَنَّىٰ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں کہاں سے

يُصْرَفُونَ ﴿٤٩﴾ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا

پھیرے جاتے ہیں وہ لوگ کہ جنہوں نے جھٹلایا اس کتاب کو اور اس کو جو بھیجا ہم نے

بِهِمْ سَلَنَّا قَدْ فَسَدُوا يَعْلَمُونَ ﴿٥٠﴾ إِذَا الْأَعْلَىٰ فِي

اپنے رسولوں کے ساتھ سو آخر جان لیں گے جب طوق پر ہیں ان کی

أَعْنَاقِهِمُ وَالسَّلَاسِلُ ط يُسْحَبُونَ ﴿٥١﴾ فِي الْحَمِيمِ

گردلوں میں اور زنجیریں بھی کھینچے جائیں جلتے پانی میں

ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ ﴿٥٢﴾ ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ آيِنَ مَا

پھر آگ میں ان کو جھونک دیں پھر ان کو کہیں کہاں گئے

كُنْتُمْ تُشْرِكُونَ ﴿٥٣﴾ مِنْ دُونِ اللَّهِ ط قَالُوا ضَلُّوا

جن کو تم شرک بتلا کرتے تھے اللہ کے سوائے بولیں وہ ہم سے چوک گئے



عَنَابِلٌ لَّمْ تَكُنْ نَدْعُوا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا ط كَذَلِكَ

کوئی نہیں ہم تو پکارتے نہ تھے پہلے کسی چیز کو اسی طرح

يُضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ ﴿٤٧﴾ ذَلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُونَ

بھلاتا ہے اللہ منکروں کو یہ بدلہ اُس کا جو تم اتراتے پھرتے تھے

فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُونَ ﴿٤٨﴾

زمین میں ناحق اور اس کا جو تم اڑتے تھے

أَدْخَلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا هِيَ قَبْعُ عَسَى

داخل ہو جائے دروازوں میں دوزخ کے سدا رہنے کو اُس میں سو کیا بُرا

مَثْوًى الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٤٩﴾ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ هُوَ

ٹھکانا ہے غرور والوں کا سو تو ٹھہرا رہ بیشک وعدہ اللہ کا بھیک ہے

فَأَمَّا نُرِّيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَقَّعَنَّكَ

پھر اگر ہم دکھلا دیں تجھ کو کوئی وعدہ جو ہم ان سے کرتے ہیں یا تمہیں کریں تجھ کو

فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٥٠﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ

ہر حالت میں ہماری ہی طرف پھرتے تھے اور ہم نے بھیجے ہیں بہت رسول تجھ سے پہلے

مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ

بعضے ان میں وہ ہیں کہ ہم نے سنایا تجھ کو ان کا احوال اور بعضے ہیں کہ

نَقْصُصْ عَلَيْكَ ط وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ

نہیں سنایا اور کسی رسول کا مقدور نہ تھا کہ لے آتا کوئی نشانی

إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ هَ إِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ فَخُذْ بِالْحَقِّ

مگر اللہ کے حکم سے پھر جب آیا حکم اللہ کا فیصلہ ہو گیا انصاف سے

وَتَخَسِرَ هُنَالِكَ الْهَاطِلُونَ ﴿٥١﴾

اور لوٹے میں پڑے اس جگہ چھوٹے

خُلَاَصَةُ تَفْسِيرِ

کیا آپ نے ان لوگوں (کی حالت) کو نہیں دیکھا جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں (حق سے) کہاں پھرے چلے جا رہے ہیں جن لوگوں نے اس کتاب (یعنی قرآن) کو جھٹلایا اور اس

چیز کو بھی (جھٹلایا) جو ہم نے اپنے پیغمبروں کو دیکر بھیجا تھا (اس میں کتب و احکام و معجزات سب داخل ہو گئے) کیونکہ مشرکین عرب اور کسی پیغمبر کو بھی نہیں مانتے تھے (سوان کو ابھی (یعنی قیامت میں کہ قریب ہے) معلوم ہوا جاتا ہے جبکہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور ان طوقوں میں) زنجیریں (پہر دی) ہوئی ہوں گی جن کا دوسرا سرا سر فرشتوں کے ہاتھ میں ہوگا اور ان زنجیروں سے) ان کو گھسیٹتے ہوئے کھولتے پانی میں پہنچائیں گے۔ پھر یہ آگ میں جھونک دئے جائیں گے پھر ان سے پوچھا جاوے گا کہ وہ (معبود) غیر اللہ کہاں گئے جن کو تم شریک (خدائی) ٹھہراتے تھے (یعنی تمہاری مدد کیوں نہیں کرتے) وہ کہیں گے کہ وہ تو سب ہم سے غائب ہو گئے بلکہ (سچ بات تو یہ ہے کہ) ہم اس کے قبل (دنیا میں جو بتوں کو پوجتے تھے تو اب معلوم ہوا کہ) کسی کو بھی نہیں پوجتے تھے (یعنی معلوم ہوا کہ وہ لاشی محض تھے ایسی بات غلطی ظاہر ہونے کے وقت کہی جاتی ہے جیسے کوئی شخص تجارت میں خسارہ اٹھائے اور اس سے پوچھا جاوے کہ تم فلاں مال کی تجارت کیا کرتے ہو اور وہ کہے کہ میں تو کسی کی بھی تجارت نہیں کرتا یعنی جب اس کا ثمرہ حاصل نہ ہو تو یوں سمجھنا چاہیے کہ گویا وہ عمل ہی نہ ہوا آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کو غلطی میں پھنسائے رکھتا ہے (کہ جس چیز کے لاشی و غیر نافع ہونے کا وہاں وہ خود اقرار کریں گے) آج یہاں ان کی عبادت میں مشغول ہیں ارشاد ہوگا کہ) یہ (سزا) اس کے بدلہ میں ہے کہ تم دنیا میں ناحق خوشیاں مناتے تھے اور اس کے بدلہ میں ہے کہ تم اتراتے تھے (اور اس کے قبل ان کو حکم ہوگا) کہ جہنم کے دروازوں میں گھسو (اور) ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہو سو متکبرین (عن آیات اللہ) کا وہ برا ٹھکانا ہے۔ (اور جب ان سے اس طرح انتقام لیا جاوے گا) تو آپ (چندے) صبر کیجئے بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے (پھر جس (عذاب) کا (مطلقاً) ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں (کہ کفر موجب عذاب ہے) اُس میں سے کچھ تھوڑا سا عذاب) اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی حیات میں ان پر اُس کا نزول ہو جائے) یا (اس کے نزول کے قبل ہی) ہم آپ کو وفات دیدیں (پھر خواہ بعد میں نزول ہو یا نہ ہو) سو (درد و نال) احتمال ہیں کوئی شق ضروری نہیں لیکن ہر حال اور ہر احتمال پر) ہمارے ہی پاس ان کو آنا ہوگا (اور اس وقت بالیقین ان پر عذاب واقع ہوگا) اور (اس بات کو یاد کر کے بھی تسلی حاصل کیجئے کہ) ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے جن میں بعض تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے (اجمالاً یا تفصیلاً) بیان کیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور (اتنا امر سب میں مشترک ہے کہ) کسی رسول سے یہ نہ ہو سکا کہ کوئی معجزہ بدون اذن الہی کے ظاہر ہو سکے (اور اُمت کی ہر فرمائش پوری کر سکے۔ سو بعض اس لئے بھی ان کی تکذیب کرتے رہے، اسی طرح یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو آپ تسلی رکھئے اور صبر کیجئے) پھر جس وقت اللہ کا حکم (نزول عذاب کے لئے) آدیکھا



(خواہ دنیا میں یا آخرت میں بقولہ تعالیٰ فَاِمَّا تُرِيْدُكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُكُمْ فَلَنْ تَوْتَحِيْكَ نَحِيْكَ (عملی) فیصلہ ہو جایا دے گا اور اس وقت اہل باطل خسارہ میں رہ جاویں گے۔

## معارف و مسائل

يُسْحَبُوْنَ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ - حمیم کھولتا ہوا گرم پانی ہے۔ اس آیت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اہل جہنم کو پہلے حمیم میں ڈالا جائے گا، اس کے بعد حمیم یعنی جہنم میں اور لفظ حمیم اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حمیم جہنم سے باہر کسی جگہ ہے۔ سورہ صافات کی آیت ثُمَّ اِنَّهُمْ رُجِعُوْهُمْ اِلَى الْجَحِيْمِ سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حمیم جہنم سے باہر کسی جگہ ہے اہل جہنم کو اس کا پانی پلانے کے لئے لایا جائیگا پھر جہنم میں لوٹا دیا جائے گا۔ اور بعض آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ حمیم بھی حمیم ہی میں ہے جیسے هٰلِكًا جَهَنَّمَ اَلَّتِي يُكَدِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ يَطُوْقُوْنَ بَنِيْنَهَا وَبَنِيْنُ حَمِيْمٍ اِنَّ ط اس میں تصریح ہے کہ حمیم بھی جہنم کے اندر ہے۔

عذر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد و تعارض نہیں۔ جہنم ہی کے بہت سے طبقات ہوں گے جن میں قسم قسم کے عذاب ہوں گے۔ انہیں میں ایک طبقہ حمیم کا بھی ہو سکتا ہے جس کو بوجہ ممتاز اور الگ ہونے کے جہنم سے خارج بھی کہا جاسکتا ہے اور چونکہ یہ بھی ایک طبقہ جہنم ہی کا ہے اس لئے اس کو جہنم بھی کہا جاسکتا ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اہل جہنم زنجیروں میں جکڑے ہوئے کبھی کبھی حمیم میں ڈال دئے جاویں گے کبھی حمیم میں۔

قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا - یعنی جہنم میں پہنچ کر مشرکین کہیں گے وہ بت اور شیاطین جن کی ہم عبادت کیا کرتے تھے آج غائب ہو گئے۔ مراد یہ ہے کہ ہمیں نظر نہیں آ رہے اگرچہ وہ بھی جہنم کے کسی گوشہ میں پڑے ہوں جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے ان کا جہنم میں ہونا ثابت ہے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ خَصَبٌ جَعَلْتُمْ۔

بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَنْحَاثِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمُرُّوْنَ - تفرحون۔ فرح سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں خوش ہونا اور مسرور ہونا۔ اور تفرحون، فرح سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اترنا اور مال و دولت پر فخر و غرور میں مبتلا ہو کر دوسروں کے حقوق میں تعدی کرنا۔ فرح تو مطلقاً مذہوم اور حرام ہے اور فرح یعنی خوشی میں یہ تفصیل ہے کہ مال و دولت کے نشہ میں خدا کو بھول کر معاصی سے لذت حاصل کرنا اور ان پر خوش ہونا یہ تو حرام و ناجائز ہے اور اس آیت میں یہی فرح مراد ہے جیسے قارون کے قصہ میں بھی فرح اسی معنی میں آیا ہے لَا تَفْرَحْ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ - یعنی بہت خوش نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ خوش ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور دوسرا درجہ فرح کا یہ ہے کہ دنیا کی نعمتوں اور راحتوں کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھ کر ان پر خوشی و مسرت کا اظہار کرے، یہ جائز بلکہ مستحب اور مامور بہ ہے۔ ایسی فرح کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا۔ فَبِذٰلِكَ قَلِيْلٌ مِّنْ حَسْبِ الْاِنْسَانِ - یعنی اس پر خوش ہونا چاہیے۔ آیت مذکورہ میں فرح کے ساتھ کوئی قید نہیں مطلقاً سبب عذاب ہے اور فرح کے ساتھ بغیر الحق کی قید لگا کر تبادلاً یا کہ ناحق اور ناجائز لذتوں پر خوش ہونا حرام اور حق و جائز نعمتوں پر بطور شکر کے خوش ہونا عبادت اور ثواب ہے۔

فَاَصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَاِمَّا نُرَبِّتَكُمُ الْاَيَةُ - اس آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشی کے ساتھ اس کے منتظر تھے کہ کافروں کو عذاب ملے۔ اس لئے آپ کی تسلی کے لئے اس آیت میں یہ فرمایا کہ آپ ذرا صبر کریں، اللہ نے جو وعدہ ان کے لئے عذاب کا کیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ خواہ آپ کی حیات ہی میں یا آپ کی وفات کے بعد۔ کافروں کے عذاب کا انتظار بظاہر شانِ رحمتہ للعالمین کے منافی ہے۔ لیکن جبکہ مجرمین کو سزا دینے سے مقصد غیر مجرم مؤمنین کو حقیقت پر ظلم کیا گیا تھا تو سزا دینا ہو تو مجرموں کو سزا، شفقت و رحمت کے منافی نہیں۔ کسی مجرم کو سزا دینا کسی کے نزدیک بھی رحمت کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔

اللّٰهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا

اللہ ہے جس نے بنادیئے تمہارے واسطے جو پائے تاکہ سواری کرو بعضوں پر

وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٤٩﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا

اور بعضوں کو کھاتے ہو اور ان میں تم کو بہت فائدے ہیں اور تاکہ پہنچو

عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ

ان پر چڑھ کر کسی کام تک جو تمہارے جی میں ہو اور ان پر اور کشتیوں پر

تَحْمَلُوْنَ ﴿٥٠﴾ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖٓ قٰلَ اٰيٰتُ اللّٰهِ

لہے پھرتے ہو اور دکھلاتا ہے تم کو اپنی نشانیاں پھر کون کون سی نشانیوں کو اپنے

تَنْكِرُوْنَ ﴿٥١﴾ اَفَلَمْ يَسِيرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا

رب کی نشانیاں گے کیا پھرے نہیں وہ ملک میں کہ دیکھ لیتے



كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ كَانُوا أَكْثَرَ

کیا انجام ہوا ان سے پہلوں کا وہ تھے ان سے

مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَىٰ

زیادہ اور زور میں سخت اور نشانوں میں جو چھوڑ گئے ہیں زمین پر پھر کام نہ آیا

عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٢﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ

ان کے جو وہ کھاتے تھے پھر جب پہنچے ان کے پاس رسول ان کے

بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ

کھلی نشانیاں لے کر اترائے تھے اس پر جو ان کے پاس تھی خبر اور الٹ پڑی

بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَمْتِرُونَ ﴿٨٣﴾ فَلَمَّا رَأَوْا

ان پر وہ چیز جس پر ٹھٹھا کرتے تھے پھر جب انھوں نے دیکھ لیا

بِأَسْنَاءِ مَا كَانُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ

ہماری آفت کو بولے ہم یقین لائے اللہ اکیلے پر اور ہم نے چھوڑ دیں وہ چیزیں جن کو

مُشْرِكِينَ ﴿٨٤﴾ فَلَمْ يَكُنْ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ كَمَا

شرک بنا دیتے تھے پھر نہ ہوا کہ کام آئے ان کو یقین لانا ان کا جس وقت

رَأَوْا بِأَسْنَاءِ سُوءِ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ج

دیکھ چکے ہمارا عذاب رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو جلی آئی ہے اس کے بندوں میں

وَحَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ﴿٨٥﴾

اور خراب ہوئے اس جگہ کافر

## خلاصہ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے موشی بنائے تاکہ ان میں بعض سے سواری لے اور ان میں بعض (ایسے  
میں کہ ان کو کھاتے بھی ہوا اور تمہارے لئے ان میں اور بھی بہت سے قائدے ہیں کہ ان کے بال اور  
اُون کام آتی ہے) اور (اس لئے بنائے) تاکہ تم ان پر (سوار ہو کر) اپنے مطلب تک پہنچو جو تمہارے دلوں  
میں ہے (جیسے کسی سے ملنے کے لئے جانا تجارت کے لئے جانا وغیرہ وغیرہ) اور (سوار ہونے میں کچھ ان ہی  
کی تخصیص نہیں بلکہ) ان پر (بھی) اور کشتی پر (بھی) لدے لدے پھرتے ہو اور (ان کے علاوہ) تم کو اپنی  
(قدرت کی) اور نشانیاں دکھلاتا رہتا ہے (چنانچہ ہر مصنوع اس کی صنعت پر ایک نشان ہے) سو تم

اللہ کی کون کون سی نشانیوں کا انکار کرو گے (اور یہ لوگ جو بعد قیام دلائل بھی توحید کے متکبر ہیں تو کیا ان کو شرک کے وبال کی خبر نہیں اور) کیا ان لوگوں نے ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو (مشرک) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (اس شرک کی بدولت) ان کا کیسا انجام ہوا (حالانکہ) وہ لوگ ان سطرد میں بھی (زیادہ تھے اور قوت اور نشاۃ میں) (بھی) جو کہ زمین پر چھوڑ گئے ہیں (مثل عمارات وغیرہ) بڑھے ہوئے تھے سوان کی (یہ تمام تر) کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی (اور عذاب الہی سے نہ بچ سکے) غرض جب ان کے پیغمبر ان کے پاس کھلی دلیلیں لے کر آئے تو وہ لوگ اپنے (اس) علم (معاش) پر بڑے نازاں ہوئے جو ان کو حاصل تھا (یعنی معاش کو مقصود سمجھ کر اور اس میں جو ان کو لیاقت حاصل تھی اس پر خوش ہوئے اور معاویہ کا انکار کر کے اس کی طلب کو دیوانگی اور اس کے انکار پر وعید عذاب سے متسخر کیا) اور (اس کے وبال میں) ان پر وہ عذاب آپڑا جس کے ساتھ متسخر کرتے تھے، پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہنے لگے (اب) ہم خدائے واحد پر ایمان لائے اور ان سب چیزوں سے ہم متکبر ہوئے جن کو ہم اُس کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے سوان کا یہ ایمان بے نافع نہ ہوا جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ (کیونکہ وہ ایمان اضطراری ہے اور بندہ مکلف ہے ایمان اختیاری کا) اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی معمول مقرر کیا ہے جو اس کے بندوں میں پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے اور اس وقت (یعنی جبکہ ایمان نافع نہ ہوا) کافر خسارہ میں رہ گئے (پس ان مشرکین کو بھی یہ سمجھ کر ڈرنا چاہیے، ان کے لئے بھی یہی ہو گا پھر کچھ تلافی نہ ہو سکے گی)۔

## معارف و مسائل

فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ۔ یعنی ان عاقبت نا اندیش متکبرین کے پاس جب اللہ تعالیٰ کے رسول دلائل واضحہ توحید و ایمان لے کر آئے تو یہ لوگ اپنے علم کو انبیاء کے لائے ہوئے علم سے بہتر اور حق سمجھ کر انبیاء کے کلام کا رد کرنے لگے۔ یہ علم جس پر کفار خوش اور مگن تھے اور اس کے مقابلہ میں انبیاء کے علوم کو رد کرتے تھے۔ یا تو ان کا جہل مرکب تھا کہ حق اور باطل کو حق و صحیح سمجھ بیٹھے تھے۔ جیسے یونانی فلاسفہ کے بیشتر علوم و تحقیقات جو الہیات سے متعلق ہیں اسی نمونہ کی ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں۔ ان کو جہل مرکب تو کہہ سکتے ہیں۔ ان کا نام علم رکھنا علم کی توہین ہے۔ یا پھر ان کے اس علم سے مراد دنیا کی تجارت، صنعت وغیرہ کا علم ہے جس میں یہ لوگ فی الواقع ماہر تھے اور قرآن کریم نے ان کے اس علم کا ذکر سورہ روم کی آیت میں اس طرح



فرمایا ہے یَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَفْلُونَ۔ یعنی لوگ دنیا کی ظاہری زندگی اور اس کے منافع حاصل کرنے کو تو کچھ جانتے سمجھتے ہیں، مگر آخرت جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور جہاں کی راحت و کلفت دائمی ہے اُس سے بالکل جاہل و غافل ہیں۔ اس آیت میں بھی اگر یہی علم ظاہر دنیا کا مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ چونکہ قیامت اور آخرت کے منکرانہ وہاں کی راحت و کلفت سے جاہل و غافل ہیں۔ اسی لئے اپنے اسی ظاہری ہنر پر خوش اور مگن ہو کر امتیاز کے علوم کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ (مظہری)

فَلَمَّا نِيكَ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ۔ یعنی عذاب سامنے آنے کے بعد یہ لوگ ایمان کا اقرار کر رہے ہیں مگر اس وقت کا ایمان اللہ کے نزدیک مقبول و معتبر نہیں۔ حدیث میں ہے کہ یَقْبِلُ اللّٰهُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يَغْشَا عَدُوًّا (ابن کثیر)۔ یعنی اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ اس وقت سے پہلے پہلے قبول کرتے ہیں جس وقت نزع رُوح اور غرغرة موت سامنے آجائے، اسی طرح پر عذاب آسمانی کے سامنے آجانے کے بعد کسی کی توبہ اور ایمان قبول نہیں ہوتا۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ وَالتَّوْبَةَ قَبْلَ الْمَوْتِ وَالْيَسْرَةَ الْمَعَافَاةَ عِنْدَ الْمَوْتِ وَالمَغْفِرَةَ وَالرَّحْمَةَ بَعْدَ الْمَوْتِ بِبِرْكَةِ اِلِىٰ حَسْبِ وَصَلِىِّ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلٰى النَّبِىِّ الْكَرِىْمِ ط۔

تمت سورۃ المؤمن بحمد اللہ تعالیٰ و عونه

لثالث عشر من ربيع الآخر سنة ۱۳۹۲ ھ يوم السبت

فله الحمد اوله و آخره و ظاهره و باطنه

# سُورَةُ حَمِّ السَّجْدَةِ

سُورَةُ حَمِّ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ أَرْبَعٌ وَخَمْسُونَ آيَةً وَسِتُّ رُكُوعَاتٍ

سورۃ لحم سجده مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں چوٹن آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شرع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

حَمَّ ۱ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۲ كِتَابٌ

انارا ہوا ہے بڑے مہربان رحم والے کی طرف سے ایک کتاب ہے کہ

فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۳ بَشِيرًا

جدی جدی کی ہیں اسکی آیتیں قرآن عربی زبان کا ایک سمجھ والے لوگوں کو سنائے والا

وَنَذِيرًا ۴ فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۵ وَ

نوحیجری اور ڈر بار دھیان میں نہ لائے وہ بہت لوگ سو وہ نہیں سنتے اور

قَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي

کہتے ہیں ہمارے دل غلاف میں ہیں اس بات سے جسکی طرف تو ہم کو بلاتا ہے اور ہمارے

أَذَانِنَا وَقُرْءَانٍ مِّن بَيْنِنَا وَبَيْنَكَ حِجَابٌ ۶ فَاَعْمَلْ

کالوں میں پوچھ ہے اور ہمارے اور تیرے بیچ میں پردہ ہے سو تو اپنا کام کر

إِنَّا عَمِلُونَ ۷ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَىٰ

ہم اپنا کام کرتے ہیں تو کہہ میں بھی آدمی ہوں جیسے تم حکم آتا ہے مجھ کو

أَنَّمَا أُمُوكُمْ إِلَهُ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوا ۸

کہ تم پر بندگی ایک حاکم کی ہے سو سیدھے رہو اس کی طرف اور اس سے گناہ بخشو



وَوَيْلٌ لِلْمُشْرِكِينَ ۝ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ

اور خیراتی ہے مشرکین کے لئے وایں جو نہیں دیتے زکوٰۃ

وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا

اور وہ آخرت سے مشرک ہیں البتہ جو لوگ یقین لائے

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝

اور کئے بھلے کام ان کو ثواب ملنا ہے جو موقوف نہ ہو -

## خلاصہ تفسیر

حکم (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ کلام رحمت و رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے یہ (کلام) ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی (زبان میں) ہے تاکہ جو بلا واسطہ اس کے مخاطب ہیں، یعنی عرب لوگ وہ آسانی سے سمجھ لیں اور ایسے لوگوں کے لئے (نافع) ہے جو دانشمند ہیں (یعنی اگرچہ مکلف اور مخاطب احکام کے سمجھنے میں مگر ان سے نفع دہی لوگ اٹھاتے ہیں جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں قرآن ایسے لوگوں کو) بشارت دینے والا ہے اور (نہ ماننے والوں کے لئے) ڈرالے والا ہے سو (اس کا تقاضہ یہ تھا کہ سمجھی اس پر ایمان لاتے مگر) اکثر لوگوں نے (اس سے) روگردانی کی پھر وہ سنتے ہی نہیں اور جب آپ ان کو سناتے ہیں تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف آپ ہم کو بلاتے ہیں ہمارے دل اس سے پر دہل میں ہیں (یعنی آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی) اور ہمارے کانوں میں ٹواٹ (لگ رہی ہے) اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب ہے سو آپ اپنا کام کئے جائیے۔ ہم اپنا کام کر رہے ہیں (یعنی ہم سے قبول کی امید نہ رکھئے ہم اپنے طریقہ کار کو نہ چھوڑیں گے) آپ فرما دیجئے کہ (تمہیں ایمان پر مجبور کر دینا تو میرے بس کی بات نہیں، کیونکہ میں بھی تم ہی جیسا بشر ہوں) خدا نہیں جو دلوں میں تصرف کر سکوں البتہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ امتیاز دیا ہے کہ مجھ پر یہ وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے (اور یہ وحی ایسی ہے کہ ہر شخص غور کرے تو اس کا حق و معقول ہونا اس کی سمجھ میں آسکتا ہے اور جبکہ میری نبوت اور وحی معجزات کے ذریعہ ثابت ہو چکی تو میری بات بہر حال ماننا سب پر فرض ہے، تمہارے قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں ضرور قبول کرو) اس (معبود و حق) کی طرف سیدھ باندھ لو (یعنی اس کے سوا کسی کی عبادت کی طرف توجہ نہ کرو) اور اس سے معافی مانگو (یعنی پچھلے اعمال شرکیہ سے توبہ کرو، اور اپنی خطا کی معافی مانگو) اور ایسے مشرکوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو (دلائل نبوت کو دیکھنے

اور دلائل توحید کو سننے کے باوجود اپنے باطل طریقہ کو نہیں چھوڑتے اور زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہیں رہتے ہیں (ان کے برخلاف) جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کے لئے (آخرت میں) ایسا اجر ہے جو (کبھی) موقوف ہونے والا نہیں۔

## معارف مسائل

یہ سات سورتیں جو **حکم** سے شروع ہوئی ہیں جن کو **الِ حَم** یا **حوا** میم کہا جاتا ہے۔ باہم متیان کے لئے ان کے ساتھ نام میں کچھ اور الفاظ بھی شامل کئے جاتے ہیں۔ مثلاً سورۃ مؤمن کے حکم کو **حَم المؤمن** اور اس سورت کے حکم کو **حَم السجده** یا **حَم فصلت** بھی کہا جاتا ہے۔ اس سورت کے یہ دونوں نام معروف ہیں **حکم فصلت** اور **حکم السجده**۔

اس سورۃ کے پہلے مخاطب قریش عرب ہیں جن کے سامنے یہ قرآن نازل ہوا اور ان کی زبان میں نازل ہوا۔ انھوں نے قرآن کے اعجاز کا مشاہدہ کیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بشیر و معجزات دیکھے اس کے باوجود قرآن سے اعراض کیا۔ اور سمجھنا کیا سنا بھی گوارا نہ کیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشفقانہ نصیحتوں کے جواب میں بالآخر یہ کہہ بیٹھے کہ آپ کی باتیں نہ ہمارے سمجھ میں آتی ہیں، نہ ہمارے دل ان کو قبول کرتے ہیں نہ ہمارے کان ان کو سننے کے لئے آمادہ ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان تو دوسرے پردے حائل ہیں۔ بس اب آپ اپنا کام کریں، ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔

یہی مفہوم ہے اس سورت کی ابتدائی پانچ آیتوں کا۔ ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے قریش کی خصوصیت سے اس کا اظہار فرمایا کہ قرآن کو عربی زبان میں تمھاری خاطر نازل کیا گیا کہ تمھیں اس کے مضامین سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ اس کے ساتھ قرآن کریم کی تین صفتیں بتلائی گئیں۔ اول یہ کہ **فَصَلَّتْ آيَتُهُ**۔ تفصیل سے ماحوذ ہے جس کے اصل معنی مضامین کو فصل فصل کر کے ممتاز کر دینا ہے مراد اس سے کھول کر وضاحت سے بیان کرنا ہے، خواہ وہ مختلف فصلوں میں ہو یا ایک ہی جگہ۔ قرآن کریم کی آیات میں احکام، قصص، عقائد، اہل باطل کا رد وغیرہ۔ مختلف مضامین کو الگ الگ بھی بیان کیا گیا ہے اور ہر مضمون کو مثالوں سے واضح کر کے سمجھایا گیا ہے۔ دوسری اور تیسری صفت قرآن کریم کی یہ بتلائی کہ وہ بشیر اور نذیر ہے یعنی اپنے ماننے والوں کو دائمی راحتوں کی خوشخبری اور نہ ماننے والوں کو آبدی عذاب سے ڈراتا ہے۔

اوسرا ان سب صفات کو بیان کر کے آخر میں فرمایا **لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ** یعنی آیات قرآن کا



عربی زبان میں ہونا واضح اور صاف ہونا اور بشارت و نذارت پر مشتمل ہونا یہ سب ایسے ہی لوگوں کو نفع دے گا ہے جو سوچے اور سمجھنے کا ارادہ بھی کریں۔ **يَعْلَمُونَ** کے لفظ سے اس جگہ یہی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مراد ہے اسی لئے علامہ تفسیر میں اس کا ترجمہ دانشمند سے کیا گیا ہے۔ مگر عرب اور قریش نے ان سب باتوں کے باوجود اس سے اعراض کیا، سمجھنا کیا سنا بھی گوارا نہ کیا جس کا ذکر انہی آیات میں **فَاَعْرَضُوا كَثُرُوا** سے فرمایا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کفار مکہ کی طرف سے ایک پیش کش اور آپ پر ایمان لانے والوں کو طرح طرح کی ایذا میں پہنچا کر خود فزودہ کرنے کی بہت سی کوششیں کیں۔ لیکن اسلام ان کے علی الرغم بڑھتا اور قوت پکڑتا چلا گیا۔ پہلے حضرت حمزہ جو قریش کے مسلم سردار تھے وہ مسلمان ہو گئے پھر حضرت عمر بن خطاب جیسے قوی اور جبری داخل اسلام ہو گئے تو اب قریش مکہ نے تحویف کا راستہ چھوڑ کر ترغیب اور لالچ کے ذریعہ تبلیغ اسلام کا راستہ روکنے کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیں۔ اسی سلسلہ کا ایک واقعہ ہے جسکو حافظ ابن کثیرؒ نے مسند بزار ابو یعلیٰ اور بغوی کی روایتوں سے نقل کیا ہے۔ ان سب روایتوں میں **مَقْرُطٌ** افرق ہے۔ ابن کثیرؒ نے ان میں بغوی کی روایت کو سب سے زیادہ اشد و اقرب قرار دیا۔ اور ان سب کے بعد محمد بن اسحاق کی کتاب السیرۃ سے اس واقعہ کو نقل کر کے ان سب روایات پر اس کو ترجیح دی۔ اس لئے یہ قصہ اس جگہ ابن اسحاق ہی کی روایت کے مطابق نقل کیا جاتا ہے۔

محمد بن اسحاق نے بیان کیا کہ محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا بڑا سردار مانا جاتا تھا، ایک دن قریش کی ایک جماعت کے ساتھ مسجد حرام میں بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے گوشہ میں اکیلے بیٹھے تھے۔ عتبہ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر آپ لوگوں کی رائے ہو تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے گفتگو کروں اور ان کے سامنے کچھ ترغیب کی چیزیں پیش کروں کہ اگر وہ ان میں سے کسی کو قبول کر لیں تو ہم وہ چیزیں انہیں دیدیں تاکہ وہ ہمارے دین و مذہب کے خلاف تبلیغ کرنا چھوڑ دیں۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہو چکے تھے اور مسلمانوں کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ عتبہ کی پوری قوم نے بیک زبان کہا کہ اے ابوالولید (یہ اس کی کنیت ہے) ضرور ایسا کریں اور ان سے گفتگو کر لیں۔ عتبہ اپنی جگہ سے اٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ گفتگو شروع کی کہ اے ہمارے بھتیجے آپ کو معلوم ہے کہ ہماری قوم قریش میں آپ کو ایک مقام بلند نسب

اور شرافت کا حامل آپ کا خاندان فرسیع اور ہم سب کے نزدیک مکرم و محترم ہے۔ مگر آپ نے قوم کو ایک بڑی مشکل میں پھنسا دیا ہے۔ آپ ایک ایسی دعوت لے کر آئے، جس نے ہماری جماعت میں تفرقہ ڈال دیا، ان کو بے وقوف بنایا، ان کے معبودوں پر اور ان کے دین پر عیب لگایا اور ان کے جو آباء و اجداد گزر چکے ہیں ان کو کافر قرار دیا۔ اس لئے آپ میری بات سنیں، میں چند چیزیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، تاکہ آپ ان میں سے کسی کو پسند نہ کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا۔ ابوالولید کہیے جو کچھ آپ کو کہتا ہے، میں سنوں گا۔

عتبہ ابوالولید نے کہا کہ اے بھتیجے، آپ نے جو تحریک چلائی ہے اگر اس سے آپ کا مقصد مال جمع کرنا ہے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے لئے اتنا مال جمع کر دیں گے کہ آپ ساری قوم سے زیادہ مالدار ہو جائیں۔ اور اگر مقصد اقتدار و حکومت ہے تو ہم آپ کو سب قریش کا سردار تسلیم کر لیں گے اور آپ کے حکم کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے۔ اور اگر آپ بادشاہت چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں اور اگر یہ صورت ہے کہ آپ کے پاس آنے والا کوئی جن یا شیطان ہے جو آپ کو ان کاموں پر مجبور کرتا ہے اور آپ اس کو دفع کرنے سے عاجز ہیں تو ہم آپ کے لئے ایسے معالج بلوائیں گے جو آپ کو اس تکلیف سے نجات دلا دیں اس کے لئے ہم اپنے اموال خرچ کریں گے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بعض اوقات کوئی جن انسان پر غالب آجاتا ہے جس کا علاج کیا جاتا ہے عتبہ یہ طریق تقریر کرتا رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے رہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ ابوالولید آپ اپنی بات پوری کر چکے؟ اس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا کہ اب میری بات سنئے۔ عتبہ نے کہا کہ بے شک میں سنوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے کوئی جواب دینے کے بجائے اس سورۃ فصحت کی تلاوت شروع فرمادی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ اَحْمَدُ تَنْزِیْلُ مِنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ کَثَبٌ فَصَحَّتْ اَیْتُکَ  
قُرْآنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَعْلَمُونَ۔ ہزار اور بغوی کی روایت میں ہے کہ جب آپ اس سورت کی آیات پڑھتے پڑھتے اس آیت پر پہنچ گئے، فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ۔ تو عتبہ نے آپ کے منہ مبارک پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اپنے نسب اور رشتہ کی قسم دی کہ ان پر رحم کیجئے۔ آگے کچھ نہ فرمائیے۔ اور ابن اسحق کی روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات پڑھنا شروع کیں تو عتبہ خاموشی کے ساتھ سننے لگا اور اپنے ہاتھوں کی پیٹھ پیچھے ٹیک لگالی تاکہ غور سے سن سکے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کی آیت سجدہ پر پہنچ گئے۔ اور آپ نے سجدہ کیا۔ پھر عتبہ کو خطاب کر کے فرمایا۔



اے ابوالولید۔ آپ نے سن لیا، جو کچھ سنا آپ کو اختیار ہے جو چاہو کہہ دو۔ عتبہ اپنی مجلس سے اٹھ کر اپنی مجلس کی طرف چلا تو یہ لوگ دُور سے عتبہ کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے کہ خدا کی قسم ابوالولید کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ اب اس کا وہ چہرہ نہیں جس میں یہاں سے گئے تھے۔ جب عتبہ اپنی مجلس میں پہنچا تو لوگوں نے پوچھا کہ ابوالولید کیا خبر لائے۔ عتبہ ابوالولید نے کہا کہ میری خبر یہ ہے کہ

إِنِّي سَمِعْتُ قَوْلَ اللَّهِ مَا سَمِعْتُ  
مِثْلَهُ قَطُّ وَاللَّهِ مَا هُوَ بِالسَّحَرِ وَلَا بِالْشَّعْرِ  
وَلَا بِالْكَهَانَةِ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشِ اطِيعُونِي  
وَأَجْعَلُوا هَالِي خَلْوًا بَيْنَ الرَّجُلِ وَ  
بَيْنَ مَا هُوَ فِيهِ فَاعْتَزِلُوا فَوَاللَّهِ  
لَيَكُونَنَّ لِقَوْلِهِ الَّذِي سَمِعْتُ نَبَأٌ  
فَإِنْ تَصْبِهِ الْعَرَبُ فَقَدْ كَفَيْتُمُوهُ  
بَغَيْرِ كَرَمٍ وَإِنْ يَظْهَرِ عَلَى الْعَرَبِ  
فَمَلِكُهُ مَلِكُكُمْ وَعِزُّهُ عِزُّكُمْ  
وَكُنْتُمْ أَسْعَدَ النَّاسِ بِهِ۔

(بن کثیر ص ۹۱ ج ۴)

میں نے ایسا کلام سنا کہ خدا کی قسم اس سے پہلے کبھی ایسا کلام نہیں سنا تھا، خدا کی قسم نہ تو یہ جادو کا کلام ہے نہ شعر یا کاہنوں کا کلام ہے (جو وہ شیاطین سے حاصل کرتے ہیں)۔ اے میری قوم قریش تم میری بات مانو، اور اس معاملہ کو میرے حوالے کر دو۔ میری رائے یہ ہے کہ تم لوگ ان کے مقابلہ اور ایذا سے باز آ جاؤ اور ان کو ان کے کام پر چھوڑ دو کیونکہ ان کے اس کلام کی ضرورت ایک خاص شان ہونیوالی ہے۔ تم ابھی انتظار کرو، باقی عرب کے لوگوں کا معاملہ دیکھو۔ اگر قریش کے علاوہ باقی عرب لوگوں نے ان کو شکست دیدی تو تمہارا مطلب بغیر تمہاری کسی شیش کے حاصل ہو گیا اور اگر وہ عرب پر غالب آ گئے تو ان کی حکومت تمہاری حکومت ہو گی، ان کی عزت سے تمہاری عزت ہو گی اور اس وقت تم ان کی کامیابی کے شریک ہو گے۔

اس کے ساتھ قریشیوں نے جب اس کا یہ کلام سنا تو کہنے لگے کہ اے ابوالولید تم پر تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زبان سے جادو کر دیا ہے۔ عتبہ نے کہا میری رائے تو یہی ہے، جو کچھ کہہ چکا آگے تمہیں اختیار ہے جو چاہو کہہ دو۔

وَقَالُوا أَفَلَاؤُنَا أَكْبَرُ - اس جگہ کفار قریش کے تین قول نقل کئے، اول یہ کہ آپ کے کلام سے ہمارے دلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ آپ کے کلام سے ہمارے کان بہرے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہمارے اور آپ کے درمیان پردے حائل ہیں۔ قرآن

میں اس قول کو بطور مذمت کے نقل کیا ہے جس سے ان کا کہنا غلط معلوم ہوتا ہے۔ مگر دوسری جگہ خود قرآن نے ان کا ایسا ہی حال بیان فرمایا ہے۔ سورۃ النعام کی آیت میں ہے۔ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمُ الْكِنَّةَ أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا۔ و مثلاً فی سورۃ بنی اسرائیل والکہف۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کا اس کہنے سے مطلب یہ تھا کہ ہم تو مجبور و معذور ہیں کہ ہمارے دلوں پر پردہ اور کانوں میں بوجھ اور درمیان حجابات ہیں، تو ہم کیسے آپ کی بات سنیں اور مانیں گویا اپنے آپ کو مجبور ثابت کرنا تھا۔ اور قرآن نے جو ان کا ایسا ہی حال بیان فرمایا، اُس میں ان کو مجبور نہیں قرار دیا بلکہ اس کا حامل یہ ہے کہ ان میں آیات الہیہ کو سننے اور سمجھنے کی پوری صلاحیت تھی، مگر حجب احمقوں نے کسی طرح اُدھر کان بھی نہ لگائے اور سمجھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تو سزا کے طور پر اُن پر غفلت و جہالت مسلط کر دی گئی مگر وہ بھی اس درجہ میں نہیں کہ یہ لوگ مسلوب الاختیار ہو جائیں، بلکہ اب بھی ارادہ کر لیں تو پھر سننے اور سمجھنے کی صلاحیت عود کر آئیگی۔ (بیان القرآن)۔

منکرین کے انکار و استہزاء کا  
پیغمبرؐ پرانہ جواب

کفار نے جو اپنے دلوں پر پردے، کانوں میں بوجھ وغیرہ کا اقرار کیا، یہ تو ظاہر ہے اس سے مراد یہ نہ تھا کہ ان میں عقل نہیں یا بہرے ہیں بلکہ ایک قسم کا استہزاء و تمسخر تھا۔ مگر اس ظالمانہ جبراً و استہزاء کا جو جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلفتین کیا گیا وہ یہ تھا کہ ان کے مقابلہ میں کوئی تشدد کی بات نہ کریں، بلکہ اپنی تواضع کا اظہار کریں کہ میں خدا نہیں جو ہر کام کا مالک و مختار ہوں بلکہ تم ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ فرق صرف اس کا ہے کہ مجھے میرے رب نے وحی بھیج کر ہدایت کی، اس کی تائید کے لئے معجزات دیئے۔ جس کا اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ تم سب مجھ پر ایمان لاتے۔ اور اب بھی میں تمہیں یہی وصیت کرتا ہوں کہ اپنا رخ عبارت و طاعت میں صرف ایک اللہ کی طرف کر لو اور پچھلے گناہوں سے توبہ کر لو۔

آخر خطاب میں قرآنی بشارت و نذارت کے دونوں پہلو ان کے سامنے کر دئے کہ مشرکین کیلئے بڑی خرابی ہے اور مؤمنین کے لئے دائمی ثواب۔ اس میں مشرکین کی خرابی بیان کرنے کے ضمن میں اس کی وجہ یہ ذکر کی گئی ہے کہ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ یعنی یہ لوگ زکوٰۃ نہیں دیا کرتے تھے۔ اس میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ یہ آیات مکئی ہیں اور زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے تو فرض ہونے سے پہلے ہی ان پر عدم ادائیگی زکوٰۃ کا الزام کیسے درست ہوا؟

اس کا جواب تو ابن کثیرؒ نے یہ دیا ہے کہ اصل زکوٰۃ تو ابتداء اسلام ہی میں نماز کے ساتھ ہی فرض ہو گئی تھی جس کا ذکر سورۃ مزمل کی آیات میں آیا ہے۔ مگر اس کے فضائل کی تفصیلات اور وصولیابی کا انتظام مدینہ طیبہ میں ہوا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مکہ میں زکوٰۃ فرض نہیں تھی



کیا کفار فروع اعمال کے  
مکلف اور مخاطب ہیں یا نہیں

دوسرا اشکال یہ ہے کہ کفار بہت سے فقہاء کے نزدیک مخاطب بالفروع نہیں ہوتے، یعنی نماز روزہ، حج، زکوٰۃ کے احکام ان پر عائد نہیں ہوتے۔ ان پر عائد حکم تو یہ ہے کہ وہ پہلے ایمان قبول کریں، ایمان کے بعد غیر ان عائد ہوتے ہیں تو جب ان پر زکوٰۃ کا فرض عائد ہی نہیں۔ تو اس کے ترک پر عتاب کیسا؟

جواب یہ ہے کہ بہت سے ائمہ و فقہاء کے نزدیک تو کفار بھی مخاطب بالفروع ہیں، ان کے اعتقاد سے تو یہ اشکال ہی نہیں ہوتا۔ اور جو لوگ کفار کو مخاطب بالفروع نہیں مانتے وہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ترک زکوٰۃ پر اصل مذمت نہیں بلکہ ان کا ترک زکوٰۃ چونکہ کفر کی بنا پر تھا اور ترک زکوٰۃ اس کی علامت تھی اس لئے ان کو عتاب کرنے کا حاصل یہ ہوا کہ تم مؤمن ہوتے تو زکوٰۃ کی پابندی کرتے۔ تمہارا قصور ایمان نہ لانا ہے۔ (بیان القرآن)۔ اور کفار کے مخاطب بالفروع ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق احقر کی کتاب احکام القرآن، حزب خامس میں ہے جو بزبان عربی شائع ہوئی ہے۔

تیسرا سوال یہاں یہ ہوتا ہے کہ احکام اسلام میں سب سے مقدم تو نماز ہے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ زکوٰۃ کو خصوصیت سے ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب قرطبی وغیرہ نے یہ دیا ہے کہ قریش عرب مالدار لوگ تھے۔ اور صدقہ و خیرات غریبوں کی امداد ان کا خاص وصف تھا۔ مگر جو لوگ مسلمان ہو جاتے۔ یہ لوگ ان کو اس طرح کی خاندانی اور معاشرتی امداد سے بھی محروم کر دیتے تھے۔ اس کی مذمت کرنا مقصود ہے اس لئے زکوٰۃ کو خصوصیت سے ذکر کیا گیا۔ واللہ اعلم

لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ۔ لفظ مَمْنُون کے معنی مقطوع کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ایمان و عمل صالح کے پابند لوگوں کو آخرت میں جو اجر دیا جائے گا وہ دائمی غیر منقطع ہوگا۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ مومن جن اعمال صالحہ کا عادی ہوتا ہے، اگر کسی بیماری یا سفر یا دوسرے عذر سے کسی وقت یہ عمل بھی ترک ہو جائے تو بھی اس عمل کا اجر قطع نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ میرا بندہ جو عمل اپنی تندرستی اور فرصت کے اوقات میں پابندی سے کیا کرتا تھا، اس کے عذر کی حالت میں بھی وہ اعمال بغیر کئے ہوئے اس کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے ہیں۔ اس مضمون کی حدیثیں صحیح بخاری میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے اور شرح التذیۃ ابنہوی میں حضرت ابن عمرؓ سے اور انسؓ سے اور رزینؓ نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت کی ہیں۔ (منظہری)

قُلْ آيَاتُكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي

تو کہہ کیا تم منکر ہو اس سے جس نے بنائی زمین دو

يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ آندَادًا ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۹

دن میں اور برابر کرتے ہو اس کے ساتھ اوروں کو وہ ہے رب جہان کا

وَجَعَلَ فِيهَا رِوَاْسِي مِّنْ فَوْقِهَا وَلِبْرِكِ فِيهَا وَقَدْ رَا

اور رکھے اس میں بھاری پہاڑ اور برکت رکھی اس کے اندر اور ٹھہرائیں

فِيهَا أَقْوَامًا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّاعَاتِ ۱۰

اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں پورا ہوا پورے چھپنے والوں کو

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا

پھر چڑھا آسمان کو اور وہ دھواں ہو رہا تھا پھر کہا اس کو

وَالْأَرْضَ رِوَاْسٍ اٰغْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۚ قَالَتَا اتَيْنَا

اور زمین کو آؤ تم دونوں خوشی سے یا زور سے وہ بولے ہم آئے

طَائِعِينَ ۱۱ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ

خوشی سے پھر کر دیئے وہ سات آسمان دو دن میں

وَاَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ اَمْرَهَا ۚ وَرَأَيْنَا السَّمَاءَ الدُّنْيَا

اور اتارا ہر آسمان میں حکم اس کا اور دونوں نے ہم سے دیکھے

بِمَصَابِيحٍ وَحِفْظًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۱۲

آسمان کو چراغوں سے اور محفوظ کر دیا یہ سادھا ہوا ہے زبردست خبردار کا

## خلاصہ تفسیر

آپ (ان لوگوں سے) فرمائیے کہ کیا تم لوگ ایسے خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو بار جو دو اس کی بڑی وسعت کے) دو روزہ (کی مقدار وقت) میں پیدا کر دیا اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو یہی (خدا جس کی قدرت معلوم ہوئی) سارے جہان کا رب ہے اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنا دیئے اور اس (زمین) میں فائدہ کی چیزیں رکھ دیں (جیسے نباتات و حیوانات وغیرہ) اور اس (زمین) میں اس کے رہنے والوں کی غذائیں تجویز کر دیں (جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ ہر حصہ زمین کے رہنے والوں کے مناسب



الک الک فذاتیں ہیں یعنی زمین میں ہر قسم کے غلے میوے پیدا کر دیئے کہیں کچھ کہیں کچھ جن کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ سب چاروں میں (ہوا۔ دو دن میں زمین دو دن میں پہاڑ وغیرہ جو شمار میں) پورے ہیں پورے چھینے والوں کے لئے (یعنی ان لوگوں کے لئے جو تخلیق کائنات کی کیفیت اور کمیت کے متعلق آپ سے سوالات کرتے ہیں جیسا کہ یہود نے آپ سے خلق السموات والارض کے متعلق سوال کیا تھا کما فی الذکر المنثور) پھر (یہ سب کچھ پیدا کر کے) آسمان (کے بنانے) کی طرف توجہ فرمائی اور وہ اس وقت دھواں تھا (یعنی آسمان کا مادہ جو زمین کے مادے کے بعد زمین کی موجودہ صورت سے پہلے بن چکا تھا وہ دھوئیں کی شکل میں تھا) سو اس سے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں (کو ہماری اطاعت کی طرف آنا تو ضرور پڑے گا اب تم کو اختیار ہے کہ) خوشی سے آؤ یا زبردستی سے (مطلب یہ ہے کہ ہمارے تقدیری احکام جو تم دونوں میں جاری ہوا کریں گے ان کا جاری ہونا تو تمہارے اختیار سے خارج ہے وہ تو ہو کر رہیں گے۔ لیکن جو ادراک و شعور تم کو عطا ہوا ہے اس کے اعتبار سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم ہمارے احکام تقدیری کو اپنی خوشی سے قبول کرو یا ان سے دل میں ناراض ہو، اور وہ زبردستی تمہارے اندر نافذ کئے جائیں۔ جیسے انسان کے لئے امراض اور موت کا معاملہ ہے کہ ان کا ہونا تو امر تقدیری ہے جس کو انسان ٹال نہیں سکتا۔ مگر کوئی دانشمند اس کو راضی خوشی قبول کرتا ہے اور صبر و شکر کے فوائد حاصل کرتا ہے، کوئی ناراض و ناخوش رہتا ہے، گھٹ گھٹ کر مڑتا ہے۔ تو اب تم دیکھ لو کہ ہمارے ان احکام پر راضی رہا کرو گے یا کراہت رکھو گے۔ اور مراد ان تقدیری احکام سے جو آسمان و زمین میں جاری ہونے والے تھے یہ ہیں کہ آسمان ابھی صرف مادہ دھوئیں کی شکل میں تھا، اس کا سات آسمانوں کی صورت میں بنا حکم تقدیری تھا اور زمین اگرچہ بن چکی تھی مگر اس میں بھی ہزاروں انقلابات و تغیرات قیامت تک چلنے والے تھے۔) دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے (ان احکام کے لئے) حاضر ہیں، سو دور و زمین اس کے سات آسمان بنا دیئے اور چونکہ ساتوں آسمانوں کو فرشتوں سے آباد و معمور کر دیا گیا تھا اس لئے، ہر آسمان میں اس کے مناسب اپنا حکم (فرشتوں کو) بھیج دیا (یعنی جن فرشتوں سے جو کام لینا تھا وہ ان کو تولا دیا) اور ہم نے اس قریب والے آسمان کو ستاروں زمینیت دی اور (شیاطین کو آسمانی خبریں چوری کرنے سے روکنے کے لئے) اس کی حفاظت کی یہ تجویز ہے (خدا نے) زبردستی عالم الکل کی طرف سے۔

## معارف و مسائل

ان آیات میں اصل مقصود منکرین توہید مشرکین کو ان کے کفر و شرک پر ایک بلیغ انداز میں تنبیہ کرنا ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کی صفت تخلیق اور آسمان و زمین کی عظیم مخلوقات کو بے شمار حکمتوں پر مبنی پیدا کرنے کی تفصیل دیکر ان کو بطور زجر خطاب کیا گیا ہے کہ کیا تم ایسے بے عقل ہو کہ ایسے عظیم خالق و قادر کے ساتھ دوسروں کو شریک خدائی قرار دیتے ہو۔ اسی قسم کی تنبیہ و تفصیل سورۃ بقرہ کے تیسرے رکوع میں آچکی ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَئًا فَاحْيَاكُمْ ثُمَّ لُمَيْتُمْ كُمْ ثُمَّ مُحْيِيَكُمْ  
ثُمَّ اَلْيَاءُ تَرْجَعُونَ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوٰى  
اِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ يَكْسِى السَّحَابَ كَاسًا  
اَيام تخلیق کی تعیین اور تفصیل کا ذکر نہیں۔ سورہ فقلت کی مذکورہ آیات میں اس کا بھی ذکر ہے۔

بیان القرآن میں حضرت سیدی حکیم الامت قدس سرہ نے فرمایا کہ میں یوں تو زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر مختصر و مفصل قرآن کریم میں سینکڑوں جگہ آیا ہے مگر ان میں ترتیب کا بیان کہ پہلے کیا بنا پھر کیا بنا، یہ غالباً صرف تین ہی آیتوں میں آیا ہے۔ ایک یہ آیت حٰلم سجدہ کی اور دوسری سورہ بقرہ کی مذکورہ آیت، تیسری سورہ نازعات کی یہ آیات عَالَتْكُمْ اَشْدُّ خَلْقًا اَھِ السَّمَاءُ بَنَاهَا رَفَعَ سَمَكُهَا فَسَوَّاهَا وَاَعْطٰشَ لَبَآئِهَا وَاَخْرَجَ مِنْهَا رِیْحًا وَاَلْبَسَهَا اَیَّامًا وَاَخْرَجَ مِنْهَا مَاءً وَاَصْرَعَهَا وَاَلْبَسَهَا اَیَّامًا اور تیسری نظریں ان سب مضامین میں کچھ اختلاف سا بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سورہ بقرہ اور سورہ حم سجدہ کی آیت سے زمین کی تخلیق آسمان سے مقدم ہونا معلوم ہوتا ہے اور سورہ نازعات کی آیات سے اس کے برعکس بظاہر زمین کی تخلیق آسمان کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ حضرت رحم نے فرمایا کہ سب آیات میں غور کرنے سے میرے خیال میں تو یہ آتا ہے کہ یوں کہا جاوے کہ اول زمین کا مادہ بنا اور پھر اس کی موجودہ ہئیت زبنی بھٹی کہ اسی حالت میں آسمان کا مادہ بنا جو دخان یعنی دھوئیں کی شکل میں تھا، اسکے بعد زمین ہئیت موجودہ پر پھیلا دی گئی۔ پھر اس پر پہاڑ اور درخت وغیرہ پیدا کئے گئے۔ پھر آسمان کے مادہ و خانہ سیالہ کے سات آسمان بنا دیئے۔ امید ہے کہ سب آیتیں اس تقریر پر منطبق ہو جاویں گی۔ آگے حقیقت حال سے اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہیں (بیان القرآن۔ سورہ بقرہ رکوع ۳)۔

آسمان و زمین کی تخلیق میں ترتیب اور ایام تخلیق کی تعیین



صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی آیت کے تحت میں چند سوالات و جوابات مذکور ہیں ان میں اس آیت کی جو تشریح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمائی وہ تقریباً یہی ہے، جو حضرت رحمہ نے تطبیق آیات کے لئے بیان فرمائی ہے۔ اس کے الفاظ جو ابن کثیرؒ نے اسی آیت کے تحت میں نقل کئے ہیں یہ ہیں:-

وخلق الارض في يومين ثم خلق السماء ثم استوى الى السماء فسوّاهن في يومين اخرين ثم دحى الارض ودحىها ان اخروج منها الماء والماء عى وخلق الجبال والرمال والجهاد والاكمام وما بيدهما في يومين اخرين فذلك قوله تعالى دحاها۔ اور حافظ ابن کثیرؒ نے بحوالہ ابن جریر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت حٰجّم السّجّدة کی تفسیر میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ:- یہود و مدینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے تعلق سوال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اتر اور پیر کے دن پیدا فرمایا، اور پہاڑ اور اس میں جو کچھ معدنیات وغیرہ ہیں ان کو منگل کے روز اور درخت اور پانی کے چشمے اور شہر اور عمارتیں اور دریاں میدان بڑھ کے روز، یہ کل چار روز ہو گئے، جیسا کہ اس آیت میں ہے (عَرَأَيْتُمْ لَتَكْفُرًا وَتَالَّذِي خَلَقَ الْاَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ اَنْدَادًا ذٰلِكَ سَابُّ الْعَالَمِينَ وَجَعَلَ فِيْهَا سَاوِاسِي مِنْ قُوَّتِهَا وَبَارَكْ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَامًا تَعْلَمُ فِيْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ طَسَوَاءٌ لِّلْاَشْيَاءِ يَلِيْنِ) یعنی ان لوگوں کے لئے جو اس تخلیق کا سوال کریں۔ پھر فرمایا اور جمعرات کے روز آسمان بنائے اور جمعہ کے روز ستارے اور شمس و قمر اور فرشتے یہ سب کام حمد کے دن میں تین ساعت باقی تھیں جب پورے ہوئے۔ ان میں سے دوسری ساعت میں آفات و مصائب جو ہر چیز پر آنے والی ہیں وہ پیدا فرمائی ہیں اور تیسری ساعت میں آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ان کو جنت میں ٹھہرایا اور ابلیس کو سجدہ کا حکم دیا اور سجدہ سے انکار کرنے پر جنت سے نکال دیا گیا۔ یہ سب تیسری ساعت کے ختم تک ہوا۔ (الحديث بطوله۔ ابن کثیر)

ابن کثیرؒ نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا، هَذَا الْحَدِيثُ فِيهِ عَوَابِلٌ۔

اور صحیح مسلم میں ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آئی ہے جس میں تخلیق عالم کی ابتداء یوم السبت یعنی ہفتہ کے روز سے بتلائی گئی ہے۔ اس کے حساب سے آسمان و زمین کی تخلیق کا سات روز میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مگر عام نصیص قرآن میں یہ تخلیق چھ روز میں ہونا صراحتہً مذکور ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَمَا يَدْرِيْكُمْ اَيَّامٍ لَّغُوْبٍ۔ یعنی ہم نے پیدا

کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے اندر ہے اس کو چھ دن میں اور ہمیں کوئی مکان پیش نہیں آیا۔ اس لئے نیز اس کی سند کے اعتبار سے بھی اکابر محدثین نے اس روایت کو معلول قرار دیا ہے۔ ابن کثیر نے اس کو بحوالہ مسلم و نسائی نقل کر کے فرمایا دھو من غرائب الصحیح المسلم کما فی زاد المسیر لابن الجوزی۔ یعنی یہ حدیث صحیح مسلم کے عجائب میں سے ہے۔ اور پھر فرمایا کہ امام بخاری رحمہ نے اپنی کتاب تاریخ کبیر میں اس روایت کو معلول قرار دیا ہے، اور بعض لوگوں نے اس روایت کو حضرت ابو ہریرہؓ سے بروایت کعب احبار نقل کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں اور فرمایا کہ یہی اصح ہے۔ (ابن کثیر ص ۹۲ ج ۴)۔ اسی طرح ابن مدینی اور بیہقی وغیرہ حفاظ حدیث نے بھی اس کو کعب احبار کا قول قرار دیا ہے۔ (حاشیہ زاد المسیر ابن الجوزی ص ۲۳ ج ۴)۔

پہلی روایت جو ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی عنہ سے نقل کی ہے، ابن کثیر کے فیصلے کے مطابق اس میں بھی غرابت ہے۔ ایک وجہ غرابت کی یہ بھی ہے کہ اس روایت میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق آسمانوں کی تخلیق کے ساتھ آخری دن جمعہ کی آخری ساعت میں، اور اسی ساعت میں حکم سجدہ اور ابلیس کا جنت سے اخراج مذکور ہے۔

حالانکہ متعدد آیات قرآنی میں جو قصہ تخلیق آدم علیہ السلام کا اور حکم سجدہ اور اخراج ابلیس کا مذکور ہے اس کے سیاق سے بدیہی ظہور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق آدم علیہ السلام کا واقعہ تخلیق ارض و سماء سے بہت زمانہ بعد ہوا ہے جبکہ زمین میں اس کی تمام ضروریات مکمل ہو چکیں اور جنات و شیاطین وہاں بسنے لگے اس کے بعد فرمایا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ (لذا قال فی المنظر)

خلاصہ یہ ہے کہ تخلیق ارض و سماء کے اوقات اور دن اور ان میں ترتیب جن روایات حدیث میں آئی ہے ان میں کوئی روایت ایسی نہیں جس کو قرآن کی طرح قطعی یقینی کہا جاسکے، بلکہ یہ احتمال غالب ہے کہ یہ اسرائیلی روایات ہوں مرفوع احادیث نہ ہو جیسا کہ ابن کثیر نے مسلم و نسائی کی حدیث کے متعلق اس کی تصریح فرمائی ہے۔ اس لئے آیات قرآنی ہی کو اصل قرار دیکر مقصود متعین کرنا چاہیے۔ اور آیات قرآنی کو جمع کرنے سے ایک بات تو یہ قطعی معلوم ہوتی کہ آسمان و زمین اور ان کے اندر کی تمام چیزیں صرف چھ دن میں پیدا ہوئی ہیں۔ دوسری بات سورہ حٰجۃ السجۃ کی آیت سے یہ معلوم ہوتی کہ زمین اور اس کے پہاڑ درخت وغیرہ کی تخلیق میں پورے چار دن لگے تیسری بات یہ معلوم ہوتی کہ آسمانوں کی تخلیق میں دو دن صرف ہوئے۔ جس میں پورے دو دن ہونے کی تصریح نہیں بلکہ کچھ اشارہ اس طرف ملتا ہے کہ یہ دو دن پورے خرچ نہیں ہوئے آخری دن جمعہ کا کچھ حصہ بچ گیا۔ ان آیات کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھ دن میں سے پہلے چار دن زمین پر باقی



دو دن آسمانوں کی تخلیق میں صرف ہوئے اور زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی۔ مگر سورۃ نازعات کی آیت میں زمین کے پھیلانے اور مکمل کرنے کو صراحتہً تخلیق آسمان کے بعد فرمایا ہے۔ اس لئے وہ صورت کچھ بعید نہیں جو اوپر بحوالہ بیان القرآن بیان ہوئی ہے کہ زمین کی تخلیق دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے دو دن میں زمین اور اس کے اوپر پہاڑوں وغیرہ کا مادہ تیار کر دیا گیا۔ اس کے بعد دو دن میں سات آسمان بنائے، اس کے بعد دو دن میں زمین کا پھیلاؤ اور اس کے اندر جو کچھ پہاڑ، درخت، نہریں، چشمے وغیرہ بنائے تھے انکی تکمیل ہوئی۔ اس طرح تخلیق زمین کے چار دن متحمل نہیں رہے۔ اور آیت ختم سجدہ میں جو ترتیب بیان یہ رکھی گئی کہ پہلے زمین کو دو دن میں پیدا کرنے کا ذکر فرمایا۔ خَلَقَ الْاَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ۔ اس کے بعد مشرکین کو تنبیہ کی گئی۔ پھر الگ کر کے فرمایا (وَجَعَلَ فِيهَا سَبْعًا وَاسْتَوٰى مِنْ فَوْقِهَا وَبَرَكَ فِيهَا وَقَدْ سَرَفْنَا قَوْلَنَا فِي الْاَنْبِيَاءِ آيَاتِهِمْ) اس میں اس پر تو سبھی مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ اربعۃ ایام ان پہلے دو دنوں کو شامل کر کے ہیں۔ اس سے الگ چار دن نہیں۔ ورنہ مجموعہ آٹھ دن ہو جائے گا جو تصریح قرآنی کے خلاف ہے۔

اب یہاں غور کرنے سے بظاہر مقتضی مقام کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ خَلَقَ الْاَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ فرمانے کے بعد پہاڑوں وغیرہ کی تخلیق کو بھی فِي يَوْمَيْنِ کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تو اس کا مجموعہ چار دن ہونا خود بخود معلوم ہو جاتا مگر قرآن کریم نے عند ان تعبیر اس کے بجائے یہ رکھا کہ زمین کی تخلیقات میں سے باقیماندہ کو ذکر کر کے فرمایا کہ یہ کل چار دن ہوئے۔ اس سے بظاہر اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ یہ چار دن متواتر اور مسلسل نہیں تھے بلکہ دو حصوں میں منقسم تھے۔ دو دن تخلیق سموات سے پہلے دو دن اُس کے بعد اور آیت مذکورہ میں جَوَّعَلَ فِيهَا سَبْعًا وَاسْتَوٰى مِنْ فَوْقِهَا الخ کا ذکر ہے یہ آسمانوں کی تخلیق کے بعد کا بیان ہے۔ وَاللّٰهُ سَبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ۔

وَجَعَلَ فِيهَا سَبْعًا وَاسْتَوٰى مِنْ فَوْقِهَا۔ زمین میں پہاڑ اس کے توازن کو درست رکھنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں جیسا کہ متعدد آیات قرآن میں اس کی تصریح آئی ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ ان پہاڑوں کو زمین کی سطح کے اوپر بلند و بالا کر کے رکھا جائے زمین کے اندر بھی رکھے جاسکتے تھے۔ مگر اوپر رکھنے اور ان کی بلندی کو عام انسانوں یا انوروں کی رسائی سے دور رکھنے میں زمین کے بسنے والوں کے لئے ہزاروں بلکہ بے شمار فوائد تھے۔ اس لئے اس آیت میں مِنْ فَوْقِهَا کے لفظ سے اس خاص نعمت کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

وَقَدْ سَرَفْنَا قَوْلَنَا فِي الْاَنْبِيَاءِ آيَاتِهِمْ سَوَاءً لِّلنَّاسِ اَعْلٰیٰہُمْ۔ اقوات قوت

کی جمع ہے جس کے معنی ہیں رزق اور روزی جس میں عام ضروریات انسانی داخل ہیں۔ کما قال

ابو عبید (زاد المسیر لابن جوزی)۔

اور حضرت حسنؑ اور حسنینؑ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے ہر حصہ میں اس کے بسنے رہنے والوں کی مصالح کے مناسب رزق اور روزی مقدار فرمادی۔ مقدار فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم جاری کر دیا کہ اس حصہ زمین میں فلاں فلاں چیزیں اتنی اتنی مقدار سے پیدا ہو جائیں۔ اسی تقدیر الہی سے ہر حصہ زمین کی کچھ خصوصیات ہو گئیں، ہر جگہ مختلف قسم کی معدنیات اور مختلف اقسام کی نباتات اور درخت اور جانور اس خطہ کی ضروریات ان کے مزاج و مرغوبات کے مطابق پیدا فرمادیئے۔

اسی سے ہر خطہ کی مصنوعات و مبلوسات مختلف ہوتی ہیں۔ یمن میں عصب۔ ساہور میں ساہوری رتے میں طیالہ۔ کسی خطہ میں گندم، کسی میں چانول اور دوسرے غلات، کسی جگہ میں روئی، کسی میں جوت، کسی میں سیب انگور اور کسی میں آم۔ اس اختلاف اشیاء میں ہر خطہ کے مزاجوں کی مناسبت بھی ہے اور عکسہ اور حتیٰ کج کے قول کے مطابق یہ فائدہ بھی ہے کہ دنیا کے سب خطوں اور ملکوں میں باہمی تجارت اور تعاون کی راہیں کھلیں۔ کوئی خطہ دوسرے خطہ سے مستغنی نہ ہو۔ باہمی احتیاج ہی پر باہمی تعاون کی مضبوط تعمیر ہو سکتی ہے۔ حکمران نے فرمایا کہ بعض خطوں میں نمک کو سونے کی برابر تول کر فروخت کیا جاتا ہے۔

گویا زمین کو حق تعالیٰ نے اس پر بسنے والے انسانوں اور جانوروں کی تمام ضروریات غذا، مسکن اور لباس وغیرہ کا ایک ایسا عظیم الشان گدام بنا دیا ہے، جس میں قیامت تک آنے اور بسنے والے اربوں اور کھربوں انسانوں اور لاتعداد جانوروں کی سب ضروریات رکھ دی ہیں۔ وہ زمین کے پیٹ میں بڑھتی اور حسب ضرورت قیامت تک نکلتی رہیں گی۔ انسان کا کام صرف یہ رہ گیا کہ اپنی ضروریات کو زمین سے نکال کر اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کرے۔ آگے آیت میں فرمایا سَوَاءٌ لِّلنَّاسِ أَعْلٰیٰ۔ اس جملہ کا تعلق اکثر حضرات مفسرین نے اربعہ ایام کے ساتھ قرار دیا ہے۔ معنی یہ ہیں یہ سب تخلیقات عظیم ٹھیک چار دن میں ہوئی ہیں۔ اور چونکہ عرف میں جس کو چار کہہ دیا جاتا ہے۔ وہ کبھی چار سے کچھ کم کبھی کچھ زیادہ بھی ہوتا ہے، مگر گسر کو حذف کر کے اُس کو چار ہی کہہ دیتے ہیں۔ آیت میں اس جگہ لفظ سَوَاءٌ بڑھا کر اس احتمال کو قطع کر کے یہ بتلادیا کہ یہ کام پورے چار دن میں ٹھیک ہوا ہے۔ اور لِّلنَّاسِ أَعْلٰیٰ فرمانے کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ آسمان زمین کی تخلیق کے متعلق آپ سے سوالات کر رہے ہیں جیسا کہ یہود کا سوال کرنا تفسیر ابن جریر اور درمنثور میں منقول ہے ان سوالات کرنے والوں کو یہ بتلادیا گیا ہے کہ یہ سب تخلیق ٹھیک چار دن میں ہوئی ہے۔ (ابن کثیر، قرطبی، روح)۔

اور بعض مفسرین ابن زید وغیرہ نے لِّلنَّاسِ أَعْلٰیٰ کا تعلق جملہ قَدْ سَرَفِمْہَا أَقْوَامَہَا کے ساتھ قرار دیا ہے۔ اور سائلین کے معنی طالبین و محتاجین کے لئے ہیں۔ اس صورت میں معنی یہ ہونگے



کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے جو مختلف اجناس و اقسام کی اقوات و ضروریات پیدا فرمائی ہیں، یہ اُن لوگوں کے نائدے کیلئے ہیں جو ان کے طالب اور حاجت مند ہیں اور چونکہ طالب محتاج عادتاً سوال کیا کرتا ہے اس لئے اس کو سائلین کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔ (بجرحیط)

اور ابن کثیرؒ نے اس تفسیر کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا اَشْكُم مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے وہ سب چیزیں عطا فرمائیں جو تم نے مانگیں کیونکہ یہاں بھی مانگنے سے مراد اُن کا حاجت مند ہونا ہے۔ سوال کرنا شرط نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ چیزیں نہ مانگنے والوں کو بھی عطا فرمائی ہیں۔

فَقَالَ لَهُمَا وَاللَّائِيهِ إِنِّي أَتَيْنَا طَائِفَتَيْنِ۔ یہ آسمان و زمین کو خطاب کر کے حکم دینا اور ان کا اطاعت و فرمانبرداری سے جواب دینا بعض مفسرین کے نزدیک مجاز ہے کہ زمین و آسمان اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہر کام کے لئے تیار پائے گئے۔ مگر ابن عطیہ اور دوسرے محققین ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس میں کوئی مجاز نہیں، سب اپنی حقیقت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین میں شعور و ادراک خطایک سمجھنے کا بھی پیدا فرمایا دیا تھا اور ان کو گویائی کی طاقت بھی جواب دینے کے لئے عطا فرمادی تھی۔ تفسیر بجرحیط میں اس کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہی تفسیر احسن اور بہتر ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس کو نقل کر کے بعض کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ زمین کی طرف سے یہ جواب اُس حصہ زمین نے دیا تھا جس پر بیت اللہ کی تعمیر ہوئی اور آسمان کے اُس حصہ نے جو بیت اللہ کے بالمقابل ہے، (جس کو بیت المعمور کہا جاتا ہے)۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ

پھر اگر وہ ٹلا لیں تو تو کہہ میں نے خبر سنا دی تم کو ایک سخت عذاب کی جیسے عذاب آیا

عَادٍ وَثَمُودَ ۝۱۳ اِذْ جَاءَهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ

عاد اور ثمود پر جب آئے ان کے پاس رسول آگے سے

أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ط

اور پیچھے سے کہ نہ بلو جو کسی کو سوائے اللہ کے

قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ

کہنے لگے اگر ہمارا رب چاہتا تو بھیجتا فرشتے سو ہم تمہارا لایا ہوا

بِهِ كَفَرُونَ ﴿۱۳﴾ فَأَمَّا عَادُ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ

بہیں مانتے سو وہ جو عاد تھے وہ غرور کرنے لگے ملک میں ناحق

الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ

اور کہنے لگے کون ہے ہم سے زیادہ زور میں کیا دیکھتے نہیں کہ اللہ

الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَكَانُوا بِآيَاتِنَا

جس نے ان کو بنایا وہ زیادہ ہے ان سے زور میں اور تھے ہماری نشانیوں سے

يَجْحَدُونَ ﴿۱۵﴾ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْسَرًا فِي

منکر پھر بھی ہم نے ان پر ہوا بڑے زور کی کئی دن

أَيَّامٍ نَحْسَاتٍ لَّنِمْ يُقْبَهُمُ عَذَابُ الْآخِرَةِ فِي الْحَيَاةِ

جو مصیبت کے تھے تاکہ چکھائیں ان کو رسوائی کا عذاب دنیا کی زندگی

الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ آخِرُ وَهُمْ لَا يُنصَرُونَ ﴿۱۶﴾

میں اور آخرت کے عذاب میں تو پوری رسوائی ہے اور ان کو کہیں مدد نہیں

وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَىٰ يَنَّهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَصَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ

اور وہ جو ثمود تھے سو ہم نے ان کو راہ بتلائی پھر ان کو خوش لگا اندھا رہنا راہ سوچنے سے

فَاتَّخَذَتْهُمْ صَعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا

پھر پکڑا ان کو کڑک نے ذلت کے عذاب کی بدلہ اس کا جو

يَكْسِبُونَ ﴿۱۷﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۱۸﴾

کھاتے تھے اور بچا دیا ہم نے ان کو گول کو جو یقین لائے تھے اور بچ کر چلتے تھے

وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَرُونَ ﴿۱۹﴾

اور جس دن جمع ہونگے دشمن اللہ کے دوزخ پر پھر ان کی جماعتیں بنائی جائیں گی

حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ

یہاں تک کہ جب پہنچیں اس پر بتائیں گے ان کو ان کے کان اور ان کی آنکھیں

وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۰﴾ وَقَالُوا الْجُلُودُ دِهْمَلِمَا

اور ان کے جگرے جو کچھ وہ کرتے تھے اور وہ کہیں گے اپنے جگروں کو ہم نے

شَهِدَتْهُمْ عَلَيْهَا قَالَ أَلَا نَطْقَنَالَهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ

کیوں بتلایا ہم کو وہ بولیں گے ہم کو بتلویا اللہ نے جس نے بولویا ہر چیز کو



وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۳۱﴾ وَمَا كُنْتُمْ

اور اسی نے بنایا تم کو پہلی بار اور اسی کی طرف پھیرے جاتے ہو اور تم یہ مردہ

تَسْتَرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا

نہ کرتے تھے اس بات سے کہ تم کو بتلائیں گے تمھارے کان اور نہ

أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ

تمھاری آنکھیں اور نہ تمھارے چمڑے پر تم کو یہ خیال تھا کہ اللہ

لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۳۲﴾ وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ

نہیں جانتا بہت چیزیں جو تم کرتے ہو اور یہ وہی تمھارا خیال

الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَنْكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِنَ

جسے جو تم رکھتے تھے اپنے رب کے حق میں اسی نے تم کو غارت کیا پھر آج

الْخَسِرِينَ ﴿۳۳﴾ فَإِنْ يَصْبِرُوا فَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ

وہ گئے ٹوٹے ہیں پھر اگر وہ صبر کریں تو آگ ان کا گھر ہے

وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا فَمَا لَهُمْ مِنَ الْمُعْتَبِينَ ﴿۳۴﴾ وَقَلِيلٌ

اور اگر وہ مناجاہیں تو ان کو کوئی نہیں مانتا اور کادینے

لَهُمْ قُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِيُذَكِّرَ الَّذِينَ لَمْ يَرْجِعُوا إِلَىٰ

ہم نے ان کے پیچھے ساتھ رہنے والے پھر انھوں نے خوبصورت بنادیا ان کی آنکھوں میں اس کو جو ان کے آگے

خَلَفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمِّ قَدْ خَلَتْ

جسے اور جو ان کے پیچھے ہے اور ٹھیک پرچکی ان پر عذاب کی بات ان فزوں کے ساتھ جو گزر چکے

مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَسِرِينَ ﴿۳۵﴾

ان سے پہلے جنوں کے اور آدمیوں کے بیشک وہ تھے ٹوٹے والے

## خلاصہ تفسیر

پھر (دلائل توحید سنکر بھی) اگر یہ لوگ (توحید سے) اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو اسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عاد و ثمود پر (شرک و کفر کی وجہ سے) آفت آئی تھی (مراد عذاب سے ہلاک کرنا ہے)

جیسا کہ قریش مکہ کے سردار غزوہ بدر میں ہلاک اور قید کئے گئے، اور یہ قصہ عاد و ثمود کا اس وقت ہوا تھا۔ جبکہ ان کے پاس ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی پیغمبر آئے (یعنی جو پیغمبران کی طرف بھیجے گئے اور ان کے سمجھانے میں جان توڑ کوشش کی گئی۔ جیسے کوئی شخص اپنے کسی عزیز کو کسی مصیبت و ہلاکت کی طرف جاتے دیکھے تو وہ کبھی آگے سے آکر اسے روکتا ہے کبھی پیچھے سے پکڑتا ہے۔ اور اس کی مثال قرآن میں ابلیس کا یہ قول ہے کہ اس نے کہا تھا لَا تَنْتَهِهُمْ مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ۔ یعنی میں بنی آدم کو گمراہ کرنے ان کے آگے سے بھی آؤں گا ان کے پیچھے سے بھی اور ان پیغمبروں نے یہی کہا کہ) بجز اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کرو، انھوں نے جواب دیا کہ (تم جو اللہ کی طرف سے آئے کا اور توحید کی طرف بلانے کا دعویٰ کرتے ہو یہی غلط ہے کیونکہ) اگر ہمارے پروردگار کو (یہ) منظور ہو تا (کہ کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجے) تو فرشتوں کو بھیجتا اس لئے ہم اس (توحید) سے بھی منکر ہیں جس کو دیکر (محقارے دعویٰ کے مطابق) تم (پیغمبری کے طور پر) بھیجے گئے ہو پھر (اس مشترک قول کے بعد ہر قوم کے خاص کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ جو عاد کے لوگ تھے وہ دنیا میں ناحق تکبر کرنے لگے اور (جب عذاب کی وعید سنی تو) کہنے لگے وہ کون ہے جو قوت میں ہم سے زیادہ ہے (کہ وہ ہمیں ایسے عذاب میں مبتلا کر سکے اور ہم اس کے دفع کرنے پر قادر نہ ہوں) آگے جواب ہے کہ کیا ان لوگوں کو یہ نظر نہ آیا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ قوت میں ان سے بہت زیادہ ہے (مگر باوجود اس کے بھی وہ ایمان نہ لائے) اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے تو ہم نے ان پر ایک سخت ہوا ایسے دوزخ میں بھیجی جو (جو جہنم کے عذاب الہی کے ان کے حق میں) منحوس تھے تاکہ ہم ان کو اس دنیوی زندگی میں رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں اور آخرت کا عذاب اور بھی زیادہ رسوائی کا سبب ہے اور (اس عذاب کے وقت کسی طرف سے بھی) ان کو مدد نہ پہونچے گی۔ اور وہ جو ثمود تھے تو (ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ) ہم نے ان کو (پیغمبر کے ذریعہ) رستہ بتلایا، انھوں نے گمراہی کو ہدایت کے مقابلہ میں پسند کیا تو ان کو سرایا ذلت کے عذاب کی آفت نے پکڑ لیا ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے اور ہم نے (اس عذاب سے) ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے اور ہم سے ڈرتے تھے۔ (یہاں عذاب دنیوی کا ذکر تھا آگے عذاب آخرت کا ذکر ہے) اور (ان کو وہ دن بھی یاد دلایئے) جس دن اللہ کے دشمن (یعنی کفار) دوزخ کی طرف جمع کر (ئے) گئے (لئے موقف حساب میں) لائے جاویں گے پھر (راستہ میں ان کی کثرت کے سبب منتشر ہونے سے بچانے اور مجتمع رہنے کے لئے) وہ روکے جاویں گے (تاکہ پیچھے رہنے والے ساتھ ہو جاویں جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں تمام جنود اور لشکر وں کو جمع کرنے کے لئے فَهَمُّوْهُمْ عَوْنٌ فَرَمٰی یعنی ان کو روک کا جاوے گا) یہاں تک کہ جب وہ (سب جمع ہو کر) اُسر (دوزخ) کے قریب آجاویں گے (مراد موقف حساب ہے جہاں سے دوزخ قریب ہی نظر آدے گا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ دوزخ کو موقف حساب میں حاضر کرینگے



اور یہ کافر اپنے چاروں طرف اگ ہی اگ دیکھے گا غرض یہ کہ جب مؤقف حساب میں آجاریں گے اور حساب شروع ہوگا) تو ان کے کان اور آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ اور (اُس وقت) وہ لوگ (تعجب کے ساتھ) اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی (ہم تو دنیا میں سب کچھ تمھاری ہی راحت کے لئے کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ فعنکم کنت اناضل صا ولا مسلم۔ یعنی میں تمھارے ہی لئے سب کو شمش کیا کرتا تھا) وہ (اعضاء) جواب دیں گے کہ ہم کو اس تقادیر مطلق نے گواہی دی جس نے ہر (گویا) چیز کو گواہی دی (جس سے ہم نے اپنے اندر خود اس قدر استکبار کا مشاہدہ کر لیا) اور اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا تھا اور اسی کے پاس پھر (دوبارہ زندہ کر کے) لانے گئے ہو (اور ہم ایسے عظمت والے و قدرت والے کے پوچھنے پر حق بات کو کیسے چھپا سکتے تھے اس لئے گواہی دیدی) اور (آگے حق تعالیٰ ان منکروں کو خطاب فرمادیں گے کہ تم دنیا میں) اس بات سے تو اپنے کو (کسی طرح) چھپا (اور بچا) ہی نہ سکتے تھے کہ تمھارے کان اور آنکھیں اور کھالیں تمھارے خلاف میں گواہی دیں (کیونکہ حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ اور علم محیط واقع میں ثابت ہے جس کا مقتضایہ تھا کہ برے اعمال سے بچتے) لیکن تم (اس لئے نہ بچے کہ) اس گمان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمھارے بہت سے اعمال کی خبر بھی نہیں اور تمھارے اسی گمان نے جو کہ تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تم کو برباد کیا (کیونکہ اس گمان سے اعمال کفریہ کے مرکب ہوئے اور وہ موجب بربادی ہوئے) پھر تم (ابدی) خسارہ میں پڑ گئے سو (اس حالت میں) اگر یہ لوگ (اس بربادی و خسارہ پر) صبر کریں (اور تن بقدریرہ کر عذر معذرت کچھ نہ کریں) تب بھی دوزخ ہی ان کا ٹھکانہ ہے (یہ نہیں کہ ان کا صبر موجب رحم ہو جاوے جیسا کہ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا تھا) اور اگر وہ عذر کرتا چاہیں گے تو بھی مقبول نہ ہوگا اور ہم نے (دنیا میں) ان (کفار) کے لئے کچھ ساتھ رہنے والے (شیاطین) مقرر کر رکھے تھے سو انھوں نے ان کے اگلے پچھلے اعمال ان کی نظر میں سخن کر رکھے تھے (اس لئے) ان پر مضر تھے) اور (کفر پر اصرار کرنے کی وجہ سے) ان کے حق میں بھی ان لوگوں کے ساتھ اللہ کا قول (یعنی وعدہ عذاب) پورا ہو کر رہا جو ان سے پہلے جن اور انسان (کفار) ہو کر رہے ہیں ایسے شک وہ بھی خسارے میں رہے۔

## معارف و مسائل

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِم مَّائِجًا مَّاصِرًا۔ یہ اس عذابِ صاعقہ کی تشریح ہے جو اس سے پہلے آیت میں صاعقہ عاد و ثمود کے عنوان سے بیان ہوا ہے۔ صاعقہ کے اصل معنی مدہ ہوش و بہوش کرنے

والی چیز کے ہی اسی لئے گرنے والی بجلی کو بھی صاعقہ کہا جاتا ہے۔ اور ناگہانی آفت و مصیبت کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قوم عاد پر جو ہوا کا طوفان مسلط کیا گیا وہ بھی اسی صاعقہ کا ایک فرد ہے اسی کو ریح صرصر کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ جو تیز و تند ہوا کو کہا جاتا ہے، جس میں تیز رفتاری کے ساتھ سخت آواز بھی ہو۔ (قرطبی)

ضحاک نے فرمایا کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے تین سال تک بارش بالکل بند کر دی اور تیز و تند خشک ہوائیں چلتی رہیں اور آٹھ روز سات راتیں مسلسل ہوا کا شدید طوفان رہا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ واقعہ آخر سوال میں ایک بدھ کے روز سے شروع ہوا کہ دوسرے بدھ تک رہا۔ اور جس کسی قوم پر عذاب آیا ہے وہ بدھ ہی کے دن آیا ہے۔ (قرطبی و منطہری)

حضرت جابر بن عبد اللہ رحمہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں تو ان پر بارش برساتے ہیں اور زیادہ تیز ہواؤں کو ان سے روک لیتے ہیں۔ اور جب کسی قوم کو مصیبت میں مبتلا کرنا ہوتا ہے تو بارش ان سے روک لی جاتی ہے اور ہوائیں زیادہ اور تیز چلنے لگتی ہیں۔ فتح آیات محمدیہ سادات۔ اصول اسلام اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ کوئی دن یا رات اپنی ذات میں منحوس نہیں ہے۔ قوم عاد پر طوفان باد کے آیام کو نحسات فرمانے کا حامل یہ ہے کہ یہ دن اس قوم کے حق میں ان کی بد اعمالیوں کے سبب منحوس ہو گئے تھے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ دن سب کے لئے منحوس ہوں۔ (منطہری و بیان القرآن) اور اس مسئلہ کی پوری تحقیق کہ کوئی چیز انہی اشیاء میں منحوس ہو سکتی ہے یا نہیں، احقر کی کتاب احکام القرآن حزب خمس میں دیکھ لیں جو عربی میں طبع ہو چکی ہے۔

فَهِمُّ يَوْمَ تَئَوَّوْا - یہ وزع سے مشتق ہے جس کے معنی روکنے اور منع کرنے کے آتے ہیں اسی کے مطابق خلاصہ تفسیر مذکور میں اس کا ترجمہ روکنے سے کیا گیا ہے۔ اور اکثر حضرات مفسرین نے یہی معنی لئے ہیں کہ اہل جہنم جو بڑی تعداد میں ہوں گے ان کو میدان حشر اور موقف حساب کی طرف جانے کے وقت انتشار سے بچانے کے لئے اگلے حصہ کو کچھ روک دیا جائے گا، تاکہ پچھلے لوگ بھی آملیں۔ اور بعض حضرات مفسرین نے یَوْمَ تَئَوَّوْا کا ترجمہ یُسَاقُفُونَ و یُدْفَعُونَ سے کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو موقف حساب کی طرف ہٹا کر دھکے دیکر لایا جائے گا۔ (قرطبی)

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَنْ يَكْشِفَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ الْآیۃ - معنی آیت کے یہ ہیں کہ انسان اگر چھپ کر کوئی جرم و گناہ کرنا چاہے تو دوسرے لوگوں سے تو چھپا سکتا ہے، خود اپنے ہی اعضاء و جوارح سے کیسے چھپائے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں اور بدن کی کھال اور بال سب ہمارے نہیں بلکہ سرکاری گواہ ہیں اور جب ان سے ہمارے اعمال کو بچھپا جاوے گا



تو سچی گواہی دیں گے تو پھر چھپا کر کوئی جرم و گناہ کرنے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہتا، اس رسوائی سے بچنے کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ گناہ کو ہی چھوڑا جائے۔ مگر تم لوگ یعنی منکرین تو حید و رسالت کا ذہن ادھر تو کیا جاتا کہ ہمارے اعضاء و جوارح بھی بولنے لگیں گے اور ہمارے خلاف اللہ کے سامنے گواہی دیں گے، مگر اتنی بات تو ہر ذی عقل کی سمجھ میں آ سکتی تھی کہ جس ذات نے ہمیں ایک حقیر چیز سے پیدا کر کے سمیع و بصیر انسان بنایا، پالا اور جوان کیا، کیا اس کا علم ہمارے اعمال و احوال پر محیط نہیں ہو گا؟ مگر تم نے اس بدیہی چیز کے خلاف یہ گمان کر رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے بہت سے اعمال کی کچھ خبر نہیں۔ اس لئے تمہیں شرک و کفر کرنے پر جرأت ہوئی۔ وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَنْتُمْ تَكْفُرُونَ یعنی تمہارے اسی گمان بد نے تمہیں برباد کیا۔

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ کو ہنسی آگئی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ میں کس بات پر ہنس رہا ہوں۔ ہم نے عرض کیا

انسان کے اعضاء و جوارح کی محشر میں گواہی

کہ اللہ انہر اس کا رسول ہی جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ہنسی اس کلام پر آئی جو میدان حشر اور موقف حساب میں بندہ اپنے رب سے کرے گا۔ یہ عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار کیا آپ نے مجھے ظلم سے بچا نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ بیشک دی ہے۔ اس پر بندہ کہے گا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اپنے حساب و کتاب کے معاملہ میں اور کسی کی گواہی پر مطمئن نہیں ہوں گا، بجز اس کے کہ میرے وجود ہی میں سے کوئی گواہ کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا یعنی اچھا ہے لو تم خود ہی اپنا حساب کر لو۔ اس کے بعد اس کے منہ پر مہر کر دی جاوے گی اور اسکے اعضاء و جوارح سے کہا جائے گا کہ تم اس کے اعمال بتلاؤ، ہر عضو بول اٹھے گا اور سچی گواہی پیش کر دے گا۔ اس کے بعد اس کی زبان کھول دی جاوے گی تو یہ خود اپنے اعضاء پر ناراض ہو کر کہے گا بُعْدَ الْكُفِّ وَشُحْقَافَعَنْكُنَّ اَنَا ضَلُّ۔ یعنی تم غارت و برباد ہو میں نے تو دنیا میں جو کچھ کیا تمہارے ہی آرام پہنچانے کے لئے کیا تھا (اب یہی میرے خلاف گواہی دینے لگے)۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اس شخص کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کی ران کو کہا جائے گا کہ تو بول اور اس کے اعمال بیان کر، تو انسان کی ران اور گوشت اور ہڈی سب اس کے اعمال کی گواہی دیدیں گے۔ (رواہ مسلم۔ مظہری)

اور حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انیوالا دن انسان کو یہ ندا دیتا ہے کہ میں تیاؤں ہوں اور جو کچھ تو میرے اندر عمل کرے گا قیامت میں میں اس پر گواہی دوں گا۔ اس لئے تجھے چاہیے کہ میرے ختم ہونے سے پہلے پہلے کوئی نیکی کرے کہ میں اس کی

کو اسیوں اور اگر میں چلا گیا تو پھر تو مجھے کبھی نہ پائے گا۔ اسی طرح ہر رات انسان کو یہ ندادیتی ہے۔  
(ذکرہ البونعم - کذافی القرطبی)

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا

اور کہنے لگے منکر مت کان دھرو۔ اس قرآن کے سننے کو اور یک بیک کرو

فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ﴿۲۶﴾ فَلَنذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

اسکے پڑھنے میں شاید تم غالب ہو سو ہم کو ضرور چکھانا ہے منکروں کو

عَذَابًا بِأَنَّهُمْ كَانُوا

سخت عذاب اور ان کو بدلہ دینا ہے برے سے برے کاموں کا جو وہ

يَعْمَلُونَ ﴿۲۷﴾ ذَلِكَ جزاءُ أعداءِ الله النارُ

کرتے تھے یہ سزا ہے اللہ کے دشمنوں کی آگ ان کا اسی میں

فِي جَهَادٍ أُرِ الْخُلْدِ ط جزاءُ بئما كانوا

گھر ہے سدا کو بدلہ اس کا جو ہماری باتوں سے انکار کرتے تھے

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا أَرِنَا الَّذِينَ أَخَذْنَا مِنَ

اور کہیں گے وہ لوگ جو منکر ہیں اے رب ہمارے ہم کو دکھا دے وہ دونوں جنہوں نے ہم کو بہکا یا

الْجَنِّ وَالْإِنْسِ نَجْعَلُهُمَات حَتَّى أَقْدَامًا لِيَكُونَا

جو جن ہے اور جو آدمی کہ تم ان کو اپنے پاؤں کے نیچے کر دے رہیں

مِنَ الْأَسْفَلِينَ ﴿۲۸﴾

سب سے نیچے

## خلاصہ تفسیر

اور یہ کافر (یا ہم) یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنو ہی مت اور اگر پیغمبر سنانے بھی لگیں تو اس کے  
پیچ میں غل مچا دیا کرو شاید (اس تدبیر سے) تم ہی غالب رہو (اور پیغمبر پر کہ غلاموش ہو جاویں) تو ان کے  
اس ناپاک ارادے اور عزم کے بدلہ میں ہم ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ چکھا دیں گے اور ان کو اپنے  
برے برے کاموں کی سزا دیں گے یہی سزا ہے اللہ کے دشمنوں کی یعنی دوزخ ان کے لئے وہاں ہمیشہ



رہنے کا مقام ہوگا۔ اس بات کے بدلہ نہیں کہ وہ ہماری آیاتوں کا انکار کیا کرتے تھے (اور جب عذاب میں مبتلا ہوں گے تو) وہ کفار کہیں گے اے ہمارے پروردگار ہم کو وہ دونوں شیطان اور انسان دکھلا دیجئے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا ہم ان کو اپنے پیروں تلے روند ڈالیں تاکہ وہ خوب ذلیل ہوں۔ (یعنی ان کو اس وقت ان لوگوں پر غصہ آدے گا جنہوں نے ان کو دنیا میں بہکایا تھا۔ آدمی بھی اور شیطان بھی خواہ ایک ایک ہوں یا متعدد ہوں۔ اور یوں تو یہ گمراہ کرنے والے بھی سب جہنم میں ہی ہوں گے۔ مگر اس گفتگو کے وقت وہ ان کے سامنے نہیں ہوں گے اس لئے سامنے کی درخواست کی۔ کسی آیت میں یا روایت میں یہ مذکور نہیں دیکھا کہ ان کی یہ درخواست منظور ہوگی یا نہیں۔ واللہ اعلم)

## معارف و مسائل

لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوَا فِيهِ۔ کفار جب قرآن کے مقابلہ سے عاجز ہو گئے، اور اس کے خلاف ان کی ساری تدبیریں ناکام ہو گئیں تو اس وقت انہوں نے یہ حرکت شروع کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ابو جہل نے لوگوں کو اس پر آمادہ کیا کہ جب قُتِلَ (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن پڑھا کریں تو تم ان کے سامنے جاکر جمع و پکار اور شور و غل کرنے لگا کر وہ تاکہ لوگوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بعض نے کہا کہ سیٹھاں اور تالیاں بجا کر اور بیچ میں طرح طرح کی آوازیں نکال کر قرآن سننے سے لوگوں کو روکنے کی تیاری کرو۔ (قرطبی)

تلاوت قرآن کے وقت خاموش ہو کر سننا واجب ہے نہ رہنا کفار کی عادت ہے۔ علامت ہے۔ آجکل ریڈیو پر تلاوت قرآن نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ ہر موٹل اور مجمع کے مواقع میں ریڈیو کھولا جاتا ہے جس میں قرآن کی تلاوت ہو رہی ہو اور موٹل والے خود اپنے دھندوں میں لگے رہتے ہیں کھانے پینے والے اپنے شغل میں۔ اس کی صورت وہ بنجانی ہے جو کفار کی علامت تھی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت فرمادیں کہ یا تو ایسے مواقع میں تلاوت قرآن کیلئے نہ کھولیں اگر کھولنا ہے اور برکت حاصل کرنا ہے تو چند منٹ سب کام بند کر کے خود بھی اس طرف متوجہ ہو کر سنیں دوسروں کو بھی اس کا موقع دیں۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا اسْمُنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ

تحقیق جنہوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر اسی پر قائم رہے ان پر اتارے ہیں

الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ

فرشتے کہ تم مت ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور خوشخبری سنو اس بہشت کی

الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٦﴾ نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمْ فِي الْحَيَاةِ

جس کا تم سے وعدہ تھا ہم ہیں تمہارے ربین دنیا

الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهَى

اور آخرت میں اور تمہارے لئے وہاں ہے جو چاہے

أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ ﴿٣٧﴾ نَزَّلًا مِّنْ غَفُورٍ

جی تمہارا اور تمہارے لئے وہاں ہے جو کچھ مانگو پہناتی ہے اس بخشنے والے

رَّحِيمٍ ﴿٣٨﴾ وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ

بہر بان کی طرف سے اور اس سے بہتر کس کی بات جس نے بلایا اللہ کی طرف

وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٣٩﴾ وَلَا

ادریا کیا نیک کام اور کہا میں حکم بردار ہوں اور برابر

تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ وَإِذْ فَعُ بِالَّتِي هِيَ

نہیں نیکی اور نہ بدی جواب میں وہ کہہ جو اس سے

أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ

بہتر ہو پھر تو دیکھ لے کہ تجھ میں اور جس میں دشمنی تھی گویا دوست دار ہے

حَمِيمٌ ﴿٤٠﴾ وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۚ وَمَا يُلْقُهَا

قرابت والا اور یہ بات ملتی ہے انہی کو جو سہار رکھتے ہیں اور یہ بات ملتی ہے

إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٤١﴾ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ

اسی کو جس کی بڑی قسمت ہے اور جو بھی چوک لگے تجھ کو شیطان کے چوک

نَزْعٌ ۖ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٤٢﴾

لگانے سے تو پناہ پکڑ اللہ کی بے شک رہی ہے سننے والا جاننے والا -

## خلاصہ تفسیر

جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کر لیا کہ ہمارا رب (حقیقی صرف) اللہ ہے (مطلب یہ ہے کہ شرک



چھوڑ کر توجہ اختیار کر لی، پھر اس پر مستقیم رہے (یعنی اُس کو چھوڑنا نہیں، اُن پر اللہ کی طرف سے رحمت و بشارت کے) فرشتے اتریں گے (اول موت کے وقت پھر قبر میں پھر قیامت میں۔ جیسا کہ درمنثور میں حضرت زید بن اسلم کی روایت سے ثابت ہے اور کہیں گے) کہ تم نہ (احوال آخرت سے) اندیشہ کرو اور نہ (دنیا کے چھوڑنے پر) رنج کرو (کیونکہ آگے تمہارے لئے اس کا نعم البدل اور امن و عاقبت ہے) اور تم جنت (کے ملنے) پر خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا تھا، ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے (دنیا میں فرشتوں کا رفیق ہونا یہ ہے کہ وہ انسان کے دلیں نیکیوں کا الہام کرتے رہتے ہیں، اور کوئی تکلیف و مصیبت پیش آجائے تو اس پر صبر و سکون فرشتوں ہی کی رفاقت کا اثر ہوتا ہے۔ اور آخرت میں رفیق ہونا تو آمنے سامنے کھل کر ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: **وَتَتَلَفَّظُ لَهُمُ الْمَلَائِكَةُ** اور دوسری آیت میں **يَكُونُ لَهُمْ مَعْنِيَ كَلِّ بَابٍ** وغیرہ) اور تمہارے اس (جنت) میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے اور نیز تمہارے لئے اُس میں جو مانگو گے موجود ہے (یعنی جو کچھ زبان مانگو گے وہ تو ملے ہی گا۔ بلکہ مانگنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی جس چیز کو تمہارا دل چاہے گا موجود ہو جائے گی) یہ بطور مہمانی کے ہوگا عفو و رحیم کی طرف سے (یعنی یہ نعمتیں اکرام و اعزاز کے ساتھ اس طرح ملیں گی جس طرح مہمانوں کو ملتی ہیں۔ آگے حسن حال کے بعد حسن مقال و اعمال کو بتایا گیا ہے) اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو لوگوں کو (خدا کی طرف بلائے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور (اظہار اطاعت کے لئے) کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں (یعنی بندگی کو اپنا فخر سمجھے، متکبرین کی طرح اس سے غار نہ کرے) اور (چونکہ دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق کا ارادہ کرنے والوں کو اکثر جاہلوں کی طرف سے ایذاؤں اور تکلیفوں کا سامنا ہوتا ہے اس لئے آگے ان کو ظلم کے مقابلہ میں انصاف اور برائی کے بدلہ میں بھلائی کرنے کی تلقین کی جاتی ہے نیز تجربہ سے ثابت ہے کہ دعوت کے مؤثر اور کامیاب ہونے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ مخالفین کی ایذاؤں پر صبر کر کے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا جس میں سب مسلمان ضمناً شامل ہیں کہ) نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی (بلکہ ہر ایک کا اثر جدا ہے اور جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اب) آپ (مع اپنے متبعین کے) نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کیجئے پھر کیا ایک (آپ دیکھیں گے کہ) آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے، (یعنی بدی کا بدلہ بدی سے دینے میں تو عداوت بڑھتی ہے اور نیکی کرنے سے بشرط سلامت طبع دشمن کی عداوت گھٹتی ہے۔ یہاں تک کہ اکثر تو بالکل ہی عداوت جاتی رہتی ہے اور اس معاملہ میں مثل دوست کے ہو جاتا ہے گو دل سے دوست نہ ہو) اور یہ بات ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو (اخلاق کے اعتبار سے) بڑے مستقل (مزاج) ہیں اور یہ بات اُسی کو نصیب ہوتی ہے جو (ثواب کے اعتبار سے)

بڑا صاحب نصیب ہے اور اگر (ایسے وقت میں) آپ کو شیطان کی طرف سے (عقد کا) کچھ دوسو سہ آنے لگے تو (فورا) اللہ سے پناہ مانگ لیا کیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ بشرط سلامت طبع کی قید سے یہ خدشہ دور ہو گیا کہ بعض اوقات شری آدمی پر نرمی کرنے کا الٹ اثر ہوتا ہے، کیونکہ یہ صرف ایسے لوگوں سے محتمل ہے جو اپنی سلامت طبع کھو بیٹھتے ہیں اور وہ شاذ و نادر ہوتے ہیں۔

## معارف و مسائل

م شروع سورت سے یہاں تک منکرین قرآن اور منکرین رسالت و توحید سے خطاب ہے۔ ان کو حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں پیش نظر کر کے توحید کی دعوت پھر انکار کرنے والوں کا انجام اور عذاب آخرت و دوزخ کا مفصل بیان چلا آیا ہے۔ یہاں سے مؤمنین و کاملین کے حالات اور دنیا و آخرت میں ان کے اعزاز و اکرام کا بیان اور ان کے لئے خاص ہدایات کا ذکر ہے۔ مؤمنین و کاملین وہی ہوتے ہیں جو خود بھی اپنے اعمال و اخلاق میں مستقیم اور بے کم و کاست بالکل شریعت کے مطابق ہوں، اور دوسروں کو بھی اللہ کی طرف دعوت دیں اور ان کی اصلاح کی فکر کریں۔ اسی سلسلہ میں داعیان اسلام کے لئے صبر اور برائی کے بدلہ میں بھلائی کرنے کی ہدایت ہے۔

استقامت کے معنی | پہلے جزء کو لفظ استقامت سے تفسیر فرما کر ارشاد ہوا اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ

لشَٰكًا سَتَقَامُوْا۔ یعنی جن لوگوں نے سچے دل سے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب یقین کر لیا اور اس کا اقرار بھی کر لیا۔ یہ تو اصل ایمان ہوا، آگے اس پر مستقیم بھی رہے یہ عمل صالح ہوا۔ اس طرح ایمان اور عمل صالح کے جامع ہو گئے۔ لفظ استقامت کا جو مفہوم خلاصہ تفسیر میں بیان ہوا ہے کہ ایمان و توحید پر قائم رہے اس کو چھوڑا نہیں۔ یہ تفسیر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور تقریباً یہی مضمون حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، انھوں نے استقامت کی تفسیر اخلاص عمل سے فرمائی ہے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

الاستقامة ان تستقیم علی الامر والنہی ولا تروغ ما وعظاک الثعالب۔ (منظہری)

استقامت یہ ہے کہ تم اللہ کے تمام احکام اور امر اور نہی پر سیدھے جے رہو، اس سے ادھر ادھر راہ فرار لو مڑیوں کی طرح نہ نکالو۔

اس لئے علماء نے فرمایا کہ استقامت تو ایک لفظ مختصر ہے مگر تمام شرائع اسلامیہ کو جامع ہے جس میں تمام احکام الہیہ پر عمل اور تمام محرمات و مکروہات سے اجتناب دائمی طور پر شامل ہے۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ انسان کا رَبُّنَا اللّٰهُ کہنا بھی صحیح ہو سکتا ہے جبکہ وہ دل سے یقین کرے کہ میں



ہر حال اور ہر قدم میں اللہ تعالیٰ کی زیر تربیت ہوں مجھے ایک سانس بھی اس کی رحمت کے بغیر نہیں سکتا اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان طریقی عبادت پر ایسا مضبوط و مستقیم رہے کہ اس کا قلب اور قالب دونوں اس کی عبودیت سے سرمد انحراف نہ کریں۔

اسی لئے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفیؓ نے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اسلام کی ایک جامع بات بتلا دیجئے جس کے بعد مجھے کسی اور سے کچھ نہ پوچھنا پڑے تو آپ نے فرمایا، قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ شَحًّا سَقِيمًا (رواہ مسلم) یعنی تم اللہ پر ایمان لانے کا اقرار کرو، پھر اس پر مستقیم رہو۔ مستقیم رہنے کی ظاہر مراد یہی ہے کہ ایمان پر بھی مضبوطی سے جھے رہو اور اس کے اقتضائے مطابق اعمال صالحہ پر بھی۔

اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے استقامت کی تعریف اداائے فرائض سے نہرمانی اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: استقامت یہ ہے کہ تمام اعمال میں اللہ کی اطاعت کرو اور اس کی معصیت سے اجتناب کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ استقامت کی جامع تعریف وہی ہے جو اوپر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے نقل کی گئی ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی تعریف بھی اسی کی طرف راجع ہے جس میں اعمال صالحہ کے ساتھ اخلاص عمل کی تاکید ہے۔ (تفسیر مظہری) جصاص نے بھی مذکورہ تفسیر کو ابوالعالیہ سے نقل کر کے اختیار کیا ہے اور ابن جریر نے بھی۔

تَنْزِيلٌ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ - فرشتوں کا نزول اور وہ خطاب جو اس آیت میں آیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ موت کے وقت ہوگا اور قتادہؒ نے فرمایا کہ محشر میں قبروں سے نکلنے کے وقت ہوگا اور وکیع بن جراحؒ نے فرمایا کہ تین وقتوں میں ہوگا۔ اول موت کے وقت پھر قبروں کے اندر پھر محشر میں قبروں سے اٹھنے کے وقت۔ اور ابوحیانؒ نے بحر محیط میں فرمایا کہ میں تو کہتا ہوں کہ مؤمنین پر فرشتوں کا نزول ہر روز ہوتا ہے جس کے آثار و برکات اُن کے اعمال میں پائے جاتے ہیں، البتہ مشاہدہ اور ان کے کلام کا سننا یہ انھیں مواقع میں ہوگا۔

اور ابو نعیمؒ نے حضرت ثابت بنانیؒ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے سورہ حٰلِم السجۃ کی تلاوت فرمائی یہاں تک کہ آیت تَنْزِيلٌ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ پر پہنچے تو فرمایا کہ ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ مؤمن جس وقت اپنی قبر سے اٹھے گا تو دو فرشتے جو دنیا میں اسی کے ساتھ رہا کرتے تھے وہ ملیں گے اور اس کو کہیں گے کہ تم خوف و غم نہ کرو بلکہ جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ان کا کلام سن کر مؤمن کو اطمینان ہو جائے گا۔ (منظہری)

لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتٰٓئُونَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْفُسُكُمْ وَاَنْفُسُكُمْ لَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعَوْنَ نَزْلًا مِّنْ عَفْوٰٓءٍ رَّحِيْمٍ - فرشتے مؤمنین و مخلصین کو بتلائیں گے کہ تمہیں جنت میں وہ چیز ملے گی جس کو تمہارا دل چاہے اور وہ چیز

جو تم مانگو۔ اس کا حامل تو یہ ہے کہ تمہاری ہر خواہش پوری کی جائے گی، خواہ تم مانگو یا نہ مانگو۔ آگے نزلے  
بمعنی ہمانی فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ بہت سی وہ نعمتیں بھی ملیں گی جن کی تمنا بھی تمہارے دل میں  
پیدا نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ہمان کے سامنے بہت سی وہ چیزیں بھی آتی ہیں جن کا پہلے سے کوئی تصور نہیں  
ہوتا خصوصاً جبکہ کسی بڑے کا ہمان ہو۔ (منظہری)

**حدیث** میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں کسی پرندے کو اڑتا ہوا  
دیکھ کر تمہارے دل میں اس کا گوشت کھانے کی خواہش پیدا ہوگی تو وہ اسی وقت بھنا بھنایا تمہارے  
سامنے آگے گا۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ ناک سے منہ ہوگا نہ دھڑکتے سے، خود بخود دیک کر سامنے  
آجائے گا۔ (رواہ البزار والبیہقی عن ابن مسعود۔ منظہری)

اور **حدیث** میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کو جنت میں اگر  
اپنے گھر میں بچہ پیدا ہونے کی خواہش ہوگی تو اس کا حمل اور وضع حمل پھر اُس کا دودھ چھڑانا پھر حبان  
ہونا سب ایک ساعت میں ہو جائے گا۔ (ترمذی و بیہقی وغیرہ۔ منظہری)

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ - یہ مومنین کا ملین کا دوسرا حصہ احوال ہے کہ  
وہ صرف خود ہی اپنے ایمان و عمل پر قناعت نہیں کرتے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کی دعوت  
دیتے ہیں۔ اور فرمایا کہ اُس سے اچھا کس کا قول ہو سکتا ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے معلوم ہوا کہ  
انسان کے کلام میں سب سے افضل و احسن وہ کلام ہے جس میں دوسروں کو دعوت حق دی گئی ہو،  
اس میں دعوت الی اللہ کی سب صورتیں داخل ہیں۔ زبان سے تحریر سے یا کسی اور عنوان سے، اذان دینے  
والا بھی اس میں داخل ہے، کیونکہ وہ دوسروں کو نماز کی طرف بلاتا ہے۔ اسی لئے حضرت صدیقہ عائشہ  
نے فرمایا کہ یہ آیت مؤذنون کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس دَعَا إِلَى اللَّهِ کے بعد عَمِلَ صَالِحًا  
آیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اذان و قناعت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھ لے۔

ایک **حدیث** میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اذان و قناعت کے درمیان  
جو دعا کی جاتی ہے وہ رد نہیں ہوتی۔ (رواہ ابوداؤد و الترمذی عن انس رض۔ منظہری)  
اذان اور جواب اذان کے فضائل و برکات احادیث صحیحہ میں بہت بڑے ہیں۔ بشرطیکہ اخلاص  
کے ساتھ اللہ کے لئے اذان دے، ہجرت و معاوضہ پیش نظر نہ ہو۔ یہ احادیث اس جگہ تفسیر منظہری  
میں جمع کر دی ہیں۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ - یہاں سے دعوت الی اللہ کی خدمت انجام دینے والوں کو  
خاص ہدایات دی گئی ہیں جس کا حامل یہ ہے کہ وہ بُرائی کا بدلہ برائی سے نہ دیں بلکہ صبر اور احسان سے  
کام لیں اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ یعنی داعیانِ حق کی خصلت یہ ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کی بُرائی کو



طریق احسن سے دفع کریں۔ وہ یہ کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ لینا اور معاف کر دینا تو عمل حسن ہے اور احسن یہ ہے کہ جس نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا تم اس کو معاف بھی کر دو اور اس کے ساتھ احسان کا برتاؤ کر دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس آیت میں حکم یہ ہے کہ جو شخص تم پر غصہ کا اظہار کرے، تم اس کے مقابلہ میں صبر سے کام لو۔ جو تمہارے ساتھ جہالت سے پیش آوے تم اس کے ساتھ حلم و بردباری کا معاملہ کر دو اور جس نے تمہیں ستایا اس کی معاف کر دو۔ (منظہری)

بعض روایات میں ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کسی شخص نے گالی دی یا برا کہا تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر تم اپنے کلام میں سچے ہو کہ میں مجرم و خطا دار اور برا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمادے، اور اگر تم نے جھوٹ بولا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمادے۔ (قرطبی)

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ط

اور اس کی قدرت کے نمونے ہیں رات اور دن اور سورج اور چاند

لَا تَسْجُدُ لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ

سجدہ نہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو اور سجدہ کرو اللہ کو

الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝۳۹

جس نے ان کو بنایا اگر تم اسی کو بلو جنتے ہو پھر اگر

اسْتَكَبَرُوا فَاذْهَبْ عَنكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ

عز و رکریں تو جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں پاکی بولتے رہتے ہیں اس کی

بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ ۝۴۰ وَمِنْ آيَاتِهِ

رات اور دن اور وہ نہیں ملکتے اور ایک اس کی

أَنْتَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ

نشانی یہ کہ تو دیکھتا ہے زمین کو دبی ہوئی پھر جب اتارا ہم نے اس پر پانی

اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۝۴۱ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتِ ط

تازہ ہوئی اور ابھری بے شک جس نے اس کو زندہ کیا وہ زندہ کرے گا مردوں کو

إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۴۲

وہ سب کچھ کر سکتا ہے ۔

## خلاصہ تفسیر

اور منجملہ اس کی (قدرت و توحید) کی نشانیوں کے رات اور دن ہے اور سورج ہے اور چاند ہے، (پس) تم لوگ نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو (جیسا کہ صائبین ستاروں کی عبادت کیا کرتے تھے کما فی الکشاف) اور (صرف) اس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان (سب) نشانیوں کو پیدا کیا۔ اگر تم کو خدا کی عبادت کرنا ہے (یعنی اگر خدا کی عبادت کرنا ہے تو وہ صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو، مشرکین کی طرح اللہ کی عبادت کے ساتھ دوسروں کو عبادت میں شریک کر دیا تو پھر وہ اللہ کی عبادت نہیں رہتی) پھر اگر یہ لوگ (توحید کی عبادت اختیار کرنے اور اپنی آبائی رسوم شرک کو چھوڑنے سے عار) اور تکبر کریں تو (اُن کی حماقت ہے، کیونکہ) جو فرشتے آپ کے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور وہ (اس سے ذرا) نہیں اکتاتے (جب اللہ کے مقرب فرشتے جو ان لوگوں سے لاکھوں درجہ مکرم و معظم ہیں ان کو عار نہیں تو ان احمقوں کو عار کرنے کا کیا موقع ہے) اور منجملہ اس کی (قدرت و توحید) کی نشانیوں کے ایک یہ ہے کہ زمین کو دیکھتا ہے دبی دبی (پڑی) ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ بھرتی اور پھولتی ہے (اس توحید پر بھی استدلال ہوتا ہے اور بعثت یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر بھی کیونکہ) جس نے زمین کو (اس کے مناسب) زندہ کر دیا وہی مردوں کو (اُن کے مناسب) زندہ کر دے گا، بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

## معارف و مسائل

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں

اس آیت سے ثابت ہوا کہ سجدہ صرف خالق کائنات کا حق ہے۔ اس کے سوا کسی ستارے یا انسان وغیرہ کو سجدہ کرنا حرام ہے، خواہ وہ عبادت

کی نیت سے ہو یا محض تعظیم و تکریم کی نیت سے دونوں صورتیں باجماع اُمت حرام ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو عبادت کی نیت سے کسی کو سجدہ کرے گا وہ کافر ہو جائیگا اور جس نے محض تعظیم و تکریم کے لئے سجدہ کیا اس کو کافر نہ کہیں گے مگر ارتکاب حرام کا مجرم اور فاسق کہا جائے گا۔

سجدہ عبادت تو اللہ کے سوا کسی کو کسی اُمت و شریعت میں حلال نہیں رہا۔ کیونکہ وہ شرک



میں داخل ہے اور شرک تمام شرائع انبیاء میں حرام رہا ہے۔ البتہ کسی کو تعظیماً سجدہ کرنا، یہ پچھلی شریعتوں میں جائز تھا۔ دنیا میں آنے سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے سب فرشتوں کو سجدہ کا حکم ہوا۔ یوسف علیہ السلام کو ان کے والد اور بھائیوں نے سجدہ کیا جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے مگر اتفاقاً فقہار امت یہ حکم ان شریعتوں میں تھا۔ اسلام میں منسوخ قرار دیا گیا اور غیر اللہ کو سجدہ مطلقاً حرام قرار دیا گیا۔ اس مسئلہ کی پوری تفصیل احقر کے رسالہ "المقالة المرفیہ فی حکم سجدۃ التخیل" میں مذکور ہے جو ترجمان عربی ہے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ۔ اس پر تو امت کا اجماع ہے اس سورت میں سجدہ تلاوت واجب ہے مقام سجدہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ قاضی ابوبکر بن العربی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما پہلی آیت کے ختم پر سجدہ کرتے تھے یعنی اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔ پیر اور اسی کو امام مالک رحمہ اللہ نے اختیار فرمایا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دوسری آیت کے آخر یعنی لَا يَسْمَعُونَ پر سجدہ کرتے تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی یہی فرمایا کہ دوسری آیت کے ختم پر سجدہ کریں۔ مسروق، ابو عبد الرحمن سلمی، ابراہیم نخعی، ابن سیرین، قتادہ وغیرہ، جمہور فقہاء لَا يَسْمَعُونَ۔ ہی پر سجدہ کرتے تھے۔ امام ابوبکر حصص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ یہی سب تمام ائمہ حنفیہ کا ہے اور فرمایا کہ اختلاف کی بنا پر احتیاط بھی اسی میں ہے کہ دوسری آیت کے ختم پر سجدہ کیا جائے کیونکہ اگر سجدہ پہلی آیت سے واجب ہو چکا ہے تو وہ اب ادا ہو جائے گا اور اگر اسی آیت سے واجب ہوا ہے تو اس کا ادا ہونا خود ظاہر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اٰيٰتِنَا لَا يَخَفُوْنَ عَلٰنَا

جو لوگ ٹیڑھے چلتے ہیں ہماری باتوں میں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں

اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَنْ يَّآتِيْ اٰمِنًا يَّوْمَ

بھلا ایک بڑتا ہے آگ میں وہ بہتر یا ایک جو آئے گا امن سے دن

الْقِيٰمَةِ ط اَعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۷

قیامت کے کہے جاؤ جو چاہو بیشک جو تم کرتے ہو وہ دیکھتا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالَّذِيْ كُرِّهًا جَاؤُهُمْ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ

جو لوگ منکر ہوئے نصیحت سے جب آئی ان کے پاس اور وہ کتاب ہے

عَزِيْزٌ ۝۸ لَا يٰۤاٰتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ

نادر اس پر جھوٹ کا دخل نہیں آئے سے اللہ نہ پیچھے

خَلْفَهُ ط تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿۴۲﴾ مَا يُقَالُ لَكَ

سے اتاری ہوئی ہے حکمتوں والے سب تعریفوں والے کی تجھے نہ ہی کہتے ہیں

الْأَمَّا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ط إِنَّ سَاءَ لَكَ لَذُو

جو کہہ چکے ہیں سب رسولوں سے تجھ سے پہلے تیرے رب کے یہاں معافی

مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَجَبًا

بھی ہے اور سزا بھی ہے دردناک اور اگر ہم اس کو کہتے قرآن ادبیری

لَقَالُوا لَوْلَا فَضَّلَتْ آيَاتُهُ ط عَرَبِيٌّ وَعَرَبِيٌّ ط قُلْ

زبان کا تو کہتے اس کی باتیں میوں کھولی گئیں کیا ادبیری زبان کی کتاب اور عربی لوگ تو کہہ

هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ ط وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ

یہ ایمان والوں کے لئے سوجھ ہے اور لوگ کا دور کرنے والا اور جو یقین نہیں لاتے اُن کے

فِي أَذَانِهِمْ وَقُرْ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ط أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ

کانٹوں میں . لو جھ ہے اور یہ قرآن اُن کے حق میں اندھایا ہے ان کو پکارتے ہیں دور

مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۴۴﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ

کی جگہ سے اور ہم نے دی تھی موسیٰ کو کتاب پھر اس میں

فِيهِ ط وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقَضَىٰ بِدِينِهِمْ ط

اختلاف پڑا اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو پہلے چلی تھی تیرے رب کی طرف سے تو اُن میں فیصلہ ہو جاتا

وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ﴿۴۵﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا

اور وہ ایسے دھوکے میں ہیں اس قرآن سے جو چین نہیں لینے دیتا جس نے کی بھلائی سوا اپنے

فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ط وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿۴۶﴾

واسطے اور جس نے کی برائی سو وہ بھی اسی پر اور تیرا رب ایسا نہیں جو ظلم کرے بندوں پر

## خلاصہ تفسیر

بلاشبہ جو لوگ ہماری آیتوں میں کج روی کرتے ہیں (یعنی یہ کہ ہماری آیتوں کا تقاضا ان پر ایمان لانے پھر ان پر استقامت رکھنے کا ہے) اس کو چھوڑ کر اُن کی تکذیب کرتے ہیں (کمانی الدر المنثور عن قتادہ) وہ لوگ ہم پر جھٹی نہیں (ان کو ہم جہنم کا عذاب دیں گے) سو بھلا جو شخص جہنم میں ڈالا جائے (جیسے کافر) وہ اچھا ہے یا وہ شخص جو قیامت کے روز امن و امان کے ساتھ (جنت میں) آئے (آگے



ان کو ڈرانے کے لئے ارشاد ہے کہ) جو حجتی چاہے (خوب) کر لو وہ تمہارا سب کچھ کیا ہوا دیکھ رہا ہے (ایک دفعہ ہی سزا دے گا) جو لوگ اس قرآن کا جبکہ وہ ان کے پاس پہنچتا ہے انکار کرتے ہیں۔ (ان میں خود تدبیر کی کمی ہے) اور (اس قرآن میں کوئی کمی نہیں کیونکہ) یہ (قرآن) بڑی وقعت کتاب ہے جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے (یعنی اس میں کسی پہلو اور کسی جہت سے اس کا احتمال نہیں کہ یہ قرآن منزل من اللہ ہو اور پھر خلاف واقعہ اس کو منزل من اللہ کہہ دیا جائے جیسا کفار آپ پر یہی مشبہ کرتے تھے۔ حق تعالیٰ ایک قاعدہ کلیہ سے اس مشبہ خاص کا ازالہ کر دیا اس طرح کہ اس کا انجاز سب کے نزدیک مسلم ہے اسلئے یہ ثابت ہو گیا کہ) یہ خدائے حکیم محمود (الذات والصفات) کی طرف سے نازل کیا گیا ہے (اور باوجود اس کے جو یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں۔ تو یہ معلوم کر کے تسلی کر لیجئے کہ) آپ کو وہی باتیں (تکذیب و ایذا کی) کہی جاتی ہیں۔ جو آپ سے پہلے رسولوں کو لہی گئی ہیں (انہوں نے صبر کیا تھا آپ بھی صبر کیجئے اور اس سے بھی تسلی حاصل کیجئے کہ) آپ کا رب بڑی مغفرت والا اور درناک سزا دینے والا ہے (پس اگر یہ مخالفین خلاف سے باز آکر مستحق مغفرت نہ ہو گئے تو ان کو سزا بھی دوں گا پھر آپ کا ہے کے لئے پریشان ہوں) اور (یہ لوگ ایک مشبہ یہ کرتے ہیں کہ قرآن کا کچھ حصہ عجمی بھی ہوتا چاہئے تھا جیسا کہ تفسیر درمنثور میں قریش کا ایسا قول حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے جس سے اس کا انجاز خوب ظاہر ہوتا کہ نبی کریم جو عجمی زبان نہیں مانتے وہ عجمی میں تکلم کریں سو بات یہ ہے کہ) اگر ہم اس کو (کھلایا بعضاً) عجمی (زبان کا) قرآن بناتے (تو یہ ہرگز نہ ہوتا کہ اس کو مان لیتے بلکہ اس میں ایک اور حجت نکالتے کیونکہ جب مانتے اور سمجھنے کا ارادہ نہیں ہوتا تو ہر تقدیر پر کچھ نہ کچھ شاخ نکال لی جاتی ہے چنانچہ اگر ایسا ہوتا تو یوں کہتے کہ اس کی آیتیں (اس طرح) صاف صاف کیوں نہیں بیان کی گئیں (کہ ہم سمجھ لیتے یعنی عربی میں کیوں نہیں آیا اگر بعض عجمی ہوتا تو کہتے یہ بعض بھی عربی کیوں نہیں ہے اور یوں کہتے کہ) یہ کیا بات ہے کہ عجمی کتاب اور عربی عربی (خلاصہ یہ کہ اب جو قرآن عربی ہے تو کہتے ہیں عجمی کیوں نہیں اور اگر عجمی ہوتا تو کہتے عربی کیوں نہیں کسی حال پر ان کو قرار نہیں پھر عجمی ہونے سے کیا فائدہ ہوتا۔ آگے اس مضمون سے جواب دینے کا حکم ہے کہ اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لئے تو (نیک کاموں کے بتلانے میں) رہنما ہے اور (برے کاموں سے جو روگ دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں جب اس قرآن کی رہنمائی پر عمل کیا جائے تو یہ ان روگوں سے) شفا ہے (پس چونکہ ایمان والوں میں تدبیر و طلب حق کی کمی نہ تھی ان کے حق میں قرآن اپنی حقانیت کے سبب نافع ہوا) اور جو (باوجود ظہور حق کے عناداً) ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے (جس سے حق کو انصاف اور تدبیر سے نہیں

سننے اور وہ کمی یہی ہے) اور (اسی کمی کی وجہ سے) وہ قرآن ان کے حق میں نابینائی ہے (قلبت تدبر و قلبت انصاف سے تعصب میں قوت رہتی ہے اور تعصب ہدایت قبول کرنے سے ملنے بلکہ زیادہ گمراہی کا سبب ہو جاتا ہے۔ نابینائی کا سبب ہونے کی یہ وجہ ہے جیسے آفتاب عالم کو روشنی دیتا ہے چمکا ڈر کو اندھا کر دیتا ہے اور) یہ لوگ (حق بات سننے کے باوجود نفع سے محروم رہنے میں ایسے ہیں کہ گویا کسی دور جگہ سے پکارے جا رہے ہیں کہ آواز سنئے ہوں مگر سمجھتے نہ ہوں) اور (آپ کی تسلی کے لئے جیسا کہ پر مجملہ رسولوں کا ذکر ہوا ہے اب خاص موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوتا ہے کہ) ہم نے موسیٰؑ کو بھی کتاب دی تھی سو اس میں بھی اختلاف ہوا (کسی نے مانا کسی نے نہ مانا) یہ کوئی نئی بات آپ کے لئے نہیں ہوئی، پس آپ مغموم نہ ہوں) اور (یہ منکرین ایسے مستحق عذاب ہیں کہ اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے بھڑک چکی ہے (کہ پورا عذاب ان کو آخرت میں دوں گا) تو ان کا (قطعی) فیصلہ (دنیا ہی میں) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ (باوجود قیام برائین کے) ابھی تک اس (فیصلہ یعنی عذاب موعود) کی طرف سے ایسے شک میں (پڑے) ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے (کہ ان کو عذاب کا یقین ہی نہیں آتا حالانکہ فیصلہ ضرور واقع ہو گا اور اس فیصلہ کا حاصل یہ ہے کہ) جو شخص نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے نفع کے لئے (یعنی وہاں اس کا نفع اور ثواب پاوے گا) اور جو شخص برا عمل کرتا ہے اس کا وبال (یعنی ضرر و عذاب) اسی پر پڑے گا اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (کہ کوئی نیکی جو شرائط کے مطابق عمل میں لائی گئی ہو اس کو شمار نہ کرے یا کسی بدی کو زائد شمار کرے)۔

## معارف و مسائل

کفر کی ایک خاص قسم الحاد ہے | اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا۔ اس سے پہلی آیات میں اُن منکرین تو حید و رسالت کو زجر و تنبیہ اور ان کے عذاب کا ذکر تھا جو رسالت و تو حید کا کھل کر صاف انکار کرتے تھے۔ یہاں سے انکار کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا جاتا ہے جس کا نام الحاد ہے۔ الحاد اور الحاد کے لغوی معنی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں۔ قبر کی لحد کو بھی اسی لئے لحد کہتے ہیں کہ وہ ایک طرف مائل ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث کی اصطلاح میں آیات قرآنی سے عدول و انحراف کو الحاد کہتے ہیں۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو یہ عام ہے صراحتہً کھلے طور پر انکار و انحراف کرے یا تاویلات فاسدہ کے بہانہ سے انحراف کرے۔ لیکن عام طور سے الحاد ایسے انحراف کو کہتے ہیں کہ ظاہر میں تو قرآن اور اس کی آیات پر ایمان و تصدیق کا دعویٰ ہے



کرے مگر ان کے معانی اپنی طرف سے ایسے گھڑے جو قرآن و سنت کی نصوص اور جمہور امت کے خلاف ہوں اور جس سے قرآن کا مفصلہ ہی الٹ جائے۔ حضرت ابن عباس رضی عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں الحاد کے معنی یہی منقول ہیں فرمایا الحاد هو وضع الكلام على غير موضعه۔ اور آیت مذکورہ میں ارشاد لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْهَا بھي اس کا قرینہ ہے کہ الحاد کوئی ایسا کفر ہے جس کو یہ لوگ چھپانا چاہتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہم سے اپنا کفر نہیں چھپا سکتے۔

اور آیت مذکورہ نے صراحت یہ تکرار دیا کہ آیات قرآنی سے انکار و انحراف صاف اور کھلے لفظوں میں ہو یا معانی میں تاویلات یا طعنہ کر کے قرآن کے احکام کو بدلنے کی فکر کرے یہ سب کفر و ضلال ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ الحاد ایک قسم کا کفر نفاق ہے کہ ظاہر میں قرآن اور آیات قرآن کو ماننے کا دعویٰ اور اقرار کرے لیکن آیات قرآنی کے معانی ایسے گھڑے جو دوسری نصوص قرآن و سنت اور اصول اسلام کے منافی ہوں۔ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں فرمایا:-

كذلك الزنادقة الذين يلحدون | ایسے ہی وہ زندیق لوگ ہیں جو الحاد کرتے ہیں اور  
وقد كانوا يظهرون الاسلام۔ | بظاہر اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ملحد اور زندیق دونوں ہم معنی ہیں جو ایسے کافر کو کہا جاتا ہے جو ظاہر میں اسلام کا دعویٰ کرے اور حقیقت میں اس کے احکام کی تعمیل سے انحراف کا یہ بہانہ بنائے کہ قرآن کے معانی ہی ایسے گھڑے جو خلاف نصوص و خلاف اجماع امت ہوں۔

ایک مغالطہ کا ازالہ | کتب عقائد میں ایک ضابطہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ متاویل کو کافر نہیں کہنا چاہیے یعنی جو شخص عقائد باطلہ اور کلمات کفریہ کو کسی تاویل سے اختیار کرے وہ کافر نہیں۔ لیکن اس ضابطہ کا مفہوم اگر عام لیا جائے کہ کیسے ہی قطعی اور یقینی حکم میں تاویل کرے اور کیسی ہی فاسد تاویل کرے وہ بہر حال کافر نہیں تو اس کا نتیجہ یہ لازم آتا ہے کہ دنیا میں مشرکین، بت پرست، یہود و نصاریٰ میں سے کسی کو بھی کافر نہ کہا جائے۔ کیونکہ بت پرست مشرکین کی تاویل تو قرآن میں مذکور ہے مَا تَعْبُدُونَ إِلَّا لِيُقَرَّرَ بُؤْسُ آلِ اللَّهِ زُفَى۔ یعنی ہم بتوں کی فی نفس عبادت نہیں کرتے بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ سفارش ہمیں کر کے اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں، تو حقیقت عبادت اللہ ہی کی ہے۔ مگر قرآن نے ان کی اس تاویل کے باوجود انہیں کافر کہا، یہود و نصاریٰ کی تاویلیں تو بہت ہی مشہور و معروف ہیں۔ جن کے باوجود قرآن و سنت کی نصوص میں ان کو کافر کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متاویل کو کافر نہ کہنے کا مفہوم عام نہیں۔

اسی لئے علماء و فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ یہ تاویل جو تکفیر سے مانع ہوتی ہے اُسکی شرط یہ ہے کہ وہ ضروریات دین میں ان کے مفہوم قطعی کے خلاف نہ ہو۔ ضروریات دین سے مراد وہ احکام

و مسائل ہیں جو اسلام اور مسلمانوں میں اتنے متواتر اور مشہور ہوں کہ مسلمانوں کے ان پر پڑھ جائوں تک کو بھی ان سے واقفیت ہو جیسے پانچ نمازوں کا فرض ہونا۔ صبح کی دو ظہر کی چار رکعت کا فرض ہونا۔ رمضان کے روزے فرض ہونا۔ سود، شراب، خنزیر کا حرام ہونا وغیرہ۔ اگر کوئی شخص ان مسائل سے متعلق آیات قرآن میں ایسی تاویل کرے جس سے مسلمانوں کا متواتر اور مشہور مفہوم الٹ جائے وہ بلاشبہ باجماع امت کافر ہے، کیونکہ وہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے انکار ہے اور ایمان کی تعریف جمہور امت کے نزدیک یہی ہے کہ

تصدیق النبی صلی اللہ علیہ وسلم  
فہما علم حجیتہ بہ ضرورۃ۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنا  
ان تمام امور میں جن کا بیان کرنا اور حکم کرنا رسول  
صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرورۃً ثابت ہو یعنی ایسا یقینی  
ثابت ہو کہ علماء کے سوا عوام بھی اس کو جانتے ہوں۔

اس لئے کفر کی تعریف اس کے بالمقابل یہ ہوگی کہ جن چیزوں کا لانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضروری اور قطعی طور پر ثابت ہو ان میں سے کسی کا انکار کفر ہے۔  
تو جو شخص ایسی ضروریات دین میں تاویل کرے اس حکم کو بدلے وہ آپ کی لائی ہوئی تعلیم کا انکار کرتا ہے۔

اس زمانہ میں کفر و الحاد کی گرم بازاری | اس زمانے میں ایک طرف تو دین اور احکام دین سے جہالت  
اور غفلت انتہا کو پہنچ گئی کہ نئے لکھے پڑھے لوگ بہت سی  
ضروریات دین سے بھی ناواقف رہتے ہیں۔ دوسری طرف جدید بے خدا تعلیم جس کی بنیاد ہی مادہ  
پرستی پر ہے، کچھ اس کے اثر سے اس پر مزید یورپ کے مستشرقین کے پھیلانے ہوئے اسلام کے  
خلاف شبہات و ادھام سے متاثر ہو کر بہت سے ایسے لوگوں نے اسلام اور اصول اسلام پر بحث  
و گفتگو شروع کر دی ہے جن کو اسلام کے اصول و فروع قرآن و حدیث کے علوم سے کوئی واسطہ  
نہیں۔ انھوں نے اسلام کے متعلق اگر کچھ معلومات بھی حاصل کی ہیں تو اہل یورپ دشمنان اسلام سے  
حاصل کی ہیں۔ ایسے لوگوں نے قرآن و حدیث کی نصوص قطعیہ ضروریہ میں طرح طرح کی باطل تاویلات  
کر کے شریعت اسلام کے مستحق علیہ اور نصوص قطعیہ سے ثابت شدہ احکام کی تحریف کو اسلام کی خدمت  
سمجھ لیا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ کھلا کفر ہے تو وہ مشہور ضابطہ کا سہارا لیتے ہیں کہ ہم اس حکم  
کے منکر تو نہیں بلکہ ایک تاویل کر رہے ہیں اس لئے ہم پر یہ کفر عائد نہیں ہوتا۔

اسی لئے وقت کی اہم ضرورت سمجھ کر ہمارے استاد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد انور شاہ  
کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام ہے



اکفاسا الملحدین والملتأولین فی شیء من ضروریات الدین۔ اس میں ہر طبقہ ہر مسلک کے علماء و فقہاء کی تصریحات سے ثابت کیا ہے کہ ضروریات دین میں کسی کی تاویل مسموع نہیں۔ اور یہ تاویل ان کی تکفیر سے مانع نہیں۔ یہ کتاب بزبان عربی شائع ہوئی ہے، احقر نے اس کا ترجمہ اردو زبان میں بنام ”ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں“ شائع کر دیا ہے۔ اور احکام القرآن خزینہ میں اس کا خلاصہ بزبان عربی بیان کر دیا ہے، اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحم کی ایک تحریر سے نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحم نے فرمایا کہ آیات قرآنی میں تاویل باطل جس کو قرآن کی آیت مذکورہ میں الحاد فرمایا ہے اس کی دو قسمیں ہیں اول وہ تاویل باطل جو نصوص قطعیہ متواترہ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو وہ تو بلاشبہ کفر ہے۔ دوسری یہ کہ وہ ایسی نصوص کے خلاف ہو جو اگرچہ قطعی ہیں مگر قریب بہ یقین ہیں یا اجماع عرفی کے خلاف ہو، ایسی تاویل گمراہی اور فسق ہے، کفر نہیں۔ ان دو قسم کی تاویلوں کے علاوہ باقی تاویلات جو قرآن و حدیث کے الفاظ میں مختلف احتمالات ہونے کی بنا پر ہوں وہ تاویل عام فقہاء امت کا میدان اجتہاد ہے جو تصریح حدیث ہر حال میں باعث اجرو ثواب ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالَّذِي كُرِّهًا جَاءَهُمْ وَإِنَّ لَهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ - جمہور مفسرین نے فرمایا کہ ذکر سے مراد یہاں قرآن ہے، اور جملہ لَاتِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالَّذِي كُرِّهًا جَاءَهُمْ سابق جملہ لَاتِ الَّذِينَ كُرِّهًا جَاءَهُمْ سے بدل ہے اور بقاعدہ عربیت اور مبدل منہ کا ایک حکم ہوتا ہے اس لئے اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ لوگ ہم سے چھپ نہیں سکتے اور اس لئے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ آگے قرآن کے محفوزہ منجانب اللہ ہونے کو بیان فرمایا ہے کہ إِنَّ لَهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ۔ یعنی یہ کتاب اللہ کے نزدیک عزیز و کریم ہے، کوئی باطل اس میں راستہ نہیں پاسکتا (کمادری عن ابن عباس رض۔ مظہری)

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ۔ آگے اس کتاب کے لئے منجانب اللہ حفاظت کا بیان ہے۔ قناتہ اور سدری نے فرمایا کہ باطل سے مراد شیطان ہے اور مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ یعنی نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے اس سے مراد تمام جوانب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان کا کوئی تصرف و تدبیر اس کتاب میں نہیں چلتی کہ وہ اس کتاب میں کمی و بیشی یا کوئی تحریف کر سکے۔

تفسیر مظہری میں اس کو نقل کر کے فرمایا کہ شیطان اس جگہ عام شیطان الجن ہو یا آدمی شیطان کسی کی تحریف و تبدیل قرآن میں نہیں چلتی جیسے بعض زرافض نے قرآن میں دس پاروں کا، بعض نے

خاص خاص آیات کا اضافہ کرنا چاہا مگر کسی کی بات نہ چلی۔

ابو حیانؒ نے بحر محیط میں فرمایا کہ لفظ باطل اپنے الفاظ کے اعتبار سے شیطان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہر باطل و مبطل شیطان کی طرف سے ہو یا کسی دوسرے کی طرف سے قرآن میں وہ نہیں چل سکتا۔ پھر بحوالہ طبری آیت کا یہ مفہوم بتلایا کہ کسی اہل باطل کی مجال نہیں کہ سامنے آکر اس کتاب میں کوئی تغیر و تبدل کرے اور نہ اس کی مجال ہے کہ تجھے سے چھپ کر اس کے معانی میں تحریکات اور الحاد کرے۔

طبری کی تفسیر اس مقام سے بہت زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ قرآن میں الحاد و تحریف کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ کوئی اہل باطل کھلے طور پر قرآن میں کوئی کمی و بیشی کرنا چاہے اس کو قَوْمٌ بَیِّنٌ یَدَّیْنِہٖ سے تعبیر فرمایا۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص بظاہر دعویٰ ایمان کا کرے مگر چھپ کر تاویلات باطلہ کے ذریعہ قرآن کے معنی میں تحریف کرے اس کو قَوْمٌ خَلْفِہٖ کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کے نزدیک ایسی عزیز و کریم ہے کہ نہ اس کے الفاظ میں کوئی کمی و بیشی اور تحریف و تبدل پر کسی کو قدرت ہے اور نہ معانی میں تحریف کر کے قرآن کے احکام بدل دینے کی مجال ہے۔ جس شخص کی بد بختی نے اس کا ارادہ کیا وہ ہمیشہ رسوا ہوا۔ قرآن اس کی ناپاک تدبیر سے پاک صاف رہا۔ الفاظ میں تحریف و تبدل کی راہ نہ ہونا تو ہر شخص دیکھتا سمجھتا ہے کہ تقریباً چودہ سو سال سے

ساری دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہے۔ ایک زیر زبر کی غلطی کسی سے ہو جائے تو بوڑھوں سے لے کر بچوں تک، عالموں سے لیکر جاہلوں تک لاکھوں مسلمان اس کی غلطی پکڑنے والے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ قَوْمٌ خَلْفِہٖ کے الفاظ سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ قرآن کی حفاظت جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے اِنَّا لَکَ لَحَافِظُوْنَ وہ

صرف الفاظ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اس کے معانی کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ ہی کفیل ہے اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بلا واسطہ شاگردوں یعنی صحابہ کرام کے ذریعہ معانی قرآن اور احکام قرآن کو بھی ایسا محفوظ کر دیا ہے کہ کوئی مصلح دین اس میں تاویلات باطلہ کے ذریعہ تحریف کا ارادہ کرے تو ہر جگہ ہرزمانے میں ہزاروں علماء اس کی تردید کے لئے کھڑے ہو جاتے

ہیں اور وہ خائب و خاسر ہوتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ آیت اِنَّا لَکَ لَحَافِظُوْنَ میں ضمیر لَکَ قرآن کی طرف راجع ہے اور قرآن صرف الفاظ کا نام نہیں بلکہ نظم و معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ خلاصہ آیات مذکورہ کے مضمون کا یہ ہو گیا کہ جو لوگ بظاہر مسلمان ہیں، اس لئے کھل کر قرآن کا انکار تو نہیں کرتے مگر آیات قرآنی میں تاویلات باطلہ سے کام لیکر ان کو ایسے مطلب پر محمول کرتے ہیں جو

قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قطعی تصریحات کے خلاف ہے۔ ان کی تحریف سے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو ایسا محفوظ کر دیا ہے کہ یہ کھڑے ہوئے معانی کسی کے چل نہیں سکتے۔ قرآن وحدیث کی



دوسری نصیحتیں اور علمائے اُمت اُس کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ اور احادیث صحیحہ کی تصریح کے مطابق قیامت تک مسلمانوں میں ایسی جماعت قائم رہے گی جو تحریف کرنے والوں کی تحریف کا پردہ چاک کر کے قرآن کے صحیح مفہوم کو واضح کر دے۔ اور دنیا سے وہ اپنے کفر کو کیسا ہی چھپا میں۔ اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپا سکتے۔ اور جب اللہ تعالیٰ ان کی اس سازش سے باخبر ہے تو ان کو اس کی سزا ملنا بھی ضروری ہے۔

عَرَبِیٌّ وَعَرَبِیٌّ۔ عرب کے سوا جتنی قومیں دنیا میں ہیں ان سب کو عجم کہا جاتا ہے اور جب اُس پر حرفِ ہمزہ بڑھا کر عجم کہا جائے تو اس کے معنی کلام غیر فصیح کے ہوتے ہیں۔ اسلئے عجیبی اُس شخص کو کہیں گے جو عربی نہ ہو، اگرچہ کلام فصیح بولتا ہو۔ اور عجیبی اس کو جو کلام فصیح نہ کر سکے۔

(قرطبی)

آیت مذکورہ میں اَعْرَبِیٌّ فرمایا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم قرآن کو عربی زبان کے علاوہ کسی زبان میں بھیجے تو قریش عرب جو قرآن کے پہلے مخاطب ہیں ان کو یہ شکایت ہوتی کہ یہ کتاب ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اور تعجب سے کہتے کہ نبی تو عربی ہے اور کتاب عجیبی ہے جو فصیح نہیں۔

قُلْ هُوَ لَکِنَّ یَکُنْ اٰمَنُوْا اٰھْدٰی وَّشِفَآءٌ۔ یہاں قرآن کریم کی دو صفتیں بتلائی ہیں ایک یہ کہ وہ ہدایت ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کو ایسا راستہ بتاتا ہے جو اس کے لئے نافع و مفید ہی ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ شفا ہے۔ قرآن کریم کا مراض باطنہ کفر و شرک، کبر و حسد، حرص و طمع وغیرہ سے شفا دینا تو ظاہر ہی ہے۔ ظاہری اور جسمانی امراض سے شفا دینا بھی اس میں داخل ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ بہت سے جسمانی امراض کا علاج قرآنی دعاؤں سے ہوتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔

اَوَلٰیئِکَ یَتَذٰوَرْنَ مِنْ مَّکَانَ بَیْعِیْدٍ۔ یہ ایک تمثیل ہے جو آدمی کلام کو سمجھتا ہو، عرب اس کو کہتے ہیں۔ اَنْتَ تَسْمَعُ مِنْ مَّسْرِیْبٍ۔ یعنی تم قریب سے سُن رہے ہو اور جو کلام کو نہ سمجھے اس کو کہتے ہیں اَنْتَ تَسَادٰی مِنْ بَیْعِیْدٍ۔ یعنی تمہیں دُور سے آواز دیکھا رہی ہے۔ (قرطبی)

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ قرآنی ہدایات کو سُننے اور سمجھنے کا ارادہ نہیں رکھتے اس لئے گویا ان کے کان بہرے ہیں، اور آنکھیں اندھی ہیں۔ ان کو ہدایت کی تعلیم دینا ایسا ہے جیسا کسی کو بہت دُور سے پکارا جائے کہ اس کے کانوں تک اس کی آواز نہ پہنچے۔

اِلَیْہِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ

اسی کی طرف حوالہ ہے قیامت کی خبر کا اور نہیں نکلتے کوئی میوے

مِّنْ أَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ط

اپنے غلام سے اور نہیں رہتا حمل کسی مادہ کو اور نہ وہ جسے کہ جس کی اس کو خبر نہیں

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ إِيَنَّ شُرَکَاۓِیَ لَا قَالُوا آذَانُكَ لَا مَمْنُونًا

اور جس دن ان کو پکارے گا کہاں ہیں میرے شریک بولیں گے ہم نے تجھ کو کہہ سنایا

مِّنْ شَهِيدٍ ۚ ۴۱ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِن

ہم میں کوئی اس کا اقرار نہیں کرتا اور چوک گیا اُن سے جو پکار رہے تھے

قَبْلُ وَظَنُوا مَا لَهُم مِّنْ مَّحِيصٍ ۚ ۴۲ لَا يَسْمَعُ الْإِنْسَانُ

پہلے اور سمجھ گئے کہ ان کو کہیں نہیں خلاصی نہیں تھکتا آدمی

مِّنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنَّ مَصْرَهُ الشَّرْفِ یُؤَسُّ قَنُوطٌ ۚ ۴۳ وَ

مانگنے سے بھلائی اور اگر لگ جائے اسکو برائی تو اس توڑ بیٹھے نا امید ہو کر اور

لَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِنَّا مِن بَعْدِ ضَرَاءٍ مَّسَّتْهُ

اگر ہم چکھائیں اس کو کچھ اپنی مہربانی پیچھے ایک تکلیف کے جو اس کو پہنچی تھی

لَیَقُولَنَّ هَٰذَا إِلَىٰ ۚ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً ۚ وَلَئِنْ

تو کہنے لگے یہ ہے میرے لائق اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر میں

رَاجَعْتُ إِلَىٰ رَبِّیْٓ إِنَّ لِي عِنْدَکَ لَلْحُسْنٰی ۚ فَلَنُذِیْبَنَّ

پھر بھی گیا اپنے رب کی طرف بیشک میرے لئے ہے اس کے پاس خوبی سو ہم جتلا دیں گے

الَّذِیْنَ کَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا ۚ وَكَذٰلِکَ یُقَذِّبُهُم مِّنْ عَذَابٍ

منکروں کو جو انھوں نے کیا ہے اور چکھائیں گے ان کو ایک گاڑھا

خَلِیْظٍ ۚ ۴۴ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَا

عذاب اور جب ہم نعمتیں بھیجیں انسان پر تو طلا جاوے اور موڑ لے

بِجَانِبِهِ ۚ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِیْضٍ ۚ ۴۵

اپنی کروٹ اور جب لگے اس کو برائی تو دعائیں کرے چوڑی

قُلْ أَسْرَأُ بِیْتُمْ إِنْ کَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ کَفَرْتُمْ بِهِ

تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر یہ ہو اللہ کے پاس سے پھر تم نے اس کو نہ مانا

مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِی شِقَاقٍ بَعِیْدٍ ۚ ۴۶ سَنَرِیْهِمْ

پھر اس سے گمراہ زیادہ کون جو دور چلا جائے مخالف ہو کر اب ہم دکھلائیں گے



اَلَيْتَنَّا فِي الْاَفَاقِ وَفِي اَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ

ان کو اپنے منونے دنیا میں اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ کھل جائے ان پر کہ یہ

اَنَّهُ الْحَقُّ ۚ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

ٹھیک ہے کیا تیرا رب بھڑکا ہے ہر چیز پر گواہ ہوئے

شَهِيدٌ ۝۵۳ اَلَا اِنَّهُمْ فِي مَرِيضَةٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ ۚ

کے لئے سنتا ہے وہ دھوکے میں ہیں اپنے رب کی ملاقات سے سنتا ہے وہ

اَلَا اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ ۝۵۴

گھیر رہا ہے ہر چیز کو

## خلاصہ تفسیر

(اور پر جس قیامت کا ذکر ہے کہ اس میں اُن کو جزا ملے گی اُس) قیامت کے علم کا حوالہ خدا ہی کی طرف دیا جاسکتا ہے (یعنی اس سوال کے جواب میں کہ قیامت کب آوے گی جیسا کہ کفار بغرض انکار ایسا کہا کرتے تھے یہی کہا جاوے گا کہ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ مخلوق کو اس کا علم نہ ہونے سے اس کا عدم وقوع لازم نہیں آتا) اور (قیامت ہی کی کیا تخصیص ہے اس کا علم ہر شے کو محیط ہے حتیٰ کہ

کوئی پھل اپنے خول میں سے نہیں نکلتا اور نہ کسی عورت کو حمل رہتا ہے اور نہ وہ بچہ جنمتی ہے مگر یہ

سب اس کی اطلاع سے ہوتا ہے) اور اس اطلاع کی وجہ اس کی صفت علم کا ذاتی ہونا ہے جو بوجہ اعلیٰ

درجہ کے کمال ہونے کے دلیل توحید بھی ہے۔ اور دلیل علم قیامت کی بھی ہے۔ پس اس دونوں مضمونوں کی

تائید ہو گئی (اور آگے اُس قیامت کے ایک واقعہ کا ذکر ہے جس سے اثبات توحید و ابطال شرک بھی

ہوتا ہے یعنی) جس روز اللہ تعالیٰ ان (مشرکین) کو پکارے گا (اور کہے گا) کہ (جن کو تم نے میرا شرک

قرار دے رکھا تھا وہ) میرے شریک (اب) کہاں ہیں (ان کو بلاؤ کہ تم کو اس مصیبت سے بچاویں) وہ

کہیں گے کہ (اب تو) ہم آپ سے ہی عرض کرتے ہیں کہ ہم میں کوئی (اس عقیدہ کا) مدعی نہیں (یعنی

اپنی غلطی کے مقر ہیں چونکہ وہاں حقائق عقائد منکشف ہو جاویں گے۔ پس یہ اقرار یا تو اضطرابی ہے یا

اس لئے ہے کہ اس سے کچھ توقع نجات کی ہو) اور جن جن کو یہ لوگ پہلے سے (یعنی دنیا میں) پوجا کرتے

تھے وہ سب غائب ہو جاویں گے اور (جب یہ احوال دیکھیں گے تو) یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لئے

بچاؤ کی کوئی صورت نہیں (اس وقت بھولے خداؤں کا بے بس ہونا اور الٰہ واحد کا حق ہونا معلوم ہو جاوے گا

آگے شرک و کفر کا ایک بڑا اثر طبیعت انسانی پر بیان فرماتے ہیں کہ جو شخص توحید و ایمان سے بے بہرہ

ہے اس آدمی کے اخلاق و عقائد و اعمال ایسے بُرے ہوتے ہیں کہ ایک تو کسی حالت میں یعنی فراخی اور تنگی دونوں میں ترقی کی خواہش سے اس کا جی نہیں بھرتا (جو انتہائی حرص کی علامت ہے) اور (خاص حالت تنگی وغیرہ میں یہ کیفیت ہے کہ) اگر اس کو کچھ تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید اور ہراساں ہو جاتا ہے (اور یہ انتہائی ناشکری اور اللہ تعالیٰ بدگمانی کی علامت ہے) اور (جب تنگی دور ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کی یہ کیفیت ہے کہ) اگر ہم اس کو کسی تکلیف کے بعد جو کہ اس پر واقع ہوئی تھی اپنی مہربانی کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میرے لئے ہونا چاہیے تھا (کیونکہ میری تدبیر و لیاقت و ذہنیت اسی کی مقتضی تھی اور یہ بھی انتہائی ناشکری اور تکبر ہے) اور اس نعمت میں یہاں تک بھولتا ہے بھولتا ہے کہ یوں بھی کہتا ہے کہ میں قیامت کو آنے والا نہیں خیال کرتا اور اگر بالفرض محال آئی بھی اور میں اپنے رب کے پاس پہنچا یا بھی گیا (جیسا نبیؐ کہتے ہیں) تو میرے لئے اس کے پاس بھی بہتری ہی ہے (کیونکہ میں حق پر ہوں اور اس کا مستحق ہوں) - قیامت کا انکار غایت درجہ کفر اور قیامت واقع ہونے کی صورت میں یہ گمان کہ وہاں بھی مجھے انعامات ملیں گے، یہ اللہ کے معاملے میں انتہائی دھوکہ میں مبتلا ہونا ہے۔ غرض کفر و شرک سے یہ مفساد پیدا ہوئے۔ وہ ایسی بُری چیز ہے) سو یہ لوگ یہاں جو چاہیں دعویٰ احقاق و استحقاق کا کر لیں اب عنقریب ہم ان منکروں کو ان کے (یہ) سب کردار ضرور بتلا دیں گے اور ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھا دیں گے اور (نیز کفر و شرک کا ایک اثر یہ ہے کہ) جب ہم (ایسے) آدمی کو نعمت عطا کرتے ہیں تو (ہم سے اور ہمارے احکام سے) مُنہ موڑ لیتا ہے اور کڑوٹ پھیر لیتا ہے (جو انتہائی درجہ کی ناشکری ہے) اور (حالت تنگی و ضرر میں آثار کفر و شرک میں سے ایک یہ ہے کہ) جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو (نعمت سلب ہو جانے پر) سراسر رخ کی راہ سے نہ کہ منعم کی طرف (التجاء کے طور پر) خوب لمبی چوڑی دُمائیں کرتا ہے۔ (اور یہ نائمیت و رجس کی ہے صبری اور حب دنیا میں انہماک ہے۔ آگے رسالت اور قرآن کی حقانیت کی طرف دعوت دینے کے لئے ارشاد ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، آپ (ان منکبین سے) کہتے کہ) اے منکرو! قرآن کے حق ہونے پر جو دلائل قائم ہیں جیسے اس کا معجزہ ہونا اور غیب کی خبریں صحیح صحیح دینا، اگر تم عدم تدبیر کی وجہ سے ان کو سبب یقین نہیں سمجھتے تو کم از کم اس کے احتمال کے درجہ کی تو نفی تم بھی نہیں کر سکتے کیونکہ نفی پر تمہارے پاس کوئی دلیل تو قائم نہیں سو) بھلا یہ بتلاؤ کہ اگر (بنابر علی الاحتمال المذکور) یہ قرآن خدا کے یہاں سے آیا ہو اور پھر تم اس کا انکار کرو تو ایسے شخص سے زیادہ کون غلطی میں ہو گا جو (حق سے) ایسی دور دراز کی مخالفت میں پڑا ہو (اس لئے انکار میں جلد بازی نہ کرو، بلکہ سوچ سمجھ سے کام لو تاکہ حق واضح اور متعین ہو جاوے اور ان لوگوں سے تو کیا امید ہے کہ یہ تدبیر کریں مگر خیر) ہم (خود ہی) عنقریب ان کو اپنی



(قدرت کی) نشانیاں (جو کہ دال ہوں صدق قرآن پر) ان کے گرد و نواح میں بھی دکھائیں گے (کہ تمام عرب پیشین گوئی کے موافق فتح ہو گا) اور خود ان کی ذات (خاص) میں بھی (دکھلائیں گے کہ بدر میں مارے جائیں گے اور ان کا مسکن مکہ بھی فتح ہو جاوے گا) یہاں تک کہ (بالاضطرار ان پیشین گوئیوں کے وقوع سے) ان پر ظاہر ہو جاوے گا کہ وہ قرآن حق ہے (کہ اس کی پیشین گوئیاں کس طرح صادق ہو رہی ہیں گو یہ علم اضطراری بدون تصدیق اختیاری کے مقبول نہیں، لیکن اتمام حجت میں تو قوت زیادہ ہو جاوے گی۔ غرض اس کی حقیقت ایک روز اس طرح ظاہر ہوگی باقی فی الحال جو یہ لوگ آپ کی وحی رسالت کا انکار کر رہے ہیں آپ معنوم نہ ہوں کیونکہ اگر لوگ اس پر شہادت نہ دیں تو) کیا آپ کے رب کی بات (آپ کی حقانیت کی شہادت اور تسلی کے لئے) کافی نہیں کہ وہ ہر (واقعی) چیز کا شاہد ہے (اور اس نے جا بجا آپ کی رسالت کی شہادت دی ہے، آگے اصل وجہ اس انکار کی بتلائے ہیں اور اس سے تسلی بھی زیادہ ہو سکتی ہے) یاد رکھو کہ وہ لوگ اپنے رب کے رد پر جانے کے طرف سے شک میں پڑے ہیں (اس لئے دل میں ڈرتے ہیں جس سے حق کو طلب کریں مگر یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو (اپنے علم کے) اھلے میں لئے ہوئے ہے پس ان کے شک و شبہ کو بھی جانتا ہے اور اس پر سزا دے گا)۔

## معارف و مسائل

فَذُودُ عَائِ عِکْرِ یَحْیٰ - مقصود یہ ہے کہ کافر انسان کی خصلت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس کو کوئی نعمت دولت و عزت عافیت دیتے ہیں تو ان میں مگن اور مست ہو کر منعم حقیقی اللہ تعالیٰ سے اور بھی زیادہ دور ہو جاتا ہے اور اس کا تکبر اور غفلت بڑھ جاتی ہے اور جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے لمبی لمبی دعائیں مانگنے لگتا ہے۔ لمبی دعا کو اس جگہ عرض یعنی چوڑی سے تعبیر فرمایا جس میں زیادہ مبالغہ ہے۔ کیونکہ جس چیز کا عرض بڑا ہو اس کا طول اس سے زیادہ بڑا ہونا خود بخود معلوم ہے۔ اسی لئے جنت کی وسعت بیان فرمانے میں بھی حق تعالیٰ نے فرمایا عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ - یعنی جنت اتنی وسیع ہے کہ اس کے عرض میں سب آسمان و زمین سما جائیں۔ اور طویل دعائیں مانگنا اگرچہ فی نفسہ امر محمود و مستحسن ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں دعا کے آداب میں ذکر کیا گیا ہے کہ دعا میں الحاج و زاری اور بار بار تکرار کرنا بہتر ہے۔

(لما اخرجہ البخاری و مسلم دعا المحدثین)

لیکن اس جگہ اس کافر انسان کی جو مذمت کی گئی ہے وہ درحقیقت طول دعا پر نہیں بلکہ اسکی اس مجموعی مذموم خصلت پر ہے کہ جب اس پر اللہ تعالیٰ نعمت کا رزاقی فرما دے تو تکبر اور غرور میں مدہوش ہو جاوے اور جب مصیبت آئے تو اپنی پریشانی کو بار بار بکارتا اور کہتا پھرے جیسا غافل لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اللہ سے دعا کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اپنا دکھڑا روزنا اور لوگوں سے کہتے رہنا مقصود ہوتا ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ۔ یعنی اپنی قدرت کاملہ اور وحدانیت کی نشانیاں ان لوگوں کو دکھلائے ہیں آفاق میں بھی اور خود ان کے اپنے تن بدن میں بھی۔ آفاق اُفق کی جمع ہے، آسمان کے نچلے کنارے کو کہا جاتا ہے۔ مراد آفاق سے اطراف عالم ہیں یعنی سارے عالم کی بڑی چھوٹی مصنوعیات و مخلوقات آسمان و زمین اور ان کے درمیانی مخلوقات میں سے ہر چیز کو دیکھو تو وہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے علم و قدرت کے محیط ہونے اور اس کے کیا ہونے کی شہادت دیتی ہیں اور اس سے زیادہ قریب کی چیز خود انسان کی اپنی جان اور جسم ہے۔ اس کے ایک ایک عضو اور اس میں کام کرنے والی باریک اور نازک مشینوں کو دیکھئے کہ ان میں انسان کی راحت و سہولت کے کیسے کیسے انتظام رکھے گئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ پھر ان نازک مشینوں کو اتنا مضبوط بنایا ہے کہ سترہ اسی سال تک وہ گھستی نہیں۔ انسان کے عام جوڑوں میں جو اسپرنگ لگے ہوئے ہیں اگر انسانی صنعت ہوتی تو فوراً آدمی اسپرنگ بھی گھس کر ختم ہو جاتے۔ یہاں ہاتھوں کی کھال اور اس پر لکھی ہوئی لکیریں اور خطوط بھی ساری عمر نہیں گھستے۔ جن میں کوئی ادنیٰ عقل و شعور کا آدمی بھی غور کرے تو اس یقین پر مجبور ہوگا کہ اس کی پیدا کرنے والی اور قائم رکھنے والی کوئی ایسی ذات جس کے علم و قدرت کی کوئی انتہا نہیں اور جس کا مثل کوئی نہیں ہو سکتا۔

فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ط

تَمَّتْ سُورَةُ الْحَمِّ السَّجْدَةِ بِعَوْنِ اللَّهِ وَحْدَهُ لِلْعَشْرِينَ

مِنَ الرَّبِّيعِ الثَّانِي ۱۳۹۲ھ يَوْمَ السَّبْتِ



# سُورَةُ الشُّورَى

سُورَةُ الشُّورَى مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلَاثٌ وَخَمْسُونَ آيَةً وَخَمْسُ رُكُوعَاتٍ  
سورۃ شوریٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں تریپن آیتیں ہیں اور پانچ رکوع۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حَمْدٌ ۱ عَسَقٌ ۲ كَذَلِكَ يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ

اسی طرح وحی بھیجتا ہے تیری طرف اور تجھ سے پہلوں

مِنْ قَبْلِكَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۳ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

کی طرف اللہ زبردست حکمتوں والا اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں

وَمَا فِي الْأَرْضِ ۴ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۵ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ

اور زمین میں اور وہی ہے سب سے اعلیٰ بڑا قریب ہے کہ پھٹ پڑیں

يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ

آسمان اسی سے اور فرشتے پاکی بولتے ہیں خوبیاں اپنے

رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ ۶ وَالْآلَآنَ

رب کی اور گناہ بخشواتے ہیں زمین والوں کے مستحق وہی

اللَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۷ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ

ہے اللہ معاف کرنے والا مہربان اور جنہوں نے پکڑے ہیں اس کے

دُونِهِ أَوْلِيَاءَ اللَّهُ حَفِيفٌ عَلَيْهِمْ ۸ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ

سولے رفیق اللہ کو وہ سب یاد ہیں اور تجھ پر نہیں ان کا

بُوكِيلٌ ۹ وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَتُنْذِرَ

اور اسی طرح اتارا ہم نے تجھ پر قرآن عربی زبان کا کہ تو ڈر مٹائے

أَمَّا الْقُضَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا  
 بڑے نکاووں کو اور اس کے آس پاس والوں کو اور خبر سنادے جمع ہونے کے دن کی

رَأَيْبَ فِيهِ طَفَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ④  
 اس میں دھوکا نہیں ایک فرقہ بہشت میں اور ایک فرقہ آگ میں

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يُدْخِلُ  
 اور اگر چاہتا تھا تو سب لوگوں کو کرتا ایک ہی فرقہ لیکن وہ داخل کرتا ہے

مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ طَوَالِظُ الظَّالِمُونَ مَالَهُمْ مِنْ دَرِي  
 جس کو چاہے اپنی رحمت میں اور گنہگار جو ہیں ان کا کوئی نہیں رنہ

وَلَا نَصِيرٍ ⑤ أَمَّا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۚ قَالَ اللَّهُ  
 اور نہ مددگار کیا انھوں نے پھرے ہیں اس سے دوسرے کام بنانے والے سوا اللہ جو ہے

هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ⑥  
 وہی ہے کام بنانے والا اور وہی چلاتا ہے مردوں کو اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے

## خلاصہ تفسیر

حَمْدٌ عَسَقَ - (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں جس طرح اصول دینیہ کی تحقیق اور فوائد  
 عظیمہ کے لئے یہ سورت آپ پر نازل ہو رہی ہے) اسی طرح آپ پر اور جو (پیغمبر) آپ سے پہلے  
 ہو چکے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ جو زبردست حکمت والا ہے (دوسری سورتوں اور کتابوں کی) وحی بھیجتا  
 رہا ہے (اور اس کی یہ شان ہے کہ) اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہی  
 سب سے برتر اور عظیم الشان ہے (اس کی عظمت شان کو اگر کچھ زمین والے نہ پہچانیں اور نہ مانیں  
 مگر آسمانوں میں اس کی معرفت رکھنے والے اور عظمت کو پہچاننے والے فرشتے اس کثرت سے ہیں کہ کچھ بعد  
 نہیں کہ آسمان (ان کے بوجھ کی وجہ سے) اپنے اوپر سے (کہ بوجھ اور دھری سے پڑتا ہے) پھٹ پڑیں  
 (جیسا کہ حدیث میں آگلی السَّمَاءُ وَحَقٌّ لَهَا أَنْ تَنَظَّطَ مَا فِيهَا مَوْضِعَ أَرْبَعَةِ أَصَابِعَ  
 الْوَلَدِ وَاصْبَحَ جَبْهَتُهُ سَاجِدًا لِلَّهِ - رواہ الترمذی وابن ماجہ وبقی فی الدرر) یعنی آسمان میں ایسی آواز پیدا ہونے لگی جیسی کسی چیز پر زیادہ بوجھ پڑ جانے سے ہوا کرتی ہے - اور آسمان  
 ایسی ہی آواز ہونی چاہیے - کیونکہ پورے آسمانوں میں چار انگشت کی جگہ بھی ایسی نہیں جس میں کوئی  
 فرشتہ اپنی پیشانی ٹیک کر سجدہ میں نہ ہو (وہ) فرشتے اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں، اور





## معارف و مسائل

يَنْقُطُونَ - اس میں بحوالہ حدیث اور بیان ہوا ہے کہ فرشتوں کے بوجھ سے آسمان میں ایسی آواز پیدا ہوتی جیسی کسی چیز پر بڑا بھاری بوجھ رکھ دینے سے ہوا کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں میں ثقل الا بوجھ ہے۔ اور اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ کیونکہ یہ بات تو مسلم ہے کہ فرشتے بھی اجسام ہیں اگرچہ اجسام لطیفہ ہوں۔ اور اجسام لطیفہ جب بہت بڑی تعداد میں ہو جائیں تو ان کا بوجھ بڑا کوئی مستبعد نہیں۔ (بیان القرآن)

لَتَنذِرَنَّهُمْ الْقُرْآنُ - اُمّ القریٰ کے معنی میں ساری بستیوں اور شہروں کی اہل اور بنیاد، مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس کا نام اُمّ القریٰ اس لئے رکھا گیا کہ یہ شہر ساری دنیا کے شہروں اور بستیوں سے اور ساری زمین سے اللہ کے نزدیک اشرف و افضل ہے۔ جیسا کہ امام احمد نے مستند میں حضرت عدی بن حمراء نہ ہری سے روایت کی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت سنا جبکہ آپ (مکہ مکرمہ سے ہجرت کر رہے تھے اور) بازار مکہ کے مقام حزوہ پر تھے کہ آپ نے مکہ مکرمہ کو خطاب کر کے فرمایا:-

تومیرے نزدیک اللہ کی ساری زمین سے بہتر ہے اور ساری زمین سے زیادہ محبوب ہے، اگر مجھے اس زمین سے نکال دیا جاتا تو میں اپنی مرضی سے کبھی اس زمین کو نہ چھوڑتا۔

اذنک لخبیر اس رضی اللہ و احب اس رضی اللہ الیٰ و لو لا انی اُخویت منک لما خیرت (درود میں مثلہ الترمذی والنسائی) ابن ماجہ و قال الترمذی حدیث حسن صحیح

وَمَنْ حَوْلَهَا - یعنی مکہ مکرمہ کے آس پاس اس سے مراد آس پاس کے عرب ممالک بھی ہو سکتے ہیں اور پوری زمین کی مشرق و مغرب بھی۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ذَلِكُمُ

اور جس بات میں جھگڑا کرتے ہو تم لوگ کوئی چیز نہ ہو اس کا فیصلہ ہے اللہ کے حوالے وہ اللہ

اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝ فَاطِرُ السَّمَوَاتِ

ہے رب میرا اسی پر ہے مجھ کو بھروسہ اور اسی کی طرف میری رجوع ہے بنا کالئے آسمانوں کا

وَالْأَرْضِ ط جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنْ

اور زمین کا بنا دیئے تمھارے واسطے تم ہی میں سے جوڑے اور جو یا یوں



الْأَنْعَامِ أَنْزِلُوا جَاهِ يَدُكُمْ فِيهِ طَلَيْسَ كَيْتِلَاهُ شَعْنُ

میں سے جوڑے بکھیرنا ہے تم کو اسی طرح نہیں ہے اس کی طرح کا سا کوئی

وَهُوَ السَّيِّئُ الْبَصِيرُ ۝ لَّهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

اور وہی ہے سننے والا دیکھنے والا اسی کے پاس ہیں کھیاں آسمانوں کی اور زمین کی

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ بِكُلِّ

بھیلا دیتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اور ماپ کر دیتا ہے وہ ہر چیز کی خبر

شَيْءٍ عَلَيْهِ ۝

رکھتا ہے ۔

## خلاصہ تفسیر

اور آپ ان لوگوں سے جو توحید میں آپ سے اختلاف رکھتے ہیں یہ کہئے کہ جس جس بات میں تم (اہل حق کے ساتھ) اختلاف کرتے ہو اس (سب) کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے سپرد ہے (وہ یہ ہے کہ دنیا میں دلائل و معجزات کے ذریعہ توحید کا حق ہونا واضح فرما دیا اور آخرت میں ایمان والوں کو جنت اور ایمان نہ لانے والوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا) یہ اللہ (جس کی یہ شان ہے) میرا رب ہے (اور تمہارا کہ خلافت و مخالفت سے جو کسی تکلیف و نقصان کے پہنچنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے اس کے بارے میں) اسی پر توکل رکھنا ہوں اور (دنیا و دین کے سب کاموں میں) اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں (اس سے توحید کا مضمون خوب مزید ہو گیا۔ آگے دوسری صفات کمال کے بیان سے اس کی مزید تاکید کی جاتی ہے یعنی) وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (اور تمہارا بھی پیدا کرنے والا ہے چنانچہ) اس نے تمہارے لئے تمہاری مجلس کے جوڑے بنائے اور (اسی طرح) مویشی کے جوڑے بنائے (اور) اس (جوڑے ملانے) کے ذریعہ تمہاری نسل چلاتا رہتا ہے (وہ ذات و صفات میں ایسا کامل ہے کہ) کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے (بخلاف دوسروں کے کہ ان کا سننا دیکھنا بہت محدود ہے اور بمقابلہ اللہ کے سمع و بصر کے کالعدم ہے) اسی کے اختیار میں ہیں کھیاں آسمانوں کی اور زمین کی (یعنی ان میں تصرف کرنے کا صرف اسی کو حق ہے جس میں سے ایک تصرف یہ ہے کہ) جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے اور (جس کو چاہے) کم دیتا ہے، بے شک وہ ہر چیز کا پورا جاننے والا ہے (ہر ایک کو مصلحت کے مطابق دیتا ہے۔)

## معارف و مسائل

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ - یعنی جس معاملہ جس کام میں بھی تمہارے آپس میں کوئی اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے۔ کیونکہ اصل حکم صرف اللہ ہی کا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ **إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ**۔ اور دوسری اکثر آیات میں جو اطاعت کے حکم میں رسول کو اور بعض آیات میں اولوالامر کو بھی شامل کیا گیا ہے وہ اس کے معارض نہیں کیونکہ رسول یا اولوالامر جو کچھ فیصلہ یا حکم کرتے ہیں وہ ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہوتا ہے۔ اگر مذکورہ دو یا انصوص کتاب و سنت ہے تو اس کا حکم الہی ہونا ظاہر ہے۔ اور اگر اپنے اجتہاد سے ہے تو چونکہ اجتہاد کا مدار بھی انصوص قرآن و سنت پر ہوتا ہے اس لئے وہ بھی ایک حیثیت سے اللہ ہی کا حکم ہے مجتہدین اُمت کے اجتہادات بھی اس حیثیت سے احکام الہیہ ہی میں داخل ہیں۔ اسی لئے علماء نے فرمایا کہ عام آدمی جو قرآن و سنت کو سمجھے کی صلاحیت نہیں رکھتے اُن کے حق میں مفتی کا فتویٰ ہی حکم شرعی کہلاتا ہے۔

**شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا**

راہ ڈال دی تمہارے لئے دین میں وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم بھیجا ہم نے

**إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا**

تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو یہ کہ قائم رکھو

**الدِّينَ وَلَا تَفْرَقُوا فِيهِ ط كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ**

دین کو اور اختلاف نہ ڈالو اس میں بھاری ہے شرک کرنے والوں کو وہ چیز جس کی طرف تو

**إِلَيْهِ ط اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ**

ان کو بلاتا ہے اللہ چاہتا ہے اپنی طرف سے جس کو چاہے اور راہ دیتا ہے اپنی طرف اس کو جو

**يَنْبِي ۙ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ**

رجوع لائے اور جنہوں نے اختلاف ڈالا سو سمجھا چکے کے بعد آپس کی

**بَغْيًا بَيْنَهُمْ ط وَلَوْ لَا كَلِمَةُ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَى**

سے اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو نکلی ہے تیرے رب سے ایک

**أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّفَقَضَ بَيْنَهُمْ ط وَإِنَّ الَّذِينَ أُوْرِشُوا**

مقررہ وعدہ تک تو فیصلہ ہو جاتا اُن میں اور جن کو ملی ہے



الْكِتَابِ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٌ ۝۱۴ فَلِذَا لِكَ

کتاب ان کے پیچھے وہ البتہ اس سے دھوکہ میں ہیں جو چین نہیں آئے دیتا سو تو اسی طرف

فَادُعِ ۝ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ هُمْ وَقُلْ

مبلا اور قائم رہ جیسا کہ فرما دیا ہے تجھ کو اور مست چل ان کی خواہشوں پر اور کہہ

أَمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ

میں یقین لایا ہر کتاب پر جو اتاری اللہ نے اور مجھ کو حکم ہے کہ انصاف کروں تمہارے بیچ میں

اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حِجَّةَ

اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا ہم کو ملیں گے ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام کچھ جھگڑا نہیں

بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝۱۵

ہم میں اور تم میں اللہ اکٹھا کرے گا ہم سب کو اور اسی کی طرف پھر جانا ہے -

## خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اُس نے نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ (علیہم السلام) کو (مع ان سب کے اتباع کے) حکم دیا تھا (اور ان کی اُمم کو یہ کہا تھا) کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ (مُراد اس دین سے اصول دین ہیں جو مشترک ہیں تمام مشرک میں، مثل توحید و رسالت و بعث و نحوہ اور قائم رکھنا یہ کہ اس کو تبدیل مت کرنا اور اس کو ترک مت کرنا اور تفریق یہ کہ کسی بات پر ایمان لاؤں اور کسی پر ایمان نہ لاؤں یا کوئی ایمان لاؤں اور کوئی نہ لاؤں۔ مماثل یہ کہ توحید وغیرہ دین قدیم ہے کہ اول سے اس وقت تک تمام مشرک اس میں متفق رہی ہیں اور اسی کے ضمن میں نبوت کی بھی تائید ہو گئی۔ پس چاہیے تھا کہ اس کے قبول کرنے میں لوگوں کو ذرا پس و پیش نہ ہوتا مگر پھر بھی) مشرکین کو وہ بات (یعنی توحید) بڑی گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ اُن کو بلا رہے ہیں۔ (اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ) اللہ اپنی طرف جس کو چاہے پہنچ لیتا ہے (یعنی دین حق قبول کرنے کی توفیق دیتا ہے) اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے (مشائیت کے بعد اجتناب ہوتا ہے اور اجتبار یعنی توفیق ایمان کے بعد اگر ناہت و اطاعت ہو تو اُس پر قرب الہی و ثواب غیر متناہی مرتب ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مشرکین متصف بالابارہیں اور یمنین متصف بالاجتبار والاہتدارہیں) اور (ہمارا جو اُمم سابقہ کو حکم تھا اَقِمْو الدِّینَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا

فَیَدَّ تَوْبَتُہٗ لَوَکَ اس پر قائم نہ رہے اور متفرق ہو گئے اس کا سبب کوئی التباس و اشتباہ نہ تھا کہ احتمال معذوری کا ہو بلکہ وہ لوگ بعد اس کے کہ اُن کے پاس (یعنی اُن کے اسماع و اذیان تک) علم (صحیح) پہنچ چکا تھا محض آپس کی ضد و تضادی سے باہم متفرق ہو گئے (اس طرح کہ اول طلب مال و دولت و طلب جاہ و ریاست سے اغراض مختلف ہوئیں پھر فرقے بن گئے۔ ایسے وقت میں دین کو بھی آرڈر دوسرے کی تنقیص و تعیب کی بنایا کرتے ہیں، شدہ شدہ مسلک و مذہب مختلف ہو جاتا ہے پھر فروع سے اصول میں جا پہنچتے ہیں) اور (یہ لوگ اس جرم عظیم میں کہ حق کو سمجھ کر مختلف ہوئے ایسے عذاب شدید کے مستحق ہو گئے تھے کہ) اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک وقت معین تک (کے لئے مہلت دینے کی) ایک بات پہلے قرار نہ پا چکی (کہ ان کا عذاب موعود آخرت میں ہوگا) تو (دنیا ہی میں) اُن (کے اختلافات) کا فیصلہ ہو چکا ہوتا (یعنی عذاب سے استیصال کر دیا جاتا اور گوامم سابقہ پر عذاب آیا لیکن غیر مومنین پر آیا۔ مومنین میں سے جنہوں نے تفرق کیا یہ برکت التزام ایمان کے ان پر نہیں آیا۔ اگر کسی پر ثابت ہو جاوے تو سب پر نہیں آیا اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ جن بعض پر نہیں آیا، اس کی وجہ عدم مقتضی کا نہیں بلکہ اس کی وجہ مانع یعنی امہال الیٰ آجلیٰ مسیحی کا وجود ہے۔ یہ تو قصۃ امم سابقہ کا ہوا) اور جن لوگوں کو اُن (امم سابقہ) کے بعد کتاب دی گئی ہے (مُرَاد اس سے مشرکین عہد نبوی کے ہیں کہ آپ کے ذریعہ سے اُن کو قرآن پہنچا) وہ (لوگ) اُس (کتاب) کی طرف سے ایسے (قوی) شک میں پڑے ہیں جس نے (اُن کو) رُتد میں ڈال رکھا ہے (مطلب یہ کہ امم سابقہ میں سے بعض نے جیسے انکار کیا تھا اسی طرح اب ان کی توبت آئی) سو آپ (کسی کے انکار سے دل شکستہ نہ ہو جائے بلکہ حیثیت آپ ان کو پہلے سے بلا رہے ہیں جس کا ذکر اس آیت میں ہے کَبُرَ عَلٰی الْمُشْرِکِیْنَ مَا کَانَ حَقُّہُمْ فِی الدِّیْنِ یعنی توحید) اُسی طرف (اُن کو برابر) بلائے جائے اور جس طرح آپ کو حکم ہوا ہے اَکْثَرُ لَکَ فَادُعُ اَکْثَرُ پر مستقیم رہیے اور ان کی (فاسد) خواہشوں پر نہ چلیے (یعنی وہ مخالفت کر کے یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو کہنا چھوڑ دیں تو آپ چھوڑیے نہیں) اور آپ کہہ دیجئے کہ (میں جس بات کی طرف تم کو بلاتا ہوں میں خود بھی اُس پر عامل ہوں چنانچہ) اللہ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں (جن میں قرآن بھی داخل ہے) میں سب پر ایمان لاتا ہوں (جن کے مضامین متفق علیہا میں سے توحید بھی ہے) اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ (اپنے اور تمہارے درمیان میں عدل و انصاف) رکھوں (یعنی جس چیز کو تم پر واجب و لازم کہوں اپنے اوپر بھی اس کو لازم رکھوں) یہ نہیں کہ تم کو کلفت میں ڈالوں اور خود آزاں ہوں ایسے مضامین و معانی سے سلیم الطبع کو رغبت اتباع کی ہوتی ہے۔ اور اس پر بھی اگر نرم نہ ہوں تو اخیر بات یہ ہے کہ اللہ ہمارا بھی



مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے (یعنی وہ سب کا حاکم ہے اور) ہمارے عمل ہمارے لئے اور تمہارے عمل تمہارے لئے، ہمارے تمہاری کچھ بحث نہیں اللہ (جو سب کا مالک ہے قیامت میں) ہم سب کو جمع کرے گا (اس میں شک نہیں کہ) اسی کے پاس جانا ہے (وہ سب کا فیصلہ اعمال کے موافق کرے گا) اس وقت تم سے بحث نفی ہے ہاں تبلیغ کئے جاویں گے۔

## معارف و مسائل

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا آتِیَةً - سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی ظاہری اور جسمانی نعمتوں کا ذکر تھا، یہاں سے باطنی اور روحانی نعمتوں کا بیان ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایسا مضبوط اور مستحکم دین عطا فرمایا جو تمام انبیاء علیہم السلام میں مشترک اور متفق علیہ ہے۔ آیت میں انبیاء علیہم السلام میں سے پانچ کا ذکر فرمایا۔ سب سے پہلے نوح علیہ السلام اور آخر میں ہمارے رسول خاتم الانبیاء اور درمیان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اس لئے کہ وہ ابوالانبیاء ہیں اور عرب کے لوگ باوجود اپنے کفر و شرک کے ان کی نبوت کے قائل تھے۔ اور ان کے بعد حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ نزول قرآن کے وقت انھیں دو پیغمبروں کے ماننے والے یہود و نصاریٰ موجود تھے۔ سورہ احزاب میں بھی میناق انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں انھیں پانچ کا ذکر آیا ہے۔ (وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ) فرق یہ ہے کہ سورہ احزاب میں خاتم الانبیاء کا ذکر پہلے اور نوح علیہ السلام کا بعد میں ہے، اور سورہ شوریٰ میں نوح علیہ السلام کا ذکر پہلے آپ کا بعد میں ہے۔ اس میں شاید اشارہ اس طرف ہو کہ حضرت خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام اگرچہ زمان ولادت و بعثت کے اعتبار سے سب سے آخر میں ہیں مگر ازلی تقسیم نبوت و رسالت میں سب سے مقدم ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ میں سب انبیاء میں باعتبار تخلیق (ازلی) کے پہلے ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب سے آخر میں ہوں۔

(ابن ماجہ دارمی عن بہز بن حکیم رضی اللہ عنہما حدیث حسن کہ فی المشکوٰۃ ص ۵۸)

رہا یہ سوال کہ سب سے پہلے پیغمبر تو حضرت آدم علیہ السلام ہیں، ذکر انبیاء کو ان سے کیوں شروع نہ کیا گیا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے پیغمبر ہیں جو دنیا میں تشریف لائے۔ اصول عقائد اور مہمات دین میں اگرچہ وہ بھی مشترک تھے مگر ان کے زمانہ میں شرک و کفر انسانوں میں نہیں تھا۔ کفر و شرک کا مقابلہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا ہے، اس لحاظ سے نوح علیہ السلام

پہلے پیغمبر ہیں جن کو اس طرح کے معاملات پیش آئے، جو بعد کے انبیاء کو پیش آنے والے تھے، اس لئے سلسلہ کو نوح علیہ السلام سے شروع کیا گیا۔ واللہ اعلم۔

اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَقْسُرُوا فِیْهِ - یہ جملہ پہلے ہی جملہ کی تشریح ہے کہ وہ دین جس میں سب انبیاء علیہم السلام مشترک اور متحد ہیں اس دین کو قائم رکھو اس میں اختلافات و تفرق جائز نہیں بلکہ موجب ہلاکت ہے۔

اقامت دین فرض اور اس میں تفرق حرام ہے۔ اس کا معنی پہلو یعنی اس میں تفرق کی ممانعت۔ جبکہ جوہر مفسرین کے نزدیک اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ میں حرف اَنْ تفسیر کیلئے ہے تو دین

کے معنی متعین ہو گئے کہ مراد وہی دین ہے جو سب انبیاء علیہم السلام میں مشترک چلا آ رہا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دین مشترک بین الانبیاء اصول عقائد یعنی توحید۔ رسالت۔ آخرت پر ایمان اور اصول عبادات۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی پابندی ہے۔ نیز جوہری، ڈاکہ، زنا، جھوٹ فریب۔ دوسروں کو بلا وجہ شرعی ایذا دینے وغیرہ اور عہد شکنی کی حرمت ہے جو سب ادیان سماویہ میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں۔ اور یہ بھی نص قرآن سے ثابت ہے کہ فروع احکام میں انبیاء کی شریعتوں میں جزوی اختلاف بھی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَا جَا۔ اس مجموعہ سے ثابت ہوا کہ آیت کے اس جملہ میں جس دین کی اقامت کا حکم اور اس میں تفرق کی ممانعت مذکور ہے وہ وہی احکام الہیہ ہیں جو سب انبیاء علیہم السلام کی شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں۔ انھیں میں تفرق و اختلاف حرام اور موجب ہلاکت اعم ہے۔

**حکایت:** حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایک سیاہ خط کھینچا، پھر اس خط کے داہنے بائیں دوسرے چھوٹے خط کھینچے اور فرمایا کہ یہ داہنے بائیں کے خطوط وہ طریقے ہیں جو شیاطین نے اچھڑائے ہیں اور اس کے ہر راستہ پر ایک شیطان مسلط ہے جو لوگوں کو اس طرف چلنے کی تلقین کرتا ہے اور پھر سیدھے خط کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، وَاَنْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ مَا فَاتَبَحُوْهُ۔ یعنی یہ میرا سیدھا راستہ ہے تم اسی کا اتباع کرو۔ (رواہ احمد والنسائی والدارمی۔ منظرہ)

اس تمثیل میں صراط مستقیم سے وہی دین قیم کا راستہ ہے جو سب انبیاء علیہم السلام میں مشترک چلا آیا ہے۔ اس کے اندر شاخیں نکالنا یہ تفرق حرام اور شیاطین کا عمل ہے۔ اور انہی اجماعی اور متفق علیہ احکام میں تفرق ڈالنے کی شدید ممانعت احادیث صحیحہ میں آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شَبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ۔ رواہ احمد والبودائی



یعنی جس شخص نے جماعت مسلمین سے ایک بالشت بھی جُدائی اختیار کی اس نے اسلام کا حلقہ عقیدت اپنے گلے سے نکال دیا۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کَلِمَةُ اللَّهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ (رواہ الترمذی بسند حسن) یعنی اللہ کا ہر بقعہ ہے جماعت پر۔ اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان انسانوں کے لئے بھیڑیا ہے جیسے بکریوں کے گلے کے پیچھے بھیڑیا لگتا ہے، تو وہ اسی بکری کو کپڑا تا ہے جو اپنی ڈار اور گلے سے پیچھے یا ادھر ادھر رہ جائے۔ اس لئے متوفی چاہیے کہ جماعت کے ساتھ رہو علیحدہ نہ ہو۔

(رواہ احمد یہ سب احادیث تفسیر منظر ہی میں ہیں)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں حکم اس دین مشترک اور متفق علیہ کے قائم رکھنے کا ہے، جس پر تمام انبیاء علیہم السلام متفق اور مشترک چلے آئے ہیں۔ اس میں اختلاف کو تفرق کے لفظ سے تعبیر کر کے ممنوع کیا گیا ہے۔ انہی قطعی احکام میں اختلاف و تفرق کو احادیث مذکورہ میں ایمان کے لئے خطرہ اور سبب ہلاکت فرمایا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ فروعی مسائل میں جہاں قرآن و حدیث میں کوئی واضح حکم موجود نہیں یا نصوص قرآن و سنت میں کوئی ظاہری تفرق ممنوع میں داخل نہیں۔ وہاں ائمہ مجتہدین کا اپنے اپنے اجتہاد سے کوئی حکم متعین کر لینا، جس میں باہم اختلاف ہونا، اختلاف رائے و نظر کی بنا پر لازمی ہے، اس تفرق ممنوع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ایسا اختلاف صحابہ کرامؓ میں خود عہد رسالت سے چلا آیا ہے اور وہ باتفاق فقہاء رحمت ہے۔

اور اقامت دین سے مراد، اُس پر قائم و دائم رہنا، اس میں کسی شک و شبہ کو راہ نہ دینا، اور کسی حال اس کو نہ چھوڑنا ہے۔ (قرطبی)۔

کَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ۔ یعنی دین حق کا جس میں توحید رکن اعظم ہے ابتداء عالم سے سب انبیاء علیہم السلام کے اتفاق سے حق ہونا ثابت ہو جانے کے باوجود جو لوگ شرک کے عادی ہو چکے ہیں، ان کو آپ کی دعوت توحید بڑی بھاری معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ اہوار و اغراض اور شیطانی تعلیمات کا اتباع اور صراطِ مستقیم کو چھوڑنا ہے جس کی اوپر ممانعت مذکور ہے۔ آگے فرماتے ہیں۔

اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔ یعنی صراطِ مستقیم کی ہدایت کے دو ہی طریقے ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کو اپنے دین اور صراطِ مستقیم کے لئے منتخب فرما کر اس کی فطرت و طبیعت ہی اس کے مطابق بنا دے۔ جیسے انبیاء علیہم السلام اور خاص اولیاء اللہ

جن کے بار میں قرآن نے فرمایا اِنَّا اَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ كُوْنِ الدَّارِ یعنی ہم نے ان کو ایک خاص کام کے لئے خالص کر دیا ہے جو آخرت کی فکر اور خاص خاص انبیاء کے بارے میں قرآن نے مُخْلِصٌ بفتح لام ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔ جس کے معنی منتخب اور مخصوص کے ہیں۔ یہی مفہوم اللہ یَجْتَنِبُ إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ کا، یہ طریقہ ہدایت مخصوص و محدود ہے اور دوسرا عام طریقہ ہدایت پائے کا یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی طرف رجوع ہو اور اس کے دین پر چلنے کا ارادہ کر لے تو اس کو اللہ تعالیٰ دین حق کی ہدایت کر دیتا ہے۔ یہ مطلب ہے دوسرے جملے وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ کا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت پانے کے صرف دو طریق ہیں، ایک خصوصی کہ اللہ تعالیٰ کسی کو خود ہی صراطِ مستقیم کے لئے منتخب فرمائے۔ دوسرا عمومی کہ جو شخص اللہ کی طرف رجوع ہو اور اس کے دین حق کی تلاش کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے مقصود ہدایت تک پہنچا دیتا ہے۔ اور مشرکین مکہ کو جو دعوتِ توحید بھاری معلوم ہوتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ دین کے سمجھنے اور اس پر چلنے کا ارادہ بھی نہیں کرتے۔

وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَلْعَدٍ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ۔ مَا تَفَرَّقُوا کی ضمیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف راجع فرمائی اور مطلب یہ قرار دیا کہ کفار قریش نے جو دین حق اور صراطِ مستقیم سے علیحدگی اور بیزاری اختیار کی، یہ فی نفسہ بھی سخت نادانی تھی، اس پر مزید یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے علم آجانے کے بعد بھی انہوں نے ایسا کیا۔ علم آجانے سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آجانا ہے، جو سارے علوم الہیہ کے سرچشمہ تھے۔ اور بعض حضرات مَا تَفَرَّقُوا کی ضمیر پھیلی امتوں کے لوگوں کی طرف پھیری اور معنی یہ قرار دیے کہ پھیلی امتوں کے لوگوں نے اپنے اپنے انبیاء کے دین سے تفرق اور علیحدگی اختیار کی، باوجودیکہ ان کے پاس انبیاء کے ذریعہ صراطِ مستقیم کا صحیح علم آچکا تھا۔ اُمم سابقہ مخاطب ہوں یا امتِ محمدیہ کے کفار۔ دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ خود تو گمراہی میں پڑے ہی اپنے رسولوں کو بھی اپنے راستہ پر چلانے کے خواہشمند تھے اس لئے اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا:-

قُلْ لَئِنْ لَمْ يَنْزِلْ إِلَيْكُمُ الْكِتَابُ لَأَعْتَابُكُمْ وَإِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَنْ يُظَيِّرَ لَكُمْ سُبُلَ الْغَيِّ۔

حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ آیت دس مستقل جملوں پر مشتمل ہے اور ہر جملہ خاص احکام پر مشتمل ہے۔ گویا اس ایک آیت میں احکام کی دس فصلیں مذکور ہیں۔ اس کی نظیر پورے قرآن میں ایک آیت الکرسی کے سوا کوئی نہیں۔ آیت الکرسی میں بھی دس احکام کی دس فصلیں آئی ہیں۔



پہلا حکم فَلِذَا لِكَ فَادْعُ یعنی اگرچہ مشرکین پر آپ کی دعوت توحید جاری ہے۔ مگر اس کی وجہ سے آپ اپنی دعوت کو نہ چھوڑیں۔ اور مسلسل اس دعوت کا کام جاری رکھیں۔ دوسرا حکم وَاسْتَقِمْ کہنا اُمِرْت ہے، یعنی آپ اس دین پر غور مستقیم رہیں۔ جس کی دعوت لوگوں کو دیتے ہیں اور یہ استقامت ایسی ہونی چاہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ یعنی تمام احکام عقائد۔ اعمال اخلاق و عادات و معاشرت میں صحیح اعتدال پر قائم رہیں۔ کسی طرف افراط و تفریط کا ادنیٰ اسامیلان نہ ہو۔ اور ظاہر کیے کہ ایسی استقامت آسان کام نہیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بعض صحابہ نے آپ کے سفید بال آجانے کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا شَبَّ بَشْنَىٰ هُوْدُ یعنی مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا سورہ ہود میں بھی یہی حکم انھیں الفاظ کے ساتھ آیا ہے۔ (معارف القرآن جلد چہارم صفحہ ۶۷۷) تفسیر سورہ ہود کے ضمن میں استقامت کے مفہوم اور اس کی دشواری اور اہمیت پر مستقل کلام کیا گیا ہے، وہاں دیکھ لیا جائے، تیسرا حکم وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ كُفْرٍ یعنی اپنے فریضہ تبلیغ میں آپ کسی مخالفت کی مخالفت کی پروا نہ کریں۔ چوتھا حکم مَثَلُ امْنٌ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ یعنی آپ اعلان فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں میرا ان سب پر ایمان ہے۔ یا پھر اَمْرٌ بِالْعَدْلِ بَيْنَ كُفْرٍ اس کا مفہوم ظاہر تو یہی ہے کہ میرے پاس جو معاملات باہمی جھگڑوں کے آویں مجھے حکم کیا گیا ہے کہ میں ان میں عدل و انصاف کروں۔ بعض حضرات نے یہاں عدل کے معنی برابر ہی کے لیکر آیات کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ میں تمھارے درمیان دین کے سب احکام کو برابر رکھوں کہ ہر نبی اور ہر کتاب پر ایمان لاؤں اور تمام احکام الہیہ کی اطاعت کروں۔ ایسا نہیں کہ بعض پر ایمان ہو بعض پر نہ ہو یا بعض احکام کی تعمیل ہو بعض کی نہ ہو۔ چھٹا حکم اللَّهُ سَمِعْنَا یعنی اللہ سہارا سب کا پالنے والا ہے۔ سَتَأْتِ الْكُفْرَ لَنَا نَقْصَانٌ وَلَكُمْ نَقْصَانٌ یعنی ہمارے اعمال ہمارے کام آویں گے تمھیں اُن کا کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور تمھارے اعمال تمھارے کام آویں گے ہمیں اس سے کوئی نفع و نقصان نہ پہنچے گا۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی تھی جبکہ کفار سے جہاد کرنے کے احکام نازل نہ ہوئے تھے۔ احکام جہاد کی آیتوں نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ کیونکہ جہاد کا حاصل یہی ہے کہ جو لوگ نصیحت و نہایت کا اثر نہ لیں اُن سے قتال کر کے انھیں مغلوب کیا جائے یہ نہیں کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ حکم منسوخ نہیں اور مطلب آیات کا یہ ہے کہ جب ہم نے حق کو دلائل اور براہین سے ثابت کر دیا تو اب اس کا نہ ماننا صرف عناد اور ریت دھرمی ہی کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور عناد اگیا تو اب دلائل کی گفتگو فضول ہوئی تمھارا عمل تمھارے آگے میرا میرے آگے کا (قرطبی)۔ اَمْرٌ بِالْعَدْلِ بَيْنَ كُفْرٍ حجت سے مراد بحث و مباحثہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ حق واضح اور ثابت ہو جانے کے بعد بھی اگر تم عناد سے کام لیتے ہو تو اب گفتگو

نفل ہے، ہمارے اور تمہارے درمیان اب کوئی بحث نہیں۔ تو ان حکم اللہ یجمعہم بیکنا یعنی قیامت کے روز ہم سب کو اللہ تعالیٰ جمع فرما دیں گے اور ہر ایک عمل کا بدلہ دیں گے۔ سوال حکم والیہ المصیور یعنی ہم سب اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

وَالَّذِينَ يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتَجِيبَ لَهُ

اور جو لوگ جھگڑا ڈالتے ہیں اللہ کی بات میں جب لوگ اس کو مان چکے ان کا

حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ

جھگڑا باطل ہے ان کے رب کے یہاں اور ان پر غصہ ہے

وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۱۶ ۱۷ اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ

اور ان کو سخت عذاب ہے اللہ وہی ہے جس نے اتاری کتاب سچے دین پر

وَالْمِيزَانَ ط وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ۱۸ يَسْتَعْجِلُ

اور ترازو بھی اور کچھ کو کیا خبر ہے شاید وہ گھڑی پاس ہو جلدی کرتے ہیں

بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ

اس گھڑی کی وہ لوگ کہ یقین نہیں رکھتے اس پر اور جو یقین رکھتے ہیں ان کو اس کا ڈر

مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ ط الْآيَاتِ الَّذِينَ يُمارُونَ

ہے اور جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے سنتا ہے جو لوگ جھگڑتے ہیں اس گھڑی کے

فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ۱۸

آنے میں وہ بہک کر دور جا بڑے -

## خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ (کے دین) کے بارے میں (مسلمانوں سے) جھگڑنے لگاتے ہیں۔ بعد اسکے کہ وہ مان لیا گیا (یعنی بہت سے سمجھدار ذی عقل آدمی مسلمان ہو کر اس کو مان چکے ہیں۔ اور حجت واضح ہو جانے کے بعد مجادلہ اور زیادہ مذموم ہے سو) ان کو گول کی حجت ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر خدا کی طرف سے (غضب (الے والا) ہے اور ان کے لئے (قیامت میں) سخت عذاب (ہونے والا) ہے (اور اس سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کو اور اس کے دین کو مانو، یعنی اس کی کتاب جو



حقوق اللہ اور حقوق العباد سب پر حاوی ہے اس کو واجب العمل جانو کیونکہ (اللہ ہی جس نے (اس) کتاب (یعنی قرآن) کو حق کے ساتھ اور (اس میں جو خاص حکم ہے) انصاف (کا اس) کو نازل فرمایا) جب یہ کتاب اللہ کی تو اللہ کو ماننا بغیر اس کتاب کے ماننے کے مستبر نہیں۔ بعض غیر مسلم جو اللہ کو ماننے کا تو دعویٰ کرتے ہیں مگر قرآن کو نہیں مانتے وہ نجات کے لئے کافی نہیں) اور (یہ لوگ جو آپ سے قیامت کا متعین وقت پوچھتے ہیں تو) آپ کو (اس کی) کیا خبر (لیکن آپ کو خبر نہونے سے اس دن کی نفی لازم نہیں آتی بلکہ اس کا وقوع یقینی ہے اور تعین وقت کے لئے اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ) عجیب نہیں کہ قیامت قریب ہو (مگر) جو لوگ اس کا یقین نہیں رکھتے (وہ اُس دن سے ڈرنے کے بجائے بطور استہزاء و انکار کے) اُس کا تقاضا کرتے ہیں۔ (کہ وہ جلد کیوں نہیں آجاتی) اور جو لوگ یقین رکھتے والے ہیں وہ اس سے (کانپتے اور) ڈرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ برحق ہے یاد رکھو کہ (ان دونوں قسم کے لوگوں میں قسم اول کے لوگ یعنی) جو لوگ قیامت کے (منکر ہیں اور اُسکے) بارے میں جھگڑتے ہیں بڑی دور (دورانہ) کی گمراہی میں (مبتلا) ہیں۔

## معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اُس دین تویم کی طرف اہل عالم کو دعوت دی گئی تھی جس پر تمام آسمانی کتابیں اور انبیاء علیہم السلام متفق ہیں۔ اور اس پر قائم رہنے اور استقامت اختیار کرنے کی تلقین تھی۔ مگر بعض اہل کفر جو سننے اور ماننے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے اور کفول نے اس پر بھی مسلمانوں سے حجت بازی شروع کی۔ بعض روایات میں ہے کہ کچھ اہل کتاب یہود و نصاریٰ نے یہ حجت پیش کی کہ ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے اور ہمارے کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے۔ اس لئے ہمارا دین تمہارے دین سے افضل ہے۔ اور بعض روایات میں یہی مضمون کفار قریش کی طرف سے ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو دینِ ابراہیم علیہ السلام کا متبع کہتے تھے۔ قرآن کریم نے آیات مذکورہ میں ان کو متنبہ کیا کہ دین اسلام اور قرآن کی حجت لوگوں پر تمام ہو چکی ہے اور خود تمہارے سمجھدار انصاف پسند لوگ تسلیم کر کے مسلمان ہو چکے ہیں اب یہ تمہاری حجت یا ذی باطل اور گمراہی ہے جس کا کوئی قرار نہیں۔ اب اگر اس کو نہیں مانو گے تو خدا کا غضب تم پر ٹوٹے گا۔ آگے قرآن کے منجانب اللہ ہونے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کے لئے جامع قانون ہونے کا ذکر ہے۔ اَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ کتاب سے مراد اس جگہ مطلق آسمانی کتاب ہے جس میں قرآن اور پہلی کتابیں سب داخل ہیں اور حق سے مراد دین حق ہے

جس کا ذکر اوپر آیا ہے اور میزان کے لفظی معنی ترازو کے ہیں وہ چونکہ انصاف قائم کرنے اور حق پورا دینے کا ایک آلہ ہے۔ اس لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے میزان کی تفسیر عدل و انصاف سے کی ہے۔ مجاہد امام تفسیر نے فرمایا کہ یہاں میزان سے مراد وہ عام ترازو ہے جس کو لوگ استعمال کرتے ہیں اور مراد اس سے سب کے حقوق کی پوری ادائیگی اور انصاف ہے۔ تو لفظ حق میں سب حقوق اللہ اور لفظ میزان میں سب حقوق العباد کی طرف اشارہ ہو گیا۔

اور یہ جو فرمایا کہ مومنین قیامت سے ڈرتے ہیں۔ مراد اس سے اعتقاد ہی خوف ہے جو قیامت کے احوال سے ہے۔ نیز اپنی عملی کوتاہیوں پر نظر کرنے سے لازمی ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات کسی مومن پر اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا شوق غالب ہے کہ اس خوف پر غالب آجاتا ہے وہ اس کے منافی نہیں جیسا کہ قبر میں بعض مردوں کا یہ کہنا ثابت ہے کہ قیامت جلد آجائے، وجہ یہ ہے کہ قبر میں جب فرشتوں کی طرف سے انسان کو بشارت رحمت و مغفرت کی ملجائے گی تو قیامت کا خوف مغلوب ہو جائے گا۔

اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْقَوِيُّ

اللہ نرمی رکھتا ہے اپنے بندوں پر روزی دیتا ہے جس کو چاہے اور وہی ہے زور آور

الْعَزِيزُ ۱۹ مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ لَا يُزِلْهُ

زبردست جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی زیادہ کہیں ہم اس کے واسطے

فِي حَرْثِهِ ۲۰ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ

اس کی کھیتی اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی اس کو دیں

مِنْهَا ۲۱ وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ تُصِيبٍ ۲۲

ہم کچھ اس میں سے اور اس کے لئے نہیں آخرت میں کچھ حصہ

## خلاصہ تفسیر

اور یہ لوگ جو دنیا کی ناز و نعمت پر مغرور ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں اور یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اگر ہمارا عمل اللہ کی رضا کے خلاف ہوتا تو ہم کو یہ عیش و عشرت کیوں دیتا خوب سمجھو کہ یہ انکی بھول ہے یہ دنیا کی دولت و نعمت دلیل رضا نہیں بلکہ اس کی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (دنیا میں) اپنے بندوں پر (عام طور سے) مہربان ہے (اسی رحمت عامہ کے سبب سب کو روزی دیتا ہے صحت و تندرستی دیتا ہے جس میں مصالح و حکمت کی بنیاد پر بھی ہوتی ہے کہ جس کو (جس قدر)



چاہتا ہے روزی دیتا ہے (مگر نفس روزی سب میں مشترک ہے) اور دنیا میں اس لطف و مہربانی سے یہ سمجھ لینا کہ ان کا طریقہ حق ہے اور آخرت میں بھی لطف و مہربانی جاری رہے گی نہ مہر دھوکہ ہے۔ وہاں تو ان کے اعمالِ بد پر عذاب ہو گا جو کوئی مستبعد نہیں کیونکہ وہ قوت والا زبردست ہے (غرض ان کی ساری خرابیوں کی جھڑ دنیا پر مغرور ہونا ہے۔ ان کو چاہیے کہ اس سے باز آجائیں اور آخرت کی فکر کریں کیونکہ جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو، ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے (اعمالِ صالحہ کھیتی اور اس پر ملنے والا ثواب اس کا پھل ہے اور اس کی ترقی یہ ہے کہ ثوابِ معنوی ملے گا، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا ملے گا) اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو (یعنی سارے عمل و سعی کا مقصد دنیا کی متاع ہی، آخرت کے لئے کچھ کوشش نہ کرے) تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں) دیدیں گے اور آخرت میں اس کو کچھ حصہ نہیں (کیونکہ اس کی شرط ایمان ہے وہ ان میں سے نہیں)۔

## معارف و مسائل

اللہ کَطِیْفٌ بِعِبَادِهِ۔ لفظ لطیف لغت کے اعتبار سے چند معانی میں استعمال ہوتا ہے یہاں حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ حقیقی معنی مہربان سے اور حضرت عکرمہؓ نے باتر یعنی محسن سے کیا ہے۔

حضرت مقاتلؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بھی بندوں پر مہربان ہے۔ یہاں تاک کہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(حاشیہ) ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ روز چہار شنبہ کی صبح کو "معارف القرآن" کی تفسیر یہاں تک پہنچانے اور دارالعلوم کے دوسرے کام کرنے کے بعد نمازِ ظہر ادا کی اور یہ اوراقِ تکیہ کے بچے دیکر رکھے۔ کھانے کے بعد تھکرا سا آرام کر کے پھر تفسیر کا کام شروع کر دیا مگر انسان اور اس کے ارادوں کی کمزوری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آج پورے چھپن دن کے بعد ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۹۲ھ روز چہار شنبہ کو دوبارہ اس کا غنڈ پر قلم لگانے کی نوبت اس کے بعد آئی کہ ایک عرصہ تک زندگی سے مایوسی رہی اور ڈیڑھ پارہ قرآن کی تفسیر جو لکھنا باقی تھی اس کی تکمیل کی دھیت اپنے پر غرور و ارجح مولوی محمد تقی سلمہؒ کو کمر کے اپنی حسرت کا تھوڑا سا تذکرہ چکا اور دل کو فارغ کر چکا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد ہی میرے سینے میں شدید درد ہوا جو اگلے روز اکثر اوقات کی شخصیت کے مطابق میرے قلب پر شدید حملہ ہارٹ ایک نایت ہوا۔ میرے

کافر ناجبر بھی دنیا میں اس کی نعمتیں برستی ہیں۔ حق تعالیٰ کی عنایات اور لطف و کرم اپنے بندوں پر ہمیشہ انوار و اقسام کے ہیں۔ اس لئے تفسیر قرطبی نے لفظ تسلیف کے معنی بھی بہت سے بیان فرمائے ہیں۔ اور حامل سب کا لفظ حقیقی اور بابت میں شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا رزق تو ساری مخلوقات کے لئے عام اور شامل ہے۔ دریا اور خشکی میں رہنے والے وہ جانور جن کو کوئی نہیں جانتا اس کا رزق ان کو بھی پہنچتا ہے۔ اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اس کا حامل زیادہ واضح وہ ہے جس کو تفسیر مظہری نے اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی بے شمار اقسام و انواع ہیں۔ بقدر ضرورت معاش رزق تو سب کے لئے عام ہے۔ پھر خاص خاص اقسام رزق کی تقسیم میں اپنی حکمت بالغہ سے مختلف درجات اور پیمانے رکھے ہیں کسی کو مال و دولت کا رزق زیادہ دیدیا۔ کسی کو صحت و قوت کا، کسی کو علم و

مخلص محبت محترم ڈاکٹر صغیر احمد صاحب دامت مکارمہ کو حق تعالیٰ نے میری دوسری زندگی کا ذریعہ بنا دیا۔ انھوں نے اپنی خاص تدبیر سے مجھے فوراً امراض قلب کے ہسپتال میں داخل کرادیا جبکہ میرے اختیار سے اس کسی طرح آمادہ نہ تھا۔ کیونکہ ہسپتال میں مریضوں کے قہرلوں کے جو مشاہدات کرتا آیا تھا ان کے سبب میرا دل کسی طرح مطمئن نہ تھا کہ میں کسی ہسپتال میں خصوصاً موت و حیات کی کشمکش کے حال میں داخل ہوں مگر موصوف نے کچھ تدبیریں کر کے مجھے وہاں پہنچا دیا۔ بعد میں ثابت ہو گیا کہ وہ ہی میری دوبارہ زندگی کا ظاہری سبب بنا۔ بغیر ہسپتال میں قیام کے علاج ممکن نہیں تھا۔

۲۵ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ بروز جمعرات کو امراض قلب کے ہسپتال میں داخل ہوا اور بحمد اللہ یہاں کے ڈاکٹر بڑے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ ہمدرد اور مہربان بھی ثابت ہوئے۔ چند روز میں اللہ تعالیٰ نے خطہ سے نکال دیا۔ مزید احتیاطی علاج کے لئے ۳۲ روز مجھے ہسپتال میں رہنا پڑا۔ ۱۱ جولائی ۱۳۹۲ء روزِ شنبہ کو مجھے ہسپتال سے رخصت کیا گیا اور اپنے مکان واقع سبیلہ میں چند ہفتے قیام کا ارادہ کر لیا۔ یہاں بھی احتیاطی تدبیر اور علاج جاری ہے۔ آج ۲۰ جمادی الثانیہ کو جو اتفاق سے میرے پاکستان کراچی پہنچنے کی تاریخ ہے اور آج پاکستان میں آئے ہوئے مجھے چوبیس سال پورے ہو کر پچیسواں شروع ہو رہا ہے۔ اور بحمد اللہ صحت و قوت بھی اب کچھ تدریجاً برقرار رہی ہے تو اللہ کے نام پر آج یہ اوراق پھراٹھائے اور یہ حاشیہ لکھ دیا۔

تفسیر معارف القرآن کی صورت حال یہ ہے کہ جب یہ حادثہ مجھے پیش آیا تو میں معارف القرآن کو تقریباً آخر قرآن تک لکھ چکا تھا ایک خاص سبب سے درمیانی چھٹی منزل رہ گئی تھی اس کو لکھنے کا کام سورہ شوریٰ کے اس مقام تک پہنچا تھا۔ آگے تقریباً ڈیڑھ پارہ قرآن کریم کا سورہ حجرات تک لکھنا باقی تھا۔ اب حق تعالیٰ نے گویا دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور معالج ڈاکٹروں نے کچھ لکھنے پڑھنے کی اجازت دی تو بر خود اربو لوی محمد تقی کو ساتھ لگا کر بنام خدا آج پھر یہ کام شروع کیا ہے۔ واللہ المستعان!



معرفت کا کسی کو دوسری انواع و اقسام کا اس طرح ہر انسان دوسرے کا محتاج بھی رہتا ہے اور یہی احتیاج ان کو باہمی تعاون و تناصر پر آمادہ کرتی ہے جس پر تمدن انسانی کی بنیاد ہے۔

حضرت جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ رزق کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و مہربانی بندوں پر دو طرح کی ہے اول تو یہ کہ ہر ایک ذی روح کو اس کے مناسب حال غذا اور ضروریات عطا فرماتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی کو اس کا پورا رزق عمر بھر کا بیک وقت نہیں دیدیتا، ورنہ اول تو اس کی حفاظت کرنا مشکل ہو جاتا، اور کتنی بھی حفاظت کرنا وہ بکھر بھی سڑنے اور خراب ہونے سے نہ بچتا۔ (مظہری و مثله فی القریطی)

ایک مجرب عمل | مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت حاجی امداد الشرح سے منقول ہے کہ جو شخص صبح کو ستر مرتبہ پابندی سے یہ آیت پڑھا کرے وہ رزق کی تنگی سے محفوظ رہے گا۔ اور فرمایا کہ بہت مجرب عمل ہے۔ آیت یہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔  
اللہ لطیف بعبادہ یرزق من یشاء وہو القوی العزیز

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنَ

کیا ان کے لئے اور شریک ہیں کہ راہِ گدالی ہے انھوں نے ان کے واسطے دین کی کہ جس کا حکم نہیں دیا

بِإِذْنِ اللَّهِ ط وَلَوْلَا كَلِمَةٌ فُضِّلَ لِقَضَىٰ بَيْنَهُمْ وَإِن

اللہ نے اور اگر نہ مقرر ہو چکی ہو تو ایک بات فیصلہ کی تو فیصلہ ہو جاتا ان میں اور بیشک

الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَى الظَّالِمِينَ

جو گنہگار ہیں ان کو عذاب ہے دردناک تو دیکھے گا گنہگاروں کو کہ ڈرتے

مُشْفِقِينَ مِّمَّا كَسَبُوا وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ ط وَالَّذِينَ

ہوں گے اپنی کمائی سے اور وہ پڑھ کر رہے گا ان پر اللہ جو لوگ  
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رَوْضَةٍ أَلْبَنَىٰ لَهُمْ  
یقین لائے اور بھلے کام کئے باغوں میں ہیں جنت کے ان کے  
مَّا يَشَاءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ ط ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿۲۲﴾  
لئے ہے جو وہ چاہیں اپنے رب کے پاس یہی ہے بڑی بزرگی  
ذَلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللَّهُ عِبَادَهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا  
یہ ہے جو خوشخبری دیتا ہے اللہ اپنے ایمان دار بندوں کو جو کرتے ہیں

الصِّلَاحِ طَقْلٌ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا التَّوَدَّةَ

بھلے کام لو کہہ میں مانگتا نہیں تم سے اس پر کچھ بدلا مگر دوستی چاہیے

فِي الْقُرْبَىٰ طَوْمَنْ يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا

قربت میں اور جو کوئی کماے رکھا نیکی ہم اس کو بڑھادیں گے

حَسَنًا ط\_إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ (۲۳)

اس کی خوبی بے شک اللہ معاف کرنے والا حق ماننے والا ہے

## خلاصہ تفسیر

دین حق کو تو خدا نے مشروع و مقرر فرمایا ہے، مگر یہ لوگ جو اس کو نہیں مانتے تو کیا ان کے (تجویز کئے ہوئے) کچھ شریک (خدا کی) ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کر دیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی (مطلب یہ ہے کہ کوئی ذات اس قابل نہیں کہ خدا کے خلاف اس کا مقرر کیا ہو دین معتبر ہو سکے) اور اگر (خدا کی طرف سے) ایک قول تفصیل (کھٹھا ہوا) نہ ہوتا (یعنی یہ کہ ان پر اصل عذاب موت کے بعد ہوگا) تو (دنیا ہی میں) ان کا (عملی) فیصلہ ہو چکا ہوتا اور (آخرت میں) ان ظالموں کو ضرور دردناک عذاب ہوگا (اس روز) آپ ان ظالموں کو دیکھیں گے کہ اپنے اعمال (کے وبال) سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ (وبال) ان پر (ضرور) پڑ کر رہے گا (یہ تو منکرین کا حال ہوگا) اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے (ہوں گے) وہ بہشتوں کے باغوں میں (داخل) ہوں گے (بہشت کو جمع اس لئے لائے کہ بہشت کے مختلف طبقات اور درجات ہیں، ہر طبقہ ایک بہشت ہے اور ہر طبقہ میں متعدد درجات ہیں) اپنے اپنے رتبہ کے مطابق کوئی کہیں ہوگا، کوئی کہیں ہوگا، وہ جس چیز کو چاہیں ان کے رب کے پاس ان کو ملیگی یہی بڑا العام ہے (نہ وہ فانی عیش و عشرت جو دنیا میں موجود ہے) یہی ہے جسکی بشارت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دے رہا ہے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے (اور چونکہ کفار پورا مضمون سننے سے پہلے ہی تکذیب کرنے کے خوگر تھے) اس لئے اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہی ایک جملہ معترفہ میں کفار کو ایک دلدل از مضمون سننے کا حکم فرماتے ہیں (یعنی) آپ (ان سے) یوں کہیے کہ میں تم سے اور کچھ مطلب نہیں چاہتا بجز رشتہ داری کی محبت کے (یعنی اتنا چاہتا ہوں کہ تمہارے رشتہ داری کے جو تعلقات ہیں، ان کے حقوق کا تو خیال رکھو کیا رشتہ داری کا یہ حق نہیں کہ مجھ سے عداوت میں جلدی نہ کرو بلکہ (ظہیمان کے ساتھ میری پوری



بات سن لو اور اس کو عقل اور دلیل صحیح کی میزان سے جانچو، اگر معقول ہو تو قبول کر لو، اور اگر کچھ شبہ ہو تو صاف کر لو، اور بفرصت حال غلط ہو تو مجھ کو سمجھا دو، غرض جو بات ہو خیر خواہی سے ہو، یہ نہیں کہ فوراً ہی بھڑک اٹھو، اور (اگے مؤمنین کے لئے بشارت کا تہمتہ ہے یعنی) جو شخص کوئی نیکی کرے گا ہم اُس (نیکی) میں اور خوبی زیادہ کر دیں گے (یعنی اس خوبی کا مقتضائی نفع جس قدر ثواب ہے ہم اُس سے زیادہ ثواب دیں گے) بے شک اللہ (اطاعت گزار بندوں کے گناہوں کا) بڑا بخشنے والا (اور ان کی نیکیوں کا) بڑا قدر دان (اور ثواب عطا کرنے والا) ہے۔

## معارف و مسائل

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا التَّوَدُّةَ فِي الْقُرْبَىٰ۔ اس آیت کی جو تفسیر مذکور الصدر خلاصہ میں آچکی ہے۔ یہی جمہور مفسرین سے منقول و مأثور اور مختار ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ میرا اصل حق تم سب پر تو یہ ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں تم اس کا احترام کرو اور اپنی صلاح و فلاح کے لئے میری اطاعت کرو۔ مگر میری نبوت و رسالت کو تم تسلیم نہیں کرتے تو نہ سہی مگر میرا ایک انسانی اور خاندانی حق بھی تو ہے جس کا تم انکار نہیں کر سکتے کہ تمہارے اکثر قبائل میں میری رشتہ داری اور قرابتیں ہیں۔ قرابت کے حقدار اور صلہ رحمی کی ضرورت سے تمہیں بھی انکار نہیں تو میں تم سے اپنی اُس خدمت کا جو تمہاری تعلیم و تبلیغ اور اصلاح اعمال و احوال کے لئے کرتا ہوں، کوئی معاوضہ تم سے نہیں مانگتا، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ رشتہ داری کے حقوق کا تو خیال کرو۔ بات کا ماننا یا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے۔ مگر عداوت اور دشمنی تو کم از کم یہ نسب و قرابت کا تعلق مانع ہونا چاہیے۔

اب یہ بات ظاہر ہے کہ رشتہ داری کے حقوق کی رعایت یہ خود ان کا اپنا فرض تھا۔ اس کو کسی خدمت تعلیمی تبلیغی کا معاوضہ نہیں کہا جاسکتا۔ آیت مذکورہ میں جو اس کو بلفظ استثناء ذکر فرمایا ہے تو یہ یا تو اصطلاحی الفاظ میں استثناء منقطع ہے جس میں مستثنیٰ اس مجموعہ مستثنیٰ منہ کا جز نہیں ہوتا یا پھر اس کو مجازاً اور اوعاء معاوضہ قرار دیا گیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ میں تم سے صرف اتنی بات چاہتا ہوں اگرچہ حقیقتہً کوئی معاوضہ نہیں، تم اس کو معاوضہ سمجھو تو یہ تمہاری اپنی غلطی ہے۔ اس کے نظائر عرب و عجم ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً شاعر نے ایک قوم کی شجاعت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ان میں کوئی عیب نہیں بجز اس کے کہ ان کی تلواروں میں کثرت حرب و ضرب کی وجہ سے دندالے پڑ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شجاع و بہادر کے لئے یہ کوئی عیب نہیں، بلکہ ٹہنر ہے۔ اس کا عربی شعر یہ ہے۔

ولا عیب فیہم خیر ان سیوفہم + بکھن فلول من قراع الکتاب

ایک ادو شاعر نے اسی طرح کا مضمون اس طرح لکھا ہے ۔  
مجھ میں ایک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں + اس نے وفاداری کو عیب کے لفظ سے تعبیر کر کے اپنی بے گناہی کو بہت اونچا کر کے دکھلایا ہے ۔  
خلاصہ یہ ہے کہ حقوق قرابت کی رعایت جو فی الواقع کوئی معاوضہ نہیں میں تم سے اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا ۔

آیت مذکورہ کی یہی تفسیر صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور ائمہ تفسیر میں مجاہد قتادہ اور بہت بڑی جماعت نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے ۔ یہی تمام انبیاء علیہم السلام کی آداب پر دور میں رہی ہے کہ اپنی قوم کو کھول کر بتادیا کہ ہم جو کچھ تمہاری بھلائی اور خیر خواہی کے لئے کوشش کرتے ہیں تم سے اس کا کوئی معاوضہ ہم نہیں مانگتے ۔ ہمارا معاوضہ صرف اللہ تعالیٰ دینے والا ہے ۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو ان سب میں اعلیٰ و ارفع ہے وہ کیسے قوم سے کوئی معاوضہ طلب کرتے ۔

ابام حدیث سعید بن منصور اور ابن سعد اور عبد بن حمید اور حاکم اور بیہقی امام شعبی سے یہ واقعہ نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ امام شعبی کہتے ہیں کہ لوگوں نے ہم سے اس آیت کی تفسیر کے متعلق سوالات کئے تو ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خط لکھ کر اسکی

صحیح تفسیر دریافت کی آپ نے جواب میں لکھا کہ

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کان وسط النسب فی قریش لیس بطن  
من بطرئہم الا وقد ولد ولا فقال  
اللہ تعالیٰ (قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا) علی  
ما اذعوکم علیہ (اِلاّ المودۃ فی القربی)م  
تودونی لقرا ابی منکم وتحفظونی  
بھا۔ (روح)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ایسے نسب سے تعلق رکھتے تھے کہ اس کے ہر ذیلی خاندان سے آپ کا رشتہ ولادت قائم تھا ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ”آپ مشرکین سے یہ کہتے کہ اپنی دعوت پر میں تم سے کوئی معاوضہ بجز اس کے نہیں مانگتا کہ تم مجھ سے قرابت داری کی موت و مروت کا معاملہ کر کے بغیر کسی تکلیف کے اپنے درمیان رہتے دو اور میری حفاظت کرو۔“

اور ابن جریر وغیرہ نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں :-

یا قوم اذا ابیتہم ان تتابعونی  
فاحفظوا قرابتی منکم ولا تکون

اے قوم! اگر تم میری اتباع سے انکار کرتے ہو تو تم سے جو میرا قرابت کا رشتہ ہے اس کی پاسداری



غیرکم من العصاب اولی بحفظی و  
نصرتی منکم۔ (روح)

تو کہو، اور ایسا نہ ہو کہ عرب کے دوسرے لوگ  
(جن کے ساتھ میری قرابت نہیں) میری حفاظت اور  
نصرت میں تم پر بازی لے جائیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی سے سند ضعیف کے ساتھ ایک روایت یہ بھی منقول ہے  
کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو کچھ لوگوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ آپ کی قرابت میں کون لوگ ہیں آپ نے فرمایا کہ  
علیؑ اور فاطمہؑ اور ان کی اولاد۔ اس روایت کی سند کو درمنثور میں سیوطی نے اور تخریج احادیث  
کشاف میں حافظ ابن حجر نے ضعیف قرار دیا ہے اور چونکہ اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ میں اپنی خدمت کا  
اتنا معاوضہ مانگتا ہوں کہ میری اولاد کی تم رعایت کیا کرو، جو عام انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء  
کی شان کے مناسب بھی نہیں۔ اس لئے راجح اور مختار تفسیر جمہور امت کے نزدیک وہی ہے جو  
اوپر لکھی گئی۔ روافض نے اس روایت کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ اس پر بڑے قلعے تعمیر کر ڈالے، جن  
کی کوئی بنیاد نہیں۔

آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی  
تعظیم و محبت کا مسئلہ

درخواست نہیں کی۔ اس کے یہ معنی کسی کے نزدیک نہیں کہ اپنی جگہ آل رسول مقبول صلی اللہ  
علیہ وسلم کی محبت و عظمت کوئی اہمیت نہیں رکھتی، ایسا خیال کوئی بد بخت گمراہ ہی کر سکتا ہے حقیقت  
مسئلہ کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و محبت کا ساری کائنات سے زائد  
ہونا جزو ایمان بلکہ مدار ایمان ہے۔ اور اس کے لئے لازم ہے کہ جس کو جس قدر نسبت قریبہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اسکی تعظیم و محبت بھی اسی پیمانے سے واجب و لازم ہوئے  
میں کوئی شبہ نہیں، کہ انسان کی صلیبی اولاد کو سب سے زیادہ نسبت قربت حاصل ہے اسلئے انکی  
محبت بلا مشبہ جزو ایمان ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ازواج مطہرات اور دوسرے  
صحابہ کرام جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ متعدد قسم کی نسبتیں قربت اور قرابت  
کی حاصل ہیں ان کو فراموش کر دیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ محبت اہل بیت آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مسئلہ امت میں کبھی زیر اختلاف  
نہیں رہا، باجماع و اتفاق ان کی محبت و عظمت لازم ہے۔ اختلافات وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں  
دوسروں کی عظمتوں پر حملہ کیا جاتا ہے۔ ورنہ آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی حیثیت سے عام  
سادات خواہ ان کا سلسلہ نسب کتنا ہی بعید بھی ہو، ان کی محبت و عظمت عین سعادت و اجر

و ثواب ہے۔ اور چونکہ بہت سے لوگ اس میں کوتاہی برتنے لگے، اسی لئے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے چند اشعار میں اس کی سخت مذمت فرمائی۔ وہ اشعار یہ ہیں اور درحقیقت یہی جمہور امت کا مسلک و مذہب ہے۔

یا سأكیافت بالمحصب من منیٰ      واهتف بساکن خیفها والناھض  
سحرًا اذا فاض الحجيج الی منیٰ      فیضا مکتطم الفرات المناھض  
ان کان سافضا حیث الی محصبہا      فلیشھل الثقلان الی سافضی  
یعنی اسے شہ سوار، منیٰ کی وادی محصب کے قریب رک جاؤ، اور جب صبح کے وقت عازمین حج کا سیلاب ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح منیٰ کی طرف روانہ ہو تو اس علاقے کے ہر باشندے اور ہر راہرو سے پکار کر یہ کہہ دو کہ اگر صرف آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی کا نام رفیق ہے تو اس کائنات کے تمام جنات و انسان گواہ رہیں کہ میں بھی رافضی ہوں۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ فَإِنْ يَشِإِ اللَّهُ

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے باندھا اللہ پر جھوٹ سو اگر اللہ چاہے

يَخْتِمُ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۖ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ

مہر کر دے تیرے دل پر اور مٹاتا ہے اللہ جھوٹ کو اور ثابت کرتا ہے سچ کو

بِكَلِمَاتِهِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝۲۶ وَهُوَ

اپنی باتوں سے اس کو معلوم ہے جو دلوں میں ہے اور وہی ہے

الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ

جو قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں کی اور معاف کرتا ہے

السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ۝۲۷ وَكَسَتْ جِبِ

برائیاں اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو اور دعا سنتا ہے

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَيَزِيدُهُمْ

ایمان والوں کی جو بھلے کام کرتے ہیں اور زیادہ دیتا ہے ان کو

مِّنْ فَضْلِهِ ۖ وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝۲۸

اپنے فضل سے اور جو منکر ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے۔



## خلاصہ تفسیر

کیا یہ لوگ (آپ کی نسبت لغو ذبالہ) یوں کہتے ہیں کہ انھوں نے خدا پر جھوٹ بہتان باندھ رکھا ہے (کہ نبوت اور وحی کا خلاف واقع دعویٰ کیا ہے) سو (ان کا یہ قول خود افتر ہے) اس لئے کہ آپ کی زبان حق تر حیان سے اللہ کا یہ معجز کلام جاری ہو رہا ہے جو سچے نبی کے سوا کسی کی زبان پر جاری نہیں ہو سکتا۔ اگر معاذ اللہ آپ اپنے دعوائے رسالت میں سچے نہ ہوتے تو اللہ یہ کلام آپ پر جاری نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ (خدا) کو یہ قدرت حاصل ہے کہ (اگر وہ) چاہے تو آپ کے دل پر بند لگا دے (اور یہ کلام آپ کے قلب پر نہ القا ہو) نہ باقی رہے بلکہ سلب ہو جائے، اور آپ بالکل بھول جائیں، اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ زبان سے اس کا صدور ہو ہی نہیں سکتا) اور اللہ تعالیٰ (کی یہ عادت ہے کہ وہ نبوت کے) باطل (دعوے) کو مٹا یا کرتا ہے (چلنے نہیں دیتا، یعنی ایسے جھوٹے مدعی کے ہاتھ پر معجزات ظاہر نہیں ہوتے) اور (نبوت کے) حق (دعوے) کو اپنے احکام سے ثابت (اور غالب) کیا کرتا ہے (پس آپ صادق اور وہ کاذب ہیں اور چونکہ وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) دلوں تک کی باتیں جانتا ہے (چہ جائیکہ زبان کے اقوال اور جوارح کے افعال) پس اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے عقائد، اقوال اور اعمال سب کی خبر ہے، ان سب پر خوب سزا دے گا، ہاں جو لوگ اپنے کفر اور بد اعمالیوں سے توبہ کر لیں انھیں معاف کر دے گا، کیونکہ یہ اس کا قانون ہے) اور وہ ایسا (رحیم) ہے کہ اپنے بندوں کی توبہ (بشر الطہار) قبول کرتا ہے اور وہ (اس توبہ کی برکت سے) تمام (گذشتہ) گناہ معاف فرما دیتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس (سب) کو جانتا ہے (پس اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ توبہ خالص کی ہے یا غیر خالص) اور (جب کوئی شخص کفر سے توبہ کر کے مسلمان ہو گیا تو اس کی جو عبادتیں پہلے قبول نہ ہوتی تھیں، اب قبول ہونے لگیں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ) ان لوگوں کی عبادت (بشرطیکہ ریاء کے لئے نہ ہو) قبول کرتا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے (وہ عبادتیں یہی نیک عمل ہیں اور ان کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ثواب دیتا ہے) اور (علاوہ اس ثواب کے جو فی نفسہ اس عمل کا مقتضا ہے) ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ (ثواب) دیتا ہے (یہ تو ایمان والوں کے لئے ہوا) اور جو لوگ کفر (پراصرار) کر رہے ہیں (اور ایمان نہیں لائے) ان کے لئے سخت عذاب (مقرر) ہے۔

## معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور قرآن کو غلط اور خدائے تعالیٰ پر افتراء کہنے والوں کو اپنا ایک عام ضابطہ بتلا کر جواب دیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ، ایسے کام جو عادتاً انسان نہیں کر سکتے، جن کو خرق عادت یا معجزہ کہا جاتا ہے، اگرچہ بعض ساحر، جادوگر بھی اپنے سحر سے ایسے کام کر دکھاتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی بغیر اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کے کچھ نہیں کر سکتا۔ حق تعالیٰ ہی اپنے فضل سے انبیاء کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ان کو معجزات عطا فرماتے ہیں جن میں پیغمبر کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

اسی طرح جادوگروں کا جادو بھی اپنی حکمت امتحان و آزمائش کی بنا پر چلنے دیتے ہیں۔ مگر سحر اور معجزہ میں فرق اور نبی اور ساحر میں امتیاز کے لئے اس نے یہ ضابطہ جاری کر رکھا ہے کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ جھوٹا کرے، اس کے ہاتھ سے کوئی سحر یا جادو کامیاب نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ مدعی نبوت نہ ہو سحر چلتا ہے۔ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے بعد اس کا سحر اللہ تعالیٰ نہیں چلنے دیتے۔

اور جن کو اللہ تعالیٰ نبوت و رسالت عطا فرماتے ہیں۔ ان کو معجزات بھی عطا فرماتے ہیں۔ اور ان کے معجزات کا ہندو و روم شن کرتے ہیں۔ اس طرح تکوینی اور تقدیری طور پر ان کی نبوت کو ثابت کر دیتے ہیں۔ دوسرے اپنے کلام کی آیات میں ان کی تصدیق نازل فرما دیتے ہیں۔

جب یہ ضابطہ معلوم ہو گیا تو اب یہ سمجھو کہ قرآن کریم ایک معجزہ ہے کہ تمام دنیا کے جن و بشر اس کی ایک آیت کی مثال بناتے سے عاجز ہیں جن کا عجز زمانہ نبوت میں ثابت ہو چکا اور آج تک ثابت ہے۔ ایسا کھلا ہوا معجزہ کسی جھوٹے مدعی نبوت سے حسب ضابطہ مذکورہ صادر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ کا دعویٰ وحی و رسالت صحیح اور حق ہے، اس کو غلط اور افتراء کہنے والے گمراہ مفتری ہیں۔

دوسری آیت میں منکرین و معاندین کو نصیحت کی گئی ہے کہ اب بھی کفر و انکار سے باز آجائیں اور توبہ کر لیں۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے، توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول فرمالیتا ہے اور ان کی خطاؤں کو بخشتے رہتا ہے۔



توبہ کے لفظی معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں، اور شرعی اصطلاح میں کسی گناہ سے باز آنے کو توبہ کہتے ہیں۔ اور اس کے صحیح و معتبر ہونے کے لئے تین شرائط ہیں۔

ایک یہ کہ جس گناہ میں فی الحال مبتلا ہے اس کو فوراً ترک کر دے، دوسرے یہ کہ ماضی میں جو گناہ ہو اس پر نادم ہو، اور تیسرے یہ کہ آئندہ اُسے ترک کرنے کا پختہ عزم کر لے اور کوئی شرعی فریضہ چھوڑا ہوا ہے تو اسے ادا یا قضا کرنے میں لگ جائے اور اگر گناہ حقوق العباد سے متعلق ہے تو اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر کسی کا مال اپنے اوپر واجب ہے اور وہ شخص زندہ ہے تو یا اسے وہ مال لوٹائے یا اس سے معاف کرائے اور اگر وہ زندہ نہیں اور اس کے ورثہ موجود ہیں تو ان کو لوٹائے، اگر ورثہ بھی نہیں ہیں تو بیت المال میں داخل کرائے، بیت المال بھی نہیں ہے یا اس کا انتظام صحیح نہیں ہے تو اس کی طرف سے صدقہ کر دے، اور اگر کوئی غیر مالی حق کسی کا اپنے ذمہ واجب ہے، مثلاً کسی کو ناحق مستایا ہے، بُرا بھلا کہا ہے، یا اس کی غیبت کی ہے تو اسے جس طرح ممکن ہو راضی کر کے اس سے معافی حاصل کرے۔

اور یہ توبہ ہر قسم کی توبہ کے لئے ضروری ہے ہی کہ گناہ کا ترک کرنا اللہ کے لئے ہو، اپنے کسی جسمانی ضعف یا مجبوری کی بنا پر نہ ہو۔ اور نہ شریعت میں اصل مطلوب توبہ ہے کہ توبہ سارے ہی گناہوں سے کی جائے، لیکن اگر صرف کسی خاص گناہ سے توبہ کی گئی تو اہل سنت کے مسلک کے مطابق اس گناہ کی حد تک توبہ معافی ہو جائیگی، دوسرے گناہوں کا وبال سر پر رہے گا۔

وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّسْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ

اور اگر پھیلا دے اللہ روزی اپنے بندوں کو تو دھوم اٹھادیں ملک میں

وَلَكِنْ يُنْزِلُ بِقَدَرِ مَا يُشَاءُ ط إِنَّكَ بِعِبَادِهِ لَخَبِيرٌ

لیکن اتارتا ہے مایہ کر جتنی چاہتا ہے بے شک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھتا ہے

بَصِيرٌ ۲۷ وَهُوَ الَّذِي يُنْزِلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ

دیکھتا ہے اور نہ ہی ہے جو اتارتا ہے مینہ بعد اس کے کہ اس

مَا قَنَطُوا وَدَيْنُ شَرِّ رَحْمَةٍ ط وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ۲۸

توڑ چکے اور پھیلاتا ہے اپنی رحمت اور وہی ہے کام بنانے والا سب تعریفوں کے لائق

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

اور ایک اس کی نشانی ہے بنانا آسمانوں کا اور زمین کا اور جس قدر

فِيهِمَا مِنْ دَابَّةٍ ط وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ

بکھیرے ہیں ان میں جانور اور وہ جب چاہے اُن سب کو اکٹھا کر سکتا

قَدْ يُرِ ۲۹ وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبَتْ

ہے اور جو پرٹ سے تم پر کوئی سختی سو وہ بدلہ ہے اس کا جو کمایا

أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ ۳۰ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ

تمہارے ہاتھوں نے اور معاف کرتا ہے بہت سے گناہ اور تم تمہکا دینے والے نہیں بھاگ کر

فِي الْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا

زمین میں اور کوئی نہیں تمہارا اللہ کے سوائے کام بنانے والا اور نہ

نَصِيرٍ ۳۱ وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ۳۲

مرد و گارہ اور ایک اس کی نشانی ہے کہ جہاز چلتے ہیں دریا میں جیسے پہاڑ

إِنْ يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلَى ظَهْرِهِ

اگر چاہے تمام دے ہوا کو پھر رہیں سارے دن ٹھہرے ہوئے اس کی پیٹھ پر

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۳۳ أَوْ يُوقِفُهُنَّ

مقرر اس بات میں پستے ہیں ہر قائم رہنے والے کو جو احسان مانے یا تباہ کر دے ان کو

بِمَا كَسَبُوا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيرٍ ۳۴ وَيَعْلَمَ الَّذِينَ يُنَٰ

بہ سبب ان کی کمائی کے اور معاف بھی کرے بہتوں کو اور تاکہ جان لیں وہ لوگ جو

يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِنَا مَا لَهُمْ مِنْ مَّحِيصٍ ۳۵

جھگڑتے ہیں ہماری قدرتوں میں کہ نہیں اُن کے لئے بھاگنے کی جگہ

## خلاصہ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ حکمت کے آثار میں سے یہ ہے کہ اس نے سب آدمیوں کو زیادہ مال

نہیں دیا، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے لئے (بجالاتِ موجودہ جیسی ان کی طبیعتیں ہیں)



روزِی فراخ کر دیتا تو وہ دنیا میں (بالعموم) شرارت کرنے لگتے (کیونکہ جب سارے انسان مالدار ہوتے اور کوئی کسی کا مطلق محتاج نہ ہوتا تو کوئی بھی کسی سے نہ دیتا) لیکن (یہ بھی نہیں کیا کہ بالکل ہی کسی کو کچھ نہ دیا ہو، بلکہ) جتنا رزق چاہتا ہے اندازہ (مناسب) سے (ہر ایک کے لئے) اتارتا ہے، (کیونکہ) وہ اپنے بندوں کے مصالح کو جاننے والا (اور ان کا حال) دیکھنے والا ہے اور وہ ایسا (رحیم) ہے جو (بسا اوقات) لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت کے آثار دنیا میں پھیلاتا ہے (آثار سے مراد نباتات اور پھل پھول ہیں) اور وہ سب کا کار ساز (اور اس کا سازِی پر) قابلِ حمد (و ثنا) ہے اور منجملہ اس کی (قدرت کی) نشانیوں کے پیدا کرتا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جانداروں کا جو اُس نے زمین و آسمان میں پھیلا رکھے ہیں اور وہ (قیامت کے دن دوبارہ زندہ کر کے) اُن (مخلوقات) کے جمع کر لینے پر بھی جب وہ (جمع کرنا) چاہے قادر ہے اور (وہ انتقام لینے والا مگر ساتھ ہی معاف کرنے والا بھی ہے چنانچہ) تم کو (اے گناہگارو) جو کچھ مصیبت (حقیقتاً) پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے (پہنچتی ہے اور پھر بھی ہر گناہ پر نہیں، بلکہ بعض بعض گناہوں پر اور بہت سے گناہوں) سے درگزر ہی کر دیتا ہے (خواہ دونوں جہاں میں یا صرف دنیا میں) اور (اگر وہ سب پر مؤاخذہ کرنے لگے تو) تم زمین کے کسی حصہ میں (پناہ لیکر اس کو) ہر انہیں سکتے اور (ایسے وقت میں) خدا کے سوا تمہارا کوئی حامی مددگار نہیں (ہو سکتا) اور منجملہ اُس کی (قدرت کی) نشانیوں کے جہاز ہیں سمندر میں (ایسے اونچے) جیسے پہاڑ (مراد یہ ہے کہ ان کا سمندر میں چلنا دلیل ہے حق تعالیٰ کی عجیب صنائی کی اور نہ) اگر وہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ (جہاز) سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں (یہ اسی کا کام ہے کہ ہوا کو چلاتا ہے اور اُس سے وہ جہاز چلتے ہیں) بے شک اس میں (قدرت پر دلالت کرنے والی) نشانیاں ہیں ہر صابرو شاکر (یعنی مومن) کے لئے (اس کی تشبیح سورۃ لقمان کے آخری کسب میں اسی قسم کے جملہ کے تحت گزر چکی۔ غرض اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کیم کے جہازوں کو کھڑا کرے) یا (اگر وہ چاہے زور کی ہوا چلا کر) اُن جہازوں (کے سواروں) کو اُن کے اعمال (بدکفر وغیرہ) کے سبب تباہ کر دے اور (ان میں) بہت سے آدمیوں سے درگزر کر جاوے (یعنی اُس وقت غرق نہ ہوں) گو آخرت میں سزا یاب ہوں) اور (اس تباہی کے وقت) ان لوگوں کو جو کہ ہماری آیتوں میں جھگڑنے نکالتے ہیں معلوم ہو جاوے کہ (آب) ان کے لئے کہیں بچاؤ کی صورت نہیں (کیونکہ ایسے اوقات میں وہ بھی اپنے مژغومہ شرکار کو عاجز سمجھتے تھے)۔

## معارف و مسائل

ربط اور شان نزول | ان آیات میں باری تعالیٰ نے عقیدہ توحید کو ثابت کرنے کے لئے اپنی اس حکمت بالغہ کا تذکرہ فرمایا ہے جس کے ذریعہ اس نے کائنات کو ایک مستحکم نظام میں جکڑا ہوا ہے، اور مقصد یہ ہے کہ کائنات کا مستحکم نظام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کوئی حکیم و خبیر ذات اسے چلا رہی ہے۔

اس مضمون کی ابتدا باری تعالیٰ نے اپنے اس نظام معیشت کی طرف اشارہ فرما کر کی ہے جو اس نے اپنی حکمت سے دنیا میں جاری فرمایا ہے۔ اور مضمون پچھلی آیات سے اس طرح مربوط ہے کہ گزشتہ آیتوں میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کی عبادت کو قبول فرماتا ہے جس میں اُن کی دعاؤں کی قبولیت بھی داخل ہے۔ اب یہاں یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ یہ بات بکثرت مشاہدہ میں آتی ہے کہ مسلمان اپنے کسی دنیوی مقصد کے لئے دعا کرتا ہے، لیکن وہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس اشکال کا جواب مذکورہ بالا آیات میں سے سب سے پہلی آیت میں دیا گیا ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی خواہش کا پورا ہونا بعض اوقات خود انسان کی انفرادی یا اجتماعی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے لہذا اگر کسی وقت کسی انسان کی کوئی دعا بظاہر قبول نہ ہو تو اس کے پیچھے کائنات کی وہ عظیم مصلحتیں ہوتی ہیں جنہیں اس کے حکیم خالق کے ہوا کوئی نہیں جانتا، اگر دنیا کے ہر انسان کو ہر قسم کا رزق اور ہر قسم کی نعمتیں عطا کر دی جائیں تو دنیا کا نظام حکمت کے ساتھ ہی نہیں سکتا تو نفسیہ کبر، چنانچہ بعض روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ آیت ان مومنین کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو کافروں کی مال و دولت دیکھ کر تنہا کیا کرتے تھے کہ یہ وسعت و فراخی ہمیں بھی حاصل ہو جائے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہم نے بنو قریظہ بنو نضیر اور بنو قینقاع کے مال و دولت کو دیکھا تو ہمارے دلوں میں بھی مالدار کی کی تمنا پیدا ہوئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضرت عمر بن حریث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اصحاب صفہ میں سے بعض حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مالدار بنادے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (روح المعانی وغیرہ)۔

دُنیا میں دولت کی فراوانی | بہر کیف! آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر دنیا کے ہر فرد پر ہر قسم کے رزق اور ہر قسم کی نعمت کی فراوانی کر دی جاتی تو انسانوں کا ایک دوسرے کے خلاف بغی و فساد خد سے بڑھ جاتا۔ اس لئے کہ

دولت کی فراوانی کی وجہ سے نہ کوئی کسی کا محتاج ہوتا اور نہ کوئی کسی سے دُبتا، دوسری طرف



دولت مناری کی ایک خاصیت یہ ہے کہ جتنی دولت بڑھتی ہے، اتنا ہی حرص و ہوس میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک دوسرے کی املاک پر قبضہ جانے کے لئے زور و زبردستی کا استعمال عام ہو جاتا۔ لڑائی جھگڑے، سرکشی اور دوسری بد اعمالیاں حد سے زیادہ بڑھ جاتیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو ہر قسم کا رزق اور ہر قسم کی نعمت دینے کے بجائے ان نعمتوں کو اپنے بندوں پر اس طرح تقسیم کیا ہے کہ کسی کے پاس مال و دولت زیادہ ہے، کوئی صحت و قوت میں دوسرے سے بڑھا ہوا ہے۔ کوئی حسن و جمال سے مالا مال ہے، کسی کے پاس علم و حکمت کی دولت دوسروں سے زیادہ ہے۔ غرض ہر شخص کسی نہ کسی چیز کے لئے دوسروں کا محتاج ہے، اور اسی باہمی احتیاج پر تمدن کی عمارت قائم ہے۔ وَلٰكِنْ يُّنْزِلُ إِلَيْكُم مِّنْ سَّمَاءٍ مَّاءٌ لِّتَشَابَهُ مِثْلَ بَيْتٍ مَّجِيدٍ (بلاشبہ وہ اپنے بندوں کو جاننے والا دکھانے والا ہے) فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس شخص کے لئے کون سی نعمت مناسب ہے اور کون سی نقصان دہ؟ لہذا اس نے ہر شخص کو مناسب نعمتیں دی ہیں، اور اگر کسی سے کوئی نعمت سلب فرمائی ہے تو وہ اس کی اور پورے عالم کی مصلحت ہی کی بنا پر سلب کی ہے۔ اور یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر فرد کے بارے میں یہ مصلحت ہماری سمجھ میں بھی آجائے، کیونکہ یہاں ہر انسان اپنی معلومات کے ایک محدود دائرے میں رہ کر سوچتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پوری کائنات کی مصلحتیں ہیں، اس لئے اس کی تمام حکمتوں تک رسائی ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کی ایک محسوس نظریہ ہے کہ ایک دیانتدار سربراہ مملکت بسا اوقات ایسے احکام جاری کرتا ہے جو بعض افراد کے خلاف پڑتے ہیں اور وہ ان کی وجہ سے مصائب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جو شخص اس طرح مصائب کا شکار ہوا ہے وہ چونکہ صرف اپنے مفاد کے محدود دائرہ میں رہ کر سوچ رہا ہے، اس لئے ممکن ہے کہ اسے سربراہ مملکت کا یہ اقدام برا محسوس ہو، لیکن جس شخص کی نگاہ پورے ملک و قوم کے حالات پر ہے اور جو یہ سمجھتا ہے کہ کسی ایک شخص کے مفاد پر پورے ملک کو قربانی نہیں کیا جاسکتا، وہ اس اقدام کو برا خیال نہیں کرتا، اب جو ذات پوری کائنات کا نظام چلا رہی ہے اس کی حکمتوں کا احاطہ آخر کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اگر یہ نکتہ ذہن میں رہے تو وہ اوہام اور دوسو سے خود بخود کا فور ہو سکتے ہیں جو دنیا میں کسی شخص کو گرفتار مصائب دیکھ کر پیدا ہوتے ہیں۔

اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں کا مال و دولت میں مساوی ہونا ناممکن ہے، نہ مطلوب اور نہ نظام عالم کی تکوینی مصلحتیں اس کا تقاضا کرتی ہیں۔ اس مسئلہ فی پوری تفصیل انشا اللہ سورہ زخرف کی آیت نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّا فِیْہِمْ شَہْرًا لِّمَن

کے تحت آئے گی۔

جنت اور دنیا کا فرق یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ جنت میں تو تمام انسانوں پر ہر قسم کی نعمتوں کی فراوانی کر دی جائے گی، وہاں یہ چیز فساد کا سبب کیوں نہیں ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں فساد کا سبب مال و دولت کی فراوانی کے ساتھ حرص و ہوس کے وہ جذبات ہیں جو دولت مندی کے ساتھ عاموماً بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف جنت میں نعمتوں کی عام بارش تو ہوگی لیکن حرص و ہوس اور سرکشی کے یہ جذبات ختم کر دئے جائیں گے چنانچہ وہاں یہ فساد رونما نہیں ہوگا حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلاصہ تفسیر میں ”محالات موجودہ“ کے الفاظ اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے بڑھائے ہیں۔ (بیان القرآن) اب یہاں یہ اعتراض قطعی فضول ہے کہ دنیا میں بھی مال و دولت کی فراوانی کر کے حرص و ہوس کے جذبات کیوں نہ ختم کر دیئے گئے؟ کیونکہ دنیا کی تخلیق کا مقصد ہی ایک ایسا جہان پیدا کرنا ہے جو خیر و شر دونوں کی قوتوں سے مرکب ہو۔ اس کے بغیر انسانوں کی وہ آزمائش ممکن ہی نہیں ہے جو تخلیق عالم کا اصل منشا ہے۔ لہذا اگر یہاں انسانوں میں سے یہ جذبات ختم کر دئے جاتے تو دنیا کی پیدائش کا مقصد اصلی ہی فوت ہو جاتا۔ اس کے برخلاف جنت خالص خیر پر مشتمل ہوگی اس لئے وہاں یہ جذبات ختم کر دیئے جائیں گے۔

هُوَ الَّذِي يَنْزِلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا - اور وہ ایسا ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے یوں تو اللہ تعالیٰ کی عام عادت ہے کہ جب زمین کو پانی کی شدید ضرورت ہوتی ہے، بارش برسا دیتے ہیں۔ لیکن یہاں ”ناامید ہو جانے کے بعد“ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ کبھی کبھی باری تعالیٰ مینہ برسانے میں عام عادت کے خلاف اتنی تاخیر کر دیتے ہیں جس سے لوگ ناامید ہوئے لگیں۔ اس سے آزمائش کے علاوہ اس بات پر تنبیہ مقصود ہوتی ہے کہ بارش اور مخطوب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ جب چاہتا ہے لوگوں کی بد اعمالیوں وغیرہ کی بنا پر بارش روک لیتا ہے تاکہ لوگ اس کی رحمت کی طرف متوجہ ہو کر اس کے سامنے بجز و نیاز کا مظاہرہ کریں۔ ورنہ اگر بارش کا بھی کوئی لگا بندھا وقت ہوتا جس سے کبھی سر ہوا خراف نہ ہو تو لوگ اسے خالص ظاہری اسباب کے تابع سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بے توجہ ہو جاتے اور یہاں ”ناامید“ ہونے سے مراد اپنی تدبیروں سے ناامید ہونا ہے، ورنہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا کفر ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ فِيهِمَا مِنْ ذَا بَيِّنَةٍ - ”ذآ بَیِّنَةٍ“ اصل لغت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے اختیار سے چلنے اور حرکت کرنے والی ہو، بعد میں یہ لفظ صرف جانوروں کے لئے استعمال ہونے لگا ہے اس آیت میں آسمان اور زمین دونوں کی طرف نسبت کر کے یہ کہا گیا ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے



بہت سی چلنے والی مخلوقات پیدا کی ہیں زمین پر یہ چلنے والی مخلوقات تو ظاہر ہیں، آسمان میں ان سے مراد ملائکہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آسمانوں میں کچھ ایسے جانور موجود ہوں جو ابھی تک انسان کے علم میں نہیں آ سکے۔

بہر کیف! مقصد یہ ہے کہ گو نظام عالم کی مصلحت سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مال و دولت میں وسعت عطا نہیں کی، بلکہ ایک حکیمانہ انداز سے برزق کی تقسیم فرمائی ہے، لیکن کائنات کی جو نعمتیں عمومی فائدے کی ہیں، اُن سے ہر شخص کو بہرہ اندوز کیا ہے۔ بارش، بادل، زمین، آسمان، اور ان کی مخلوقات سب انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور یہ سب چیزیں اللہ کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے بعد کسی شخص کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اس کے اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچتی ہے۔ لہذا اُسے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرنے کے بجائے اپنے گمراہی میں منہ ڈالنا چاہیے۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَتَعْتُوا عَن كَثِيرٍ  
یہی مطلب ہے۔ حضرت حسن رضی سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے، جس شخص کو کسی لکڑی سے کوئی خراش لگتی ہے، یا کوئی رُگ دھڑکتی ہے یا قدم کو لغزش ہوتی ہے، یہ سب اس کے گناہوں کے سبب ہوتا ہے اور ہر گناہ کی سزا اللہ تعالیٰ نہیں بخشتے بلکہ جو گناہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیتے ہیں وہ ان سے بہت زیادہ ہیں، جن پر کوئی سزا دی جاتی ہے۔ حضرت اشرف المصنف نے فرمایا کہ جس طرح جسمانی آذیتیں اور تکلیفیں گناہوں کے سبب آتی ہیں اسی طرح باطنی امراض بھی کسی گناہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آدمی سے کوئی ایک گناہ سرزد ہو گیا تو وہ سبب بن جاتا ہے دوسرے گناہوں میں مبتلا ہونے کا، جیسا کہ حافظ ابن قیمؒ نے الدوائر الشانی میں لکھا ہے کہ گناہ کی ایک نقد سزا یہ ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ دوسرے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسی طرح نیکی کی ایک نقد جزا یہ ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچ لاتی ہے۔ بیضاویؒ وغیرہ نے فرمایا کہ یہ آیت اُن لوگوں کے لئے مخصوص ہے جن سے گناہ سرزد ہو سکتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام جو گناہوں سے معصوم ہیں یا نابالغ بچے اور مجنون جن سے کوئی گناہ نہیں ہوتا، اُن کو جو تکلیف و مصیبت پہنچتی ہے وہ اس حکم میں داخل نہیں۔ اس کے دوسرے اسباب اور حکمتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً رفع درجات اور درحقیقت ان کی حکمتوں کا احاطہ انسان نہیں کر سکتا (واللہ اعلم)۔

بعض روایات حدیث سے ثابت ہے کہ جن گناہوں پر کوئی سزا دنیا میں

دیدنی جاتی ہے مومن کے لئے اس سے آخرت میں معافی ہو جاتی ہے جیسا کہ حکم

نے مستدرک میں اور۔ نبویؐ نے حضرت علیؓ کو اللہ وجہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ (منظہری)

فَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَّاعٌ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ

سو جو کچھ ملا ہے تم کو کوئی چیز ہو سو وہ برتا دینا ہے دنیا کی زندگی کافی میں اور جو کچھ اللہ کے

اللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَى لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٣٦﴾

یہاں ہے بہتر ہے اور باقی رہنے والا واسطے ایمان والوں کے جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْأَشْوَاعِ إِفْوَاهِشَ وَإِذَا مَا

اور جو لوگ کہ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بے حیائی سے اور جب

غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ

غصہ آدے تو وہ معاف کر دیتے ہیں اور جنہوں نے کہ حکم مانا اپنے رب کا

وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا

اور قائم کیا نماز کو اور کام کرتے ہیں مشورہ سے آپس کے اور ہمارا

رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ

دیا کچھ خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ کہ جب ان پر ہمدردی چڑھائی

هُمْ يَنْتَصِرُونَ ﴿٣٩﴾ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ

تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور ہر برائی کا بدلہ ہے برائی ویسی ہی پھر جو

عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿٤٠﴾

کوئی معاف کرے اور صلح کرے سو اس کا ثواب ہے اللہ کے ذمے بیشک اس کو پسند نہیں آتے گنہگار

وَلَمَنْ أَنْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مَسٌّ

اور جو کوئی بدلہ لے اپنے مظلوم ہونے کے بعد سو ان پر بھی نہیں کچھ الزام

سَبِيلٍ ﴿٤١﴾ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ

الزام تو ان پر ہے جو ظلم کرتے ہیں لوگوں پر

وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ

اور دھرم اٹھاتے ہیں ملک میں ناحق ان لوگوں کے لئے ہے عذاب

أَلِيمٌ ﴿٤٢﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿٤٣﴾

دردناک اور اہستہ جس نے سہا اور معاف کیا بیشک یہ کام ہمت کے ہیں



## خلاصہ تفسیر

(اور تم اور پرہیزگار چکے ہو کہ طالب دنیا کی ہر دنیوی تمنا پوری نہیں ہوتی اور آخرت سے محروم رہتا ہے اور طالب آخرت کو ترقی ہوتی ہے۔ نیز پرہیزگار چکے ہو کہ زیادہ متاع دنیا کا انجام اچھا نہیں، اکثر اس سے اعمال مُضَرّہ پیدا ہوتے ہیں) سو (اس سے ثابت ہوا کہ مطلوب بنانے کے قابل دنیا نہیں، بلکہ آخرت ہے، اور باقی دنیا کی چیزوں میں سے) جو کچھ تم کو یاد دلایا گیا ہے وہ محض چند روزہ (دنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے) کہ عمر کے خاتمہ کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا) اور جو (اجر و ثواب آخرت میں) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے (کیفیت کے اعتبار سے بھی) بہتر ہے اور (کمیت کے لحاظ سے بھی) زیادہ یا بُد (یعنی ہمیشہ رہنے والا ہے، پس دنیا کی طلب چھوڑ کر آخرت کی طلب کرو، مگر آخرت کے حصول کے لئے کم سے کم شرط تو ایمان لانا اور کفر کو چھوڑنا ہے، اور آخرت کے مکمل درجات کے لئے تمام واجبات و فرائض کو اختیار کرنا اور تمام گناہوں کو چھوڑنا ضروری ہے۔ اور تقرب کے درجات حاصل کرنے کے لئے نفعی طاعات کو اختیار کرنا اور خلاف اولیٰ مباهات کو ترک کرنا بھی محبوب ہے چنانچہ وہ (ثواب جس کی تفصیل اور پرکذری) ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لے آئے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں اور جو کبیرہ گناہوں سے اور ان میں سے بے حیائی کی باتوں سے (بالخصوص زیادہ) بچتے ہیں اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اور جن لوگوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور وہ نماز کے پابند ہیں اور ان کا ہر (اہم) کام جس میں اللہ کی طرف سے کوئی معین حکم نہ ہو) آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے اور ہم نے جو نچھان کو دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو ایسے (منصف) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف سے کچھ) ظلم واقع ہوتا ہے تو وہ (اگر بدلہ لیتے ہیں تو) برابر کا بدلہ لیتے ہیں (زیادتی نہیں کرتے، اور یہ مطلب نہیں کہ معاف نہیں کرتے) اور (برابر کا بدلہ لینے کے لئے ہم نے یہ اجازت دے رکھی ہے کہ) برائی کا بدلہ برائی ہے ویسی ہی (بشرطیکہ وہ نعل بذات خود گناہ نہ ہو) پھر (انتقام کی اجازت کے باوجود) جو شخص معاف کر دے اور (باہمی معاملہ کی) اصلاح کر لے (جس سے عداوت جاتی رہے اور دوستی ہو جاوے) تو اس کا ثواب (حسب وعدہ) اللہ کے ذمہ ہے (اور جو بدلہ لینے میں زیادتی کر لے لگے تو پرہیزگار رکھے کہ) واقعی اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور جو (زیادتی نہ کرے بلکہ) اپنے اور پر ظلم ہو جانے کے بعد برابر کا بدلہ لے لے، سو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں، الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں (خواہ ابتداءً یا انتقام کے وقت)، اور ناحق دنیا میں سرکشی (اور تکبر) کرتے (پھرتے) ہیں (اور یہی تکبر ظلم کا سبب ہو جاتا ہے۔ اور ناحق اس لئے کہا کہ سرکشی اور تکبر ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے۔ آگے اُس الزام کا بیان ہے کہ) ایسوں کے لئے دردناک عذاب (مقرر) ہے اور جو شخص (دوسرے

کے ظلم پر صبر کرے اور معاف کر دے، یہ البتہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے (یعنی ایسا کرنا بہتر اور  
اولوالعزمی کا تقاضا ہے)۔

## معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں دنیا کی نعمتوں کا ناقص ہونا اور فانی ہونا اور اس کے مقابل آخرت کی نعمتوں کا  
کامل بھی ہونا اور دائمی ہونا بیان فرمایا ہے۔ اور آخرت کی نعمتوں کے حصول کے لئے سب سے اہم  
اور بڑی شرط تو ایمان ہے کہ اس کے بغیر وہ نعمتیں وہاں کسی کو نہ ملیں گی۔ لیکن ایمان کے ساتھ  
اگر اعمال صالحہ کا بھی پورا اہتمام کر لیا تو آخرت کی یہ نعمتیں ازل ہی مل جائیں گی۔ ورنہ اپنے گناہوں اور  
گناہیوں کی سزا بھگتنے کے بعد ملیں گی۔ اس لئے آیات مذکورہ میں سب سے پہلی شرط تو  
الَّذِينَ آمَنُوا بیان فرمائی۔ اس کے بعد خاص خاص اعمال کا ذکر فرمایا گیا جن کے بغیر ضابطہ کے مطابق  
آخرت کی نعمتیں شروع سے نہ ملیں گی بلکہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد ملیں گی۔ اور ضابطہ کے  
مطابق اس لئے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو سب گناہوں کو معاف فرما کر ازل ہی آخرت کی نعمتیں  
بڑے سے بڑے فاسق کو دے سکتے ہیں وہ کسی قانون کے پابند نہیں۔ اب وہ اعمال و صفات دیکھئے  
جن کو اس جگہ اہمیت سے ذکر فرمایا ہے۔

پہلی صفت ۱۔ عَالِي سَرَاتٍ ۙ يَتَذَكَّرُونَ۔ یعنی ہر کام اور ہر حال میں اپنے ربِّ کو بھروسہ رکھیں،  
اس کے سوا کسی کو حقیقی کار ساز نہ سمجھیں۔ دوسری صفت ۲۔ الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ  
الْآثِمِ وَالْفَوَاحِشَ۔ یعنی جو کبیرہ گناہوں سے خصوصاً بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرے  
والے ہیں۔ کبیرہ گناہ کیا ہیں؟ اس کی تفصیل سورہ نساء وغیرہ میں پہلے بیان ہو چکی اور احقر نے  
ایک مختصر سالہ میں کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی پوری فہرست بھی لکھ دی ہے۔ جو گناہ بے  
لذت، کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

کبیرہ گناہوں میں سبھی گناہ داخل تھے، ان میں سے فواحش کو الگ کر کے بیان فرمانے  
میں یہ حکمت ہے کہ فواحش کا گناہ عام کبیرہ گناہوں سے زیادہ سخت بھی ہیں اور وہ ایک مرضِ معنوی  
ہیں، جس سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں فواحش کا لفظ ان کاموں کے لئے بولا جاتا ہے  
جن میں بے حیائی ہو جیسے زنا اور اس کے مقدمات۔ نیز وہ اعمالِ بد جو ٹوٹھٹائی کے ساتھ  
علانیہ کیے جاویں وہ بھی فواحش کہلاتے ہیں کہ ان کا وبال بھی نہایت شدید اور پورے انسانی  
معاشرہ کو خراب کرنے والا ہے۔



تیسری صفت: **وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ**۔ یعنی وہ جب غصہ میں آتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ کیونکہ کسی کی محبت یا کسی پر غصہ یہ دونوں چیزیں جب غالب آتی ہیں تو اچھے بھلے عاقل فاضل آدمی کو اندھ بھرا کر دیتی ہیں۔ وہ جائز، ناجائز، حق و باطل اور اپنے کئے کے نتائج پر غور کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ جس پر غصہ آتا ہے اس کی کوشش یہ ہونے لگتی ہے کہ مقدور ہو اس پر غصہ اتارا جائے۔ مومنین و صالحین کی اللہ تعالیٰ نے یہ صفت بیان فرمائی کہ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ غصے کے وقت حق و ناحق کی حدود پر قائم رہیں بلکہ اپنا حق ہونے ہونے بھی معاف کر دیتے ہیں۔

چوتھی صفت: **الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ**۔ استجابیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم ملے اسکو فوراً بے چون و چرا اور بے تاقل قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جائے وہ اپنی طبیعت کے مطابق ہو یا مخالف، ہر حال میں اس کی تعمیل کرے۔ اس میں اسلام کے تمام فرائض کی ادائیگی اور تمام محرمات و مکروہات سے بچنے کی پابندی شامل ہے مگر فرائض میں چونکہ نماز سب سے اہم فرض ہے۔ اور اس میں یہ خاصہ بھی ہے کہ اس پر عمل کرنے سے دوسرے فرائض کی پابندی اور ممنوع چیزوں سے بچنے کی توفیق بھی ہو جاتی ہے اس لئے اس کو ممتاز کر کے فرمادیا، **وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ** یعنی یہ لوگ نماز کو اس کے تمام واجبات اور آداب کے ساتھ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں۔

پانچویں صفت: **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ**۔ یعنی ان کے کام آپس میں مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔ شوریٰ بروزن بشری مصدر ہے۔ تقدیر عبارت ذوق شوریٰ ہے۔ مراد یہ ہے کہ مہمات امور جن میں شریعت نے کوئی خاص حکم متعین نہیں کر دیا ہے ان کو طے کرنے میں یہ باہمی مشورہ سے کام لیتے ہیں۔ مہمات امور کی قید خود لفظ امر سے استفادہ ہے کیونکہ عرب میں امر ایسے ہی کاموں کے لئے بولا جاتا ہے جن کی اہمیت ہو۔ جیسا کہ سورۃ آل عمران کی آیت **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** کے تحت تفصیل گزر چکی ہے اس میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ مہمات امور میں امور مملکت و حکومت بھی داخل ہیں اور عام معاملات مہمات بھی۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ مہمات مملکت میں مشورہ لینا واجب ہے اسلام میں امیر کا انتخاب بھی مشورہ پر موقوف کر کے زمانہ جاہلیت کی شخصی بادشاہتوں کو ختم کیا ہے۔ جنہیں ریاست بطور وراثت کے ملتی تھی۔ اسلام نے سب سے پہلے اس کو ختم کر کے حقیقی جمہوریت کی بنیاد ڈالی مگر مغربی جمہوریت کی طرح عوام کو ہر طرح کے اختیارات نہیں دیتے، اہل شوریٰ پر کچھ پابندیاں عائد فرمائی ہیں۔ اس طرح اسلام کا نظام حکومت شخصی بادشاہت اور مغربی جمہوریت دونوں سے الگ ایک نہایت معتدل دستور ہے۔ اس کی تفصیل معارف القرآن جلد دوم ص ۲۱۵ سے ص ۲۲۲ تک میں

ملاحظہ فرمائیں۔

امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے مشورہ کی اہمیت واضح ہو گئی اور یہ کہ ہم اس پر مامور ہیں کہ ایسے مشورہ طلب اہم کاموں میں جلد بازی اور خود رانی سے کام نہ کریں۔ اہل عقل و بصیرت سے مشورہ لیکر قدم اٹھائیں۔

خطیب بغدادیؒ حضرت علی مرتضیٰؒ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس میں قرآن نے کوئی فیصلہ نہیں کیا اور آپ سے بھی اس کا کوئی حکم نہیں نہیں ملا تو ہم کیسے عمل کریں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اجمعوا لہ العابدین من امتی واجعلوا بینکم شوری ولا تقضوا برأی واحد۔  
(روح المعانی - بحوالہ خطیب)

اس کے لئے میری امت کے عبادت گزاروں کو جمع کرو اور آپس میں مشورہ کر کے طے کر لو کیسی کی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

اس روایت کے بعض الفاظ میں فقہاء و عابدین کا لفظ آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ مشورہ اُن لوگوں سے لینا چاہیے جو فقہار یعنی دین کی سمجھ بوجھ رکھنے والے اور عبادت گزار ہوں۔ صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ جو مشورہ اس طریق پر نہیں بلکہ بے علم بے دین لوگوں میں اترے ہو اس کا فساد اس کی صلاح پر غالب رہے گا۔

یہ بھی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی کام کا ارادہ کیا اور اس میں مشورہ لے کر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ارشاد امور کی طرف ہدایت فرما دے گا۔ یعنی اس کا رخ اسی طرف پھیر دے گا جو اس کے لئے انجام کار خیر اور بہتر ہو۔ اسی طرح کی ایک حدیث بخاری نے الادب المفرد میں اور عبد بن حمید نے مسند میں حضرت حسنؓ سے بھی نقل کی ہے جس میں آپ نے آیت مذکورہ پڑھ کر یہ فرمایا ہے۔

ما تشاور قوم قط الا هداوا  
لا رشدا امرهم۔

جب کوئی قوم مشورہ سے کام کرتی ہے تو ضرور ان کو صحیح راستہ کی طرف ہدایت کر دی جاتی ہے۔

حدیث :- ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک تمہارے امراء اور حکام وہ لوگ ہوں جو تم سب میں بہتر ہیں اور تمہارے مالدار لوگ سچی ہوں کہ اللہ کی راہ میں اور غریب پر خرچ کریں اور تمہارے کام باہمی مشورہ سے طے ہوا کریں۔ اس وقت تک تمہارے لئے زمین کے اوپر رہنا یعنی زندہ رہنا بہتر ہے اور جب تمہارے امراء و حکام تمہاری قوم کے بُرے لوگ ہو جاویں اور تمہارے مالدار بخیل ہو جاویں اور تمہارے کام غور توں کے سپرد ہو جاویں کہ



وہ جس طرح چاہیں کریں۔ اس وقت تمہارے لئے زمین کی پیٹھ کی بجائے زمین کا پیٹ بہتر ہوگا یعنی زندگی سے موت بہتر ہوگی۔ (روح المعانی)

چھٹی صفت۔ مِمَّا سَارَقَتْهُمْ يُنْفِقُونَ۔ یعنی وہ لوگ اللہ کے دئے ہوئے رزق میں سے نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ جس میں زکوٰۃ، فرض اور نفلی صدقات سب شامل ہیں۔ عالم اسلوب قرآن کے مطابق زکوٰۃ و صدقات کا ذکر نماز کے متصل آنا چاہئے تھا یہاں نماز کے ذکر کے بعد مشورہ کا مسئلہ پہلے بیان کر کے پھر زکوٰۃ کا بیان آیا۔ اس میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ اقامت نماز کے لئے مساجد میں پانچ وقت اجتماع ہوتا ہے۔ اس اجتماع سے مشورہ طلب امور میں مشورہ لینے کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ (روح المعانی)

ساتویں صفت۔ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ۔ یعنی جیسا کہ کوئی ظلم کرتا ہے تو یہ برابر کا انتقام لیتے ہیں۔ اس میں حد مساوات تجاوز نہیں کرتے۔ یہ صفت درحقیقت تیسری صفت کی تشریح و تفصیل ہے۔ کیونکہ تیسری صفت کا مضمون یہ تھا کہ یہ لوگ اپنے مخالفت کو معاف کر دیتے ہیں۔ مگر بعض حالات ایسے بھی پیش آسکتے ہیں کہ معاف کر دینے سے فساد بڑھتا ہے تو وہاں انتقام لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس کا قانون اس آیت میں بتلادیا کہ اگر کسی جگہ انتقام لینا ہی مصلحت سمجھا جائے تو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس انتقام لینے میں برابر سے آگے نہ بڑھیں ورنہ یہ خود ظالم ہو جائیں گے۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا یعنی برائی کی جزا اس کی برابر برائی کرنا ہے۔ یعنی جتنا نقصان مالی یا جسمانی کسی نے نہیں پہنچایا ہے، ٹھیک اتنا ہی تم پہنچا دو۔ جیسی برائی اس نے تمہارے ساتھ کی ہے ویسی ہی تم کو لو مگر اس میں یہ شرط ہے کہ وہ برائی فی نفسہ گناہ نہ ہو۔ مثلاً کسی شخص نے اس کو شراب جبراً پلا دی تو اس کے جواب میں اس کے لئے جائز نہ ہوگا کہ وہ اس کو زبردستی شراب پلا دے۔

اس آیت میں اگرچہ برابر کا بدلہ لینے کی اجازت دیدی گئی ہے مگر آگے یہ بھی فرمادیا، کہ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ۔ یعنی جو معاف کر دے اور اصلاح کا راستہ اختیار کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ جس میں یہ ہدایت کردہی کہ معاف کر دینا افضل ہے۔ اس کے بعد کی دو آیتوں میں اسی کی مزید تفصیل آئی ہے۔

حضرت ابراہیم خلیجی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سلف صالحین یہ پسند نہ کرتے تھے کہ مومن عفو و انتقام میں اپنے آپ کو فساد و فحار کے سامنے ذلیل کریں اور ان کی جرأت بڑھ جائے۔ اس لئے جہاں یہ خطرہ ہو کہ معاف کرنے سے فساد و فحار کی جرأت بڑھے گی وہ اور نیک لوگوں کو ستائیں گے وہاں انتقام لے لینا بہتر ہوگا اور معافی کا افضل ہونا

اس صورت میں ہے جبکہ ظلم کرنے والا اپنے فعل پر نادم ہو اور ظلم پر اس کی جرأت بڑھ جانے کا خطرہ نہ ہو۔ قاضی ابوبکر ابن عربی نے احکام القرآن میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ عفو و انتقام کے دونوں حکم مختلف حالات کے اعتبار سے ہیں۔ جو ظلم کرنے کے بعد شرمندہ ہو جائے اس سے عفو افضل ہے اور جو اپنی صدا اور ظلم پر اصرار کر رہا ہو اس سے انتقام لینا افضل ہے۔

اور حضرت اشرف المصنفین نے بیان القرآن میں اس کو اختیار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیتوں میں مؤمنین، مخلصین اور صالحین کی دو خصوصیتیں ذکر فرمائی ہیں۔ **هُمْ لَعَفْرُونَ**۔ میں تو یہ بتلایا کہ یہ غصہ میں مغلوب نہیں ہوتے۔ بلکہ رحم و کرم ان کے مزاج میں غالب رہتا ہے معاف کر دیتے ہیں۔ اور **هُمْ يَنْصُرُونَ** میں یہ بتلایا کہ یہ بھی انھیں صالحین کی خصوصیت ہے کہ اگر کبھی ظلم کا بدلہ لینے کا داعیہ ان کے دل میں پیدا بھی ہوا اور بدلہ لینے لگیں تو اس میں حق سے تجاوز نہیں کرتے، اگرچہ معاف کر دینا ان کے لئے افضل ہے۔

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَلِيٍّ مِّنْ بَعْدِ لَا وَتَرَى

اور جس کو راہ نہ سمجھائے اللہ تو کوئی نہیں اس کا کام بنانے والا اس کے سوا اور تو دیکھے

الظَّالِمِينَ لَهُمْ آسَاءُ الْعَذَابِ يَقُولُونَ هَلْ إِلَىٰ مَرَدٍّ

گنہگاروں کو جس وقت دیکھیں گے عذاب کہیں گے کسی طرح پھر جانے کی بھی ہوگی

مِّنْ سَبِيلٍ ۚ وَتَرَاهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا خَشِيعَتِ

کوئی راہ اور تو دیکھے ان کو کہ سامنے لائے جائیں آگ کے آنکھیں جھکائے ہوئے

مِنَ الدَّلِّ يَنْظُرُونَ مِنْ طُرُقٍ حَقِيقَةٍ وَقَالَ الَّذِينَ

ذلت سے دیکھتے ہوں گے چھپی نگاہ سے اور کہیں وہ لوگ

أَمَنُوا إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ

جو ایمان دار تھے مقرر ہوئے والے وہی ہیں جنہوں نے گنوا یا اپنی جان کو

وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ أَلَا إِنَّ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ

اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن سنا ہے گنہگار پڑے ہیں سدا کے

مَقْلَبٍ ۚ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ أَوْلِيَاءَ يَنْصُرُهُمْ

عذاب میں اور کوئی نہ ہوئے ان کے حمایتی جو مدد کرتے ان کی



مِّن دُونِ اللَّهِ ط وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ سَبِيلٍ ط

اللہ کے سوائے اور جس کو بھٹکائے اللہ اس کے لئے کہیں نہیں راہ

اَسْتَجِیْبُوا رَبَّكُمْ مِّن قَبْلِ اَنْ يَّآتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنْ

مالو اپنے رب کا حکم اس سے پہلے کہ آئے وہ دن جس کو پھرنا نہیں اللہ کے

اللَّهُ ط مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَا یَوْمَئِذٍ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِیْرٍ ط

یہاں سے نہیں ملے گا تم کو بچاؤ اُس دن اور نہ ملے گا الوپ ہو جائیگا

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَا اَرْسَلْنَاكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا اِنْ

پھر اگر وہ منہ پھیریں تو تجھ کو نہیں بھیجا ہم نے ان پر نگہبان تیرا

عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلَاغُ ط وَاِنَّا اِذَا اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِثْرَ حُمَلَةٍ

ذمہ تو بس یہی ہے پہنچا دینا اور ہم جب بھجواتے ہیں آدمی کو اپنی طرف سے رحمت

فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِیْبُهُمْ سَيِّئَةٌ یَّمْلُؤْنَ اَیْدِیْهِمْ

اس پر پھولا نہیں سماتا اور اگر پہنچتی ہے ان کو کچھ برائی بدلے میں اپنی کمانی کے

فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ط لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط

تو انسان بڑا ناشکر ہے اللہ کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں

یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ط یَهْبِطُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَّا نَآوِیْقِبُ

پیدا کرتا ہے جو چاہے بخشتا ہے جس کو چاہے بیٹیاں اور بھتیجا ہے

لِمَنْ یَّشَآءُ الذَّکُوْرَ ط اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُکْرًا وَّ اُنَاثًا ط

جس کو چاہے بیٹے یا ان کو دیتا ہے جوڑے بیٹے اور بیٹیاں

و یَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا ط اِنَّہٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ط

اور کر دیتا ہے جس کو چاہے بانجھ وہ ہے سب کچھ جانتا کر سکتا

## خلاصہ تفسیر

(یہ حال تو اہل ہدایت کا تھا کہ وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے ہدایت اور آخرت میں ثواب مشرق ہوئے۔) اور (آگے اہل ضلالت کا حال سنو، وہ یہ ہے کہ) جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کے بعد

اُس شخص کا (دنیا میں بھی) کوئی چارہ ساز نہیں کہ اس کو راہ پر لے آوے) اور (قیامت میں بھی بُرا حال ہوگا، چنانچہ اُس روز) آپ (ان) ظالموں کو دیکھیں گے جس وقت کہ ان کو عذاب کا معاملہ ہوگا کہ (نہایت حسرت سے کہتے ہوں گے کیا دنیا میں) واپس جانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے، تاکہ پھر اچھے عمل کر کے آئیں) اور (نیز) آپ ان کو اس حالت میں دیکھیں گے کہ وہ دوزخ کے دروازے پر لڑے جاویں گے، مارے ذلت کے جھکے ہوئے ہوں گے (اور وہ اُس کو) حسرت (حسرت) نگاہ سے دیکھتے ہوں گے (جیسے خوف زدہ آدمی دیکھا کرتا ہے) اور ایک دوسری آیت میں جو نابینا ہونے کی خبر دی ہے وہ حشر کے وقت ہے اور یہ اُس کے بعد کا واقعہ ہے، چنانچہ وہاں لفظ مُحْشَرٌ کی تصریح ہے) اور (اس وقت) ایمان والے (اپنے بچنے پر شکر کرنے کے لئے اور اُن پر ملامت کرنے کے لئے) کہیں گے کہ پوچھ خوارہ والے وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں سے اور اپنے متعلقین سے (آج) قیامت کے روز خسارہ میں پڑے (اس کی تفسیر سورہ زمر کے دوسرے رکوع میں گزر چکی ہے) یاد رکھو کہ ظالم (یعنی مشرک و کافر) لوگ عذاب دائمی میں (گرفتار نہیں گئے اور وہاں) ان کے کوئی مددگار نہ ہوں گے جو خدا سے الگ (ہو کر) اُن کی مدد کریں اور جس کو خدا اکراہ کر دے اُس (کی نجات) کے لئے کوئی رستہ ہی نہیں (یعنی نہ معذرت، نہ کسی کی مدد، نہ اور کچھ۔ اُن کے کافروں سے خطاب ہے کہ اے لوگو جب تم نے قیامت کے یہ ہولناک حالات سُن لئے تو) تم اپنے رب کا حکم (ایمان وغیرہ کا) مان لو قبول کرو کہ ایسا دین آپہنچے جس کے لئے خدا کی طرف سے ہلنا نہ ہوگا (یعنی جس طرح دنیا میں عذاب ہلٹتا جاتا ہے، آخرت میں ایسی کوئی صورت نہ ہوگی اور) نہ تم کو اس روز کوئی (اور) پناہ ملے گی اور نہ تمہارے بارے میں کوئی (خدا سے) روک ٹوک کرنے والا ہے (کہ اتنا ہی پوچھ لے کہ ان کا یہ حال کیوں بنایا گیا اور اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو یہ سنا دیجئے) پھر اگر یہ لوگ (یہ سُن کر بھی) اعراض کریں (اور ایمان نہ لائیں) تو (آپ فکر اور غم میں نہ پڑیں، کیونکہ) ہم نے آپ کو اُن پر نگران کر کے نہیں بھیجا (جس سے باز پرس کا احتمال ہو کہ آپ کی نگرانی میں اُن سے یہ امور کیوں صادر ہوئے، بلکہ) آپ کے ذمہ تو صرف (حکم کا) پہنچا دینا ہے (جس کو آپ کر رہے ہیں، پھر آپ اس سے زیادہ فکر کیوں کریں) اور (ان کے حق سے اعراض کرنے کا سبب تعلق مع اللہ کی کمزوری ہے، جس کی علامت یہ ہے کہ) ہم جب (اس قسم کے) آدمی کو کچھ اپنی عنایت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ اُس پر (اترا کر) خوش ہو جاتا ہے (اور منعم پر نگاہ کر کے شکر نہیں کرتا) اور اگر (ایسے) لوگوں پر اُن کے (ان) اعمال (بد) کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو (ایسا) آدمی ناشکری کرنے لگتا ہے



اور ایسا نہیں کرتا کہ گناہوں سے توبہ واستغفار کر کے عبادت و طاعت کے ذریعہ اللہ کی طرف رجوع ہو، اور یہ دونوں حالتیں اس بات کی علامت ہیں کہ اس کا تعلق اپنی نفسانی لذتوں کے ساتھ زیادہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معدوم یا کمزور ہے اور اسی سے وہ کفر میں مبتلا ہوا ہے۔ اور چونکہ یہ حالت ان لوگوں کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ اس لئے اُن سے آپ ایمان کی توقع ہی کیوں رکھیں جو موجب غم ہو۔ آگے پھر توحید کا بیان ہے کہ اللہ ہی کی ہے (سب) سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے (چنانچہ جس کو چاہتا بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے یا اُن کو (جس کے لئے چاہے) جمع کر دیتا ہے (کہ) بیٹے بھی (دیتا ہے) اور بیٹیاں بھی اور جس کو چاہے بے اولاد رکھتا ہے، بے شک وہ بڑا جاننے والا بڑی قدرت والا ہے۔

## معارف و مسائل

آیات مذکورہ کی ابتدائی آیات میں ان لوگوں کا انجام مذکور ہے جو مومنین صالحین کے بالمقابل بجائے فکر آخرت کے صرف دنیا کی لذت و راحت کے طلبگار رہے۔ اس کے بعد اِشْتَجِبُوا لَوَيْكُمُ میں ان کو نصیحت کی گئی ہے کہ قیامت کا عذاب آنے سے پہلے توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں۔ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپ کی بار بار تبلیغ اور کوشش کے باوجود اگر یہ لوگ ہوش میں نہ آویں تو آپ غم نہ کریں، فَإِنْ أَغْمَرَ ضُنُّوْا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا حَفِیْظًا۔ کا یہی مطلب ہے۔

آخری آیات میں لِلّٰہِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ سے آخر تک تخلیق کائنات میں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا مشاہدہ ہوتا ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں، ان کو بیان کر کے توحید کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر فرمانے کے بعد ایک ضابطہ قدرت بیان فرمایا کہ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ۔ یعنی اس کو ہر بڑی چھوٹی چیز کے بنانے پر پوری قدرت ہے وہ جب چاہے جو چاہے پیدا کر دیتا ہے۔ اسی سلسلہ میں تخلیق انسانی کا ذکر فرمایا یَهْبِطُ لَہُمْ کِیۡۤسَآءُ اِنَّا نَآءِوِیۡہِبُ لَہُمۡ کِیۡۤسَآءُ الَّذِیۡنَ کُۡوۡرَہُ اَوۡیٰنَ وَجْہُہُمۡ ذُکۡرَ اِنَّا وَاِنَّا نَاجٍ وَیَجْعَلُ مَنۡ یَّشَآءُ حَقِیۡمًا ط اِنَّہٗ عَلِیۡہُمۡ قَدِ یُّوۡسِطُ

یعنی انسان کی تخلیق میں کسی کے ارادہ و اختیار بلکہ علم و خبر کا بھی کوئی دخل نہیں اور کسی کا دخل تو کیا ہوتا، انسان کے ماں باپ جو اس کی تخلیق کا ظاہری سبب بنتے ہیں خود ان کے ارادے اور

اختیار کا بھی سچہ کی تخلیق میں کوئی دخل نہیں تخلیق میں دخل ہونا تو دور کی بات، بچہ کی ولادت سے پہلے ماں کو بھی کچھ خبر نہیں ہوتی کہ اس کے پیٹ میں کیا، کیسا اور کس طرح بن رہا ہے۔ یہ صرف حق تعالیٰ کا کام ہے کہ کسی کو اولاد لڑکیاں دیدیتا ہے۔ کسی کو نرینہ اولاد لڑکے بخش دیتا ہے۔ کسی کو لڑکے اور لڑکیاں دونوں عطا فرما دیتا ہے اور کسی کو بالکل بانجھ کر دیتا ہے۔ کہ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوتی ان آیات میں بچوں کے اقسام بیان کرنے میں حق تعالیٰ نے پہلے لڑکیوں کا ذکر فرمایا ہے۔ لڑکوں کا ذکر بعد میں کیا ہے۔ اسی آیت کے اشارہ سے حضرت واثلہ بن اسقعؓ نے فرمایا کہ جس عورت کے بطن سے پہلے لڑکی پیدا ہو وہ مبارک ہوتی ہے۔ (قرطبی)

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ

اور کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارہ سے یا پردے کے پیچھے

حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بآذَانِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ

سے یا بھیجے کوئی پیغام لانے والا پھر بھیجا دے اس کے حکم سے جو وہ چاہے

عَلَىٰ حَكِيمٌ ۝۵۱ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا

تحقیق وہ سب ادھر ہے حکمت والا اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ

تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان لیکن ہم نے رسی ہے

نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ

یہ روشنی اس سے راہ سمجھا دیتے ہیں جس کو چاہیں اپنے بندوں میں اور بے شک

لَتَقْدِرَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝۵۲ صِرَاطَ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي

تو سمجھاتا ہے مسیدھی راہ اللہ کی اسی کا ہے جو کچھ ہے

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ طَالِيَ اللَّهُ تَصِيرُ الْأُمُورُ ۝۵۳

آسمانوں میں اور زمین میں سنتا ہے اللہ ہی تک پہنچتے ہیں سب کام

## خلاصہ تفسیر

اور کسی بشر کی (بجالت موجودہ) یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرماوے، مگر (تین طریق سے) یا تو الہام سے (کہ قلب میں کوئی اچھی بات ڈال دے) یا حجاب کے باہر سے (کچھ



کلام منہادے جیسے موسیٰ علیہ السلام نے سنا تھا، یا کسی فرشتہ کو بھیجے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے، پیغام پہنچا دیتا ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بڑا عالیشان ہے (اس سے جب تک وہ خود طاقت نہ دے کوئی ہمکلام نہیں ہو سکتا، مگر اس کے ساتھ) بڑی حکمت والا بھی) ہے (اسی لئے بندوں کی مصالحت سے اس نے کلام کے تین مذکور طریقے مقرر فرمادیئے ہیں) اور (جس طرح بشر کے ساتھ ہمارے ہمکلام ہونے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے) اسی طرح (یعنی اس قاعدے کے مطابق) ہم نے آپ کے پاس (بھی) وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے (اور آپ کو نبی بنایا ہے، اور یہ وحی ایسا ہدایت نامہ ہے کہ آپ کے بے مثل علوم میں اسی کی بدولت ترقی ہوئی، چنانچہ اس سے پہلے آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان (کا مکمل ترین درجہ جواب حاصل ہے) کیا چیز ہے (گو نفس ایمان نبی کو نبوت سے پہلے بھی حاصل ہوتا ہے، لیکن ہم نے (آپ کو نبوت اور قرآن دیا اور) اس قرآن کو (آپ کے لئے اولا اور دوسروں کے لئے ثانیاً) ایک نور بنایا (جس سے آپ کو یہ عظیم علوم اور بلند مرتبہ احوال حاصل ہوئے اور) جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں (پس اس کے نور عظیم ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اب جو اندھا ہی ہو وہ اس نور کے نفع سے محروم بلکہ اس کا منکر ہے، جیسے یہ معترضین) اور اس میں کوئی مشبہ نہیں کہ آپ اس قرآن اور وحی کے ذریعہ سے عام لوگوں کو، ایک سیدھے رستہ کی ہدایت کر رہے ہیں، یعنی اس خدا کے رستہ کی کہ اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے (آگے ان احکام کے ماننے اور نہ ماننے والوں کی جزا و سزا کا ذکر ہے کہ) یاد رکھو سب امور اسی کی طرف رجوع ہوں گے (پس وہ سب پر جزا و سزا دے گا)۔

## معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت یہود کے ایک معاندانہ مطالبہ کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ بغوی اور قرطبی وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ پر کیسے ایمان لے آئیں جبکہ آپ نہ خدا تعالیٰ کو دیکھتے ہیں اور نہ اس سے بالمشافہ کلام کرتے ہیں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کلام کرتے اور اللہ تعالیٰ کو دیکھتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بالمشافہ کلام کرنا اس دنیا میں ممکن نہیں۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی

مشافہہ کلام نہیں سنا بلکہ پس پردہ صرف آواز سنی۔

اس آیت میں یہ بھی بتلادیا گیا کہ کسی بشر سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کی صرف تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وَحْیاً یعنی کسی مضمون کو قلب میں ڈال دینا۔ یہ جاگتے ہوئے بھی ہو سکتا ہے اور نیند میں بصورت خواب بھی، جیسا کہ بہت سی احادیث میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اَلْقِیَ فِی سَاعِی۔ یعنی یہ بات میرے دل میں القاء کی گئی ہے اور انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔ اُن میں شیطانی تصرف نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں عموماً الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتے۔ صرف ایک مضمون قلب میں آتا ہے جس کو وہ اپنے الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں۔

دوسری صورت۔ مِنْ دُورٍ اَوْ حِجَابٍ ہے، یعنی جاگتے ہوئے کوئی کلام پس پردہ سنے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر پیش آیا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنا مگر زیارت نہیں ہوئی اسی لئے زیارت کی درخواست کی رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْهِ، جس کا جواب نفی میں دیا گیا، لَنْ تَرَانِیْ۔

اور یہ حجاب جو انسان کو دنیا میں حق تعالیٰ کی زیارت سے مانع ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو حق تعالیٰ کو چھپا سکے، کیونکہ اُس کے نور محیط کو کوئی شے چھپا نہیں سکتی۔ بلکہ انسان کی قوت بنیانی کا ضعف ہی اس کے لئے زیارت حق کے درمیان حجاب ہوتا ہے۔ اسی لئے جنت میں جبکہ اس کی بنیانی قوی کر دی جائے گی تو وہاں ہر جنتی حق تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہوگا۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ کی تصریح کے مطابق اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔

یہ قانون جو آیت مذکورہ میں ارشاد ہے، دنیا کے متعلق ہے کہ دنیا میں کوئی انسان اللہ تعالیٰ سے کلام مشافہہ یعنی بے حجاب نہیں کر سکتا۔ اور انسان کی تخصیص کلام میں اس لئے ہے کہ گفتگو انسان ہی کے متعلق تھی۔ ورنہ ظاہر یہ ہے کہ فرشتوں سے بھی اللہ تعالیٰ کلام بالمشافہہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ترمذی کی روایت میں جبرائیل علیہ السلام سے منقول ہے کہ میں بہت قریب ہو گیا تھا اور پھر بھی مَشر ہزار حجاب رہ گئے تھے۔ اور شب معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق تعالیٰ سے بالمشافہہ کلام اگر ثابت ہو جائے جیسا کہ بعض علماء کا قول ہے تو وہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ وہ کلام اس عالم میں نہیں تھا، عالم سموات میں تھا۔ واللہ اعلم۔

تیسری صورت، اَوْ یُرْسِلُ رَسُوْلًا ہے۔ یعنی کسی فرشتہ جبرائیل وغیرہ کو اپنا کلام دیکر بھیجا جائے وہ رسول کو بڑھ کر مناد ہے۔ اور یہی طریقہ عام رہا ہے، قرآن مجید پورا اسی طرح بواسطہ ملائکہ نازل ہوا ہے۔ مذکورہ تفصیل میں لفظ وحی کو صرف القاء فی القلب کے معنی میں لیا گیا ہے



مگر اکثر یہ لفظ تمام اقسام کلام ربانی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک طے میں حدیث میں وحی کی اقسام بذریعہ فرشتہ کلام کو بھی شمار فرمایا ہے۔ اور اس میں یہ بھی تفصیل ہے کہ فرشتہ کے ذریعہ جو وحی آتی ہے اس کی بھی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی تو فرشتہ اپنی اصلی ہدیت میں ہوتا ہے کبھی بشکل انسانی سامنے آتا ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِنْ الْآيَةُ - یہ آیت پہلی ہی آیت کے مضمون کا نکتہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں بالمشافہہ کلام تو کسی کا نہ ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں پر اپنی وحی بھیجتے ہیں جس کے تین طریقے پہلی آیت میں بیان ہوئے۔ اسی سنت الہیہ کے مطابق آپ پر بھی وحی بھیجی جاتی ہے۔ یہودیوں کا یہ مطالبہ کہ آپ اللہ تعالیٰ سے بالمشافہہ کیوں مخاطب نہیں ہوتے محض جاہلانہ اور معاندانہ ہے۔ اس لئے یہ فرمایا کہ کسی انسان کو یہاں تک کہ کسی رسول کو جو کچھ بھی علم ملتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی ان کو نہ بتلا دیں تو نہ انھیں کسی کتاب کی واقفیت ہو سکتی ہے نہ تفصیلات ایمان کی کتاب کی واقفیت قبل وحی نہ ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ ایمان سے واقفیت نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ایمان کی تفصیلات اور شرائع ایمان یا ایمان کا اعلیٰ مقام جو بعد وحی حاصل ہوتا ہے، وحی سے پہلے اس کی واقفیت نہیں ہوتی۔ ورنہ باجماع امت یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ جس انسان کو اپنا رسول و نبی بناتے ہیں اس کو ابتداء ہی سے ایمان پر پیدا فرماتے ہیں۔ ان کی فطرت ایمان پر مبنی ہوتی ہے۔ عطار نبوت اور نزول وحی سے پہلے بھی وہ بچے مومن ہوتے ہیں۔ اصول ایمان ان کی فطرت و خلقت میں داخل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے جب ان کی قوموں نے مخالفت کی تو ان پر طرح طرح کے الزام لگائے۔ مگر کسی پیغمبر پر کسی امت نے یہ الزام نہیں لگایا کہ تم بھی تو نبوت کے دعوے سے پہلے ہماری طرح بتوں کو پوجا کرتے تھے۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اور قاضی عیاض نے شفا میں اس مضمون کو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔

# سُورَةُ الزُّخْرُفِ

سُورَةُ الزُّخْرُفِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تَسْعُ وَثَمَانُونَ آيَةً وَسِتِّعُ رُكُوعٌ  
سورہ زخرف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی نواسی آیتیں ہیں اور سات رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شرع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حَمْدٌ ۱ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ۲ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ

قسم ہے اس کتاب واضح کی ہم نے رکھا اس کو قرآن عربی زبان کا تاکہ تم

تَعْقِلُونَ ۳ وَانَّهُ فِيْ اِمَّا الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلَّ حَكِيمٌ ۴ اَفَنْضَرْبُ

سمجھو اور تحقیق یہ قرآن نور محفوظ میں ہمارے پاس ہے برتر مستحکم کیا پھر دیں گے

عَنْكُمْ الَّذِیْ كَرَّ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِیْنَ ۵ وَكَمْ اَرْسَلْنَا

ہم تمہاری طرف سے یہ کتاب موڑ کر اس سبب سے کہ تم ہو ایسے لوگ کہ حد پر نہیں لہتے اور بہت بھیجے ہیں ہم نے

مِنْ نَّبِیٍّ فِی الْاَوَّلِیْنَ ۶ وَمَا یَاْتِیْهِمْ مِنْ نَّبِیٍّ اِلَّا کَانُوْا

نبی پہلوں میں اور نہیں آتا لوگوں کے پاس کوئی پیغام لانے والا جس سے

بِه یَسْتَهْزِءُوْنَ ۷ فَاهْلَکْنَا اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّ

ٹھٹھا نہیں کرتے پھر برباد کر ڈالے ہم نے اُن سے سخت تر اور والے اور

مَضٰی مَثَلُ الْاَوَّلِیْنَ ۸

چلی آئی ہے مثال پہلوں کی

## خلاصہ تفسیر

الحمد (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) قسم (ہے) اس کتاب واضح کی کہ ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ (اے عرب) تم (آسانی سے) سمجھ لو اور وہ ہمارے پاس نور محفوظ میں بڑے رتبہ کی اور حکمت بھری کتاب ہے (پس جب وہ سمجھنے میں آسان اور خاص ہماری زیر حفاظت



اور اعجاز کی وجہ سے بڑے رتبے والی اور حکیمانہ مضامین پر مشتمل ہے تو ایسی کتاب کو ضرور ماننا چاہیے لیکن اگر تم نہ مانو تب بھی ہم اپنی حکمت کے مقتضائے اسکا بھیجنا اور تم کو اسکا مخاطب بنانا چھوڑینگے چنانچہ ارشاد ہے کہ (کیا ہم تم سے اس نصیحت (نامہ) کو (محض) اس بات پر ہٹالیں گے کہ تم حد (اطاعت) سے اگزر نہ دالے ہو) اور اس کو نہیں مانتے، یعنی خواہ تم مانو یا نہ مانو مگر نصیحت تو برابر کی جائے گی اور یہ فیض کامل ہو کر ہے گناہ کا اس سے مومنین کو نفع ہو اور تم پر حجت قائم ہو) اور ہم پہلے لوگوں میں (باوجود اُن کی تکذیب کے) بہت سے نبی بھیجتے رہے ہیں (یہ نہیں ہو کہ اُن کے جھٹلانے کی وجہ سے سلسلہ نبوت بند ہو جاتا) اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، جیسے ہم نے اُن کی تکذیب کی پروا نہیں کی اسی طرح آپ بھی کچھ پروا اور غم نہ کیجئے، کیونکہ) اُن (پہلے) لوگوں (کا بھی یہی حال تھا کہ اُن کے پاس کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انھوں نے استہزاء نہ کیا ہو، پھر جنے اُن لوگوں کو جو کہ ان (اہل مکہ) سے زیادہ زور اور تھے (تکذیب اور استہزاء کی سزائیں) غارت کر ڈالا، اور پہلے لوگوں کی یہ حالت ہو چکی ہے) پس نہ آپ غم کریں کہ ان کا بھی ایسا ہی حال ہونا ہے (جیسا کہ بدر وغیرہ میں ہوا اور نہ یہ بے فکر ہوں کہ نمونہ موجود ہے)

## معارف و مسائل

یہ سورت مکی ہے، البتہ حضرت مقاتلؓ کا قول ہے کہ آیت **وَأَسْأَلُ مَنْ أَرْسَلْنَاكَ مِنْ دُونِ** اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ سورت معراج کے وقت آسمان پر نازل ہوئی (روح المعانی) والمقد علم **وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ**، (قسم ہے کتاب واضح کی) اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کی قسم کھاتے ہیں تو عموماً وہ چیز لید کے دعوے کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ یہاں قرآن کریم کی قسم کھا کر اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے۔ قرآن بذات خود اپنے اعجاز کی وجہ سے اپنی حقانیت کی دلیل ہے اور قرآن کو واضح کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وعظ و نصیحت پر مشتمل مضامین باطنی سمجھ میں آجاتے ہیں لیکن جہاں تک اس سے احکام شرعیہ کے استنباط کا تعلق ہے وہ بلاشبہ ایک مشکل کام ہے اجتہاد کی پوری صلاحیت کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا چنانچہ دوسری جگہ یہ بات واضح کر دی گئی ہے **وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدْرِكٍ** (اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے، پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟) اس میں فرما دیا گیا ہے کہ قرآن نصیحت اندوزی کیلئے آسان ہے لہذا اس سے اجتہاد و استنباط کا آسان ہونا لازم نہیں آتا بلکہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے کہ اس کام کے لئے متعلقہ علوم میں پوری ہمت و شہاد ہے۔

بیان کو مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیے | اَفَتَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَافًۢمَ اِنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِیْنَ  
 (کیا ہم تم سے اس نصیحت کو اس بات پر ہٹالیں گے کہ تم حد سے گزرنے والے ہو؟) مطلب یہ ہے کہ تم اپنی کشتی  
 اور نافرمانی میں خواہ کتنے حد سے گزر جاؤ لیکن ہم تمہیں قرآن کے ذریعہ نصیحت کرنا نہیں چھوڑیں گے۔ اس  
 سے معلوم ہوا کہ جو شخص دعوت و تبلیغ کا کام کرتا ہو اسے ہر شخص کے پاس پیغام حق لیکر جانا چاہیے اور  
 کسی گروہ یا جماعت کو تبلیغ کرنا محض اس بنا پر نہیں چھوڑنا چاہیے کہ وہ تو انتہا درجے کے ملحد  
 بے دین یا فاسق و فاجر ہیں انہیں کیا تبلیغ کی جائے۔

وَلَیِّنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ

اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے بنائے آسمان اور زمین تو کہیں بنائے

الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ ۙ (۹) الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمُ

اس زبردست خبردار نے وہی ہے جس نے بنا دیا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور رکھ دیں تمہارے واسطے

فِیْهَا سَبَیْلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۙ (۱۰) وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَآءً

اسیں راہیں تاکہ تم راہ پاؤ اور جس نے اتارا آسمان سے پانی

یَقْدَرُ ۙ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلَدًا مَّیِّتًا ۙ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۙ (۱۱) وَالَّذِیْ

پا کر پھر ابھار کھڑا کیا ہے اس سے ایک میں مردہ کو اسی طرح تم کو بھی نکالیں گے اور جس نے

خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمُ مِنَ الْفَلَکِ وَالْاَنْعَامِ مَا

بنائے سب چیز کے جوڑے اور بنا دیا تمہارے واسطے کشتیوں اور چوپایوں کو

تَرْکَبُوْنَ ۙ (۱۲) لِتَسْتَوُوا عَلٰی ظُهُورِہٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّکُمْ اِذَا

جس پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ چڑھ بیٹھو تم اسکی پیٹھ پر پھر یاد کرو اپنے رب کا احسان جب

اَسْتَوِیْتُمْ عَلَیْہِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَاَمَّا کُنَّا

بیٹھ چکے اس پر اور کہو پاک ذات ہے وہ جس نے بس میں کر دیا ہمارے اسکو اور ہم نہ تھے

لَہٗ مُقَرَّنِیْنَ ۙ (۱۳) وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۙ (۱۴) وَجَعَلُوْا لَہٗ مِنْ

اس کو قابو میں لا سکتے اور ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے اور ٹھہرائی ہے انہوں نے

عِبَادَہٗ جُزْءًا مِّنَ الْاِنْسَانِ لَکُفُوْرٍ مُّبِیْنٍ ۙ (۱۵) اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا

حق تعالیٰ کے واسطے اولاد کے بندوں میں سے، تحقیق انسان بڑا ناشکر ہے صریح کیا اُس نے رکھ لیں اپنی

یَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفَحَکُمْ بِالْبَنٰتِ ۙ (۱۶) وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُہُمْ بِمَا

مخلوقات میں سے بیٹیاں اور تم کو دیدیے جن کو بیٹے اور جب انہیں کسی کو خوشخبری ملے اُس چیز کی جس

نہایت پسند ہے اُنہیں اُن کی بیٹیوں سے دیا



ضَرَبَ لِلرَّحْمَنِ مَثَلًا ظَلًّا وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝۱۷

کو رحمن کے نام لگایا تو سارے دن رہے منہ اُسکا سیاہ اور وہ دل میں گھٹ رہا ہے کیا

مَنْ يَنْشُرْهُ فِي الْحَيَاةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ۝۱۸ وَجَعَلُوا

ایسا شخص کہ پرورش پاتا ہے زور میں اور وہ جھگڑے میں بات نہ کہہ سکے اور ٹھہرایا انھوں نے

الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ إِنْ شَاءَ أَشْهَدُ وَآخِلَقَهُمْ

فرشتوں کو جو بندے ہیں رحمن کے عورتیں کیا دیکھتے تھے اُن کا بننا

سَتَكْتُبُ شَهَادَتَهُمْ وَيُسْأَلُونَ ۝۱۹ وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَنُ مَا

اب لکھ رکھیں گے اُن کی گواہی اور اُن سے پوچھ ہوگی اور کہتے ہیں اگر چاہتا رحمن تو ہم

عَبْدُهُمْ مَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝۲۰

نہ بوجھتے اُن کو کچھ خبر نہیں اُن کو اس کی یہ سب انگلیں دوڑاتے ہیں

أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا مِنْ قَبْلِهِ فَهُمْ بِهِ مُسْتَمْسِكُونَ ۝۲۱ بَلْ قَالُوا إِنَّا

کیا ہم نے کوئی کتاب دی ہے اُن کو اس سے پہلے سوانحوں نے اس کو مضبوط پکڑ رکھا ہے بلکہ کہتے ہیں ہم نے

وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ ۝۲۲ وَكَذَلِكَ

پایا اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر اور ہم انہی کے قدموں پر ہیں راہ پائے ہوئے اور اسی طرح

مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا

جس کسی کو بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے ڈر نشانے والا کسی گاؤں میں سو کہنے لگے وہاں کے خوشحال لوگ

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ ۝۲۳

ہم نے تو پایا اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر اور ہم انہی کے قدموں پر چلتے ہیں

قُلْ أَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِآهْدَىٰ مِمَّا وَجَدْتُمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ قَالُوا

وہ بولا اور جو میں لا دوں تم کو اس سے زیادہ سوچھ کی راہ جس پر تم نے پایا اپنے باپ دادوں کو تو یہی کہنے

إِنَّا بِمَا أَرْسَلْتُمْ بِهِ كُفِرَؤُنَ ۝۲۴ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَنْظُرْ كَيْفَ

لگے ہم تمہارا لایا ہوا نہیں مانیں گے پھر ہم نے اُن سے بدلہ لیا سو دیکھ لے کیسا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ ۝۲۵

انجام جھٹلانے والوں کا

## خلاصہ تفسیر

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ

اُن کو زبردست جاننے والے (خدا) نے پیدا کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ جس ذات نے تنہا یہ عظیم مخلوقات پیدا کی ہوں عبادت بھی تنہا اسی کی کرنی چاہیے، لہذا توحید خود اُن کے اعتراف سے ثابت ہو گئی۔ آگے اللہ تعالیٰ توحید کو مزید مدلل کرنے کے لئے اپنے وہ افعال بیان فرماتے ہیں جو توحید پر دلالت کر نیوالے ہیں یعنی یہ زمین و آسمان اسے پیدا کیا ہے) جس نے تمہارے (آرام کے) لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا (کہ اس پر آرام کرتے ہو) اور اُس (زمین) میں اُس نے تمہارے (منزل مقصود تک پہنچنے کے) لئے رستے بنائے تاکہ (اُن راستوں پر چل کر) تم منزل مقصود تک پہنچ سکو اور جس نے آسمان سے پانی ایک انداز (خاص) سے (اپنی مشیت اور حکمت کی مطابق) برسایا پھر ہم نے اس (پانی) سے خشک مین کو (اُس کے مناسب) زندہ کیا (اور اس سے توحید پر دلالت کے علاوہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ) سیطرح تم (بھی اپنی قبروں سے) نکالے جاؤ گے اور جس نے (مختلف اجناس والوں میں) تمام (مختلف) اقسام (یعنی اصناف) بنائیں اور تمہاری وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ تم اُن (کشتیوں اور چارپائیوں) کی (سطح اور) پیٹھ پر چم کر (اطمینان سے) بیٹھو پھر جب اسپر مٹھ چکو تو اپنے رب کی (اس) نعمت کو (دل سے) یاد کرو اور (زبان سے استغیاباً) یوں کہو کہ اُسکی ذات پاک ہے جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم تو ایسے (طاقتور اور ہر مند) نہ تھے جو اُن کو قابو میں کر لیتے (کیونکہ جانور سے زیادہ طاقت نہیں، اور الہام حق کے بغیر کشتی چلانے کی تدبیر سے واقف نہیں، دونوں کے متعلق حق تعالیٰ نے تدبیر سکھادی) اور تم کو اپنے رب کی طرف کوٹ کر جانا ہے (اس لئے ہم اس پر سوار ہو کر شکر سے غفلت یا تکبر نہیں کرتے) اور (یاد جو دلائل توحید کے واضح ہونے کے) ان لوگوں نے (شرک اختیار کر رکھا ہے اور وہ بھی کیسا قبیح کہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں اور اُن کی عبادت کرتے ہیں پس ایک فرابی تو یہ ہوئی کہ اُنھوں نے) خدا کے بندوں میں سے (جو مخلوق ہوتے ہیں) خدا کا جزو ٹھہرایا، (حالانکہ خدا کا کوئی جزو ہونا عقلاً محال ہے) واقعی (ایسا) انسان سرج ناشکر ہے (کہ خدا تعالیٰ کیساتھ اتنا بڑا کفر کرتا ہے کہ اُسکو صاحب جزو قرار دیتا ہے جس سے خدا تعالیٰ کا معاذ اللہ حادث ہونا لازم آتا ہے۔ غرض ایک فرابی تو یہ ہوئی اور دوسری فرابی یہ کہ یہ لوگ لڑکی کو ناقص سمجھتے ہیں اور پھر خدا کے لئے بیٹیاں مانتے ہیں تو) کیا خدا نے اپنی مخلوق میں سے (تمہارے زعم میں اپنے لئے تو) بیٹیاں پسند کیں اور تمکو بیٹوں کے ساتھ مخصوص کیا حالانکہ (تم بیٹیوں کو اتنا برا سمجھتے ہو کہ) جب تم میں کسی کو اُس چیز کے ہوئی خبر دیتی ہے جس کو خدا نے رحمان کا نمونہ (یعنی اولاد) بنا رکھا ہے (مُراد بیٹی ہے) تو (اسقدر ناراض ہو کہ) سارے دن اُسکا چہرہ بے رونق رہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے (توحیرت ہے کہ خدا کی طرف نقص کی نسبت کرتے ہو یہاں تک انکے فاسد عقیدے کی الزامی تردید تھی جس کی تشریح سورہ صافات میں گزر چکی ہے۔ آگے اسی عقیدے کی تحقیقی تردید کی جاتی ہے کہ اگرچہ لڑکی ہونا بذاتِ خود کوئی ذلت یا عار کی بات نہیں جیسے



تم سمجھتے ہو، لیکن ہمیں تو کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے ناقص عقل اور ضعیف الرائے ضرور ہے جب یہ بات ہے تو کیا (خدا نے اولاد بنانے کے لئے لڑکی کو پسند کیا ہے) جو کہ (عادتاً) آرائش (دزیائش) میں نشوونما پائے (جو زیورات اور بناؤ سنگھار کی طرف اسکی رغبت کا سبب ہوتی ہے اور اسکا لازمی نتیجہ عقل و رائے کی ناچستگی ہے) اور وہ (فکری قوت کے ضعف کی بنا پر) مباحثہ میں قوتِ بیانیہ (بھی) نہ رکھے (چنانچہ عورتیں عموماً اپنے مافی الضمیر کو قوت اور وضاحت کیساتھ بیان کرنے پر مردوں کی نسبت کم قادر ہوتی ہیں، اکثر ادھوری بات کہیں گی اور ہمیں فضول باتیں ملا دیں گی) جنکا اصل مقصد میں کچھ دخل نہ ہو، یہ دو خرابیاں ہوتیں (اور تیسری خرابی شرک لازم آنی سے قطع نظر یہ ہو کہ) انھوں نے فرشتوں کو جو کہ خدا کے (مخلوق) بندے ہیں (اسلئے اللہ کو ان کی پوری حالت معلوم ہے اور چونکہ وہ نظر نہیں آتے اسلئے انکی کوئی صفت بغیر اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی اور اللہ نے کہیں یہ نہیں بتلایا کہ فرشتے عورت ہیں لیکن اسکے باوجود انھوں نے اُن کو بلا دلیل) عورت قرار دے رکھا ہے (اور اُن کے عورت ہونے پر نہ کوئی عقلی دلیل موجود ہے نہ نقلی، لہذا مشاہد ہونا چاہیے تو) کیا یہ اُن کی پیدائش کے وقت موجود تھے (اور دیکھ رہے تھے، جواب ظاہر ہے کہ انھوں نے فرشتوں کی تخلیق کا مشاہدہ نہیں کیا، لہذا ان کے اس احمقانہ دعوے کی حقیقت واضح ہو گئی) ان کا یہ دعویٰ (جو بلا دلیل ہے اعمال کے دفتر میں) لکھ لیا جاتا ہے اور (قیامت میں) اُن سے باز پرس ہوگی (یہ گفتگو تو فرشتوں کے بیٹیاں ہونے سے متعلق تھی) اور (آگے ان کے معبود ہونے کے متعلق بیان ہے کہ) وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ (اس بات کو خوشی سے) چاہتا (کہ ملائکہ کی عبادت نہ ہو، یعنی اس عبادت سے وہ ناخوش ہوتا) تو ہم (کبھی) ان کی عبادت نہ کرتے (کیونکہ وہ کرنے ہی نہ دیتا، بلکہ جبراً روک دیتا، جب نہیں روکا تو معلوم ہوا کہ وہ ان کی عبادت نہ کرنے سے خوش نہیں بلکہ عبادت کرنے سے خوش ہے آگے اُن کی تردید ہے کہ) اُن کو اس (بات) کی کچھ تحقیق نہیں (ہے) محض بے تحقیق بات کر رہے ہیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو کسی فعل پر قدرت دیدینا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ اس فعل پر راضی بھی ہے جیسے کہ پارہ ہشتم کے نصف سے پہلے آیت سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْلَا اِلهٌ فِي سَمٰوٰتِہِمْ سُبْحٰنَہُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے اب یہ بتلا دیں کہ) کیا ہم نے ان کو اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب دے رکھی ہے کہ یہ (اس دعوے میں) اُس سے استدلال کرتے ہیں (حقیقت یہ ہے کہ نہ ان کے پاس دلیل عقلی ہے نہ دلیل نقلی) بلکہ (محض اپنے باپ دادوں کی اتباع ہے، چنانچہ) وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے رستہ چل رہے ہیں اور (جس طرح یہ لوگ بلا دلیل بلکہ خلافتِ دلیل اپنی قدیم رسم کو بطور سند پیش کرتے ہیں) اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے

کسی بستی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے (اولاً اور متبعین نے ثانیاً) یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انہی کے چھپے پیچھے چلے جا رہے ہیں (اس پر انکے) (اس) پیغمبر نے (انسے) کہا کہ کیا (آبائی رسوم ہی کا اتباع کئے جاؤ گے) اگرچہ میں اُس سے اچھا (مُزَل) مقصود پر پہنچا دینے والا طریقہ تمہارے پاس لایا ہوں کہ جس پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہو، وہ (براہ عناد) کہنے لگے کہ ہم تو اُس (دین) کو مانتے ہی نہیں جس کو دیکھو (برغم تمہارے) تم کو بھیجا گیا ہے سو (جب عناد حد سے بڑھ گیا اُسوقت) ہم نے اُن سے استقام لیا، سو دیکھئے، تکذیب کرنے والوں کا کیسا (بُرا) انجام ہوا۔

## معارف و مسائل

جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا (تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا) مطلب یہ ہے کہ زمین کی ظاہری صورت اور اسکا آرام فرش کا سا ہے، لہذا یہ زمین کے گول ہونے کے منافی نہیں۔

وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ (اور تمہارے لئے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہو) انسان کی سواریاں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک وہ سواریاں جنہیں انسان اپنی صنعتِ حُرفت کے ذریعہ خود بناتا ہے اور دوسرے وہ حیوانات جن کی تخلیق میں انسانی صنعت کا کوئی دخل نہیں۔ ”کشتیاں“ بول کر سواریوں کی پہلی قسم مراد ہے اور ”چوپائے“ سے دوسری قسم۔ بہر حال مقصد یہ ہے کہ انسانی استعمال کی تمام سواریاں، خواہ ان کی تیاری میں انسانی صنعت کو دخل ہو یا نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہیں۔ چوپایوں کا نعمت ہونا تو بالکل ظاہر ہے کہ وہ انسان سے کئی گنا زائد طاقتور ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں انسان کے آگے ایسا رام کر دیا ہے کہ ایک بچہ بھی ان کے منہ میں لگتا یا ناک میں نکیل ڈال کر جہاں چاہتا ہے انہیں لیجاتا ہے۔ اسی طرح وہ سواریاں بھی اللہ کی بڑی نعمت ہیں جن کی تیاری میں انسانی صنعت کو دخل ہے، ہوائی جہاز سے لیکر مٹولی سائیکل تک یہ ساری سواریاں اگرچہ بظاہر انسان نے خود بنائی ہیں لیکن اُن کی صنعت کے طریقے سمجھانے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے؟ یہ وہ قادرِ مطلق ہی تو ہے جس نے انسانی دماغ کو وہ طاقت عطا کی ہے جو لوہے کو موم بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اسکے علاوہ ان کی صنعت میں جو خام مواد استعمال ہوتا ہے وہ اور اس کے خواص و آثار تو براہِ راست اللہ تعالیٰ ہی کی تخلیق ہیں۔

ثُمَّ لَنَذَرَنَّهُمْ كَمِمْزَاتِ الْمَسْكِ (اور تاکہ تم یاد کرو اپنے پروردگار کی نعمت کو) اس سے اشارہ فرما دیا گیا کہ ایک صاحبِ عقل و ہوش انسان کا کام یہ ہے کہ وہ منعمِ حقیقی کی نعمتوں کو استعمال کرتے ہوئے غفلت، بے پروائی اور استغناء کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اس بات پر دھیان دے کہ یہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے لہذا مجھ پر اسکے شکر کی ادائیگی اور عجز و نیاز کا اظہار واجب ہے۔ ایک کافر



اور مومن میں درحقیقت یہی فرق ہے کہ کائنات کی نعمتوں کو دونوں استعمال کرتے ہیں لیکن کافر انھیں غفلت اور بے پروائی سے استعمال کرتا ہے اور مومن اللہ کے انعامات کو مستحضر کر کے اپنا سرِ نیا ز اس کے حضور جھکا دیتا ہے۔ اسی مقصد سے قرآن و حدیث میں مختلف کاموں کی انجام دہی کے وقت صبر و شکر کے مضامین پر مشتمل دعائیں تلقین کی گئی ہیں۔ اور اگر انسان اپنی روزمرہ زندگی میں اٹھتے، بیٹھتے چلتے پھرتے ان دعاؤں کو اپنا معمول بنائے تو اسکا ہر مباح کام بھی عبادت بن جاتا ہے۔ یہ دعائیں علامہ جزریؒ کی کتاب "حصن حصین" اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی "مناجات قبول" میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ سفر کے وقت کی دعائیں سُبْحَنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا (پاک ہے وہ ذات جس نے اسکو ہمارے لئے مسخر کر دیا) یہ سواری پر بیٹھ کر پڑھنے کی دعا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد روایات میں منقول ہے کہ آپ سواری پر بیٹھتے وقت یہ کلمات پڑھا کرتے تھے اور سوار ہونے کا پورا مستحب طریقہ حضرت علیؓ سے یہ منقول ہے کہ سواری پر پاؤں رکھتے وقت "بسم اللہ" کہے، پھر سوار ہو جائیکے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور اسکے بعد یہ کلمات سُبْحَنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا سَے لَمُنْقَلِبُونَ تک (قرطبی) نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر آپ کسی سفر پر جا رہے ہوتے تو مذکورہ کلمات کے بعد یہ دعا بھی پڑھتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيفَةُ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَعْتَا السَّفَرِ وَكَابَةِ الْمُنْقَلَبِ، وَالْحَوْرِ بَعْدَ الْكُوْرِ وَسُوْرِ الْمُنْظَرِ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ، اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ظَلَمْتَ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ کہ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ (قرطبی)

وَمَا کُنَّا لَکَ مُقْرِیْنِیْنَ (اور ہم تو ایسے نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے) یہ بات مشینی سواروں پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے جس طرح جانوروں اور چوپایوں پر۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ ان کا خام مواد پیدا نہ کرتا، یا اس میں وہ خواص و آثار نہ رکھتا یا انسانی دماغ کو ان خواص کے دریافت کرنے کی طاقت نہ بخشتا تو ساری کائنات مل کر بھی ایسی سواریاں پیدا نہ کر سکتی تھی۔

وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ (اور بلاشبہ ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں) ان الفاظ کے ذریعہ تعلیم یہ دی گئی ہے کہ انسان کو اپنے ہر دنیوی سفر کے وقت آخرت کا وہ کٹھن سفر یاد کرنا چاہیے جو ہر حال میں پیش آکر ہے گا اور اسے سہولت کیساتھ طے کرنے کے لئے اعمالِ صالحہ کے سوا کوئی سواری نہیں ہوگی۔

وَجَعَلُوْا لَکُمْ عِبَادَہٗ جُزْءًا (اور انھوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا جزو ٹھہرایا) یہاں جزؤ سے مراد اولاد ہے کہ مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے اور اولاد کے بجائے "جزؤ" کا لفظ اختیار کر کے مشرکین کے اس دعوائے باطل کی عقلی تردید کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اللہ کے کوئی اولاد ہو تو وہ اسکی جزد ہوگی کیونکہ بیباپ کا جزد ہوتا ہے، اور یہ عقلی قاعدہ ہے کہ ہر کل اپنے وجود میں جزد کا محتاج ہوتا ہے تو اس سے لازم آئیگا کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ بھی اپنی اولاد کا محتاج ہو۔ اور ظاہر ہے کہ کسی بھی قسم کی احتیاج شان خداوندی کے بالکل منافی ہے، اَوْ مَنْ يَكْتَسِبُ فِي الْحَلْيَةِ الْخ (کیا جو آرائش میں نشوونما پائے) اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے لئے زیور کا استعمال اور موافق شرع آرائش کے طریقے اختیار کرنا جائز ہے۔ چنانچہ اس پر اجماع ہے لیکن ساتھ ہی پیرایہ بیان یہ بتا رہا ہے کہ آرائش میں اتنا اہتمام کہ صبح و شام بناؤ شکھار ہی میں لگی رہے یہ مناسب نہیں بلکہ یہ ضعیف عقل رائے کی علامت بھی ہے اور اس کا سبب بھی۔

وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ، (اور وہ مباحثہ میں قوت بیان بھی نہ رکھے) مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی اکثریت ایسی ہے کہ وہ مافی الضمیر کو قوت اور وضاحت کیساتھ بیان کرنے پر مردوں کے برابر قادر نہیں ہوتی۔ اسی لئے اگر کہیں مباحثہ ہو جائے تو اپنے دعوے کو ثابت کرنا اور دوسرے کے دلائل کو رد کرنا اسکے لئے مشکل ہوتا ہے لیکن یہ حکم اکثریت کے اعتبار سے ہے۔ لہذا اگر کچھ عورتیں سلیقہ گفتار کی مالک ہوں اور اس معاملہ میں مردوں سے بھی بڑھ جائیں تو اس آیت کے منافی نہیں، کیونکہ حکم اکثریت پر لگتا ہے اور اکثریت بلاشبہ ایسی ہی ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِرَبِّهٖ وَقُوۡمِهٖ اِنِّیۡۤ اِبْرَءُ فَمَا تَعْبُدُوۡنَ ۙ (۲۶) اَللّٰی

اور جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ کو اور اسکی قوم کو میں الگ ہوں ان چیزوں سے جن کو تم پوجتے ہو

الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡۤ اِنَّہٗ سَیُّہْدِیۡنَ ۙ (۲۷) وَجَعَلَهَا کَلِمَةً بَاقِیَةً فِیۡ

جس نے مجھ کو بنایا سو وہ مجھ کو راہ سمجھائے گا اور یہی بات پیچھے چھوڑ گیا اپنی

عَقِبِہٖ لَعَلَّہُمْ یَرْجِعُوۡنَ ۙ (۲۸) بَلْ مَتَّعْتُہُمْ لَہٗوَ لَاۤءٍ وَّ اَبَآءَہُمْ حَتّٰی

اولاد میں تاکہ وہ رجوع کریں کوئی نہیں پر میں نے برتنے دیا ان کو اور انکے باپ دادوں کو

جَآءَہُمْ الْحَقُّ وَرَسُولٌ مُّبِیۡنٌ ۙ (۲۹) وَلَمَّا جَآءَہُمْ الْحَقُّ قَالُوۡا

یہاں تک کہ پہنچا انکے پاس دین سچا اور رسول کھول کر سنا دینے والا اور جب پہنچا ان کے پاس سچا دین، کہنے لگے

ہٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِہٖ کٰفِرُوۡنَ ۙ (۳۰)

یہ جادو ہے اور ہم اس کو نہ مانیں گے

## خلاصہ تفسیر

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جبکہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے



فرمایا کہ میں اُن چیزوں (کی عبادت) سے بیزار (اور بے تعلق) ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ہاں (اُس خدا سے تعلق رکھتا ہوں) جسے مجھ کو پیدا کیا، پھر وہی مجھ کو (میرے دین و دنیا کی صلتوں تک) رہنمائی کرتا ہے (مطلب یہ کہ ان لوگوں کو ابراہیم علیہ السلام کا حال یاد کرنا چاہیے کہ وہ خود بھی توحید کے معتقد تھے) اور (وصیت کے ذریعہ) وہ اُس (عقیدہ) کو اپنی اولاد میں (بھی) ایک قائم رہنے والی بنا کر گئے (یعنی اپنی اولاد کو بھی وصیت کی جسکا اثر کچھ کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک بھی برابر رہا یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بھی عرب میں بعض لوگ شرک سے نفرت کرتے تھے اور یہ وصیت انھوں نے اسلئے کی تھی) تاکہ (ہر زمانے میں شرک) لوگ (موحدین سے توحید کا عقیدہ سن سن کر شرک سے) باز آتے رہیں (مگر یہ لوگ پھر بھی باز نہیں آتے اور اس طرف توجہ نہیں کرتے) بلکہ میں (جو) انکو اور ان کے باپ دادوں کو (دنیا کا) خوب سامان دیا ہے (اس میں منہمک اور غافل ہو رہے ہیں) یہاں تک کہ (اسی انہما اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے) ان کے پاس سچا قرآن (جو معجز ہو نیکی وجہ سے اپنی سچائی کی آپ ہی دلیل ہے) اور صاف صاف بتائیوالا رسول (اللہ کمیطوف سے) آیا اور جب انکے پاس یہ سچا قرآن پہنچا (اور اسکا اعجاز ظاہر ہوا) تو کہنے لگے کہ یہ جادو ہے اور ہم اسکو نہیں مانتے۔

## معارف و مسائل

وَلَاذَقَالَ ابْرَاهِيْمُ اِنْ كُنْتُمْ تَرْضَوْنَ لِي اٰلِهَةً غَيْرَ اللَّهِ فَلْيُرْسِلُوْنِيْ اِلٰى اٰلِهَتِكُمْ فَلَمْ يَجِبُوْا لَهٗ اِلٰهًا غَيْرَ اللَّهِ فَذَكَرَ اٰلِهَتَهُمْ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحْسِنًا  
 عرب کے پاس اپنے شرک پر سوائے اپنے باپ دادوں کی رسوم کے کوئی دلیل نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ واضح عقلی اور نقلی دلائل کی موجودگی میں محض باپ دادوں کی تقلید پر اصرار کرنا حق و انصاف سے کس قدر بعید ہے۔ اب ان آیات میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اگر اپنے آباء و اجداد ہی کے رستے پر چلنا چاہتے ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رستے پر کیوں نہیں چلتے جو تمھارے اشرف ترین جدِ اعلیٰ ہیں اور جن کیساتھ نسی و ابستگی کو تم خود اپنے لئے سرمایہ فخر سمجھتے ہو۔ وہ نہ صرف توحید کے قائل تھے اور اپنی اولاد کو بھی اسی وصیت کر کے گئے بلکہ خود اُن کا طرز عمل یہ بتاتا ہے کہ کھلے ہوئے عقلی اور نقلی دلائل کی موجودگی میں محض باپ دادوں کی تقلید کرنا جائز نہیں، جب وہ دنیا میں مبعوث ہوئے تو اُن کی ساری قوم اپنے آباء و اجداد کی اتباع میں شرک میں مبتلا تھی، لیکن انھوں نے اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید کے بجائے دلائل واضحہ کا اتباع کرتے ہوئے اپنی قوم سے بیزاری کا اظہار کیا اور فرمایا اِنِّیْۤ اِبْرَآءُۤ اِمَّا تَعْبُدُوْنَ (جن چیزوں کی عبادت تم کرتے ہو میں اُن سے بری ہوں)۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی بد عمل یا بد عقیدہ گروہ یا جماعت کے درمیان رہتا ہے اور خاموش رہنے کی صورتیں یہ اندیشہ ہے کہ اس کو بھی اس گروہ کا ہم خیال سمجھا جائیگا تو محض اپنے

عقیدے اور عمل کا درست کر لینا ہی کافی نہیں، بلکہ اس گروہ کے عقائد و اعمال سے اپنی برائت کا اظہار بھی ضروری ہے۔ چنانچہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اپنے عقائد و اعمال کو مشرکین سے عملاً ممتاز کر لیا بلکہ زبان سے بھی برائت کا برملا اظہار فرمایا۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِيْدَةٍ (اور وہ اس کو اپنی اولاد میں ایک قائم رہنے والی بات کر گئے) مطلب یہ ہے کہ اپنے عقیدہ توحید کو انھوں نے اپنی ذات ہی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اپنی اولاد کو بھی اسی عقیدے پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی۔ چنانچہ آپ کی اولاد میں ایک بڑی تعداد موحدین کی ہوئی اور خود مکہ مکرمہ اور اسکے گرد و نواح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تک ایسے سلیم الفطرت حضرات موجود تھے جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصلی دین ہی پر قائم رہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی ذات کے علاوہ اپنی اولاد کو دین صحیح پر کاربند کرنے اور رکھنے کی فکر بھی انسان کے فرائض میں داخل ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں بھی قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انھوں نے وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو دین صحیح پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی لہذا جس صورت سے ممکن ہو اولاد کے اعمال و اخلاق کی اصلاح میں اپنی پوری کوشش صرف کر دینا ضروری بھی ہے اور انبیاء کی سنت بھی۔ اور یوں تو اولاد کی اصلاح کے بہت سے طریقے ہیں جنہیں حسب موقع اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن حضرت شیخ عبد الوہاب شمرانی رحمۃ اللہ علیہ نے لطائف المنن والاخلاق میں لکھا ہے کہ اولاد کی اصلاح کے لئے سب سے زیادہ کارگر عمل یہ ہے کہ والدین ان کی دینی اصلاح کے لئے دعا کا اہتمام کریں۔ افسوس ہے کہ اس آسان تدبیر سے آجکل غفلت عام ہوتی جا رہی ہے اور اس کے انجام بد کا مشاہدہ خود والدین کرتے رہتے ہیں۔

وَقَالُوا لَا تَزَلْ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرِيْبَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۳۱)

اور کہتے ہیں کیوں نہ اُترا یہ قرآن کسی بڑے مرد پر ان دونوں بستیوں میں سے

اَمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي

کیا وہ بانٹتے ہیں تیرے رب کی رحمت کو ہم نے بانٹ دی ہے اُن میں روزی اُن کی

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ

دنیا کی زندگی میں اور بلند کر دیئے درجے بعض کے بعض پر کہ ٹھہراتا ہے

بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرَ لَّكَ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۳۲)

ایک دوسرے کو خدمتگار اور تیرے رب کی رحمت بہتر ہے اُن چیزوں سے جو سمیٹتے ہیں



## خلاصہ تفسیر

(یہ تو کافروں نے قرآن کے بارے میں کہا) اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں) کہنے لگے کہ یہ قرآن (اگر کلام الہی ہے اور بحیثیت رسالت آیا ہے تو) ان دونوں سببیوں (یعنی مکہ اور طائف کے رہنے والوں) میں کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا (یعنی رسول کیلئے عظیم الشان ہونا ضروری ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال اور ریاست نہیں رکھتے تو یہ پیغمبر نہیں ہو سکتے۔ باری تعالیٰ انکے اس شبہ کی تردید فرماتے ہیں کہ) کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) کو (خود) تقسیم کرنا چاہتے ہیں (یعنی یہ چاہنا کہ نبوت ہماری رائے کے مطابق لوگوں کو ملنی چاہیے گویا خود تقسیم کر کے ہوس کرنا ہے کہ تقسیم ہمارے سپرد ہو حالانکہ یہ ہوس نری نادانی ہے کیونکہ) دنیوی زندگی میں (تو) انکی روزی ہم (ہی) نے تقسیم کر رکھی ہے اور (اس تقسیم میں) ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے تاکہ (اس سے مصلحت حاصل ہو کہ) ایک دوسرے سے کام لیتا رہے (اور عالم کا انتظام قائم رہے) اور (ظاہر اور یقینی بات ہے کہ) آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) بدرجہا اس (دنیوی مال و متاع اور جاہ و منصب) سے بہتر ہے جس کو یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں (پس جب دنیوی معیشت کی تقسیم ہونے ان کی رائے پر نہیں رکھی، حالانکہ وہ ادنیٰ درجہ کی چیز ہے، تو نبوت جو خود بھی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے اور اسکے مصالح بھی نہایت عظیم درجہ کے ہیں وہ کیونکر ان کی رائے پر تقسیم کی جاتی)۔

## معارف و مسائل

ان آیات میں باری تعالیٰ نے مشرکین عرب کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کیا کرتے تھے۔ دراصل شرعاً میں تو وہ یہ باور کرنے پر ہی تیار نہ تھے کہ اللہ کا کوئی رسول انسان ہو سکتا ہے، چنانچہ ان کا یہ اعتراض قرآن کریم نے جا بجا ذکر فرمایا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم رسول کیسے مان لیں جبکہ وہ عام افسانوں کی طرح کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے ہیں، لیکن جب متعدد آیات قرآنی کے ذریعہ یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خصوصیت نہیں، بلکہ دنیا میں جبکہ راہبیا آئے ہیں وہ سب انسان ہی تھے، تو اب انھوں نے پینترا بد لکر یہ اعتراض کیا کہ اگر کسی انسان ہی کو نبوت سونپنی تھی تو حضور مالی اعتبار سے کوئی بڑے صاحب حیثیت نہیں ہیں، یہ منصب حضور کے بجائے مکہ اور طائف کے کسی بڑے دولتمند اور صاحب چاہ و منصب انسان کو کیوں نہیں دیا گیا؟ روایات میں ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے مکہ مکرمہ سے ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کے اور طائف سے عروہ بن مسعود ثقفی حبیب بن عمر ثقفی یا کنانہ بن عبد یالیل کے نام پیش کئے تھے (روح المعانی)

شرکین کے اس اعتراض کے باری تعالیٰ نے دو جواب دیئے ہیں۔ پہلا جواب مذکورہ آیتوں سے دوسری آیت میں اور دوسرا جواب اگلی آیات میں دیا گیا ہے اسکی تشریح بھی وہیں آئے گی۔ اس پہلے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں اس معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نبوت کا منصب کس کو دے رہا ہے اور کس کو نہیں دے رہا؟ نبوت کی تقسیم تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے کہ کسی کو نبی بنانے سے پہلے تم سے رائے لی جائے، یہ کام کلیۃً اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہی اپنی عظیم مصلحتوں کے مطابق اسے انجام دیتا ہے۔ تمہارا وجود اور عقل و شعور اس عظیم کام کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا کہ تقسیم نبوت کا کام تمہارے سپرد کر دیا جاتا اور نبوت کی تقسیم تو بہت اونچے درجہ کی چیز ہے تمہاری حیثیت وجود و شعور تو اسکی بھی متحمل نہیں کہ خود تمہاری معیشت اور سامان معیشت کی تقسیم کا کام تمہارے سپرد کیا جاسکے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا کیا گیا تو تم ایک دن بھی نظام عالم کو نہ چلا سکو اور سارا نظام درجہ پر ہم ہو کر رہ جائیگا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی میں تمہاری روزی کی تقسیم بھی تمہارے ذمہ نہیں رکھی بلکہ تقسیم معیشت کا کام خود اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ جب یہ ادنیٰ درجہ کا کام تمہارے حوالہ نہیں کیا جاسکتا تو نبوت کی تقسیم جیسا عظیم کام تمہارے حوالہ کیسے کر دیا جائے۔ آیات کا مقصد و کلام تو اتنا ہی ہے لیکن شرکین کو جواب دینے کے ضمن میں باری تعالیٰ نے دنیا کے نظام معیشت سے متعلق جو اشارے کر دیئے ہیں ان سے متعدد معاشی اصول مستنبط ہوتے ہیں یہاں انکی مختصر توضیح ضروری ہے۔

تقسیم معیشت کا قدرتی نظام | اِنَّهُمْ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ (ہم نے تقسیم کیا ہے انکے درمیان انکی معیشت کو) مقصد یہ ہے کہ ہم نے اپنی حکمت بالغہ سے دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ یہاں ہر شخص اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسرے کی امداد کا محتاج ہو اور تمام لوگ اسی باہمی احتیاج کے رشتے میں بندھے ہوئے پورے معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کر رہے ہیں۔ اس آیت نے کھول کر یہ بات بتلا دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تقسیم معیشت کا کام (اشتراکیت کی طرح) کسی یا اختیار انسانی ادارے کے سپرد نہیں کیا جو منصوبہ بندی کے ذریعہ یہ طے کرے کہ معاشرے کی ضروریات کیا ہیں؟ انہیں کس طرح پورا کیا جائے وسائل پیداوار کو کس تناسب کیساتھ کن کاموں میں لگایا جائے اور ان کے درمیان آمدنی کی تقسیم کس بنیاد پر کی جائے؟ اسے بجائے یہ تمام کام اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں اور اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص کو دوسرے کا محتاج بنا کر دنیا کا نظام ہی ایسا بنادیا ہے جس میں اگر (اجارہ داروں وغیرہ کے ذریعہ) غیر فطری رکاوٹیں پیدا نہ کی جائیں تو وہ نظام خود بخود یہ تمام مسائل حل کر دیتا ہے۔ باہمی احتیاج کے اس نظام کو موجودہ معاشی اصطلاح میں ”طلب رسد“ کا نظام کہا جاتا ہے۔

”طلب رسد“ کا قدرتی قانون یہ ہے کہ جس چیز کی رسد کم ہو اور طلب زیادہ اسکی قیمت بڑھتی ہے لہذا وسائل پیداوار اس چیز کی تیاری میں زیادہ نفع دیکھ کر اسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور جب رسد



طلب کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے تو قیمت گھٹ جاتی ہے چنانچہ اس چیز کی مزید تیاری نفع بخش نہیں رہتی اور وسائل پیداوار کے بجائے کسی اور ایسے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں جی ضرورت زیادہ ہو۔ اسلام نے طلب رسد کی انہی قدرتی قوتوں کے ذریعہ دولت کی پیدائش اور تقسیم کا کام لیا ہے اور عام حالات میں تقسیم معیشت کا کام کسی انسانی ادارے کے حوالہ نہیں کیا اسکی وجہ یہ ہے کہ منصوبہ بندی کے خواہ کتنے ترقی یافتہ طریقے دریافت کر لئے جائیں لیکن ان کے ذریعہ معیشت کی ایک ایک جزوی ضرورت کا احاطہ ممکن نہیں اور اس قسم کے معاشرتی مسائل عموماً ایسے ہی قدرتی نظام کے تابع چلتے ہیں۔ زندگی کے بیشتر معاشرتی مسائل اسی طرح قدرتی طور پر خود بخود طے پاتے ہیں، اور انہیں حکومت کی منصوبہ بندی کے حوالہ کرنا زندگی میں ایک مصنوعی جکڑ بند پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ دن کا وقت کام کے لئے ہے اور رات کا سونے کے لئے کسی معاہدہ عمرانی یا انسانی منصوبہ بندی کے تحت نہیں طے پائی، بلکہ قدرت کے خود کار نظام نے خود بخود یہ فیصلہ کر دیا ہے، اسی طرح یہ مسئلہ کہ کون شخص کس سے شادی کرے طبعی مناسبتوں کے فطری نظام کے تحت خود بخود انجام پاتا ہے اور اسے منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ یا مثلاً یہ بات کہ کون شخص علم و فن کے کس شعبہ کو اپنا میدان بنائے، اسے طبعی ذوق اور مناسبت کے بجائے حکومت کی منصوبہ بندی کے حوالہ کر دینا ایک خواہ مخواہ کی زبردستی ہے اور اس سے نظام فطرت درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح نظام معیشت کو بھی قدرت نے اپنے ہاتھ میں کھائے اور شخص کے دل میں وہی کام ڈال دیا ہے جو اسکے لئے زیادہ مناسب ہے اور جسے وہ بہت طریقے سے انجام دے سکتا ہے چنانچہ ہر شخص خواہ وہ ایک خاکروب ہی کیوں نہ ہو اپنے کام پر خوش ہے اور اسی کو اپنے لئے سرمایہ فخر سمجھتا ہے کل حزب بما لہ یتھم فخرچون، البتہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح اسلام نے افراد کو اتنی آزادی نہیں دی کہ وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت سمیٹ کر دوسروں کے لئے رزق کے دروازے بند کر دیں، بلکہ ذرائع آمدنی میں حلال و حرام کی تفریق کر کے سود، سٹہ، قمار اور ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دیدیا ہے پھر جائز آمدنی پر بھی زکوٰۃ، عشر وغیرہ کے واجبات عائد کر کے ان خرابیوں کا انسداد کر دیا، جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں پائی جاتی ہیں اسکے باوجود بھی اگر کبھی اجارہ داری قائم ہو جائیں تو ان کو توڑنے کے لئے حکومت کی مداخلت کو جائز رکھا ہے یہاں اسکی تفصیل کا موقع نہیں، اس موضوع پر احقر کے مستقل رسائل ”مسئلہ سود“ اسلام کا نظام تقسیم دولت اور ”اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات“ ملاحظہ فرمائے جائیں۔

معاشی مساوات کی حقیقت | وَرَقَدْنَا بَعْضَهُمْ قَوْقٍ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ (اور ہم نے ایک کو

دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے) اس سے معلوم ہوا کہ معاشی مساوات (۱) اس معنی میں کہ دنیا کے تمام افراد کی آمدنی بالکل برابر ہو نہ مطلوب ہے نہ ممکن فعل۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے ہر رکن پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں اور کچھ حقوق دیئے ہیں اور دونوں میں اپنی حکمت سے یہ تناسب کھائی کہ جسکے ذمہ جتنے فرائض ہیں اسکے اتنے ہی حقوق ہیں۔ انسان کے علاوہ جتنی مخلوقات ہیں ان کے ذمہ چونکہ فرائض سب سے کم ہیں کہ وہ شرعاً حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے مکلف نہیں ہیں اسلئے ان کے حقوق بھی سب سے کم ہیں چنانچہ انسان کو ان کے معاملہ میں وسیع آزادی عطا کی گئی ہے کہ وہ ان سے چند معمولی سی یا بند یوں کیسا تھ جس طرح چاہے نفع اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ بعض حیوانات کو وہ کاٹ کر کھاتا ہے بعض پر سواری کرتا ہے، بعض مخلوقات کو پامال کرتا ہے مگر اسے ان مخلوقات کی حق تلفی نہیں سمجھا جاتا۔ اسلئے کہ ان مخلوقات پر چونکہ فرائض کم ہیں اسلئے ان کے حقوق بھی بہت کم ہیں۔ پھر کائنات میں سب سے زیادہ فرائض انسان اور جنات پر عائد کئے گئے ہیں کہ وہ اپنے ہر قول و فعل اور ہر نقل و حرکت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہیں اور اگر اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کریں تو آخرت کے عذاب کے مستحق ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ نے انسان اور جنات کو حقوق بھی دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عطا کئے ہیں۔ پھر انسانوں میں بھی یہ لحاظ ہے کہ جس کی ذمہ داری اور فرائض دوسروں سے زیادہ ہیں، اسکے حقوق بھی زائد ہیں۔ انسانوں میں سب سے زیادہ ذمہ داری انبیاء علیہم السلام پر ہوتی ہے، چنانچہ ان کو بہت سے حقوق بھی دوسروں سے زائد عطا کئے گئے ہیں۔

نظام معیشت میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی رعایت رکھی ہے کہ ہر شخص کو اتنے معاشی حقوق دیئے جائیں جتنے فرائض کی ذمہ داری وہ اپنے سر لے، اور ظاہر ہے کہ فرائض میں یکسانیت کا پیدا ہونا بالکل ناممکن اور ان میں تفاوت ناگزیر ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہر شخص کے معاشی وظائف و فرائض دوسروں سے بالکل مساوی ہوں اسلئے کہ معاشی وظائف و فرائض انسانوں کی فطری صلاحیتوں پر موقوف ہیں جنہیں جسمانی طاقت، صحت، دماغی قوت اور عمر، ذہنی معیار، چستی اور پھرتی جیسی چیزیں داخل ہیں اور یہ بات ہر شخص کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے کہ ان اوصاف کے اعتبار سے انسانوں میں یکسانیت اور مساوات پیدا کرنا بڑی سے بڑی ترقی یافتہ اشتراکی حکومت کے بس میں بھی نہیں، جب انسانوں کی صلاحیتوں میں تفاوت ناگزیر ہے تو ان کے فرائض میں بھی لازماً تفاوت ہوگا اور معاشی حقوق چونکہ انہی فرائض پر موقوف ہیں اسلئے معاشی حقوق یعنی آمدنی میں بھی تفاوت ناگزیر ہے کیونکہ اگر سب کی آمدنی بالکل مساوی کر دی جائے اور فرائض میں تفاوت رہے تو اس سے کبھی عدل و انصاف قائم نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ اس صورت میں بعض لوگوں کی آمدنی ان کے فرائض سے زیادہ اور بعض کی ان کے فرائض سے کم ہو جائے گی جو صریح نا انصافی ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ آمدنی میں مکمل مساوات



کسی بھی دور میں قرین انصاف نہیں ہو سکتی لہذا اشتراکیت اپنی ترقی کے انتہائی دور (مکمل کیونترم) میں بھی جس مساوات کا دعویٰ کرتی ہے وہ کسی بھی حال میں نہ قابل عمل ہے اور نہ قرین عدل انصاف۔ البتہ یہ طے کرنا کہ کس کے فرائض زیادہ اور کس کے کم ہیں، اور ان کی مناسبت سے اسے کتنے حقوق ملنے چاہئیں ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے اور انسان کے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے جس سے وہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکے۔ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک ماہر اور تجربہ کار انجینئر نے ایک گھنٹہ میں اتنی آمدنی حاصل کر لی ہے جو ایک غیر ہنرمند مزدور نے دن بھر منوں مٹی ڈھو کر بھی حاصل نہیں کی، لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قطع نظر اس سے کہ مزدور کی دن بھر کی آزاد محنت ذمہ داری کے اُس بوجھ کے برابر نہیں ہو سکتی جو انجینئر نے اٹھارہ گھنٹہ کی یہ آمدنی صرف اُس ایک گھنٹہ کی محنت کا صلہ نہیں بلکہ اسی سالہا سال کی اس دماغ سوزی، ترقی اور جانفشانی کے صلے کا ایک حصہ بھی شامل ہے جو اُسے انجینئرنگ کی تعلیم و تربیت اور پھر اسی تجربہ و مہارت حاصل کرنے میں برداشت کی ہے۔ اشتراکیت نے اپنے ابتدائی دور میں آمدنی کے اس تفاوت کو تسلیم تو کر لیا ہے چنانچہ تمام اشتراکی ممالک میں آبادی کے مختلف طبقات کے درمیان تنخواہوں کا زبردست تفاوت پایا جاتا ہے لیکن ٹھوکر یہاں کھائی ہے کہ تمام وسائل پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دیکر وسائل کے لئے فرائض کا تعین اور پھر ان کی مناسبت سے ان پر آمدنی کی تقسیم بھی تمام تر حکومت ہی کے حوالہ کر دی ہے۔ حالانکہ جیسا اوپر عرض کیا گیا فرائض اور حقوق کے درمیان تناسب باقی رکھنے کے لئے انسان کے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے چنانچہ اشتراکیت کے طریق کار کے تحت ملک بھر کے انسانوں کی روزی کا تعین حکومت کے چند کارندوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے اور انھیں یہ اختیار مل گیا ہے کہ جس شخص کو جتنا چاہیں دیں، جتنا چاہیں روک لیں۔ اول تو اسیں بددیانتیوں اور اقربا و اقاربوں کو ایک بڑا میدان مل جاتا ہے جس کے سہارے افسر شاہی پھلتی پھولتی ہے، دوسرے اگر حکومت کے تمام کارندوں کو فرشتہ بھی تصور کر لیا جائے اور وہ فی الواقعہ یہی چاہیں کہ ملک میں آمدنی کی تقسیم حق و انصاف کی بنیاد پر ہو تو ان کے پاس آخر وہ کونسا پیمانہ ہے جس سے وہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ ایک انجینئر اور ایک مزدور کے فرائض میں کتنا تفاوت ہے اور اس کی نسبت سے ان کی آمدنیوں میں کتنا تفاوت قرین انصاف ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ انسانی عقل کے ادراک سے قطعی ماوراء ہے اسی لئے اسے قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ آیت زیر بحث وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ

۱۔ اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ فی الحال تو آمدنی کی مکمل مساوات ممکن نہیں لیکن اگر اشتراکیت کے ابتدائی ہولوں پر عمل کیا جائے تو ایک وقت ایسا آجائے گا جب آمدنی میں مکمل مساویا مالک میں مکمل اشتراک پیدا ہو جائیگا اور یہ مکمل کیونترم کا دور ہوگا۔





القوی حتی اخذ الحق منه "خدا کی قسم میرے نزدیک ایک کمزور آدمی سے زیادہ قوی کوئی نہیں  
تاہم قہر میں اسکا حق اسنے دلوادوں اور میرے نزدیک ایک قوی آدمی سے زیادہ کمزور کوئی نہیں،  
جب تک کہ میں اس سے (کمزور کا) حق وصول نہ کروں۔"

اسی طرح ٹھیکہ معاشی نقطہ نظر سے اسلامی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں ہر شخص  
کو کمائی کے یکساں مواقع حاصل ہیں اور اسلام اس بات کو گوارہ نہیں کرتا کہ چند بڑے بڑے دو متمثال  
دولت کے دہانوں پر قابض ہو کر اپنی اجارہ داریاں قائم کر لیں اور چھوٹے تاجروں کے لئے بازار میں  
بیٹھنا دو بھر بنادیں۔ چنانچہ سود، سٹہ، قمار، ذخیرہ اندوزی اور اجارہ دارانہ تجارتی معاہدوں کو ممنوع  
قرار دیکر، نیز زکوٰۃ، عشر، خراج، نفقات، صدقات اور دوسرے واجبات عائد کر کے ایسا ماحول پیدا  
کر دیا گیا ہے جس میں ہر انسان اپنی ذاتی صلاحیت، محنت اور سرمایہ کے تناسب سے کمائی کے مناسب  
مواقع حاصل کر سکتا ہے اور اس سے ایک خوشحال معاشرے کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ اسکے باوجود آدمی کا  
جو تفاوت باقی رہے وہ درحقیقت ناگزیر ہے اور جس طرح انسانوں کے درمیان حسن و جمال، قوت  
وصحت، عقل و ذہانت اور آل و اولاد کے تفاوت کو مٹانا ممکن نہیں، اسی طرح اس تفاوت کو  
بھی مٹایا نہیں جاسکتا۔

وَلَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً جَعَلْنَا لِمَنْ يَكْفُرُ بِاللَّهِ حُمْلًا

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ ہو جائیں ایک دین پر تو ہم دیتے اُن لوگوں کو جو منکر ہیں رحمن سے

لِبِئْسَ تَهُمُ سُقْفًا مَنْ فِضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ ﴿٣٣﴾ وَلِبِئْسَ تَهُمُ

اُن کے گھروں کے واسطے چھت چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر چڑھیں اور اُن کے گھروں کے

أَبْوَابًا وَسُرًّا عَلَيْهَا يَتَكُونُونَ ﴿٣٤﴾ وَخُرُفًا وَإِنْ كُلُّ ذَلِكَ لَمَّا

واسطے دروازے اور تخت جن پر تنگیہ لگا کر بیٹھیں اور سونے کے اور یہ سب کچھ نہیں ہے مگر

مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٣٥﴾

دنیا کی زندگی کا، اور آخرت تیرے رب کے یہاں اُنہی کے لئے ہے جو ڈرتے ہیں

## خلاصہ تفسیر

د اور یہ کافر لوگ مال و دولت کی زیادتی کو نبوت کی صلاحیت کی شرط سمجھتے ہیں حالانکہ نبوت  
ایک عظیم الشان چیز ہے اس لئے اس کی صلاحیت کی شرط بھی عظیم الشان ہونی چاہیے اور  
(دنیا کی دولت و جاہ ہمارے نزدیک اس قدر حقیر ہے کہ) اگر یہ بات (متوقع) نہ ہوتی کہ (قریب

قریب) تمام آدمی ایک ہی طریقہ کے ہو جاویں گے (یعنی کافر ہو جائیں گے) تو جو لوگ خدا کیساتھ کھرتے ہیں (اور خدا کے نزدیک سخت میغوض ہیں) ہم ان (سب) کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی (چاندی کے کر دیتے) جن پر چڑھا (اُترا) کرتے اور ان کے گھروں کے کواڑ بھی (چاندی کے کر دیتے) اور تخت بھی (چاندی کے کر دیتے) جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں اور (یہی چیزیں) سونے کی بھی (کر دیتے) یعنی کچھ چاندی کی کچھ سونے کی۔ مگر یہ سامان سب کفار کو اس لئے نہیں دیا کہ اکثر انسانوں کی طبیعت میں مال و متاع کی حرص غالب ہے اور اس مفروضہ صورت میں کفر اس مال و متاع کے حصول کا یقینی سبب بن جاتا، پس چند تھوڑے سے آدمیوں کو چھوڑ کر قریب قریب بھی کفر اختیار کر لیتے، اس لئے ہم نے تمام کافروں کو مال و دولت کی یہ وسعت نہیں دی، ورنہ اگر یہ مصلحت نہ ہوتی تو ہم ایسا ہی کرتے اور ظاہر ہے کہ دشمن کو قدر و وسعت کی چیز نہیں دیا کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی مال و متاع حقیقت میں کوئی عظیم الشان چیز نہیں، پس وہ نبوت جیسے منصبِ عظیم کے لئے صلاحیت کی شرط بھی نہیں ہوتی سکے بجائے نبوت کی شرط وہ اعلیٰ درجہ کے ملکات ہیں جو اللہ کی طرف سے انبیاء کو عطا ہوتے ہیں اور یہ ملکات محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پوری طرح جمع ہیں، پس نبوت ان ہی کے لئے زیبا تھی نہ کہ مکہ اور مکہ کے رسیوں کے لئے) اور (حقارتِ دنیا کی ایک بالکل ظاہر وجہ بیان فرماتے ہیں کہ) یہ سب (ساز و سامان جسکا اوپر ذکر ہوا) کچھ بھی نہیں، صرف دنیوی زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے (پھر فنا، آفرینا) اور آخرت (جو ابدی ہے اور اس لئے اس سے بہتر ہے وہ) آپ کے پروردگار کے ہاں خدا ترسوں کے لئے ہے۔

## معارف و مسائل

مالِ دولت کی زیادتی فضیلت کا سبب نہیں ہے [کفار نے جو یہ کہا تھا کہ مکہ اور طائف کے کسی بڑے مالدار کو نبی کیوں نہ بنا دیا گیا؟ ان آیات میں اسکا دوسرا جواب دیا گیا ہے اور اسکا خلاصہ یہ ہے کہ بیشک نبوت کے لئے کچھ شرائطِ صلاحیت کا پایا جانا ضروری ہے لیکن مال و دولت کی زیادتی کی بنا پر کسی کو نبوت نہیں دیا جاتا، کیونکہ مال و دولت ہماری نگاہ میں اتنی حقیر چیز ہے کہ اگر تمام لوگوں کے کافر بن جائیں گے اندیشہ نہوتا تو ہم سب کافروں پر سونے چاندی کی بارش کر دیتے اور صحیح تہذیب کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لو کان اللہ تعالیٰ تعدل عند اللہ جنتہ بعوضۃ ماسقی کافراً منھا شرب ماء (یعنی اگر دنیا اللہ کے نزدیک پھر کے ایک پر کے برابر بھی درجہ رکھتی تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو اس سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیتا) اس سے معلوم ہوا کہ نہ مال و دولت کی زیادتی کوئی فضیلت کی چیز ہے نہ اس کی کمی انسان کے کم رتبہ ہونے کی علامت ہے۔ البتہ نبوت کے لئے کچھ اعلیٰ درجہ کے اوصاف ضروری ہیں وہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، اسلئے یہ اعتراض بالکل لغو اور باطل ہے۔



اور مذکورہ آیات میں یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر کافروں پر مال و دولت کی اتنی فراوانی کر دی جاتی تو سب لوگ کافر ہو جاتے، اس میں مراد لوگوں کی بھاری اکثریت ہے ورنہ اللہ کے کچھ نیک بندے آج بھی ایسے موجود ہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ کفر اختیار کر کے وہ مال و دولت سے نہال ہو سکتے ہیں، لیکن وہ مال و دولت کی خاطر کفر کو اختیار نہیں کرتے ایسے کچھ لوگ شاید اُس وقت بھی ایمان پر قائم رہ جاتے لیکن اُن کی تعداد اُٹے میں نمک کے برابر ہوتی۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقِيضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ﴿۳۶﴾

اور جو کوئی آنکھیں پُرائے رحمن کی یاد سے ہم اس پر مقرر کر دیں ایک شیطان پھر وہ رہے اسکا ساتھی

وَأَنَّهُمْ لَيَصَدُّونَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ﴿۳۷﴾

اور وہ اُن کو روکتے رہتے ہیں راہ سے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہ پر ہیں

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ يَلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ ﴿۳۸﴾

یہاں تک کہ جب آئے ہمارے پاس کہے کسی طرح مجھ میں اور تجھ میں فرق ہو مشرق مغرب کا سا

فَبُئْسَ الْقَرِينُ ﴿۳۹﴾ وَلَنْ يَنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ إِذْ ظَلَمْتُمْ أَنَّكُمْ

کہ کیا بُرا ساتھی ہے اور کچھ فائدہ نہیں تم کو آج کے دن جبکہ تم ظالم ٹھہریکے اس بات سے

فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿۴۰﴾ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ أَوْ تَهْدِي

کہ تم عذاب میں شامل ہو سو کیا تو سُنائے گا بہروں کو یا سمجھائے گا

الْعُمَىٰ وَمَنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۴۱﴾ قَائِمًا نَذْهَبُ بِكَ

اندھوں کو اور صریح غلطی میں بھٹکتوں کو پھر اگر کبھی ہم تجھ کو یہاں سے

قَائِمًا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُونَ ﴿۴۲﴾ أَوْ تُرِيدُكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا

لے جائیں تو ہم کو اُن سے بدلہ لینا ہے یا تجھ کو دکھا دیں جو اُن سے وعدہ ٹھہرایا ہے تو یہ

عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُونَ ﴿۴۳﴾ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ

ہمارے بس میں ہیں سو تو مضبوط پکڑے وہ اُسی کو جو تجھ کو حکم پہنچا

إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۴۴﴾ وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ

تو ہے بیشک سیدھی راہ پر اور یہ مذکور رہے گا تیرا اور تیری قوم کا اور آگے تم سے

تُسْأَلُونَ ﴿۴۵﴾ وَسَأَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا

پوچھ ہوگی اور پوچھ دیکھ جو رسول بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے کبھی ہم نے رکھے ہیں

مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ إِلَهًا يَعْبُدُونَ ﴿۴۶﴾

رحمن کے سوائے اور حاکم کہ پوچھے جائیں

## خلاصہ تفسیر

اور جو شخص اللہ کی نصیحت (یعنی قرآن اور وحی) سے (جان بوجھ کر) اندھا بن جائے (جیسے یہ کفار ہیں کہ کافی شافی دلائل کہہ رہے ہوتے ہوئے تجاہل سے کام لیتے ہیں) ہم اُس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، سو وہ (ہر وقت) اس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ (ساتھ رہنے والے شیاطین) ان (قرآن سے اعراض کرنے والوں) کو (برابر) راہِ حق سے رکتے رہتے ہیں (اور قسط کا یہی اثر ہے) اور یہ لوگ (باوجود راہِ حق سے دُور ہونے کے) یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ہم) راہِ (راست) پر ہیں (سو جس کی گمراہی کی یہ صورت اور یہ حالت ہوا کے راہ پر آنے کی کیا امید ہے۔ سو غم کیوں کیا جائے اور یہ بھی تسلی رکھے کہ ان کا یہ تغافل جلدی ہی ختم ہو گا اور جلدی ہی ان کو اپنی غلطی ظاہر ہو جائے گی کیونکہ یہ تغافل صرف دُنیا ہی دُنیا تک ہے) یہاں تک کہ جب ایسا شخص ہمارا پاس آدینگا (اور اس کی غلطی ظاہر ہوگی) تو (اُس شیطان قرین سے) کہے گا کہ کاش میرے اور تیرے درمیان میں (دُنیا میں) مشرق و مغرب کے برابر فاصلہ ہوتا (کیوں) کہ تو تو (بُرا) ساتھی تھا (کہ تو نے مجھ کو گمراہ کیا، مگر حیرت اُس وقت کام نہ آئے گی) اور (نیز ان سے کہا جائیگا کہ) جبکہ تم (دُنیا میں) کفر کر چکے تھے تو (جس طرح آج حسرت تمہارے کام نہیں آئی اُسی طرح) آج یہ بات (بھی) تمہارے کام نہ آو گی کہ تم (اور شیاطین) سب عذاب میں شریک ہو (جیسے دُنیا میں بعض اوقات دوسرے کو شریک مصیبت دیکھ کر ایک گونہ تسلی ہو جاتی ہے وہاں چونکہ عذاب بہت زیادہ شدید ہو گا اسلئے دوسرے کی طرف التفات بھی نہ ہو گا، ہر شخص اپنے حال میں مبتلا ہو گا اور اپنے ہی کو سب سے زیادہ مبتلا سمجھے گا) سو (آپ کو جب انکی یہ حالت معلوم ہو گئی کہ انکی ہدایت کی کوئی اُمید نہیں تو) کیا آپ (ایسے) بہروں کو سنا سکتے ہیں یا (ایسے) اندھوں کو اور ان لوگوں کو جو کہ صریح گمراہی میں (مبتلا) ہیں راہ پر لا سکتے ہیں (یعنی انکی ہدایت آپ کے اختیار سے خارج ہے آپ درپے نہیں) پھر (انکی یہ سرکشی ظاہر جانے والی نہیں، بلکہ اس پر ضرور سزا مرتب ہوئی ہے خواہ آپکی حیات میں ہو خواہ آپکی وفات کے بعد ہو، پس) اگر ہم (دُنیا سے) آپ کو اٹھا لیں تو بھی ہم ان (کافروں) سے بدلہ لینے والے ہیں یا اگر ان سے جو ہم نے عذاب کا وعدہ کر رکھا ہے وہ (آپ کی حیات میں ان پر نازل کر کے) آپ کو (بھی) دکھلا دیں تب بھی (کچھ بعید نہیں کیونکہ) ہم کو ان پر ہر طرح کی قدرت ہے (مطلب یہ کہ عذاب ضرور ہو گا خواہ کب ہی ہو اور جب یہ باتیں تو آپ تسلی رکھئے اور اطمینان سے) اُس قرآن پر قائم رہئے جو آپ پر وحی کے ذریعہ سے نازل کیا گیا ہے (کیونکہ) آپ بیشک سیدھے رستہ پر ہیں (مطلب یہ کہ اپنا کام کئے جائیے اور دوسروں کے کام کا غم نہ کیجئے) اور یہ قرآن (جس پر قائم رہنے کو ہم کہتے ہیں) آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے بڑے شرف کی چیز ہے (آپ کے لئے تو اس لئے کہ آپ بلا واسطہ مخاطب ہیں اور قوم کے لئے اس واسطے کہ وہ بالواسطہ مخاطب ہیں و عام بادشاہوں سے ہم کلامی بڑا شرف سمجھی جاتی ہے چہ جائیکہ ملک الملک کا مخاطب



بننا) اور عنقریب (قیامت کے دن) تم سب (اپنے اپنے ذمہ کے واجب حقوق سے) پوچھے جاؤ گے، (پس آپ سے صرف تبلیغ کے متعلق سوال ہوگا جس کو آپ خوب ادا کر چکے ہیں اور عمل کے متعلق اُن سے سوال ہوگا، پس جب آپ سے ان کے اعمال کے بارے میں باز پرس نہ ہوگی تو آپ غم کیوں کرتے ہیں) اور (ہمنے جو آپ پر نازل ہونے والی وحی کو حق قرار دیا ہے اس میں کفار کو سب سے بڑا اعتراض عقیدہ توحید پر ہے جس کے حق ہونے میں ان کو بڑا کلام ہے، سو درحقیقت وہ ایسا امر حق ہے کہ اس پر تمام انبیاء علیہم السلام کا اجماع ہے اور چونکہ انبیاء عقلی و نقلی دلائل کے جامع ہیں اسلئے گویا اُس پر ہزاروں عقلی و نقلی دلائل قائم ہیں، چنانچہ اگر آپ کا جی چاہے تو آپ اُن سب پیغمبروں سے جن کو ہمنے آپ سے پہلے بھیجا ہے پوچھ لیجئے (یعنی اُن کی کتابوں اور صحیفوں سے جنکا کچھ بقیہ موجود ہے، تحقیق کر لیجئے) کہ کیا ہم نے خدائے رحمان کے سوا (کبھی بھی) دوسرے معبود ٹھہرا دیئے تھے کہ ان کی عبادت کیجاوے (اس سے دوسرے کو سنانا منظور ہے کہ جس کا جی چاہے تحقیق کر لے اور کتابوں میں دیکھنے کو رسولوں سے پوچھنا مجاز اکھدیا)

## معارف و مسائل

یا دِخدا سے اعراض بڑی صحبت کا سبب ہے | وَمَنْ يَغْتَسِمْ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ اِنَّهُ مُطْلَبٌ بِهٖ بِمَا كَفَرَ بِشَيْءٍ  
اللہ کی نصیحت یعنی قرآن اور وحی سے جان بوجھ کر اعراض کرے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو دنیا میں بھی اسکے ساتھ لگا رہتا ہے اور اسے نیکیوں سے روک کر بُرائیوں پر ابھارتا رہتا ہے اور آخرت میں بھی جب یہ شخص قبر سے اٹھے گا تو یہ شیطان اس کے ساتھ ساتھ ہوگا یہاں تک کہ دونوں جہنم میں داخل ہو جائیں (قرطبی) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی یاد سے اعراض کی اتنی سزا دینا ہی میں مل جاتی ہے کہ انسان کی صحبت خراب ہو جاتی ہے اور شیاطین، خواہ انسانوں میں سے ہوں یا جنات میں سے، اس کو بھلائیوں سے دور اور برائیوں سے قریب کرتے رہتے ہیں وہ کام سارے گمراہی کے کرتا ہے مگر سمجھتا یہ ہے کہ بہت اچھا کر رہا ہے (قرطبی) اور یہاں جس شیطان کو مسلط کرنے کا ذکر ہے وہ اس شیطان کے علاوہ ہے جو ہر مومن و کافر کے ساتھ لگایا گیا ہے کیونکہ وہ مومن سے خاص اوقات میں ہٹ بھی جاتا، اور یہ ہمیشہ ساتھ لگا رہے گا (بیان القرآن)

وَلَنْ يَنْفَعَكُمْ الْيَوْمَ اِنَّ اس آیت کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ جب تمہارا کفر و شرک ثابت ہو چکا ہے تو آخرت میں تمہاری یہ تمنا کچھ کام نہ آئے گی کہ کاش، یہ شیطان مجھ سے دور ہوتا کیونکہ اس وقت تم سب عذاب میں شریک ہو گے اس صورت میں اِنْتُمْ فِي الْعَذَابِ اِنَّ لَاسَ لَكُمْ مَعْنٰی میں ہوگا اور نفع کی ضمیر فاعل مقولہ یا لَیْتَ بَیِّنِیْ اِلَہ کی طرف راجع ہوگی۔  
اور دوسری تفسیر یہ ممکن ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد تمہارا اور شیاطین کا عذاب میں شریک

ہونا تمہارے لئے چنداں فائدہ مند نہیں ہوگا۔ دنیا میں بیشک ایسا ہوتا ہے کہ ایک مصیبت میں چند آدمی شریک ہو جائیں تو ہر ایک کا غم بکسا ہو جاتا ہے لیکن وہاں چونکہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی اور کوئی کسی کا دکھ نہیں بٹا سکے گا اسلئے اس اشتراک سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، اس صورتیں انکم ہر منفع کا فاعل ہوگا۔

نیک شہرت بھی دین میں پسندیدہ ہے | وَلَا تَكُنْ مِنَ الْكَافِرِينَ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْفٰسِقِیْنَ (اور یہ قرآن آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے بڑے شرف کی چیز ہے) ”ذکر“ سے یہاں مراد نیک ناموری ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم آپ کے اور آپ کی قوم کے لئے شرف عظیم اور نیک شہرت کا باعث ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ نیک شہرت ایک قابل رغبت چیز ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں اسکو ایک احسان کے طور پر ذکر فرمایا ہے اور اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تھی کہ وَجْعَلْنِیْ اِلٰی لِسَانٍ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ (تفسیر کبیر) لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نیک شہرت اسوقت مستحسن ہے جب وہ مقصد زندگی بنائے بغیر انسان کے اعمال صالحہ سے خود بخود حاصل ہو جائے اور اگر انسان نیکیاں صرف اسی مقصد سے کرے کہ ان سے دنیا میں نام ہوگا تو یہ ”ریا“ ہے جس سے نیکیوں کا سارا فائدہ جاتا رہتا ہے اور اٹا گناہ لازم ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں ”آپ کی قوم“ سے مراد بعض مفسرین نے صرف قبیلہ قریش کو قرار دیا ہے اور اس سے قریش کی فضیلت ثابت کی ہے لیکن علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد آپ کی پوری امت ہے خواہ کسی رنگ نسل سے تعلق رکھتی ہو۔ قرآن کریم اُن سب کے لئے عظمت و شرف اور نیک ناموری کا باعث ہے (قرطبی)

وَسَلِّ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا، (آپ ان سب پیغمبروں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے پوچھ لیجئے) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام تو وفات پا چکے، اُن سے پوچھنے کا حکم کیسے دیا جا رہا ہے؟ اسکا جواب بعض مفسرین نے تو یہ دیا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی معجزہ کے طور پر سابقہ انبیاء علیہم السلام سے آپ کی ملاقات کمرادے تو اسوقت اُن سے یہ بات پوچھ لیجئے چنانچہ شب معراج میں آپ کی ملاقات تمام انبیاء سے ہوئی اور علامہ قرطبی نے بعض روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انبیاء علیہم السلام کی امامت کر نیچے بعد اُن سے یہی بات پوچھی تھی لیکن ان روایات کی سند میں معلوم نہیں ہوگی چنانچہ اکثر مفسرین نے آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام سے پوچھنا مراد نہیں بلکہ اُن پر نازل ہوئی اولیٰ صحیفوں سے تحقیق کرنا اور اُن کی امتوں کے علماء سے پوچھنا مراد ہے۔ چنانچہ انبیاء بنی اسرائیل کے جو صحیفے اب موجود ہیں ان میں بہت سی تحریفات کے باوجود توحید کی تعلیم اور شرک سے بیزاری کی تعلیم آج تک شامل ہے مثال کے طور پر موجودہ بائبل کی درج ذیل عبارتیں ملاحظہ فرمائیے۔



انبیاء کے صحیفوں میں توحید کی تعلیم | موجودہ تورات میں ہے :-

”تاکہ توجہ لے کہ خداوند ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی ہے ہی نہیں“ (استثنا ۴: ۳۵)  
 اور، ”سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خدا ہے“ (استثنا ۶: ۴)  
 اور حضرت اشعیا علیہ السلام کے صحیفہ میں ہے :-

”میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں، میرے سوا کوئی خدا نہیں، تاکہ مشرق سے مغرب تک گٹ جان لیں  
 کہ میرے سوا کوئی نہیں، میں ہی خداوند ہوں، میرے سوا کوئی دوسرا نہیں“ (یسعیاہ ۴۵: ۶۵)  
 اور حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول موجودہ انجیلوں میں مذکور ہے :-

”اے اسرائیل، سن! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے  
 دل اور اپنی ساری جان اور اپنی پیاری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ“

(مرقس ۱۲: ۲۹ و متی ۲۲: ۳۶)

منقول ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ مناجات کرتے ہوئے فرمایا :-

”اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدا کے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں“  
 (یوحنا ۱۷: ۳)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس تو کہا میں بھیجا ہوا ہوں

رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۶﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ ﴿۳۷﴾

جہان کے رب کا پھر جب لایا ان کے پاس ہماری نشانیاں وہ تو لگے ان پر ہنسنے

وَمَا نُزِ بِهِمْ مِنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا وَأَخَذْنَاهُمْ بِالْعُنَىٰ

اور جو دکھلاتے گئے ہم ان کو نشانی سو پہلی سے بڑی اور پکڑا ہم نے ان کو تکلیف میں

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۳۸﴾ وَقَالُوا يَا أَيُّهُ السَّحَرَاءُ كُنَّا بَلَدًا بِمَاعَهَدِ

تاکہ وہ باز آئیں اور کہنے لگے اے جادوگر پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو جیسا رکھلا

عِنْدَ لَوْ إِنَّا كَاهِنُونَ ﴿۳۹﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ

رکھا ہے تجھ کو ہم ضرور راہ پر آجائیں گے پھر جب اٹھالی ہم نے ان پر سے تکلیف

إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ﴿۴۰﴾ وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَبْقُوا لِي

تسبی وہ دعدہ توڑ ڈالتے اور پکارا فرعون نے اپنی قوم میں بولا اے میری قوم بھلا میرے

لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي أَفَلَا

ہاتھ میں نہیں حکومت مصر کی اور یہ نہریں چل رہی ہیں میرے محل کے نیچے کیا تم

تَبْصِرُونَ ۵۱) اَمَّا نَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ وَلَا یَکَادُ

نہیں دیکھتے بھلا میں ہوں بہتر اس شخص سے جس کو کچھ عزت نہیں اور صاف نہیں

یُبَیِّنُ ۵۲) فَلَوْ لَا اُلْقِیَ عَلَیْہِ اَسْوَرَةٌ مِّنْ ذَہَبٍ ۙ اَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِکَةُ

بول سکتا پھر کیوں نہ آپڑے اس پر سنگین سونے کے یا آتے اس کے ساتھ فرشتے

مُقْتَرِبِیْنَ ۵۳) فَاسْتَخَفَّ قَوْمُہٗ ۙ فَاطَاعُوْہٗ ۙ اِنَّہُمْ کَانُوْا قَوْمًا

پُر اماندہ کر پھر عقل کھردی اپنی قوم کی، پھر اسی کا کہنا مانا مقرر وہ تھے لوگ

فٰسِقِیْنَ ۵۴) فَلَمَّا اَسْفَوْا نَا اَنْتَقَمْنَا مِنْہُمْ فَاعْرَقْنٰہُمْۙ اَجْمَعِیْنَ ۵۵)

نافرمان پھر جب ہم کو غصہ دلایا تو ہم نے اُن سے بدلہ لیا، پھر ڈبو دیا اُن سب کو

فَجَعَلْنٰہُمْ سَلَکًا وَمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ ۵۶)

پھر کر ڈالا اُن کو گئے گزرے اور ایک نظیر پچھلوں کے واسطے

## خُصْلَۃُ تَفْسِیْرِ

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے دلائل (یعنی معجزات عصا اور ید بیضا) دیکر فرعون کے

اور اسکے امراء کے پاس بھیجا تھا، سوائے انہوں نے (اُن لوگوں کے پاس آکر) فرمایا کہ میں رب العالمین

کی طرف سے (تم لوگوں کی ہدایت کے لئے) پیغمبر (ہو کر آیا) ہوں (مگر فرعون و اہل فرعون نے نہیں مانا)

پھر (ہم نے دوسرے دلائل سزاؤں کے رنگ میں اُن کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ظاہر کئے، یعنی قحط سالیا

وغیرہ مگر اُن لوگوں کی پھر بھی یہ حالت رہی کہ) جب موسیٰ (علیہ السلام) ان کے پاس ہماری (وہ)

نشانی لیکر آئے (جو آیات تسعہ کہلاتی ہیں) تو وہ بیکار اُن (معجزات) پر لگے ہنسنے (کہ یہ کیا اچھے معجزے

ہیں، محض معمولی واقعات و حوادث ہیں کیونکہ قحط وغیرہ ویسے بھی ہو جاتا ہے مگر یہ اُن کی حماقت تھی کیونکہ

دوسرے قرائن سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ واقعات غیر معمولی ہیں اور معجزہ کے طور پر ہو رہے ہیں۔ اسی لئے

انہوں نے ان پر جادو کی تہمت لگائی تھی جیسا کہ سورہ اعراف میں لِسُحْرِیَّانَہَا کے الفاظ اس پر شاہد ہیں)

اور (ان نشانیوں کی کیفیت یہ تھی کہ) ہم ان کو جو نشانی دکھلاتے تھے وہ دوسری نشانی سے بڑھ کر ہوتی

تھی (مطلب یہ کہ نشانیاں بڑی ہی تھیں اور یہ مطلب نہیں کہ ہر نشانی ہر نشانی سے بڑی تھی، یہ ایک محاورہ،

جب کئی چیزوں کا کمال بیان کرنا چاہتے ہیں تو یوں ہی بولتے ہیں کہ ایک سے ایک بڑھ کر۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ

واقعہ بھی ہر انبویٰ نشانیوں پچھلی نشانی سے کچھ فضیلت رکھتی ہو) اور ہم نے (ان نشانیوں کے واقع

کرنے سے) ان لوگوں کو عذاب میں پکڑا تھا تاکہ وہ (اپنے کفر سے) باز آجائیں (یعنی وہ نشانیاں نبوت

کی دلیل بھی تھیں اور اُن کے لئے سزا بھی تھیں مگر وہ لوگ باز نہ آئے، باوجودیکہ ہر نشانی کے تورع



پراسکا چند بار عہد بھی کیا) اور انھوں نے (موسیٰ علیہ السلام سے ہر نشانی پر یہ) کہا کہ اے جادوگر (یہ لفظ حسبِ عادت سابقہ قریبہ حواسی سے اُن کے منہ سے نکل جاتا ہوگا، ورنہ ایسی عاجزانہ درخواست کے موقع پر یہ شرارت کا لفظ بولنا مستبعد معلوم ہوتا ہے) ہر حال مطلب یہ تھا کہ اے موسیٰ (ہمارے لئے اپنے رب سے اُس بات کی دعا کر دیجئے جس کا اُس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے) (اور وہ بات ہے ہمارے باز آجانے پر قہر کا دور کر دینا، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر آپ اس عذاب کو دور کرادیں تو) ہم ضرور راہ پر آجائیں گے، پھر (جب) ہم نے وہ عذاب ان سے ہٹا دیا تب ہی انھوں نے (اپنا) عہد توڑ دیا (ان نو نشانیوں کا بیان سورۃ اعراف میں آچکا ہے) اور فرعون نے (غالباً اس خیال سے کہ کہیں معجزات دیکھ کر عام لوگ مسلمان ہو جائیں) اپنی قوم میں منادی کرائی (اور اُس منادی میں) یہ بات کہی (یعنی کہلوای) کہ اے میری قوم کیا مصر (مع تواب) کی سلطنت میری نہیں ہے اور (دیکھو) یہ نہریں میرے (محل کے) پائیں میں بہہ رہی ہیں کیا تم (یہ چیزیں) دیکھتے نہیں ہو (اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس کچھ بھی سامان نہیں تو بتلاؤ میں افضل اور قابلِ اتباع ہوں یا موسیٰ علیہ السلام) بلکہ میں (ہی) افضل ہوں اس شخص سے (یعنی موسیٰ علیہ السلام سے) جو کہ (باعتبار مال و جاہ کے) کم قدر (آدمی) ہے اور قوتِ بیانیہ بھی نہیں رکھتا (اور اگر یہ شخص اپنے آپ کو پیغمبر بتاتا ہے) تو اسکے (ہاتھوں میں) سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے (جیسے شاہانِ دنیا کی عادت ہے کہ جب کسی پر خاص عنایت کرتے ہیں تو اسکو عام دربار میں سونے کے کنگن پہناتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر اس شخص کو نبوت عطا ہوتی تو خدا کی طرف سے اسکے ہاتھ میں سونے کے کنگن ہوتے) یا فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر آئے ہوتے (جیسا کہ خاص امرا شاہی کا جلوس اسی طرح نکلتا ہے) غرض اُس نے (ایسی باتیں کر کر کے) اپنی قوم کو مغلوب (یعقل) کر دیا اور وہ اسکے کہنے میں آ گئے، (اور) وہ لوگ (کچھ پہلے سے بھی) شرارت کے بھرے تھے (اسوجہ سے فرعون کی باتوں کا اُن پر زیادہ اثر ہوا) پھر جب اُن لوگوں نے (برا بکفر و عناد پر اصرار کر کے) ہم کو غصہ دلایا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور اُن سب کو ڈبو دیا اور ہم نے اُن کو آئندہ آنے والوں کے لئے خاص طور کے متقدمین اور نمونہ (عبرت) بنا دیا (خاص طور کے متقدمین بنانا یہ مطلب یہ ہے کہ لوگ اُن کا قصہ یاد کر کے عبرت دلاتے ہیں کہ دیکھو متقدمین میں ایسے ایسے ہوئے ہیں اور اُن کا ایسا ایسا حال ہوا)۔

## معارف و مسائل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ پیچھے بار بار گزر چکا ہے اور ان آیات میں انکے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ تفصیل کیساتھ سورۃ اعراف میں آئے ہیں، یہاں ان کا واقعہ یاد دلانے سے مقصد یہ ہے کہ کفار کہہ آئیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر آپ کے مالدار نہ ہونے سے جو شبہ کر رہے ہیں یہ کوئی نیا شبہ

نہیں، بلکہ فرعون اور اُس کی قوم نے یہی شبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر کیا تھا۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ میں ملک مصر کا مالک ہوں اور میرے محلات کے نیچے نہریں بہتی ہیں اسلئے میں موسیٰ علیہ السلام سے (معاذ اللہ) افضل ہوں، پھر میرے مقابلے میں انھیں نبوت کیونکر مل سکتی ہے؛ لیکن جس طرح اسکا یہ شبہ اسکے کچھ کام نہ آسکا اور وہ اپنی قوم سمیت غرق ہو کر رہا، اسی طرح نقار مکہ کا یہ اعتراض بھی انھیں دنیا و آخرت کے وبال سے نہ بچا سکے گا۔

وَلَا يَكَاذُ يَبُيِّنُ (اور جو قوت بیانیہ بھی نہیں رکھتا) اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان کی لکنت دور کر دی تھی لیکن فرعون کو ان کا پہلا منظر ہی یاد تھا اس لئے اُس نے حضرت موسیٰ پر یہ عیب لگایا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں ”قوت بیانیہ“ سے مراد زبان کی روانی کے بجائے دلائل کی قوت و وضاحت ہو اور فرعون کا مطلب یہ ہو کہ حضرت موسیٰ کے پاس ایسے کافی دلائل نہیں ہیں جو مجھے مطمئن کر سکیں۔ حالانکہ یہ فرعون کا زرا اٹھام تھا، ورنہ حضرت موسیٰ نے دلائل بڑھانے کے مقابلے میں فرعون کو قطعی لا جواب کر دیا تھا (تفسیر کبیر روح المعانی)

فَاَسْتَحَقَّ قَوْمَهُ، اس کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ فرعون نے اپنی قوم کو آسانی سے اپنا تابع بنالیا (طلب منهم الحق في مطاوعته) اور دوسرے یہ کہ ”اُس نے اپنی قوم کو بیوقوف پایا“ (وجد لهم خفيفة احلامهم) (روح المعانی)

فَلَمَّا أَتَوْا سَفُوحًا، یہ اُسٹے سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی ہیں افسوس، لہذا اس جملے کے لفظی معنی ہوئے ”پس جب انھوں نے ہمیں افسوس دلایا“ اور افسوس بکثرت غصہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے اسکا با محاورہ ترجمہ عموماً اس طرح کیا جاتا ہے کہ ”جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا“ اور چونکہ باری تعالیٰ افسوس اور غصہ کی انفعالی کیفیات سے پاک ہے اسلئے اسکا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے کام ایسے کئے جس سے ہم نے انھیں سزا دینے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ (روح)

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝۵۰

اور جب مثال لائے مریم کے بیٹے کی تبھی قوم تیری اُس سے چلانے لگتے ہیں

وَقَالُوا آءِ إِلَهِنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ

اور کہتے ہیں ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ یہ مثال جو ڈالتے ہیں تجھ پر سو جھگڑنے کو بلکہ یہ لوگ

قَوْمٌ خَصِمُونَ ۝۵۱ إِنَّ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا

ہیں جھگڑالو وہ کیا ہے ایک بندہ ہے کہ ہم نے اس پر فضل کیا اور کھڑا کر دیا اس کو

لِبَنِي إِسْرَءِيلَ ۝۵۲ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي

بنی اسرائیل کے واسطے اور اگر ہم چاہیں نکالیں تم میں سے فرشتے



الْأَرْضِ يَخْلُقُونَ ۖ ۶۰ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ

زمین میں بھاری جگہ اور وہ نشان ہے قیامت کا سو اس میں شک مت کرو اور

اتَّبِعُونَ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۖ ۶۱ وَلَا يَصُدُّكُمْ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ

میرا کہا مانو یہ ایک سیدھی راہ ہے اور نہ روکدے تم کو شیطان وہ تو

لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۖ ۶۲ وَلَمَّا جَاءَ عِيسَى بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ

تمہارا دشمن ہے صریح اور جب آیا عیسیٰ نشانیاں لے کر بولا میں لایا ہوں تمہارے پاس

بِالْحِكْمَةِ وَالْبَيِّنَاتِ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ فَاتَّقُوا اللَّهَ

پکی باتیں اور بتلانے کو بعضی وہ چیز جس میں تم جھگڑتے تھے سو ڈرو اللہ سے

وَأَطِيعُوا ۖ ۶۳ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ

اور میرا کہا مانو بیشک اللہ جو ہے وہی ہے رب ہیرا اور رب تمہارا سو اسی کی بندگی کرو یہ ایک سیدھی

مُسْتَقِيمٌ ۖ ۶۴ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ

راہ ہے پھر پھٹ گئے کتنے فرقے ان کے پیچے سے سو خسرابی ہے

ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ ۖ ۶۵

گنہگاروں کو آفت سے ڈکھ والے دن کی

## خلاصہ تفسیر

(ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ کے سوا جتنوں کی ناحق عبادت کی جاتی ہے ان میں سے کسی میں کوئی خیر نہیں۔ اس پر قریش کے بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ نصرانی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں مگر ان کے بارے میں آپ بھی مانتے ہیں کہ ان میں خیر ہی خیر تھی اسکے جواب میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں) اور جب (عیسیٰ) ابن مریم (علیہ السلام) کے متعلق (ایک معترض کی طرف سے) ایک عجیب مضمون بیان کیا گیا (عجیب اس لئے کہ سرسری نظر ہی سے اس کا بطلان خود ان کو معلوم ہو سکتا تھا، پس عقل رکھ کر ایسا اعتراض کرنا بہت عجیب تھا، غرض جب یہ اعتراض کیا گیا) تو یکایک آپ کی قوم کے لوگ اُس (اعتراض کے سننے) سے (مارے خوشی کے) چلانے لگے اور (اُس معترض کے ساتھ متفق ہو کر) کہنے لگے کہ (بتلائیے آپ کے نزدیک) ہمارے معبود زیادہ بہتر ہیں یا عیسیٰ (علیہ السلام) بہتر ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ عیسیٰ علیہ السلام کو تو یقیناً بہتر سمجھتے ہیں حالانکہ آپ نے جو یہ کہا تھا کہ اللہ کے سوا جتنوں کی ناحق عبادت کی جاتی ہے ان میں کوئی خیر نہیں، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بالکل بھلائی نہ ہو اس سے ایک تو آپ کا یہ قول (معاذ اللہ)

درست نہیں رہا۔ دوسرے معلوم ہوا کہ جن کو آپ خیر کہتے ہیں خود ان کی بھی عبادت ہوئی ہے اس لئے اس سے شرک کی صحت ثابت ہو گئی۔ آگے اس اعتراض کا جواب ہے، پہلے اجمالاً پھر تفصیلاً، اجمالاً تو یہ کہ ان لوگوں نے جو یہ (عجیب اعتراض) آپ سے بیان کیا ہے تو محض جھگڑنے کی غرض سے (نہ کہ طلب حق کے لئے، ورنہ خود ان پر اس اعتراض کی لغویت پوشیدہ نہ رہتی اور ان لوگوں کا جھگڑنا کچھ اسی اعتراض کے ساتھ مخصوص نہیں) بلکہ یہ لوگ (اپنی عادت سے) ہیں ہی جھگڑاؤ (کہ اکثر حق باتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں۔ آگے تفصیلی جواب ہے یعنی) عیسیٰ (علیہ السلام) تو محض ایک ایسے بندے ہیں جن پر ہم نے (مقبولیت اور کمالات نبوت دیکر اپنا) فضل کیا اور ان کو بنی اسرائیل کے لئے (اولاً اور دوسروں کیلئے بھی ثانیاً) ہم نے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنایا تھا (تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ خدا تعالیٰ کو اس طرح بغیر باپ کے پیدا کرنا بھی کچھ مشکل نہیں۔ اس سے ان کے دونوں اعتراضات کا جواب بیکل آیا جسکی تشریح معارف مسائل میں آئیگی) اور (ہم تو اس سے زیادہ عجیب غریب امور پر قادر ہیں، چنانچہ) اگر ہم چاہتے تو ہم تم سے فرشتوں کو پیدا کر دیتے (جس طرح تم سے تمھارے بچے پیدا ہوتے ہیں) کہ وہ زمین پر (افسان کی طرح) یکے بعد دیگرے رہا کرتے (یعنی پیدائش بھی آدمیوں کی طرح ہوتی اور موت بھی۔ پس بغیر باپ کے پیدا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اسکے زیر قدرت نہیں رہے۔ لہذا یہ امر حضرت عیسیٰ کے معبود ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا بلکہ اس طرح پیدا کرنے میں بعض حکمتیں تھیں جنہیں سے ایک تو اوپر بیان ہوئی کہ انھیں اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنانا تھا) اور (دوسری حکمت یہ تھی کہ وہ یعنی عیسیٰ علیہ السلام اس طرح پیدا ہونے میں امکان، قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں) اس طرح کہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے میں اس سے زیادہ اور کیا بعد ہے کہ دوبارہ زندگی خلاف عادت ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے ہونے سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ خلاف عادت امور کے صادر کرنے پر قادر ہے۔ پس اس سے قیامت و آخرت کے عقیدے کا صحیح ہونا ثابت ہو گیا اور جب تم نے عقیدہ آخرت کی یہ دلیل سن لی (تو تم لوگ اس (کی صحت) میں شک مت کرو، اور (توحید اور آخرت وغیرہ عقائد میں) تم لوگ میرا اتباع کرو، یہ (مجموعہ جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں) سیدھا راستہ ہے اور تم کو شیطان (اس راہ پر آنے سے) روکنے نہ پاوے وہ بیشک تمھارا صریح دشمن ہے اور (یہاں تک تو کفار کے مذکورہ اعتراض کا جواب تھا، آگے خود عیسیٰ علیہ السلام کے مضمون دعوت سے توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کی تائید ہے یعنی) جب عیسیٰ (علیہ السلام کھلے کھلے) معجزے لیکر آئے تو انھوں نے (لوگوں سے) کہا کہ میں تمھارے پاس سمجھ کی باتیں لیکر آیا ہوں (تاکہ تمھارے عقائد کی اصلاح کروں) اور تاکہ بعض باتیں (منجملہ اعمال حلال و حرام کے) جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم سے بیان کر دوں (جس سے اختلاف و اشتباہ رفع ہو جاوے، جب میں اس طرح آیا ہوں) تو تم لوگ اللہ سے



ڈرو (اور میری نبوت کا انکار نہ کرو، کیونکہ یہ خدا کی مخالفت ہے) اور میرا کہا مانو (کیونکہ نبوت کی تصدیق کے لئے یہ ضروری ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی کہا کہ) بیشک الشری میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے سو (صرف) اُسی کی عبادت کرو (اور) یہی (توحید) سیدھا راستہ ہے سو (باد جو عیسیٰ علیہ السلام کے اس واشگاف بیان توحید کے پھر بھی) مختلف گروہوں نے (اس بارے میں) باہم اختلاف ڈال لیا (یعنی توحید کے خلاف طرح طرح کے مذاہب ایجاد کر لئے، چنانچہ توحید میں نصاریٰ وغیرہ نصاریٰ کا اختلاف بھی معلوم ہے) سو ان ظالموں (یعنی مشرکین اہل کتاب غیر اہل کتاب) کیلئے ایک پُر درد دن کے عذاب سے بڑی خرابی (ہونیوالی) ہے (پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت سے خود توحید کی تائید ہو گئی لہذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ناحق عبادت سے شرک کی صحت پر استدلال مدعی مست گواہ چست کی مثال ہے)

## معارف و مسائل

وَلَقَدْ ضَرَبَ ابْنُ مَرْجِيٍّ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ، ان آیات کے شان نزول میں مفسرین نے تین روایتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ قریش کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، ”یا معشر قریش لا خیر فی احد یعبد من دون اللہ“ یعنی ”اے قریش کے لوگو! اللہ کے سوا جس کسی کی عبادت کیجاتی ہے اس میں کوئی خیر نہیں“ اس پر مشرکین نے کہا کہ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں لیکن آپ خود مانتے ہیں کہ وہ اللہ کے نیک بندے اور اس کے نبی تھے۔ اُن کے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ (قرطبی) دوسری روایت یہ ہے کہ جب قرآن کریم کی آیت اِنَّا لَنَعْلَمُ مَا تُعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصَبٌ جَعَلَهُمْ بِلَا شَيْءٍ اَوْ شُرَكَاءُ تَمْشُوا تَعْبُدُوهُمْ اور جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے) نازل ہوئی تو اسپر عبد اللہ بن الزبیری نے جو اس وقت کافر تھے، یہ کہا کہ اس آیت کا تو میرے پاس بہترین جواب موجود ہے اور وہ یہ کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں اور یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی، تو کیا یہ دونوں بھی جہنم کا ایندھن بنیں گے؟ یہ بات سن کر قریش کے مشرکین بہت خوش ہوئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ایک تو یہ آیت نازل فرمائی کہ اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنٰی اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ، اور دوسرے سورہ زمر کی مذکورہ بالا آیات (ابن کثیر وغیرہ)

تیسری روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین مکہ نے یہ یہودہ خیال ظاہر کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدائی کا دعویٰ کرنا چاہتے ہیں، ان کی مرضی یہ ہے کہ جس طرح نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو پوجتے ہیں اس طرح ہم بھی ان کی عبادت کیا کریں، اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں۔ اور درحقیقت تینوں آیات میں کوئی تعارض نہیں، کفار نے تینوں ہی باتیں کہی ہونگی جن کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ایسی جامع آیات

نازل فرمادیں جن سے انکے تینوں اعتراضات کا جواب ہو گیا۔ اس آخری اعتراض کا جواب مذکورہ آیات میں بالکل واضح ہے کہ جن لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت شروع کر دی ہے انہوں نے نہ کسی خدائی حکم سے ایسا کیا، نہ خود حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ خواہش تھی اور نہ قرآن اُن کی تائید کرتا ہے انہیں تو حضرت عیسیٰ کے باپ کے بغیر پیدا ہونے سے مغالطہ لگا تھا اور قرآن اس مغالطہ کی تردید کرتا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) عیسائیوں کی دیکھا دیکھی اپنی خدائی کا دعویٰ کر بیٹھیں۔

اور پہلی اور دوسری روایتوں میں کفار کے اعتراض کا حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔ اُن کا جواب مذکورہ آیات سے اس طرح نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا تھا کہ اللہ کے سوا جتنوں کو لوگوں نے معبود بنا رکھا ہے وہ جہنم کا ایندھن ہونگے، یا حضور نے جو فرمایا تھا کہ ان میں خیر نہیں اس سے مراد وہ معبود تھے جو یا تو بے جان ہوں جیسے پتھر کے بت، یا جاندار ہوں مگر خود اپنی عبادت کا حکم دیتے یا اُسے پسند کرتے ہوں جیسے شیاطین، فرعون اور نمرود وغیرہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں جبکہ وہ کسی بھی مرحلہ پر اپنی عبادت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نصاریٰ انکی کسی ہدایت کی بنا پر اُن کی عبادت نہیں کرتے، بلکہ انہیں ہم نے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا کر بغیر باپ کے پیدا کیا تھا تاکہ لوگوں پر یہ صبح ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی تخلیق میں اسباب کے کسی واسطے کی ضرورت نہیں مگر نصاریٰ نے اسکا غلط مطلب لیکر انہیں معبود بنالیا، حالانکہ ان کا یہ معبود بننا عقلاً بھی غلط تھا اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بالکل خلاف تھا۔ کیونکہ انہوں نے ہمیشہ توحید کی تعلیم دی تھی۔ غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی عبادت سے بیزار ہونا اس بات سے مانع ہے کہ انہیں دوسرے باطل معبودوں کی صف میں شامل کیا جائے۔

اس سے کفار کا یہ اعتراض بھی ختم ہو گیا جسکا ذکر خلاصہ تفسیر میں آیا ہے کہ جن کو آپ خود خیر کہتے ہیں (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) ان کی بھی عبادت ہوئی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی عبادت کچھ بُری بات نہیں۔ مذکورہ آیات میں اسکا جواب واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو عبادت ہوئی وہ اللہ کی مرضی کے بھی خلاف تھی اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی۔ لہذا اس سے شرک کی صحت پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

وَكُوْنُوا لِمَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ ۚ لَقَدْ يَمْنُنُ ۚ  
جواب ہے جس کی بنا پر انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود قرار دیا تھا۔ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے اُن کی خدائی پر استدلال کیا تھا۔ باری تعالیٰ ان کی تردید میں فرماتے ہیں کہ یہ تو محض ہماری قدرت کا ایک مظاہرہ تھا، اور ہم تو اس سے بھی بڑھ کر



خلافِ عادت کاموں پر قادر ہیں۔ بغیر باپ کے پیدا ہونا تو کوئی بہت زیادہ خلافِ عادت نہیں، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام تو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے، اگر ہم چاہیں تو ایسا کام بھی کر سکتے ہیں جس کی اب تک کوئی نظیر نہیں اور وہ یہ کہ انسانوں سے فرشتے پیدا کر دیں۔

وَإِنَّكُمْ لَعَلَّكُمْ لِلْسَّاعَةِ (اور بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کا یقین کرنے کے لئے ایک ذریعہ ہیں) اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک وہ جو خلاصہ تفسیر میں بیان ہوئی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خلافِ عادت بغیر باپ کے پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر ظاہری اسباب کے بھی لوگوں کو پیدا کر سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دینا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ آسمان سے نازل ہونا قیامت کی علامت ہے۔ چنانچہ اچکا آخری زمانے میں دوبارہ تشریف لانا اور دجال کو قتل کرنا احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ اس مسئلہ کی کچھ تفصیل سورہ آل عمران میں آیت اِنِّیْ مُتَوَقِّئُکُمْ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ میں ص ۶۹ ج ۱ پر اور کچھ سورہ مائدہ میں ص ۵۹ ج ۳ پر گزر چکی ہے۔ مزید تفصیلاً سہ لے احقر کے سالہ ”النصارى بما تواتر فی نزول مسیح“ اور مسیح موعود کی پہچان ”غیر کی طرف رجوع کیا جائے۔ وَلَا بَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ یُخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ (اور تاکہ میں بیان کروں تم سے بعض وہ باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو) چونکہ بنی اسرائیل میں عناد اور ہٹ دھرمی کا غلبہ تھا اسلئے انھوں نے بعض احکام شرعیہ میں تحریف کر ڈالی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسکی حقیقت واضح فرمادی، اور بعض باتیں اسلئے فرمائی کہ بعض امور خالص دنیوی تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان میں اختلاف رفع کرنے کی ضرورت نہ سمجھی ہوگی (بیان القرآن)

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٦٦﴾

اب یہی ہے کہ راہ دیکھتے ہیں قیامت کی کہ آکھری ہو ان پر اچانک اور ان کو خبر بھی نہ ہو

الْأَخِلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ ﴿٦٧﴾ يَعْبَادُ

جتنے دوست ہیں اُس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر جو لوگ ہیں ڈر والے، اے بند میرے

لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿٦٨﴾ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا

نہ ڈر ہے تم پر آج کے دن اور نہ تم غمگین ہو گے جو یقین لائے ہماری باتوں پر

وَكَاثُوا مُسْلِمِينَ ﴿٦٩﴾ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُخْبَرُونَ ﴿٧٠﴾

اور رہے حکمران چلے جاؤ بہشت میں تم اور تمہاری عورتیں کہ تمہاری عزت کریں

يُطَافُ عَلَيْكُمْ بِصُحَافٍ مِنْ ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ

لئے پھریں گے ان کے پاس رکابیاں سونے کی اور آبخورے اور وہاں ہے جو

اِلَّا نَفْسٌ وَتَكَذُّبُ الْاَعْيُنِ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ﴿٤١﴾ وَتِلْكَ

چاہے اور جس سے آنکھیں آرام پائیں اور تم اُن میں ہمیشہ رہو گے اور یہ وہی

الْجَنَّةُ الَّتِي اُوْرِثْتُمْوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٤٢﴾ لَكُمْ فِيْهَا

بہشت ہے جو میراث پائی تم نے بدلے میں ان کاموں کے جو کرتے تھے تمہارے واسطے انہیں

فَاَكْهَدُ كَثِيْرَةً مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٤٣﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ

بہت میوے ہیں ان میں سے کھاتے رہو البتہ جو لوگ کہ گنہگار ہیں وہ دوزخ کے

جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ ﴿٤٤﴾ لَا يُفْتَرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٤٥﴾

عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں نہ ہلکا ہوتا ہے اُن پر سے اور وہ اسی میں پڑے ہیں آس ٹوٹے

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٦﴾ وَنَادٰوْا اِلٰى مٰلِكٍ

اور ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا لیکن تھے وہی بے انصاف اور پکاریں گے اے مالک

لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۖ قَالَ اِنَّكُمْ مَّا كُنْتُمْ

کہیں ہم پر فیصلہ کر چکے تیرا رب وہ کہے گا تم کو ہمیشہ رہنا ہے

## خلاصہ تفسیر

یہ لوگ (حق واضح ہونے کے باوجود باطل پر اصرار کر رہے ہیں تو) بس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان پر دفعۃً آپڑے اور ان کو خبر بھی نہ ہو (انکار کے باوجود انتظار سے مراد یہ ہے کہ انکا دلائل کو نہ ماننا ایسا ہے جیسے کوئی شخص مشاہدہ کا منتظر ہو کہ جب آنکھوں سے دیکھ لوں گا تب مانوں گا، اور اُس روز قیامت کے واقعات یہ ہیں کہ) تمام (دنیا کے دوست) اُس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جاویں گے، بجز خدا سے ڈرنے والوں (یعنی اہل ایمان) کے (کیونکہ اُس روز باطل کی دوستی کا نقصان محسوس ہوگا تو لا محالہ اُس سے کراہت اور دوستوں سے نفرت ہوگی کہ یہ لوگ نقصان کا سبب ہوئے اور حق کی دوستی کا نفع اور ثواب محسوس ہوگا اس لئے وہ باقی رہے گی۔ اور ان مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بُدا ہوگی) اے میرے بندو تم پر آج کوئی خوف (کی بات واقع ہونے والی) نہیں، اور تم غمگین ہو گے یعنی وہ بندے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے تھے اور (علماً و عملاً ہمارے) فرمانبردار تھے تم اور تمہاری (ایمان دار) بیویاں خوش خوش جنت میں داخل ہو جاؤ (اور جنت میں جانے کے بعد اُن کے لئے یہ ہوگا کہ) اُن کے پاس سونے کی رکابیاں (کھانے کی چیزوں سے بھری ہوئی) اور گلاس (مشروبات سے بھرے ہوئے سونے کے، یا اور کسی چیز کے) لائے جاویں گے (یعنی غلمان لائیں گے) اور وہاں وہ چیزیں ملیں گی جن کو جی چاہے گا اور جن سے آنکھوں کو لذت ہوگی اور (اُن سے کہا جائیگا کہ) تم یہاں ہمیشہ رہو گے



اور (یہ بھی کہا جائے گا کہ) یہ وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنا دیے گئے (تم سے کبھی نہ لیجاوے گی) اپنے (نیک) اعمال کے عوض میں (اور) تمہارے لئے اس میں بہت سے میوے ہیں جن میں سے کھا رہے ہو (یہ تو اہل ایمان کا حال ہوا۔ آگے کفار کا ذکر ہے کہ) بیشک نافرمان (یعنی کافر) لوگ عذابِ زرخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ (عذاب) اُن (پر) سے ہلکا نہ کیا جاوے گا اور وہ اُسی (عذاب) میں مایوس پڑے رہیں گے اور (آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) ہم نے اُن پر (ذرا) ظلم نہیں کیا (کہ ناحق عذاب دیا ہو) لیکن یہ خود ہی ظالم تھے (کہ کفر و شرک کر کے اپنا نقصان کر لیا) اور (آگے اُن کا باقی حال مذکور ہے کہ جب نجات سے بالکل مایوس ہو جائیں گے اُس وقت موت کی تمنا کریں گے اور دوزخ کے داروغہ مالک نامی فرشتہ کو پکارینگے کہ اے مالک (تم ہی دُعا کرو کہ) تمہارا پروردگار (ہم کو موت دیکر) ہمارا کام ہی تمام کر دے وہ (فرشتہ) جواب دیگا کہ تم ہمیشہ اسی حال میں رہو گے (نہ بچلو گے نہ مرو گے)۔

## معارف و مسائل

دوستی در حقیقت وہی ہے جو اللہ کے لئے ہو | اَلَا خَلَقْنَاكُمْ يَوْمَ مِيقَاتِنَا بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِينَ (تمام دوست اُس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے بجز خدا سے ڈرنے والوں کے) اس آیت نے یہ بات کھول کر بتا دی کہ یہ دوستانہ تعلقات جن پر انسان دُنیا میں ناز کرتا ہے اور جن کی خاطر حلالِ حرام ایک کر ڈالتا ہے قیامت کے روز نہ صرف یہ کہ کچھ کام نہ آئیں گی بلکہ عداوت میں تبدیل ہو جائیں گی۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کے تحت حضرت علیؓ کا یہ ارشاد مصنف عبد الرزاقؒ اور ابن ابی حاتمؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ دو دوست مومن تھے اور دو کافر، مومن دوستوں میں سے ایک کا انتقال ہوا اور اُسے جنت کی خوشخبری سنائی گئی تو اُسے اپنا دوست یاد آیا۔ اُس نے دُعا کی کہ یا اللہ! میرا فلاں دوست مجھے آپکی اور آپکے رسولؐ کی اطاعت کی تاکید کرتا، بھلائی کا حکم دیتا اور بُرائی سے روکتا تھا اور یہ یاد دلاتا رہتا تھا کہ مجھے ایک دن آپکے پاس حاضر ہونا ہے، لہذا یا اللہ! اسکو میرے بعد گمراہ نہ کیجئے گا تاکہ وہ بھی (جنت کے) وہ مناظر دیکھ سکے جو آپ نے مجھے دکھائے ہیں، اور آپ جس طرح مجھ سے راضی ہوئے ہیں اُسی طرح اُس سے بھی راضی ہو جائیں۔ اس دُعا کے جواب میں اس سے کہا جائیگا کہ جاؤ، اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں نے تمہارے اُس دوست کے لئے کیا اجر و ثواب رکھا ہے تو تم روؤ کم اور ہنسو زیادہ۔ اسکے بعد جب دوسرے دوست کی وفات ہو چکے گی تو دونوں کی ارواح جمع ہونگی، باری تعالیٰ اُن سے فرمایگا کہ تم میں سے ہر شخص دوسرے کی تعریف کرے، تو اُن میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں یہ کہے گا کہ وہ بہترین بھائی، بہترین ساتھی اور بہترین دوست ہے۔

اس کے برخلاف جب دو کافر دوستوں میں سے ایک کا انتقال ہو گا اور اسے بتایا جائیگا کہ اسکو جہنم میں ڈالا جائے گا تو اُسے بھی اپنا دوست یاد آئے گا اُسوقت وہ یہ دعا کرے گا کہ یا اللہ! میرا فلاں دوست مجھے آپ کی اور آپ کے رسول کی نافرمانی کرنیکا حکم دیتا تھا، بُرائی کی تاکید کرتا اور بھلائی سے روکتا تھا، اور مجھ سے کہا کرتا تھا کہ میں کبھی آپ کے حضور حاضر نہ ہوں گا، لہذا یا اللہ! اس کو میرے بعد ہدایت نہ دیجئے گا، تاکہ وہ بھی (دوزخ کے) وہ مناظر دیکھے جو آپ نے مجھے دکھائے ہیں، اور آپ جس طرح مجھ سے ناراض ہوئے ہیں اُسی طرح اُس سے بھی ناراض ہوں۔ اسکے بعد دوسرے دوست کا بھی انتقال ہو جائیگا تو دونوں کی رُو میں جمع کی جائیں گی اور ان سے کہا جائیگا کہ تم میں سے ہر شخص اپنے ساتھی کی تعریف کرے، تو ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں کہیگا کہ یہ بدترین بھائی بدترین ساتھی اور بدترین دوست ہے۔ (ابن کثیر ص ۱۳۳ ج ۴) اسی لئے دنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے بہترین دوستی وہ ہے جو اللہ کے لئے ہو۔ جن دو مسلمانوں میں صرف اللہ کے لئے محبت ہو ان کے بڑے فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ میدانِ جہنم میں یہ لوگ اللہ کے عرش کے سایہ میں ہونگے۔ اور اللہ کے لئے محبت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے سے اس بنا پر تعلق ہو کہ وہ اللہ کے دین کا سچا پیرو ہے۔ چنانچہ علوم دین کے استاذ، شیخ دُمرشد، علماء اور اہل اللہ سے نیز عالم اسلام کے تمام مسلمانوں سے بے لوث محبت اس میں داخل ہے۔

لَقَدْ جِئْتَكُمْ بِالْحَقِّ وَلَكِنْ أَكْثَرَكُمْ لَذِقُوا كَرَهُونَ ۝۸۹

ہم آئے ہیں تمہارے پاس سچا دین پر تم بہت لوگ سچی بات سے بُرا ماننے ہو کیا

أَبْرَمُوا أَمْرًا فَإِنَّا مُبْرِمُونَ ۝۹۰ أَمْ يَحْسِبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سَرَّهُمْ

انہوں نے ٹھہرائی ہے ایک بات تو ہم بھی کچھ ٹھہرائیں گے کیا خیال رکھتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے اُن کا بھید

وَنَجْوَاهُمْ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَإِيْهِمْ يَكْتُبُونَ ۝۹۱ قُلْ إِن كَانَ لِلرَّحْمَنِ

اور ان کا مشورہ کیوں نہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے رہتے ہیں تو کہہ اگر ہو رحمن کے واسطے

وَلَدٌ فَإِنَّا أَوَّلُ الْعَبِيدِ ۝۹۲ سُبْحَنَ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

اولاد تو ہیں سب سے پہلے بوجوں پاک ذات ہے وہ رب آسمانوں کا اور زمین کا

رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝۹۳ فَذَرُهُمْ يَخْوَضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ

صاحب عرش کا ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں، اب چھوڑ دے ان کو بگ بگ کریں اور کھیلیں یہاں تک کہ

يَلْقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوْعَدُونَ ۝۹۴ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهُ

ملیں اپنے اُس دن سے جس کا اُن کو وعدہ دیا ہے اور وہی ہے جس کی بندگی ہے آسمان میں اور



وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ﴿۸۳﴾ وَتَبَارَكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ

اُس کی بندگی ہے زمین میں اور وہی ہے حکمت والا سب کے خبردار اور بڑی برکت ہے اُس کی جس کا راج ہے

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ

آسمانوں میں اور زمین میں اور جو کچھ انکے پہنچ میں ہے اور اُسی کے پاس ہے خبر قیامت کی اور اُسی تک

تَرْجِعُونَ ﴿۸۴﴾ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ

پھر کر پہنچ جاؤ گے اور اختیار نہیں رکھتے وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں سفارش کا

إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْمُونَ ﴿۸۵﴾ وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ

مگر جس نے گواہی دی سچی اور اُن کو خبر سچی اور اگر تو اُن سے پوچھے کہ اُن کو

خَلَقَهُمْ كَيْفَ قَالَ اللَّهُ فَأَنَّى يُؤْفَكُونَ ﴿۸۶﴾ وَقِيلَ لَهُ رَبِّ انْ هَؤُلَاءِ

کس نے بنایا تو کہیں گے اللہ نے پھر کہاں سے اُلٹ جلتے ہیں تم ہے رسول کے اُس کہنے کی کہ اے رب یہ

قَوْمٌ لَا يَوْمِنُونَ ﴿۸۷﴾ قَا صَفَحْنَا عَنْهُمْ وَفَلَّ سَلَامٌ فَسَوْفَ يَعْمُونَ ﴿۸۸﴾

لوگ ہیں کہ یقین نہیں لاتے سو تو منہ پھیر لے انکی طرف سے اور کہہ سلام ہے اب آخر کو معلوم کریں گے

## خلاصہ تفسیر

(اور اوپر جن سراؤں کا بیان ہوا اُن کی وجہ یہ ہے کہ) ہم نے سچا دین (جسکا اُکبر غظم توحید و

رسالت کا اعتقاد ہے) تمہارے پاس پہنچایا، لیکن تم میں اکثر آدمی سچے دین سے نفرت رکھتے ہیں

(اکثر آدمی یا تو اس لئے کہا کہ بعض لوگ آئندہ ایمان لانے والے تھے، اور یا اسلئے کہ نفرت تو صحیح معنی

میں بعض ہی کو تھی، دوسرے بعض محض تقلیدِ اُراہ حق کو چھوڑے ہوئے تھے، اور یہ نفرت شامل ہے

رسول کی مخالفت اور توحید کی مخالفت دونوں کو۔ آگے دونوں کی تفصیل ہے کہ) ہاں کیا انھوں نے

(رسول کو نقصان پہنچانے کے بارے میں) کوئی انتظام درست کیا ہے، سو ہم نے بھی ایک نظام درست

کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ خدائی انتظام کے سامنے اُن کا انتظام نہیں چل سکتا، چنانچہ آپ محفوظ ہے

اور وہ لوگ ناکام، اور آخر کو بدر میں ہلاک ہوئے۔ اسکا مفصل ذکر سورہ انفال رکوع چہارم آیت

وَإِنَّكَ مُبْرِكٌ الَّذِي كَفَرُوا بِالْحَقِّ (یہ لوگ جو آپ کو نقصان پہنچانے کے لئے خفیہ

تدبیریں کرتے ہیں) کیا ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی چپکی چپکی (کہی ہوئی) باتوں کو اور

ان کے (خفیہ) مشوروں کو نہیں سُنتے (در نہ اگر ہم کو سُنانے والا سمجھتے ہیں تو پھر ایسی جرات کیوں

کرتے ہیں؟ آگے انکے اس خیال کی تردید فرماتے ہیں کہ) ہم ضرور سُنتے ہیں اور (اسکے علاوہ ہمارے

فرشتے (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

ہے) (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

ہے) (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

ہے) (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

ہے) (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

ہے) (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہیں

لیکن عام عادت یہ ہے کہ مجرم کے لئے پولیس کی لکھی ہوئی رپورٹ حاکم کے معائنہ سے زیادہ قابل اہم ہوتی ہے۔ یہ تو انکی مخالفت رسول کا بیان ہوا، آگے توحید کی مخالفت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اے پیغمبر اللہ علیہ السلام! آپ (ان مشرکین سے) کہئے کہ (تم جو اپنے بعض مشرکانہ اقوال میں حق تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہو تو) اگر (بفرض محال ایسا ہو یعنی خدا نے جن کے اولاد ہو تو سب سے اول انکی عبادت کرنے والے ہیں) ہوں (جس طرح تم فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر ان کی عبادت کرتے ہو، اسی طرح میں بھی اُس صورت میں خدا کی اولاد کی عبادت کرتا۔ مطلب یہ کہ مجھ کو تمھاری طرح حق بات کے ماننے سے انکار نہیں، تم اگر ثابت کردو تو سب سے پہلے میں اس کو مانوں، اور جب اس کو خدا کی اولاد مان لوں تو چونکہ خدا کی اولاد بھی خدا ہی ہونی چاہیے اور خدا مستحق عبادت ہے، اسلئے میں انکی عبادت بھی کروں، مگر چونکہ یہ امر باطل محض ہے اسلئے نہ میں مانوں گا اور نہ عبادت کروں گا۔ آگے شرک سے اللہ تعالیٰ کے پاک ہونیکا بیان ہے یعنی) آسمانوں اور زمین کا مالک جو کہ عرش کا بھی مالک ہے اُن باتوں سے منزہ ہے جو یہ (مشرک) لوگ (اس کی جناب میں) بیان کرتے ہیں (جب یہ لوگ حق کے واضح ہونیکے باوجود اپنے عناد سے باز نہیں آتے) تو آپ ان کو اسی شغل اور تفریح میں رہنے دیجئے، یہاں تک کہ ان کو اپنے اُس دن سے سابقہ واقع ہو جسکا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے (اُس وقت سب حقیقت معلوم ہو جائے گی، اور رہنے دینے کا مطلب یہ نہیں کہ تبلیغ نہ کیجئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انکی مخالفت کی طرف التفات نہ کیجئے اور ان کے ایمان نہ لانیسے غمگین نہ ہو جئے) اور وہی ذات جو آسمانوں میں بھی قابل عبادت ہے اور زمین میں بھی قابل عبادت ہے اور وہی بڑی حکمت والا اور بڑے علم والا ہے (اور کوئی علم و حکمت میں اسکا شریک نہیں، پس خدای بھی اسی کیساتھ خاص ہے) اور وہ ذات بڑی عالیشان ہے جس کے لئے آسمانوں کی اور زمین کی اور جو (مخلوق) انکے درمیان میں ہے انکی سلطنت ثابت ہے اور (علم ایسا کامل ہے کہ) اسکو قیامت کی خبر (بھی) ہے (جسکا کسی مخلوق کو پتہ نہیں) اور (جزا و سزا کا مالک بھی وہی ہے چنانچہ) تم سب اُسی کے پاس ٹوٹ کر جاؤ گے (اور اُس کو حساب دو گے) اور (اسوقت اللہ تعالیٰ کا بلا شرکت غیرے جزا و سزا کا مالک ہونا ایسا ظاہر و باہر ہو گا کہ) خدا کے سوا جن معبودوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سفارش (تک) کا اختیار نہ رکھیں گے ہاں جن لوگوں نے حق بات (یعنی کلمہ ایمان) کا اقرار کیا تھا اور وہ (دل سے) تصدیق بھی کیا کرتے تھے (وہ البتہ باذن الہی اہل ایمان کی سفارش کر سکیں گے مگر اس سے کفار کو کیا فائدہ؟) اور (ہمنے جو ادا پر توحید کا مضمون بیان کیا ہے جس میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں، سو اُس کے مقدمات کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو (یعنی تم کو) کس نے پیدا کیا ہے تو یہی کہیں گے کہ اللہ نے (پیدا کیا ہے) سو (ظاہر ہے کہ مستحق عبادت وہی ہو سکتا ہے جو پیدا کرنے پر قادر ہو۔ پس) یہ لوگ (مقدمات کو تو مانتے ہیں مگر پھر مطلوب کے ماننے کے وقت خدا جانے) کہ دھڑلے چلے جاتے ہیں (ان تمام باتوں سے واضح ہے کہ ان کافروں



کے جرائم کس قدر سخت ہیں، لہذا سزا بھی یقیناً سخت ہوگی۔ اور آگے سزا کی سختی کو اور زیادہ نوکد کر نیچے لئے ایک اور بات کا بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح خدا تعالیٰ کو قیامت کی خبر ہے اُسی طرح) اُس کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کہنے کی بھی خبر ہے کہ اے میرے رب یہ ایسے لوگ ہیں کہ (باوجود میری اس درجہ فہمائش کے) ایمان نہیں لاتے (اس سے سزا کی سختی اور بڑھ گئی کہ جرائم تو سخت تھے ہی ان کیساتھ رسول کی نالاش بھی موجود ہے، پس سمجھ لینا چاہیے کہ کیسا سخت عذاب ہوگا۔ اور جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا انجام یہ ہونے والا ہے) تو آپ اُن سے بے رخ رہئے (یعنی ان کے ایمان کی ایسی اُمید نہ رکھئے جو بعد میں موجب رنج ہو) اور (اگر وہ آپ سے مخالفت اور جہالت کی بات کریں تو آپ رنج شرکے لئے) یوں کہہ دیجئے کہ تم کو سلام کرتا ہوں (اور کچھ نہیں کہتا اور نہ کچھ واسطہ رکھتا ہوں، آگے حق تعالیٰ تسلی کیلئے فرماتے ہیں کہ آپ چندے صبر کیجئے) سوال کو ابھی (مرتے ہی) معلوم ہو جاوے گا۔

## معارف و مسائل

اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَكَدًّا فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰلَمِيْنَ (اگر خدا نے رحمن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ خدا کی اولاد ہونے کا کسی بھی درجہ میں کوئی امکان ہے، بلکہ مقصد دراصل یہ بتانا ہے کہ میں تمہارے عقائد کا انکار کسی عناد یا ہرٹ دھرمی سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ دلائل کی وجہ سے کر رہا ہوں، اگر صحیح دلائل سے خدا کی اولاد کا وجود ثابت ہو جاتا تو میں اُسے ضرور مان لیتا، لیکن عقل و نقل کی ہر دلیل اس کی تردید کرتی ہے، اسلئے ماننے کا کوئی سوال نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل باطل کیساتھ مباحثہ کے وقت اپنی حق پسندی جتانے کے لئے یہ کہنا جائز اور مناسب ہے کہ اگر تمہارا دعویٰ صحیح دلائل کیساتھ ثابت ہوتا تو میں اُسے تسلیم کر لیتا، کیونکہ بعض اوقات اس اندازِ کلام سے مخالف کے دل میں ایسی نرمی پیدا ہو سکتی ہے جو اُسے قبولِ حق پر آمادہ کر دے۔

وَقِيلَ لِرَبِّ اِنَّ هٰؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُوْنَ، یہ جملہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ ان کافروں پر غضبِ خداوندی نازل ہونے کے کتنے شدید اسباب موجود ہیں۔ ایک طرف تو ان کے جرائم فی نفسہ سخت ہیں، دوسری طرف وہ رسول جو رحمۃ للعالمین اور شفیع المذنبین بنا کر بھیجے گئے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جب خود ان لوگوں کی شکایت کریں اور یہ فرمائیں کہ یہ لوگ بار فہمائش کے باوجود ایمان نہیں لاتے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر اذیت پہنچائی ہوگی، ورنہ معمولی تکلیف پر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے ایسی پُر درد شکایت نہ فرماتے۔ اس تفسیر کے مطابق وَقِيلَ اَيْتَ پہلے کے لفظ السَّاعَةِ پر معطوف ہے، اس

آیت کی اور بھی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ یہاں واو عطف کی نہیں بلکہ قسم کی ہے۔ یا ارب "قلیل" کا مقولہ ہے اور ان کھولائے الخ جواب قسم ہے۔ ان تفسیروں کی تفصیل اہل علم و روح المعانی وغیرہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

وَقُلْ سَلَامٌ الخ آخر میں وہی تلقین کی گئی ہے جو ہر داعی حق کو ہمیشہ کی گئی کہ مخالفین کے دلائل و شبہات کا جواب تو دیدو، لیکن وہ جو جہالت و حماقت یا دشنام طرازی کی بات کریں، اسکا جواب انہی کی زبان میں دینے کے بجائے سکوت اختیار کرو۔ اور یہ جو فرمایا کہ کہدو تم کو سلام کرتا ہوں، اس سے مقصد یہ نہیں ہے کہ انہیں السلام علیکم کہا جائے، کیونکہ کسی غیر مسلم کو ان الفاظ سے سلام کرنا جائز نہیں، بلکہ یہ ایک محاورہ ہے کہ جب کسی شخص سے قطع تعلق کرنا ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ "میری طرف سے سلام" یا تمہیں سلام کرتا ہوں۔ اس حقیقی طور پر سلام کرنا مقصد نہیں ہوتا، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں خوبصورتی کے ساتھ تم سے قطع تعلق کرنا چاہتا ہوں۔ لہذا جن حضرات نے اس آیت سے استدلال کر کے کافروں کو السلام علیکم یا سلام کہنا جائز قرار دیا ہے ان کا قول مرجوح ہے (روح المعانی)

الحمد لله آج بتایں ۳ رجب بروز دو شنبہ بوقت عشر سورہ زخرف کی تفسیرات روز میں مکمل ہوئی۔

والحمد لله اولاً و آخراً وصلى الله على خير خلقه محمد وعلى آله واصحابه اجمعين





## سُورَةُ الدُّخَانِ

سُورَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعٌ وَخَمْسُونَ آيَةً وَثَلَاثُ رُكُوعَاتٍ  
سورہ دخان مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں انسٹھ آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حَمْدٌ ۱ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ۲ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ

قسم ہے اس کتاب واضح کی ہم نے اس کو اتارا ایک برکت کی رات میں

اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ ۳ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٍ ۴ اَمْرًا مِّنْ

ہم ہیں کہہ سنانے والے اسی میں جدا ہوتا ہے ہر کام جانچا ہوا حکم ہو کر ہمارے

عِنْدًا ۵ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۶ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ

پاس سے ہم ہیں بھیجنے والے رحمت سے تیرے رب کی وہی ہے سننے

الْعَلِيمُ ۷ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤَقِنِينَ ۸

جاننے والا رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ ہے اگر تم کو یقین ہے

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اَبَائِكُمُ الْاَوَّلِينَ ۹

کسی کی بندگی نہیں سوائے اسکے جلاتا ہے اور مارتا ہے، رب تمہارا اور رب تمہارے اگلے باپ دادوں کا

بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَّلْعَبُونَ ۱۰

کوئی نہیں وہ دھوکے میں ہیں کھیلتے

## خلاصہ تفسیر

حَمْدٌ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) قسم ہے اس کتاب واضح (المعنی) کی کہ ہم نے اس کو (لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر) ایک برکت والی رات (یعنی شب قدر) میں اتارا ہے (کیونکہ) ہم (بوجہ شفقت کے اپنے ارادہ میں اپنے بندوں کو) آگاہ کرنے والے تھے (یعنی ہم کو یہ منظور ہوا کہ ان کو مفسرتوں سے

بچا لینے کے لئے خیر و شر پر مطلع کر دیں، یہ قرآن کو نازل کرنے کا مقصد تھا۔ آگے اُس شب کے برکات و منافع کا بیان ہے کہ اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم (صادر) ہو کر طے کیا جاتا ہو (یعنی سال بھر کے معاملات جو سارے کے سارے ہی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں جس طرح انجام دینے اللہ کو منظور ہوتے ہیں اس طریقے کو متعین کر کے اُن کی اطلاع متعلقہ فرشتوں کو کر کے اُن کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، چونکہ وہ رات ایسی ہے اور نزول قرآن سب سے زیادہ حکمت والا کام تھا اسلئے اس کے لئے بھی یہی رات منتخب کی گئی اور یہ قرآن اسلئے نازل کیا گیا کہ ہم بوجہ رحمت کے جو آپکے رب کی طرف سے ہوتی ہے آپ کو پیغمبر بنا دیئے تھے (تاکہ آپکی معرفت اپنے بندوں کو آگاہ کر دیں) بیشک بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے (اسلئے بندوں کی رعایت کرتا ہے، اور وہ ایسا ہے) جو کہ مالک ہر آسمانوں اور زمین کا اور جو (مخلوق) ان دونوں کے درمیان میں ہے اسکا بھی، اگر تم یقین لانا چاہو (تو یہ توحید کے دلائل یقین لانے کے لئے کافی موجود ہیں، آگے توحید کی تصریح ہے کہ) اسکے سوا کوئی لائق عبادت کے نہیں، وہی جان ڈالتا ہے وہی جان رکالتا ہے، وہ تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی پروردگار ہے (اور اس تصریح و توضیح کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ لوگ مان لیتے مگر یہ لوگ پھر بھی نہیں مانتے) بلکہ وہ (توحید جیسے حقائق کی طرف سے) شک میں (پرے) ہیں (اور دنیا کے، کھیل کود) میں مصروف ہیں (آخرت کی فکر نہیں جو حق کو طلب کریں ہمیں غور سے کام لیں)۔

## معارف و مسائل

**فضیلت سورت** | حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کی رات میں سورہ دُخان پڑھ لے تو صبح کو اسکے گناہ معاف ہو چکے ہونگے۔ اور حضرت امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے جمعہ کی رات یا دن میں سورہ دُخان پڑھ لی اللہ تعالیٰ اسکے لئے جنت میں گھر بنائیں گے (قرطبی بروایت ثعلبی)

آیات مذکورہ میں قرآن کی عظمت اور بعض خاص صفات کا بیان ہے وَالْكِتَابُ بِلُغَةٍ يُحِبُّ یعنی واضح کتاب سے مراد قرآن ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا ہے کہ اسکو ہم نے ایک مبارک رات میں نازل فرمایا جسکا مقصد غافل انسانوں کو بیدار کرنا ہے۔ اسی طرح کئی قسم انہی الفاظ کے ساتھ سورہ زخرف کے شروع میں بھی گزر چکی ہے وہاں اسکا بیان آچکا ہے۔ لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک شب قدر ہے جو رمضان مبارک کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔ اس رات کو مبارک فرمانا اس لئے ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر بے شمار خیرات و برکات نازل ہوتی ہیں اور قرآن کریم کا شب قدر میں نازل ہونا



قرآن کی سورۃ قدر میں تصریح کے ساتھ آیا ہے اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں بھی ایلۃ مبارکہ سے مراد شب قدر ہی ہے۔ اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں ابتداء دُنیا سے آخر تک اپنے انبیاء علیہم السلام پر نازل فرمائی ہیں وہ سب کی سب ماہ رمضان المبارک ہی کی مختلف تاریخوں میں نازل ہوئی ہیں۔ حضرت قتادہ نے بروایت واثلہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صحف ابراہیم علیہ السلام رمضان کی پہلی تاریخ میں اور تورات رمضان کی چھٹی تاریخ میں، زبور بارہویں میں انجیل اٹھارویں میں، اور قرآن چوبیس تاریخ گزرنے کے بعد یعنی چالیسویں شب میں نازل ہوا (قطبی)

قرآن کے شب قدر میں نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوح محفوظ سے پورا قرآن سماء دُنیا پر اسی رات میں نازل کر دیا گیا تھا پھر تیس سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر سال میں جتنا قرآن نازل ہوتا مقدر ہوتا تھا اتنا ہی شب قدر میں لوح محفوظ سے سماء دُنیا پر نازل کر دیا جاتا تھا (قطبی)

اور بعض مفسرین عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے کہ انھوں نے اس آیت میں ایلۃ مبارکہ سے مراد شب برات یعنی نصف شعبان کی رات قرار دی ہے مگر اس رات میں نزول قرآن دوسری تمام نصوص قرآن اور روایات حدیث کے خلاف ہے شہور رمضان الَّذِیْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ اور اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ جیسی کھلی نصوص کے ہوتے ہوئے بغیر کسی قوی دلیل کے نہیں کہا جاسکتا کہ نزول قرآن شب برات میں ہوا۔ البتہ شعبان کی پندرہویں شب کو بعض روایات حدیث میں شب برات یا لیلۃ القدر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس رات کا مبارک ہونا اور اسمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا ذکر ہے۔ اس کے ساتھ بعض روایات میں یہ مضمون بھی آیا ہے جو اس جگہ لیلۃ مبارکہ کی صفت میں بیان فرمایا ہے یعنی فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ اَمْرًا قَدَرًا یعنی اس رات میں ہر حکمت والے معاملہ کا فیصلہ ہماری طرف سے کیا جاتا ہے جس کے معنی حضرت ابن عباسؓ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ یہ رات جس میں نزول قرآن ہوا، یعنی شب قدر، اسی میں مخلوقات کے متعلق تمام اہم امور جن کے فیصلے اس سال میں اگلی شب قدر تک دافع ہونے والے ہیں طے کئے جاتے ہیں کہ کون کون اس سال میں پیدا ہونگے، کون کون آدمی اس میں مریں گے، کس کو کس قدر رزق اس سال میں دیا جائے گا۔ یہی تفسیر دوسرے ائمہ تفسیر حضرت قتادہؓ، مجاہدؓ، حسنؓ وغیرہم سے بھی منقول ہے اور مہدوی نے فرمایا کہ معنی اسکے یہ ہیں کہ یہ تمام فیصلے جو تقدیر الہی میں پہلے ہی سے طے شدہ تھے اس رات میں متعلقہ فرشتوں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، کیونکہ قرآن و سنت کی دوسری نصوص اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلے انسان کی پیدائش سے بھی پہلے ازل ہی میں لکھ دیئے تھے۔ تو

اس رات میں اُن کے طے کرنا حاصل بھی ہو سکتا ہے کہ قضاء و قدر کی تنفیذ جن فرشتوں کے ذریعہ ہوتی ہے اس رات میں یہ سالانہ احکام ان کے سپرد کر دیے جاتے ہیں (قطبانی)

چونکہ بعض روایات حدیث میں شبِ برات یعنی شعبان کی پندرہویں شب کے متعلق بھی آیا ہے کہ اس میں آجماں و ارزاق کے فیصلے لکھے جاتے ہیں۔ اسلئے بعض حضرات نے آیت مذکورہ میں لیلۃ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ البرات سے کر دی ہے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ یہاں اس رات میں نزولِ قرآن کا ذکر سب سے پہلے ہے اور اسکا رمضان میں ہونا قرآن کی نصوص سے متعین ہے۔ اور شبِ برات کے متعلق جو یہ مضمون پیش روایات میں آیا ہے کہ اس میں ارزاق وغیرہ کے فیصلے ہوتے ہیں اول تو ابن کثیر نے اس کے متعلق فرمایا کہ یہ روایت مرسل ہے اور ایسی روایت نصوص صریحہ کے مقابلہ میں قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح قاضی ابوبکر بن عربی نے فرمایا کہ نصف شعبان کی رات کے بارے میں کوئی قابلِ اعتماد روایت ایسی نہیں جس سے ثابت ہو کہ رزق اور موت و حیات کے فیصلے اس رات میں ہوتے ہیں بلکہ انھوں نے فرمایا کہ اس رات کی فضیلت میں بھی کوئی قابلِ اعتماد حدیث نہیں آئی لیکن روح المعانی میں ایک بلا سند روایت حضرت ابن عباسؓ سے اس مضمون کی نقل کی ہے کہ رزق اور موت و حیات وغیرہ کے فیصلے نصف شعبان کی رات میں لکھے جاتے ہیں اور شبِ قدر میں فرشتوں کے حوالے کئے جاتے اگر یہ روایت ثابت ہو تو اس طرح دونوں قول میں تطبیق ہو سکتی ہے ورنہ اصل بات جو ظاہر قرآن اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے وہ یہی ہے کہ سورہ دُخان کی آیت میں لیلۃ مبارکہ اور فیہا یُفرق وغیرہ کے سب الفاظ شبِ قدر ہی کے متعلق ہیں۔ رہا شبِ برات کی فضیلت کا معاملہ، سو وہ ایک مستقل معاملہ ہے جو بعض روایات حدیث میں منقول ہے مگر وہ اکثر ضعیف ہیں اسی لئے قاضی ابوبکر بن عربی نے اس رات کی کسی فضیلت سے انکار کیا ہے لیکن شبِ برات کی فضیلت کی روایات اگرچہ باعتبار سند کے ضعف سے کوئی خالی نہیں لیکن تعدد طرق اور تعدد روایات سے ان کو ایک طرح کی قوت حاصل ہو جاتی ہے اس لئے بہت سے مشائخ نے ان کو قبول کیا ہے کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف روایات پر عمل کر لینے کی بھی گنجائش ہے۔ واللہ اعلم

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ۝۱۰ يَغْشَى النَّاسَ

سو تو انتظار کر اُس دن کا کہ لائے آسمان دُھواں صریح جو گھیر لیوے لوگوں کو

هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۱ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ۝۱۲

یہ ہے عذاب دردناک اے رب کھول دے ہم پر سے یہ آفت ہم یقین لاتے ہیں

اِنِّیْ لَهُمُ الذِّکْرٰی وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ ۝۱۳ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا

کہاں بلے اُن کو سمجھنا اور آپکا اُن کے پاس رسول کھول کر منالے والا پھر اُس سے پیچھے پھیری اور کہنے لگے



مَعْلَمٌ فَجُنُونٌ ۱۳ اِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ اِنْكُمْ عَائِدُونَ ۱۵

سکھایا ہوا ہے باؤلا ہم کھولے دیتے ہیں یہ عذاب تھوڑی مدت تک تم پھر وہی کر دو گے

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ اِنَّا مُنْتَقِمُونَ ۱۶

جس دن پکڑیں گے ہم بڑی پکڑ تحقیق ہم بدل لینے والے ہیں

## خلاصہ تفسیر

(اور جب یہ لوگ حق کے واضح ہونے کے باوجود نہیں مانتے) سو آپ (ان کے لئے) اس روز کا

انتظار کیجئے کہ آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہو جو ان سب لوگوں پر عام ہو جاوے یہ

(بھی) ایک دردناک سزا ہے (جو ان کو ہوگی، اس سے مراد غلہ کا قحط ہے جس میں اہل مکہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے مبتلا ہو گئے تھے۔ اور یہ دُعا ایک مرتبہ مکہ میں ہوئی تھی اور ایک بار مدینہ

میں، اور قاعدہ ہے کہ بھوک کی شدت اور خشکی میں آسمان و زمین کے درمیان آنکھوں کے سامنے

دھواں سا نظر آیا کرتا ہے۔ غرض اہل مکہ اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور لگے عاجزی کرنے، چنانچہ

پیشین گوئی کے طور پر فرماتے ہیں کہ اس وقت جناب باری میں عرض کریں گے کہ) اے ہمارے رب ہم

سے اس مصیبت کو دور کر دیجئے ہم ضرور ایمان لے آویں گے (چنانچہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی

کہ ابوسفیان اور دیگر قریش نے آپ کو لکھا بھی اور آئے بھی کہ آپ دُعا کریں اور ثمامہ رئیس پیامہ

کو جسے غلہ بند کر دیا تھا سمجھا دیں، اور صاحب رُوح نے ابوسفیان کا وعدہ ایمان بھی نقل کیا ہے،

آگے انکے اس وعدے کا صدق دل سے نہ ہونا ارشاد فرماتے ہیں کہ) ان کو (اس سے) کب نصیحت

ہوتی ہے (جس سے انکے ایمان کی توقع کی جاوے) حالانکہ (اس کے قبل) انکے پاس ظاہر شان کا

پیغمبر آیا (یعنی جس کی شان نبوت ظاہر تھی) پھر بھی یہ لوگ اس سے سرتابی کرتے رہے اور یہی

کہتے رہے کہ (کسی دوسرے بشر کا) سکھایا ہوا ہے (اور) دیوانہ ہے (پس جب اتنے بڑے سول

کے آنے پر جس کے دلائل رسالت میں کوئی تاویل ہی نہیں ہو سکتی، یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو قحط کے

ہونے پر جس میں بے انصاف آدمی یہ بھی احتمال نکال سکتا ہے کہ یہ ایک معمولی واقعہ ہے جو طبعی اسباب

کے تحت ہوا ہے اور کفر کی سزا نہیں ہے کب ایمان لانے کی امید ہے، اُن کا یہ کہنا محض دفع الوقتی ہے

مگر خیر ہم (حجت تمام کرنے کے لئے) چندے اس عذاب کو ہٹا دیں گے (مگر) تم پھر اپنی اسی

(پہلی) حالت پر آ جاؤ گے (چنانچہ یہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ آپ نے دُعا فرمائی، بارش ہوئی،

اور ثمامہ کو بھی خط لکھا کہ غلہ آنے دیں، اور اہل مکہ کو فارغ البالی میسر ہوئی مگر ایمان تو کیا لاتے

وہ نرمی اور شکستگی بھی جاتی رہی، پھر وہی زور اور وہی شور اور چندے اس لئے فرمایا کہ اس عذاب

کے ٹپنے کی مدت صرف دنیوی زندگی تک ہے پھر مرنیکے بعد جو مصیبت آوے گی اسکا کہیں خاتمہ نہیں، چنانچہ ارشاد ہے کہ جس روز ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے (اُس روز) ہم (پورا) بدلہ لے لیں گے (یعنی آخرت میں پوری سزا ہوگی)

## معارف و مسائل

آیت مذکورہ میں جس دُخانِ مبین کا ذکر بطور پیشین گوئی کے آیا ہے کہ آپ انتظار کریں اس واضح دھوئیں کا جو آسمان پر ہوگا اور لوگوں پر چھا جائے گا، اسکے متعلق حضرات صحابہ و تابعین سے تین قول منقول ہیں۔ اول یہ کہ یہ علامات قیامت میں سے ایک علامت ہے جو قیامت کے بالکل قریب واقع ہوگی۔ یہ قول حضرت علی مرتضیٰؓ اور ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابو ہریرہؓ اور زید بن علیؓ اور حسن بصریؓ، ابن ابی لیلیٰؓ وغیرہ کا ہے اور حضرت ابوسعید خدریؓ اور حذیفہ بن اسید غفاریؓ سے یہ قول مرفوعاً بھی روایت کیا گیا ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ پیشین گوئی واقع ہو چکی ہے اور اسکا مصداق مکہ مکرمہ کا قحط ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے اُن پر مسلط ہوا تھا وہ بھوکوں مرنے لگے، مُردار جانور تک کھانے لگے، آسمان پر بجائے بارشِ دل کے اُن کو دھواں نظر آتا تھا۔ یہ قول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ کا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس دُخان سے مراد وہ گرد و غبار ہے جو فتح مکہ کے روز مکہ مکرمہ کے آسمان پر چھا گیا تھا، یہ قول عبدالرحمن اعرجؓ وغیرہ کا ہے۔ (قطبی) زیادہ معروف پہلے ہی دو قول ہیں، تیسرے قول کے متعلق ابن کثیرؒ نے فرمایا: ہذا القول غریب جداً بل منکر۔ باقی دونوں کا ذکر احادیث صحیحہ میں آیا ہے روح المعانی نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے اور مذکور الصدر خلاصہ تفسیر بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے ابن کثیرؒ اور قرطبیؒ سے پہلے قول کی ترجیح معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم، دونوں اقوال کی روایات حسبِ میل ہیں صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ بن اسیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بالاخلانے سے ہم پر نظر فرمائی، ہم آپس میں علامات قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے، آپ نے فرمایا کہ قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم دس علامتیں نہ دیکھ لو۔ آفتاب کا مغرب کجائنب سے طلوع ہونا، اور دُخان اور دابہ اور یاجوج ماجوج کا خروج۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور دجال کا خروج اور تین خُصف یعنی زمین میں دھنس جانا۔ ایک خُصف مشرق میں دوسرا مغرب میں تیسرا جزیرۃ العرب میں۔ اور آگ جو قعرِ عدن سے نکلے گی لوگوں کو ہکا کر لے چلے گی جہاں رات کو لوگ سونے کے لئے ٹھہریں گے رُک جاوے گی جہاں دو پہر کو آرام کیلئے رکیں گے یہ بھی رُک جائیگی (ابن کثیر) ابن جریر نے ابومالک اشعریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں



تھیں تین چیزوں سے ڈراتا ہوں۔ ایک دُخان (یعنی دھواں) جو مومن کے لئے صرف ایک طرح کا زکام پیدا کر دے گا اور کافر کے تمام بدن میں بھر جائے گا یہاں تک کہ اسکے ہر مسموع اور مسمام سے نکلنے لگے گا اور دوسری چیز دابۃ (یعنی دابۃ الارض کوئی عجیب قسم کا جانور زمین سے نکلے گا) اور تیسری دجال۔ اس روایت کو ابن کثیر نے نقل کر کے فرمایا (ہذا اسناد جید) اسی مضمون کی ایک روایت بحوالہ ابن ابی تمہر حضرت ابوسعید خدریؓ سے بھی ابن کثیر نے نقل کی ہے۔ اور بحوالہ ابن ابی حاتم حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ دُخان کی پیشین گوئی گزری نہیں (بلکہ قرب قیامت میں) یہ دھواں مومن کے لئے ایک طرح کا زکام پیدا کر دے گا اور کافر کے اندر بھر جائے گا یہاں تک کہ اسکے ہر منفذ سے نکلنے لگے گا اسی طرح کا مضمون بحوالہ ابن جریر حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی نقل کیا ہے جس کو نقل کر کے ابن کثیر نے فرمایا:

هذا اسناد صحيح الى ابن عباس رضى الله عنهما  
وترجمان القرآن وهكذا قول من واقفه  
من الصحابة والتابعين رضى الله عنهم مع الاحاديث  
المرفوعة من الصحاح والحسان وغيرها  
التي اوردوها معانيه مقنع ودلالة  
ظاهرة على ان الدخان من الايات  
المنتظرة مع انه ظاهر القرآن (فارتقب  
يوم تأتي السماء بدخان مبين) وعلى ما  
فسره ابن مسعود انما هو خيال رأوه في  
اعينهم من شدة الجوع والجهد  
لهكذا قوله تعالى (يفشي الناس) او  
يتخاشعهم ويعصمهم لو كان اموالهم خيال  
اهل مكة المشركين لما قيل فيه يفشي الناس

حضرت ابن عباس جبرأت اور ترجمان القرآن مکت اسناد  
صحیح ہے اور یہی قول دوسرے حضرات صحابہ و تابعین کا ہے  
جنہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی موافقت فرمائی ہے اسکے ساتھ  
وہ احادیث مرفوعہ جن میں بعض صحیح بعض حسن ہیں وہ بھی یہ  
ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ دُخان اُن علامات قیامت  
میں سے ہے جن کا انتظار ہے ابھی آئی نہیں، خصوصاً جبکہ  
ظاہر الفاظ قرآن بھی اس پر شاہد ہیں اور حضرت عبداللہ بن  
مسعود کی تفسیر مشہور میں جس دھویں کا ذکر ہے وہ تو ایک  
خیالی دھواں تھا جو بھوک کی شدت سے اُن کی آنکھوں کو  
محسوس ہوتا تھا اسکے لئے لفظ یفشی الناس بعید علوم و آثار  
کیونکہ یہ خیالی دھواں تو اہل مکہ کے لئے مخصوص تھا اور  
یفشی الناس کے الفاظ یہ بتلاتے ہیں کہ وہ سب لوگوں پر  
عام طور پر چھا جائے گا۔

اور پہلے یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود کے قول کی روایت صحیحین اور مسند احمد اور ترمذی نسائی  
وغیرہ میں اس طرح آئی ہے کہ حضرت مسروقؓ نے روایت کیا ہے کہ ایک روز ہم کوفہ کی مسجد  
میں داخل ہوئے جو ابواب کندہ کے قریب تھے وہاں دیکھا کہ ایک واعظ لوگوں کو وعظ شاربہ ہے  
اور اس آیت یعنی یَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ کے متعلق اُس نے مخاطبین سے سوال کیا کہ تم  
جانتے ہو کہ اس دُخان سے کیا مراد ہے پھر فرمایا کہ یہ ایک دھواں ہوگا جو قیامت کے روز نکلے گا

جو منافقین کے کانوں اور آنکھوں کو لے لیگا اور مؤمن کو اس سے صرف زکام کی سی کیفیت پیدا ہوگی۔ مسروق کہتے ہیں کہ داعط کی یہ بات سن کر ہم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اُن سے اسکا ذکر کیا وہ لیٹے ہوئے تھے گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ اللہ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ، یعنی میں تم سے تمہاری خدمت تعلیم و تبلیغ کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا اور نہ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو تکلف کوئی بات بنائیں اسلئے علم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو نہیں جانتا صاف کہہ دے کہ میں نہیں جانتا اسکا علم اللہ ہی کو ہے (تکلف سے بات نہ بناوے) پھر فرمایا کہ اب تمہیں اس آیت کی تفسیر کا ایک واقعہ سنانا ہوں، وہ یہ ہے کہ جب قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کو قبول کرنے سے انکار اور اپنے کھر پر اصرار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لئے بددعا فرمائی کہ یا اللہ ان پر ایسا قحط ڈال کہ جیسا کہ آپ نے یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں ڈالا تھا۔ اس بددعا کا اثر یہ ہوا کہ یہ لوگ شدید قحط میں مبتلا ہو گئے یہاں تک کہ ہڈیاں اور مردار جانور تک کھانے لگے۔ یہ لوگ آسمان کی طرف نظریں اٹھاتے تھے تو دھویں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ان کا کوئی آدمی آسمان کی طرف نظر اٹھاتا تو بھوک کی شدت سے اس کو دھواں سا نظر آتا تھا۔ اسکے بعد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے استدلال میں یہ آیت تلاوت فرمائی فَإِنَّ السَّمَاءَ بِدُحَانٍ مُّبِينٍ۔ جب واقعہ پیش آیا تو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ اپنے قبیلہ مضر کے لئے اللہ سے بارش کی دعا کریں ورنہ وہ سب ہلاک ہو جاویں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تو اللہ نے بارش دیدی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی إِنَّا كَاشِفُ الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ، یعنی ہم تمہارے اس عذاب کو چند روز کے لئے ہٹائے لیتے ہیں (مگر جب تم مصیبت سے نکل جاؤ گے) تو پھر اپنے کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا پھر وہ اپنے پچھلے حال کی طرف لوٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ، یعنی جس دن ہم سخت پکڑ پکڑیں گے اُس دن سے ڈرو، پھر ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بطشہ کبریٰ یعنی بڑی سخت پکڑ غزوہ بدر میں ہو چکی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ پانچ چیزیں گزر چکی ہیں، یعنی دخان، روم، قمر، بطشہ، لزام (ازابن کثیر) دخان سے مراد اس تفسیر پر سکھ کا قحط ہے، اور روم سے مراد وہ پیش گوئی ہے جو سورہ روم میں انکے غلبہ کے متعلق آئی ہے وَهَذَا مِنْ بَعْدِ عَلَيْهِمْ سَبْعُونَ، اور قمر سے انشاق قمر مراد ہے جسکا ذکر اقتربت الساعة وانشق القمر میں ہے، اور بطشہ تفسیر مذکور کے مطابق غزوہ بدر میں کفار قریش کا انجام ہے۔ اور لزام سے اشارہ اس آیت کی طرف ہے فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا۔



آیات مذکورہ میں غور کیجئے تو ان میں چند پیشین گوئیاں ہیں۔ اول دھویں کا آسمان پر ظاہر ہونا اور سب لوگوں پر چھا جانا، دوسرے مشرکین کا اس عذاب سے عاجز آکر ایمان کا وعدہ کر کے اللہ سے دعا کیا مانگنا۔ تیسرے اُن کے وعدہ کا جھوٹا ہونا اور بعد میں مکر جانا۔ چوتھے اللہ تعالیٰ کا اُن کے جھوٹے وعدے پر بھی بطور انعام حجت کے کچھ عرصہ کیلئے ان سے عذاب کا ہٹا دینا اور یہ جتنا دینا کہ تم اس وعدہ پر قائم نہ رہو گے پانچویں پھر دوبارہ اُن کو سخت پکڑ میں پکڑ لینا حضرت عبداللہ بن مسعود کی تفسیر کے مطابق یہ سب کی سب پیشین گوئیاں پوری ہو چکیں، پہلی چار تو مکہ والوں پر قحط شدید مسلط ہونے اور پھر اسکے رفع ہونے کے دوران پوری ہوئیں اور پانچویں غزوہ بدر میں پوری ہو گئی، لیکن اس تفسیر پر ظاہر الفاظ قرآنی سے یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ بھوک کی شدت کے سبب آسمان پر خیالی دھواں نظر آنے کو قرآن کریم نے ثَمَّالِی السَّمَاءِ اور دُخَانِ یَمِیْنِ اور نَفِیْثِی النَّاسِ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہو کیونکہ بظاہر ان الفاظ سے عام آسمان پر کھلا ہوا دھواں چھا جانا اور سب لوگوں کا اُس دھویں سے متاثر ہونا معلوم ہوتا ہے۔ تفسیر مذکور میں نہ آسمان پر دھویں کا چھا جانا ثابت ہوتا ہے اور نہ لوگوں کا اس دھویں سے متاثر ہونا معلوم ہوتا ہے بلکہ یہ دھواں تو خود اُن کی اپنی شدت مصیبت کا اثر تھا اسی لئے حافظ ابن کثیر نے ظاہر قرآن کے مطابق اسکو ترجیح دی کہ یہ دُخَانِ مبین علامات قیامت میں سے ہے اور اسکو ترجیح اس لئے بھی ہے کہ وہ روایات مرفوعہ سے ثابت ہے۔ یہ صرف حضرت عبداللہ بن مسعود کا اپنا قول ہے مگر اس تفسیر پر بظاہر اِنَّا کَاشِفُ الْعَذَابِ اَنْکُمْ عَائِدُوْنَ سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ قیامت میں تو کفار سے کوئی عذاب نہیں ہٹایا جائیگا۔ یہاں چند روز کے لئے عذاب ہٹا دینے کا ذکر کیسے درست ہو گا؟ ابن کثیر نے فرمایا کہ اسکے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ مراد اس سے یہ ہو کہ اگر ہم تمہارے کہنے کے مطابق عذاب ہٹا دیں اور تمہیں پھر دُنیا میں لوٹا دیں تو تم پھر وہی کفر و انکار کرنے لگو گے جیسا کہ دوسری آیت میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے وَ لَوْ رَحَّمْنَاهُمْ وَ کَشَفْنَا مَا یُھَمُّ مِنْ ظُلُمٍ لِّلْجُورِ اِنَّهُمْ یَعْمَھُوْنَ، اور ایک اور آیت میں فرمایا وَ لَوْ رَدُّوْا الْعَادُوْا لَمَّا نَهَوْا عَنْہُمْ، دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کَاشِفُ الْعَذَابِ میں کشف عذاب سے مراد یہ ہو کہ اگرچہ عذاب آنے کے اسباب مکمل ہو چکے اور عذاب تمہارے قریب آچکا ہے مگر کچھ روز کے لئے ہم اس کو مؤخر کر دیتے ہیں جیسا کہ قوم یونس علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے کَشَفْنَا عَنْہُمْ الْعَذَابَ، حالانکہ قوم یونس علیہ السلام پر عذاب آ نہیں چکا تھا صرف آثار عذاب نظر آئے تھے اسکو کشف عذاب سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر دُخَانِ کی پیش گوئی کو علامات قیامت میں شمار کیا جائے تو کَاشِفُ الْعَذَابِ کے الفاظ سے اس پر بھی کوئی اشکال نہیں رہتا اور اس تفسیر پر یَوْمَ یَبْطِشُ الْبَطِشَۃُ الْکُبْرٰی سے مراد روز قیامت کی پکڑ ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی تفسیر میں جو غزوہ بدر کی پکڑ کو فرمایا ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہے وہ بھی ایک پکڑ سخت ہی تھی

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آگے قیامت میں اُس سے بڑی پکڑ نہ ہو۔ اور اس میں بھی کچھ بعد نہیں معلوم ہوتا کہ قرآن کریم نے کفار مکہ کو ایک آئینہ عذاب سے ان آیات میں ڈرایا ہے اسکے بعد جو بھی عذاب اُن پر آیا اُس کو کسی درجہ میں اسکا مصداق سمجھ کر صحابہ کرامؓ نے ان آیات کا ذکر فرمادیا ہو جس سے اس کے علامات قیامت میں سے ہونے کی نفی نہیں ہوتی جیسا کہ روح المعانی میں علامہ سفارینی کی کتاب البحور النلخوۃ کے حوالہ سے خود حضرت ابن مسعودؓ نے روایت کیا ہے۔

ہمَا دُخَانَانِ مَضًى وَاحِدٌ وَالَّذِي بَقِيَ يَمْلَأُ  
مَابَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَا يَصِيبُ الْمُتُومِنِ  
إِلَّا بِالسَّكْمَةِ وَأَمَّا الْكَافِرُ فَيُشَقُّ مَسَامِعُهُ  
فَيُبْعَثُ اللَّهُ تَعَالَى عِنْدَ ذَلِكَ الرَّيْحِ الْجَنُوبِ  
مِنَ الْبَحْرِ فَيَقْبِضُ رُوحَ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَيَقِفُ  
شَوَارِ النَّاسِ (دو ج)

دُخَانِ دو ہیں، ایک گرز چکا (یعنی تھما مکہ کے وقت) اور  
دوسرا جو باقی ہے وہ آسمان اور زمین کی درمیانی فضا کو بھر گیا  
اور مومن کو اس سے صرف زکام کی کیفیت پیدا ہوگی اور  
کافر کے تمام منافذ کو پھاڑ ڈالے گا اس وقت اللہ تعالیٰ مین کی  
طرف سے جنوبی ہوا بھیج دیں گے جو ہر مومن کی روح قبض  
کر لے گی اور صرف کفار شرار الناس باقی رہ جائیں گے۔

اگرچہ صاحب روح المعانی نے اپنی مختار تفسیر کے مطابق اس روایت کی صحت کے متعلق اپنے شک کا اظہار کیا ہے مگر یہ روایت ثابت ہو جائے تو ظواہر قرآن اور روایت مرفوعہ کیساتھ کوئی تعارض نہیں رہتا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ ۝۱۷

اور چاہتے تھے ہم اُن سے پہلے فرعون کی قوم کو اور آیا اُن کے پاس رسول عزت والا کہ حوالہ کرد

إِلَىٰ عِبَادِ اللَّهِ إِيَّاكُمْ رُسُولٌ أَمِينٌ ۝۱۸ وَأَنْ لَا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ

میرے بندے خدا کے میں تمہارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا معتبر اور یہ کہ چڑھے نہ جاؤ اللہ کے مقابل

إِنِّي أَنَا رَبُّكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۝۱۹ وَإِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ

میں لاتا ہوں تمہارے پاس سند کھلی ہوئی اور میں پرناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس

تَرْجُمُونِ ۝۲۰ وَإِنْ لَمْ تُؤْمِنُوا إِلَيَّ فَأَعْتَزَلُونِ ۝۲۱ قَدْ عَارَفْتُمْ أَنْ

بات سے کہ تم مجھ کو شکسا کر دو، اور اگر تم نہیں یقین کرتے مجھ پر تو مجھ سے پرے ہو جاؤ پھر دعا کی اپنے رب سے کہ

هُوَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ قَوْمٌ مُّجْرِمُونَ ۝۲۲ فَاسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُمْ مُّتَّبِعُونَ ۝۲۳

یہ لوگ گنہگار ہیں پھر لے نکل رات سے میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے

وَإِنَّكَ الْبَحْرَ رَهَوًا إِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُونَ ۝۲۴ كَمْ تَرَكُوا مِنْ

اور پھوڑ جا دریا کو تھا ہوا البتہ وہ لشکر ڈوبنے والے ہیں بہت سے چھوڑ گئے

جَنَّتٍ وَعُيُونٍ ۝۲۵ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ۝۲۶ وَنَعْمَةٍ كَانُوا

باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور گھر خاصے اور آرام کا سامان جس میں



فِيهَا فِكْهَيْنِ ۝ كَذَلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ ۝ فَمَا بَكَتْ

بائیں بنایا کرتے تھے یونہی ہوا اور وہ سب ہاتھ لگا دیا یعنی ایک دوسری قوم کے، پھر نہ رویا

عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنْظَرِينَ ۝ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا

اُن پر آسمان اور زمین اور نہ ملی اُن کو ڈھیل اور ہم نے بچا نکالا

بَنِي إِسْرَءِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۝ مِنْ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ

بنی اسرائیل کو عذاب کی مصیبت سے جو فرعون کی طرف سے تھی بیشک

كَانَ عَلِيًّا مِّنَ الْمُسْرِفِينَ ۝ وَلَقَدْ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ

وہ تھا چڑھ رہا حد سے بڑھ جانے والا اور ان کو ہم نے پسند کیا جان بوجھ کر جہان کے

الْعَالَمِينَ ۝ وَآتَيْنَاهُم مِّنَ الْأَيِّتِ مَا فِيهِ بَلَاءٌ مُّبِينٌ ۝

لوگوں سے اور دیں ہم نے ان کو نشانیاں جن میں تھی مدد صریح

## خلاصہ تفسیر

اور ہم نے ان سے پہلے قوم فرعون کو آزمایا تھا اور (وہ آزمائش یہ تھی کہ) اُن کے پاس ایک معزز پیغمبر

(یعنی موسیٰ علیہ السلام) آئے تھے (پیغمبر کے آنے سے آزمائش یہ ہوتی ہے کہ کون ایمان لاتا ہے اور

کون نہیں لاتا اور انھوں نے اگر فرعون اور فرعون کی قوم سے فرمایا کہ ان اللہ کے بندوں (یعنی بنی اسرائیل)

کو (جن کو تم نے طرح طرح کی تکالیف میں پھنسا رکھا ہے) میرے حوالے کر دو (اور ان سے دست بردار

ہو جاؤ کہ میں جہاں اور جس طرح مناسب ہوں کو آزاد کر کے رکھوں) میں تمھاری طرف (خدا کا)

فرستادہ (ہو کر آیا) ہوں (اور) دیانتدار ہوں (کوئی بات وحی سے کمی بیشی نہیں کرتا ہوں جو حکم

ہونا ہے پہنچاتا ہوں، پس تم کو ماننا چاہیے) اور یہ (بھی فرمایا) کہ تم خدا سے سرکشی مت کرو (اور

حق العباد کا امر تھا اور یہاں حق اللہ کا) میں تمھارے سامنے ایک واضح دلیل (اپنی نبوت کی) پیش

کرتا ہوں (مراد اس سے معجزہ عصا و ید بیضا ہے) اور (جب فرعون و اہل فرعون نے نہ مانا بلکہ باہم

مشورہ آپ کے قتل کا ہوا اس وقت آپ نے فرمایا کہ) میں اپنے پروردگار اور تمھارے پروردگار کی پشاہ

لیتا ہوں اس سے کہ تم لوگ مجھ کو پتھر (وغیرہ) سے قتل کرو اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو تم مجھ سے

الگ ہی رہو (یعنی مجھے تکلیف پہنچانے کے ورپے مت ہو کیونکہ مجھ کو تو کوئی نقصان نہ پہنچے گا،

مجھ سے اللہ کا وعدہ ہے فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا) لیکن تمھارا جرم اور شدید ہو جائے گا، اسلئے خیر خواہی

سے کہتا ہوں کہ ایسا مت کرو مگر وہ کب باز آتے تھے) تب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے رب سے

دُعائی کہ یہ بڑے سخت مجرم لوگ ہیں (کہ جہنم سے باز نہیں آتے، اب ان کا فیصلہ کر دیجئے ارشاد ہوا

کہ ہم نے دُعا قبول کی اور ان کے فیصلہ کا وقت آگیا) تو اب میرے بندوں (یعنی بنی اسرائیل) کو تم رات ہی رات میں لیکر چلے جاؤ (کیونکہ) تم لوگوں کا (فرعون کی طرف سے) تعاقب (بھی) ہوگا (اس لئے رات میں نکل جانے سے اتنی دُور تو نکل جاؤ گے کہ یہ تعاقب کر کے تم کو پا نہ سکے) اور (اٹھائے سفر میں جو دریا حائل ہوگا) تم اس دریا کو (اول عصا مارنا کہ وہ خشک ہو کر رستہ دیدیگا، پھر پار ہونیکے بعد جب اُس کو اُسی حالت پر دیکھو تو فکر نہ کرنا کہ اسی طرح فرعون بھی شاید پار ہو جائیگا بلکہ تم اُس کو اسی) سکون کی حالت میں (یعنی پانی کے بہٹ جانے اور راستہ کے خشک ہو جانے سے دریا کی جو ہیئت پیدا ہوئی ہے اُسی ہیئت پر) چھوڑ دینا (اور بے فکر رہنا، کیونکہ اُسکے اس حالت میں رہنے کی یہ حکمت ہے کہ) اُن (فرعونیوں) کا سارا لشکر (اس دریا میں) ڈبو یا جاوے گا (اس طرح کہ وہ اسیں گھسیں گے اور جب اُس میں آجاویں گے تو چہار طرف سے پانی آئے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پار ہو گئے اور فرعون غرق ہوئے اور) وہ لوگ کتنے ہی باغ اور کتنے ہی (چشمے) (یعنی نہریں) اور (کتنی ہی) کھیتیاں اور (کتنے ہی) عمدہ مکانات (اور کتنے ہی) آرام کے سامان جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے چھوڑ گئے (یہ قصہ) اسی طرح ہوا اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا مالک بنا دیا (مراد بنی اسرائیل ہیں) سو (چونکہ وہ نہایت مغرض تھے اس لئے) نہ تو اپنے آسمان زمین کو ردنا آیا اور نہ ان کو (عذاب سے کچھ اور) مہلت دی گئی (یعنی اگر کچھ اور جیتے تو عذاب جہنم سے کچھ اور دن بچے رہتے) اور ہم نے (اس طرح) بنی اسرائیل کو سخت ذلت کے عذاب یعنی فرعون (کے ظلم و ستم) کو نجات دی۔ واقعی وہ (فرعون) بڑا سرکش (اور) حد (معبودیت) سے نکل جانے والوں میں سے تھا (ایک نعمت تو بنی اسرائیل پر یہ ہوئی) اور (اسکے علاوہ) ہم نے بنی اسرائیل کو (اور بھی نعمتیں دے کر) اپنے علم (اور حکمت) کی رُوسے (بعض اُمور میں تمام) دُنیا جہان والوں پر (یا تمام اُمور میں ایک بڑے حصہ مخلوق پر مثلاً اُس زمانے کے لوگوں پر) فوقیت دی اور (اُن نعمتوں میں انعام ہونے کے علاوہ اللہ کی قدرت پر دلالت بھی تھی جسکا حاصل یہ ہے کہ) ہم نے اُن کو (اپنی قدرت کی) ایسی (بڑی بڑی) نشانیاں دیں جن میں صریح انعام (پایا جاتا) تھا (یعنی جو احسان ان پر کیا گیا اسیں دو وصف پائے جاتے تھے، انعام ہونا بھی اور دلیل قدرت ہونا بھی۔ پھر بعض ان میں حتیٰ نعمتیں تھیں جیسے فرعون سے نجات دلانا اور بعض معنوی تھیں جیسے علم و کتاب مشاہدہ معجزات)

## معارف و مسائل

وَلَقَدْ عَلَّمْتُمُ النَّاسَ رِسَالَتِي دَرَجَاتٍ وَرَبَّكَوْا اَنْ تَرْجُمُوْا (میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تم مجھے رجم کرو) رجم کے معنی سنگسار کرنے یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کے



بھی آتے ہیں اور کسی کو گالی دینے اور برا بھلا کہنے کے بھی۔ یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں لیکن راجح یہ ہے کہ یہاں سنگسار کرنے کے معنی مراد ہیں کیونکہ فرعون کی قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل غیر کی دھمکیاں دے رہی ہوگی۔

وَأَنزَلْنَا الْبَحْرَ دَهَوًا (اور دریا کو سکون کی حالت میں چھوڑ دینا) ”دَهَوًا“ کے معنی ہیں ”ساکن“ دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپکے رفقاء کے پار ہو جانیکے بعد اُن کی خواہش طبعی طور پر یہ ہونی چاہئے تھی کہ دریا دوبارہ اپنی اصلی حالت پر آجائے تاکہ فرعون کا لشکر پار نہ ہو سکے، اسلئے اللہ تعالیٰ نے انھیں تنبیہ فرمادی کہ خود پار ہونے کے بعد مندر کو اُنکی ہیئت پر ساکن ہی چھوڑ دینا، اور دوبارہ پانی کے جاری ہونے کی فکر مت کرنا، تاکہ فرعون خشک راستہ بنا ہوا دیکھ کر دریا کے بچوں بچ پہنچ جائے، اُس وقت ہم دریا کو جاری کر دیں گے اور یہ لشکر ڈوب جائے گا (ابن کثیر)

وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ (اور ہم نے اُنکا وارث ایک دوسری قوم کو بنا دیا) سورۃ شعراء میں تصریح ہے کہ اس ”دوسری قوم“ سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اور اس پر جو مشہور اشکال ہوتا ہے کہ مشہور تواریح کے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بنی اسرائیل دوبارہ مصر میں آباد ہوئے، اسکا جواب بھی سورۃ شعراء کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ زمین و آسمان کا روتا | فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ (پس اُن پر آسمان و زمین کو رونا نہیں آیا) مطلب یہ ہے کہ انھوں نے زمین پر کوئی ایسا عمل صالح نہیں کیا تھا کہ اُن کے مرنے سے زمین روئے، اور نہ اُن کا کوئی نیک عمل آسمان تک پہنچا تھا کہ اُن کو آسمان روئے۔ اور یہ بات متعدد روایات سے ثابت ہے کہ کسی نیک بندے کی موت پر آسمان و زمین روتے ہیں۔ حافظ ابو یعلیٰ نے حضرت انسؓ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آسمان میں ہر بندے کے لئے دو دروازے مقرر ہیں، ایک سے اسکا رزق نازل ہوتا ہے دوسرے سے اسکا عمل اور اس کی گفتگو اور پہنچتی ہے۔ چنانچہ جب وہ بندہ مرتا ہے تو یہ دو دروازے اُسے یاد کر کے روتے ہیں۔ اسکے بعد آپؐ نے (بطور استشہاد) یہی آیت تلاوت فرمائی کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ، حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی قسم کی روایت مروی ہیں (ابن کثیر) ایک اور حدیث میں جو حضرت شریح بن عبید حضرت عائشہؓ سے مروی ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو مومن بھی ایسی غریب الوطنی کی حالت میں مرتا ہے کہ اس پر کوئی روتے والا نہ ہو تو اس پر آسمان زمین روتے ہیں، اس پر بھی آپؐ نے یہی آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ یہ زمین و آسمان کسی کافر پر نہیں روتے (ابن جریر) حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے کہ انھوں نے نیک آدمی کے مرنے پر آسمان و زمین کے رونے کا ذکر فرمایا (ابن کثیر)

اور بعض حضرات نے آیت کے الفاظ کو مجاز و استعارہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ آسمان و زمین کا حقیقہ رونا مراد نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اُن کا وجود ایسا ناقابل التفات تھا کہ اسکے ختم ہو جانے

پر کسی کو افسوس نہیں ہوا۔ لیکن مذکورہ روایات کی روشنی میں رنج یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آسمان و زمین کا حقیقہ رونا مراد ہے کیونکہ جب آیت کے حقیقی معنی ممکن ہیں اور روایات سے بھی اُن کی تائید ہوتی ہے تو خواہ مخواہ اسے مجاز و استعارہ پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں۔ رہا یہ شبہ کہ آسمان و زمین میں شعور کہاں ہے جو وہ رو سکیں؟ تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق میں کچھ نہ کچھ شعور ضرور موجود ہے جیسا کہ قرآن کریم کی آیت **إِنَّ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا لَیْسَ بِہِ بِحَیٍّ** سے معلوم ہوتا ہے، اور اب رفتہ رفتہ جدید سائنس بھی اسی نتیجے پر پہنچ رہی ہے۔ ہاں یہ ضروری نہیں کہ آسمان و زمین کا رونا ویسا ہی ہو جیسے انسانوں کا رونا ہوتا ہے، اُنکے رونے کی کیفیت یقیناً مختلف ہوگی جس کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں۔

**وَلَقَدْ اخْتَرْنَاہُمْ عَلٰی عَلٰیہِ عَلٰی الْعٰلَمِیْنَ** (اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے علم کی رُو سے دُنیا جہان والوں پر فوقیت دی) اس سے بنی اسرائیل کا اُمت محمدیہ علی صاحبہا السلام پر فائق ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ اس سے مراد اُس زمانے کے دُنیا جہان والے ہیں اور اس وقت بلاشبہ وہ تمام اقوام سے فضل تھے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت مریمؑ کے لئے **نساء العالمین** پر فضیلت کا قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص پہلو سے بنی اسرائیل کو تمام دُنیا اور ہر زمانے کے لوگوں پر کوئی فضیلت حاصل ہو لیکن مجموعی حیثیت سے افضلیت اُمت محمدیہؐ ہی کو حاصل ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ابن کثیر وغیرہ) اور علی علیہ السلام (اپنے علم کی رُو سے) کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے پس اُنکو فوقیت دینا چونکہ ہمارے علم میں حکمت و مصلحت کا تقاضا تھا، اسلئے ہم نے اُن کو فوقیت دیدی۔  
**وَاتَّيْنَاهُمْ مِّنَ الْآيٰتِ مَا قَبِيْہُ يَكُوْنُ اٰمِيْنٌ** (اور ہم نے اُن کو ایسی نشانیاں دیں، جنہیں صریح انعام تھا) نشانوں سے مراد عصا اور ید بیضا وغیرہ کے معجزات ہیں۔ اور **یٰکُوْنُ** کے دو معنی آتے ہیں، ایک انعام اور دوسرے آزمائش، یہاں دونوں معنی بلا تکلف ممکن ہیں۔ (قرطبی)

**اِنَّ ہُوَ اَكْبَرُ لَیْقُوْلُوْنَ ۝۳۵ اِنْ ہِیَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُولٰی وَمَا نَحْنُ**

یہ لوگ کہتے ہیں اور کچھ نہیں ہمارا یہی مرنا ہے پہلا اور ہم کو

**بِمُنْشَرٰیۡنَ ۝۳۶ فَاْتُوْا بِاٰیٰتِنَا اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۳۷ اَھْمُ خَیْرٌ**

پھر اُٹھنا نہیں بھلائے تو آؤ ہمارے باپ دادوں کو اگر تم سچے ہو بھلا یہ بہتر ہیں

**اَمْ قَوْمٌ تَبِیْعَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہُمْ اَھْلَکْنٰھُمْ زَاۓِمًا کَاۡنُوْا**

یا تبیع کی قوم اور جو اُن سے پہلے تھے ہم نے اُن کو غارت کر دیا بیشک وہ تھے

**مُجْرِمِیْنَ ۝۳۸ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَا لِعِیْنٍ ۝۳۹**

گنہگار اور ہم نے جو بنایا آسمان اور زمین اور جو انکے بیچ ہے کھیل نہیں بنایا



مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾ إِنَّ يَوْمَ

اُن کو تو بنایا ہم نے ٹھیک کام پر بہت لوگ نہیں سمجھتے تحقیق فیصلہ

الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَوْلًى شَيْئًا وَ

کا دن وعدہ ہے ان سب کا جس دن کام نہ آئے کوئی رفیق کسی رفیق کے کچھ بھی اور

لَا هُمْ يَنْصَرُونَ ﴿۴۱﴾ إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۴۲﴾

نہ اُن کو مدد پہنچے مگر جس پر رحمت کرے اللہ بیشک وہی ہے زبردست رحم والا

## خلاصہ تفسیر

یہ لوگ (قیامت کی وعیدیں سن کر قیامت کا انکار کرتے ہیں اور) کہتے ہیں کہ اخیر حالت بس یہی ہمارا دنیا کا مرنا ہے اور ہم دوبارہ زندہ نہ ہونگے (مطلب یہ کہ اخیر حالت وہ آخری زندگی نہیں بلکہ یہ دنیوی موت ہی اخیر حالت ہے جس کے بعد کچھ ہونا نہیں ہے) سو (اے مسلمانو!) اگر تم (آخرت کے دعوے میں) سچے ہو تو (انتظار کون کرے، ابھی) ہمارے باپ دادوں کو (زندہ کرا کے) لا موبچو کرو (آگے ان کے کفریات پر تہدید ہے کہ ان کو ذرا سوچنا چاہیے کہ) یہ لوگ (قوت و شوکت میں) زیادہ بڑھے ہوئے ہیں یا شیخ (بادشاہ مین) کی قوم اور جو قومیں اُن سے پہلے ہو گزری ہیں (مثلاً عاد و ثمود وغیرہ) یعنی یہ قومیں زیادہ بڑھی ہوئی تھیں مگر ہم نے اُن کو (بھی) ہلاک کر ڈالا (محض اسلئے کہ) وہ نافرمان تھے (سو یہ لوگ اگر نافرمانی سے باز نہ آئیں گے تو یہ کیونکر اپنے کو بچالیں گے) اور (آگے قیامت کی صحت اور حکمت کا بیان ہے کہ) ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اُس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعلِ عبث کرنے والے ہوں (بلکہ) ہم نے ان دونوں کو (ان کی دوسری مخلوق سمیت) کسی حکمت ہی سے بنایا ہے (مثلاً ان سے ایک تو اللہ کی قدرت کاملہ پر دلالت ہوتی ہے، دوسرے جزا و سزا کا ثبوت ملتا ہے) لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے (کہ جو ذات ایسے عظیم اجسام کو ابتداء پر پیدا کرنے پر قادر ہو وہ ان کی دوبارہ تخلیق پر بھی قادر ہے) بیشک فیصلہ کا دن (یعنی قیامت کا دن) ان سب کے دوبارہ زندہ ہونے اور جزا و سزا ملنے کا وقت مقرر ہے (جس کا وقوع اپنے موقع پر ضرور ہوگا، آگے قیامت کے کچھ واقعات ہیں۔ یعنی) جس دن کوئی علاقہ والا کسی علاقہ والے کے ذرا کام نہ آوے گا، اور نہ اور ہی کسی کی طرف سے، مثلاً ان کے مرنے والے خداؤں کی طرف سے) انکی کچھ حمایت کیجاو گی، ہاں مگر جس پر اللہ رحم فرمائے (کہ رحمت سے اسکے حق میں باری تعالیٰ کی اجازت سے کی گئی سفارش کام آو گی اور اللہ اسکا ناصر ہوگا) وہ (اللہ) زبردست ہر کافروں سے انتقام لیگا (مہربان ہے) مسلمانوں پر رحمت فرما دے گا۔

## معارف و مسائل

فَاٰتُوا بِاَبْنَائِكُمْ كَمَا بَٰتِلَآءٌ فَرِحُوْا بِهِمْ فِيْ يَوْمِهِمْ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُتَّعَيْنٰ۟نَ (اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لا موجود کرو) قرآن کریم نے اُن کے اس اعتراض کا جواب اس لئے نہیں دیا کہ بالکل ظاہر تھا اور وہ یہ کہ تمام انسانوں کی دوبارہ زندگی کا دعویٰ آخرت میں کیا جا رہا ہے، اُسی وقت اللہ تعالیٰ سب کو زندہ کرے گا۔ دنیا میں موت و حیات قدرت کے مخصوص قوانین اور مصالح کی پابند ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس وقت کسی کو دوسری زندگی عطا نہیں فرما رہا تو یہ اس بات کی دلیل کیسے بن گئی کہ آخرت میں بھی وہ دوبارہ زندہ نہ کر سکے گا۔ منطقی اصطلاح میں اس جواب کو یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ مقید کا عدم وقوع مطلق کے عدم وقوع کو مستلزم نہیں ہو سکتا (بیان القرآن)

قوم یثیع کا واقعہ | اَھْمُ خَیْرٍ اَمْ قَوْمٌ مُّبِیْنٌ (کیا یہ لوگ شان و شوکت کے اعتبار سے بڑھے ہوئے ہیں یا یثیع کی قوم) قرآن کریم میں قوم یثیع کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ایک یہاں اور دوسرے سورہ ق میں، لیکن دونوں مقامات پر اسکا صرف نام ہی مذکور ہے کوئی مفصل واقعہ مذکور نہیں۔ اس لئے اس بارے میں مفسرین نے طویل بحثیں کی ہیں کہ اس سے کون مراد ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ یثیع کسی فرد معین کا نام نہیں، بلکہ یہ یمن کے ان حمیری بادشاہوں کا متواتر لقب رہا ہے جنہوں نے ایک عرصہ دراز تک یمن کے مغربی حصہ کو دار السلطنت قرار دیکر عرب، شام، عراق اور افریقہ کے بعض حصوں پر حکومت کی۔ اسی لئے یثیع کی جمع تبایعہ آتی ہے اور ان بادشاہوں کو تبایعہ یمن کہا جاتا ہے یہاں ان تبایعہ میں سے کوئی نسا یثیع مراد ہے؟ اس بارے میں حافظ ابن کثیرؒ کی تحقیق زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد یثیع اوسط ہے جسکا نام اسعد ابو کریم بن ملکہ بن یحییٰ ہے۔ یہ بادشاہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کم از کم سات سو سال پہلے گزرا ہے اور حمیری بادشاہوں میں اسکی مدت سلطنت سب سے زیادہ رہی ہے اس نے اپنے عہد حکومت میں بہت سے علاقے فتح کئے یہاں تک کہ سمرقند تک پہنچ گیا۔ محمد بن حنفیہؒ کی روایت ہے کہ انہی فتوحات کے دوران وہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کی بستی سے گزرا اور اس پر چڑھائی کا ارادہ کیا۔ اہل مدینہ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ دن کے وقت اس سے جنگ کرتے اور رات کو اس کی مہمانی کرتے۔ اس سے اس کو شرم آئی اور اس نے مدینہ والوں سے لڑائی کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ اسی دوران وہاں کے دو یہودی عالموں نے اُسے تنبیہ کی کہ اس شہر پر اسکا بس نہیں چل سکتا اسلئے کہ یہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہجرت ہے، چنانچہ وہ ان یہودیوں کو ساتھ لے لیکر یمن چلا آیا، اور ان یہودیوں کی تعلیم و تبلیغ سے متاثر ہو کر اُس نے دین موسوی کو قبول کر لیا جو اسوقت دین برحق تھا، پھر اس کی



قوم بھی اس سے متاثر ہو کر اسلام لے آئی لیکن اسکی وفات کے بعد یہ قوم پھر گمراہ ہو گئی اور اُسے بت پرستی اور آتش پرستی شروع کر دی جس کے نتیجے میں اُن پر وہ قہر الہی نازل ہوا جسکا مفصل ذکر سورۃ سبا میں چکا ہے (خلاصہ از تفسیر ابن کثیر ص ۱۴۲ ج ۲) اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس تیغ کا یہاں ذکر ہے وہ بذات خود اسلام لے آیا تھا البتہ اس کی قوم بعد میں گمراہ ہو گئی تھی یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں دونوں جگہ قوم تیغ کا ذکر کیا گیا ہے، تیغ کا نہیں۔ اسکی تائید حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایتوں سے بھی ہوتی ہے جنہیں ابن ابی حاتم، امام احمد، اور طبرانی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، لَا تَسْبُوا تَبْعَافَانَا قَدْ كَانَ اسلم، تیغ کو برا بھلا مت کہو، اس لئے کہ وہ اسلام لے آیا تھا (حوالہ مذکور)

مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (ہم نے ان دونوں یعنی زمین و آسمان کو کسی حکمت ہی سے بنایا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے) مطلب یہ ہے کہ اگر سوچنے سمجھنے والی عقل ہو تو آسمان و زمین اور ان کے اندر جو مخلوقات پیدا کی گئی ہیں وہ سب بہت سے حقائق پر دلالت کرتی ہیں مثلاً ایک تو قدرت خداوندی پر۔ دوسرے آخرت کے امکان پر، کیونکہ جس ذات نے ان عظیم اجسام کو عدم سے وجود عطا کیا وہ یقیناً اس بات پر بھی قادر ہے کہ انہیں ایک مرتبہ فنا کر کے دوبارہ پیدا کر دے۔ تیسرے جزا و سزا کی ضرورت پر، کیونکہ اگر آخرت کی جزا و سزا نہ ہو تو یہ سارا کارخانہ وجود بیکار ہو جاتا ہے۔ اسکی تخلیق کی تو حکمت ہی یہ ہے کہ اسے دارالامتحان بنایا جائے، اور اسکے بعد آخرت میں جزا و سزا دی جائے۔ در نہ نیک و بد دونوں کا انجام ایک ہونا لازم آتا ہے جو اللہ کی شان حکمت سے بعید ہے۔ چوتھے یہ کائنات سوچنے سمجھنے والوں کو اطاعت خداوندی پر ابھارنے والی بھی ہے کیونکہ یہ ساری مخلوقات اُسکا بہت بڑا انعام ہیں، اور بندے پر واجب ہے کہ اس نعمت کا شکر اسکے خالق کی اطاعت کر کے ادا کرے۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزُّقُومِ ۝ طَعَامُ الْآثِمِينَ ۝ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي لَبْطُونٍ ۝

مقرر درخت زہند کا کھانا ہے گنہگار کا جیسے پگھلا ہوا تانبا کھوتا ہے لبتوں میں

كغلي الحميم ۝ خذوه فاعذبوه ۝ إِلَىٰ سَوَاءٍ الْجَحِيمِ ۝

جیسے کھوتا پانی پکڑو اس کو اور دھکیل کر بیجاؤ بیچوں بیچ دوزخ کے پھر

صَبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ۝ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ

ڈالو اس کے سر پر جلتے پانی کا عذاب یہ چکھ، تو ہی ہے بڑا عزت والا

الْكَرِيمِ ۝ إِنَّ هَذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ ۝ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي

سردار یہ وہی ہے جس میں تم دھوکے میں پڑے تھے بیشک ڈرنے والے گھر

مَقَامٍ اَعِيْنُ ۵۱) فِيْ جَنَّتٍ وَّ عِيُوْنٍ ۵۲) يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ

میں ہیں چین کے باغوں میں اور چشموں میں پہنتے ہیں پوشاک ریشمی پتلی اور

اِسْتَبْرَقٍ مُّتَقَبِلِيْنَ ۵۳) كَذٰلِكَ ۵۴) وَ زَوْجُهُمْ يُحَوِّرُ عِيْنَ ۵۵)

گاڑھی ایک دوسرے کے سامنے اسی طرح ہوگا اور بیاہ دیں ہم اُن کو عورتیں بڑی آنکھوں والیاں

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِيْنٍ ۵۶) لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ

منگوائیں گے وہاں ہر میوہ دلچسپی سے نہ چکھیں گے وہاں موت

اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُولٰٓئِ ۵۷) وَ وَفَّيْنٰهُمْ عَنْ اَبِ الْجَحِيْمِ ۵۸) فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ

مگر جو پہلے آچکی اور بچایا اُن کو دوزخ کے عذاب سے فضل سے تیرے رب کے

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۵۹) فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ

یہی ہے بڑی مراد ملنی سو یہ قرآن آسان کیا ہم نے اسکو تیری بولی میں تاکہ

يَتَذَكَّرُوْنَ ۶۰) فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مَّرْتَقِبُوْنَ ۶۱)

وہ یاد رکھیں اب تو راہ دیکھ وہ بھی راہ سمجھتے ہیں

## خلاصہ تفسیر

بیشک زقوم کا درخت (جس کی تحقیق سورہ صافات کے دوسرے رکوع میں گزر چکی ہے) بڑے

مجرم (یعنی کافر) کا کھانا ہوگا جو (صورت کے مکروہ ہونے میں) تیل کی تلچھن جیسا ہوگا (اور) وہ پتے

میں ایسا کھولیکا جیسا تیز گرم پانی کھولتا ہے (اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس کو پکڑو پھر کھینچتے ہو

دوزخ کے نیچوں پہنچ تک لیجاؤ، پھر اسکے سر کے اوپر تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑو (اور اس

سے بطور استہزار کھا جائے گا کہ) لے چکھ! تو بڑا معزز مکرم ہے (یہ تیری تعظیم ہو رہی ہے جیسا

تو دنیا میں اپنے آپ کو معظم و مکرم سمجھ کر ہمارے احکام سے عار کیا کرتا تھا اور دوزخیوں سے کہا

جائیگا کہ) یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک (والکار) کیا کرتے تھے (یہ تو کافر دوزخیوں کا حال ہوا

آگے اہل ایمان کا ذکر ہے کہ) بیشک خدا سے ڈرنے والے امن (چین) کی جگہ میں ہوں گے یعنی

باغوں میں اور نہروں میں (اور) وہ لباس پہنیں گے باریک اور دبیر ریشم کا، آسنے سامنے بیٹھے

ہونگے (اور یہ) بات اسی طرح ہے، اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں سے بیاہ

کر دیں گے (اور) وہاں اطمینان سے ہر قسم کے میوے منگاتے ہونگے (اور) وہاں وہ بجز اس موت

کے جو دنیا میں آچکی تھی اور موت کا ذائقہ بھی نہ چکھیں گے (یعنی مریں گے نہیں) اور اللہ تعالیٰ

اُن کو دوزخ کے عذاب سے (بھی) بچالے گا (اور) یہ سب کچھ آپ کے رب کے فضل سے ہوگا، بڑی کامیابی



یہی ہے (اور اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا کام اتنا ہے کہ آپ ان کو کہتے رہیں) سو (اسی غرض سے) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان (عربی) میں آسان کر دیا تاکہ یہ (اس کو سمجھ کر اس سے) نصیحت قبول کریں تو (اگر یہ لوگ نہ مانیں تو) آپ (ان پر مصائب کے نزول کے) منتظر رہیں، یہ لوگ بھی (آپ پر مصائب کے نزول کے) منتظر ہیں (پس آپ تبلیغ سے زیادہ فکر میں نہ پڑیں، نہ مخالفت پر رنج کیجئے، ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے صبر کیجئے، وہ خود سمجھ لے گا)۔

## معارف و مسائل

ان آیات میں آخرت کے کچھ احوال بیان کئے گئے ہیں، اور عادت کے مطابق یہاں بھی قرآن کریم نے دوزخ اور جنت دونوں ہی کے احوال یکے بعد دیگرے بیان فرمائے ہیں۔

ان شَجَرَاتِ الزَّيْتُونِ، زقوم کی حقیقت سے متعلق کچھ ضروری باتیں سورۃ صافات کی تفسیر میں لکھی جا چکی ہیں وہاں ملاحظہ فرمائی جائیں۔ یہاں اتنی بات قابل ذکر ہے کہ قرآن کریم کی آیات سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ کفار کو زقوم دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے ہی کھلایا جائے گا کیونکہ یہاں زقوم کھلانے کے بعد یہ حکم مذکور ہے کہ ”اسے کھینچ کر دوزخ کے بیچوں بیچ لیجاؤ“ اس کے علاوہ سورۃ واقعہ کی آیت ”هَذَا الَّذِي هُمْ يُنْزَلُونَ“ سے بھی بعض حضرات نے یہی سمجھا ہے، کیونکہ ”نزل“ ان کے نزدیک اصلاً مہمان کی اس خاطر تواضع کو کہا جاتا ہے جو اصل دعوت سے پہلے کی جائے، بعد کے کھانے کو ”ضیافۃ“ یا ”مأدبۃ“ کہتے ہیں۔ یوں قرآنی الفاظ میں احتمال اسکا بھی ہے کہ زقوم کا کھلانا دخول جہنم کے بعد ہو۔ اس صورت میں ”نزل“ کا استعمال دعوت کے اصل کھانے کے معنی میں تو سعا ہوگا۔ اور آیت زیر تفسیر میں جو اس کے بعد جہنم کی طرف گھسیٹ لیجانے کا ذکر ہے اسکا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تھا تو پہلے بھی جہنم ہی میں، لیکن زقوم کھلانے کے بعد اسے مزید تذلیل اور ایذا رسانی کے لئے دوزخ کے وسط میں لیجایا جائے گا۔ واللہ اعلم (محض از بیان القرآن)

ان الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ، ان آیات کے ذریعہ جنت کی سرمدی نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور نعمت کی تقریباً تمام اصناف کو جمع کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انسانی ضرورت کی چیزیں عموماً یہ ہوتی ہیں: عمدہ رہائش گاہ، عمدہ لباس، بہتر شریک زندگی، بہتر ماکولات، پھر ان سب نعمتوں کے باقی رہنے کی ضمانت اور رنج و تکلیف سے کُلّی طور پر مومن رہنے کا یقین۔ یہاں ان چھ باتوں کو اہل جنت کے لئے ثابت کر دیا گیا ہے جیسا کہ ان چھ باتوں پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہے۔ یہاں اہل جنت کی قیام گاہ کو ”امین“ (پُر امن) کہہ کر اس طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا، کہ انسانی رہائش گاہ کی سب سے قابل تعریف صفت اسکا پُر امن یعنی خطرات سے محفوظ ہونا ہے۔

سُنْدُسٍ وَاِسْتَبْرَقٍ ، یہ دونوں ریشمی کپڑوں کے نام ہیں، سُنْدُس رقیق ریشم کا کپڑا ہے اور استبرق دبیر ریشم کا۔

وَزَوْجَتْهُمَا يُحَوِّرُ عَيْنَیْنِ ، تزویج کے معنی اصل میں ہیں کسی کو کسی کا جوڑ قرار دیدینا۔ بعد میں یہ لفظ نکاح کرانے کے معنی میں بکثرت استعمال ہونے لگا ہے۔ اس جگہ اسکے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جنتی مردوں کا حورِ عین سے باقاعدہ عقدِ نکاح کر دیا جائے گا، اور اگرچہ جنت میں کوئی شخص احکام کا مکلف نہیں ہوگا لیکن یہ عقدِ نکاح بطور اعزاز و اکرام کے ہوگا اسلئے کوئی اشکال نہیں، اور اگر پہلے معنی لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ حورِ عین کو جنتی مردوں کا جوڑا قرار دیدیا جائے گا، اور وہ جنتی عورتیں بطور بہانہ عطا کر دی جائیں گی اور اس کے لئے دنیا کی طرح عقدِ نکاح کی ضرورت نہیں ہوگی۔

لَا یَكُونُ فِیْهَا الْمَوْتُ اِلَّا الْمَوْتِ الْاُولٰی ، مطلب یہ ہے کہ جو موت ایک مرتبہ آپہنچی بس وہ آپہنچی، اسکے بعد کوئی موت ان پر نہیں آئے گی۔ اور یہ بات اگرچہ اہل جہنم کو بھی حاصل ہوگی، لیکن ظاہر ہے کہ وہ ان کے لئے اور زیادہ تکلیف کا سبب ہوگی اور اہل جنت کیلئے مسرور و کیف میں اضافے کا باعث۔ کیونکہ نعمتِ خواہ کتنی بڑی ہو اسکے زوال کا تصور لازماً کدورت کا سبب ہوتا ہے اور اہل جنت جب یہ تصور کریں گے کہ یہ نعمتیں کبھی ہم سے نہیں چھینیں گی تو اس سے ان کی مسرتوں میں اضافہ ہوگا۔

الحمد للہ کہ آج بتائے رجب ۱۳۹۲ھ بروز پنجشنبہ بوقت نمازِ عشاء سورۃ دُخان کی تفسیر مکمل ہوئی

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَاٰخِرًا وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ اٰجَمَعِیْنَ





سُورَةُ الْجَاثِيَةِ

سُورَةُ الْحَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعٌ وَثَلَاثُونَ آيَةً وَأَرْبَعٌ رُكُوعًا

سُورۂ حاشہ مکہ میں نازل ہوئی اس میں سینتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

مشروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حَمْدُ ١ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ٢ إِنَّ فِي

اُتنا کتاب کا ہے اللہ کی طرف سے جو زیر دست ہے حکمتوں والا

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٣﴾ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا

آسمانوں میں اور زمین میں بہت فشانیاں ہیں مانتے والوں کے واسطے اور تمہارے بتانے میں اور

يَبْتَ مِنْ دَابَّةٍ آتَتْ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿٣٧﴾ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ

حقد رکھنا رکھے ہیں حاور نشانیاں ہیں لوگوں کے واسطے جو یقین رکھتے ہیں اور بدلنے میں رات

وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ

۱۲۔ ان کے اور وہ جو اُتاری اللہ نے آسمان سے روزی پھر زندہ کر دیا

الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ آيَةُ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٥﴾

میں نے یہ کہ اس کو جان کر اور اس کے لئے یہ کہ نشانہ لے کر وہ ایک نیکو و مسطح صحیح سرگرمی ہے

تَاَوَّابٌ اِلَيْهِ ۝ اَللّٰهُ نَتَّلُوْهُمَا عَلٰۤى اَفْوَۡحٍ فَآۡتٍ ۝۱۰۰ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنْ اَبِي سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ مَنْ تَوَلَّى بَعْدَ اَدْبَارِ يَدَيْهِ مِائَةً مِّنَ النَّاسِ لَمْ يَمُتْ

بَلِّغْ أَيْبَ الدِّينِ بِأَيِّ يَدٍ شِئْتَ

یہ بایں ہیں اللہ کی ہم سنائے ہیں مجھ کو نصیب نصیب چھر کوسنی بات کو اللہ اور

اللہ وَأَرْسِلَ رُسُلًا مِنْهُ ۖ (۶) وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يَأْتِيَ السَّحَابَ (۷) لَسْمَعِ

[illegible]

اِس کی باتوں کو چھوڑ کر مانیں گے۔

اٰیۃ اللہ سے علیہ الرحمہ مستدیرا کہ ان کو یہ سمجھا جائے کہ

بَعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ وَإِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَ هَاهُ وَوَا

اس کو ایک عذاب دردناک کی، اور جب خبر پائے ہماری باتوں میں سے کسی کی، اس کو ٹھہرائے ٹھٹھا

أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝ ۹ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمْ جَهَنَّمَ وَلَا يُغْنِي

ایسوں کو ذلت کا عذاب ہے پرے اُن کے دوزخ ہے اور کام نہ آئے گا

عَنْهُمْ مَا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ ۝

انکے جو کمایا تھا ذرا بھی اور نہ وہ کہ جن کو پکڑا تھا اللہ کے سوائے رفیق

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ ۱۰ هَذَا هُدًى وَالَّذِينَ كَفَرُوا ابْزَتْ رَحْمَةُ

اور ان کے واسطے بڑا عذاب ہے یہ سبھا دیا اور جو منکر ہیں اپنے رب کی باتوں سے

لَهُمْ عَذَابٌ مِنْ رَجْزٍ أَلِيمٍ ۝ ۱۱

انکے لئے عذاب ہے ایک بلا کا دردناک

## خلاصہ تفسیر

حکم، یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے (اور جب یہ ایسی کتاب ہے تو اسکے مضامین کو خوب توجہ سے سُننا چاہیے، چنانچہ اس مقام پر ایک مضمون تو توحید کا ہی جسکا بیان یہ ہے کہ) آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کے (استدلال کے) لئے بہت سے دلائل (قدرت اور توحید کے) ہیں اور (اسی طرح) خود تمھارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں جن کو (زمین پر) پھیلا رکھا ہے (نیز) دلائل (قدرت و توحید) ہیں اُن لوگوں کے (سمجھنے کے) لئے جو یقین رکھتے ہیں اور (اسی طرح) یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اور (اسی طرح) اُس (ماوۃ) رزق میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اُتارا (مراد بارش ہے) پھر اُس (بارش) سے زمین کو تر و تازہ کیا اسکے خشک ہوئے پیچھے اور (اسی طرح) ہواؤں کے بدلنے میں (باعتماد سمت اور کیفیت کے کہ کبھی پُر واپے کبھی پچھوا۔ کبھی گرم ہے، کبھی سرد۔ غرض ان سب چیزوں میں) دلائل (قدرت و توحید موجود) ہیں اُن لوگوں کے لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں (اس سے توحید پر استدلال کا طریقہ پارہ دوم اِنْ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ الْاُخْرٰی میں گزر چکا ہے اور دوسرا مضمون نبوت کا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو صحیح طور پر ہم آپ کو پڑھ کر سُناتے ہیں (جس سے نبوت ثابت ہوتی ہے لیکن اتنی بڑی دلیلِ معجز کے باوجود بھی اگر یہ لوگ نہیں مانتے) تو پھر اللہ اور اس کی (ایسی) آیتوں کے بعد اور کونسی بات (اس سے بڑھ کر ہوگی جس) پر یہ لوگ ایمان لا دیں گے (اور تیسرا مضمون آخرت کا ہے جس میں ان مخالفین حق کو سزا بھی ہوگی جسکا بیان یہ ہے کہ) بڑی فراہی ہوگی ہر ایسے شخص کے



لئے جو (عقائد سے متعلق اقوال میں) جھوٹا ہو (اور اعمال میں) نافرمان ہو جو (باد جو دیکھ) خدا کی آیتوں کو سنتا (بھی) ہے جبکہ وہ اس کے رد پر دیر ہی جاتی ہیں (اور) پھر بھی وہ تکبر کرتا ہوا (اپنے کفر پر) اس طرح اڑا رہتا ہے جیسے اُس نے ان (آیتوں) کو سنا ہی نہیں، سو ایسے شخص کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے (اور اُس شخص کی شرارت کا یہ حال ہو کہ) جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی آیت کی خبر پاتا ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے ایسے لوگوں کیلئے (آخرت میں) ذلت کا عذاب (ہونیوالا) ہے (مطلب یہ کہ جن آیتوں کو تلاوت میں سنتا ہے انکی بھی تکذیب کرتا ہے اور جن آیتوں کی ویسے ہی خبر سن لیتا ہے انکی بھی تکذیب کرتا ہے غرض تکذیب کی بات میں بہت بڑھا ہوا ہے۔ آگے اُس عذاب کی تعیین ہی یعنی) اُنکے آگے جہنم (آ رہا) ہے اور (اُس وقت) نہ تو اُنکے وہ چیزیں ذرا کام آویں گی جو (دُنیا میں) کما گئے تھے (اس میں اموال اور اعمال سب آگئے) اور نہ وہ (کام آویں گے) جن کو اُنھوں نے اللہ کے سوا کارساز (اور معبود) بنا رکھا تھا اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہوگا (اور وجہ اس عذاب کی یہ ہو کہ) یہ قرآن سرتا سر ہدایت (اور واجب التسلیم) اور (اس کا مقتضایہ ہی ہے کہ) جو لوگ اپنے رب کی (ان) آیتوں کو نہیں مانتے ان کیلئے سختی کا دردناک عذاب ہوگا۔

## معارف و مسائل

یہ پوری سورت مکی ہے، صرف ایک قول یہ ہو کہ آیت قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ آيَاتِ اللَّهِ مدنی ہے اور باقی مکی، لیکن جمہور کے قول کے مطابق پوری سورت قبل الهجرة ہی نازل ہوئی ہے۔ اور دوسری مکی سورتوں کی طرح اس کا بنیادی مضمون عقائد ہی کی اصلاح ہے، چنانچہ اس میں توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد ہی کو مختلف طریقوں سے مدلل کیا گیا ہے، خاص طور سے آخرت کے اثبات کے دلائل، منکرین کے شبہات اور دہریوں کی تردید اس میں زیادہ تفصیل سے آئی ہے۔

لَا يَرْجُونَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا يَتَذَكَّرُونَ أَلَمَ الْيَوْمِينِ، ان آیات سے توحید کا اثبات مقصود ہے۔ اس سے ملتی جلتی آیتیں دوسرے پارے کے رکوع اِنْ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ میں گزر چکی ہیں، وہیں ان کی مفصل تفسیر مذکور ہے اور یہ بھی کہ ان چیزوں سے توحید کیونکر ثابت ہوتی ہے دونوں مقامات میں عنوان کا جو تھوڑا تھوڑا فرق ہے اُس سے متعلق نکات اہل علم امام رازی کی تفسیر کبیر میں دیکھ سکتے ہیں۔ البتہ ایک بات قابل ذکر ہے کہ یہاں کائنات کی مختلف نشانیاں بیان فرما کر ایک جگہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اسمیں ایمان لانے والوں کے لئے "نشانیاں ہیں، دوسری جگہ ارشاد ہے کہ "یقین کرنے والوں کے لئے" نشانیاں ہیں اور تیسری جگہ ارشاد ہے کہ "عقل رکھنے والوں" کے لئے نشانیاں ہیں اسمیں اسلوب کے تنوع کے علاوہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ان نشانیوں سے پورا فائدہ تو وہی اٹھا سکتے ہیں جو ایمان لے آئیں۔ دوسرے نمبر پر یہ اُن لوگوں کے لئے مفید ہو سکتی ہیں جو خواہ فوراً

ایمان نہ لائیں لیکن انکے دل میں یقین پیدا ہو جائے کہ یہ چیزیں توحید پر دلالت کر رہی ہیں کیونکہ یہ یقین کسی نہ کسی دن ایمان کا سبب بن سکتا ہے اور تیسرے درجہ میں اُن لوگوں کے لئے مفید ہیں جو خواہ فی الحال نہ مومن ہوں نہ یقین رکھنے والے، لیکن عقل سلیم رکھتے ہوں اور ان میں بصیرت کے ساتھ غور کریں۔ کیونکہ عقل و بصیرت کے ساتھ جب بھی ان نشانیوں پر غور کیا جائے گا، بالآخر اس سے ایمان و یقین ضرور پیدا ہو کر رہے گا۔ ہاں جو لوگ عقل سلیم نہ رکھتے ہوں یا ان معاملات میں عقل کو تکلیف دینا ہی گوارا نہ کریں ان کے سامنے ہزار دلائل پیش کر لیجئے سب ناکافی رہیں گے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (بڑی خرابی ہوگی اس شخص کے لئے جو جھوٹا اور نافرمان ہو) اس آیت کے شان نزول میں متعدد روایات ہیں۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نصرت بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی، بعض میں ہے کہ حارث بن کلدہ کے بارے میں، اور بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد ابو جہل اور اسکے اصحاب ہیں (قطبی) اور درحقیقت قرآنی مفہوم کی تشریح کے لئے کسی ایک شخص کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں "کُل" کا لفظ بتا رہا ہے کہ خواہ نزول آیت کے پس نظر میں یہ تینوں افراد ہوں لیکن مراد ہر وہ شخص ہے جو ان جیسی صفات کا حامل ہو۔

مِنْ ذُرِّيَّتِهِمْ مَكَتُومَةٍ (دراے) کا لفظ عربی میں "پچھے" کے لئے زیادہ اور سامنے "کیلئے" کم استعمال ہوتا ہے لیکن اکثر مفسرین نے یہاں "سامنے" کے معنی قرار دیئے ہیں۔ چنانچہ خلاصہ تفسیر میں ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے البتہ بعض مفسرین نے "پچھے" کے معنی لئے ہیں اور مطلب یہ قرار دیا ہے کہ دنیا میں وہ جس نخوت و تکبر کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اسکے پچھے یعنی بعد میں جہنم آئیوالی ہے (قطبی)

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لَتَجْرِيَ الْفُلُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ

الشر وہ ہے جس نے بس میں کر دیا تمہارے دریا کو کہ چلیں اسیں جہاز اسکے حکم سے اور تاکہ تلاش کرو اسکے

فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٢﴾ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي

فضل سے اور تاکہ تم حق مانو اور کام میں لگا دیا تمہارے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور

الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١٣﴾ قُلْ

زمین میں سب کو اپنی طرف سے، اسیں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو دھیان کرتے ہیں کہہ دے

لِّلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا

ایمان والوں کو درگزر کریں اُن سے جو اُمید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی تاکہ وہ سزا دے

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿١٤﴾ مَّنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ

ایک قوم کو بدلہ اسکا جو کھاتے تھے، جس نے بھلا کام کیا تو اپنے واسطے اور جس نے بُرا کیا



فَعَلَيْهَا ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿۱۵﴾

سواپنے حق میں، پھر اپنے رب کی طرف پھیرے جاؤ گے

## خلاصہ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے (فائدہ کے) لئے دریا کو مسخر (قدرت) بنایا تاکہ اسکے حکم سے ہمیں کشتیاں چلیں اور تاکہ (ان کشتیوں میں سفر کر کے) تم اس کی روزی تلاش کرو اور تاکہ (وہ روزی حاصل کر کے) تم شکر کرو اور (اسی طرح) جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے (یعنی اپنے حکم اور فضل سے) مسخر (قدرت) بنایا (تاکہ تمہارے منافع کا سبب ہو) بیشک ان باتوں میں اُن لوگوں کے لئے دلائل (قدرت) ہیں جو غور کرتے رہتے ہیں (اور کفار کی شرارتوں پر بعض اوقات مسلمانوں کو غصہ آجایا کرتا تھا، آگے ان کو درگزر کرنے کا حکم ہے) آپ ایمان والوں سے فرمادیجئے کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو خدا تعالیٰ کے معاملات (یعنی آخرت کی جزا و سزا) کا یقین نہیں رکھتے، تاکہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو (یعنی مسلمانوں کو) انکے (اس) عمل (نیک) کا (اچھا) صلہ دے (کیونکہ وہاں کا قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص نیک کام کرتا ہے سواپنے ذاتی نفع (و ثواب) کے لئے (کرتا ہے) اور جو شخص بُرا کام کرتا ہے اسکا وبال اُسی پر پڑتا ہی پھر (سب نیک و بد کام کر نیچے بعد) تم کو اپنے پروردگار کے پاس ٹوٹ کر جانا ہے (پس وہاں تم کو تمہارے اچھے اعمال و اخلاق کا بہترین صلہ اور تمہارے مخالفین کو ان کے کفر و معاصی پر بدترین سزا دی جائیگی، لہذا تم کو یہاں درگزر ہی مناسب ہے)۔

## معارف و مسائل

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ (تا) وَ لَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ، قرآن کریم میں فضل تلاش کرنے سے مراد عموماً کسب معاش کی جدوجہد ہوتی ہے۔ یہاں اسکا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں سمندر میں کشتی رانی پر اس لئے قدرت دی گئی تاکہ اسکے ذریعہ تم تجارت کر سکو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فضل تلاش کرنے کا کشتی رانی سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ یہ تسخیر بحر کی ایک مستقل قسم ہو، اور مطلب یہ ہو کہ سمندر میں بہت سی نفع بخش چیزیں پیدا کر کے سمندر کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم انہیں تلاش کر کے نفع اٹھاؤ۔ چنانچہ جدید سائنس کی رو سے یہ معلوم ہے کہ سمندر میں اسقدر معدنی ذخائر اور زمین کی پوشیدہ دولتیں ہیں کہ اتنی خشکی میں بھی نہیں ہیں۔

قُلْ لِّلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ أَيْامُ اللَّهِ، (آپ ایمان والوں سے

فرمادیجئے کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو خدا تعالیٰ کے معاملات کا یقین نہیں رکھتے، اس آیت کے شان نزول میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مکہ مکرمہ میں کسی مشرک نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر دشنام طرازی کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کے بدلے میں اسے کچھ تکلیف پہنچانے کا ارادہ فرمایا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس روایت کے مطابق یہ آیت مکی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ غزوہ بنو المصطلق کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے مریض نامی ایک کنوئیں کے قریب پڑا وڈالا منہ کا سردار عبداللہ بن ابیؓ بھی مسلمانوں کے لشکر میں شامل تھا، اُس نے اپنے غلام کو کنوئیں سے پانی بھرنے کے لئے بھیجا، اُسے واپسی میں دیر ہو گئی۔ عبداللہ بن ابیؓ نے وجہ پوچھی تو اُس نے کہا کہ حضرت عمرؓ کا ایک غلام کنوئیں کے ایک کنارے پر بیٹھا ہوا تھا، اُس نے کسی کو اس وقت تک پانی بھرنے کی اجازت نہیں دی جب تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے شکیرے نہیں بھر گئے۔ اس پر عبداللہ بن ابیؓ نے کہا کہ ”ہم پر اور ان لوگوں پر تو وہی مثل صادق آتی ہر سمن کلک یا کلک (اپنے کتے کو موٹا کرو تو وہ تم کو کھا جائے گا)“ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ تلوار سنبھا کر عبداللہ بن ابیؓ کی طرف چلے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس روایت کے مطابق یہ آیت مدنی ہے (قرطبی روح المعانی) ان روایتوں کی اسنادی تحقیق سے اگر دونوں کی صحت ثابت ہو تو دونوں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ دراصل یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکی تھی، پھر جب غزوہ بنو المصطلق کے موقع پر اسی سے ملتا جلتا واقعہ پیش آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو اُس موقع پر بھی تلاوت فرما کر واقعہ کو اس پر بھی منطبق فرمایا۔ اور شان نزول کی روایات میں ایسا بکثرت ہوا ہے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام یا دہانی کے لئے غزوہ بنو المصطلق کے واقعہ میں دوبارہ یہ آیت لے آئے ہوں کہ یہ موقع اس آیت پر عمل کرنے کا ہے۔ اُصول تفسیر کی اصطلاح میں اسے ”نزول مکرر“ کہا جاتا ہے اور آیت میں آیات اللہ کے لفظ سے مراد بیشتر مفسرین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے وہ معاملات ہیں جو وہ آخرت میں انسانوں کے ساتھ کرے گا یعنی جزا و سزا۔ کیونکہ آیات اللہ کا لفظ ”واقعات و معاملات“ کے معنی میں عربی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

یہاں دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ بات یوں بھی کہی جاسکتی تھی کہ ”آپ ایمان والوں سے فرمادیجئے کہ وہ مشرکین سے درگزر کریں“ اس کے بجائے کہا یوں گیا ہے کہ ”ان لوگوں سے درگزر کریں، جو خدا تعالیٰ کے معاملات کا یقین نہیں رکھتے“ اس سے شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ان لوگوں کو اصل سزا آخرت میں دی جائیگی اور چونکہ یہ لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے اس لئے یہ سزا ان کے لئے غیر متوقع اور اچانک ہوگی، اور غیر متوقع تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے اس لئے انکو پہنچنے والا عذاب بہت سخت ہوگا اور اس کے ذریعہ ان کی تمام بد عنوانیوں کا پورا پورا بدلہ لے لیا جائیگا۔



دنیا میں آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کی گرفت کی فکر نہ کیجئے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس آیت کا حکم جہاد کے احکام نازل ہونے کے بعد منسوخ ہو گیا لیکن بیشتر محقق مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت کا جہاد کے حکم سے کوئی تعلق نہیں، یہ تو عام معاشرت میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا انتقام نہ لینے کی تعلیم ہے جو ہر زمانے کے لئے عام ہے اور آج بھی اس کا حکم باقی ہے۔ لہذا اسے منسوخ قرار دینا درست نہیں، خصوصاً اگر اس کا شان نزول غزوہ بنو المصطلق کا واقعہ ہو تو آیات جہاد اسکے لئے ناسخ نہیں بن سکتیں کیونکہ آیات جہاد اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالْزُّبُرَ وَرَفَقْنَا

اور ہم نے دی بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور پیغمبری اور کھانے کو دیں

مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝۱۶ وَأَتَيْنَاهُم بَيِّنَاتٍ مِّن

سحری چیزیں اور بزرگی دی ان کو جہان پر اور دیں ان کو کھلی باتیں دین

الْآخِرِ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيًّا بَيْنَهُمْ

کی پھر انہوں نے پھوٹ جوڑالی تو سمجھ آپکنے کے بعد آپس کی ضد سے

إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝۱۷

بیشک تیرا رب فیصلہ کریگا ان میں قیامت کے دن جس بات میں وہ جھگڑتے تھے

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ

پھر تجھ کو رکھا ہم نے ایک رستہ پر دین کے کام کے ساتھ اسی پر چل اور مت چل خواہشوں

الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝۱۸ إِنَّهُمْ لَكُنْ يُغْنُوا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَ

پر نادانوں کی وہ ہرگز کام نہ آئیں گے تیرے اللہ کے سامنے ذرا بھی اور

إِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ ۝۱۹

بے انصاف ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اللہ رفیق ہے ڈرنے والوں کا

هَذَا آيَاتُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝۲۰

یہ سوجھ کی باتیں ہیں لوگوں کے واسطے اور راہ کی اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو یقین لاتے ہیں

## خلاصہ تفسیر

اور (نبوت کوئی انوکھی چیز نہیں جو اسکا انکار کیا جائے، چنانچہ اس کے قبل ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (آسمانی) اور حکمت (یعنی علم احکام) اور نبوت دی تھی (یعنی ان میں انبیاء پیدا کئے تھے) اور

ہم نے اُن کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں (اس طرح کہ میدانِ تیرہ میں من و سلوی نازل کیا اور ان کو ملک شام کا مالک بنایا جو برکاتِ ارضیہ کا معدن ہے) اور ہم نے (بعض اُمور میں مثلاً سمندر کو چیر دینا، ابر کا سایہ کرنا وغیرہ) ان کو دنیا جہان والوں پر فوقیت دی اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیلیں دیں (یعنی اُن کو بڑے صریح معجزات دکھائے، غرض حسی معنوی، علمی ہر طرح کی نعمتیں دیں) سو (چاہیے تو یہ تھا کہ خوب اطاعت کرتے مگر) انھوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا بوجہ آپس کی ضدِ ضدی کے (جس کا بیان پارہ دوم رکوع سل بنی اسرائیل الخ میں ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو علم اختلافات ختم کرنے کا سبب ہونا چاہیے تھا انھوں نے نفسا نفسی کیوجہ سے اُلٹا اسے اختلاف کا موجب بنالیا، سو) آپ کا رب اُن کے آپس میں قیامت کے روز اُن اُمور میں (عملی) فیصلہ کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے، پھر (بنی اسرائیل میں دو ربوت ختم ہونے کے بعد) ہم نے آپ کو (نبوت دی اور آپ کو) دین کے ایک خاص طریقے پر کر دیا، سو آپ اسی طریقے پر چلے جائیے (یعنی عمل میں بھی اور تبلیغ میں بھی) اور ان جہلاء کی خواہش پر نہ چلئے (یعنی ان کی خواہش تو یہ ہے کہ آپ تبلیغ ترک کر دیں اور اسی لئے یہ طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں تاکہ آپ تنگ ہو کر تبلیغ چھوڑ دیں، سو آپ سے گو یہ احتمال نہیں مگر امت تبلیغ کے اہتمام کے لئے آپ کو پھر اسکا حکم ہوتا ہے۔ آگے اسی طرز پر اس حکم کی علت فرماتے ہیں کہ) یہ لوگ خدا کے مقابلے میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے (پس ان کا اتباع نہ ہونے پائے) اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں (اور ایک دوسرے کا کہنا مانتے ہیں) اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا (اور اہل تقویٰ اس کا کہنا مانا کرتے ہیں۔ سو جب آپ ظالم نہیں ہیں بلکہ سردارِ متقین ہیں تو آپ کو انکی اتباع سے کیا نسبت؟ البتہ احکامِ الہی کی اتباع سے خاص نسبت ہے، غرض آپ صاحبِ نبوت شرعی حق ہیں اور یہ قرآن (جو آپ کو ملا ہے یہ) عام لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین (یعنی ایمان) لانے والوں کے لئے بڑی رحمت (کا سبب) ہے۔

## معارف و مسائل

ان آیات کا موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات ہے اور اسکے ضمن میں کفار کی اینداز سانیوں پر آپ کی تسلی بھی فرمائی گئی ہے۔ اِن رَبِّكَ يَفْقَهُ بَيْنَهُمَا نَجْوَاكَ کے مضمون آیات سے دو باتیں مستفاد ہوئیں، ایک تو بنی اسرائیل کو کتاب و نبوت دینے سے آپ کی نبوت کی تائید، دوسرے آپ کی تسلی کہ بنی اسرائیل کو اختلاف کی جو وجہ پیش آئی تھی وہی آپ کی قوم کو آپ کے ساتھ اختلاف کرنے میں پیش آئی ہے یعنی حُبِ دنیا اور حسد و فسادِ نیت۔ یہ نہیں کہ



آپ کے دلائل میں کچھ کمی ہو پس آپ غم نہ کریں۔ (بدین القرآن)

پچھلی اُمتوں کی شریعتوں کا حکم ہمارے لئے **لَمْ يَجْعَلْنَا عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ** (پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقے پر کر دیا) یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ دین اسلام کے کچھ تو اصولی عقائد ہیں مثلاً توحید و آخرت وغیرہ اور کچھ علیٰ زندگی سے متعلق احکام ہیں، جہاں تک اصولی عقائد کا تعلق ہے وہ تو ہر نبی کی اُمت میں یکساں رہے ہیں اور ان میں کبھی ترمیم اور تبدیلی نہیں ہوئی لیکن عملی احکام مختلف انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے بدلتے رہے ہیں، آیت مذکورہ میں انہی دوسری قسم کے احکام کو ”دین کے ایک خاص طریقے“ سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اسی وجہ سے فقہار نے اس آیت سے نتیجہ نکالا ہے کہ اُمت محمدیہ کے لئے صرف شریعت محمدی ہی کے احکام واجب العمل ہیں۔ پچھلی اُمتوں کو جو احکام دیئے گئے تھے وہ ہمارے لئے اُس وقت تک واجب العمل نہیں ہیں جب تک قرآن و سنت سے اُن کی تائید نہ ہو جائے۔ پھر تائید کی ایک شکل تو یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں صراحۃً یہ فرمایا گیا ہو کہ فلاں نبی کی اُمت کا یہ حکم ہمارے لئے بھی واجب العمل ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن کریم یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی پچھلی اُمت کا کوئی حکم بطور تحسین و مدح بیان فرمائیں اور اسکے بارے میں یہ نہ فرمائیں کہ یہ حکم ہمارے زمانے میں منسوخ ہو گیا ہے۔ اس سے بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حکم ہماری شریعت میں بھی جاری ہے اور درحقیقت اس حکم کا واجب العمل ہونا بھی اس صورت میں شریعت محمدی کا ایک جز، ہونے کی حیثیت ہی سے ہوتا ہے۔ یہاں اتنی بات مسئلہ کی حقیقت سمجھنے کے لئے کافی ہے تفصیلاً اصول فقہ کی کتابوں میں گورہیں۔

**أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَوْا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ**

کیا خیال رکھتے ہیں جنہوں نے کمائی ہیں بُرائیاں کہ ہم کر دیں گے اُن کو برابران لوگوں کی جو کہ

**آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا سَوَاءٌ قُلُوبُهُمْ وَمَا تَلْمِزُ سَاءَ مَا**

یقین لائے اور کئے بھلے کام ایک سا ہے اُن کا جینا اور مرنا بُرے دعوے ہیں

**يُحْكَمُونَ ۝۲۱ وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ**

جو کرتے ہیں اور بنائے اللہ نے آسمان اور زمین جیسے چاہیں اور تاکہ بدلہ پائے

**كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝۲۲**

ہر کوئی اپنی کمائی کا اور اُن پر ظلم نہ ہوگا

## خلاصہ تفسیر

یہ (قیامت کا انکار کرنے والے) لوگ جو بُرے بُرے کام (کفر و شرک و ظلم و معصیت) کرتے

(اہستے) ہیں، کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اُن کو اُن لوگوں کے برابر رکھیں گے جنہوں نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیا کہ اُن سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے (یعنی مومنین کا مرنا جینا بایں معنی یکساں ہو جائے کہ جس طرح زندگی میں لذتوں سے بہرہ اندوز نہ ہوئے اسی طرح موت کے بعد بھی محروم رہیں۔ اور اسی طرح کافروں کا مرنا جینا بھی بایں معنی یکساں ہو جائے کہ جیسے اس زندگی میں عذاب اور تکلیفوں سے بچے رہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی عذاب سے مامون رہیں۔ مطلب یہ کہ انکارِ معاد سے یہ لازم آتا ہے کہ اطاعتِ بندوں کو کہیں اطاعت کا پھل نہ ملے اور مخالفین پر کبھی مخالفت کا وبال نہ پڑے) یہ برا حکم رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا (ایک حکمت تو یہ ہے کہ ان عظیم الشان مخلوقات کی تخلیق پر قدرتِ مشاہدہ میں آجانے سے ہر ذی عقل یہ بھی سمجھ لے گا کہ جو پہلی مرتبہ ان چیزوں کو پیدا کر سکتا ہے وہ اُن کو فنا کر کے دوبارہ بھی اسی طرح موجود کر سکتا ہے جس سے قیامت و آخرت کا وجود ثابت ہوتا ہے) اور (دوسری حکمت یہ ہے کہ) تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے (اور یہ سب جانتے ہیں کہ دُنیا میں پورا بدلہ ہے نہیں اس لئے آخرت کا ہونا ضروری ہو گیا) اور (اس بدلہ میں) اُن پر ظلم نہ کیا جائیگا۔

## معارف و مسائل

عالمِ آخرت اور اس میں جزا و سزا عقلاً ضروری ہے | مذکورہ دو آیتوں میں سے پہلی آیت کا حاصل ایک عقلی استدلال ہے۔ جزا کے ضروری ہونے پر وہ یہ ہے کہ یہ بات تو ہر شخص کے مشاہدہ میں ہے کسی کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ دُنیا میں اچھے برے اعمال کا بدلہ پورا نہیں ملتا، بلکہ عام طور سے کفار، فجار، دولتِ دُنیا اور عیش عشرت میں زندگی گزارتے ہیں اور اللہ کے اطاعت شعار بندے فقر و فاقہ اور مصائبِ آفات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اول تو دُنیا میں بدکردار مجرموں کے جرم کا علم ہی اکثر نہیں ہوتا، علم بھی ہو گیا تو اکثر پکڑے نہیں جاتے، کبھی پکڑے بھی گئے تو حلالِ حرام جھوٹ سچ کی پروا کئے بغیر سزا سے بچنے کے راستے ڈھونڈ لیتے ہیں اور سیکڑوں میں کسی ایک کو سزا ہو بھی گئی تو وہ بھی اس کے عمل کی پوری سزا نہیں ہوتی۔ اس طرح خدا تعالیٰ کے باغی اپنی خواہشات کے پیرو اس دُنیا کی زندگی میں دُذنائے پھرتے رہتے ہیں اور بیچارے مومن پابندِ شریعت بہت سی دولت اور لذتوں کو تو حرام سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں اور مصائبِ آفات سے بچنے کے لئے بھی صرف جائز طریقے اختیار کرتے ہیں اس لئے دُنیا میں اُن کا بڑی راحتوں اور لذتوں سے محروم رہنا ظاہر ہے۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ اس دُنیا میں اعمال کی پوری جزا نہیں ملتی تو اب اگر اس دُنیا کے بعد دوسرا عالمِ آخرت اور اس میں دوبارہ زندگی اور جزا و سزا کا نفاذ نہ ہو تو پھر دُنیا میں کسی چوری، ڈاکے، زنا، قتل وغیرہ کو جرم کہنا حماقت کے سوا کیا ہے۔ یہ لوگ تو اکثر دُنیا میں بڑی کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔ ایک چور ڈاکو رات بھر میں اتنی دولت



۵۰  
 ۱۶۔ ارجل کر لیتا ہے جو ایک گریجویٹ سالوں کی ملازمت اور محنت سے حاصل نہیں کر سکتا۔ تو اگر آخرت اور اس کا حساب کتاب کچھ نہ ہو تو اس چور ڈاکو کو اس شریف گریجویٹ سے بہتر اور فضل کہنا پڑے گا جو کوئی ذی عقل گوارا نہیں کر سکتا۔ رہا یہ کہنا کہ ان لوگوں پر دنیا میں سخت سزائیں ہر حکومت میں مقرر ہیں مگر آجکل کا تجربہ یہ بتلا رہا ہے کہ مجرم صرف وہ پکڑا جاتا ہے جو بے وقوف ہو، ہوشیار عادی مجرم کے لئے سزا سے بچنے کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک رشوت ہی کا چور دروازہ ان کے فرار کیلئے کافی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ دنیا میں کوئی بھلائی برائی، نیکی بدی کوئی چیز نہیں اپنا مطلب جس طرح حاصل ہو وہ عین ثواب ہے مگر اس کا دنیا میں کوئی قائل نہیں۔ اور جب نیکی بدی کا امتیاز تسلیم کیا جائے تو پھر دونوں کا انجام برابر ہے بلکہ بد اور مجرم نیک سے زیادہ آرام میں رہے اس کی برابر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔ اسی کو قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ مجرم اور غیر مجرم دونوں کو دنیا و آخرت میں برابر کر دیا جائے سَوَاءٌ تَحْيَا تَهُمَّ وَتَمُوتُ تَهُمَّ یہ نہایت احمقانہ فیصلہ ہے جبکہ دنیا میں نیکی بدی کی جزا سزا پوری نہیں ملتی تو آخرت کی دوسری زندگی اور اس میں جزا سزا ہونا لازمی ہے۔ دوسری آیت میں بھی اسی مضمون کی تکمیل کے لئے فرمایا گیا وَلِلْجَوْنِ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ، یعنی ظلم و جور کے ثنائے اور انصاف قائم کرنے کے لئے روز جزا ہونا ضروری ہے۔ رہا یہ شبہ کہ دنیا ہی میں ہر عمل کا بدلہ اچھایا برائیوں نہ منشا دیا گیا یہ اس حکمت تکوینی کے خلاف ہے کہ اس عالم کو حق تعالیٰ نے دارالعمل اور دارالامتحان بنایا ہر دارالجزا نہیں بنایا۔ واللہ اعلم

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ

بھلا دیکھ تو جس نے ٹھہرایا اپنا حاکم اپنی خواہش کو اور راہ سے بھلا دیا اس کو اللہ نے جانتا بوتا تھا اور مہر

عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً ۖ فَمَنْ يَهْدِيهِ فَمِنْ

رگادی اس کے کان پر اور دل پر اور ڈال دی اس کی آنکھ پر اندھیری پھر کون راہ پر لائے اس کو

بَعْدَ اللَّهِ أَفَلَا تَنۢ كُرۡهُونَ ۚ ۲۳ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا

اللہ کے سوائے سو کیا تم غور نہیں کرتے اور کہتے ہیں اور کچھ نہیں بس یہی ہے ہمارا جینا دنیا کا

نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُم بِذٰلِكَ مِنْ

عالم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم جو مرتے ہیں سوزمانے سے اور ان کو کچھ غم نہیں

عِلۡمٍ ۚ إِنْ هُمۡ إِلَّا يَظُنُّونَ ۚ ۲۴ وَإِذَا نُنۢشِلُہُمۡ آيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ

اس کی محض انگلیں دوڑاتے ہیں اور جب سنائیں جائیں انکو ہماری آیتیں کھلی کھلی

مَا كَانَ حُجَّتُہُمۡ إِلَّا أَنۡ قَالُوا ائْتُوا بِآيٰتِنَا إِنۡ كُنۡتُمْ صٰدِقِیۡنَ ۚ ۲۵

اور کچھ دلیل نہیں ان کی مگر یہی کہہتے ہیں اے آؤ ہمارے باپ دادوں کو اگر تم سچے ہو

قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

تو کہہ کہ اللہ ہی جلاتا ہے تم کو پھر مار بیٹا تم کو پھر اکٹھا کر بیٹا تم کو قیامت کے دن تک

لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۶﴾

اس میں کچھ شک نہیں پر بہت لوگ نہیں سمجھتے

## خلاصہ تفسیر

سو کیا (توحید و آخرت کے ان واضح بیانات کے بعد) آپ نے اُس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے (کہ جو دل میں آتا ہے اُسی کے پیچھے چلتا رہتا ہے) اور خدا تعالیٰ نے اسکو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے (کہ حق کو سنا اور سمجھا بھی مگر نفسانی خواہش کی پیروی سے گمراہ ہو گیا) اور (خدا تعالیٰ نے) اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اسکی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے (یعنی نفس پرستی کی بدولت قبول حق کی صلاحیت نہایت کمزور ہو گئی) سو ایسے شخص کو بعد خدا کے (گمراہ کر دینے کے) کون ہدایت کرے (اس میں تسلی بھی ہے۔ آگے ان منکرین کو زجر کے طور پر خطاب ہے کہ) کیا تم (ان بیانات کو سن کر) پھر بھی نہیں سمجھتے (یعنی ایسا سمجھنا جو نافع ہو۔ اگرچہ عام معنی کے اعتبار سے سمجھتے تھے) اور یہ (قیامت کا انکار کرنے والے) لوگ یوں کہتے ہیں کہ بجز ہماری اس دُنیاوی زندگی کے اور کوئی زندگی (آخرت میں) نہیں ہے ہم (یہی ایک مرنا) مرتے ہیں اور (یہی ایک جینا) جیتے ہیں (مقصود یہ کہ موت کی طرح زندگی بھی دُنیا ہی کے ساتھ خاص ہے) اور ہم کو صرف زمانہ (کی گردش) سے موت آجاتی ہے (مطلب یہ کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جسمانی قوتیں خسر جاتی رہتی ہیں اور ان اسباب طبعیہ سے موت آجاتی ہے اور اسی طرح حیات کا سبب بھی امور طبعیہ ہیں پس جب موت و حیات اسباب طبعیہ کے تابع ہیں اور اسباب طبعیہ آخرت کی زندگی کا تقاضا نہیں کرتے تو آخرت کی زندگی نہ ہوگی) اور ان لوگوں کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں ہے محض اُنکل سے ہانک رہے ہیں (یعنی اُفرادی زندگی کی نفی پر کوئی دلیل نہیں) اور (نہ اہل حق کی دلیل کا وہ کچھ جواب دے سکتے ہیں چنانچہ) جسوقت (اس بارہ میں) ان کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں (جو مطلوب ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں) تو ان کا (اس پر) بجز اس کے اور کوئی جواب نہیں ہوتا کہ کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا کو (زندہ کر کے) سامنے لے آؤ اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو (اور اس جواب کے سوا کوئی اور جواب نہیں دے سکتے مثلاً یہ کہ کسی دلیل عقلی سے اسکا عقلاً محال ہونا ثابت کر دیتے) آپ (انکے جواب میں) یوں کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو (جب تک چاہتا ہے) زندہ رکھتا ہے پھر (جب چاہے گا) تمکو موت دیگا، پھر قیامت کے دن جس (کے وقوف) میں ذرا



شک نہیں تم کو (زندہ کر کے) جمع کر گیا (پس دعویٰ اُس روز میں زندہ کرنے کا ہے اور دنیا میں مردوں کو زندہ نہ کرنے سے اُس روز میں زندہ کرنے کی نفی لازم نہیں آتی) لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے (اور بلا دلیل حق کا انکار کرتے ہیں)

## معارف و مسائل

مَنْ اتَّخَذَ إِلَهًا هَوًى، یعنی وہ شخص جس نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کو اپنا معبود بنالیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی کافر بھی اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا خدا یا معبود نہیں کہتا مگر قرآن کریم کی اس آیت نے یہ بتلایا کہ عبادت و حقیقت اطاعت کا نام ہے جو شخص خدا کی اطاعت کے مقابلے میں کسی دوسرے کی اطاعت اختیار کرے وہ ہی اسکا معبود کہلا گیا۔ تو جس شخص کو حلال و حرام اور جائز ناجائز کی پروا نہ ہو، خدا تعالیٰ نے جسکو حرام کہا ہے وہ اس میں خدا کا حکم ماننے کے بجائے اپنے نفس کی پیروی کرے تو گو وہ اپنے نفس کو زبان سے اپنا معبود نہ کہے مگر حقیقت وہی اسکا معبود ہوا۔ اسی مضمون کو کسی عارف نے ایک شعر میں کہا ہے ۷

سودہ گشت از سجدہ راہِ بتان پیشانیم \* چہند بر خود تہمت دینِ مسلمانی نہم

اس میں خواہشاتِ نفسانی کو بتوں سے تعبیر کیا ہے جس نے اپنی خواہشات کو ہی امام و مقتدا بنالیا اور انکے پیچھے چلنے لگا تو گو یا یہ خواہشات ہی اسکے بت ہیں۔ حضرت ابوامامہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ زیرِ آسمان دنیا میں جتنے معبودوں کی عبادت کی گئی ہے ان میں سب سے زیادہ بغضِ اللہ کے نزدیک ہوئی ہے یعنی خواہشِ نفسانی۔ حضرت شاد بن اوش سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دانشمند وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور مابعد الموت کے واسطے عمل کرے اور فاجر وہ ہے جو اپنے نفس کو اسکی خواہش کے پیچھے چھوڑ دے اور اسکے باوجود اللہ سے آفرت کی بھلائی کی تمنا کرتا ہے۔ اور حضرت سہل بن عبد اللہ تفسیریؓ نے فرمایا کہ تمھاری بیماری تمھاری نفسانی خواہشات ہیں۔ ہاں اگر تم ان کی مخالفت کرو تو یہ بیماری ہی تمھاری دوا بھی ہے (یہ سب روایات قرطبی سے لی گئی ہیں)۔

وَمَا يَهْدِيكُمْ إِلَّا إِلَهُ الْكَافِرِ، لفظ دہر دراصل اس تمام مدت کے مجموعہ کا نام ہے جو اس عالم کی ابتدا سے انتہا تک ہو، اور کبھی بہت بڑی مدت کو بھی دہر کہہ دیا جاتا ہے۔ کفار نے یہ قول بطور دلیل کے پیش کیا ہے کہ ہماری موت و حیات کا خدا کے حکم و مشیت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اسبابِ طبیعیہ کے تابع ہے جسکا مشاہدہ موت کے متعلق تو سب کرتے ہیں کہ اعضاءِ انسانی اور انکی قوتیں احتمال کے سبب گھٹتی رہتی ہیں اور ایک مانہ دراز گزر جانے کے بعد وہ بالکل محفل ہو جاتی ہیں اسی کا نام موت ہے۔ اسی پر حیات کو بھی قیاس کر لو کہ وہ بھی کسی خدائی حکم سے نہیں بلکہ مادہ کی طبعی حرکتوں سے چال ہوتی ہے۔

دہریا زمانے کو برا کہنا اچھا نہیں | کفار و شرکین زمانے کی گردش ہی کو ساری کائنات اور ان کے سارے حالات کی علت قرار دیتے تھے، اور اسی کی طرف سب کرتے تھے جیسا کہ اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے حالانکہ درحقیقت یہ سب افعال اللہ تعالیٰ جل شانہ کی قدرت و ارادے سے ہوتے ہیں۔ اسی لئے احادیث صحیحہ میں دہریا زمانے کو برا کہنے کی ممانعت آئی ہے کیونکہ کفار جس قوت کو دہر کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں درحقیقت وہ قوت و قدرت حق تعالیٰ ہی کی ہے اس لئے دہر کو برا کہنے کا نتیجہ درحقیقت خدا تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دہر کو برا نہ کہو کیونکہ دہر درحقیقت اللہ ہی ہے مراد یہ ہے کہ یہ جاہل جس کام کو دہر کا کام کہتے ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی قوت و قدرت کا کام ہے، دہر کوئی چیز نہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دہر اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے کوئی نام ہو کیونکہ یہاں مجاز اللہ تعالیٰ کو دہر کہا گیا ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۚ يَوْمَ يَخْسِرُ

اور اللہ ہی کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جس دن قائم ہوگی قیامت اُس دن خراب ہونگے

الْمُطْلُوْنَ ۝۲۷ وَتَرٰی كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۚ كُلُّ اُمَّةٍ تَدْعٰی اِلٰی كِتٰبِهَا ۚ

جسوں کے اور تو دیکھے ہر فرقہ کو کہ بیٹھے ہیں گھٹنوں کے بل، ہر فرقہ بلایا جائے اپنے اپنے دفتر کے پاس

اَلْيَوْمَ نَحْزُوْنَ ۚ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطٰقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۚ

آج بدلہ پاؤ گے جیسا تم کرتے تھے یہ ہمارا دفتر ہے بولتا ہے تمہارے کام ٹھیک

لَا تَاْكِنَّا تَسْتَنِيْخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۹ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

ہم کھواتے جاتے تھے جو کچھ تم کرتے تھے سو جو لوگ یقین لائے ہیں اور بھلے کام

الصّٰلِحٰتِ فَيَدْخِلْنٰهُمْ رَحْمَتِنَا ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝۳۰ وَ

کئے سوائے کو داخل کر دیا ان کا رب اپنی رحمت میں یہ جو ہے یہی ہے صریح مراد مبین اور

اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَآفَلَمْ تَكُنْ اٰیٰتِیْ تَتْلٰۤیْ عَلَیْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ

جو منکر ہو گئے کیا تم کو سنائی نہ جاتی تھیں باتیں میری پھر تھیں غور کیا اور ہو گئے

قَوْمًا مُّجْرِمٰیْنَ ۝۳۱ وَاِذَا قُلِیْۤ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ وَالسَّاعَةُ لَا رَیْبَ

تم لوگ گنہگار اور جب کہنے کہ وعدہ اللہ کا ٹھیک ہے اور قیامت میں کچھ شبہ نہیں

فِیْہَا ۚ قُلْتُمْ مَا نَدْرِیْ ۚ مَا السَّاعَةُ ۚ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا ۚ وَمَا نَحْنُ

تم کہتے تھے ہم نہیں سمجھتے کیا ہے قیامت ہم کو آتا تو ہے ایک خیال سا اور ہم کو

مُتَّقِیْنَ ۝۳۲ وَیَدَّ اِلَیْہُمْ سَیِّآتُ مَا عَمِلُوْا ۚ وَحَاقَ بِہُمْ مَّا كَانُوْا

یقین نہیں ہوتا اور کھل جائیں ان پر بُرائیاں ان کاموں کی جو کئے تھے اور الٹ پڑے اُن پر وہ چیز



بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۳۴﴾ وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنْسِفُكُمْ كَمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ

جس پر ٹھٹھا کرتے تھے اور تم ہو گا کہ آج ہم تم کو بھلا دیں گے جیسے تم نے بھلا دیا تھا اپنے اُس دن کی

هَذَا أَوْ كَأُولَئِكَ مَا لَكُمْ مِنْ نَصْرٍ ۚ ﴿۳۵﴾ ذَلِكُمْ بِأَنكُمْ اتَّخَذْتُمْ

ملاقات کو اور گھر تمھارا دوزخ ہے اور کوئی نہیں تمھارا مددگار یہ تم پر اس واسطے کہ تم نے پھر اللہ

آيَاتِ اللَّهِ هُزُؤًا وَغَرَّتْكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يَخْرُجُونَ مِنْهَا

کی باتوں کو ٹھٹھا اور بھکے رہے دُنیا کی زندگی پر سو آج نہ اُن کو نکالنا منظور ہے وہاں سے

وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿۳۶﴾ فَلِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ رَبِّ

اور نہ اُن سے مطلوب ہے توبہ، سو اللہ ہی کے واسطے ہے سب خوبی جو رہے آسمانوں کا اور رب زمین کا رب

الْعَالَمِينَ ﴿۳۷﴾ وَلَهُ الْكِبَرُ بِمَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۳۸﴾

سارے جہان کا اور اُسی کے لئے بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی عزت بردست حکمت والا

## خُلاصہ تفسیر

اور (اوپر جو کہا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ تم کو جمع کرے گا" تو اسکو کچھ مشکل نہ سمجھا جائے کیونکہ) اللہ

ہی کی سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمین میں (وہ جو چاہے تصرف کرے، پس تمھیں موت کے بعد زندہ کر کے جمع کرنا بھی

اُسکے لئے کوئی مشکل نہیں) اور جس روز قیامت قائم ہوگی اُس روز اہل باطل خسارہ میں پڑیں گے اور آپ (مُحَمَّد)

ہر فرقہ کو دیکھیں گے کہ (مارے خوف کے) زانو کے بل گر پڑیں گے، ہر فرقہ اپنے نامہ اعمال (میں لکھے ہوئے اعمال کے

حساب) کی طرف بلایا جائیگا (یہ مطلب ہے نامہ اعمال کی طرف بلانے کا، ورنہ نامہ اعمال تو خود اُسکے پاس ہو گئے اور اُنے

کہا جائیگا کہ) آج تمکو تمھارے کئے کا بدلہ ملے گا (اور کہا جائیگا کہ) یہ (نامہ اعمال) ہمارا (لکھایا ہوا) دفتر ہے جو

تمھارے مقابلے میں ٹھیک ٹھیک ہا رہی (یعنی تمھارے اعمال کو ظاہر کر رہا ہے اور) ہم (دُنیا میں) تمھارے سب اعمال کو

(فرشتوں) لکھواتے جاتے تھے (اور یہ اُن ہی کا مجموعہ ہی) سو (حساب کے بعد فیصلہ یہ ہو گا کہ) جو لوگ ایمان لائے تھے اور

اُنھوں نے اچھے کام کئے تھے تو ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہ صریح کامیابی ہو اور جو لوگ کافر تھے

(اُنے کہا جائیگا کہ) کیا میری آیتیں تم کو پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں سو تم نے (اُنکے قبول کرنے سے) تکبر کیا تھا اور

(اسوجہ سے) تم بڑے مجرم تھے اور (تمھارا یہ حال تھا کہ) جب (تم سے) کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ (دوبارہ

زندہ کر کے جزا و سزا دینے کا) حق ہو اور قیامت میں کوئی شک نہیں ہو تو تم (نہایت بے پرواہی سے) کہا کرتے تھے کہ

ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے (صرف مُسننے مُسانے سے) محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے اور ہم کو (اسکا)

یقین نہیں اور (اُس وقت) اُن پر اپنے تمام بُرے اعمال ظاہر ہو جائیں گے اور جس (عذاب) کے ساتھ وہ سزا کیا کرتے تھے

وہ انکو آگھیرے گا اور اُسے (کہا جائیگا کہ) آج ہم تم کو بھلائے دیتے ہیں (یعنی رحمت سے محروم کئے دیتے ہیں جسے بھلاانا

مجازاً کہہ دیا) جیسا تم نے اپنے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا اور (آج سے) تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور کوئی تمہارا مددگار نہیں یہ (سزا) اسوجہ سے کہ تم نے خدا تعالیٰ کی آیتوں کی ہنسی اڑائی تھی اور تم کو دنیاوی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا کہ اسیں مشغول ہو کر آخرت سے بالکل غافل بلکہ منکر ہو گئے تھے سو آج یہ لوگ نہ تو دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے خدا کی خفگی کا تذکرہ چاہا جائیگا (یعنی اسکا موقع نہ دیا جائیگا کہ تو بہ کر کے خدا کو راضی کر لیں۔ جب تمام مضامین سن لئے) تو (ان سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ) تمام خوبیاں اللہ ہی کے لئے (ثابت) ہیں جو پروردگار ہی آسمانوں کا اور پروردگار ہے زمین کا (اور آسمان و زمین ہی کی کیا تخصیص ہو وہ تو) پروردگار ہی تمام عالم کا اور اسی کو پڑائی ہے (جسکا ظہور آثار و علامات سے) آسمان و زمین میں (رہورہا ہی) اور وہی زبردست حکمت والا ہے۔

## معارف و مسائل

وَتَرَىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً، جُثُو سے مشتق ہے جس کے مستی گھٹنوں کے بل بیٹھنے کے ہیں اور حضرت سفیان نے فرمایا، جُثُو اس طرح بیٹھنے کو کہتے ہیں کہ جس میں زمین پر صرف گھٹنے اور پادوں کے نیچے ٹپک جائیں، اس طرح کی نشست ہول اور خوف کی وجہ سے ہوگی۔ اور ظاہر کُلِّ أُمَّةٍ کے لفظ سے یہ ہے کہ یہ صورت خوف تمام اہل محشر میں کافر نیک یہ سب کو پیش آئے گی اور بعض دوسری آیات اور روایات میں جو محشر کے خوف و فرار سے انبیاء و صلحاء کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے یہ اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ یہ درشت و خوف تھوڑی مدت کے لئے انبیاء و صلحاء پر بھی طاری ہو، مگر تھوڑی دیر قلیل ہونے کی بنا پر اسکو نہونے کے حکم میں رکھا گیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کُلِّ أُمَّةٍ سے مراد عام اہل محشر نہ ہوں بلکہ اکثر مراد ہوں جیسا کہ لفظ کُلِّ بعض اوقات اکثر کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے جاثیہ کے معنی ایسی نشست کے لئے ہیں جیسے نماز میں ہوتی ہے تو پھر وہ اشکال خود ہی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ نشست خوف کی نہیں ادب کی نشست ہے۔ کُلِّ أُمَّةٍ تَدْعِي إِلَىٰ كِتَابِهَا، کتاب سے مراد اس جگہ اکثر مفسرین کے نزدیک نامہ اعمال ہے جو فرشتے دنیا میں لکھتے رہے تھے اور اب محشر میں یہ صحائف اعمال اُڑا دیے جائیں گے ہر ایک آدمی کا نامہ اعمال اسکے ہاتھ میں پہنچ جائیگا اور اس سے کہا جائے گا اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ لِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَذَابًا حَسْبًا یعنی اپنا نامہ اعمال پڑھ لو اور خود ہی حساب لگا لو کہ تمہیں ان اعمال کا کیا بدلہ ملنا چاہیے۔ اور اس اعمال نامہ کی طرف بلانے کا مطلب ان کے حساب کی طرف بلانا ہے جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں آچکا ہے۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ

تَمَّتْ سُورَةُ الْجَاثِيَةِ الْحَادِي عَشْرَةَ رَجَبِ سَنَةِ ۱۳۹۵ هـ يَوْمَ الثَّلَاثَاءِ وَاللَّهُ أَحْمَدُ وَالْمِنَّةُ





## سُورَةُ الْاِحْقَافِ

سُورَةُ الْاِحْقَافِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُونَ وَثَلَاثُونَ آيَةً وَارْبَعُونَ رُكُوعًا  
سورۃ احقاف ۵۰ آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شرع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حَمْدٌ ۱ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۲ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ

اُتارنا کتاب کا ہے اللہ زبردست حکمت والے کی طرف سے ہم نے جو بنائے آسمان

وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۳ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّا

اور زمین اور جو اُن کے پیچھے ہیں ہے سو ٹھیک کام پر اور ایک ٹھہرے وعدہ پر اور جو لوگ منکر ہیں وہ

اَنْذِرُوْا مُّعْرِضُوْنَ ۴ قُلْ اَرَاَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْرِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ

ڈرکوشن کر مند پھیر لیتے ہیں تو کہہ بھلا دیکھو تو جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوائے دکھلاؤ تو مجھ کو

مَا ذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ

انہوں نے کیا بنایا زمین میں یا اُن کا کچھ سا جہا ہے آسمانوں میں لاؤ میرے پاس کوئی کتاب

مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثَرٌ ۵ مِّنْ عَلٰمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۶ وَمَنْ

اس سے پہلے کی یا کوئی علم جو چلا آتا ہو اگر ہو تم سچے اور اس سے

اَضَلُّ فَمَنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْرِ اللّٰهِ مَنْ لَا یَسْتَجِیْبُ لَهٗ اِلٰی یَوْمِ

زیادہ گمراہ کون جو پکارتے اللہ کے سوائے ایسے کو نہ پہنچے اس کی پکار کو دن قیامت

الْقِیَمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۷ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا

تک اور اُن کو خبر نہیں اُن کے پکارنے کی اور جب لوگ جمع ہوں گے وہ ہونگے

لَهُمْ اَعْدَآءٌ وَكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ کٰفِرِیْنَ ۸

انکے دشمن اور ہونگے اُن کے پوجنے سے منکر

## خلاصہ تفسیر

لَحْدَ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ کتاب اللہ زبردست حکمت والے کی طرف سے بھیجی گئی ہے، (اس لئے اسکے مضامین قابل غور ہیں، آگے توحید اور معاد کا بیان ہے کہ) ہم نے آسمان اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں حکمت کے ساتھ اور ایک ميعاد معین (تک) کے لئے پیدا کیا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں ان کو جس چیز سے ڈرایا جاتا ہے (مثلاً یہ کہ توحید کے انکار پر تم کو قیامت میں عذاب ہوگا) وہ اس سے بے رخی (اور بے التفاتی) کرتے ہیں (اور توحید کو قبول نہیں کرتے)۔ آپ (ان سے توحید کے بارہ میں) کہئے کہ یہ تو بتلاؤ جن چیزوں کی تم خدا (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو (ان کے مستحق عبادت ہونے کی کیا دلیل ہے، اگر دلیل عقلی ہے تو) مجھ کو یہ دکھلاؤ کہ انھوں نے کونسی زمین پیدا کی ہے یا اسکا آسمان (کے پیدا کرنے) میں کچھ حصہ ہے (اور ظاہر ہے کہ تم بھی ان کو خالق نہیں مانتے جو کہ دلیل ہو سکتی ہے مستحق عبادت ہونے کی، بلکہ مخلوق کہتے ہو جو کہ مستحق عبادت ہونے کے منافی ہے پس دلیل عقلی تو مفقود ہوئی اور اگر تمہارے پاس دلیل نقلی ہے تو) میرے پاس کوئی (صحیح) کتاب (لاؤ جس میں شرک کا حکم ہو اور) جو اس (قرآن) سے پہلے کی ہو (کیونکہ تم بھی جانتے ہو کہ قرآن میں شرک کی نفی ہے پس کسی اور ہی کتاب کی ضرورت ہوگی) یا (اگر کتاب نہ ہو تو) کوئی اور (معتبر) مضمون (جو زبانی) منقول (ہونا چاہا آتا ہو اور کتاب میں مدون نہ ہو) لاؤ اگر تم (دعویٰ شرک میں) سچے ہو (مطلب یہ کہ دلیل نقلی کا قابل تصدیق اور مستند ہونا ضروری ہے کسی نبی کی کتاب ہو یا ان کا زبانی قول ہو) اور (ظاہر ہے کہ ایسی دلیل کوئی پیش نہیں کر سکتا مگر جو اپنے باطل عقیدے سے پھر بھی باز نہ آئے ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں کہ) اُس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو (دلیل سے عاجز ہونے اور اسکے خلاف پر دلیل قائم ہونے کے باوجود) خدا کو چھوڑ کر ایسے معبود کو پکارے جو قیامت تک بھی اسکا کہنا نہ کرے اور ان کو ان کے پکارنے (تک) کی بھی خبر نہ ہو اور (پھر) جب (قیامت میں) سب آدمی (حساب کے لئے) جمع کئے جائیں تو وہ (معبود) ان عبادت کرنے والوں کے دشمن ہو جائیں اور ان کی عبادت ہی کا انکار کر بیٹھیں (پس ایسے معبود کی عبادت کرنے سے بڑھ کر کیا غلطی ہے کہ عبادت کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں اور عبادت نہ کرنے سے اسباب و وجوہ بکثرت ہیں)

## معارف و مسائل

قُلْ اَرَأَيْتُمْ مِمَّا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ، ان آیات میں مشرکین کے دعوئے شرک کو باطل کرنے کے لئے ان سے ان کے دعوئے پر دلیل کا مطالبہ کیا گیا ہے کیونکہ کوئی دعویٰ بغیر شہادت و دلیل کے عقلاً یا شرعاً قابل عمل نہیں ہوتا۔ پھر اسمیں حجتی قسمیں دلائل کی ہو سکتی ہیں سب کو جمع کر دیا ہے اور



ثابت کیا ہے کہ تمھارے دعوے پر کسی قسم کی بھی دلیل و شہادت موجود نہیں اس لئے اس بے دلیل دعوے پر قائم رہنا گمراہی ہے۔ دلائل کی اس آیت میں تین قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک عقلی دلیل جس کی نفی کے لئے فرمایا اَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ، دوسری قسم دلیل نقلی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں دلیل نقلی وہ ہی معتبر ہو سکتی ہے جو خود حق تعالیٰ کی طرف سے آئی ہو جیسے آسمانی کتابیں تو رات انجیل اور قرآن وغیرہ یا ان حضرات کے اقوال جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول و نبی منتخب کیا ہے۔ ان دونوں قسموں میں سے پہلی قسم کی نفی تو اس سے فرمائی اَيُّتُورِيْ بِكُتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا، یعنی اگر تمھارے پاس بت پرستی کی کوئی دلیل نقلی موجود ہے تو کسی آسمانی کتاب کو پیش کر و جس میں بت پرستی اور شرک کی اجازت دی گئی ہو۔ اور دوسری قسم یعنی اقوال انبیاء کی نفی کیلئے فرمایا، اَوْ اٰثَرَةٍ مِّنْ عِندِہٖ، یعنی اگر اللہ کی کسی کتاب میں تم شرک و بت پرستی کی کوئی دلیل و شہادت نہیں دکھا سکتے تو کم از کم انبیاء میں سے کسی کا قول دکھلاؤ جو سند معتد کے ساتھ اسے ثابت ہو۔ اور جب تم یہ بھی پیش نہیں کر سکتے تو تمھارا قول و عمل بجز گمراہی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ لفظ اٰثَرَةٍ مِّنْ عِندِہٖ میں اٰثَرَةٍ مصدر ہے بر وزن شجاعت سماحت وغیرہ جس کے معنی نقل و روایت کے ہیں اسی لئے حضرت عکرمہ اور مقاتل نے اٰثَرَةٍ مِّنْ عِندِہٖ کی تفسیر میں روایت عن الانبیاء فرمایا اور قرطبی نے اس کی تفسیر اسناد حسن کے ساتھ فرمائی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ دلیل نقلی کی دو قسمیں معتبر ہیں، ایک آسمانی کتاب جو اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر پر نازل فرمائی، دوسرے پیغمبر کا قول جو اسناد معتبر کے ساتھ پیغمبر سے ثابت ہو۔ اٰثَرَةٍ مِّنْ عِندِہٖ کا یہی مفہوم ہے یہ سب مضمون تفسیر قرطبی سے لیا گیا ہے اور یہی تفسیر مختار اور بے غبار ہے۔ بعض حضرات سے اٰثَرَةٍ مِّنْ عِندِہٖ کی تفسیر میں دوسرے اقوال بھی منقول ہیں مگر وہ ثابت نہیں اور نظم قرآنی کے مناسب بھی نہیں اس لئے ہمہور کے نزدیک مختار نہیں۔ واللہ اعلم

وَ اِذَا تَنٰثَلٰ عَلَيْهِمْ اٰیٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَالْحَقُّ لَمَّا جَآءَهُمْ

اور جب مُنَاسَی جاؤں اُن کو ہماری باتیں کھلی کھلی کہتے ہیں منکر یہی بات کو جب اُن تک پہنچی

هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۱۰ اَمْ یَقُوْلُوْنَ اَفْتَرٰیہٗ قُلْ اِنْ اَفْتَرٰیہٗ فَلَا

یہ جادو ہے صریح کیا کہتے ہیں یہ بنا لیا ہے تو کہہ اگر میں یہ بنا لیا ہوں تو تم

تَمْلُکُوْنَ لِیْ مِنْ اللّٰهِ شَیْئًا ۝۱۱ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِیضُوْنَ فِیْہٗ کَفَا

میرا بھلا نہیں کر سکتے اللہ کے سامنے ذرا بھی اس کو خوب خبر ہے جن باتوں میں تم لگ رہے ہو وہ کافی ہے

بِہٖ شَہِیْدًا ۝۱۲ بَلٰی وَ یُبَیِّنُکُمْ ۝۱۳ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝۱۴ قُلْ مَا

حق بتانے والا میرے اور تمھارے بیچ اور وہی ہے بخشنے والا مہربان تو کہہ

كُنْتُ بِدُعَاةِ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا يَكْمُرُ إِيَّانِي

میں کچھ نیا رسول نہیں آیا اور مجھ کو معلوم نہیں کیا ہوتا ہے مجھ سے اور تم سے میں اسی

أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ⑨ قُلْ أَرَأَيْتُمْ

پر چلتا ہوں جو حکم آتا ہے مجھ کو اور میرا کام تو یہی ہے ڈرنا دینا کھول کر تو کہہ بھلا دیکھو تو

إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ

اگر یہ آیا ہو اللہ کے یہاں سے اور تم نے اسکو نہیں مانا اور گواہی دے چکا ایک گواہ بنی اسرائیل کا

عَلَىٰ مِثْلِهِ قَامَنَ وَاسْتَكَبَرْتَ ثُمَّ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ⑩

ایک ایسی کتاب کی، پھر وہ یقین لایا اور تم نے غرور کیا بیشک اللہ راہ نہیں دیتا گمراہوں کو

## خلاصہ تفسیر

اور جب ہماری کھلی کھلی آیتیں (جو کہ معجزہ ہونے کے باعث رسالت کی دلیل ہیں) ان (منکر

رسالت) لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو یہ منکر لوگ اس سچی بات کی نسبت جبکہ وہ ان تک پہنچتی ہر

یوں کہتے ہیں کہ یہ صریح جادو ہے (حالانکہ جادو کی نظیر کا ممکن ہونا اور اسکی نظیر کا ممکن نہ ہونا اس قول کے

بطلان کی صریح دلیل ہے اور اس سے بڑھ کر اور سنو) کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے (یعنی آپ نے

نعوذ باللہ) اس (قرآن) کو اپنی طرف سے بنالیا ہے (اور خدا کی طرف منسوب کر دیا۔ آگے اس قول کا

جواب ہم کہ) آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا ہوگا (اور خدا کے ذمہ لگا دیا ہوگا)

تو (خدا تعالیٰ اپنی عادت کے موافق لوگوں کو دھوکہ سے بچانے کے لئے مجھ کو نبوت کے جھوٹے دعوے

پر جلد ہی ہلاک کر دے گا) پھر (جب وہ مجھ کو ہلاک کرنے لگے گا تو) تم (یا اور) لوگ مجھ کو خدا (کے

عذاب) سے ڈرا بھی نہیں بچا سکتے (مطلب یہ کہ نبوت کے جھوٹے دعوے پر عذاب کا ہونا ایسا لازمی

کہ میرا کوئی حامی و مددگار بھی اُسے نہیں روک سکتا، مگر مجھ کو عذاب نہیں ہوا۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ میں

اپنے دعویٰ نبوت میں جھوٹا نہیں، اور جب میں جھوٹا نہیں تو یہ سمجھ رکھو کہ) وہ خوب جانتا ہے تم

قرآن میں جو جو باتیں بنا رہے ہو (اسلئے تمکو سزا ہوگی غرض یہ کہ) میرے اور تمہارے درمیان (صدق

و کذب کا فیصلہ کرنے کے لئے) وہ کافی گواہ (یعنی باخبر) ہے (لہذا اگر میں جھوٹا ہو گا مجھ کو فوراً

عذاب دے گا، اور اگر تم جھوٹے ہو گے تو تم کو جلد یا بدیر عذاب دے گا) اور (اگر کسی کو یہ شبہ

ہو کہ جب وہ ہماری باتوں سے واقف ہے اور پھر بھی ہم پر عذاب نہیں آیا تو جس طرح مدعی نبوت پر عذاب

نہ آنا اس کی سچائی کی دلیل ہے اسی طرح ہم منکروں پر عذاب نہ آنا ہماری سچائی کی دلیل بن گئی ہے

تو اسکا جواب یہ ہے کہ) وہ بڑی مغفرت والا ہے (اسلئے مغفرت کی بعض اقسام مثلاً دنیا میں



کافروں پر عذاب نہ آنا بھی واقع کر دیتا ہے اور بڑی رحمت والا ہے اس لئے رحمت کی بعض قسم بھی جس کو رحمت عامہ کہتے ہیں کفار کے لئے بھی واقع کر دیتا ہے۔ لہذا منکرین کے انکار پر دنیا میں عذاب نہ ہونا ان کے صدق کی دلیل نہیں، برخلاف مدعی نبوت کے کہ وہاں جھوٹا دعویٰ اور عذاب کا نزول دونوں لازم و ملزوم ہیں کیونکہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے کو دنیا میں عذاب نہ دینا لوگوں کی گمراہی کا سبب بن سکتا ہے بخلاف دوسرے مجرموں کے۔ آگے اثبات نبوت کی تاکید ہے کہ آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں کہ تمہارے لئے باعثِ تعجب ہو کیونکہ مجھ سے پہلے بہت سے پیغمبر آچکے ہیں جن کی خبر تو اتر سے تم نے بھی سنی ہے) اور (اسی طرح کسی اور عجیب بات کا بھی میں دعویٰ نہیں کرتا جیسا کہ مثلاً علم غیب ہے چنانچہ میں خود کہتا ہوں کہ مجھ کو غیب کی باتوں میں سے صرف وہ معلوم ہیں جو وحی سے مجھے بتادی گئی ہیں، غیب کی اور کسی بات کی خبر مجھے نہیں حتیٰ کہ) میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ (یہ معلوم کہ) تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ لہذا جب اپنے اور تمہارے آئندہ حالات کے علم کا میں مدعی نہیں ہوں تو دور کی غیبی باتوں کے بارے میں تو کیا دعویٰ کرتا، البتہ جن امور کا علم وحی سے ہو گیا ہے خواہ وہ اپنے متعلق ہوں یا غیر کے اور خواہ دنیا کے حالات ہوں یا آخرت کے ان کا علم بیشک کامل ہے چنانچہ آگے ارشاد ہے کہ) میں تو (علم عمل میں) صرف اُسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے آتا ہے اور (اسی کی تبلیغ بھی کرتا ہوں۔ اور اگر تم اسکو نہیں مانتے تو میرا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں (جس کو میں دلائل سے ثابت کر چکا ہوں اور اوپر جو الزام آخر کی تردید ”هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ“ سے اجمالاً کی گئی تھی آگے اسکی تفصیل کے طور پر ارشاد ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ تم مجھ کو یہ بتا دو کہ اگر یہ قرآن منجانب اللہ ہو اور (پھر) تم اسکے منکر ہو اور (کسی دلیل سے اسکے منجانب اللہ ہونے کی مزید تائید بھی ہو جائے مثلاً اسی دلیل سے کہ) بنی اسرائیل (کے علماء) میں سے کوئی (معتبر) گواہ (جو علم دیانت کے اعتبار سے مسلم و معتبر ہو) اور ایک ہو یا زیادہ، ماضی میں ہو یا حال میں یا مستقبل میں) اس جیسی کتاب (یعنی اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے) پر گواہی دیکر ایمان لے گئے اور تم (باوجود بے علم ہونے کے اس کتاب پر ایمان لانے سے) تکبر ہی میں ہو (تو اس صورت میں تم سے زیادہ بے انصاف کون ہوگا اور بے انصاف لوگوں کی یہ حالت ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو (ان کے عناد کے باعث) ہدایت نہیں کیا کرتا (بلکہ ہمیشہ گمراہی میں رہتے ہیں اور گمراہی کا انجام آگ ہے)۔

## معارف و مسائل

وَمَا آذِرِيْكَ فَاِفْعَلْ بِنِيْ وَلَا يَكْمُرْ اِنَّ اَنْتَ لَمَّا تُوْحٰى اِلٰىكَ، اس آیت میں

جملہ ان اشیاء بمعنی استثناء کے ہے یعنی میں نہیں جانتا بجز اسکے جو مجھ پر وحی کی جائے۔ اسی بنا پر امام تفسیر ضحاکؒ سے اس آیت کی تفسیر وہ منقول ہے جو خلاصہ تفسیر مذکور میں اختیار کی گئی ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ امور غیبیہ کا علم مجھے صرف وحی کے ذریعہ ہو سکتا ہے جس معاملے کے متعلق وحی سے مجھے علم نہ ہو خواہ وہ میری ذات سے متعلق ہو یا امت کے مومن و کافروگوں سے اور خواہ وہ معاملہ دنیا کا ہو یا آخرت کا اسکی مجھے کچھ خبر نہیں۔ امور غیبیہ کے متعلق میں جو کچھ کہتا ہوں وہ سب وحی الہی سے کہتا ہوں چنانچہ قرآن کریم میں خود مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے شمار علوم امور غیبیہ کے متعلق عطا فرمائے ہیں، **بَلَدَکَ مِنْ اَنْبَاِ الْغَیْبِ نُوْجُھَا اَلْیَکَ**، کا یہی مطلب ہے۔ امور آخرت، دوزخ، جنت، حساب کتاب، سزا و جزا سے متعلق تو تفصیلاً خود قرآن کریم میں بے شمار مذکور ہیں اور دنیا میں پیش آنے والے واقعات آئندہ کی بہت سی تفصیلات احادیث صحیحہ متواترہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں جس سے ثابت ہوا کہ آیت مذکورہ کا حاصل صرف اتنا ہے کہ میں امور غیبیہ کے علم محیط میں خدا تعالیٰ کی طرح نہیں اور ان کے علم میں خود مختار نہیں بلکہ مجھے بواسطہ وحی خداوندی جو کچھ بتلادیا جاتا ہے وہ میں ذکر کر دیتا ہوں۔

تفسیر روح المعانی میں اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے اُس وقت تک خصت نہیں ہوئے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور آخرت اور دنیا میں پیش آنے والے اہم معاملات سے آپ کو بذریعہ وحی باخبر نہیں کر دیا گیا۔ رہا اشخاص و افراد کے جزوی شخصی حالات و معاملات کا علم کہ زید کل کو کیا کام کرے گا اور اسکا انجام کیا ہوگا، عمر بچہ اپنے گھروں میں کیا کیا کام کر رہے ہیں یا کریں گے ان امور غیبیہ کا علم نہ کوئی کمال پر نہ انکے ہونے سے کمال نبوت میں کوئی فرق آتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کے متعلق تقاضائے ادب یہ ہے علم غیب کے متعلق تقاضائے ادب کہ یوں نہ کہا جائے کہ آپ غیب نہیں جانتے تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امور غیب کا بہت بڑا علم دیا تھا جو انبیاء میں سے کسی دوسرے کو نہیں ملا۔ اور بعض حضرات مفسرین نے جو یہ فرمایا کہ اس آیت میں نفی علم صرف امور دنیویہ سے متعلق ہے آخرت کے متعلق علم غیب کی نفی اس میں شامل نہیں (کما ذکرہ القرطبی) انھوں نے غالباً جملہ **اِنْ اَشْبَحَ اِلَکَ مَا یُوحٰی** کو بمعنی استثناء قرار نہیں دیا، اسلئے نفی علم غیب کو امور دنیا کے ساتھ مخصوص فرمایا کیونکہ آخرت کے متعلق تو کھلے طور پر اپنے بتلادیا کہ کافر دوزخ میں اور مومن جنت میں جائے گا۔

وَشَہِدْ شَہِدٌ مِّنْ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی رَسُوْلِهِ فَاَمَنَ وَاسْتَکْبَرُوْا ثُمَّ اِذَا اِیْتِیْکُمْ اُولٰٓئِکَ فَاَقْبِلْ عَلَیْہُمْ لَعَلَّکُمْ تَعْلَمُوْنَ  
کا مضمون تقریباً وہی ہے جو سورہ شعراء کے آخری رکوع کی آیت کا ہے یعنی **اَوَلَمْ یَکُنْ لَّہُمْ**



آیۃ اَنْ یَّعْلَمَہُ عُلَمَآؤُہِ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ جسکا حاصل یہ ہے کہ یہ جاہل یہود و نصاریٰ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کا انکار کرتے ہیں یہ خود اپنی کتابوں سے بھی ناواقف اور جاہل ہیں کیونکہ بہت سے علمائے بنی اسرائیل اپنی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی علامات کا مشاہدہ کر کے آپ پر ایمان لے آئے ہیں۔ کیا ان علماء کی شہادت بھی ان جاہل لوگوں کے لئے کافی نہیں۔ اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ میرا دعوائے رسالت اور قرآن کا اللہ کی کتاب ہونا غلط اور افترا ہے اول تو اسکے غلط ہونے کے لئے وہ بات کافی ہے جو پہلے ابھی ذکر کی گئی ہے کہ جو شخص اللہ پر ایسا کھلا افترا کرے کہ مجھے اُس نے نبی بنا کر بھیجا ہے اور واقع میں وہ نبی نہیں ہے تو اس پر اس دنیا ہی میں عذاب لگے آجانا اور اسکا ہلاک کیا جانا ضروری ہے تاکہ عام لوگ ہمو کے سے بچ سکیں۔ اور بالفرض تم اسکو بھی نہیں مانتے تو کم از کم اس احتمال کو تو نظر انداز نہ کرو کہ اگر میرا دعویٰ صحیح ہوا اور یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہی ہوئی اور تم اس کو کفر و انکار پر جمے رہو تو تمہارا کیا انجام ہوگا خصوصاً اس صورت میں کہ خود تمہاری قوم بنی اسرائیل ہی میں کوئی بڑا آدمی اسکے منجانب اللہ ہونے کی شہادت دے دے اور مسلمان ہو جائے اور تم اس علم کے بعد بھی اپنی ضد اور تکبر پر جمے ہو تو تم کس قدر عذاب کے مستحق ہو گے۔

اس آیت کے الفاظ میں کسی خاص عالم بنی اسرائیل کا نام نہیں لیا گیا اور نہ یہ متعین کیا کہ یہ شہادت اس آیت کے نزول سے پہلے لوگوں کے سامنے آچکی ہے یا آئندہ آنے والی ہے بلکہ ایک جملہ شرطیہ کے طور پر فرمایا ہے کہ اگر ماضی میں یا بالفعل یا آئندہ ایسا ہو جائے تو تمہیں اپنی فکر کرنا چاہیے کہ تم عذاب سے کیسے بچو گے۔ اسلئے مضمون آیت کا سمجھنا اس پر موقوف نہیں ہے کہ علمائے بنی اسرائیل میں کسی شاہد معین کو اسکا مصداق قرار دیا جائے بلکہ جتنے حضرات یہود و نصاریٰ میں سے داخل اسلام ہوئے جن میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ زیادہ معروف ہیں وہ سبھی اس میں داخل ہیں اگرچہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا ایمان اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مدینہ منورہ میں ہوا، اور یہ یہوری سورت مکتی ہے۔ (ابن کثیرؒ)

اور بعض روایات میں جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے بارے میں نازل ہوئی (کما رواہ البخاری و مسلم والنسائی من حدیث مالک) نیز حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؓ، ضحاکؓ، قتادہؓ وغیرہ ائمہ تفسیر سب نے باتفاق فرمایا کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے متعلق نازل ہوئی ہے، تو یہ اس آیت کے مکتی ہونے کے منافی نہیں، کیونکہ اس صورت میں یہ پیشگوئی آئندہ کے لئے ہو جائے گی۔ (کذا قال ابن کثیرؒ)

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کَانَ خَیْرًا مَّا سَبَقُوْا

اور کہنے لگے منکر ایمان والوں کو اگر یہ دین بہتر ہوتا تو یہ نہ دہرائے اس پر

إِلَيْهِ وَادَّ كَرِهْتَدُ وَإِيَّاهُ فَسَيَقُولُونَ هَذَا أَلْفُكُ قَدِيمٌ ۝۱۱ وَمِنْ

ہم سے پہلے، اور جب راہ پر نہیں آئے اسکے بتانے سے تو یہ اب کہیں گے یہ جھوٹ ہے بہت پرانا اور اس

قَبْلَهُ كِتَابٌ مُوسَى إِمَامًا وَرَحْمَةً ۖ وَهَذَا كِتَابٌ مُصَدِّقٌ

سے پہلے کتاب موسیٰ کی سچی راہ ڈالنے والی اور رحمت اور یہ کتاب ہے اس کی تصدیق کرتی

لِسَانًا عَرَبِيًّا لِّبَنِي النَّازِلِينَ ظَلَمُوا ۖ وَبُشْرَىٰ لِلْمُحْسِنِينَ ۝۱۲

عربی زبان میں تاکہ ڈر سنائے گنہگاروں کو اور خوشخبری نیکی والوں کو

## خلاصہ تفسیر

اور یہ کافر ایمان والوں (کے ایمان لانے) کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ اگر یہ قرآن (جس پر یہ لوگ ایمان لائے ہیں) کوئی اچھی (یعنی سچی) چیز ہوتا تو یہ (کم درجہ کے) لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ کرتے (یعنی ہم لوگ بڑے عاقل ہیں اور یہ لوگ کم عقل ہیں، اور حق بات کو عاقل پہلے قبول کرتا ہے تو اگر یہ حق ہوتا تو ہم پہلے مانتے جب ہم نے نہیں مانا تو یہ حق نہیں یہ لوگ بے عقلی سے ادھر دڑنے لگے ہیں۔ کافروں کا یہ قول انکے انتہائی تکبر کی دلیل ہے جسکا ذکر اوپر استکبر ٹم میں آیا ہے) اور جب (عناد و تکبر کے باعث) ان لوگوں کو قرآن سے ہدایت نصیب نہ ہوئی تو (اپنے عناد اور ضد کی بنا پر) یہی کہیں گے کہ یہ (بھی مثل) قدیمی (جھوٹے مضامین کے ایک) جھوٹ (مضمون) ہے اور اس (قرآن) سے پہلے موسیٰ (علیہ السلام) کی کتاب (نازل ہو چکی) ہے جو (موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کیلئے بالعموم) رہنما (تھی) اور (اہل ایمان کے لئے بالخصوص) رحمت تھی (اور جس طرح توریت میں اسکی پیشین گوئی ہی یہ (اسی طرح کی) ایک کتاب ہے جو اس (کی پیشین گوئی) کو سچا کرتی ہے (اور) عربی زبان میں (ہے) ظالموں کو ڈرانے کے لئے اور نیک لوگوں کو بشارت دینے کے لئے (نازل ہوئی ہے)۔

## معارف و مسائل

کَوْكَبَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ، تکبر و غور انسان کی عقل کو بھی مسخ کر دیتا ہے۔ تکبر آدمی اپنی عقل اور اپنے عمل کو معیار حسن و قبح و خیر و شر سمجھنے لگتا ہے جو چیز اسکو پسند نہو خواہ دوسرے لوگ اسکو کتنا ہی اچھا سمجھیں، یہ اُن سب کو بیوقوف سمجھتا ہے حالانکہ خود بیوقوف ہے۔ کفار کے اسی درجہ غرور و تکبر کا اس آیت میں بیان ہے کہ اسلام و ایمان چونکہ اُن کو پسند نہیں تھا تو دوسرے لوگ جو ایمان کے دلدادہ تھے ان کو یہ کہتے تھے کہ اگر یہ ایمان کوئی اچھی چیز ہوتی تو سب سے پہلے ہمیں پسند آتی، ان دوسرے غریب فقیر لوگوں کی پسند کا کیا اعتبار۔



ابن منذر وغیرہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ عمر بن خطابؓ جب مسلمان نہیں ہوئے تھے انکی ایک کنیز جسکا نام زبیرہ تھا پہلے مسلمان ہو گئی تھی یہ اس کو اسکے اسلام پر اتے اور دھمکاتے تھے کہ کسی طرح یہ اسلام کو چھوڑے اور کفار قریش کہا کرتے تھے کہ اسلام کوئی اچھی چیز ہوتی تو زمین حبشیہ پر عورت اس میں ہم سے آگے نہ ہوتی، اسکے متعلق آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ (مظہری)

وَمِنْ قَبْلِهِ كُتِبَ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً، اس کلام سے ایک تو ما کُنتُ بِدُعَا قَوْمِ الرُّسُلِ کا ثبوت ملا کہ آپ کوئی انوکھے رسول اور قرآن کوئی انوکھی کتاب نہیں کہ اُن پر ایمان لانے میں لوگوں کو اشکال ہو بلکہ آپؐ پہلے موسیٰ علیہ السلام رسول ہو کر آچکے ہیں اور اُن پر تورات نازل ہو چکی ہے جس کو یہ کفار یہود و نصاریٰ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ دوسرے اوپر جو شہد شاہد آیا ہے اسکی بھی تقویت ہو گئی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام اور تورات خود قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کے شاہد ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

مقرر جنہوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے تو نہ ڈرے اُن پر اور نہ وہ

يُخْزَوْنَ ۝۱۳ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا

عملگین ہوں گے وہ لوگ ہیں بہشت والے سدا رہیں گے اس میں بدلہ ہے ان کاموں

كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۴ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا طَحَمَلَتْهُ

کا جو کرتے تھے اور ہم نے حکم کر دیا انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی کا، بیٹ میں رکھا

أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا طوَحْمَلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا

اسکو اسکی ماں نے تکلیف سے اور بچا اسکو تکلیف سے اور حمل میں رہنا اسکا اور دردہ چھوڑنا تیس مہینے میں ہے

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ

بہا تک کہ جب پہنچا اپنی قوت کو اور پہنچ گیا چالیس برس کو کہنے لگا اے رب میرے

أَوْزَعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ

میری قسمت میں کہ کہ شکر کروں تیرے احسان کا جو تو نے مجھ پر کیا اور میرے ماں باپ پر

وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلَحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۚ إِنِّي اتَّخَذْتُ

اور یہ کہ کروں نیک کام جس سے تو راضی ہو اور مجھ کو دے نیک اولاد میری میں نے توبہ کی

إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝۱۵ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَنْتَقِبُ

تیری طرف اور میں ہوں حکیم دار یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم قبول کرتے ہیں

عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ

بہتر سے بہتر کام جو کئے ہیں اور معاف کرتے ہیں ہم بُرائیاں اُن کی رہنے والے جنت

الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝۱۶ وَالَّذِي قَالَ

کے لوگوں میں سچا وعدہ جو ان سے کیا جاتا تھا اور جس شخص نے کہا

لِوَالِدَيْهِ أَتِ لَّكُمَا أَعْدَانِي أَنْ أُخْرِجَ وَقَدْ خَلَيْتَ الْقُرُونُ

اپنے ماں باپ کو میں بیزار ہوں تم سے، کیا مجھ کو وعدہ دیتے ہو کہ میں نکال جاؤں تمکا قبر سے، اور گزر چکی ہیں

مِنْ قَبْلِي ۚ وَهَمَّا يَسْتَغِيثُ اللَّهَ وَيْلِكَ آمِنْ قَائِلًا وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا

بہت جماعتیں مجھ سے پہلے اور وہ دونوں فریاد کرتے ہیں اللہ سے کہ لے فرما میری تو ایمان لے آ، بیشک وعدہ اللہ کا

فَيَقُولُ مَا هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝۱۷ أُولَئِكَ الَّذِينَ حَقَّ

ٹھیکے، ابھر کہتا ہے یہ سب نقلیں ہیں پہلوں کی یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر ثابت

عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ

ہوئی بات عذاب کی شامل اور فرقوں میں جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے جنوں کے اور آدمیوں کے

لَا تَنْفَعُ كَانُوا خَاسِرِينَ ۝۱۸ وَلِكُلِّ دَرَجَةٍ مِمَّا عَمِلُوا وَلِيُوقَّيَهُمْ

بیشک وہ تھے ٹوٹے میں پڑے اور ہر فرقے کے کئی دہے ہیں اپنے کئے کا مزید موافق اور تاکہ پورے دے

أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظَاهَمُونَ ۝۱۹ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى

انکو کام ان کے اور ان پر ظلم نہ ہوگا اور جس دن لائے جائیں گے منکر آگ کے

النَّارِ أَذْهَبَتْهُمْ طَيِّبَتُكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا

کنارہ پر ضائع کئے تھے اپنے مزے دنیا کی زندگی میں اور ان کو برت چکے

فَالْيَوْمَ تُجْرَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي

اب آج سزا پاؤ گے ذلت کا عذاب بدلہ اسکا جو تم غرور کرتے تھے

الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ۝۲۰

مُلک میں ناحق اور اسکا جو تم نافرمانی کرتے تھے

## خلاصہ تفسیر

جن لوگوں نے (صدق دل سے) کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے (یعنی توحید کو تعلیم رسول کے مطابق قبول کیا) پھر (اس پر مستقیم رہے) (یعنی اس کو چھوڑا نہیں) سو یقیناً (اسکا نتیجہ یہ ہے کہ) ان لوگوں پر (آخرت میں) کوئی خوف (کی بات واقع ہونے والی) نہیں اور نہ وہ (وہاں) غمگین ہونگے (یہ تو انکے مضرت سے بچنے کا بیان تھا، آگے اُس منفعت کا ذکر ہے جو انکو ملنے والی ہے کہ) یہ لوگ اہل جنت ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے بعوض ان (بیک) کاموں



کے جو کہ وہ کرتے تھے (جن میں سے ایمان لانے اور اس پر قائم رہنے کا اور ذکر ہے) اور (جس طرح ہم نے حقوق اللہ کو واجب کیا ہے جبکہ ذکر ہو چکا اسی طرح حقوق العباد کو بھی واجب کیا ہے چنانچہ اُن میں سے ایک بہت بڑا حق والدین کا ہے اسلئے) ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے (اور بالخصوص ماں کے ساتھ اور زیادہ کیونکہ) اُس کی ماں نے اُس کو بڑی مشقت کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور (پھر) بڑی مشقت کے ساتھ اس کو جنم اور اُس کو پیٹ میں رکھنا اور اس کا دودھ پھڑانا (اکثر) تینس مہینہ (میں پورا ہوتا) ہے۔ (اٹنے دنوں طرح طرح کی مصیبت اُٹھاتی ہے اور کم و بیش ان مصیبتوں میں باپ کی بھی شرکت ہوتی ہے بلکہ اکثر امور کا انتظام عادتاً باپ ہی کو کرنا پڑتا ہے اور اپنے آرام میں خلل آجانیہ دونوں کو مساوی طور پر پیش آتا ہے اسلئے بھی ماں باپ کا حق انسان پر زیادہ واجب کیا گیا ہے۔ غرض اس کے بعد نشوونما پاتا ہے) یہاں تک کہ جب (نشوونما پاتے پاتے) اپنی جوانی کو (یعنی بلوغ کو) پہنچ جاتا ہے اور (پھر بلوغ کے بعد ایک ماہ میں) چالیس برس (کی عمر) کو پہنچتا ہے تو (جو سعادت مند ہوتا ہے وہ) کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اس پر مداومت دیجئے کہ میں آپ کی اُن نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہے (اگر ماں باپ مسلمان ہیں تب تو دین کی نعمت بھی، ورنہ دنیا کی نعمت تو ظاہر ہی ہے اور ماں باپ کی نعمت کا اثر اولاد پر بھی پہنچتا ہے۔ چنانچہ اُن کا وجود و بقا جو دنیاوی نعمت ہے اس کی بدولت تو خود اولاد کا وجود ہی ہوتا ہے اور دینی نعمت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اُن کی تعلیم و تربیت اُس کے لئے علم و عمل کا ذریعہ بنتی ہے) اور (وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مجھ کو اس کی بھی پابندی نصیب کیجئے کہ میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں اور میری اولاد میں بھی میرے (نفع کے) لئے صلاحیت پیدا کر دیجئے (دنیاوی نفع یہ کہ دیکھ دیکھ کر راحت ہو اور دینی نفع یہ کہ اجر و ثواب ہو اور) میں آپ کی جناب میں گناہوں سے بھی) تو یہ کرتا ہوں اور میں (آپ کا) فرمانبردار ہوں (مقصود اس سے اپنی غلامی کا اقرار ہے نہ کہ دعویٰ۔ آگے ان اعمال کا نتیجہ فرماتے ہیں کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم انکے نیک کاموں کو قبول کر لیں گے اور انکے گناہوں سے درگزر کر دیں گے اس طور پر کہ یہ اہل جنت میں سے ہونگے (اور یہ سب) اُس وعدہ صادقہ کی وجہ سے (ہو) جس کا اُن سے (دنیا میں) وعدہ کیا جاتا تھا (یہاں تک تو غمخیز اور خوش بخت لوگوں کا بیان ہوا۔ آگے ظالم اور بد بخت لوگوں کا ذکر ہے یعنی) اور جس نے (حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو پامال کر دیا جیسا اُس کے اس حال سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے) اپنے ماں باپ سے کہا (جن کے حق کی حقوق العباد میں سب سے زیادہ تاکید ہے خصوصاً جبکہ وہ مسلمان بھی ہوں اور خصوصاً جبکہ وہ اسکو بھی اسلام کی دعوت دے رہے ہوں) کہ تم سے تمپر کیا تم مجھ کو یہ وعدہ (یعنی خبر) دیتے ہو کہ میں (قیامت میں دوبارہ زندہ ہو کر) قبر سے

مکالا جادوں کا حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی اُمّیں گزر گئیں (جن کو ہر زمانے میں انکے پیغمبر یوں ہی خبریں دیتے چلے آئے مگر آج تک کسی بات کا ظہور نہ ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں) اور وہ دونوں (غریب ماں باپ اسکے اس انکار سے کہ جو کفر عظیم ہے گھبرا کر) اللہ سے فریاد کر رہے ہیں (اور نہایت درد مندی سے اس سے کہہ رہے ہیں) کہ ارے تیرا ناس ہو ایمان لا (اور قیامت کو بھی برحق سمجھ) بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے تو یہ (اس پر بھی) کہتا ہے کہ یہ بے سند باتیں اگلوں سے منقول چلی آرہی ہیں (مطلب یہ کہ ایسا بد نصیب ہے کہ کفر اور ماں باپ سے بد سلوکی دونوں کا مرتکب ہے، اور بد سلوکی بھی اس درجہ کی کماں باپ کی مخالفت کے ساتھ اُن سے کلام میں بھی بد تمیزی کرتا ہے۔ آگے ان اعمال کا نتیجہ فرماتے ہیں کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے حق میں بھی اُن لوگوں کے ساتھ اللہ کا قول (یعنی وعدہ عذاب) پورا ہو کر رہا جو ان سے پہلے جہنم اور انسان (کفار) ہو گزرے ہیں بیشک یہ (سب) خسارہ میں ہے۔ اور (آگے مذکورہ بالا تفصیل کو خلاصہ اجمال کے طور پر فرماتے ہیں کہ مذکورہ دونوں فریقوں میں سے) ہر ایک (فریق) کے لئے انکے (مختلف) اعمال کی وجہ سے الگ الگ درجے (کسی کو جنت کے کسی کو دوزخ کے) ملیں گے اور (مختلف درجے اسلئے ملیں گے) تاکہ اللہ تعالیٰ سب کو اُن کے اعمال (کی جزا) پوری کرے اور اُن پر (کسی طرح کا) ظلم نہ ہو گا اور (اوپر بحسن کی جزا میں تو جنت کو متعین طور سے بیان کر دیا گیا تھا مگر ظالمین کا عذاب متعین کر کے نہیں بتایا گیا تھا اجمالاً فرما دیا تھا حقّ علیہم القول اور کائناتِ خیر میں اس لئے آگے عذاب کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے۔ جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے (اور اُن سے کہا جائے گا) کہ تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے (یہاں کوئی لذت تم کو نصیب نہ ہوگی) اور انکو خوب بُرت چکے (حتیٰ کہ اُن میں پڑ کر ہلکے بھی بھول گئے) سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی (چنانچہ سزا کے لئے آگ ہے اور ذلت میں سے یہ ملامت اور پھٹکار ہے) اسوجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے (تکبر سے مراد ایسا تکبر ہے جو ایمان سے بازر رکھے کیونکہ دائمی عذاب اُسی کے ساتھ خاص ہے) اور اسوجہ سے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے (اسمیں کفر فسق ظلم اور انکی تمام صورتیں داخل ہو گئیں)۔

## معارف و مسائل

مذکورہ صدر آیات میں پہلی دو آیتیں تو پچھلے ہی کلام کا تکرار ہے جو اس سے پہلی آیات میں آیا ہے کہ ظالموں کے لئے وعید عذاب اور مومنین صالحین کے لئے فوز و فلاح کی خوشخبری تھی۔ پہلی آیت یعنی اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا میں بڑی بلاغت کے ساتھ پورے اسلام و ایمان اور اعمالِ صالحہ سب کو جمع کر دیا گیا۔ رَبُّنَا اللّٰهُ کا اقرار پورا ایمان ہے اور اس پر استقامت



میں ایمان پر تادمِ مرکب قائم رہنا بھی شامل ہے اور اسکے مقتضیات پر پورا پورا عمل بھی۔ لفظ استقامت اور اسکی اہمیت کی تشریح و تفصیل سورۃ حجر سجدہ میں بیان ہو چکی ہے۔ آیت مذکورہ میں ایمان استقامت پر یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو نہ آئندہ کسی تکلیف و پریشانی کا خوف ہو گا نہ ماضی کی تکلیف پر رنج و افسوس رہے گا۔ بعد کی آیت میں اس بے نظیر راحت کے دائمی اور غیر منقطع ہونے کی بشارت دی گئی ہے اسکے بعد کی چار آیتوں میں انسان کو اسکے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت اور اسکے خلاف کرنے کی مذمت اور ضمن میں انسان پر اسکے ماں باپ کے احسانات کا اور اولاد کے لئے سخت محنت و مشقت برداشت کرنے کا تذکرہ، اور بڑی عمر کو پہنچنے کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و انابت کی خاص تلقین فرمائی گئی ہے۔ سابقہ آیات سے اسکی مناسبت اور ربط بقول ابن کثیر یہ ہے کہ قرآن کریم کا عام اسلوب یہ ہے کہ وہ جہاں انسان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی طرف دعوت دیتا ہے تو ساتھ ساتھ ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک اور خدمت و اطاعت کے احکام بھی دیتا ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات مختلف سورتوں میں اس پر شاہد ہیں۔ اسی اسلوب کے مطابق یہاں بھی اللہ کی توحید کی دعوت کے ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر کیا گیا۔ اور قرطبی نے بحوالہ تفسیری وجہ ربط یہ بیان کی ہے کہ اسمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک قسمی کا پہلو ہے کہ آپ ایمان و توحید کی دعوت دیتے رہیں کوئی قبول کرے گا کوئی نہ کرے گا اس سے معصوم نہ ہوں کیونکہ انسان کا حال یہی ہے کہ وہ سب اپنے والدین کے ساتھ بھی یکساں نہیں رہتے بعض اچھا سلوک کرتے ہیں اور بعض انکے ساتھ بھی بد سلوکی کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

بہر حال ان چار آیتوں میں اصل مضمون انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرنا ہے اور ضمناً دوسری تعلیمات آئی ہیں۔ اگرچہ بعض روایات حدیث سے ان آیات کا حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں نازل ہونا معلوم ہوتا ہے اور اسی بنا پر تفسیر مظہری نے وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ میں الْإِنْسَانَ کے الف لام کو عہد کا قرار دے کر اس سے مراد صدیق اکبرؓ کو قرار دیا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی آیت قرآن کا سبب نزول کوئی خاص فرد یا خاص واقعہ ہو تو پھر بھی حکم سب کے لئے عام ہی ہوتا ہے۔ شان نزول خاص صدیق اکبرؓ ہوں اور تخصیصات سندرجہ آیات انھیں کی صفات ہوں جب بھی مقصود آیات کا تعلیم عام ہی ہے۔ اور اگر اصل آیات کو عام تعلیم قرار دیا جائے، اسمیں بھی صدیق اکبرؓ اس تعلیم کے پہلے مصداق قرار پائیں گے جو ان ہونے اور چالیس سال عمر ہونے کے بعد کی جو تخصیصات ان آیات میں مذکور ہیں وہ تخصیصات بطور تمثیل کے ہونگی اب آیات مذکورہ کے خاص خاص الفاظ کی تشریح دیکھئے۔ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِالذِّكْرِ احْسَنًا، لفظ وصیت تاکید کی حکم کے معنی میں آتا ہے اور احسان بمعنی حسن سلوک ہے جس میں ان کی خدمت و اطاعت بھی داخل ہے اور تعظیم و تکریم بھی۔

حَمَلَتْهُ أُمُّ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا، لَفْظِ كُرْهًا بضم الکاٹ اُس مشقت کو کہتے ہیں جو انسان کو کسی وجہ سے برداشت کرنا پڑے اور کُرْهًا بفتح کاٹ اس محنت و مشقت کا نام ہے جس پر اگر کوئی دوسرا آدمی مجبور کرے۔ اسی سے اکراہ مشتق ہے۔ پہلے جملے میں جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے یہ دوسرا جملہ اُس کی تاکید کے لئے ہے کہ والدین کی خدمت و اطاعت ضروری ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے تمہاری پیدائش سے لیکر جوانی تک تمہارے لئے بڑی مشقتیں برداشت کی ہیں، خصوصاً ماں کی محنت و مشقت بہت ہی نمایاں ہے اسلئے یہاں بیان صرف ماں کی مشقت کا کیا گیا ہے کہ اُس نے ایک طویل مدت نو ماہ اپنے پیٹ میں تم کو اٹھائے رکھا جس میں اسکو طرح طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرنا پڑیں، پھر ولادت کے وقت سخت درد اور تکلیف کے ساتھ تمہارا وجود اس دُنیا میں آیا۔

ماں کا حق باپ سے زیادہ ہے | شرع آیت میں حُسن سلوک کا حکم ماں اور باپ دونوں کے لئے ہے مگر اس جگہ صرف ماں کی محنت و مشقت کا ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ماں کی محنت و مشقت لازمی اور ضروری ہے۔ حمل کے زمانے کی تکلیفیں، پھر وضع حمل اور دردِ زہ کی تکلیف ہر حال ہر بچہ کے لئے لازمی ہے جو صرف ماں ہی کی محنت ہے، باپ کے لئے پرورش پر محنت اٹھانا اتنا لازمی و ضروری نہیں ہو سکتا ہے کہ کسی باپ کو ولادت کی تربیت میں کوئی بھی محنت و مشقت اٹھانی پڑے جبکہ وہ مالدار صاحبِ حشم و خدم ہو، دوسروں سے ولادت کی خدمت لے یا وہ کسی دوسرے ملک میں چلا گیا اور فرج بھیجتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد پر ماں کے حق کو سب سے زیادہ رکھا ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے صَلِّ عَلَى أُمِّكَ ثُمَّ عَلَى أَبَاكَ ثُمَّ عَلَى ابْنِكَ ثُمَّ عَلَى ابْنَةِ ابْنِكَ (مظہری) یعنی صلہ رحمی اور خدمت کرو اپنی ماں کی پھر اپنی ماں کی پھر اپنی ماں کی، اسکے بعد اپنے باپ کی اور اسکے بعد جو قریب تر رشتہ دار ہو اسکی، پھر جو اسکے بعد ہو۔

وَحَمْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا، اس جملہ میں بھی ماں کی محنت و مشقت ہی کا بیان ہے کہ بچے کے حمل اور وضع حمل کی مشقت کے بعد بھی ماں کو محنت سے فراغت نہیں ملتی کیونکہ اسکے بعد بچے کی غذا بھی قدرت نے ماں کی چھاتیوں میں اتاری ہے وہ اسکو دودھ پلاتی ہے۔ آیت میں ارشاد یہ فرمایا کہ بچے کا حمل اور دودھ چھڑانا تین ہینے میں ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس آیت سے اس بات پر استدلال فرمایا کہ حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ کی ہے کیونکہ قرآن کریم نے اکثر مدتِ رضاع تو دو سال کامل متعین فرمادی ہے جیسا کہ ارشاد ہے وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ، اور یہاں حمل اور رضاع دونوں کی مدت تین ماہ قرار دی گئی



تو مدت رضاع کے دو سال یعنی چوبیس مہینے نکلنے کے بعد چھ ماہ ہی باقی رہ جاتے ہیں جس کو کم سے کم مدت حمل قرار دیا گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں ایک عورت کے بطن سے چھ ماہ ہو جانے پر بچہ پیدا ہو گیا جبکہ عام عادت نو مہینے میں اور کم سے کم سٹا مہینے میں بچہ پیدا ہونے کی ہے۔ عثمان غنیؓ نے اسکو حمل ناجائز قرار دیکر سزا کا حکم دیدیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اطلاع ملی تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کو اس سزا سے منع کیا اور فرمایا کہ قرآن میں حمل اور رضاع کی مجموعی مدت تین سال ہے پھر رضاع کی مدت کا چوبیس ماہ ہونا دوسری جگہ متعین کر دیا ہے اسلئے باقی ماندہ مدت چھ ماہ ہی حمل کی کم سے کم مدت ہے۔ عثمان غنیؓ نے انکے استدلال کو قبول کر کے اپنا حکم واپس لے لیا (قطبی)

اسی لئے کم سے کم مدت حمل کے بارے میں تمام ائمہ متفق ہیں کہ وہ چھ ماہ ہو سکتی ہے اکثر مدت کتنی ہے اس میں ائمہ کے اقوال مختلف ہیں قرآن نے اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیا۔

**فائدہ** | اس آیت میں حمل کی تو اقل مدت کا بیان کیا گیا اور رضاع کی اکثر مدت کا اس میں اشارہ ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ متعین ہے اس سے کم میں صحیح سالم بچہ پیدا نہیں ہو سکتا مگر زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ بچہ حمل میں رہ سکتا ہے اس میں عادتیں مختلف ہیں یہ متعین نہیں اسی طرح رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت متعین ہے کہ دو سال تک دودھ پلایا جاسکتا ہے کم سے کم مدت کچھ متعین نہیں۔ بعض عورتوں کے دودھ ہوتا ہی نہیں، بعض کا دودھ چند مہینوں میں خشک ہو جاتا ہے، بعض بچے ماں کا دودھ زیادہ نہیں پیتے یا ان کو مضر ہوتا ہے تو دوسرا دودھ پلانا پڑتا ہے۔

اکثر مدت حمل اور اکثر مدت رضاع | اکثر مدت حمل امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک دو سال ہیں، امام مالکؒ میں فقہائے ائمہ کا اختلاف سے مختلف روایات منقول ہیں۔ چار سال، پانچ سال، ست سال۔ امام شافعیؒ کے نزدیک چار سال، امام احمدؒ کی بھی مشہور روایت چار ہی سال کی ہے (منظری) اور اکثر مدت رضاعت جس کے ساتھ حرمت رضاعت کے احکام متعلق ہوئے ہیں جمہور فقہاء کے نزدیک دو سال ہیں۔ امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور ائمہ حنفیہ میں سے ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سب اسے متفق ہیں، اور صحابہ کرام میں حضرت عمرؓ ابن عباسؓ کا بھی یہ قول ہے (رواہ الترمذی) علی مرتضیٰؒ عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی یہی ارشاد ہے (خرجہ ابن ابی شیبہ) صرف امام اعظم ابو حنیفہؒ سے یہ منقول ہے کہ ڈھائی سال تک بچہ کو دودھ پلایا جاسکتا ہے جسکا حاصل جمہور حنفیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اگر بچہ کمزور ہو، ماں کے دودھ کے سوا کوئی غذا دو سال تک بھی نہ لیتا ہو تو مزید چھ ماہ دودھ پلانے کی اجازت ہے کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مدت رضاعت

پوری ہونے کے بعد ماں کا دودھ بچے کو پلانا حرام ہے مگر فتویٰ فقہائے حنفیہ کا بھی جمہور ائمہ کے مسلک پر ہے کہ دو سال کی مدت کے بعد اگر دودھ پلایا گیا تو اس سے قرمت رضاعت کے احکام ثابت نہیں ہونگے۔ سیدی حضرت حکیم الامت نے بیان القرآن میں فرمایا کہ اگرچہ فتویٰ جمہور کے قول پر ہی مگر عمل میں احتیاط کرنا بہتر ہے کہ ڈھائی سال کی مدت کے اندر جس بچہ کو دودھ پلایا گیا ہے اس کے مناکحت میں احتیاط برقی جائے۔ بعض حضرات نے آیت وَحَمْلُهُ وَفُصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا سے امام اعظم کے قول کے مطابق اکثر مدت رضاعت ڈھائی سال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ تفسیر مظہری میں فرمایا کہ یہ درست نہیں کیونکہ صحابہ کرام کی جماعت علی مرتضیٰ عثمان غنی وغنی نے آیت کی تفسیر یہ متعین کر دی ہے کہ اس میں چھ ماہ اقل مدت حمل کے اور چوبیس ماہ مدت رضاعت کے مراد ہیں۔ اور حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ قرآن کریم نے حمل اور رضاعت کی مشترک مدت تیس ماہ بتلائی ہے ہر ایک کی الگ الگ حد نہیں بتلائی اسکا سبب یہ ہے کہ عادت عامہ یوں ہے کہ بچہ نو ماہ میں پیدا ہوتا ہے اور جب بچہ پورے نو ماہ میں پیدا ہو تو ماں کا دودھ پلانے کی ضرورت صرف اکیس ماہ رہ جاتی ہے اور اگر بچہ سات مہینے میں پیدا ہو جائے تو تیس ماہ دودھ پلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور جو بچہ چھ ماہ میں پیدا ہو جائے تو چوبیس ماہ یعنی پورے دو سال دودھ پلانے کی ضرورت ہوگی (مظہری)

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ اَشَدَّهٖ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً، لفظ اشد کے لغوی معنی قوت کے ہیں۔ سورۃ النعام میں حَتَّىٰ يَبْلُغَ اَشَدَّہٗ کے تحت میں اس کی تفسیر بلوغ سے کی گئی ہے یعنی جب بچہ سن بلوغ کو پہنچ جائے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بلوغ اشد سے مراد اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنا ہے۔ مذکور الصدر آیت میں بھی بعض حضرات نے بلوغ اشدہ کے معنی یہی کئے ہیں کہ بچہ سن بلوغ کو پہنچ جائے اور اسکے بعد بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً کو ایک مستقل منزل عمر قرار دیا۔ یہ قول شعبیؒ اور ابن زید کا ہے اور حسن بصریؒ نے بلوغ اشد اور بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ دونوں کو ہم معنی اور بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ کو بَلَغَ اَشَدَّہٗ کی تفسیر و تاکید قرار دیا ہے۔ (قطبی)

اور تقدیر عبارت یوں ہے کہ اول بچہ کے حمل کا پھر وضع حمل کا پھر دودھ پینے کے زمانے کا ذکر کرنے کے بعد حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ اَشَدَّہٗ کا حاصل یہ ہے کہ فعاش واستمتع بحیاتیہ حَتَّىٰ اِذَا كَتَمَل واستحق قوتہ وعقلہ (روح) یعنی دودھ چھوٹنے کے بعد بچہ زندہ رہا اور عمر پائی یہاں تک کہ وہ بالغ اور قوی ہو گیا اور اس کی قوت اور عقل مکمل ہو گئی تو اب اس کو اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کی طرف رجوع ہونے کی توفیق نصیب ہوئی اور وہ یوں دعائیں مانگنے لگا کہ،

رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۗ اِنِّيْ نَسِيتُ الْيَتَامٰى مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، یعنی



اے میرے پالنے والے مجھے توفیق عطا کر کہ میں تیری اُس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر مبذول فرمائی اور جو میرے والدین پر مبذول فرمائی اور مجھے یہ توفیق دے کہ میں وہ عمل کروں جس سے تو راضی ہو جائے اور میرے لئے میری اولاد کی بھی اصلاح فرمائے، میں تیری طرف رجوع ہوتا ہوں اور میں تیرے تابع فرمان مسلمانوں میں سے ہوں۔ قرآن نے اس جگہ حَتَّىٰ اِذَا بَلَغَ اَشَدُّہٗ سے لیکر مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ تک سب صیغے ماضی کے استعمال فرمائے جس سے ظاہر یہ ہے کہ یہ بیان کسی خاص واقعہ اور خاص شخص کا ہے جو نزول آیت کے وقت ہو چکا ہے۔ اسی لئے تفسیر مظہری نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ یہ سب آلات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہیں انھیں کا بیان بالفاظ عام اس حکمت سے کیا گیا ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی اسی ترغیب ہو کہ وہ بھی ایسا ہی کیا کریں اور اسکی دلیل وہ روایت ہے جو قرطبی نے بروایت عطاء حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی بیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ کے مال سے تجارت کا قصد فرمایا اور ملک شام کا سفر کیا تو اس سفر میں ابوبکر صدیقؓ آپ کے ساتھ تھے اس وقت اُن کی عمر اٹھارہ سال کی تھی جو مصداق ہے بَلَّغْ اَشَدُّہٗ کا۔ پھر اس سفر میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے حالات دیکھے کہ وہ اتنے گرویدہ ہو گئے کہ سفر سے واپسی کے بعد ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے لگے، یہاں تک کہ جب آپ کی عمر شریف چالیس سال کی ہو گئی اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کا شرف عطا فرمایا اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عمر اڑتیس سال تھی۔ مردوں میں سب سے پہلے انھوں نے اسلام قبول کیا پھر جب اُن کی عمر چالیس سال کی ہو گئی اس وقت یہ دُعا مانگی جو ادھر آیت میں مذکور ہے رَبِّ اَدْزِیْنِیْ، اور یہی مصداق ہے بَلَّغْ اَزْجَلِیْنَ سَنَہٗ کا اور جب یہ دُعا مانگی اُن اَعْمَلْ صَالِحًا تَرْضَاهُ تو اللہ نے یہ دُعا قبول فرمائی، اُن کو تو ایسے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کی توفیق بخشی جو مسلمان ہو گئے تھے اور اُن کے مالک اُن کو اسلام لانے پر طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے، اسی طرح اُن کی دُعا اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ بھی قبول ہوئی، اُن کی اولاد میں کوئی ایسا نہ رہا جو ایمان نہ لایا ہو۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ میں یہ خصوصیت حق تعالیٰ نے صدیق اکبرؓ کو عطا فرمائی کہ وہ خود بھی مسلمان ہوئے، والدین بھی، اولاد بھی اور سب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا اور تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ مہاجرین و انصار میں اس وقت یہ خصوصیت صرف صدیق اکبرؓ کی ہی تھی کہ وہ خود بھی مسلمان ہوئے اور ان کے والدین بھی مسلمان ہو گئے۔ رہا یہ سوال کہ صدیق اکبرؓ کے والد ابو قحافہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے ہیں اور یہ سورت پوری ہو گئی ہے اس لئے یہ آیات بھی مکہ میں نازل ہوئیں اس وقت والدین پر نعمت الہی مبذول ہونے کا ذکر کیسے مناسب ہو گا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض حضرات نے ان آیات کو مدنی کہا ہے اسپر تو کوئی اشکال نہیں رہتا، اور اگر مکی بھی ہوں تو مراد نعمت اسلام سے مشرف

ہونے کی دعا ہوگی (روح) اس تفسیر کی زد سے اگرچہ یہ سب حالات صدیق اکبر کے بیان ہوئے مگر حکم عام ہے سب مسلمانوں کو اس کی ہدایت کرنا مقصود ہے کہ آدمی کی عمر جب چالیس سال کے قریب ہو جائے تو اس کو آخرت کی فکر غالب ہو جانی چاہیے۔ پچھلے گناہوں سے توبہ کی تجدید کیے اور آئندہ کے لئے اُن سے بچنے کا پورا اہتمام کرے کیونکہ عادت اور تجربہ یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر میں جو اخلاق و عادات کسی شخص کی ہو جاتی ہیں پھر اُن کا بدلنا مشکل ہوتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ مؤمن جب چالیس سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا حساب آسان فرما دیتے ہیں اور جب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچے تو اُس کو اپنی طرف رجوع و انابت نصیب فرما دیتے ہیں اور جب ستر سال کی عمر کو پہنچ جائے تو تمام آسمان والے اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جب اسی سال کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حسنات کو قائم فرما دیتے ہیں اور اس کے سیئات کو مٹا دیتے ہیں، اور جب نوے سال کی عمر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیتے ہیں اور اس کو اپنے اہل بیت کے متعلق شفاعت کرنے کا حق دیدیتے ہیں اور آسمان میں اس کے نام کے ساتھ لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ اسیر اللہ فی الارض ہے یعنی زمین میں اللہ کی طرف سے قیدی ہے (ذکرہ ابن کثیر عن ابی یعلیٰ و مسند احمد وغیرہ) اور یہ ظاہر ہے کہ مراد اس سے وہ ہی بندہ مؤمن ہے جس نے اپنی زندگی احکام شرع کے تابع ہو کر تقویٰ کے ساتھ گزاری ہے۔ ابن کثیر نے چونکہ پہلی تفسیر کو اختیار کیا ہے کہ مراد عام انسان ہے تو جو الفاظ خصوصیت کے اسمیں آئے ہیں جیسے حَتَّىٰ اِذَا بَلَغَ اَشْكَاکَ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً الخ وہ سب بطور تمثیل کے ہیں جس میں یہ ہدایت دینا مقصود ہے کہ انسان جب چالیس سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کو اپنی اصلاح اور اپنے اہل و عیال کی صلاح اور آخرت کی فکر غالب ہو جانی چاہیے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

اُولَئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَسُوْا وَنَسِیْنَا تَعْمَلُۢمۡۤ اِیْضًا اِیْسَیۡ مِّنْ مُّسْلِمٰنِ حِیۡنَ كَے یہ حالات ہوں جو اوپر گزرے ہیں انکی حسنات قبول کر لی جاتی ہیں اور گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ یہ حکم بھی عام ہے، اگر اس کے سبب نزول صدیق اکبر ہوں تو وہ اس کے پہلے مصداق ہونگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد ذیل سے بھی آیت کے مفہوم کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں سند کے ساتھ محمد ابن حاطب کی یہ روایت نقل کی ہے کہ میں ایک مرتبہ امیر المؤمنین حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر تھا، اس وقت ان کے پاس کچھ دوسرے حضرات بھی موجود تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کچھ عیب لگائے اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

عثمان رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے بارے

میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُولَئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ

كَانَ عُمَانُ رَضِیَ اللہ عَنْہُ مِنَ الَّذِیۡنَ قَالَ اللہ تَعَالٰی

فِیْہِمۡ اُولَئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْہُمۡ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا



وَنَجَّادُ زَعْنٍ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعَدَّ الْقِدْقِ  
الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ، قَالَ وَاللَّهِ عَثْمَانُ وَاصِلًا  
عَثْمَانُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَهَا ثَلَاثًا (ابن کثیر)  
عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَجَّادُ زَعْنٍ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ  
الْجَنَّةِ وَعَدَّ الْقِدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ، بخدا  
اس آیت کے مصداق حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھی ہیں۔ یہ  
بات حضرت علیؓ نے تین مرتبہ فرمائی۔

وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَّكُمَا سَابِقَةُ آيَةٍ مِّنَ الدِّينِ كِي خِدْمَتِ وَاطَاعَتِ كِي احْكَامِ تَحْتِ اس  
آیت میں اس شخص کا عذاب سزا مذکور ہے جو اپنے والدین کے ساتھ بدسلوکی، بدزبانی سے پیش آئے، خصوصاً جبکہ  
والدین اس کو اسلام اور اعمالِ صالحہ کی طرف دعوت دیتے ہوں ان کی بات نہ ماننا دوسرا گناہ ہے۔ ابن کثیر نے  
فرمایا کہ مفہوم آیت کا عام ہے جو شخص بھی اپنے والدین کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئے وہ اس کا مصداق ہے  
مروان نے جو اس آیت کا مصداق حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کو اپنے کسی خطبے میں کہا تھا  
اس کی تکذیب صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ مفہوم آیت کا  
عام ہے کسی صحیح روایت میں کسی فرد کا مصداق آیت ہونا منقول نہیں۔

أَذْهَبَتْكُمْ طَبِيبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمْ الدُّنْيَا، یعنی کفار کو خطاب کر کے یہ کہا جائیگا کہ تم نے اگر  
کچھ اچھے کام دنیا میں کئے تھے تو ان کا بدلہ بھی تمہیں دنیوی نعمتوں اور عیش و عشرت کی صورت میں دیا  
جا چکا ہے اب آخرت میں تمہارا کچھ حصہ باقی نہیں رہا۔ یہ خطاب کفار کو ہے جس سے معلوم ہوتا ہے  
کہ کفار کے نیک اعمال جو ایمان نہ لانے کی وجہ سے اللہ کے نزدیک مقبول نہیں آخرت میں تو ان کی کوئی قیمت  
نہیں مگر دنیا میں اللہ تعالیٰ ان کا بدلہ اس کو دیتے ہیں۔ کفار فجار کو مال و دولت اور عزت و جاہت  
وغیرہ جو دنیا میں ملتا ہے وہ ان کے نیک اعمال، سخاوت، ہمدردی، سچائی وغیرہ کا بدلہ ہوتا ہے۔ مومنین  
کیلئے یہ حکم نہیں ہے کہ اگر ان کو دنیا میں کوئی نعمت مال و دولت وغیرہ مل جائے تو آخرت کے حق سے محروم ہو جائیں۔  
لَذَاذْذُ دُنْيَا أَوْ تَنْتَمٍ سِیْزِیْ تَرْغِیْبِ اس آیت میں کفار کو عقاب ان کے دنیوی لذتوں میں منہمک  
رہنے کی بنا پر کیا گیا۔ اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے لَذَاذْذُ دُنْيَا کو ترک کرنے کی عادت  
بنالی جیسا کہ ان کی سیرت اس پر شاہد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو عین بھیجنے کے  
وقت یہ وصیت فرمائی تھی کہ دنیا کے تنعم سے پرہیز کرتے رہنا اور حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے  
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے تھوڑا رزق لینے پر راضی ہو جائے تو  
اللہ تعالیٰ بھی اس کے تھوڑے عمل پر راضی ہو جائے ہیں۔ (منظہری عن البغوی)

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أُنْذِرَ قَوْمَهُ بِأَلْحَقَافٍ وَقَدْ خَلَّتِ السُّدُورُ

اور یاد کر عادیؓ کو جب ڈرایا اپنی قوم کو احقاف میں اور گزر چکے تھے ڈرانے والے

مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ

اس کے آگے سے اور پیچھے سے کہ بندگی نہ کر دوسری کی اللہ کے سوائے میں ڈرتا ہوں

عَلَيْكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۲۱﴾ قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَأْفِكَنَا عَنِ الْهِتَانِ فَاتِنَا

تم ہر آفت سے ایک بڑے دن کی بولے کیا تو آیا ہے ہمارے پاس کہ پھیرے ہم کو ہمارے معبودوں، سولے

بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ

ہم پر جو وعدہ کرتا ہے اگر ہے تو سچا کہا یہ خبر تو اللہ ہی کو ہے

وَأُبَلِّغُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَكِنِّي أَرٰكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿۲۳﴾ فَلَمَّا

اور میں تو پہنچا دیتا ہوں جو کچھ بھیج دیا میرے ہاتھ لیکن میں دیکھتا ہوں تم لوگ نادانی کرتے ہو پھر جب

رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَّتِهِمْ قَالُوا هَذَا عَارِضٌ مُّطَرٌ نَّكَ

دیکھا اس کو ابر سامنے آیا ان کے نالوں کے بولے یہ ابر ہے ہم پر بر سے گا

بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ رِيحٌ فِيْهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۴﴾ تَدْمِرُ كُلَّ

کوئی نہیں یہ تو وہ چیز ہے جسکی تم جلدی کرتے تھے، ہوا ہے جس میں عذاب ہے دردناک اُکھاڑ پھینکے ہر

شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَاصْبِرْ إِلَّا لِلْأَمَلِ نَكْزَلُكَ الْخِزْيَ

چیز کو اپنے رب کے حکم سے، پھر کل کو رہ گئے کہ کوئی نظر نہیں آتا تھا سوائے انکے گھروں کے، یوں ہم سزا دیتے ہیں

الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ مَكَنَّاهُمْ فِيْمَا آتَانَا مَكَنًّا

گنہگار لوگوں کو اور ہم نے مقدور دیا تھا ان کو ان چیزوں کا جن کا تمکو مقدور نہیں دیا اور ہم نے انکو

لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَآفِئَةٌ رَّحْمَةٌ فَمَا اسْغَى عَنْهُمْ صَمْعُهُمْ وَلَا

دیئے تھے کان اور آنکھیں اور دل پھر کام نہ آئے ان کے کان اُنکے اور نہ

أَبْصَارُهُمْ وَلَا آفِئَةٌ لَهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ

آنکھیں ان کی اور نہ دل ان کے کسی چیز میں اس لئے کہ منکر ہوتے تھے اللہ کی باتوں

اللَّهُ وَحَاقَ بِهِمْ قَاكَوَابُهُ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۲۶﴾

سے اور اکٹ پڑی ان پر جس بات سے کہ وہ ٹھٹھا کرتے تھے

## خلاصہ تفسیر

اور آپ قوم عاد کے بھائی (یعنی ہود علیہ السلام) کا (ان سے) ذکر کیجئے جبکہ انھوں نے اپنی قوم کو جو کہ ایسے مقام پر رہتے تھے کہ وہاں ایک کے مستطیل خمدار تو دے تھے (یہ مقام کی نشان دہی اس لئے کی گئی کہ دیکھنے والوں کے ذہن میں استحضار ہو جائے) اس (بات) پر (عذاب الہی سے)



ڈرایا کہ تم خدا کے سوا کسی کی عبادت مت کرو (ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا) اور (یہ ایسی ضروری اور صحیح بات ہے کہ) اُن (ہود علیہ السلام) سے پہلے اور اُن کے پیچھے (اسی مضمون کے متعلق) بہت سے ڈرانے والے (پیغمبر اب تک) گزر چکے ہیں (اور عجب نہیں کہ ہود علیہ السلام نے اُن سب کا مستحق ہونا دعوت الی التوحید میں اُن کے سامنے بیان بھی کیا ہو پس جملہ وَقَدْ خَلَّتِ السُّنُكُ کا یہ سچ میں بڑھا دینا ان فوائد کے لئے ہے کہ مضمون دعوت کی تاکید ہو جائے اور ہود علیہ السلام نے انداز میں یہ فرمایا کہ) مجھ کو تم پر ایک بڑے (سخت) دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (اگر اس سے بچنا ہے تو توحید قبول کرلو) وہ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس ارادے سے آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے پھیر دو سو (ہم تو پھر نے والے ہیں نہیں باقی) اگر تم سچے ہو تو جس (عذاب) کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو اُس کو ہم پر واقع کر دو۔ انھوں نے فرمایا کہ پورا علم تو خدا ہی کو ہے (کہ عذاب کب تک آوے گا) اور مجھ کو تو جو پیغام دیکر بھیجا گیا ہے میں تم کو وہ پہنچا دیتا ہوں (چنانچہ اُس میں مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ تم پر عذاب آویگا میں نے تم کو اطلاع کر دی، اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم ہے اور نہ قدرت) لیکن میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم لوگ زری جہالت کی باتیں کرتے ہو کہ ایک تو توحید کو قبول نہیں کرتے پھر اپنے منہ سے بلا مانگتے ہو، پھر مجھ سے اس کی فرمائش کرتے ہو البتہ اپنے صدق کا میں مدعی ہوں جس پر دلیل قائم کر چکا ہوں اور جس واقعہ میں تم کو شبہ ہے اس کا وقت وقوع مجھ کو نہیں بتلایا گیا ہاں نفس وقوع کو جب اللہ چاہے دیکھ لینا۔ غرض جب کسی طرح انھوں نے حق کو قبول نہ کیا تو اب عذاب کا اس طرح سلمان شروع ہوا کہ اول ایک بادل اُٹھا) سو ان لوگوں نے جب اُس بادل کو اپنی دادیوں کے مقابل آتا دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسے گا (ارشاد ہوا کہ) نہیں (برسنے والا بادل نہیں) بلکہ یہ وہی (عذاب) ہے جس کی تم جلدی مچاتے تھے (کہ وہ عذاب جلدی لاؤ اور اس بادل میں) ایک اندھی بڑ جس میں دردناک عذاب ہے وہ (آندھی) ہر چیز کو (جس کے ہلاک کرنے کا حکم ہوگا) اپنے رب کے حکم سے ہلاک کر دیگی چنانچہ (وہ آندھی چھٹی اور آدمیوں کو اور مویشی کو اٹھا اٹھا کر پٹک دیتی تھی جس سے) وہ ایسے (تباہ) ہو گئے کہ بجز اُن کے مکانات کے اور کچھ (آدمی اور حیوان) نہ دکھائی دیتا تھا، ہم مجرموں کو یوں ہی سزا دیا کرتے ہیں اور ہم نے اُن کو (یعنی قوم عاد کے) لوگوں کو ان باتوں میں قدرت دی تھی کہ تم کو ان باتوں میں قوت نہیں دی (مراد ان باتوں سے وہ تصرفات ہیں جو قوت جسمانی و مالی پر موقوف ہیں) اور ہم نے ان کو کان اور آنکھ اور دل (سب ہی کچھ) دیئے تھے، سو چونکہ وہ لوگ آیات اللہ کا انکار کرتے تھے اسلئے (جب اُن پر عذاب آیا ہے تو) نہ انکے کان انکے ذرا کام آئے اور نہ انکی آنکھیں اور نہ انکے دل اور جس (عذاب) کی وہ ہنسی اُڑایا کرتے تھے اُسی نے اُن کو آگھیرا (یعنی نہ انکے جو اس انکو عذاب بچا سکے اور نہ اُن کی تدبیر جسکا ادراک قاب سے ہوتا ہے، نہ ان کی قوت پس تمھاری تو کیا حقیقت ہے۔)

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقُرَىٰ وَصَرَفْنَا آيَاتِ لَعْنِهِمْ

اور ہم غارت کر چکے ہیں جتنی تمھارے آس پاس ہیں بستیاں اور طرح طرح سے پھیر کر نشانیاں اُن کو باتیں تاکہ وہ

يَرْجِعُونَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْلَا نَصْرُهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا

لوٹ آئیں پھر کیوں نہ مدد پہنچی اُن کو اُن لوگوں کی طرف سے جن کو کھڑا تھا اللہ سے دے معبود بڑے

إِلَهَةً طِبَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ وَذَلِكَ أَفْكَهُمْ وَمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۲۸﴾

درجے پانے کو، کوئی نہیں گم ہو گئے اُن سے اور یہ جھوٹ تھا ان کا اور جو اپنے جی سے باندھتے تھے۔

خلاصہ تفسیر اور پر قوم عاد کا قصہ تفصیلاً مذکور تھا، آگے دوسری ایسی ہی قوموں کا ذکر ہے جن پر

ربط آیات کفر اور مخالفت انبیاء کی وجہ سے عذاب آئے اور ہلاک ہوئے اُن کی اُجڑی ہوئی بستیاں

بھی اہل مکہ کے سفروں کے وقت راستے میں آتی تھیں ان سے عبرت حاصل کرنے کے لئے ان کا اجمالی

حال آیات مذکورہ میں آیا ہے۔

اور ہم نے تمھارے آس پاس کی اور بستیاں بھی (اس کفر و شرک کے سبب) غارت کی ہیں (جیسے ثمود

قوم ٹوٹ کر ملک شام کو جاتے ہوئے ان بستیوں سے گزرتے تھے اور چونکہ مکہ سے ایک طرف یمن ہے دوسری

جہت میں شام ہے اس لئے مَا حَوْلَكُمْ فرمادیا) اور ہم نے (ہلاک کرنے سے پہلے ان کی فہمائش کیلئے) بار بار

اپنی نشانیاں (اُن کو) بتلا دی تھیں تاکہ وہ (کفر و شرک سے) باز آئیں (مگر باز نہ آئے اور ہلاک ہوئے)

سو خدا کے سوا جن جن چیزوں کو انھوں نے خدا تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اپنا معبود بنا رکھا

تھا (کہ یہ مصیبت میں ہمارے کام آویں گے ہلاکت و عذاب کے وقت) انھوں نے ان کی مدد کیوں نہ

کی بلکہ وہ سب اُن سے غائب ہو گئے اور وہ (معبود اور شفیع سمجھنا) محض اُن کی تراشی ہوئی اور گھڑی

ہوئی بات ہے (اور کہیں واقع میں وہ شفیع یا معبود تھوڑا ہی تھے)۔

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ

اور جس وقت متوجہ کر دیے ہم نے تیری طرف کتنے ایک لوگ جنوں میں سے سُننے لگے قرآن پھر جب وہاں پہنچ گئے

قَالُوا آانُصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ ﴿۲۹﴾ قَالُوا

ہوئے چُپ رہو پھر جب ختم ہوا اُٹے پھرے اپنی قوم کو ڈر مانتے ہوئے

يَقُولُ مِنَّا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

ہم نے تم ہماری ہم نے سنی ایک کتاب جو اُتری ہے موسیٰ کے بعد سچا کرنے والی سب اگلی

يَدِيهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَى طَرِيقٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۰﴾ يَقُولُ مِنَّا آجِبُوا

تمہاروں کو سچاتی ہے سچا دین اور ایک راہ سیدھی اے قوم ہماری مانو اللہ کے



دَاعِيَ اللَّهِ وَأَمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُمْ مَن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ

بلانے والے کو اور اس پر یقین لاؤ کہ بخشے تم کو کچھ تمہارے گناہ اور بچا دے تم کو ایک عذاب دردناک

الَيْمُ ۳۱) وَمَنْ لَا يُحِبُّ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَ

سے اور جو کوئی نہ مانے گا اللہ کے بلانے والے کو تو وہ نہ تھکا سکے گا بھاگ کر زمین میں اور

لَيْسَ لَهُ مَن دُونَهُ أَوْلِيَاءُ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۳۲)

کوئی نہیں اسکا اس کے سوائے مددگار وہ لوگ بھٹکتے ہیں صریح

## خلاصہ تفسیر

اور (اُن سے اسوقت کا قصہ ذکر کیجئے) جبکہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لگے جو (اخیر میں یہاں پہنچ کر) قرآن سننے لگے تھے غرض جب وہ لوگ قرآن (کے پڑھے جانے کے موقع) کے پاس آ پہنچے تو (آپس میں) کہنے لگے کہ خاموش رہو (اور اس کلام کو سنو) پھر جب قرآن پڑھا جا چکا (یعنی جتنا اسوقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں پڑھنا تھا ختم ہو چکا) تو وہ لوگ (اُس پر ایمان لے آئے اور) اپنی قوم کے پاس (اسکی) خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے (اور جا کر اُن سے) کہنے لگے اے بھائیو ہم ایک (عجیب) کتاب سُن کر آئے ہیں جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل کی گئی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے (اور دین) حق اور راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے (یہ تو دین اسلام کی حقانیت کا اثبات و اظہار ہے، آگے امر ہے اس کے قبول کرنے کا اول ترغیب پھر ترہیب یعنی) اے بھائیو تم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو (مراد داعی سے قرآن یا نبی ذیشان ہیں) اور (کہنا ماننا یہ ہے کہ) اُس پر ایمان لے آؤ (اسمیں اشارہ ہو گیا کہ وہ ایمان لانے کی طرف داعی ہے نہ کہ اور کسی دنیوی غرض کی طرف، پس اگر تم ایسا کرو گے تو) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دیگا اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھے گا اور جو شخص اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا نہ مانے گا تو وہ زمین (کے کسی حصہ) میں (بھاگ کر خدا کو) ہرا نہیں سکتا (یعنی اس طرح کہ ہاتھ نہ آئے) اور (جیسا وہ خود نہیں بچ سکتا اسی طرح) خدا کے سوا اور کوئی اس کا حامی بھی نہ ہو گا (کہ وہ اس کو بچا سکے اور) ایسے لوگ صریح گمراہی میں (مبتلا) ہیں کہ باوجود قیام دلائل کے داعی کے حق ہونے پر پھر بھی اُس کی اجابت نہ کریں۔

## معارف و مسائل

کفار مکہ کو سننے کے لئے اس سے پہلی آیات میں کفر اور استکبار کی مذمت اور اُن کا مہلک ہونا بیان ہوا ہے۔ مذکورہ صدر آیات میں اہل مکہ کو عار دلانے کے لئے جنات کے ایمان لانے کا واقعہ بیان

بیگیا ہے کہ جنات تو تکبر و غرور میں تم سے بھی زیادہ ہیں مگر قرآن سن کر ان کے دل بھی موم ہو گئے وہ مسلمان ہو گئے۔ تمہیں تو اللہ تعالیٰ نے جنات سے زیادہ عقل و شعور بخشا ہے مگر اس کے باوجود تم ایمان نہیں لاتے اور واقعہ جنات کے قرآن سننے اور ایمان لانے کا احادیث صحیحہ میں اس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت جب جنات کو آسمانی خبریں سننے سے روک دیا گیا تو آپ کی نبوت و بعثت کے بعد جو جن آسمانی خبریں سننے کے لئے اوپر جاتا تو اس پر شہاب ثاقب پھینک کر دفع کر دیا جانے لگا۔

جنات میں اس کا تذکرہ ہوا کہ اس کا سبب معلوم کرنا چاہیے کہ کونسا نیا واقعہ دنیا میں ہوا ہے جسکی وجہ سے جنات کو آسمانی خبروں سے روک دیا گیا۔ جنات کے مختلف گروہ دنیا کے مختلف خطوں میں اس کی تحقیقات کے لئے پھیل گئے، ان کا ایک گروہ حجاز کی طرف بھی پہنچا اس روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند صحابہ کے ساتھ مقام بطن نخلہ میں تشریف فرما تھے اور مشوق عکاظ کی طرف جانے کا قصد تھا۔ (عرب کے لوگ تجارتی اور معاشرتی امور کے لئے مختلف مقامات پر خاص خاص ایام میں بازار لگاتے تھے جس میں ہر خطے کے لوگ جمع ہوتے دکانیں لگتیں اور اجتماعات اور جلسے ہوتے تھے جیسے ہمارے زمانے میں اسی طرح کی نمائشیں جا بجا ہوتی ہیں انھیں میں سے ایک بازار مقام عکاظ میں لگتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غالباً دعوت و تبلیغ اسلام کے لئے تشریف لے جا رہے تھے) اس مقام بطن نخلہ میں آپ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے کہ وہ جنات یہاں پہنچے، قرآن سن کر کہنے لگے کہ بس وہ نئی بات یہی ہے جو ہمارے اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل ہوئی ہے (رواہ الامام احمد والبخاری ومسلم والترمذی والنسائی وجماعۃ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما)

اور ایک روایت میں ہے کہ وہ جنات جب یہاں آئے تو باہم کہنے لگے کہ خاموش ہو کر قرآن سنو، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو اسلام کی حقانیت پر یقین و ایمان لا کر اپنی قوم کے پاس واپس گئے اور ان کو اس واقعہ کے اصلی سبب کی اور اس کی خبر دی کہ تم تو مسلمان ہو گئے تم کو بھی چاہئے کہ ایمان لے آؤ، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان جنات کے آنے جانے اور قرآن سن کر ایمان لے آنے کی خبر نہیں ہوئی یہاں تک کہ سورہ جن کا نزول ہوا جس میں آپ کو اس واقعہ کی خبر دی گئی (رواہ ابن المنذر عن عبد الملک)

اور ایک روایت میں ہے کہ یہ جنات مقام نعین کے رہنے والے تھے اور کل نو یا بعض روایات کے مطابق سات تھے جب انھوں نے اپنی قوم کو یہ خبر سنائی اور ایمان لانے کی ترغیب دی تو پھر ان میں سے تین سوا شخاص اسلام لانے کے لئے حاضر خدمت ہوئے (رواہ ابو نعیم والواقدی عن کعب الاحبار والروایات کلبانی الریح) اور دوسری حدیثوں میں جنات کے آنے کی روایت دوسری طرح کی بھی آئی ہے مگر چونکہ یہ متعدد واقعات مختلف اوقات میں پیش آئے ہیں اس لئے کوئی تعارض نہیں اور اس کی تائید اس روایت بھی ہوتی ہے جو طبرانی نے اوسط میں اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ جنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بار بار حاضر ہوئے۔ خفاجی نے فرمایا کہ احادیث کی روایات جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے



خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرنے کے واقعات چھ مرتبہ پیش آئے ہیں (کذا فی الروح واخذتہ عن بیان القرآن) اسی واقعہ کی تفصیل مذکور صدر آیات میں بیان کی گئی ہے۔

کِتَابًا أَنْزَلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ، اس میں بَعْدِ مُوسَىٰ کی قید سے بعض حضرات سمجھا ہے کہ یہ جنات یہودی تھے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد تو عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل ہوئی اسکا ذکر نہیں کیا لیکن اسکی کوئی صریح روایت تو ہے نہیں اور انجیل کا ذکر نہ کرنے سے اُن کے یہودی ہونے پر استدلال ناکافی ہے کیونکہ انجیل کے ذکر نہ کرنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ انجیل اکثر احکام میں تورات کے تابع ہے اور قرآن مثل تورات کے مستقل کتاب ہے اسکے احکام و شرائع تورات سے بہت مختلف ہیں۔ تو یہ ہو سکتا ہے کہ مقصود یہ بتلانا ہو کہ تورات جیسی کتاب مستقل قرآن ہی ہے۔

يَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ حَرْفٌ مِنْ أَصْلِ مِثْلِ بَعْضٍ لَيْسَ بِجَزْئِيَّتِ كَيْفَ كُنْتُمْ تَكُونُونَ اگر یہی معنی یہاں لئے جاویں تو حرف مِنْ کے بڑھانے کا فائدہ یہ ہو گا کہ اسلام قبول کر لینے سے حقوق العباد معاف نہیں ہوتے۔ اسلئے یہ فرمانا مناسب ہو گا کہ بعض گناہ یعنی حقوق اللہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے اس حرف مِنْ کو زائد قرار دیا ہے تو اس توجیہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَكُنْ لِيَّ

بِشَيْءٍ يَّخْفِي ۚ بیا نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے بنائے آسمان اور زمین اور نہ تھکا اُن کے

بِخَلْقِهِمْ يَخْفِي ۚ بِلَا شَيْءٍ يَّخْفِي ۚ بِلَا شَيْءٍ يَّخْفِي ۚ

بنانے میں وہ قدرت رکھتا ہے کہ زندہ کرے مردوں کو؟ کیوں نہیں وہ ہر چیز

قَدِيرٌ ۚ ۳۳ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلَيْسَ هَٰذَا بِأَلْحَقٍّ

کر سکتا ہے۔ اور جس دن سامنے لائیں مسکروں کو آگ کے کیا یہ ٹھیک نہیں؟

قَالُوا بَلٰی وَرَبَّنَا قَدْ فُؤَادَنَا لَبِئْسَ مَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۳۴

کہیں گے کیوں نہیں تم ہے ہمارے اب کی، کہا تو چکھو عذاب بدلہ اسکا جو تم مسکرہ ہو تے تھے

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعِزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَمْ يَكُنْ

سو تو ٹھہرا رہے ہیں ہمت والے رسول اور جلدی نہ کر اُن کے معاملہ میں

كَانَ يَوْمَ يَرُونَ مَا يُوْعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۚ

یہ لوگ جس دن دیکھ لیں گے اس چیز کو جسکا اُن سے وعدہ ہے جیسے ڈھیل نہ پائی تھی مگر ایک گھڑی دن کی

بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلِكُ اِلَّا الْقَوْمَ الْفٰسِقُونَ ۳۵

یہ پہنچا دینا ہے، اب وہی غارت ہونگے جو لوگ نافرمان ہیں

## خلاصہ تفسیر

کیا ان لوگوں نے یہ نہ جانا کہ جس خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے میں خدا نہیں تھا وہ اس پر (درجہ اولیٰ) قدرت رکھتا ہے کہ مردوں کو (قیامت میں) زندہ کر دے (اور وہ اس پر قادر) کیوں نہ ہو، بے شک وہ (تو) ہر چیز پر قادر ہے (یہ تو امکان ثابت ہوا) اور جس روز (اس کا دُور ہوگا اور) کافر لوگ دوزخ کے سامنے لائے جاویں گے (اور ان سے پوچھا جاوے گا کہ) کیا یہ دوزخ امر واقعی نہیں ہے (جیسا کہ دُنیا میں اس کی واقعیت کی نفی کیا کرتے تھے) کما قال تعالیٰ اَنۡتُمْ مِّنۡکُمْ مَّنۡ یَّکۡفُرۡ (وہ کہیں گے کہ ہم کو اپنے پروردگار کی قسم ضرور امر واقعی ہے اور شاد ہوگا (اچھا) اپنے کفر کے بدلہ میں (جس میں انکار دوزخ بھی آگیا) اس (دوزخ) کا عذاب چکھو۔ آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے فرمایا کہ جب ان سے انتقام کفر کا لیا جانا معلوم ہو گیا (تو آپ (ولیا ہی) صبر کیجئے جیسا اور بہت والے پیغمبروں نے صبر کیا تھا اور ان لوگوں کیلئے (انتقام الہی کی) جلدی نہ کیجئے (جس کو آپ مسلمانوں کی دُجوئی کے لئے چاہتے اور عجیب تر یہ ہے کہ وہ مستحق عذاب خود جلد بازی کرتے ہیں اور عجیب تر ہونا ظاہر ہے کہ مدعی اگر مدعا علیہ کی سزا جلدی چاہے تو بعید نہیں لیکن مدعا علیہ اگر سزا جلدی چاہے تو نہایت امر غریب ہے سو گو حکمت الہیہ سے عذاب فوری نہیں ہوگا لیکن مشاہدہ کے وقت ان پر اس کا وہی اثر ہوگا جو فوری عذاب کا ہوتا ہے کیونکہ) جس روز یہ لوگ اس چیز کو (یعنی عذاب کو) دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو (اس وقت غایت شدت عذاب ایسا معلوم ہوگا کہ) گویا یہ لوگ (دُنیا میں) دن بھر میں ایک گھڑی پہے ہیں (یعنی دنیا کی مدت طویلہ قصیر معلوم ہوگی اور یہی معلوم ہوگا کہ فوراً ہی عذاب آگیا۔ آگے کفار کو تنبیہ ہے کہ) یہ (خدا کی طرف سے اتمام حجت کے لئے) پہنچا دینا ہو (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہو چکا) سو (اس کے بعد) وہی برباد ہوں گے جو نافرمانی کریں گے۔ (کیونکہ بعد تبلیغ کے کوئی عذر نہ رہا اور رسول کا اسمیں کوئی ضرر نہیں اس سے تاکید تسلیم کی بھی ہو گئی)۔

## معارف و مسائل

أُولَ‌ٓءَٓا۟لِ الْعِزِّمِ مِنَ الرُّسُلِ ایں من الرُّسُلِ کا حرف من متعین کے نزدیک بیان یہ جو بعض کیلئے نہیں۔ معنی یہ ہیں کہ تمام رسول جو صاحب عزم و ہمت ہی ہوتے ہیں معلوم ہوا کہ صاحب عزم و ہمت ہونا بھی انبیاء کی صفت ہے البتہ رسولوں کے درمیان صفات کے درجات میں تفاضل اور کئی بیشی خود قرآن کے ارشاد سے ثابت ہے اِنَّكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمۡ عَلَیۡ بَعْضٍ۔ اس لئے جو انبیاء علیہم السلام صفت عزم و ہمت میں دوسروں سے زیادہ امتیاز رکھتے خاص ان رسولوں کیلئے یہ لقب کے طور پر مشہور ہو گیا اور ان کی تعین میں بھی اختلاف ہے اور اکثر کا قول ہے کہ لقب اولو العزم جن کو دیا گیا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن کا ذکر سورۃ احزاب کی اس آیت میں ہے وَ‌اِذَا خَذَ النَّاسُ النِّسَابَ مِثۡلَاقَهُمۡ وَ‌مِثۡلَکَ وَ‌مِثۡلَ نُوۡحٍ وَ‌اِبۡرَہِیۡمَ وَ‌مُوسٰی وَ‌عِیۡسٰی ابۡنِ مَرْیَمَ اِنَّہُمۡ عِندَ اللّٰہِ لَشَٰہِدٌ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی عیش و عشرت اور تنعم محمد اور آل محمد کے شایان نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اولو العزم سے بجز مہر کے اور کسی چیز پر راضی نہیں۔ اور مجھے یہی حکم دیا ہے کہ فَاصْبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولَ‌ٓءَٓا۟لِ الرُّسُلِ۔

تمت سورۃ الاحقاف بعون اللہ للشافی والعشرین من رجب ۱۳۹۲ھ یوم السبت واللہ الحمد